جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

P. O. JAMIA NAGAR, NEW DELHI-25



جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہ جنوری ۱۹۶۲ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

سالنامہ

رسالہ "جامعہ" کا اگلا شمارہ سالنامہ ہوگا، جس میں ۱۹۶۱ء کے اردو ادب کا بسط و تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔ اس کا حجم تقریباً ۱۴۰ صفحات ہوگا، اور قیمت ڈیڑھ روپے ہوگی۔

سالنامہ ڈاک خانہ سے رسیدے کر بھیجا جائے گا، لیکن پھر بھی راستہ میں کھو جانے کا امکان ہے، اس لئے جو حضرات چاہتے ہوں کہ سالنامہ انھیں یقینی طور پر مل جائے، وہ فیس رجسٹری کے پچاس نئے پیسے بھیج دیں، ورنہ رسالہ کے نہ ملنے کا دفتر ذمہ دار نہیں ہوگا اور دوبارہ طلب کرنے پر تعمیل کرنے سے قاصر ہوگا۔

جن خریداروں نے دوسرے سال کا چندہ ابھی نہیں بھیجا ہے، ان سے درخواست ہے کہ مع فیس رجسٹری جلد بھیج دیں۔

سالنامہ کے مضامین کی تفصیل اس شمارے کے آخری صفحہ ۱۶۸ پر ملاحظہ ہو

بنیادی قومی تعلیم کا سماجی کردار

ڈاکٹر سلامت اللہ

قومی زندگی کے ہر پہلو سے متعلق آج ہمارے دیس ہندوستان میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم ہے یہاں تک کہ ہم اپنی منزل کے بارے میں متفق نہیں ہیں کہ ہمیں کہاں پہنچنا ہے۔ اس معاملے میں کہ ہماری سماجی زندگی کا کیا نقشہ ہونا چاہیئے، مختلف جماعتوں کے خیالات ایک دوسرے سے آپس میں ٹکراتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک طرف ملک کی موجودہ حکومت اور لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد سمجھتی ہے کہ ہماری مادی اور روحانی دونوں قسم کی ترقی کے لیے سوشلسٹ سماج قائم کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں سب ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کریں اور اپنی قابلیت اور طاقت کے مطابق ملک کی خوش حالی کو بڑھانے کی کوشش کریں اور اس کی برکتوں سے سب ہی فیضیاب ہوں۔ کسی کو دوسرے کی محنت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا حق نہ ہو۔ اس کے خلاف دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کی ایک چھوٹی مگر با اثر جماعت سماج کے موجودہ ڈھانچے کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ جس کی بنیاد اشتراکِ عمل کی بجائے باہمی مقابلے پر قائم ہے اور جس میں اکثریت اپنی محنت کے پھل سے بڑی حد تک محروم رہتی ہے اور اُس کا فائدہ وہ چھوٹا سا طبقہ اٹھاتا ہے جس کے قبضے میں دولت پیدا کرنے کے ذریعے ہیں۔

جب قومی زندگی کے مقصد جیسے بنیادی مسئلے میں اس قدر اختلاف رائے ہے، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تعلیم کے معاملے میں جو محض ایک وسیلے کی حیثیت رکھتی ہے، مختلف جماعتوں کے خیالات جُدا جُدا ہیں۔ یوں تو ہمارے ہاں ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی ہر ایک منزل کے بارے میں الگ الگ رائیں ہیں کہ اس کی شکل کیا ہونی چاہیئے، لیکن جتنے شدید اختلافات ابتدائی تعلیم کے بارے میں ہیں، اتنے شاید اور کسی منزل کی تعلیم کے بارے میں نہیں ہیں۔ ابتدائی تعلیم کا مقصد

اور روپ کیا ہو، اس موضوع پر اُس وقت سے ایک مسلسل بحث چھڑی ہوئی ہے جبکہ مہاتما گاندھی نے، ۱۹۳۷ء
میں قوم کے سامنے بنیادی تعلیم کا خیال پیش کیا تھا۔ آج کم وبیش ایک چوتھائی صدی کی مدت ختم ہو چکی ہے، مگر
بحث اب بھی جاری ہے کہ بنیادی قومی تعلیم میں کون سی چیزیں اہم ہیں۔ یہاں تک کہ ملک کی مختلف ریاستوں
میں جو تھوڑے بہت مدرسے بنیادی اسکول کے نام سے کھولے گئے ہیں، ان کے بارے میں شبہ ظاہر کیا
جا رہا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں بنیادی مدرسے کہلانے کے مستحق ہیں بھی یا نہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم بنیادی تعلیم کے تصور کو تاریخی اور سماجی
پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں۔

ہندوستان پر برطانیہ کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہاں کی حکومت کا ڈھانچا بھی بدلا لیکن اس سے
کہیں زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ وہ بنیادیں ہل گئیں جن پر پرانے سماج کی عمارت کھڑی تھی۔ وہ سماجی
نظام جو صدیوں سے اس دیس میں قائم تھا، ڈگمگانے لگا۔ اس سماج کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اندرونی
طور پر کسی بڑی تبدیلی کا پیدا ہونا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہاں لوگوں کے حقوق و فرائض ان کے
اپنے اپنے طبقے کے اعتبار سے متعین تھے اور ان کی پابندی کرانے میں سرکاری حکم یا ضابطہ قانون کا اتنا دخل
نہیں تھا، جتنا کہ روایات اور عقائد کا، مثال کے طور پر لوگوں کے پیشے، اختیارات اور سماجی رُتبے کا انحصار
ذات پات پر تھا۔ یا جو لوگ دولت مند تھے، جن کے پاس جاگیریں تھیں، اُن کے اور اُن کی رعایا کے درمیان
حقوق و فرائض کے رشتے واضح تھے۔ اگرچہ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے سے پہلے کئی ایک حکومتیں
بنیں اور بگڑیں، سینکڑوں حاکم، راجے مہاراجے، بادشاہ اور شہنشاہ آئے اور گئے، لیکن ملک کے سماجی
نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس کا اقتصادی ڈھانچا جوں کا توں برقرار رہا۔ بہت پرانے
زمانے سے ہندوستان کی دولت کا سب سے بڑا ذریعہ کھیتی باڑی تھا۔ گاؤں کی زندگی میں زراعت اور گھریلو
دستکاری میں ایسا تال میل تھا کہ زندگی کی تمام بنیادی ضرورتیں گاؤں ہی میں پوری ہو جاتی تھیں گاؤں
اس طرح کسی باہر کی ایجنسی کے محتاج نہیں تھے۔ لیکن دیہی زندگی کی اس تصویر سے یہ غلط فہمی نہیں
ہونی چاہیئے کہ وہ مادی یا تہذیبی لحاظ سے بھری پوری تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس سماج میں زندگی کی
ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ اور اندرونی طور پر اُس زندگی کے امن اور شانتی کو درہم برہم کرنے والے

باپ موجود تھے۔ بظاہر لوگ اپنی موجودہ حالت پر قانع تھے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ملک میں کبھی کوئی ہل چل پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی ہنگامے برپا ضرور ہوئے، بغاوتیں، جنگیں اور خون ریزیاں بھی ہوئیں، مگر ان کا اثر حاکموں کی تبدیلی، اور ایک وقتی اتھل پتھل سے زیادہ گہرا نہیں ہوا۔ سماجی زندگی پر جمود طاری رہا۔ اور سماج کے مختلف طبقے اور گروہ اپنے اپنے معینہ درجے کے مطابق زندگی گزارتے رہے۔ اور سماج کے اقتصادی نظام میں توازن قائم رہا۔

برطانوی حکومت کی پالیسی اور طریق کار نے ہندوستان کی سماجی زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ اور اس کے اقتصادی توازن کو بگاڑ دیا۔ صنعتی انقلاب کی بدولت انگلستان میں ملک کی ضرورت سے زیادہ چیزیں مشینوں سے بننے لگیں۔ ان کی کھپت کے لئے انگلستان کو ہندوستان سے بہتر منڈی اور کہاں مل سکتی تھی۔ چنانچہ ان چیزوں کی تجارت کو ہندوستان میں ہر جائز اور ناجائز طریقے سے بڑھاوا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی گھریلو دستکاریاں تباہ ہو گئیں۔ ملک کی زراعت کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے زمینداری کی جو سنتھا قائم کی، اس سے زرعی پیداوار کو بہت بڑا دھکا لگا اور کسان تباہ ہو گئے۔ اب تک زمین پر کسان کا اپنا قبضہ تھا اور وہ اپنی پیداوار کا ایک مقررہ حصہ براہ راست سرکار کو ادا کر دیتا تھا لیکن اب زمینداری کے نئے نظام میں سرکار اور کسان کے درمیان ایک تیسرا شخص "زمیندار" حائل ہو گیا اور وہ خود پیداواری عمل میں کوئی خاص حصہ لئے بغیر کسان کی محنت سے فائدہ اٹھانے لگا۔ زمیندار کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کرنے کی چھوٹ تھی، کیونکہ وہ برطانوی حکومت کو قائم رکھنے اور مضبوط بنانے میں ہر ممکن مدد دینے کے لئے تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسان کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ کسان کی بربادی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کھیتی باڑی سے روزی کمانے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ برطانوی صنعت کے حملے کا مقابلہ دیسی دستکاری نہ کر سکی اور دستکاروں کو زندہ رہنے کے لئے مجبوراً زراعت کا سہارا لینا پڑا۔ یہ اتنی بھیانک اور دل ہلا دینے والی تباہی تھی کہ اس کا احساس حکومت کے اعلیٰ حلقوں کو بھی ہوا۔ چنانچہ

لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل نے ایک اپنے سرکاری مراسلے میں صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے،
"جولاہوں (بُن کردں) کی ہڈیاں ہندوستان کے میدانوں کا رنگ پھیکا کر رہی ہیں۔"

جہاں برطانوی حکومت نے ہندوستان پر اتنی بڑی مصیبت نازل کی، وہاں نادانستہ طور پر اس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ ہندوستانی سماج صدیوں سے جمود کے عالم میں تھا اور لوگوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہماری حالت ہمیشہ ویسی ہی رہے گی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو کچھ بھی ہے وہ ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی سماجی ناانصافی، بے عزتی، ظلم و تشدد اور حکمراں طبقے کی خودسری کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھے۔ وہ طرح طرح کی توہم پرستی کا شکار تھے اور انھیں اس تاریکی سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جو حالات برطانوی حکمت عملی سے پیدا ہوئے، انھوں نے اس جمود کو توڑا۔ عام تباہ حالی نے ہندوستانیوں کو بری طرح جھنجھوڑا اور یہ سوچنے پر آمادہ کیا کہ آخر اس صورت حال سے کیوں کر چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ادھر انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے میں نئے خیالات ترقی کر رہے تھے، جو دراصل یورپ کے صنعتی انقلاب کی دین ہیں یعنی جمہوریت مساوات اور آزادی۔ یہ وہ انقلابی خیالات ہیں جن سے سرشار ہو کر ہندوستانیوں نے مختلف قسم کی سیاسی سماجی اور تہذیبی تحریکیں شروع کیں۔ اور ان کی بدولت وہ جمود ٹوٹا، جو صدیوں سے ہندوستانی سماج کو میٹھی نیند سُلا رہا تھا۔

برطانوی تسلط کے خلاف ملک میں جو بھی اندولن شروع ہوئے، وسیع معنوں میں ان سب کا کسی نہ کسی طرح عوام کی تعلیم سے تعلق تھا۔ باضابطہ طور پر نہ سہی، بے ضابطہ طور پر سبھی تعلیم کا ذریعہ تھے، کیوں کہ وہ عوام میں ایک نئی ذہنیت اور ایک نیا شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس قسم کی بالواسطہ تعلیم کچھ زیادہ کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ جمہوریت کا نیا تصور یورپ سے حاصل ہوا تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ عوام کی باضابطہ تعلیم کا سرکاری طور پر انتظام کیا جائے تاکہ کم از کم تہذیبی میدان میں ترقی کرنے کے سب کو برابر مواقع حاصل ہوں۔ اس احساس ضرورت نے آگے چل کر عوام کی مفت اور لازمی تعلیم کے مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔

انگریزی حکومت کو اپنے ابتدائی دور میں ہندوستانیوں کی تعلیم کی ضرورت کا کوئی احساس

اب تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد حکومت کو اس طرف تھوڑی بہت توجہ دینی پڑی۔ اس لئے کہ اسے اپنے دفتری کام چلانے کے لئے ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت تھی جو انگریزوں کے مقابلے میں کم تنخواہ پر سرکاری نوکری کر سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان سے یہ بھی فائدہ حاصل ہو کہ وہ حکومت اور عوام کے درمیان ایک کڑی کا کام کر سکیں۔ یعنی یہ ہندوستانی ملازمین حکومت کا آلہ کار بن کر اسے تقویت پہنچا سکیں۔ گو کہ اس تعلیم کا دائرہ بہت محدود تھا۔ ملک کی آبادی کے ایک بہت چھوٹے حصے نے اس تعلیم سے فائدہ اٹھایا۔ مگر سیاسی اور سماجی لحاظ سے دیکھئے، تو ملک پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔

یہ سچ ہے کہ انگریزی تعلیم کی بدولت ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی آزادی کی تحریک کے لئے چند غیر معمولی رہنما حاصل ہوئے ہیں، جنھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے بہترین عناصر سے اپنی ذات کو سنوارا۔ جمہوریت، آزادی، مساوات، انسان دوستی، سائنسی طریقہ، وغیرہ کو خود اپنایا اور ان ہی قدروں کا سہارا لے کر مختلف تحریکوں کی رہنمائی کی۔ لیکن عام طور پر انگریزی تعلیم کا نتیجہ ملک کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوا۔ اور ہوتا بھی کیسے جب کہ اس کا منشا یہ تھا ہی نہیں؟ جن لوگوں نے یہ تعلیم پائی، ان کی اکثریت نے برطانوی حکومت کے مقاصد پورے کئے۔

انگریزی تعلیم کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے سماج میں ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا، جو رنگ روپ کے لحاظ سے تو ہندوستانی تھا مگر اس کی عادتیں، دلچسپیاں اور رہن سہن کے طریقے انگلستان کے حکمران طبقے سے زیادہ ملتے جلتے تھے۔ پھر کیا تعجب کہ اس طبقے نے ہمیشہ انگریزی حکومت کو قائم رکھنے اور آزادی کی جدوجہد کو کمزور بنانے میں اہم حصہ لیا۔

اس تعلیم سے ایک نقصان اور ہوا۔ ہندوستانی سماج پہلے ہی دولت اور ذات پات کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ اب انگریزی تعلیم نے اس میں ایک اور دراڑ ڈال دی۔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگ خود کو کسی اور دنیا کی چیز سمجھنے لگے اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ان دونوں گروہوں میں کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ انگریزی تعلیم عوام کے لئے تھی ہی نہیں۔ اس سے صرف خواص ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے، صرف

وہی لوگ جن کے پاس دولت تھی، جو پہلے ہی سماج کے اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ اولاً تو یہ تعلیم خاصی مہنگی تھی اور دوسرے، اس کے لئے شہروں میں اسکول قائم کئے گئے تھے، جہاں مالی لحاظ سے کم حیثیت والے اور خاص کر گاؤں کے غریب اور متوسط طبقے کے لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزی تعلیم سے گاؤں اور قصبے کے چند مالدار لوگوں نے بھی ذاتی طور پر فائدہ اٹھایا۔ لیکن اس تعلیم کا سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور تعلیم یافتہ لوگوں کو شہر اپنی طرف کھینچ لیتے تھے جہاں وہ اپنے لئے جنت بنا سکتے تھے۔ اس لئے گاؤں اپنی آبادی کے ان عناصر سے محروم ہوتے چلے گئے جو شاید نئے زمانے کے تقاضوں کو سمجھ کر مادی اور تہذیبی لحاظ سے گاؤں کی زندگی کو خوب صورت اور خوش حال بنانے میں کچھ مدد کر سکتے۔ اس طرح دیہی زندگی جو بدیسی حکومت کے ہاتھوں لٹ کھسٹ کر ہر لحاظ سے ویران اور مفلس ہو رہی تھی، اور زیادہ پست ہوتی چلی گئی۔

ہندوستان کو انگریزی تعلیم سے جو سب سے بڑا نقصان پہنچا وہ یہ ہے کہ اس نے سماجی زندگی کی بنیادی حقیقتوں سے تعلیم یافتہ طبقے کو بالکل الگ تھلگ کر دیا۔ یوں تو یہ تعلیم ایک نئی تہذیب کی دعوے دار تھی، لیکن اس نے اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں چرالیں کہ تمام تہذیب کا سرچشمہ انسانی محنت ہے کہ اس کے بغیر نہ تو تہذیبی زندگی کی مادی چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں اور نہ صحیح معنوں میں وہ اخلاقی اور روحانی قدریں جو حقیقت میں تہذیب کی جان ہیں۔ انگریزی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ اتنا اپاہج ہو گیا کہ نہ وہ کسی قسم کی پیداوار میں حصہ لینے کے قابل رہا اور نہ ہی اس میں سماجی زندگی کو سنوارنے کی کوئی اہلیت باقی رہی۔ یہ طبقہ ہر قسم کی جسمانی محنت و مشقت سے گریز کرنے لگا۔ ہر وہ کام جس میں ہاتھ اور لباس کے میلے ہونے کا اندیشہ ہو، اس کے نزدیک گھٹیا اور ہیچ قرار پایا۔ ہندوستانی سماج میں پہلے ہی دولت اور ذات پات کی بنا پر اونچ نیچ کا خیال کیا کم تھا! انگریزی تعلیم نے الٹا ہی غضب کر دیا۔ زمانے کا تقاضا تو یہ تھا کہ ملک میں جمہوریت کے خیال کو تقویت پہنچائی جاتی اور لوگوں میں برابری اور باہمی عزت و احترام کے رجحان کو ترقی دی جاتی اور ملک کی خوشحالی

کے لئے پیدا دا ۔ بڑھانے کی مہم میں سبھی شریک ہوتے ۔ مگر انگریزی تعلیم کا بالکل اُلٹا اثر ہوا۔ یہاں تک کہ یہ ہر قسم کی سماجی ترقی کی راہ میں روڑا بن گئی۔

انگریزی تعلیم کے ان مضر اثرات سے آزادی کی تحریک کے لیڈر با خبر تھے ۔ چنانچہ قومی لیگ قائم سے برطانوی حکومت کی اس تعلیمی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی ہونے لگی جب ۱۹۳۷ء میں ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رُو سے تعلیم کی ذمے داری صوبوں کی نمائندہ حکومتوں کے سپرد کی گئی ۔ تو ہندوستانیوں کو پہلی بار یہ موقع ملا کہ وہ اپنے تصورات کے مطابق ملک کی تعلیمی پالیسی مرتب کریں ۔ مہاتما گاندھی نے اس موقع پر ملک کے سامنے بنیادی قومی تعلیم کا خاکہ پیش کیا ۔ گاندھی جی نہ صرف آزادی کے اندولن کے سب سے بڑے نیتا تھے ، بلکہ تعلیمی معاملات پر بھی ان کی اچھی نظر تھی ۔ انھوں نے اپنے جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران اور بعد میں سابرمتی آشرم میں کچھ تعلیمی تجربے بھی کئے تھے ۔ اور اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ ان کے ذہن میں ہندوستان کی سماجی ترقی اور خوش حالی کا ایک جامع اور واضح تصوّر موجود تھا ۔ وہ جسمانی محنت و مشقت کو بہرحال تعلیم کا ایک ضروری حصّہ سمجھتے تھے ۔ ان کے نزدیک کوئی بھی تعلیم اُس وقت تک تعلیم کہلانے کی مستحق نہ تھی ، جب تک کہ اُسے سماجی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ، اس لئے کہ وہ جس قسم کے سماج کو قائم کرنا چاہتے تھے ، اس میں ہر ایک فرد کے لئے ایسے کاموں میں حصّہ لینا ایک لازمی فرض کی حیثیت رکھتا تھا ، جن پر سماج کی خوش حالی اور ترقی کا دار و مدار ہو ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تعلیم کے اعلیٰ مقاصد ، اخلاقی خوبیاں اور قدریں حاصل کرنے کا موثر طریقہ یہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی نے بنیادی قومی تعلیم میں دستکاری اور دوسرے پیداواری کاموں کو مرکزی جگہ دی اور اس کے ساتھ ساتھ ان مشغلوں پر بھی زور دیا جو سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ضروری ہیں ۔ مثلاً بستی کی صحت و صفائی کی مہم میں حصّہ لینا ، سڑکیں بنانا ، مریضوں کی دیکھ بھال کرنا ۔ وغیرہ ۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس طرح تعلیم ایک خاموش سماجی انقلاب کی علم بردار بنے گی ۔ اور ایک ایسا سماج بنانے میں مدد دے گی جس میں سب مِل جُل کر زندگی بسر

کریں گے، کوئی کسی کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے گا، ہر ایک شخص سب کی بھلائی کے لئے کام کرے گا اور سب کی کوششوں کا پھل ہر ایک کو نصیب ہوگا۔ گاندھی جی کے آدرش سماج کا روپ یہ ہے اور اسی کو وہ جمہوریت کی روح اور سوشلزم کا نچوڑ کہتے تھے۔

یہ ہے بنیادی قومی تعلیم کا وہ پہلو، جس میں نئے سماجی نظام کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کے اسی پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کہا تھا کہ بنیادی مدرسے کا مستقل خرچ بچوں کے کام سے پورا ہونا چاہیئے۔ مگر ہوا یہ کہ بنیادی تعلیم کے اسی پہلو کو عمل میں سب سے کم زور بنایا گیا۔ آزادی سے پہلے بھی یہی حالت تھی اور آج بھی آزادی کے چودہ سال بعد یہی حالت ہے۔ اگرچہ اب یہ بات سرکاری پالیسی کے طور پر تسلیم کرلی گئی ہے کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کا روپ بنیادی تعلیم ہی ہوگا، لیکن اکثر مدرسوں میں اس قسم کے کام شروع نہیں کئے گئے ہیں۔ ایسے مدرسے بہت تھوڑے ہیں جہاں دستکاری یا حرفے کا کام ہوتا ہو۔ مگر یہ بھی کچھ اس طرح کیا جاتا ہے گویا کئے کی لاج رکھنی ہے۔ نہ کوئی کام کی چیز بنتی ہے اور نہ کوئی اور تعلیمی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ایسا تعلیمی فائدہ، جس کا ماہرینِ تعلیم کی مجلسوں میں آئے دن چرچا ہوتا رہتا ہے۔

آخر، یہ صورت حال کیوں ہے؟ یوں تو بہت سے اسباب ہیں جن کا تعلق تعلیم کا انتظام کرنے والوں، استادوں، بچوں کے سرپرستوں وغیرہ سے ہے، لیکن اصل وجہ معلوم کرنے کے لئے مدرسے کی چہار دیواری سے باہر جانا پڑے گا۔ ہماری حکومت نے ہندوستان میں سوشلسٹ سماج قائم کرنے کا اعلان تو ضرور کیا ہے۔ مگر جو طریقے اختیار کئے ہیں ان سے اس مقصد کو حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہمارا موجودہ سماج مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں تعداد کے اعتبار سے وہ طبقہ بہت بڑا ہے جو جسمانی محنت و مشقت کے ذریعے اپنا پیٹ پالتا ہے اور ملک کی پیداوار اور دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن

طاقت کے لحاظ سے دیکھیئے تو یہ طبقہ بہت کم مایہ ہے۔ اس کے مقابلے میں دولت مندوں کا چھوٹا سا طبقہ بہت طاقت ور ہے۔ اس کا ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی پر بڑا اثر ہے۔ اس طبقے کو جسمانی محنت کرنے اور پیداوار کے کام میں خود حصہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طبقہ کسی ایسی چیز کو گوارا نہیں کرے گا جس سے اس کی سماجی برتری کو خطرہ ہو۔ بنیادی قومی تعلیم کا یہ اصول کہ دستکاری اور ہاتھ کے کام کو تعلیم میں مرکزی جگہ دی جائے، دولت مند طبقے کے نزدیک اسی قسم کا ایک خطرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ بنیادی تعلیم کو نہ تو آزادی سے پہلے خوشی خوشی قبول کرنے کے لئے تیار تھا اور نہ اب ہے۔ اس طبقے نے شروع ہی سے اس اصول کی روح کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اس طبقے کی طرف سے یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ دستکاری کو تعلیم میں جگہ دینا تو اچھا ہے کیوں کہ اس سے بچے کی تخلیقی قوت کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے اور اس کے ذریعے بچے کی شخصیت کے وہ نقوش ابھرتے ہیں جنھیں کتابی تعلیم دبا کر رکھتی ہے۔ مگر اس طبقے نے اس خطرے کا بھی اعلان کیا ہے کہ اگر تعلیم میں پیداوار پر زور دیا گیا تو تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کا خون ہو جائے گا۔ اور بچہ محض کارخانے کا مزدور بن کر رہ جائے گا۔ اسی طرح دوسرے سماجی کاموں مثلاً مدرسہ اور بستی کی صحت و صفائی کے پروگرام میں بچے کی شرکت پر اس طبقے کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس قسم کے کاموں میں مدرسہ کا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے جو بہر کیف پڑھنے لکھنے پر صرف ہونا چاہیئے۔ اور اس کے علاوہ بچے کا جسم اور لباس گندا ہو جاتا ہے۔ غرض، بنیادی تعلیم کے اُس رول کو کم زور بنانے کے لئے طرح طرح کی دلیلیں اور تاویلیں پیش کی گئی ہیں، جس کا تعلق سماج کی اصلاح اور ترقی سے ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ بنیادی تعلیم کے اس اہم پہلو پر بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور غور طلب ہے۔ فرض کیجیئے کہ بنیادی مدرسوں میں پیداواری مشغلوں اور دوسرے سماجی کاموں کو عملاً ویسی ہی اہمیت دی جاتی ہیں کہ ایک سوشلسٹ سماج کی تعمیر کے لئے ضروری ہے۔ مگر اس قسم کے مدرسے محض نمونے کے طور پر

تھوڑی تعداد میں کھولے جاتے اور ملک کے باقی سب مدرسوں میں پرانے ڈھنگ کی کتابی تعلیم ہی ہوتی رہتی، تو کیا بنیادی تعلیم کا مقصد پورا ہوجاتا؟ ہرگز نہیں۔ یہ چند مثالی مدرسے سماجی ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلی کیسے پیدا کرسکتے! اس قسم کی تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ پوری قوم کی ذہنیت بدلی جائے۔ بنیادی تعلیم دراصل پوری قوم کی تعلیم کا ایک باضابطہ پروگرام ہے سماج پر اس کا اثر پورے طور پر صرف اسی وقت محسوس کیا جاسکتا ہے، جبکہ ملک کے تمام بچوں کی ابتدائی تعلیم لازمی طور پر صرف بنیادی مدرسوں ہی میں ہو، اور ان مدرسوں میں پیداواری مشغلوں اور سماجی کاموں کو کھیل کود اور تماشے کے طور پر نہیں بلکہ اس نیت سے اپنایا جائے کہ وہ نئے سماج کی زندگی کے ضروری اجزا ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کے لئے صرف ایک ہی قسم کے مدرسے ہونے چاہئیں، یعنی بنیادی مدرسے اس عمر کے بچوں کے لئے، ان کا تعلق چاہے کسی طبقے سے ہو کسی اور قسم کے مدرسے نہیں ہونے چاہئیں۔

"آتشِ گُل" کے اشعار آئینۂ ایّام میں

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

شخصیت کسی خلا میں تشکیل نہیں پاتی بلکہ حالات وحادثات، واقعات ومعاملات کے آئینے میں اُبھرا کرتی ہے۔ ہمارے مَن اور تَن کی دنیا کا اپنے ماحول کے ساتھ کچھ انوکھا سمجھوتہ ہو جاتا ہے، ایسا سمجھوتہ جس کی کوئی نظیر نہیں ہوا کرتی اور جو ہمارے مخصوص نظریۂ حیات کا غماز ہوتا ہے۔ جگر نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

اپنی اپنی وسعتِ فکر و یقیں کی بات ہے　　جس نے جو عالم بنا ڈالا، اُسی کا ہو گیا

اُن کی اپنی 'وسعتِ فکر و یقیں' کے دو نمایاں دَور آئے۔ ایک وہ زمانہ جب اُن کی نگاہیں 'شعلۂ طور' سے خیرہ تھیں۔ وہ محض ایک 'شاہد در بغل' توبہ شکن مے کش' تھے۔ اور دوسرا وہ عہد جب 'آتشِ گل' کی تپش اُن کے سوز دروں نے بڑی شدت سے محسوس کی۔ انھوں نے اپنے ماضی کو 'خدا حافظ' کہا اور اُن کی چشمِ بصیرت نے انھیں ایک نئے عالم سے باخبر کیا۔ گرد و پیش کے حالات اس شاعرِ رنگیں نوا سے کچھ تقاضے کرنے لگے، اور وہ کارزارِ حیات میں حُدا خوانی کرتا ہوا چل پڑا۔ ع

مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمتِ دار و رسن ساقی

جگر اب رمز شناسِ حیات بن چکے تھے۔ انھیں اپنی اس قلبِ ماہیت کا خود بھی بخوبی احساس تھا۔ ع　　پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب

انھیں اپنی حیثیت کا بھی احساس ہو گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ میں منجملۂ خاصانِ میخانہ ہوں اور:

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں　　مری فکر میں کہیں اے جگر ادب کثیف کی جا نہیں

ان کے نزدیک سیاست کارگہِ مکر و ضلالات تھی۔ لیکن ہر ایک باہوش شہری اپنے دیس کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات سے متاثر ہوا کرتا ہے۔ جگر کی ذات پر بھی وطن کے حالات کا اثر پڑا۔ اگرچہ انھوں نے

محدود و مخصوص اصطلاح میں سیاسی شاعری نہیں کی۔ وہ کسی سیاسی جماعت یا سماجی اور معاشی نظام کے نقیب بن کر سامنے نہیں آئے لیکن اُن کے کلام میں ماحول کا عکس نمایاں ہے۔ ان کا دل، ایک صاحبِ نظر اور مخلص وطن پرست کا دل ہے۔ ایک پاک طینت اور صاف باطن فرد کا دل ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہوا ہے۔ اسی لئے "آتشِ گل" کے اشعار میں جو دراصل ان کی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کی بہار ہیں ہمیں ان کے دور کی پوری آئینہ داری ملتی ہے۔

بدیسی سامراج کے زمانے میں دنیا کی مادی ترقی کی کچھ بھیک ہمارے نصیب میں بھی آئی۔ کوتاہ بینوں اور نفس پرستوں کو اس میں آقا کی فراخ دلی، دکھائی دی اور کچھ سادہ لوح صورتِ حال پر قناعت گزیں ہو کر روزمرہ کی زندگی میں رنگ دیو، تلاش کرنے لگے۔ جگر نے اپنائے وطن کی رگِ حمیت کو ٹٹولا:

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا — نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا
کرم صیاد کے صدہا ہیں پھر بھی — فراغِ خاطرِ اہلِ قفس کیا
قفس سے ہے اگر بیزار بلبل — تو پھر یہ شغلِ تزئینِ قفس کیا

آپ نے دیکھا کہ آزادی یا غلامی پر نہ تو کوئی فلسفیانہ بحث ہے اور نہ بندھے ٹکے الفاظ میں "نعرۂ انقلاب" یہاں کسی چوبدار کی بے کیف تکرار یا فوجی افسر کی بلند آہنگی بھی نہیں۔ اور وقتی طور پر جذبات مشتعل کرنے کا کوئی سامان بھی نہیں کیا گیا ہے تاہم ذہن کو بیدار کرنے اور دل گرمانے کے لئے بہت کچھ موجود ہے۔

اسی اثناء میں ملک کے اندر بیداری بڑھی اور غیر ملکی نظام پر بوکھلاہٹ کا عالم طاری ہونے لگا۔ جگر نے صورتِ حال سمجھی اور بڑے معصومانہ انداز میں چوٹ کی:

اسی اک جُرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے — کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

مگر ان کا حقیقت شناس دل جانتا تھا کہ اصل حالات اغیار کی اس گھبراہٹ کے متقاضی نہیں ہیں وطنِ پاک بے دست و پا ہے۔ لہٰذا احباب کو حقیقت کا احساس بھی دلاتے ہیں اور اغیار کی حالت پر طنز بھی کر جاتے ہیں:

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں — اِک لغزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

انگریزوں نے دوسری جنگِ عظیم میں جیت کے باوجود اپنے آپ کو گھاٹے میں پایا۔ اب فضائے عالم میں سلطانیٔ جمہور کا غوغا بلند تھا۔ ہندوستان کی سرزمین سے بھی اُسے اپنا آب و دانا اٹھتا دکھائی دیا۔ طیش میں آکر نفاق کا بیج جسے وہ لایا تھا اور برسوں کی آبیاری برابر کرتا چلا آرہا تھا اپنے الوداعی تحفے کے طور پر گھر گھر بانٹنے لگا۔ پھر جو کچھ ہوا ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ عروسِ آزادی سے ہم کنار ہونے کے لئے بھائی سے بھائی دست و گریباں ہو گیا اور وہ بھی اس طرح کہ قبائے انسانیت تک چاک کر ڈالی۔ جگر کا حساس دل بالکل بجھ گیا:

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں — خالی ہے شیشہ اور پئے جا رہا ہوں میں
وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجئے — مجبوریاں ہیں ساتھ دئیے جا رہا ہوں میں

ایسے میں ان کے پیغامِ محبت و مروت کا سننے والا کون تھا۔ مذہب کے نام پر سیاسی صف بندی تھی۔ لہٰذا اس آزادی کی بے اثری اور حالات کی ابتری پر کڑھ کر رہ گئے۔

ماحول ہوش رُبا ہو گیا، مرا نغمہ روح فزا ہو کیوں — کہ چمن میں پھول تو ہیں وہی مگر ان میں بوئے وفا نہیں

یہ ایک شعر نہیں بلکہ اس غزل (۲۹) کے بیشتر اشعار یہی کیفیت لئے ہوئے ہیں۔ اگلی غزل (۳۲) میں ماحول کی تلخی کا اور بھی صاف صاف اظہار موجود ہے۔ پوری سترہ اشعار کی یہ غزل اس وقت کے حالات اور ان سے پیدا شدہ جگر کے جذبات کا ایک سچا مرقع ہے۔ ہر ایک شعر، خون آلود نشتر ہے جو قلب کی گہرائیوں سے گزر کر آیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جگرِ مجروح تڑپ رہا ہے۔ شدتِ احساس و خلوص نے اسے پاش پاش کر دیا ہے:

خلوصِ شوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن — یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

کبھی یہ علیل سی فضائیں یہ مریض سا زمانہ، کہہ کر خود کو بہلایا جاتا اور کبھی اپنی ہی ذات سے بشانِ خود فریبی سوال ہوتا:

تجھے اے جگر ہوا کیا کہ بہت دنوں سے پیارے — نہ بیانِ عشق و مستی، نہ حدیثِ دلبرانہ

ایسا لگتا ہے کہ نئے سیاسی حالات نے اُن کے جسم سے جان ہی نکال لی ہو۔ وہ دیکھتے ہیں کہ رنگِ زمانہ کیسا بدل گیا۔ بظاہر وہی صورتیں ہیں لیکن دلوں میں کیسا تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ ایسے حادثاتِ زمانہ، ان سے لذتِ حیات ہی چھینے لیتے ہیں۔ غزل (۵۵) کے قریب قریب سب ہی اشعار سے یہ بات

واضح ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ کہہ پڑتے ہیں :

وہی ہے زندگی لیکن جگرؔ یہ حال ہے اپنا کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

وطن کے حالات نے انھیں بے وطن سا محسوس کرایا۔ اس سانحے کی شدت برداشت نہ ہوسکی۔ بس پکار اٹھے :

معاذ اللہ اس کی واردات غم معاذ اللہ چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے

فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے مظاہرے بڑے جاں سوز تھے۔ جگرؔ نے گردشِ فلک کی شکایت ہی نہیں کی بلکہ اپنا دل چیر کے رکھ دیا :

آ پڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایام سے زندگی شرمارہی ہے زندگی کے نام سے
آج کل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگرؔ زہر کے ساغر شرابِ زندگی کے نام سے

اس گندے ماحول میں ان کے لئے سانس لینا دوبھر تھا۔ آزادی کے نام پر یہ بربادی دیکھی نہ جاتی تھی مگر بے بس لاچار تھے۔ بس یہی کہہ سکتے تھے :

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

اس تاراجیٔ وطن میں بلاشبہ سب سے بڑا ہاتھ فرقہ وارانہ فسادات کا تھا۔ اور یہی وہ پستی تھی جس کو جگرؔ کی عالی ظرفی کسی طور پر برداشت نہ کرسکتی تھی۔ ان کی اس بے زاری اور مایوسی کے ذمہ دار یہی ناگفتہ بہ واقعات ہیں۔ انھیں اس فرقہ واریت کے جنون میں نہ ایک فرقے کی جیت نظر آئی اور نہ دوسرے کی بھلائی دکھائی دی۔ وہ جانتے تھے کہ دونوں کی ہار ہے۔ لہٰذا زبان سے بے ساختہ طور پر نکل ہی گیا :

اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم جو صید کا عالم، وہی صیاد کا عالم

ذرا سنبھلے تو خونِ ناحق پر نظر پڑی اور ان کی صوفی منشی پکار اٹھی :

منصور تو سر دے کے سبک ہوگیا لیکن جلاد سے پوچھے کوئی جلاد کا عالم

لیکن ان کی بات سننے والا کون تھا! سب ہی بے راہ روی کا شکار تھے، انھیں دراصل افراد کی تباہی کا غم نہیں تھا بلکہ اس خلفشار میں بربادیٔ چمن کا نقشہ صاف نظر آرہا تھا۔ انھیں ساری سرزمینِ چمن ہی گریہ کناں نظر آرہی تھی۔ اس کرب نے بے چین کر رکھا تھا :

ارباب چمن سے نہیں پوچھو یہ چمن سے   کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم

مگر اس عالمِ آہ و بکا میں جگر خستہ تن کی آواز کون سنتا۔ آزادی کے تصور نے سرشار کرنے کے بجائے بدمست کر دیا تھا۔ فرقہ واریت کا عفریت دیس کے نواسیوں کو ذاتوں میں بانٹ کر ان کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جن ہاتھوں کو سرپرستی کرنی چاہیئے تھی وہ بھی زبردست کے طرفدار دکھائی دینے لگے۔ یہ صورت، ناقابلِ برداشت تھی۔ بظاہر مصلحت اندیشی بھی اس شاعرِ خوش گفتار کو نہ روک سکی۔ خلوصِ نیت اور جذبۂ صداقت پکار اٹھا:

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں   جگر ہم ممبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

اور اسی احساس کے تحت انھوں نے یہ بھی کہا:

کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام   پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

صرف یہ ایک شعر نہیں بلکہ اس سلسلے کے تمام اشعار اس وقت کے حالات کے سچے مرقعے ہیں اور جگر کے دردِ نہاں کا مظہر۔ انھوں نے لوگوں کے وحشی پن اور درندگی کو دیکھا تو کہا۔ ایک بار نہیں بلکہ بار بار:

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر   ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

ہر چند کائناتِ دو عالم ہیں اے جگر   انساں ہی ایک چیز ہے، انساں مگر کہاں

آدمی کو آدمی سے بُعد، وہ بھی کس قدر   زندگی کو زندگی کا رازداں سمجھا تھا میں

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر   آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

انھیں یہ زندگی قطعی گوارا نہ تھی۔ وہ موت کو ترجیح دے رہے تھے:

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی   کہ انساں، عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

بعض اوقات کسی ایک حادثے کا اثر ان کے ذہن پر اتنا گہرا پڑا کہ وہ صاف صاف کہے بغیر نہ رہ سکے:

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر   چھپرا کی قتل گاہ کا منظر لئے ہوئے

ملک کے ان حالات سے اُکتا کر آجکل ہیں وہ قطعی بے روک ہو گئے۔ زخم جگر کھول کر رکھ دے ہیں:

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل   شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

بزمِ خیال، جنّتِ ویراں ہے آج کل ساز حیات، سازِ شکستہ ہے ان دنوں

یہ پہلے دو شعر نہیں بلکہ باقی تیئیس اشعار بھی اس وقت کے حالات کے اسی طرح مرثیہ خواں ہیں۔ جگر کے حسّاس دل نے ماحول کی ہر ایک تلخی کو محسوس کیا۔ مخلص رہبرانِ قوم کی بے بسی کو بھی سمجھا، قومیت کے نام پر شیطنت کا غلبہ بھی دیکھا اور کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گُل و ثمر والا اہتمام گلستاں بھی آباواجداد سے جو مقدس ترکہ اردو زبان کی شکل میں ملا تھا، اسے بھی تنگ نظری کا شکار پایا۔ دل کی اذیت نے طنز کی شکل اختیار کرلی:

اردو زباں پر خاص کر احساں ہے آجکل ہونے کو یوں تو روز نئی ہیں عنائیتیں

ان ابتر شب و روز کے باوجود اربابِ حل وعقد خاموش نظر آئے۔ کچھ کے نزدیک یہ خاموشی مصلحت وقت کا تقاضا بنی ہوئی تھی۔ جگر کے لئے یہ تاویل نمک پاشی کے مصداق تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شائستگی کے بھیس میں روح درندگی رواں دواں ہے، ایسے آڑے وقت پر بھی اگر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہا جائے، تو وہ زندگی کیا!

وہ مصلحت جو پیشۂ مرداں ہے آج کل اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر

پھر ایک منحوس گھڑی آئی، جبکہ گاندھی جی کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ جگر نے گاندھی جی کی یاد میں، جس خلوص عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔ بالخصوص جب ہم اس وقت کے حالات کے پیش نظر جگر کا یہ خراج عقیدت پڑھیں تو بین السطور بہت کچھ نظر آئے گا۔ انھیں قومی زندگی میں بہتیرے ایسے افراد نظر آئے، جو گاندھی جی کا نام زبان پر من کے اندر چور رکھتے تھے۔ 'آوازیں' دراصل جگر کی اپنی آوازیں ہیں جنھیں ندائے وقت سمجھنا چاہیئے۔ یہاں پر انھوں نے صاف طور پر پکار کر کہا:

چمن میں آسکتی ہو پلٹ کر، چمن کی روٹھی بہار اب بھی چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
نچوڑتا ہی لہو غریبوں کا دستِ سرمایہ دار اب بھی کوئی یہ چپکے سے ان کو پوچھے کہاں گئے آپ کے وہ دعوے

انھوں نے صرف رہبرانِ قوم کو ہی متوجہ نہیں کیا بلکہ اہلِ وطن سے بھی کہا:

مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی اگرچہ آزادئ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل
کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمیں ہے لالہ زار اب بھی اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ دیس کے کج فہم اور خود غرض لوگوں کے طرز عمل سے پوری ایک جماعت کی باعث

ہراساں اور پریشان تھی۔ نہ حال کا اطمینان تھا اور مستقبل میں امید کی کوئی کرن جھلملاتی دکھائی دیتی تھی۔ تعصب اور جذبات کا غلبہ تھا۔ اس وقت بہت سے لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا دکھائی دیتا تھا مگر ان کا یہ حالِ تباہ بھی تنگ نظر اہلِ وطن کی نظروں میں خار تھا۔ لہذا جگرؔ نے کہا:

ہمیں ملا کر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک — ہماری لحد کے ذرّے ہیں ان کے دامن پہ بار اب بھی

اس نظم میں جس کا عنوان "آوازیں" ہے، انھوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے اگر گوشِ نصیحت نیوش ہو۔ پھر یکایک انھیں خیال آیا کہ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ وہ بالکل مایوس ہیں۔ اس لئے یاد دلایا:

کبھی کبھی غور کرتے رہیئے جگرؔ کا مصرع یہ پڑھتے رہیے — چمن میں آسکتی ہو پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

اور تنگ ظرفیٔ زمانہ کے خیال سے اپنی نیت کا بھی اعلان کیا۔ لیکن پورے وقار کے ساتھ:

جگرؔ کی ہر زندگی محبت، نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت — جگرؔ کے دل میں ہو سب کی عزت جگرؔ ہو بار دوش بار اب بھی

ان کی نظم 'نوائے وقت' در اصل نوائے وقت ہے:

اٹھو اٹھو! کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے — بڑھو بڑھو! کہ چار سُو پکار ہی پکار ہے

وہ وقت ہے کہ علم حق ہی علم شیطنت میں گم — وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کہاں کے مطرب و غزل کہاں کے شاہد و چمن — کہ زندگی تمام تر بساطِ کارزار ہے

اور یہ تک کہنے پر مجبور ہو گئے:

کھلا بابِ زنداں تو کیا اس سے حاصل — کہ خود زندگی بن گئی قید خانہ

جگرؔ کی اس مایوسی نے جو فسادات اور آزادی سے کچھ قبل اور کچھ بعد کے حالات کی بنا پر پیدا ہوئی تھی کہیں کہیں طنز کی شکل بھی اختیار کر لی جب بھی انھیں جھنجھلاہٹ ہوئی، ان کا لہجہ تند و تیز ہو گیا۔ اکتاہٹ، پریشانی اور بے بسی نے طبیعت میں جو تناؤ اور کھنچاؤ پیدا کیا، اسے کم کرنے کی یہی راہ ملی۔ مثلاً نویدِ آزادی کے ساتھ ساتھ ابتری بڑھی، گھٹی نہیں۔ عوام میں بے چینی پھیلی۔ کچھ دلِ ناصبور اپنے محبانِ وطن کو ہی موردِ الزام قرار دینے لگے۔ جگرؔ کی طبع نازک پر یہ تنگ ظرفی بہت گراں گزری۔ وہ بس جھلّا گئے:

گلشن کی تباہی پر کیوں رنج کرے کوئی — الزام جو آنا تھا، دیوانوں کے سر آیا

ہمارے دیس کو کچھ بڑے ممالک کی اعانت درکار ہوئی۔ جگر کی غیور طبیعت کو ٹھیس لگی۔ ذرا تیور ملاحظہ فرمایئے:

کم نہ ہوئیں ان سے بھی کچھ ظلمتیں　　　ربط بڑھایا تھا ستاروں کے ساتھ

اس پُرآشوب زمانے میں جھوٹی تسلیاں دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ بہت سے اربابِ اقتدار صرف 'گندم نمائی' پر اکتفا کیے ہوئے تھے۔ جگر نے ان واعظانِ قوم کو براہِ راست مخاطب کیا:

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے، مانی نہیں جاتی

یہ بات تو انھوں نے ان ... کی طرح کہی جو ... فی زمانہ کا شکار ہو رہے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی سطحی اور وقتی آسودگی سے مطمئن ہو کر، ان کی ذاتی حالت پر ترس کھاتے ہوئے ملے۔ جگر ان احبابِ کم نظر کی نادانی پر کیسے ضبط کرتے۔ بہ عنوان شائستہ کہہ ہی دیا:

بہ غور اپنی جانب بھی اے کاش دیکھیں　　　مرے حال پر رحم فرمانے والے

انھوں نے لوگوں کے قول و فعل میں تضاد پایا تو اس اخلاقی پستی پر کُڑھے۔ ان میں بہت سا کابر بھی شامل تھے۔ اب کیا کہتے، دل کے پھپھولے، دعا بن کے نکلے:

خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے　　　وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے

انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ اہلِ وطن جامِ آزادی سے سرشار ہوئے بغیر ہی بہکنے لگے۔ اس تنگ ظرفی پر انھیں ملال بھی ہوا اور مستقبل کی طرف سے اندیشہ بھی۔ یہ کہہ کر اپنی خلش مٹائی اور دوسروں کو ٹوکا:

نہ تابِ مستی، نہ ہوشِ ہستی کہ شکرِ نعمت ادا کریں گے
خزاں میں جب ہے یہ اپنا عالم، بہار آئی تو کیا کریں گے

مذہب کے نام پر بہت سے لوگ زمانے کے ہاتھوں کچھ ایسے ستائے گئے کہ ہمت ہی پست ہو گئی۔ انھوں نے فرقہ پرستی کو اپنی بدحالی کا ذمہ دار سمجھا اور کسی کے پاس جانے کی جرأت ختم کر بیٹھے۔ جگر کو اس رویے میں جوہرِ ذاتی کی توہین نظر آئی۔ اور انھوں نے پھر ٹوکا:

یہ ظلم کارانِ عشق سوچیں، یہ شکوہ سنجانِ حُسن سمجھیں　　　کہ زندگی خود حسین نہ ہوگی تو پھر توجہ وہ کیا کریں گے

جب رقصِ ابلیس ہر چہار طرف نظر آیا تو زبان سے نکلا :

حسن و صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے اُف کہ انسان ہیں ملے ہوئے انسانوں کے

ایسے حالات میں 'عظمتِ رفتہ' کا دھیان آیا تو کچھ 'مسدس حالی' والی کیفیت طاری ہو گئی :

اسی کشتی کو نہیں تابِ تلاطم صد حیف
جس نے منہ پھیر دئے تھے کبھی طوفانوں کے

بہت سے اہلِ وطن 'نازِ بے جا' میں مبتلا نظر آئے۔ اپنے آپ کو بزعمِ خود 'باعثِ رونقِ گلستاں' سمجھنے والوں کی کمی نہ تھی۔ جگر کو ان اوچھی طبیعتوں کے قرینے گراں گزرنا لازمی تھے۔ خودداری مانع تھی کہ اپنے منہ سے اپنی تعریف کی جائے مگر یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ حبِ وطن میں ہم کسی سے پیچھے نہیں، صرف اپنی ہی طرف سے بالکل شخصی طور پر نہیں بلکہ وطنِ عزیز کی ایک قابلِ لحاظ آبادی کی طرف سے :

پھولوں کو نازِ حسن اگر ہے تو ہو جگر کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لئے ہوئے

فسادات میں جس طرح انسانی اقدار ملیامیٹ ہوئیں ان کی چبھن کا اندازہ تو ہم کر چکے ہیں لیکن جب یہ احساس طنزیہ شکل اختیار کر لیتا ہے تو کچھ اور دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً :

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

رہبرانِ قوم میں کچھ ایسے بھی نظر آئے جو رہزن کہلانے کے مستحق تھے۔ جگر کو طیش آیا۔ بددعا نکلی :

یہ شکل ناخدا جس میں ہی اب تک جعفر و صادق
وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

لیکن جگر نے طنز پر تکیہ نہیں کیا اور نہ مایوسی میں آسودگی تلاش کی۔ یہ محض وقتی احساسات بن کر ان کی شاعری میں نمودار ہوئے۔ دراصل ان کا میلانِ طبع اثباتی تھا۔ اور وہ بڑے حق بیں تھے۔ یہی ان کی عالی ظرفی اور بلندئی کردار کی علامت ہے۔ انھوں نے یاس کے تیز جھونکوں کے دوران میں بھی نہ امید کا دامن چھوڑا اور نہ صداقت سے منہ موڑا۔ وہ حق گو بھی رہے اور حقیقت پسند بھی۔ انھوں نے بربریت کے مظاہرے دیکھے لیکن شعاعِ امید

سے اپنے چشم ودل کو روشن رکھا۔ فسادات کے اس تاریک دور میں بھی ان کی آنکھیں کھلی رہیں۔ حیوانیت کی چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ، انس ومحبت کے پیکر بھی وہ دیکھ سکے اور انھوں نے نہ صرف اپنی ڈھارس بندھائی بلکہ اوروں کو بھی یہ مژدہ سنایا:

میں نے انھیں تاریک فضاؤں میں بھی اکثر دیکھے ہیں برستے ہوئے انوارِ محبت

اور تلقین کی:

خلوصِ عشق ویقینِ حیات کے ہمراہ جنونِ شوق وفسونِ نگاہ پیدا کر
یہی زمیں ترا مسکن، یہی ترا مدفن اسی زمیں سے تو مہر وماہ پیدا کر

ان کا حقیقت شناس دل، آزادی کے نام سے مطمئن ہونے والا نہ تھا۔ انھوں نے اہلِ وطن کو مختلف قیود میں جکڑا ہوا دیکھ کر انھیں اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا، اپنا فرض سمجھا:

قفس توڑ کر مطمئن ہو نہ بلبل قفس صورتِ آشیاں اور بھی ہیں

انھوں نے اپنے مزاج کو حرماں نصیب نہ ہونے دیا اور برابر اپنے آپ کو سمجھاتے رہے:

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہیں

جب انسانوں نے درندوں کو مات کر دیا، اس وقت بھی انسان کے خلق انس پر ان کا ایمان باقی رہا:

وہی ہے روحِ محبت، وہی ہے جسمِ وفا بدلتا رہتا ہے لیکن مذاقِ پیراہن

صدق دلی کا یہ عالم ہے کہ اپنی ذرا سی چوک بھی گوارا نہیں۔ خراب حالات نے بد دل بنایا تھا جب حالات بدلتے دیکھے تو فوراً اعتراف کیا:

عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں جنھیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

حق گوئی میں کسی وقت بھی تکلف سے سروکار نہیں رکھا۔ اگر حالات کی سختی نے 'بھاگ مسافر میرے وطن سے، میرے چمن سے'، کہلوانے پر مجبور کیا تو اسی کے ساتھ ساتھ وطن مالوف کی محبت عناں گیر بھی رہی:

کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

بربادی اور تباہی کے عالم میں ہر چند مایوسی نے کمندیں ڈالیں لیکن وہ نکل ہی بھاگے۔ ان کی روشن ضمیری

ہمیشہ کام آئی اور وہ عارفانہ شان سے کہتے ہوئے ملے:

یہ صحن و روش، یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں
منڈلائے ہوئے جب ہر جانب طوفاں ہی طوفاں ہوتے ہیں
دیوانے کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں

ان کو یوں تو یقینِ کامل تھا کہ شہیدانِ وطن کا خون رائیگاں نہ جائے گا لیکن ان کا دلِ حق نگر یہ بھی کہتا تھا کہ اگر اس خون سے تعمیرِ وطن ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا:

یہ خون جو ہے مظلوموں کا، ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

انھوں نے اپنی ہمت بھی خود بندھائی اور دوسروں کا حوصلہ بھی بڑھایا:

جو طوفانوں میں پلتے رہے ہیں — وہی دنیا بدلتے رہے ہیں
نکھرتا آ رہا ہے رنگِ گلشن — خس و خاشاک جلتے رہے ہیں
چراغِ دیر و کعبہ اللہ اللہ — ہوا کی زد پہ جلتے رہے ہیں

کبھی مذاق مذاق میں پتے کی بات کہہ کر مایوس ہونے سے بچانے کی کوشش کی:

یہ فتنے جن سے اک دنیا ہے نالاں — انھی سے گرمیٔ بازار بھی ہے
مگر ان حادثات سے گھبرا نہ جانا — یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ

اور اسی مطمحِ نظر کے تحت اپنی زندگی کے مقصد کی وضاحت کی:

مرا تو فرض چمن بندیٔ جہاں ہے فقط — مری بلا سے بہار آئے یا خزاں گزرے

'نوائے وقت' میں ماحول کی پستی کا ذکر کرنے کے بعد بھی یہی کہا:

زمیں کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے — بڑھے چلو، بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے

'اعلانِ جمہوریت'، تو عنوان ہی صاف بتا رہا ہے کہ میں کیا ہوں۔ یہاں پر انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اربابِ اقتدار اور ابنائے وطن کی خدمت میں چند گذارشات پیش کی ہیں۔ انھیں اپنے

منصب سے آگاہ کیا ہے اور جمہوریت کے تقاضوں کی طرف رجوع کرایا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے اور بھی ضروری تھا کہ حالات دگرگوں تھے:

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں — کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے
یہ میکدے کی، یہ ساقی گری کی ہے توہین — کوئی ہو جام بکف، کوئی شرمسار آئے

لہذا جتایا:

خلوص و ہمتِ اہلِ چمن پہ ہے موقوف — کہ شاخِ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے
نہ ہو عام مسرت، محال ہے اے دوست — کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

اور ان کا یہ ایمان رہا:

نمودِ صبح کاذب ہی دلیلِ صبح صادق ہے
افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

حق گوئی ان کا شعار تھا۔ اس وقت کے سیاسی حالات کے پس منظر میں یہ شعر پڑھئے:

اس جہد و طلب کی دنیا میں کیا کارِ نمایاں ہوتے ہیں
ہم صرف شکایت کرتے ہیں، وہ صرف پشیماں ہوتے ہیں

دنیا کے حالات پر جب ان کی نظر گئی تو سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود انھیں انسان کی اخلاقی پستی نظر آئی۔ ایک طرف آسائش و آرام کا سامان فراہم ہوتے دیکھا تو دوسری طرف مہلک ہتھیاروں کی تیاریاں بھی نظر آئیں۔ فوراً زبان سے نکلا:

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مگر — دل میں اگر نہیں ہے تو کہیں روشنی نہیں

جب انسان کو فضا اور خلا کی پرواز کے لئے آمادہ پایا تو کہا:

لعن کیا کیا نہ فرشتوں نے کیسے تھے جس پر
عرش پیما ہے وہی خاک کا پتلا ہو کر

دنیا کے مدبرین کو جب جنگ و جدل کے منصوبے باندھتے دیکھا تو اظہارِ تاسف کیا:

عمریں بیتیں، صدیاں گزریں — ہے وہی اب تک عقل کا بچپن

انھوں نے دیکھا کہ دیس کی نعمتیں سب کے لئے نہیں ہیں کوئی نادار ہے اور کوئی مالدار، تو زبان سے نکلا:

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن   لیکن اپنا اپنا دامن

فرداً کی نااہلی نے شمع آزادی کی لو بہت دھیمی کر رکھی تھی۔ ان کی صاف گو، اور حق گو طبیعت بغیر کہے نہ مانی:

کام ادھورا اور آزادی   نام بڑے اور تھوڑے درشن

شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی   سایہ ہے لیکن روشن روشن

لیکن اظہار حقیقت سے انھیں آسودگی نہیں ہوتی۔ وہ انکشاف بھی کرتے ہیں اور اپنی بالغ نظری کا گلہ بھی:

وسعتِ فکر و نظر بھی نہ مجھے راس آئی   ہر تبسم پہ جراحت کا گماں ہوتا ہے

سازِ مطرب کے کرشموں پہ نہ جانا کہ یہاں   اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

آخر کار اس وقت کے معاملات اس حقیقت کو سامنے لے آتے ہیں:

کارگہِ حیات میں اے دوست   یہ حقیقت مجھے نظر آئی

ہر اُجالے میں تیرگی دیکھی   ہر اندھیرے میں روشنی پائی

قحط بنگال نے ہر ایک حساس طبیعت کو جھنجھوڑا۔ جگر کا دل بھی خون ہوا۔ جو لکھا، انسانی ہمدردی میں لکھا اور ان کی دُور رس نگاہوں نے ان حالات کا انجام بھی بھانپ لیا۔ اس ناگہانی افتاد کی اوٹ میں انھیں سامراجی نظام کا تختہ اُلٹتا نظر آیا:

اربابِ وطن کو میری جانب سے یہ مژدہ   اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں

ان کی حق گوئی و حق شناسی "ساقی سے خطاب" میں پوری فن کاری کے ساتھ نمایاں ہے۔ ہر شعر ایک حقیقت ہے، اعلان ہے۔ اس سائنسی دَور کی عظمتوں کے باوجود عالمِ انسانی میں جو انتشار پھیلا ہوا ہے، اس سے اپنی بات کا آغاز کرتے ہیں:

وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا   وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباسِ حریت کے اُڑ رہے ہیں ہر طرف پُرزے   بساطِ آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی

کہیں خود حُسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر   کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

اپنے معاشرے کی پست حالت کو بسا اوقات انھوں نے بے کم و کاست یونہی شعر کے قالب میں پیش کردیا ہے:

شرافت کا معیار، افراطِ دولت	صداقت کی معراج، لفظی ترانہ
زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے	مگر طبیعتیں بیشتر مفسدانہ

جگر کی اس تمام حق شناسی و حق گوئی میں اُن کی خود اعتمادی کو بڑا دخل تھا۔ انھیں ہر حال میں اپنی ذات پر بھروسہ رہا اور خودی کی تذلیل کبھی گوارا نہ کی۔ وہ رہینِ منّت ہو کر زندگی گزارنا نہیں چاہتے تھے اگرچہ حوادثِ زمانہ کے تقاضے کچھ ایسے ہی تھے۔ جب اپنے گرد و پیش دیکھتے تو قدم ڈگمگانے لگتے۔ اسی لئے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کی خاطر اور دوسروں کے لئے مثال قائم کرنے کی غرض سے برابر اقدار کی بات کرتے۔ جگہ بہ جگہ ان کے کلام میں یہ تاثر موجود ہے مثلاً

جان فدا اس پہ کہ جس نے جگر	زیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ
وہ ہمیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے	گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

ہم کو مٹا سکے، یہ زمانے میں دم نہیں	ہم سے زمانہ خود ہے، زمانے سے ہم نہیں
میری زباں پہ شکوۂ اہلِ ستم نہیں	مجھ کو جگا دیا، یہی احسان کم نہیں
پھول بسر کرتے ہیں خاروں کے ساتھ	کھیلتے ہیں ہم بھی شراروں کے ساتھ
زندگی ہے نام جہد و جنگ کا	موت کیا ہے؟ بھول جانا چاہیئے

تو بہ زمانہ بساز، کی بات سنی تو پھر اپنے مسلک کی وضاحت کی:

ہر ایک غم کو فروغ دے کر یہاں تک آراستہ کریں گے	وہی جو رہتے ہیں دور ہم سے، خود اپنی آغوش وا کریں گے
جدھر سے گزریں گے سرفروشانہ کارنامے سنا کریں گے	وہ اپنے دل کو ہزار روکیں، مری ہمت کو کیا کریں گے
ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں، ہم اپنی کیوں وضع خاص لیں	کہ انقلاباتِ نو بہ نو تو ہوا کئے ہیں، ہوا کریں گے

اس طرح جگرؔ نے ملک کے مظلوم طبقے کی ترجمانی کی۔ صاف صاف بتایا کہ ہمیں اپنی صداقت پر بھروسہ ہے۔ ہم محبت کے بندے ہیں۔ ہم سے اپنی زبان، تہذیب اور روایات ترک کرنے کی بات نہ کرو۔ یہ چھوٹے دل کی باتیں ہیں۔ جگرؔ نے یہ سب کچھ کہا اور پورے اعتماد کے ساتھ کہا اور ساتھ ہی ساتھ احباب کے سامنے ایک نصب العین بھی رکھا۔ اور جتایا کہ تمھارا فرض کیا ہے:

خود اپنے سوزِ باطن سے نکال اک شمع غیب افانی

چراغ دیر و حرم تو اے دل، جلا کریں گے، بجھا کریں گے

جب مہاتما گاندھی کی آواز کو ملک کی ایک بڑی تعداد مجذوب کی بڑ سمجھنے لگی اس وقت جگرؔ کا اپنا ایمان بھی متزلزل ہو گیا، لیکن جلد ہی وہ خود کو ہوش میں لے آئے:

ناز ہے شاہدِ فطرت کو بھی جس پر ہمدم   وہ چمن سب ہیں لگائے ہوئے دیوانوں کے

تغیراتِ زمانہ سے گھبراہٹ ہوئی تو پھر دہرایا:

انقلابات سے کیا خوف کہ ہر عزمِ جگرؔ   اسی آغوش میں پلتا ہے، جواں ہوتا ہے

انھیں اپنے منصب کا بھی پورا احساس رہا۔ اس منحوس دور سے گزرے لیکن اپنی ہستی کو فراموش نہیں کیا۔ آلامِ روزگار کے مارے ہوئے اپنے حرماں نصیب بھائیوں سے پکار کر کہا:

آگے قدم بڑھائیں جنھیں سوجھتا نہیں   روشن چراغِ راہ کیے جا رہا ہوں میں

جن لوگوں نے ان پر اعتبار نہیں کیا اور ان کی عظمت کے قائل نہ ہوئے یا انھیں سمجھ ہی نہ سکے ان سب کو بھی انھوں نے مخاطب کیا اور اپنی شانِ امتیاز بتائی:

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں

ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

جگرؔ نہ رہ جائے بن کے آہ ہوا کا سہ سائل   نہ ایسی شاعری اپنی، نہ ایسی زندگی اپنی

اتنا کہہ کر وہ چپ نہیں ہو گئے بلکہ واضح طور پر انھوں نے رہنمائی بھی کی۔ وہ جانتے تھے کہ گمراہ کن حالات کا سامنا ہے۔ پریشان طبیعتیں اور سہمے ہوئے دل بڑی جلدی بدگمان بھی ہو جاتے ہیں اور مایوس بھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اہلِ غرض اور فتنہ پرور سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں

ایسے وقت میں انھوں نے "گذر جا" میں بازیچہ ارباب سیاست، سے نہ صرف نفرت وبیزاری کا اظہار کیا بلکہ ہر اک گمرہی کی طرف سے متنبہ کیا اور واضح الفاظ میں لائحہ عمل سامنے رکھا۔ ان سب کے لئے جو اُن کی طرح زمانہ کے ہاتھوں بیزار تھے۔

ہر تنگ نظر اہلِ صحافت سے گزر جا   ہر سادہ و پُرکار عبارت سے گزر جا
الفاظ نہیں دام ہیں یہ مکر و دغا کے   ہر سادہ و پُرکار عبارت سے گزر جا

اس پوری نظم میں اس وقت کے پیش نظر لطیف اشاروں میں نہ صرف بے راہ روی سے بچنے کو کہا ہے بلکہ راہ راست پر گامزن ہونے کی تلقین بھی کی ہے:

سر تا بقدم پیکرِ ایثار و عمل بن   مرحلۂ شکر و شکایت سے گذر جا

پھر ایک وقت وہ آیا جب انھوں نے وطن کو راہِ راست پر گامزن دیکھا۔ اس وقت بڑی سادگی اور نیک نفسی سے رہبرانِ قوم کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا:

سعیٔ مآلِ فکر و نظر دیکھتا ہوں میں   منزل رواں دواں ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

جگر کے اس اثباتی میلانِ طبع اور خود اعتمادی کا راز، ان کی حب الوطنی میں پنہاں ہے۔ وہ اپنے وطن کے سچے پرستار تھے۔ انھیں فرقہ وارانہ فسادات اور اس زمانے کے خراب حالات نے بددل کیا اور جب انھیں ہر طرف بربادیٔ چمن کے سامان نظر آئے اور انھوں نے ہر شے میں کسی شے کی کمی پائی، وہ تلخیٔ دوراں کا بُری طرح شکار ہو گئے۔ مایوسی اور بیزاری طبیعت میں دخل کرنے لگی، لیکن یہ کیفیت ان کا مزاج نہ بن سکی۔ ان کی شخصیت نے حالات کے آگے سپر نہیں ڈالی بلکہ ان کا جوہرِ ذاتی ابھرا انھوں نے دلِ ناداں کو بہر طور سمجھایا اور رادرگیتی کے سچے سپوت ہونے کی بنا پر گمراہ ہونے سے بچ نکلے جب انھیں انسان گھٹتے ہوئے اور سائے بڑھتے ہوئے دکھائی دیئے تو ان کی چشم بصیرت نے اسے فریبِ نظر سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور وہ آخر کار خود کو سمجھانے اور دوسروں کو بتانے میں کامیاب ہوئے:

پھول وہی، چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے   عہدِ بہار میں تھا کیا، دورِ خزاں میں کیا نہیں

مگر انھوں نے دیکھا کہ ان کا یہ جذبہ سادہ لوحی پر محمول کیا گیا۔ ان کے اپنے بھی ان کو نامعاقبت اندیش

مجھ بیٹھے۔ ان اہلِ دنیا کے نزدیک، برے کو برا ہی کہنا مناسب بات تھی اور بد سے اجتناب برتنا ہی عہد داری تصور کیا جا سکتا تھا۔ جگر نے ایسے آڑے وقت میں اپنے آپ کو بھی سمجھایا اور تنقید میں نظروں کا بھی جواب دیا:

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز　　　کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

ساقی سے خطاب، میں ان کا جذبۂ وطنیت ایک والہانہ انداز اختیار کر گیا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں:

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

اور آخر میں وارفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ساقیٔ میخانۂ روحانیت کے حضور میں بس یہی ایک آرزو لئے ہوئے نظر آتے ہیں:

بدہ جامِ مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت
سوادِ ساحلِ گنگا و گلگشتِ چمن ساقی

جگر کی دیدہ وری اپنے وطن کے حالات تک ہی محدود نہیں رہی۔ انھوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات کا بھی جائزہ لیا اور دنیا کے اسبابِ انتشار پر نظر ڈالی۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ساری خرابی کی جڑ، امتیازِ رنگ و نسل اور وطنیت کا محدود تصور ہے۔ ان کی وسعت نظر نے جغرافیائی حدود سے بالاتر ہو کر دیکھنے پر اکسایا اور وہ وطن پرستی سے گزر کر انسان دوستی کی منزل میں اتر آئے۔ اس نقطۂ نظر کا نمایاں اظہار ان کی نظم 'گذر جا' میں موجود ہے:

انسانیتِ عام کے مرکز کی بنا ڈال　　　ہر ناقص و محدود جماعت سے گذر جا
ہے خدمتِ مخلوق ہی نعم البدل اپنا　　　کر خدمتِ مخلوق، تجارت سے گذر جا
تو حسن کے اک دائرۂ کل کی طرف آ　　　ہر جزوی و محدود حقیقت سے گذر جا
انسان بن انسان، یہی ہے تری معراج　　　رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گذر جا

انھوں نے ہر ایک کو اپنی عینک کا پابند پایا اور تعلیم و تربیت کی بھٹی سے حسبِ خواہش اور حسبِ ضرورت سانچوں میں ڈھلے ڈھلائے انسان نکلتے دیکھے۔ اس پابندیٔ حالات و خیالات میں انھیں

اشرف المخلوقات کی سراسر تذلیل نظر آئی:

بشر کی یہ پستی ارے توبہ توبہ — زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ

وہ برابر بلند ہمتی کا درس دیتے رہے۔ حسنِ عمل اور حسنِ یقین کی تلقین کرتے رہے۔ اک جنتِ جاوید پیدا کرنے کے لئے اکسا تے رہے کیونکہ ان کے سامنے زندگی کا واضح تصور موجود تھا:

عشق ہی زندہ و پایندہ حقیقت ہے جگرؔ — عشق کو عام بنا، ذوقِ یقین پیدا کر

یہ جائزہ نا مکمل بھی ہے اور شخصی تصورات کا پابند بھی مگر ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، کیونکہ آتشِ گل کی شاعری میں جگرؔ کی شخصیت کا پرتو اور ماحول کا عکس تلاش کرنا تھا، اس غرض سے اس مجموعے کے متعدد اشعار کو ان کے پس منظر میں بقدر ظرف دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آتشِ گل میں آزادی سے قبل کے تفرقے سے متاثر ہو کر بھی کہا گیا ہے اور آزادی کے بعد رونما ہونے والے انسانیت سوز واقعات بھی جگرؔ کا حساس دل، خونِ جگر سے برابر رقم کرتا چلا گیا ہے۔ کبھی وہ کرب سے چیخ اٹھے اور لہجہ سخت ہو گیا اور کبھی آس کے دامن کی گرفت بالکل ڈھیلی پڑ گئی۔ لیکن ہر بار انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور روشن پہلو کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے آپ کو تازگی بخشی۔ اس رویّے کو اختیار کرنے میں ان کی حب الوطنی بڑی کام آئی، اور ان کی حق شناس نظر بالانجام کار انسان دوستی پر جا کر ٹکیں۔ بس یہی تمام کیفیات آتشِ گل کے اشعار میں جھلکتی ہیں۔ کبھی پس پردہ اور کبھی منظرِ عام پر۔ کہیں اشاروں میں اور کہیں پوری بے تکلفی کے ساتھ۔ کسی وقت زیرِ لب اور کسی وقت بہ بانگِ دہل۔ سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنے بارے میں ذرا بھی غلط نہیں کہا:

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی

"آتشِ گل" اس شعر کی تائید بھی ہے اور جگرؔ کی زندگی کا آئینہ دار بھی۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ شعلۂ طور میں اس جہان کی خبر اس طرح نہ ملے گی۔ انسان یوں تو بذاتِ خود اک محشرِ خیال ہے لیکن اس کی شخصیت اپنے ماحول کے ردِ عمل سے ہی بنتی ہے۔ جگرؔ نے کسی مخصوص سیاسی مسلک یا

نہ عیارانہ نظریئے کے لئے اپنی شاعری کو فرضِ کفایہ کے طور پر پیش نہیں کیا۔ وہ 'ترقی پسندی' افادی
[illegible] اور قومی شاعری، جیسی ٹکسالی اصطلاحات کے رعب میں بھی نہیں آئے۔ اور یہی ان کے جوہر
[illegible] نفسی وجود کا کرشمہ ہے جو انھیں دوسروں سے نہ صرف ممیز کرتا ہے بلکہ ممتاز و نمایاں اور گرانقدر
بھی بنا دیتا ہے۔ 'آتشِ گل' کا خالق، انسان دوستی کا علم بردار ہے۔ وہ حقیقت پسند بھی ہے اور
ترقی پسند بھی۔ تنگ نظری، تعصب اور محدود عقائد کے خلاف جد و جہد بھی کر رہا ہے اور راہِ نیک
کی نشان دہی بھی۔ اس نے اپنے افکار سے اہلِ وطن کو جھنجھوڑا بھی، کبھی نرم لہجے میں، کبھی درشتی سے لیکن
ان کا خلوصِ نیت بہرحال شامل رہا۔ 'آتشِ گل' کی شاعری کے عہد میں ان کی شخصیت کا ایک
نمایاں موڑ آیا۔ وہ 'چیزے دیگر' بن گئے۔ ماحول کے ردِ عمل سے ان کے جوہر کھلے اور ان کی شخصیت
نے جلا پائی۔ اس آب و تاب کے ساتھ انھوں نے یہ سب کچھ کہا اور پوری فنی مہارت کے ساتھ
کہا۔ اس طرح انھوں نے غزل کے پیرہن کو وسعت دی، اس کو کچھ اور حسین بنایا اور پہلے سے زیادہ
کام کی چیز بھی۔ اسی لئے جبکہ اس دور کے بہت سے مقبول و معروف شعراء کا کلام کسی سیاسی جلسے
کی ہنگامہ آرائی کی طرح بہت جلد فراموش کر دیا جائے گا، جگر کی 'آتشِ گل' صاحبانِ دل کو برابر
گرماتی رہے گی۔

بابر نامہ

پروفیسر محمد مجیب

دنیا میں بہت سے مصوّر گزرے ہیں، جنھوں نے اپنی تصویر بنائی ہے اور اس طرح اپنی طبیعت کے وہ رنگ دکھائے ہیں، جو ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ بابر نامہ میں ہمیں ایک شخصیت کی تصویر ملتی ہے، جو وقفوں کے ساتھ قریب چھتیس برس تک کھینچی جاتی رہی۔ بابر نامہ کو جس حیثیت سے دیکھیے ایک شاہ کار ہے۔ اس کی زبان چغتائی ترکی کا نمونہ ہے، اسے بابر نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور اس کا خط اتنا خوب صورت تھا کہ وہ خط بابری کے نام سے مشہور ہوا۔ بابر کی طبیعت ایسی نہیں تھی کہ وہ کسی کام کو روز پابندی کے ساتھ کرتا رہتا۔ روز نامچے کے لحاظ سے بابر نامہ مکمل نہیں ہے، بابر نے اپنی سوانح عمری ۱۴۹۴ء سے شروع کی ہے، جب وہ بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کا بادشاہ ہوا اور غالباً اس کے چند سال بعد سے وہ ایک یادداشت لکھنے لگا، جس کی مدد سے اس نے بعد میں کتاب مرتب کی۔ جو کچھ یادداشت میں نہیں تھا، وہ کتاب میں بھی رہ گیا، لیکن اس سے بابر نامہ کی تاریخ اور ادبی قدر کم نہیں ہوتی، اس کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور ہر ملک اور ہر مذاق کے لوگ اس کی سادگی، صفائی اور بے تکلفی کی تعریف کرتے ہیں۔

اپنے باپ عمر شیخ مرزا کا خاکہ بابر نے اس طرح کھینچا ہے: ٹھگنا قد، چہرے کا رنگ سُرخ، چھوٹی گھنی ڈاڑھی، بدن بھاری، مزاج ذرا چالاک، کپڑے بہت چُست پہنا کرتے تھے۔ چنانچہ بند باندھتے تھے تو پیٹ سکیڑ لیتے تھے، اکثر ایسا ہوتا کہ باندھنے کے بعد بدن چھوڑ دیتے یا سانس لیتے تو بند ٹوٹ جاتے تھے ..... وہ خاصے پڑھے لکھے تھے، خمستین، مثنوی اور تاریخ کی کتابیں ان کی نظر سے نکلی ہوئی تھیں۔ شاہ نامہ کو بہت دیکھا کرتے تھے، اگرچہ موزوں طبیعت تھی، مگر شعر گوئی پر توجہ نہ کرتے تھے.... وہ سخی بھی بہت تھے اور سخاوت ہی جیسی ان کی اور خصلتیں بھی تھیں، خوش مزاج، فصیح

ہر دلعزیز، خوش کلام اور بہادر آدمی تھے.... تیر انداز اوسط درجے کے تھے، گھونسا زبردست مارتے تھے، یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی کو گھونسا ماریں اور گھونسا کھانے والا گر نہ پڑے، ملک گیری کے خیال میں بہت دشمنوں سے پیچ لگ گئی تھی، اور بہت سے لوگ ان سے کھٹک گئے تھے۔ شروع میں بہت شراب پیتے تھے، پھر ہفتہ میں دو ایک مرتبہ مے نوشی کا جلسہ ہونے لگا، خوش صحبت آدمی تھے۔ ایسے موقعوں پر مناسب اشعار پڑھا کرتے تھے۔ آخر میں معجون بہت کھانے لگے تھے۔ معجون کھانے کے بعد مزاج چڑچڑا ہو جاتا تھا۔ رحم دل بہت تھے، ہمیشہ چوسر کھیلتے رہتے، کبھی جوا بھی کھیل لیتے تھے۔"

بابر ایسے باپ کا بیٹا تھا، باپ کے بارے میں اس نے جس طرح سے لکھا ہے اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اپنے بارے میں بھی اس نے بے تکلفی سے، گویا بغیر تیاری کے، جیسے کوئی کسی دوست سے بات کرتا ہے، سب کچھ بیان کر دیا ہوگا۔ اس نے اپنے وطن فرغانہ، سمرقند، کابل، اور ہندوستان کا جغرافیہ خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آدمیوں کا ذکر کرتے ہوئے، اس نے خیال نہیں رکھا ہے کہ ہم انہیں نہ جانتے ہوں گے اور یہ مشکل بھی بہت تھا کہ وہ سینکڑوں آدمیوں اور جھگڑوں کا پورا حال لکھے جن سے اس کو واسطہ پڑا مگر اس کا ہمیں خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ ایسی دنیا تھی، جس میں نہ آدمی کا بھروسہ تھا نہ بات کا، جس کی تقدیر میں بے چینی لکھی ہوئی تھی، جس میں مرد آدمی وہ تھا، جو ہر وقت جان اور مال کو داؤ پر لگائے رکھتا اور بے فکری سے دوستوں کے ساتھ مل بیٹھتا، شعر پڑھتا اور شراب پیتا، غفلت اور بیداری، نشہ اور ہوشیاری کی دھوپ چھاؤں کے خوب مزے لیتا۔ بابر پانی پت کی طرف ابراہیم لودھی سے مقابلے کے لئے بڑھ رہا تھا، سب کچھ ہار جیت پر منحصر تھا اور وہ کسی وقت غافل نہیں ہوا۔ لیکن کسی شوق میں کمی نہیں ہوئی۔ وہ ایک ہی سلسلہ میں لکھتا ہے کہ خواجہ کلاں غزنی سے شراب کے کئی اونٹ لایا تھا، اس کا مکان قریب ہی تھا، وہیں محفل جمی۔ پھر اس علاقے کی کھیتی باڑی کا ذکر آتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مقام خوب صورت ہے، اس کے قریب دو مرغزار ہیں، پہاڑ چھوٹے چھوٹے ہیں، جہاں آبادی ہے، وہاں مور اور بندر بہت ہیں۔ اس کے بعد جنگ کی کارروائیاں بیان ہوتی ہیں، پھر نظر قدرت کے مناظر کی طرف جاتی ہے، ایک جگہ پسند آئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے یہاں ایک

چار باغ بنانے کا حکم دیا۔ پھر ایک لڑائی ہوتی ہے، اس کا حال بیان کر کے وہ لکھتا ہے کہ اسی مقام پر ہمایوں نے اپنی ڈاڑھی منڈائی۔ اس کو آج اٹھارہواں سال ہے اور مجھ کو چھیالیسواں اب وہ سرساوہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہاں ایک چشمہ تھا، جس میں برابر پانی رہتا تھا۔ اس میں سیر کرنے کے لئے ایک کشتی بنائی گئی، جس میں دالان تھا۔ فضا کا لطف اٹھانے اور ہر طرف نظر دوڑانے کے اصل مقصد پر کوئی بڑا اثر نہیں پڑا۔ پانی پت کے میدان میں اسے کامیابی ہوئی دہلی پر قبضہ ہوا، اس کے بعد آگرہ پر۔ مگر اس وقت گرمی بہت بڑھ گئی تھی، آگرہ کے باشندے مغلوں سے ڈر کر بھاگ گئے تھے، اس لئے بابر کے سرداروں اور اس کی فوج کو غلہ اور چارہ کی کمی سے بڑی تکلیف پہنچی۔ اچھے اچھے سرداروں اور سپاہیوں کے جی چھوٹ گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر بابر نے سب کو بلایا اور کہا: "غور کرو، مدتوں کوشش کی، محنت اٹھائی، فوجیں لے کر چڑھائیاں کیں، ہم نے اپنی جان کو اور فوجوں کو لڑائی کی جلتی آگ میں ڈالا۔ خدا نے فضل کیا کہ ایسے ایسے زبردست دشمن زیر کئے، یہ وسیع ملک ہاتھ آیا۔ اس وقت کونسی زبردستی ہے اور کیا دباؤ ہے کہ جس ملک کو اتنی جاں کاہی سے لیا ہے، اسکو یوں ہی چھوڑ کر چلتے بنیں اور تنگ دستی کی بلائیں پہنیں؟ جو میرا دوست ہے وہ بیہودہ باتیں منھ سے نہ نکالے، جس کو ٹھہرنے کی تاب نہ ہو اور جو جانا چاہے بسم اللہ کرے۔"

گویا شمالی ہندوستان پر حملہ کر کے وہاں کی حکومت حاصل کرنا کوئی سیاسی پالیسی نہیں تھی، بس کچھ دوست تھے جو خوشی اور رنج میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہتے تھے اور لڑائیاں صرف اس وجہ سے لڑتے تھے کہ اس کے سوا زندگی گزارنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ تھوڑے دنوں میں حالات اور بدلے، بابر کی بارہ تیرہ ہزار فوج کچھ اور کم ہوگئی۔ ایک طرف رانا سنگرام مقابلے کے لئے تیار ہوا، دوسری طرف پٹھان سرداروں نے جگہ جگہ مخالفت شروع کی، محمد شریف، فوج کے نجومی نے پیشین گوئی کی کہ اس وقت جو لڑے گا وہ نقصان اٹھائے گا۔ کھانوا کی لڑائی سے پہلے معاملہ اتنا نازک ہوگیا تھا کہ بابر کو اپنے گناہ سب یاد آگئے۔ اس نے شراب ساری پھنکوادی، سونے چاندی کے پیالے اور صراحیاں خانقاہوں میں اور غریبوں میں

ختم کرادیں، شیشے کے برتن سب توڑ ڈالے بابر کے ساتھ اس کے تین سو کے قریب سرداروں نے اس کی طرح توبہ کی۔ جب لڑائی ہونے والی تھی تو بابر نے اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو جمع کرکے کہا کہ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا ہے وہ ضرور ایک دن قبر بھی دیکھے گا، جو دنیا میں آیا ہے، وہ یہاں سے جائے گا بھی .... اب سب کو حلف اٹھانا چاہیے تاکہ کوئی اس موت سے نہ بھاگے اور جب تک دم میں دم ہے اس لڑائی سے منہ نہ پھیرے۔" یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب لڑائی کو ایک مذہبی حیثیت دی گئی، ورنہ اسے ایسا کام سمجھا گیا جیسے مرد آدمی کرتے ہیں اور مرد آدمی ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں۔

بابر کی نظر ہندوستان کی ایک ایک چیز پر پڑتی، پہاڑوں، میدانوں، دریاؤں اور چشموں پر، درختوں، پودوں اور پھولوں پر جانوروں اور پرندوں پر، اس نے ہر چیز کا مقابلہ اپنے وطن کی چیزوں سے کیا اور آخر میں جو رائے قائم کی وہ ہندوستان کے حق میں نہیں تھی، مگر یہ رائے ایک آزاد شخص کی تھی، جو اچھے اور برے میں تمیز کر سکتا تھا اور جو کچھ پسند ہوتا اس سے واقعی لطف اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اپنے کسی عیب اور کسی غلطی کو چھپایا ہوتا تو ہم کہتے کہ اسے ہندوستان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں تھا، لیکن وہ مرد تھا، قدر شناس تھا، بے تکلف تھا، اس نے جس آئینے میں اپنی صورت دیکھی اس میں سب کو ان کی صورت دکھائی۔

بازگشت

محترمہ ساجدہ زیدی

رات خاموش ہے تاروں کے دیے بھی خاموش — آج بیتابیٔ دل سوزِ دروں ساکت ہے
جیسے طوفانِ بلا دل میں لئے بحرِ نصیب — سطحِ دریا کی ہر اک موج بھی یوں ساکت ہے
ہر شجر سہما سا، سمٹا سا نظر آتا ہے — شبِ مہتاب کا ہر کیف فسوں ساکت ہے
ہم نفس تیرگیٔ شب کے سوا کوئی نہیں

کتنے بے نور ہیں بجلی کے ستارے اس شب — درد میں لپٹی ہوئی رات کی پہنائی ہے
سوز میں ڈوب کے نکلا ہے سفینہ دل کا — کیسے بتلاؤں میں کس طرح یہ رات آئی ہے
ماہِ امید بجھا شوق کے تارے ڈوبے — بس یہاں میں ہوں مرے درد کی تنہائی ہے
شبِ مہ کیف سحر، بادِ صبا کوئی نہیں

اے شبِ تار تجھے قصۂ دل کیسے سناؤں — کیا یہ ممکن ہے کہ لے آئے تو اس درد کی تاب
کس طرح کھول کے رکھ دوں ترے سناٹے میں — جس کا عنواں ہے غمِ دل وہ تمنا کی کتاب
یاس و حرماں مرے سوز و تپشِ دل کا صلہ — کم نگاہی مری دیرینہ وفاؤں کا جواب
ہاں مگر دشتِ تمنا سے گلہ کوئی نہیں

تند طوفانِ بلا شوق کی لو لرزاں سی — دل کی نازک سی تمنائیں کڑی راہ گذر
ایک دہکا ہوا شعلہ سا رگِ جاں کے قریب — یاس کی تپتی دوپہر دل میں امیدوں کے سفر
دشتِ تنہائی میں بکھرے ہوئے یادوں کے نجوم — شبِ فرقت میں پروئے ہوئے اشکوں کے گہر
صلۂ راہروِ کوئے وفا کچھ بھی نہیں

وادیِ فکر کے رستے بڑے پُرپیچ سہی ذہنِ بیتاب کو ملتی تھیں پناہیں لیکن
دل مرا درد کے صحراؤں میں بھٹکا کیا کیا؟ شوقِ آوارہ کی پیاسی تھیں نگاہیں لیکن
ہر نفس جادۂ امید کا رہرو تھا مرا بند تھیں عشرتِ امروز کی راہیں لیکن
اور اس کشمکشِ غم کا صلہ کچھ بھی نہیں

تجربے غم کے سناؤں تو ہو عنوانِ حیات زندگی کر دوں برہنہ تو ہزاروں ناسور
لاکھوں پیاسے رہے میخانے کی دیوار تلے جن سے صہبائے نشاط اور مئے رنگین تھی دور
مضمحل دستِ جنوں کوہِ گراں غم کے اٹھائے شعلۂ دل نہ بجھے پینے دنا گو ہے دور
وہ مظاہر کہ نظر جن سے چرائی نہ گئی

ظلمِ سرمایہ کے اور پیکرِ تہذیب کا درد محنتِ روز و شب و شام و سحر گریہ کناں
محنتِ شب کی طرح سخت کڑی دھوپ کے دن شام کی گود میں پھیلا ہوا کیٹوں کا دھواں
یاس کی گرد سے سنولائے ہوئے عارضِ زرد حسنِ تہذیب کے چہرے پہ سیاہی کے نشاں
وہ سیاہی کہ جو غازوں سے چھپائی نہ گئی

دھوپ کی آنچ سے کملاتے رہے پھول سے جسم وہ فسانے کہ تصور سے لرز جائے حیات
خونِ مزدور سے گلرنگ حسینوں کے لباس دلِ مضطر کی تمنا تھی کہ ڈھل جائے یہ رات
محنتِ سخت کا غازہ رخِ محبوبی پر نگہ و دل کا تقاضا کہ سنور جائے حیات
ظلم و بیداد کا اس دور میں چرچا ہی نہیں

پھر بھی میں راہِ تمنا سے اُٹھا لائی ہوں ریزہ ہائے غمِ دل، سوزِ دروں، خونِ جگر
سلسلہ ایک ہی وحشت کا وہ دل ہو کہ حیات ایک ہی فردِ جنوں، تارِ نفس، تارِ نظر
اے شبِ تار بتا ان کو کہاں لے جاؤں دل کے دامن میں سمیٹے ہیں وفا کے جو گہر
دہر میں جنسِ وفا کا کہیں سودا ہی نہیں

جون ۱۹۶۱ء

حالات حاضرہ

چین اور ہندوستان

چین نے دھمکی دی ہے کہ اگر ہندوستان اپنی فوجی سرگرمیوں سے باز نہ آیا اور سرحدوں پر نئی فوجی چوکیاں قائم کرتا رہا تو اس کی فوجیں میک ماہن لائن کو پار کر جائیں گی، ہندوستان کی حکومت نے اس کے جواب میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان اس کی مزاحمت کرے گا اور ضرورت پڑی تو وہ جنگ کر کے چین کو مجبور کرے گا کہ وہ ہندوستان کی سرحدوں پر اپنے جارحانہ عزائم سے باز آئے۔ چین نے ہندوستان کے ساتھ اب تک جو کچھ کیا تھا وہ بغیر اعلان کے کیا تھا، اس مرتبہ باقاعدہ اعلان ہے، دھمکی ہے اور بہانہ یہ ہے کہ ہندوستان اپنی سرحدوں کی حفاظت کر رہا ہے ہمارا خیال ہے کہ بین الاقوامی دنیا کے لئے چین کے اس رویہ میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے وہ دم بخود رہ جائے، اس قسم کے بیسیوں تماشوں سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے، معلوم ہے کہ جب کوئی قوم بین الاقوامی جرائم کے لئے اپنا پروگرام بناتی ہے تو اس کی تکمیل کے لئے خود ایسی صورت حال پیدا کرتی ہے جو اس کے حصول مقاصد کے لئے بہانہ بن سکے، مغرب اور مشرق میں ہر جگہ اس کی مثالیں مل سکتی ہیں، تعجب اس پر ضرور ہے کہ چین کا یہ رویہ اُس ہندوستان کے لئے ہے جس نے چینی انقلاب کی تاریخی حقیقت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ برابر اس کی کوشش کرتا رہا کہ منکر، قومیں بھی اسے تسلیم کریں اور نئے چین کو عالمی برادری کا ایک اہم رکن تصور کریں،

کہا جا سکتا ہے کہ چین پر یہ ہندوستان کا کوئی احسان نہیں، یہ تو ایک جیتی جاگتی حقیقت تھی، ہندوستان اگر اسے نہ مانتا تو دوسری منکر، قوموں کی طرح مجرم ہوتا، ہم بھی اسے مانتے ہیں لیکن ہندوستان کی یہ مسلسل کوشش کہ ساری دنیا اس تاریخی حقیقت کو تسلیم کرے، اس کا سیاسی فرض نہیں تھا، ہاں اخلاقی فرض

عزیز تھا اور اس نے کما حقہٗ اسے پورا کیا، اور اس سلسلے میں وہ بہت سی قوموں کے نزدیک مورد عتاب بھی رہا۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے طریقوں سے بھی وہ چین پر واضح کرتا رہا کہ اس کی طرف سے اُسے ہمیشہ خیر سگالی اور دوستی کا یقین رہنا چاہیئے۔ اس کی بنیادی پالیسی قیام امن ہے، زندہ رہو اور دوسروں کو زندہ رہنے دو، اس کا فلسفۂ حیات ہے، شروع شروع میں چین نے بھی اس جذبہ اور اس پالیسی کی قدر کی، مگر معلوم ہوا کہ اخلاقی قدر کو اضافی حیثیت دینے کا فلسفہ دوستی کو بھی اسی نظر سے دیکھتا ہے، چین نے ہندوستان کے جذبۂ خیر سگالی کو بھی اسی پیمانے پر پرکھا اور دوستی کے اس جامہ کی جس میں چینی رسالک کے بھی تار تھے، دھجیاں اڑا کر اپنے پُرامن ہمسایے کی علاقائی سالمیت پر حملہ کر دیا، فرض کر لیجیئے کہ سرحدوں سے متعلق کوئی غلط فہمی تھی، یا دونوں ملکوں کے نقطۂ ہائے نظر میں کوئی اختلاف تھا، تو کیا یہ اختلاف دوستانہ فضا میں گفت و شنید کے ذریعے طے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تبت میں چین نے اپنا اقتدار قائم کیا، اور جس طرح سے قائم کیا اُسے ہندوستان نے پسند نہیں کیا، وہاں کے بے خانماں لاما کو پناہ دی لیکن اس پر کچھ پابندیاں بھی لگا دیں، یقیناً چین کو یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن اُسے اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہندوستان ایک آزاد ملک ہے، اس کا اپنا ایک طریقہ ہے، ایک اصول ہے، وہ اس کی توقع بھی کرتا ہے کہ دوسرے اس اصول کا احترام کریں گے، اگر احترام نہ کریں تو کم از کم اس کے آزادی اور آزاد پالیسی کے حق کو ضرور تسلیم کریں گے، اس لئے تبت کے واقعہ کے بعد بھی باہمی اختلافات پُرامن طریقے سے دور ہو سکتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ چین نے جارحانہ طریقۂ کار کیوں اختیار کیا؟ یہ سوال مشکل ہے اگر اخلاقی اصولوں پر اس کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے، سیاسی اور خالص سیاسی وجوہ کئی ہو سکتے ہیں، اور چین کے معاملے میں ہمیں سیاسی وجوہ ہی سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

چین کے ساتھ دنیا کے بعض اہم اور بڑے ملکوں نے جو سلوک کیا ہے اسے وہ آسانی سے بھول نہیں سکتا، نئی امنگوں اور نئے حوصلوں کے ساتھ گراں خوابی سے بیدار ہوتی ہوئی قوم کو اہمیت نہ دینا ویسی ہی غیر دانشمندی ہے جیسے کسی ایسے نوجوان کے جذبات کی قدر نہ کرنا جو عنفوان شباب کی منزلوں سے گزر رہا ہو، اس سے اس میں چڑچڑاپن اور غصہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سب سے بیزار ہونے لگتا ہے، امریکہ اور اس کے بعض ساتھیوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا ہے اور اس کی وجہ سے چینی قوم چڑچڑے پن میں ایسے کام کرتی رہی ہے جو اس کی قدیم

روایات کے عین منافی ہی غم وغصہ میں اس نے معقولیت اور ہوشمندی کا دامن چھوڑ دیا ہے، اور اپنے وجود کی حقیقت کو ثابت کرنے اور یہ جتلانے کے لئے کہ اگر اُسے بین الاقوامی دنیا میں ضابطہ کے ساتھ وہ پوزیشن نہیں مل سکتی، تو دوسرے طریقوں سے وہ اسے حاصل کر کے رہے گا، وہ غلط اور صحیح ہر طرح کا اقدام کرتی رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے اندرونی طور پر اور خارجی معاملات میں ایسے مجرمانہ کام بھی کئے ہیں جسے مہذب دنیا معاف نہیں کر سکتی۔

چین اور مارکس کے فلسفہ کا علمبردار ہے اور انقلاب کا نقیب، اس کے اپنے مسائل بھی ہیں، معاشی سماجی اور سیاسی غرض ہر قسم کے، جنھیں وہ کم سے کم مدت میں حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اُس کے معاشی نظام میں ابھی استحکام نہیں پیدا ہوا ہے، وہ اپنے یہاں مکمل انقلاب کا خواہاں ہے، اسی کے ساتھ وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور مارکسی نظام کے حامیوں کی مدد کرے، خاص طور سے ایشیا اور وہ بھی جنوب مشرقی ایشیا میں وہ جلد از جلد اس انقلاب کا خواہاں ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ وہاں سے ایسی خبریں موصول ہوئی تھیں کہ اس کے ذمہ دار رہنما اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے لئے جنگ ضروری سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جنگ ہوگی تو سرمایہ داری نظام جس کی بنیادیں پہلے سے ہی کمزور ہو چکی ہیں ختم ہو جائے گا اور اشتراکی انقلاب کی کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے، یہ بات بھی ان کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ وہ اسی کو صحیح مارکسزم کہتے ہیں اور اس سلسلہ میں روس سے ان کا اختلاف بھی ہے، وہ روس کے نعرۂ امن اور مواسات (CO-EXISTENCE) کے نظریہ کو اصولی مارکسزم سے انحراف تصور کرتے ہیں اور انھیں بدعت قرار دیتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ روس خود کہاں تک امن کا خواہاں ہے اور امن کا صحیح مفہوم اس کے نزدیک کیا ہے۔ روس اور چین کا یہ نظری اختلاف اگر خالص علمی سطح پر ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن جب چین کی طرف سے یہ عملی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کے امن پسند ہمسایے اس کی زد میں آتے ہیں تو صورت حال تشویشناک ہو جاتی ہے۔

اس وقت ایشیا میں مغربی طرز کی جمہوریت اور اشتراکیت کی سرد جنگ جاری ہے، چین جو اشتراکی انقلاب کا نقیب ہے ہندوستان کو اپنا حریف تصور کرتا ہے جہاں جمہوری طریقہ کار سے معاشی اور سماجی انقلاب لانے کی جد و جہد ہو رہی ہے، پنڈت نہرو کی قیادت میں ہندوستان کا یہ عزم ہے کہ تشدد اور خونریزی سے گریز کرتے ہوئے پُر امن طریقہ سے، سماجی اور معاشی انصاف کی بنیادوں پر ایک ایسا جمہوری نظام قائم

کیا جائے جہاں فرد کی اہمیت بھی باقی رہے اور ساتھ ہی ساتھ استحصال بالجبر کے لئے کوئی موقع نہ ہو، دوسرے لفظوں میں یہ کہ جمہوری طریقہ کار اختیار کر کے سوشلزم قائم کیا جائے، یہ تجربہ اگر کامیاب ہو جاتا ہے تو جمہوریت کو اپنی بقا کے لئے ایک سہارا مل جاتا ہے، چین کا جس فلسفۂ حیات پر ایمان ہے اس کا تقاضا کچھ اور ہے، وہ ایشیا کے پسماندہ ملکوں کے مسائل کا حل صرف اشتراکی انقلاب میں دیکھتا ہے، ہندوستان اس کا منکر ہے، اس لئے ہندوستان کی ترقی اور کامیابی میں چین کو اپنی شکست کے آثار نظر آتے ہیں، ہندوستان بنیادی طور پر امن پسند ہے اور وہ اپنے سیاسی اور معاشی تجربہ کے لئے بھی امن کا خواہاں ہے، چین کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کو یکسوئی کے ساتھ تعمیر و ترقی کے کام کے لئے امن کی فضا نہ ملے اور اس طرح ایشیا میں جمہوریت کا کوئی ٹھکانا نہ ہو، ہندوستان کی کامیابی کا اثر ایشیا اور افریقہ کی اُن قوموں کے فکر و عمل پر بھی پڑے گا جو ابھی ابھی سامراج کی زنجیروں سے آزاد ہوئی ہیں اور آزاد ہو رہی ہیں، اسی لئے بہر صورت ہندوستان چین کی عالمی انقلاب کی تمنا کی راہ میں ایک روڑا ثابت ہوگا۔

خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ چین کو کچھ داخلی پریشانیاں بھی ہیں، غلہ کی وہاں بہت کمی ہے، کمیون کا پروگرام تقریباً ناکام ثابت ہو چکا ہے، وہاں کے عوام بد دلی کا شکار ہو رہے ہیں وغیرہ وغیرہ معلوم نہیں حقیقت کیا ہے، ویسے اگر پریشانیاں ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لئے کہ وہ بھی ابھی تجربہ کی منزل سے گزر رہے ہیں اور اپنی جلد بازی میں بعض باتیں غلط بھی کر رہے ہیں یا مقابلہ اور سابقہ کے دباؤ سے منصوبہ بندی میں کوتاہیاں رہ جاتی ہیں یا عوام اس سرعت کا ساتھ نہیں دے پاتے، یہ ہوتا ہے خود ہندوستان میں بے شمار مسائل ہیں، الجھنیں ہیں، لیکن اپنی پریشانیوں اور الجھنوں پر پردہ ڈالنے یا ان کی طرف سے اپنی قوم کی توجہ ہٹانے کے لئے اگر چینی حکومت ہمالہ کی بلندیوں پر جارحانہ عزائم کا ایک محاذ کھول دے تو جہاں ایک طرف دنیا کا امن خطرہ میں پڑ سکتا ہے وہاں خود اُس نظام کی کمزوریاں اس سے نہیں دور ہو سکتیں اور نہ اس کی الجھنیں ہی دور ہو سکتی ہیں، ہندوستان کمزور ملک نہیں ہے، اگر ہندوستان اور چین میں جنگ شروع ہو جاتی ہے تو جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا ہے، یہ طویل جنگ ہوگی اور عالمی جنگ ہو سکتی ہے اس لئے دفاعی تیاریوں کے ساتھ یہ کوشش بھی جاری رہے گی کہ دوسرے طریقوں سے اس سرحدی تنازعہ کو ختم کیا جائے، ہندوستان میں بھی بعض ایسی جماعتیں اور افراد ہیں جو پنڈت نہرو

کی اس پالیسی کو کمزوری اور بزدلی پر محمول کرتے ہیں اور ممکن ہے کہ چین کو بھی یہی مغالطہ ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

گوا اور پاکستان

ہندوستان کی مشکل یہ ہے کہ وہ سنجیدگی سے پُرامن رہنا چاہتا ہے، وہ عدم تشدد کی بنیادی اچھائیوں پر ایمان رکھتا ہے، اس کے ذمہ دار رہنماؤں نے بار بار یہی کہا ہے، اگر اُسے مجبور ہو کر کسی قوم سے لڑنا پڑا تو اس سے اس کے ضمیر کو سخت صدمہ پہنچے گا، مگر جارحیت کو برداشت کرنا اور ملک کی علاقائی سالمیت کو خطرہ میں ڈال دینا اُسے قبول نہ ہوگا اور اسے مجبوراً ہتھیار اٹھانا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک اپنے سینے پر پرتگالی سامراج کے پنجے کو برداشت کرتا رہا ہے، لیکن اب گوا میں پرتگالیوں کا ظلم اور تشدد اتنا بڑھ گیا ہے کہ ہندوستان اپنے سمندروں میں بھی آزادی کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا، پرتگال نے بھی جارحیت پر کمر باندھ لی ہے، ہندوستان اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہے مگر یہاں بھی وہی مشکل اس کے سامنے ہے، جنگ نہ ہو اور خوش اسلوبی سے معاملات طے ہو جائیں اور پرتگال ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے تو ہندوستان اس کے لئے اور انتظار کر سکتا ہے۔

ان حالات میں پاکستان کا جو رویہ ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ پچھلے دنوں چین نے کشمیر کی شمالی سرحدوں سے متعلق پاکستان کو رام کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ اشارہ کیا تھا کہ وہ اس سے معاملہ کرنے کو تیار ہے، لیکن اس سلسلے میں کوئی واضح بات سامنے نہیں آئی تھی، اور شاید مختلف اسباب اور اپنی قومی مصلحتوں کی بنا پر پاکستان نے چین کی کچھ زیادہ ہمت افزائی بھی نہیں کی تھی، اب پھر اس کا امکان ہے کہ پاکستان میں چین کی ڈپلومیٹک سرگرمیاں بڑھ جائیں اور چین پاکستان سے کوئی معاملہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دے، ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ پاکستان میں چین کے سفیر نے صدر ایوب اور وزیر خارجہ منظور قادر سے ملاقات کی ہے اور چینی سفیر کے بیان کے مطابق گفتگو کامیاب رہی ہے، گوا سے پاکستان کو خواہ مخواہ کی دلچسپی رہی ہے اور اس معاملے میں اس نے بڑی رجعت پرستی اور سامراج دوستی کا مظاہرہ کیا ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض معاہدوں میں وہ پرتگالیوں سے دوستی کا دم بھر رہا ہے۔ بہرحال دونوں رجحان منفی رجحان کے حامل ہیں اور اس سے خود پاکستان کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اور

علاوہ ہیج رہا ہی۔ دہلی میں باوثوق ذرائع سے یہ خبر شائع ہوئی ہی کہ جب سے پرتگالیوں نے گوا میں ہنگامہ کھڑا کیا ہی اور ... ہی فوجی پوزیشن مضبوط کرنا شروع کی ہی دکشمیر میں جنگ بندی لائن پر پاکستانی فوجیوں کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں دوسری بار اس کی کوشش کی گئی ہی کہ اس لائن کو پار کیا جائے۔ یہ بھی پتہ چلا ہی کہ گوا میں پرتگالیوں سے پاکستان اپنا تعلق قائم کئے ہوئے ہے، کراچی کے ہوائی اڈے پر پرتگالی ہوائی جہاز اپنی ضرورتوں سے اترتے ہیں اور پرتگالیوں نے سلحے کراچی ہو کر گوا پہنچتے ہیں، دوسری طرف صدر ایوب نے ہندوستان کو مشترکہ دفاع کی دعوت دی ہی لیکن یہ دعوت مشروط ہی، صدر ایوب نے کہا ہی کہ اگر ہندوستان کھلے دل کے ساتھ کشمیر کے مسئلے حل کرنے کے لئے پیش کش کرے تو پاکستان ہندوستان کے ساتھ مشترکہ دفاعی معاہدہ کرنے کو تیار ہے اور پھر دونوں مل کر بیرونی حملہ کا مقابلہ کریں گے، پاکستان کا یہ رویہ توقع کے عین مطابق ہی اور ہندوستان کو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہئے، افسوس پاکستان کی غیر دانشمندانہ حرکت پر ہوتا ہی جہاں کے عوام اس کا خمیازہ بھگتتے رہے ہیں۔

کانگو میں اقوام متحدہ

کانگو میں بھی اس وقت ہندوستانی سپاہی لڑ رہے ہیں جہاں اقوام متحدہ کے وقار کا مسئلہ درپیش ہی، ہندوستان اقوام متحدہ کے وجود کو اور پر اثر وجود کو امن عالم کے لئے ضروری تصور کرتا ہی، اور اس بار امریکہ اور ہندوستان دونوں اس معاملہ میں عملی طور پر متفق ہوتے ہیں، مغربی یورپ کی بعض اہم قوموں کو کٹنگا سے زیادہ دلچسپی ہی اور وہ اقوام متحدہ کی زیادہ پروا نہیں کرتے، ان کے سامنے اپنا قومی مفاد ہی، ان میں انگلستان بھی شامل ہی جو اقوام متحدہ میں تو اُس ریزولیوشن کی تائید میں تھا جس کو عمل میں لانے کی کوشش ہو رہی ہی لیکن عملی طور پر اس کا رویہ اس کے برخلاف ہی اس سلسلہ میں ہندوستان سے اس کا سخت اختلاف ہی، گوا کے معاملے میں بھی وہاں کے سرکاری حلقے ہندوستان کے ساتھ نہیں ہیں، اور وہ بیچ بچاؤ کے لئے تیار ہیں، حقیقت یہ ہی کہ وہ گوا پر پرتگالی قبضہ کے حق میں ہیں خاص طور سے اس لئے کہ اگر پرتگال کو گوا چھوڑنا پڑا تو اس کا اثر افریقہ میں ان کے مفاد پر پڑے گا، ان کی طرف سے یہ منطق پیش کی جاتی ہی کہ اگر پنڈت نہرو نے ایشیا اور افریقہ کی قوموں کو خوش کرنے کے لئے گوا میں پرتگالیوں کے خلاف کچھ کیا تو اس سے ان کا بین الاقوامی وقار خطرہ میں پڑ جائے گا دلچسپ بات یہ ہی کہ انھیں اس وقت اپنے وقار سے زیادہ پنڈت نہرو کے وقار کی فکر ہے، یہ ہے استعمار کی چالیں مختلف انداز سے سامنے آتی رہتی ہیں۔

تعلیمی مسائل

قومی یک جہتی اور تعلیم

پچھلے دنوں ہمارے رہبرانِ قوم کو دیس کے اندر انتشار کے آثار دیکھ کر بڑی تشویش ہوئی۔ آج جبکہ ہر فرد اور اس کا ہر لمحہ وطن کی تعمیرِ نو کے لئے وقف ہونا چاہیئے تاکہ فی الحقیقت ایک مہذب و شائستہ جمہوری نظام قائم ہوسکے تفرقہ پرور عناصر کی ریشہ دوانیاں واقعی بڑی پریشان کن ہیں۔ ایک ناسور کی طرح جسے خارجی مرہم پٹی سے ایک مدت تک تہہ داماں رکھا گیا ہو، یہ جسدِ قوم کا فساد جگہ بہ جگہ، اتفاقیہ اور ارادتاً موقع بے موقع برابر نمودار ہو رہا ہے۔ ایسی تخریبی کارروائیاں جب وطن کے نوجوان بھی کرنے لگیں تو مسئلہ اور نازک ہو جاتا ہے۔ ان علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشترکہ قومیت کی اساس ابھی بڑی ناپائیدار ہے اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اتحادِ قومی کی روایات جنھیں بڑی جاں سوزی سے قائم کیا گیا ہے اور جو ہماری عزت و ناموس اور بقا کے لئے بڑی اہم ہیں، کہیں نصیبِ دشمناں، ملیامیٹ ہو کر نہ رہ جائیں۔

قومی یک جہتی کانفرنس نے جو اکتوبر میں دلی میں منعقد ہوئی تھی، شعوری طور پر اس مسئلے کو ملک کے سامنے پیش کیا اور متنبہ کیا کہ ہم علاقائی تعصب، فرقہ پرستی، ذات پات کی تفریق، لسانی مغائرت اور کچھ اس سے بھی زیادہ تنگ و تاریک تصورات کے مہلک اثرات کا اپنے آپ کو شکار ہونے سے محفوظ رکھیں اور اپنے احساسِ قومی کو فراموش نہ کریں۔ اس کانفرنس نے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا کہ ان تمام علائق سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ کیونکہ قومی یک جہتی کا راز ہمارے نظریات کی استواری میں مضمر ہے۔ اور تعلیم ہی اپنے وسیع معنی میں وہ سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے خیالات و احساسات اور معتقدات و تصورات کو استوار کیا جا سکتا ہے۔

آزادی کے بعد سے برابر تعلیم کے کاموں کی تنظیم کی جا رہی ہے، مختلف تبدیلیاں لائی جا چکی ہیں اور مسلسل یہ کوشش ہو رہی ہے کہ جلد از جلد تعلیم کو نئے جمہوری نظام کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ

کر دیا جائے۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر جگہ نظم وضبط کا فقدان ہے۔ شب و روز کوئی نہ کوئی ایسا حادثہ رونما ہوتا ہے جس سے قومی تذلیل ہوتی ہے اور جن نونہالانِ چمن کو دیکھ کر فرحت نصیب ہونی چاہیے تھی اور جن سے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں، وہی بے راہ روی اور خودسری میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ انھیں سے نازیبا اور ناروا حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ان کے دست و بازو تعمیرِ وطن کے لئے اٹھنے کے بجائے قومی عمارت کو مسمار کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم معلوم کریں کہ اس صورتِ حال کے اصل اسباب کیا ہیں۔ وہ کونسے نکات ہیں جن پر ہماری نظر نہیں گئی یا اب تک ہم نے پوری توجہ ان پر نہیں کی ہے بلکہ فروعی معاملات میں ہی الجھے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں کہی جا رہی ہیں لیکن درسی کتابوں کا معاملہ جیسا کہ اس قومی یک جہتی کی کانفرنس میں بھی کہا گیا ہے، بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں جبکہ چھپے ہوئے حروف ہی سب سے زیادہ ہمارے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں، درسی کتابوں کے ذریعے ہی سے زیادہ موزوں اور باضابطہ طور پر مناسب رجحانات کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ "یونیورسٹی گرانٹس کمیشن" کی یہ تجویز کہ ایک قومی مشاورتی بورڈ قائم کیا جائے جو دیش کی تمام ریاستوں کے لئے مشترکہ طور پر درسی کتابیں تیار کرنے کے سلسلے میں مشورہ دے، فوری اور پوری توجہ کی مستحق ہے۔ یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ مدرسوں میں پڑھائی جانے والی زبان، تاریخ، و جغرافیا اور دیگر مضامین کی درسی کتب کا جائزہ لیا جائے۔ پچھلے سو سال میں بدیسی دانشوروں نے ہماری تاریخ کو بری طرح مسخ کیا ہے اور قومی احساس کو ہر جگہ مجروح کرنے کی سعی کی ہے۔ نفاق کے بیج کو جہاں بھی مٹی ذرا نرم اور زرخیز نظر آئی ہے، بڑی فراخ دلی کے ساتھ بویا ہے۔ ہمیں اپنی تاریخ کی کتابوں پر صرف نظرِ ثانی ہی نہیں کرنا ہے بلکہ انھیں قوم پرور اور صحت مند نظریات کے تحت از سرِ نو ترتیب دینا ہے۔
اس فریضے کو انجام دینے میں اس بات کی پوری احتیاط برتی جانی چاہیے کہ مذہبی جوش و خروش کے ساتھ کسی تاریخی کردار کو نہ پیش کیا جائے۔ 'زبان' کی کتابوں میں بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے، انہیں کسی بھی شخصیت کو کسی خاص مذہب یا جماعت کے خلاف کسی دوسرے مذہب یا جماعت کی طرف سے ایک علمبردار بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خامی ہماری موجودہ درسی کتابوں میں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایسے اساطیری اور دیومالائی قصوں سے بھی گریز کرنا چاہیے جو قدامت پرستی اور رجعت

کی طرف رجوع کرتے ہوں یا تن بہ تقدیر، کا مطیع بنلاتے ہوں۔ اس طرح پھر مجموعی طور پر ہمیں اپنی درسی کتابوں کے ذریعے منتر کہ قومیت کے جذبے کو ابھارنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بہر کیف، کتابیں ایسی ہونی چاہئیں کہ وہ ہمارے ماضی کی صحیح تصویر پیش کریں اور ہماری رنگا رنگ تہذیب کی گل کاریوں سے انھیں بخوبی واقف کرائیں اس طرح ہمارے طلبہ میں تہذیبی ہم آہنگی پیدا ہوگی اور وہ جذباتی طور پر اپنے آپ کو قوم کا ایک فرد سمجھ سکیں گے ایسے اقدام ہی ہمیں تعلیم کی اس شاہراہ پر جادہ پیما کر سکیں گے۔ جو قومیت کی منزل پر پہنچاتی ہے۔

اس طرح درسی کتابوں کی طرف توجہ مبذول کرانے سے، استاد کے منصب کو کم کرنا مقصود نہیں ہے درحقیقت استاد ہی اس کاغذی پیرہن میں روح پھونکتا ہے اور اسی کی ذات کی بدولت بے جان الفاظ سے حقائق آشکارا ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے اساتذہ ہی ہیں، خواہ ابتدائی جماعتوں میں درس دیتے ہوں یا اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں، جن پر قومیت کے صحت مند تصور کو فروغ دینے کی ذمہ داری آتی ہے۔ یہ ان ہی کا فرض ہے کہ وطنیت کا ایسا جذبہ پیدا کریں جو روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے کا باعث ہو، جو تازگی بخشے اخوت اور اپنایت پیدا کرے۔

معلم اپنے اس منصب کو اس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک کہ تعلیم کے ذریعے طلبہ میں احساس ذمہ داری پیدا نہیں کیا جاتا۔ یوں تو ذمہ داری کا لفظ مختلف معنی میں استعمال کیا جاتا ہے اور بالکل نجی ضروریات کو پورا کرنے سے لے کر قومی رہنمائی اور انسانیت کے محسن بننے تک سب ہی کچھ اس میں شامل ہے اور اکثر ان سب کو ایک دوسرے کی راہ میں حائل بھی خیال کیا جاتا ہے لیکن ذرا ہم غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ سب ہی ذمہ داری کے مدارج ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ان کی حیثیت پیش رو یا نقش اول کی سی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے بچہ کا سماجی محور اس کا گھر اور خاندان ہوا کرتا ہے۔ ہمیں اپنے متعلقین کے حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے پھر دیگر اعزا، اور احباب کے پاسِ خاطر کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعد ازیں برادری، محلہ اور شہر کے ایک فرد ہونے کا دھیان رکھنا ہے۔ اب ذرا شعور پیدا ہونے کے بعد دیس اور پھر دیس بہ دیس سے تعلق پیدا کرنے، اور اس بڑے دائرے میں اپنے آپ کو پابند اور ایک دوسرے سے منسلک سمجھنے کا سوال اٹھتا ہے۔ اس طرح بالآخر انسانیتِ عام کے مرکز سے اپنا الحاق ہو جاتا ہے۔ اور اس حیثیت سے کچھ ذمہ داریاں ہمارے اوپر عائد ہو جاتی ہیں۔ آج کی دنیا میں تیز رفتار سواریوں نے تمام جغرافیائی

... کو بے معنی کر دیا ہے۔ اب مسافت دنوں کی جگہ گھنٹوں میں طے ہونے لگی ہے اور بشر کی پرواز ... کہ وہ فلک پیما کو گردانا ہے اور نہ قعرِ دریا اور کامِ نہنگ کا خوف باقی رکھا ہے۔ اب تو زمین کی تنابیں کچھ ایسی کھنچ گئی ہیں کہ وہ ہماری دست رس میں آگئی ہے۔ آج بُعد مکانی کا معاملہ نہیں ہے۔ تاہم ثقافتی اونچ نیچ اور تہذیبی امتیازات نے خلیجیں حائل کر رکھی ہیں۔ اس بنا پر نہ صرف بین الاقوامی اشتراک و تعاون میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے بلکہ ایک قومی معاشرے میں بھی یہی عناصر ابتری پھیلاتے ہیں۔ اس تفرقے کو کم کرنے اور مٹانے کی اشد ضرورت ہے۔ تعلیم ہم سے سب سے پہلے ذہنی طور پر ہی ذمہ دار ہونے کا مطالبہ کرتی ہے اور جہالت کی تنگ نائے سے نکلنے کا مطلب ہی یہی ہوتا ہے کہ محدود عقائد کی پیروی چھوڑ کر ہم وسعتِ فکر و نظر کی اقلیم میں اتر آئیں۔ تعلیم اپنے اس منصب کو درسی کتب اور اساتذہ کی ہی بدولت پورا کر سکتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے ادارے ہر ایک دور میں اپنے دیس کے تہذیبی اور ثقافتی سرمائے کا گہوارہ رہے ہیں۔ آج ہمارے سامنے بھی اقدار کا مسئلہ درپیش ہے۔ آئینِ نو سے ڈرنے اور طرزِ کہن پر اڑنے کی منزل بلاشبہ بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ تاہم ہمیں آگے قدم بڑھانا ہے۔ یہ مرحلہ ایک اچھا تعلیمی نظام ہی طے کرا سکتا ہے۔ ہمیں اس وقت ایسے نظام کی ضرورت ہے جو صرف ذہن ہی کی نشو و نما نہ کرے بلکہ جذبات کو سُدھارے، ستھرا مذاق پیدا کرے اور اقدار کا تابع بنائے اور پھر ایسے کردار تشکیل پائیں جو ماضی کی صالح روایات کے سچے امین کہلائیں اور عظمتِ وطن کے حقیقی علم بردار اور پاسبان۔

"معلّم"

تنقید و تبصرہ

چند خاص نمبر

ترجمان القرآن : منصب رسالت نمبر

ترجمان القرآن جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ادارت میں نکلتا ہے، مذہبی رسالوں میں اپنی سنجیدگی اور علمیت کے لحاظ سے ایک خاص حیثیت کا مالک ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ میں منکرین حدیث کے خیالات پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ یہ نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں ڈاکٹر عبدالودود صاحب جو غالباً پاکستان کی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جسے منکرین حدیث کہا جاتا ہے، اور مولانا مودودی صاحب کی وہ تمام مراسلت شائع کی گئی ہیں، جو سنت کی آئینی حیثیت کے بارے میں ہوئی تھی۔ دوسرے حصے میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے ایک رکن جسٹس محمد شفیع صاحب کے ایک فیصلہ کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس فیصلہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کا خیال ہے کہ "یہ کلیتہً انکار سنت کی بنیاد پر صادر ہوا ہے۔" جو لوگ اس مسئلہ کے دونوں پہلوؤں کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے یہ نمبر بہت مفید ثابت ہوگا۔ البتہ وہ جدید ذہن، جو نہ اس جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور نہ اُس سے اور جو آج کل کے مسائل پر معروضی طور پر غور کرتا ہے اور جسے علمائے اسلام کی توضیحات میں عصری مسائل کا تسلی بخش حل نہیں ملتا، شاید اس نمبر کے مباحث کو اپنے لئے زیادہ مفید نہ پائے۔

شاعر ۔ ادارہ : اعجاز صدیقی ۔ مہندر ناتھ

ماہنامہ شاعر، اُردو کے بہت پرانے پرچوں میں سے ہے۔ پہلے آگرہ سے، اُردو کے مشہور شاعر، مولانا سیماب اکبرآبادی مرحوم کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے بعد مولانا کی زندگی ہی میں ان کے صاحبزادے جناب اعجاز صدیقی صاحب اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ اب یہ ماہنامہ ایک طویل عرصہ سے

مئی سے شائع ہوتا ہے۔

زیرِ تبصرہ شمارہ ۶۱ء کا خاص نمبر ہے، جس میں چند اچھے تنقیدی مضامین ہیں اور اردو کے اچھے نثر نگاروں اور قریب قریب سبھی اچھے شعرا کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں

حجم ۲۰۲ صفحات اور اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ۷۵ نئے پیسے ہے۔

ملنے کا پتہ: مکتبۂ قصر الادب۔ پوسٹ بکس ۵۲۶۴ ممبئی ۸

نگار جوش نمبر مدیر: صہبا لکھنوی

سائز ۲۰×۳۰ حجم ۶۵۵ صفحات۔ جوش کی عہد بہ عہد کی متعدد تصاویر۔ کاغذ اخباری، کتابت طباعت غنیمت۔ قیمت آٹھ روپے۔ پتہ: مکتبہ افکار، رابسن روڈ۔ کراچی۔

اب زندہ شخصیتوں کے بارے میں رسالوں کے خاص نمبر نکالنے کا رواج بڑھ رہا ہے۔ اس میں خطرے بھی ہیں اور فائدے بھی۔ فائدہ یہ کہ متعلقہ شخصیت کے بارے میں اس کی زندگی میں زیادہ آسانی اور صحت کے ساتھ مواد جمع کیا جا سکتا ہے اور اس کی خدمات کا اعتراف کرکے ملک و قوم کسی حد تک اپنے فرض عہدہ برا ہو سکتی ہے۔ خطرہ اس کا ہے کہ اگر متعلقہ شخصیت متفقہ طور پر بزرگ اور محترم نہ ہوئی یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کے نزدیک نہ ہوئی تو بحث و مباحثہ کا ایک ناخوشگوار سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ جوش نمبر کے بارے میں پاکستان کے بعض گوشوں سے کچھ نامناسب آوازیں اٹھی بھی ہیں۔ علاوہ ازیں جب تک ایک شخص زندہ ہے اس کی شخصیت پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی؛ اس لئے اس کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ خود جوش نے بھی کہا ہے کہ جب تک اس جوہرِ گراں مایہ کو تنگی و لسنگی کے فشار سے رہائی نہیں دی جاتی اُس جوہر میں اس قدر طاقت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ کسی شخص کی ذات کو تکمیل و اتمام کی دولت سے مالا مال کر دے"۔

بہر نوع یہ نمبر اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ جوش کی شخصیت اور ان کی شاعری کا بہت تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، جس میں بہت سا غیر مطبوعہ بھی شامل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ مضمون نگاروں کو پوری آزادی کے ساتھ اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا ہے، چنانچہ بعض مضامین میں جوش کی شخصیت اور کردار پر سخت تنقید بھی کی گئی ہے۔ البتہ، جیسا کہ میں نے اس

(بقیہ صفحہ ۱۶۷ پر ملاحظہ ہو)

کوائف جامعہ

"میں مسلمان کیوں ہوں؟" —— ایک تقریر

نومبر کے اواخر میں ورلڈ کونسل آف چرچز کی کانفرنس نئی دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اس میں شرکت کے لئے میک گل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ایک پروفیسر ڈاکٹر رافع اسمٰعیل فاروقی صاحب جو اس وقت سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کراچی میں ایک سال کے لئے آئے ہوئے ہیں، دہلی تشریف لائے اور جامعہ میں مقیم ہوئے، ڈاکٹر فاروقی فلسطینی عرب ہیں اور فلسفہ ان کا خاص مضمون ہے لیکن ادھر عرصہ سے وہ اسلام اور دیگر مذاہب کا گہرا مطالعہ کرتے رہے ہیں، چنانچہ ابھی حال میں انھوں نے عیسائی مذہب پر ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھ کر میکگل یونیورسٹی کے شعبۂ الٰہیات کے سپرد کی ہے، جامعہ میں وہ تقریباً ایک ہفتہ تک مقیم رہے اور اس عرصہ میں یہاں کے ارباب ذوق کو اُن سے تبادلۂ خیال کا اچھا موقع ملا، جامعہ کالج کے حلقۂ مطالعہ میں انھوں نے ایک تقریر بھی کی جس کا عنوان تھا: "میں مسلمان کیوں ہوں"۔ موضوع کافی دلچسپ تھا اس لئے اجتماع بہت اچھا ہوا، تقریر انھوں نے انگریزی میں کی، تقریر ۳ بجے سہ پہر میں شروع ہوئی اور ۵ ½ بجے ختم ہوئی، اس کے بعد سوالات وجوابات کا سلسلہ شروع ہوا جو بلا مبالغہ ۱۰ بجے تک جاری رہا، اس دوران میں ڈنر پر بھی مذاکرات جاری رہے۔

تقریر کا موضوع جیسا کہ ظاہر ہے سوانحی تھا لیکن اس کی وجہ سے تقریر میں خیالات کی گرمی اور معتقدات کا جوش بھی شامل ہو گیا تھا لیکن چونکہ دوسری طرف فلسفیانہ دلائل بھی تھے اور تحقیق اور ریسرچ کے ٹھوس نتائج بھی اس لئے سننے والوں کا خیال یہ تھا کہ عرصہ کے بعد اسلام پر اتنی اچھی تقریر سننے کو ملی ہے۔ تقریر میں انھوں نے اپنے ذہنی سفر کا حال بھی سنایا اور یہ بتایا کہ شروع میں کس طرح وہ عیسائی مشنری اسکول کے ماحول سے متاثر ہوئے اور اعلیٰ تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں وہ کیونکر تشکک کی راہ سے گزرے، اور پھر بعد میں برطانوی استعمار اور فلسطینی عربوں کی جد وجہد آزادی نے کسی طرح ان کے دل ودماغ میں ذہنی اور مذہبی بیداری

ئی ہو پیدا کی، اسرائیل کی ریاست کے قیام کے بعد وہ امریکہ چلے آئے جہاں انھوں نے مشہور یونیورسٹی ہارورڈ
میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی، امریکہ میں انھوں نے مادی ترقی کا عروج دیکھا، لیکن اس ترقی کو انھوں نے زندگی
کی روحانی قدروں سے عام طور پر معرا دیکھا، الغرض مشاہدہ اور مطالعہ نے اُن پر یہ ثابت کیا کہ اسلام ہی
ایک ایسا مذہب ہے جو ایک متوازن نظامِ حیات پیش کرتا ہے، اور جہاں "معنوی خیر" اور "مادی خیر" میں
ایک حسین امتزاج ملتا ہے، انھوں نے اسلامی تعلیمات کی رجائیت پر اور اس خصوصیت پر کہ ان
میں عمل اور سعی کی پرزور تلقین کی گئی ہے، بہت زور دیا، ان کے خیال کے مطابق وہ مسلمان مسلمان نہیں ہے
جو انفرادیت کی تنگ نائیوں سے نکل کر دوسروں کے لئے کچھ نہیں کرتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں
کہ اسلام میں فرد کی بحیثیت فرد کے کوئی حیثیت نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اسلام اُس انفرادیت کا قائل
نہیں جس کا دامن اجتماعی فلاح و خیر سے نہ وابستہ ہو، یہ توازن نہ تو سرمایہ داری نظام کی لبرل فلاسفی میں
میں ملتا ہے اور نہ سوشلزم کی اجتماعی آمریت میں، انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ بدھ دھرم اور ہندو مت
سے متعلق ان کا مطالعہ گہرا نہیں ہے لیکن جو کچھ ان مذاہب کے بارے میں انھیں معلوم ہے اس کی روشنی
میں وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مذاہب اُس صحت مند رجائیت سے عاری ہیں جو اسلام میں ملتی ہے، عیسائی
مذہب اور یہودی مذہب میں جن کا مطالعہ انھوں نے گہری نظر سے کیا ہے خیر اور مادہ کے وہ حسین امتزاج
نہیں ملتا اور یہودی مذہب میں "برگزیدہ" قوم کا جو تصور ملتا ہے وہ ساری انسانیت کی وحدت کی ضد ہے
لیکن اسلام کی موجودہ صورت میں انھوں نے اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ بغیر اجتہاد کے اس
زمانہ میں اسلامی تعلیمات کے صحیح خدوخال نہیں اُبھر سکتے۔

ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی نے "العروبۃ" یعنی ARABISM پر ایک مفصل کتاب دو جلدوں میں
لکھی ہے جو زیر طبع ہے، یہ کتاب انھوں نے دو تین سال کی سخت محنت کے بعد انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک
اسٹڈیز کی خاموش اور پرسکون فضا میں ترتیب دی ہے، اس کے علاوہ وہ اچھے مترجم بھی ہیں، اور
انھوں نے کئی عربی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ (ض، ح، ف)

طلبائے کالج کی یونین کی تنظیم نو

انجمن اتحاد جامعہ کے زمانۂ قیام سے طلبائے کالج کی یونین رہی ہے اور جامعہ کی بہت سی

سرگرمیوں میں اس نے ممتاز حصہ لیا ہے۔ مگر چند سال ہوئے بعض مصالح کے پیش نظر رورل انسٹی ٹیوٹ اور کالج کی مشترک یونین بنائی گئی تھی، مگر چند برسوں کے تجربے کے بعد دونوں اداروں کی الگ الگ یونین بنا دی گئیں اور انجمن اتحاد کی از سر نو تنظیم عمل میں آئی۔

اس تنظیم کے بعد ۳ دسمبر کو جناب شیخ الجامعہ کی صدارت میں اس کا پہلا جلسۂ مسند نشینی منعقد ہوا۔ ایڈہاک کمیٹی کے کنوینر ناظم محمد ادریس صاحب نے اپنی رپورٹ پیش کی، اس کے بعد انجمن کے ایک جاتی رکن عبداللطیف اعظمی نے انجمن اتحاد کی شاندار روایات پر مختصر تقریر کی اور اراکین انجمن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ضرورت ہے کہ انجمن کی زندگی اور اس کی سرگرمیوں میں وہ اعلیٰ قدریں پیدا کی جائیں، جو پچھلی انجمن اتحاد کی طرۂ امتیاز تھیں... زمانہ آگے بڑھ رہا ہے، جامعہ وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے، حالات تیزی سے بدل رہے ہیں، آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ جامعہ کی اعلیٰ قدریں اور صحت مند روایات زندہ رہیں اور ان کا روزمرہ کی زندگی میں عمل دخل ہو۔" اس کے بعد منتخب نائب صدر عبدالوکیل صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جس میں موصوف نے انجمن کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا اور اپنے کام کا ایک نقشہ پیش کیا۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ "ہمارا اولین کام یہ ہوگا کہ طلبہ میں اتحاد اور یکجہتی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ہم سب اس سے واقف ہیں کہ آج ہمارے ملک اور قوم کے سامنے ایک چیلنج ہے، انتشار اور اختلاف کی قوتیں بڑی تیزی سے سر اٹھا رہی ہیں اور ملک و قوم کی یکجہتی اور ہم آہنگی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ ظاہر ہے یہ مسئلہ بڑا ہے، لیکن ہم اپنے چھوٹے سے حلقے میں، جہاں ہر مذہب و ملت کے لوگ آزاد خیالی کے ساتھ رہتے ہیں اور رواداری کی فضا میں تعلیم و تربیت پاتے ہیں، نمونے کی ایک چھوٹی سی ایسی برادری بنا سکتے ہیں، جو قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی اچھی مثال ہو۔"

آخر میں شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے انجمن کے نئے عہدہ داروں کو ان کے انتخاب پر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ "مجھے آج بہت خوشی ہے کہ انجمن اتحاد جو کچھ عرصے کے لئے غروب ہو گئی تھی، پھر طلوع ہو گئی ہے۔ مگر اس خوشی کے ساتھ کچھ خوف بھی ہے۔ وہ یہ کہ آج کل کالجوں کی بزم یا انجمن اتحاد جھگڑے اور فساد کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ مسئلہ صرف تعلیم گاہوں کا ہی

نہیں ہے بلکہ سارے ملک کی فضا ہی کچھ ایسی ہے۔ اگر یہ اختلافات — چاہے طالب علموں میں ہوں یا اساتذہ اور بزرگوں میں — اصولی ہوتے تو فوری طور پر چاہے کتنا ہی نقصان ہوتا، مگر آئندہ چل کر فائدہ ہوتا۔ کیونکہ جب دو اصولوں میں ٹکر ہوتی ہے تو بہتر اصول کی جیت ہوتی ہے، مگر چونکہ یہ اختلافات ذاتی اور شخصی ہوتے ہیں، اس لئے ان سے نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔ ملک میں جو اختلافات کی فضا نظر آتی ہے، وہ بہت بڑا تعطل کا باعث ہے۔ اس نے ہماری تہذیبی قدروں کو تباہ کر دیا ہے۔ تہذیب، شائستگی، مذہب اور اخلاق کی کوشش یہی ہے کہ فطری برائیوں کو دور کیا جائے۔ ان برائیوں میں نفسانیت اور انانیت نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ہماری تہذیب یہ تھی کہ خود پیچھے ہو جاتے اور دوسروں کو آگے بڑھا دیتے۔ کہا جاتا۔ پہلے آپ، پہلے آپ۔ مگر اب تمام قدروں کو روند کر آگے بڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور زبان حال سے کہا جاتا ہے پہلے میں، پہلے میں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میں قدیم روایت باقی رہے گی کہ آپ پہل نہ کریں گے اور نہ دوسروں کو دھکا دے کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کے انتخابات بغیر جھگڑے اور بغیر مقابلے کے ہو گئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی یہ یکجہتی باقی رہے گی۔ جامعہ پر بہت بڑی ذمہ داری آنے والی ہے۔ اس سے جامعہ کے لوگ اسی وقت عہدہ برا ہو سکتے ہیں، جب اس کے اساتذہ، کارکنوں اور طالب علموں میں مکمل اتفاق و اتحاد ہو اور سب لوگ کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کریں۔"

(ع ل ا)

اُستادوں کے مدرسہ میں یوم انسانی حقوق

۱۰ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ٹیچرس کالج کی طرف سے یوم انسانی حقوق *Human Rights Day* منایا گیا۔ اس موقع پر شری رامچندرن جی سکریٹری گاندھی سمارک ندھی، نئی دہلی نے مندرجہ بالا موضوع پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ شری رام چندرن نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ صحیح قسم کی تعلیم سے ہی انسانی حقوق کا تحفظ یقینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اس پروگرام میں انگریزی میں مضمون نویسی اور ہندوستانی میں تقریروں کا انعامی مقابلہ بھی شامل تھا۔ ہمارے کالج کے جونیر اور سینیر ڈپلوما کورس کے طلباء نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ بہترین کامیابی حاصل کرنے والے تین تین امیدواروں کو ایک ہزار

مقابلے میں انعام کے طور پر کتابیں پیش کی گئیں۔ تقسیم انعامات کی یہ رسم ہمارے خصوصی مہمان شری راہچندرن جی کے ہاتھوں انجام پائی۔ (س)

تقسیم سرٹیفکیٹ کی تقریب

۱۷ دسمبر کو ایک مختصر سی تقریب میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، قائم مقام شیخ الجامعہ نے یوتھ فیسٹول میں شرکت ہونے والے طلبہ اور طالبات کو سرٹیفکیٹ تقسیم کئے۔ اس کے بعد ان طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ سرٹیفکیٹ جو آپ کو دئے گئے، ان تمغوں کے مانند ہیں، جو ہماری مشرقی سرحد، نیفا سے ہو کر آنے والے فوجی سپاہیوں کو دئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو فیسٹول میں شرکت کا موقع ملا۔ جو آپ کی زندگی کی سرحد کو وسعت دیتا ہے۔ یوتھ فیسٹول کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے دیش کے مختلف حصوں کے لوگ اکٹھا ہوں۔ اگرچہ آمد و رفت کی سہولت کی وجہ سے میل ملاقات کی بہت سی صورتیں نکل آئی ہیں، مگر پھر بھی نوجوان طالب علموں کو اس کے مواقع بہت کم ملتے ہیں اور نئے ہندوستان میں، جہاں قومی اتحاد اور یکجہتی کی سخت ضرورت ہے، اس کے لئے یہ بہت اچھا ذریعہ ہے۔ ہمارے دیش کا کلچر اگرچہ الگ الگ ہے، مگر ان سب کی روح ایک ہے چنانچہ ہندوستان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کثرت میں وحدت کا نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ یوتھ فیسٹول کے اجتماع کا مقصد یہ ہے کہ ملک کی مختلف ریاستوں کے لوگ ایک دوسرے سے ملیں اور سوچیں کہ یہ سب تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی تہذیب رکھتے ہیں۔" تعلیم کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ "تعلیم کا تصور بہت وسیع ہے۔ اس میں وہ تمام مقاصد شامل ہیں، جنھیں کلچرل مشاغل، ڈرامے مباحثے وغیرہ کہتے ہیں، لیکن دوسرے مشاغل کے لئے، جو تعلیم کا اہم جزو ہیں، کوئی موقع نہیں ملتا تھا یوتھ فیسٹول کا ایک مقصد اس ضرورت کو پورا کرنا بھی ہے۔" اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ شرکت کا مقصد صرف انعام حاصل کرنا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس سے بلند ہو کر پوری تیاری کے ساتھ شریک ہونا چاہیئے اور اس کی کوشش ہونی چاہیئے کہ آپ جو چیز بھی پیش کریں اس کا حاضرین پر اچھا اثر پڑے قطع نظر اس کے کہ انعام ملتا ہے یا نہیں۔ میر نے کہا ہے کہ

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ہوتی ہیں اور ناکامی، شکست و فتح کے مختلف اسباب ہوتے ہیں بہرحال "دلِ ناتواں کو مقابلہ خوب کرنا چاہیئے"

اس سے قبل یوتھ فیسٹیول کمیٹی کے داعی جناب عبداللہ ولی بخش قادری صاحب نے شیخ الجامعہ صاحب سے سرٹیفکیٹ تقسیم کرنے کی درخواست کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جامعہ میں کتابی تعلیم کے علاوہ غیر رسمی طور پر تعلیمی مقاصد کو پورا کرنے کی ہمیشہ کوششیں ہوتی رہی ہیں اور غیر نصابی مشاغل کی یہاں ہمیشہ ہمت افزائی کی گئی ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے لیکن اس صورت میں افراد کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اب تک ہمارے یہاں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی، اس لئے اساتذہ کو شخصی اور خصوصی توجہ کرنے کا پورا موقع حاصل تھا لیکن اب ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور آئندہ اس تعداد میں بہت بڑے اضافے کی توقع ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ طلبہ کی تہذیبی زندگی کو بہتر بنانے اور تفریحی مشاغل کو زیادہ منظم اور باقاعدہ بنانے کی طرف توجہ کی جائے۔ یوتھ فیسٹول کی شرکت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ مزید تیاری کے ساتھ اور ایک منصوبے کے ماتحت اس میں شرکت کی جائے گی"۔

(ع ل ا)

(بقیہ تنقید و تبصرہ (صفحہ ۱۶۱)

تبصرہ کے شروع میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کسی زندہ شخص کی زندگی ہی میں خاص نمبر نکالنے سے یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ غلط واقعات کی تصحیح اور بے بنیاد افواہوں کی تردید کا اچھا موقع ہوتا ہے، مگر اس نمبر میں اس طرح کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، بلکہ ایک ہی واقعہ کے متعلق دو متضاد بیانات بغیر کسی اختلافی یا توضیحی نوٹ کے شائع کر دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح ۱۹۶۱ء کے شروع میں جوش صاحب ہندوستان آئے تو یہاں کے متعدد اخبارات نے لکھا کہ وہ ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں! اس کے متعلق ایک روزنامہ کا اداریہ اس نمبر میں نقل کیا گیا ہے لیکن اس کی تردید یا وضاحت میں نہ تو جوش صاحب کی طرف سے کوئی چیز شائع کی گئی ہے اور نہ ادارہ کی طرف سے۔ حالانکہ ضرورت تھی کہ یا تو اس کا جواب شائع کیا جاتا یا سرے سے اس اداریہ کو شائع ہی نہ کیا جاتا ——— بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ اس نمبر میں حضرت جوش صاحب کے بارے میں بہت کافی مواد جمع کیا گیا ہے اور جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لئے اس وقت اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہے۔

سنہ ۱۹۶۱ء کے اُردو ادب کا جائزہ

ہم نے اس سے قبل اعلان کیا تھا کہ رسالہ جامعہ کے سالنامہ میں سنہ ۱۹۶۱ء کے ادبی تعلیمی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیا جائے گا، مگر رسالہ کی مالی حالت کے پیشِ نظر بہت ضخیم نمبر نکالنا ممکن نہیں ہے، اس لئے اب صرف اُردو ادب کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا جائے گا۔ اس خاص نمبر کے مجوزہ مضامین اور مضمون نگار حسب ذیل ہیں:۔

۱۔	پاکستان کی اردو مطبوعات پر ایک نظر	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۲۔	تعلیمی کتابیں	ڈاکٹر سلامت اللہ
۳۔	علمی و مذہبی کتابیں	جناب ضیاءالحسن فاروقی
۴۔	تنقید و تحقیق	جناب راجندر ناتھ شیدا
۵۔	ناول و افسانے	ڈاکٹر قمر رئیس
۶۔	ڈرامے	ڈاکٹر محمد حسن
۷۔	طنز و مزاح	جناب فرقت کاکوروی
۸۔	تراجم	عبداللطیف اعظمی
۹۔	بچوں اور بالغوں کی کتابیں	جناب محمد حسین حسان
۱۰۔	اُردو شاعری	جناب رشید حسن خاں
۱۱۔	سنہ ۱۹۶۱ء میں جن ادیبوں کا انتقال ہوا	جناب عابد رضا بیدار
۱۲۔	مطبوعات سنہ ۱۹۶۱ء پر ایک نظر	ع ل ا

رُباعیات حکیم عُمر خیّام

۳۱۰ صفحات پر پھیلی ہوئی عُمر خیّام کی رُباعیوں اور اُن کی
دلکش تصویروں کا یہ حسین و جمیل مُرقع کسی تعریف و تحسین کا محتاج
نہیں۔ طاہر ایران کمپنی (طہران) نے فارسی اور عربی زبان کے
ساتھ ساتھ ان رُباعیوں کا فرنچ اور جرمن میں ترجمہ پیش
کرکے عُمر خیّام کی خدمت میں بیش بہا ہدیۂ عقیدت پیش
کیا ہے۔ اور اکبر تجویدی کی "مُصوّر رباعیوں" نے تو کتاب
کی خوب صورتی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

قیمت :- ۲۵ روپے

(یہ کتاب ہندوستان میں پہلی بار برائے فروخت آئی ہے)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

Printer & Publisher : A. L. Azmi
Printed at : Union Printing Press, Delhi-6.
Only cover printed at : Dayals' Printing Press,

سالنامہ

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت سالنامہ
ایک روپیہ

جلد ۴۶ | بابت ماہ فروری ۱۹۶۲ء | شمارہ ۴، ۵

فہرست مضامین

پاکستان کی اُردو مطبوعات پر ایک نظر

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پاکستان میں آج کل ہر سال اردو کی بے شمار کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان میں معیاری اور غیر معیاری دونوں کتابیں شامل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان میں زیادہ تعداد عام طور پر غیر معیاری کتابوں کی ہوتی ہے جو محض کاروباری مقصد سے شائع کی جاتی ہیں۔ لیکن ایسی کتابوں کی بھی کمی نہیں ہے جن کو شائع کرنے کا مقصد علمی اور ادبی ہوتا ہے۔ علمی و ادبی کتابیں کچھ تو وہ ادارے شائع کرتے ہیں جن کو خود حکومت نے قائم کیا ہے۔ یا پھر وہ ادارے ہیں جن کو حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے۔ ان میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ، مجلس ترقی ادب، بزم اقبال، اردو اکیڈمی، مغربی پاکستان پنجابی اکیڈمی، پشتو اکیڈمی، اردو اکیڈمی بہاول پور، ترقی اردو بورڈ کراچی، اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ایسے ادارے بھی ہیں جن کے پیش نظر اردو زبان کی خدمت ہے اور جو اسی جذبے سے اُردو کی علمی و ادبی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ ان میں انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی اور اکادمی پنجاب لاہور خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ بعض ناشر بھی ایسے ہیں جو باوجود اپنی کاروباری مصروفیتوں کے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان میں اُردو اکیڈمی سندھ کراچی، اُردو دنیا کراچی، اُردو مرکز لاہور، مکتبۂ جدید لاہور، مکتبۂ اُردو لاہور، نیا ادارہ لاہور، فیروز سنز لاہور اور شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور وغیرہ کا نام سرفہرست ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں بھی یہی ادارے علمی اور ادبی کتابیں شائع کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ اور انھوں نے سینکڑوں کی تعداد میں ایسی علمی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں جن سے پاکستان کے علمی اور ادبی ماحول پر روشنی پڑتی ہے۔

گزشتہ کئی سال سے پاکستان میں کلاسیکی اور اُردو ادب کی ان کتابوں کو از سرِ نو شائع کرنے

کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے جو عرصہ ہوا چھپی تھیں، لیکن اب نایاب ہیں۔ چنانچہ لاہور میں مجلس ترقی ادب نے اور کراچی میں ترقی اُردو بورڈ اور انجمن ترقی اُردو پاکستان نے کلاسیکی ادب کو از سرِ نو شائع کرنے کے منصوبے بنائے۔ گزشتہ سال اس منصوبے نے عملی شکل اختیار کی اور لاہور اور کراچی دونوں مقامات سے بعض اہم کتابوں کے سستے اڈیشن شائع ہوئے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے "مسافرانِ لندن" کے نام سے سرسید کا سفر نامہ شائع کیا۔ اس کتاب میں سرسید کے سفرِ لندن کے حالات ہیں اور اب یہ پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ماسٹر پیارے لال آشوب اور کرنل ہالرائیڈ نے مل کر جو کتاب "رسوم ہند" کے نام سے مرتب کی تھی اور جو اس سے قبل شائع بھی ہو چکی تھی وہ اب مجلس ترقی ادب لاہور سے از سرِ نو شائع ہوئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "قصص ہند" عرصے سے نایاب تھی۔ گزشتہ سال اس کو مکمل صورت میں مجلس نے شائع کر دیا ہے۔ مولانا حالی کی حیاتِ سعدی اور سوانح مولانا روم کے نئے اڈیشن بھی چھپ کر شائع ہوئے ہیں۔ ناولوں میں نذیر احمد کے ابن الوقت اور شرر کے فردوسِ بریں کو شائع کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ داغ کا دیوان مہتابِ داغ اور دیوان خواجہ میر دردؔ صحت کے ساتھ چھاپے گئے ہیں۔ مہاکوی کالی داس کا ڈرامہ وکرم اروسی جس کا ترجمہ عزیز مرزا لکھنوی نے کیا تھا، اور جو عرصے سے نایاب تھا اب اس کا نیا اڈیشن شائع ہوا ہے۔ بزمِ اقبال لاہور نے علامہ اقبالؒ کے جاوید نامہ کا ترجمہ بھی انگریزی میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے مترجم عبدالکریم خاں ہیں اور انھوں نے علامہ کی فارسی نظموں کو انگریزی نظم کے سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔

کراچی میں جو ترقی اُردو بورڈ اُردو لغت کا کام کر رہا ہے۔ اس نے لغات کے دو حصوں کے علاوہ گزشتہ سال اُردو کی چند نایاب کتابوں کو شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ ان میں نذیر احمد کی منتخب الحکایات اور مراۃ العروس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ منتخب الحکایات کو شاہد احمد دہلوی نے مرتب کیا ہے۔ شروع میں مقدمہ اور آخر میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ مراۃ العروس کو ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب بھی مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ راشد الخیری کی کتاب منازل السائرہ بھی ترقی اُردو بورڈ کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس کو

[illegible] صاحب نے مرتب کیا ہے اور اُن کے مقدمہ و فرہنگ کے ساتھ یہ بھی کراچی سے شائع ہوئی ہے۔
یہ کام اپنی جگہ اہم ہے۔ کیونکہ اس طرح اُردو کی بعض ایسی کتابیں جو عرصہ ہوا شائع ہو کر نایاب ہو چکی تھیں اب از سر نو شائع ہو گئی ہیں لیکن ابھی تک اردو شاعروں کے بہت سے دیوان اور تذکرے اور بعض داستانیں اور قصّے کہانیاں غیر مطبوعہ ہیں۔ بے شمار مخطوطے ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے کتب خانوں میں ایسے ہیں جن کی اشاعت اردو کلاسیکی ادب کے سرمائے میں بہت بڑا اضافہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ادارے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو شاید انھیں ایک اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا موقع ملتا۔

گزشتہ سال علمی، ادبی اور تنقیدی کتابیں ہمارے یہاں خاصی تعداد میں شائع ہوئی ہیں۔ انجمن ترقی اردو پاکستان اس کام میں پیش پیش رہی ہے۔ قاموس الکتب کی ترتیب و تدوین کا کام عرصے سے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی زیر نگرانی ہو رہا تھا۔ انتظام اللہ شہابی اس کام میں اُن کے دست راست کی حیثیت رکھتے تھے۔ اب یہ قاموس الکتب بڑے سائز کے کئی ہزار صفحات پر چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ اس میں صرف اُردو کی کتابوں کا تذکرہ ہے ـــــ اس میں بابائے اُردو کا مقدمہ بھی شامل ہے ـــــ بابائے اُردو مرحوم کی کتاب 'قدیم اُردو' بھی گزشتہ سال انجمن نے شائع کی ہے۔ اس میں ان کے وہ مقالات شامل ہیں جو انھوں نے قدیم اُردو کے شاعروں اور نثر نگاروں پر لکھے تھے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق رح، حضرت شاہ برہان الدین جانم رح، حضرت شاہ امین الدین اعلیٰ رح، شاہ علی محمد جیو گام دھنی رح، میاں شیخ خوب محمد چشتی رح، حسن شوقی، قاضی محمود دریائی، مُلّا عشرتی، سید احمد ہنر، علی احسان، پُرانی اُردو میں قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیریں، دکنی اُردو میں شاہنامے کی داستانیں، اُردو زبان کا اپنا قدیم کتبہ، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، مثنوی خالق باری، شرح تمہید ہمدانی، مثنوی وفات نامہ حضرت فاطمہ، مُلّا وجہی کی سب رس اور سب رس منظوم۔ اس مجموعے کے اہم مقالات اور تبصرے ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن نے وحید الدین سلیم کے متفرق مضامین بھی مضامین سلیم کے نام سے یک جا کر کے شائع کئے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی کتاب 'غالب، کا فکر و فن' بھی انجمن سے شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب

کی کتاب سرشار کی ناول نگاری بھی گزشتہ سال شائع ہوئی ہے ـــــ یہ ۱۶۴ صفحے کی بسوط کتاب ہے جس میں سرشار کے فن کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ انجمن نے نئی علمی کتابیں شائع کی ہیں ان میں کارل مارکس کی کتاب داس کیپٹل کا اردو ترجمہ قابل ذکر ہے۔ اس کا ترجمہ سید محمد تقی صاحب نے کیا ہے اور اس پر جو محنت کی ہے اس کا اندازہ کتاب کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ انجمن نے گزشتہ سال اپنی بعض نایاب کتابوں کے نئے اڈیشن بھی شائع کئے ہیں۔ راقم کی کتاب اردو تنقید کا ارتقاء قیام پاکستان کے فوراً بعد انجمن سے شائع ہوئی تھی۔ بہت تھوڑے عرصے میں اس کا اڈیشن ختم ہو گیا تھا اور وہ ایک زمانے سے نایاب تھی۔ انجمن نے اس کا نیا اڈیشن شائع کر دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ کتاب نظر ثانی کے بغیر چھپی ہے۔ یہ کتاب آج سے سترہ اٹھارہ سال قبل لکھی گئی تھی۔ اس عرصہ میں اردو تنقید میں خاصا کام ہوا ہے۔ اس لئے اس میں ترمیم و اضافہ ضروری تھا۔ اب انشاءاللہ جلد اس کا نیا اڈیشن ترمیم و اضافہ کے بعد راقم کی نگرانی میں شائع ہو گا۔ ارسطو کی بوطیقا مترجمہ عزیز احمد بھی عرصہ سے نایاب تھی۔ انجمن نے یہ کتاب بھی از سر نو شائع کر دی ہے۔

اردو دنیا کراچی نے گزشتہ سال راقم کی دو کتابیں شائع کی ہیں۔ ایک تو جدید شاعری اور دوسری مومن اور مطالعہ مومن ـــــ جدید شاعری بڑے سائز پر ساڑھے چھ سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک کی جدید شاعری کے رجحانات اور جدید شعرا کے کارناموں کا تنقیدی تجزیہ ہے۔ جدید شاعری کے مسائل پر بھی اس میں بحث ہے اور تمام جدید شعرا کے حالات بھی درج ہیں ـــــ مومن اور مطالعہ مومن میں انیسویں صدی کی دلی کے مشہور شاعر حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی کے حالات، ان کی شخصیت، فارسی و اردو تصانیف، غزل گوئی، مثنوی نگاری اور ادبی اہمیت کا جائزہ ہے ـــــ اس کی ضخامت ساڑھے پانچ سو صفحات ہے اور یہ بھی بڑے سائز پر چھپی ہے۔

کراچی کا ایک اور ادارہ اردو اکیڈمی سندھ بھی گزشتہ سال علمی تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع کرنے میں پیش پیش رہا ـــــ اس ادارے نے جو علمی کتابیں شائع کیں ان میں تذکرہ صوفیائے سندھ، اور تاریخ تعلیم اہمیت رکھتی ہیں ـــــ اول الذکر میں سندھ کے صوفیا کے حالات ہیں ـــــ یہ اعجاز الحق قدوسی صاحب

... ہے اور انھوں نے اس کتاب پر خاصی محنت کی ہے۔ آخرالذکر کتاب کے مولف خالد یار خاں صاحب ہیں۔ انھوں نے قدیم زمانے سے لے کر اس وقت تک کے تعلیمی نظریات کو اس کتاب میں بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے ـــــ ادبی اور تنقیدی کتابوں میں دکنی ادب کی تاریخ، مکتوبات بابائے اُردو، داستان سے افسانے تک، اُردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقا، علمی نقوش، اُردو کی تین مثنویاں، تخلیق و تنقید اور انتخاب خطوط غالب اور مقالات یوم شبلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دکنی ادب کی تاریخ کوئی دو سو صفحے کی مختصر سی کتاب ہے جس کے مولف ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ہیں اس میں بہمنی عہد، قطب شاہی، عادل شاہی عہد اور مغلیہ عہد کی دکنی شاعری اور نثر کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ ہے۔ مکتوبات بابائے اُردو حکیم امامی بنگلوری صاحب کی تالیف ہے۔ دو سو صفحے کی اس مختصر سی کتاب میں انھوں نے وہ خطوط جمع کر دئے ہیں جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے انھیں اپنی زندگی میں لکھے تھے ـــــ یہ خطوط نجی ہیں لیکن ان میں جگہ جگہ ایسے بیانات ہیں جن سے لسانی، ادبی اور تنقیدی معاملات و مسائل پر روشنی پڑتی ہے "داستان سے افسانے تک" سید وقار عظیم صاحب کی تالیف ہے۔ بڑے سائز پر چھپی ہوئی کوئی چار سو صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک ہی کتاب ہے۔ اُردو ادب میں سوانح نگاری کا ارتقا، الطاف فاطمہ کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایم اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا گزشتہ سال یہ کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں اُردو سوانح نگاری کا تاریخی و تنقیدی جائزہ ہے۔ چھوٹے سائز کے ساڑھے تین سو صفحے کی یہ کتاب اپنی جگہ مکمل ہے اور اس سے اردو سوانح نگاری کے ارتقائی مدوجزر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے "علمی نقوش" ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں بعض مضامین مثلاً ولی ویلوری کی تین مثنویاں، ولی گجراتی کا غیر مطبوعہ کلام خاکی، حضرت شرف الدین یحیٰے "منیری کے فالنامے ملفوظات شیخ وجیہہ الدین گجراتی، اُردو املا کی تاریخ، میر کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ عبدالحیٔ تاباں۔ متین بُرہان پوری کے اردو مرثیے اور خلاصۃ الاخبار قابل ذکر ہیں ـــــ اردو کی تین مثنویاں رشید اللہ خاں صاحب کے تین مضامین کا مجموعہ ہے اس میں میر حسن کی سحرالبیان دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم اور زہر عشق کا تنقیدی مطالعہ ہے "تخلیق و تنقید" عبدالسلام صاحب کے

تنقیدی مضامین کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ اس میں ابن الوقت، فردوس بریں، امراؤ جان ادا، خواجہ میر درد، رقعات غالب، غالب کا نظریۂ عشق، فسانۂ عجائب، آتش، اختر شیرانی کا مطالعہ ہے۔ یہ مضامین طالب علموں کے لئے لکھے گئے ہیں اور اس اعتبار سے مفید ہیں۔ راقم کا مرتب کیا ہوا غالب کے خطوط کا انتخاب کوئی چھ سات سال قبل اُردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا تھا۔ اب اس کا نیا اڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ غالب کے خطوط کا یہ انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ اس سے غالب کی زندگی کے حالات سامنے آجاتے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ اپنے بارے میں لکھا ہے اس کو ان کے خطوط سے نکال کر اس مجموعے میں کچھ اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ یہ کتاب ان کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے شروع میں خطوط غالب کی اہمیت کے بارے میں ایک مفصل مقدمہ بھی شامل ہے۔

"مقالات یوم شبلی" کو اُردو اکیڈمی سندھ کی شاخ اردو مرکز لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز پر خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے۔ تین سو صفحے کی اس کتاب میں وہ مضامین شامل ہیں جو اسلامیہ کالج چینوٹ کے رسالے "البصیر" کے شبلی نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ نئے مضامین کا اس مجموعے میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کے مرتب اسلامیہ کالج چینوٹ کے اُستاد عبیداللہ خاں صاحب ہیں اور انھوں نے اس میں شبلی کی تصانیف، شبلی کی سیاسی شاعری شبلی کی تنقید نگاری، مقالات شبلی، شبلی اور سیرۃ النبی، علی گڑھ میں شبلی کا قیام کے ایسے اہم موضوعات پر معروف لکھنے والوں کے مقالات جمع کر دیئے ہیں۔

اُردو اکیڈمی سندھ اور اُردو مرکز کے علاوہ بعض دوسرے اداروں نے بھی کچھ علمی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔ کراچی کے ایک ناشر نے حکومت پاکستان کی مدد سے نوراللغات کی تمام جلدیں شائع کردی ہیں۔ آخری جلد گزشتہ سال شائع ہوئی ہے۔ اس طرح نوراللغات اب نایاب نہیں رہی۔ پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز کراچی نے تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد شائع کی ہے۔ اس کو عبدالقیوم صاحب نے مرتب کی ہے اور اس میں ابتدا سے ۱۷۰۰ء تک کے اردو ادب کا تاریخی جائزہ ہے۔ انجمن مصنفین پاکستان (پاکستانی رائٹرز گلڈ) کے اشاعت گھر نے ڈاکٹر سید شاہ علی کی کتاب اُردو میں سوانح نگاری' شائع کردی ہے۔ یہ کتاب دراصل پی ایچ ڈی کا

مقالہ ہے جو انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا۔ اب یہ کتابی صورت میں چھپا ہے۔ اس میں اُردو سوانح نگاری کا تاریخی و تنقیدی جائزہ ہے جس کو مؤلف نے محنت سے تیار کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے فکر و فن پر ہمارے یہاں آج کل خاصا کام ہو رہا ہے۔ بزم اقبال لاہور اور اقبال اکیڈمی کراچی نے علامہ کے بارے میں اب تک بعض اہم کتابیں چھاپی ہیں۔ لاہور سے پروفیسر عابد علی عابد کی کتاب شعر اقبال اور سید نذیر نیازی کی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ اس سے پہلی شائع ہو چکی ہیں۔ اول الذکر علامہ کے فن کا تنقیدی جائزہ ہے اور آخر الذکر علامہ کے انگریزی لکچروں کا اردو ترجمہ ہے جس کو سید نذیر نیازی صاحب نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ گزشتہ سال جاوید نامے کے ترجمے کے علاوہ لاہور کی بزم اقبال نے کوئی قابل ذکر کتاب شائع نہیں کی۔ البتہ کراچی کی اقبال اکیڈمی نے علامہؒ کے بارے میں بعض اہم کتابیں چھاپی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر نور الدین کی کتاب تصوف اور علامہ اقبال، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتاب اقبال کے آخری دو سال، نظر حیدر آبادی کی کتاب اقبال اور حیدر آباد، محمد عثمان صاحب کی "اسرار و رموز پر ایک نظر" رئیس احمد جعفری صاحب کی "اقبال اور سیاست ملی" اور علامہ اقبال کی کتاب "علم الاقتصاد" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں سے علامہ کی زندگی ان کی شخصیت اور فن کے بعض نئے گوشے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے مضامین، خاکے اور انشایئے بھی گزشتہ سال ہمارے یہاں خاصی تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی کتاب "چند ہم عصر" کا نیا اڈیشن اس سال پھر شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل مولوی صاحب مرحوم کے یہ دلچسپ خاکے انجمن ترقی اُردو سے شائع ہوئے تھے۔ اب ان کو اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کا خاکہ "نذیر احمد کی کہانی" بھی اسی ادارے سے شائع ہوا ہے دلی کا ایک یادگار مشاعرہ اکیڈمی لائبریری کی سیریز میں از سر نو چھاپا گیا ہے ــــ جگر صاحب مرحوم کی شخصیت پر ایک مختصر سی کتاب تذکرۂ جگر کے نام سے محمود علی خاں صاحب جامعی نے لکھی ہے۔ اس لئے بہت دلچسپ ہے۔ ضیاء الدین احمد برنی صاحب کی کتاب "عظمت رفتہ" تعلیمی مرکز کراچی

سے شائع ہوئی ہے۔ ۵۱۲ صفحے کی یہ کتاب ٹائپ میں بہت خوب صورت چھپی ہے۔ اس کتاب میں برنی صاحب نے ان شخصیتوں کے حالات لکھے ہیں جن کو انھوں نے دیکھا یا جن سے انھیں ملنے کا موقع ملا ـــــ ۹۳ شخصیتوں پر انھوں نے اس کتاب میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ کر ان شخصیتوں کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ شخصیتوں میں سیاسی رہنما، معلم، ادیب، شاعر، صحافی، سب ہی شامل ہیں۔ بیسویں صدی کے ہندوستان کی شاید ہی کوئی اہم شخصیت ہو جس پر برنی صاحب نے اظہار خیال نہ کیا ہو ـــــ ہلکے پھلکے مضمون اور انشائیوں کے تین مجموعے گزشتہ سال شائع ہوئے ہیں۔ ایک تو نظیر صدیقی کا "شہرت کی خاطر" دوسرے مشتاق احمد یوسفی کا "چراغ تلے" اور تیسرے وزیر آغا کا "خیال پارے"۔ "شہرت کی خاطر" ہلکے پھلکے مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں جگہ جگہ مزاح کا پہلو اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اس کو پاک کتاب گھر، پٹواٹلی ڈھاکہ مشرقی پاکستان نے شائع کیا ہے ـــــ "چراغ تلے"، مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ بھی چند ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر مضمون کو پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے اور ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔ اسلوب اور انداز بیان میں بھی ایک انفرادی شان ہے۔ "خیال پارے" میں وزیر آغا صاحب کے کچھ انشائیے شامل ہیں۔ انشائیوں کے اس مختصر مجموعے کو اکیڈمی پنجاب لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ انشائیے انگریزی کے (LIGHT ESSAY) کے طرز پر لکھے گئے ہیں اور اردو میں ایک نیا تجربہ ہیں۔ اس لحاظ سے ان میں دلچسپی کا خاصا سامان ہے۔

ناولوں کا بازار اگرچہ اب بڑی حد تک سرد ہو گیا ہے لیکن اب بھی تاریخی یا جنسی اور رومانی ناول عام پڑھنے والوں کے لئے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ایسے ناول نہ ہونے کے برابر ہیں جن میں ناول کی فنی اقدار موجود ہوں۔ گزشتہ سال بھی ایسے کئی ناول شائع ہوئے ہیں۔ قدیم ناولوں میں منشی سجاد حسین کا مزاحیہ ناول "حاجی بغلول" از سر نو شائع ہوا ہے۔ جمیل جالبی صاحب نے مقدمہ اور فرہنگ کے ساتھ اس کو کراچی سے شائع کیا ہے۔ نذیر احمد "توبۃ النصوح" اور "فسانۂ مبتلا" کے بھی نئے اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ مرزا محمد ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا"، "شریف زادہ"، "ذات شریف" اور "اختری بیگم" کو بھی از سر نو شائع کیا گیا ہے ـــــ ان ناولوں کے سستے اڈیشن اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کئے ہیں اور یہ ایک مستحسن اقدام ہے۔ نئے لکھنے والوں کے معیاری ناول گزشتہ سال بہت کم منظر عام پر آئے ہیں۔ کرشن چندر

نے ناول "سڑک واپس جاتی ہے" اور "ایک عورت ہزار دیوانے" مکتبۂ افکار کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں رومان و حقیقت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی دھوپ چھاؤں کو یک جا کرنا کرشن چندر کے فن کا نمایاں ترین وصف ہے۔ "سڑک واپس جاتی ہے" میں بمبئی میں فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والوں کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ "ایک عورت ہزار دیوانے" میں خانہ بدوشوں کی زندگی کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کشی ہے۔ یہ ناول دلچسپ ہیں۔ ان میں افادیت کا رنگ بھی موجود ہے لیکن ان کا کنوس بہت بڑا نہیں ہے۔ اسی لیے یہ ناول سے زیادہ ناولٹ کی تکنیک سے قریب ہیں۔ کرشن چندر کے دل موہ لینے والے انداز نے ان کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کا ناول "سنگم" بھی کراچی سے شائع ہوا ہے۔ یہ ناول ایک تجربہ ہے۔ اس میں ہند و پاکستان کے تاریخی مد و جزر کے اثرات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب نے ورجینا وولف کی تکنیک کو اپنے لیے شمع راہ بنایا ہے۔ ناول دلچسپ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ــــ "علی پور کا ایلی" ممتاز مفتی کا ضخیم ناول ہے جس کو داستان گو لاہور نے شائع کیا ہے۔ ڈیڑھ ہزار صفحے کے اس ناول میں متوسط طبقے کے ایک فرد کی زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ دراصل یہ مصنف کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے جس کو ناول کا روپ دے دیا گیا ہے۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہت اچھی تصویر اس ناول میں موجود ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کا یہ ایک ہی ناول ہے۔ اس نے ہماری ناول نگاری کی روایت میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول "تلاشِ بہاراں" بھی گزشتہ سال شائع ہوا ہے۔ اس میں عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں اصلاح کا پہلو غالب ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ اوسط درجے کا ناول ہے۔ اس موضوع پر خاصی تعداد میں ناول لکھے جا چکے ہیں۔

ادھر چند سال سے مختصر افسانوں اور ڈراموں سے دلچسپی کچھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر سال بس گنتی کے چند مجموعے چھپ جاتے ہیں۔ گزشتہ سال افسانوں اور ڈراموں کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ عصمت چغتائی کے

افسانوں کے جو مجموعے 'کلیاں' اور 'چوٹیں' کے نام سے چھپے تھے، اب ان کے نئے اڈیشن اُردو مرکز لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ محمد حسن عسکری کے افسانوں کا مجموعہ 'جزیرے' بھی آئینۂ ادب لاہور نے شائع کر دیا ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کا نیا مجموعہ 'ایک خوشبو اُڑی اُڑی سی' مکتبۂ افکار کراچی سے شائع ہوا ہے اس میں کرشن چندر کے مندرجۂ ذیل افسانے شامل ہیں:۔

جنتا سے ابنتا تک، گل دان، ایک خوشبو اڑی اڑی سی، کھٹے انار میٹھے انار، چینی پنکھا، موہن جو دارو کا خزانہ، پرتو، دودھ کا دودھ پانی کا پانی، بیمار باپ، پتی اور وزیر، وزیروں کا کلب، اشوک کی موت، چور، بے داغ فولاد، دل کسی کا دوست نہیں، پیپرن ۔۔۔ ان افسانوں میں کرشن چندر کا مخصوص انداز نمایاں ہے۔ ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی افسانہ نگاری کا فن اب بھی شباب پر ہے ۔۔۔ انجمن مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ) کے اشاعت گھر نے گزشتہ سال افسانوں کے دو مجموعے شائع کئے ہیں۔ ایک تو ہاجرہ مسرور کا "تیسری منزل" اور دوسرا انور کا 'سورج بھی تماشائی'۔ ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا یہ چوتھا مجموعہ ہے، اور اس میں ان کے مندرجۂ ذیل پندرہ افسانے شامل ہیں:۔

"تیسری منزل، موج اور رتھ، مول تول، فاصلے، نئے اور پرانے، کنیز، بھالو، صندوقچہ، بے چاری، فضل دین، ایک سفر ایک اشتہار، گائے، بھاگ بھری، موت اور دودھ، محبت اور ۔۔۔ ہاجرہ مسرور نے ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ان افسانوں میں بڑی خوبی سے کی ہے۔ انور کا مجموعہ 'سورج بھی تماشائی' ان کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں ان کے یہ بارہ افسانے شامل ہیں جنس اور جینیس، کمند، انتخاب، زرنگار، صبح کرنا شام کا، کالی انگلی، بحر ہے پایاب مجھے، دل کی گہرائیوں میں، طوفان، ہیروں کا ہار، زردان ۔۔۔ یہ افسانے دلچسپ ہیں کیونکہ ان میں زندگی اور فن کا امتزاج موجود ہے۔ فہمیدہ اختر کے افسانوں کا مجموعہ 'اپنے دیس میں'، گزشتہ سال یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور سے شائع ہوا ہے۔ فہمیدہ اختر نے پٹھانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بعض بہت اچھے افسانے لکھے ہیں۔ اس مجموعے میں جو افسانے شامل ہیں، ان میں سے بیشتر میں اسی فضا کی مصوری ہے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ کامیاب افسانے ہیں ۔۔۔ یک بابی ڈراموں کا صرف

یہ مجموعہ فصیلِ شب، انجمن مصنفین پاکستان نے شائع کیا ہے۔ اس کے مصنف مرزا ادیب ہیں
متوسط طبقے کی زندگی پر ڈرامے لکھتے رہے ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے مندرجہ ذیل نو ڈرامے شامل ہیں۔ اماں
جان، اپنا اپنا راگ، وعدہ، اندھیروں کے سائے، آقائے ولی نعمت، دروازہ، شیشے کی دیوار، جمیلہ،
بالآخر، اس کے علاوہ شیخ غلام علی اینڈ سنز نے اردو ڈراموں کا ایک انتخاب بھی دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔
اس کے مرتب کمال احمد رضوی ہیں اور اس میں ڈاکٹر عابد حسین صاحب، مجیب صاحب، کرشن چندر،
عصمت، منٹو، بیدی اور ابراہیم جلیس وغیرہ کے ڈرامے شامل ہیں۔

گزشتہ سال نظموں اور غزلوں کے بعض اہم مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جذبات نادر، کے نام
سے نادر کاکوروی کے نظموں کا مجموعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ
پاکستان کے مشہور شاعر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کا مجموعۂ کلام انجمن" مکتبۂ جدید لاہور سے شائع
ہوا ہے۔ اس میں ان کا اردو، فارسی اور پنجابی کلام یک جا کیا گیا ہے۔ صوفی صاحب پختہ مشق
شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک دل موہ لینے والی کیفیت ہوتی ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں
میں بھی یہی خصوصیت پائی جاتی ہے — یوسف ظفر کا مجموعہ صدالصحرا، انجمن مصنفین پاکستان
(پاکستان رائٹرز گلڈ) کے اشاعت گھر نے شائع کیا ہے۔ اس میں ان کی غزلیں اور نظمیں شامل
ہیں۔ یوسف ظفر صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا مخصوص انداز اس مجموعے میں بھی نمایاں
ہے۔ مشہور نوجوان شاعر احمد ریاض مرحوم کا مجموعہ کلام 'سرخ خون' کے نام سے مجلس یادگارِ ریاض
لائل پور نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی — احمد ریاض زندگی کا گہرا
شعور رکھتے تھے۔ ان کا زاویۂ نظر ترقی پسندانہ تھا۔ اس کی جھلک اس مجموعے میں بھی نظر
آتی ہے — جمیل ملک نوجوان غزل گو شاعروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا
مجموعہ سرِ دِ چراغاں، گزشتہ سال گوشۂ ادب لاہور نے شائع کیا ہے — مشہور نوجوان شاعر
منیر نیازی کا دوسرا مجموعہ کلام " جنگل میں دھنک" نیا ادارہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ منیر
جدت پسند شاعر ہیں۔ یہ جدت پسندی اس مجموعے کی نظموں میں بھی نمایاں ہے — یہ نظمیں
بہت دل کش ہیں۔ انجم اعظمی کا مجموعہ کلام لہو کے چراغ، کراچی آرٹ اکیڈمی سے شائع ہوا ہے۔

اس میں انجم کی نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں ایک نیا انداز ملتا ہے ــــ جدید شاعروں میں عبدالعزیز خالد کا نام بہت نمایاں ہے۔ گزشتہ سال ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سرود رفتہ غزل الغزلات، زنجیر رم آہو، دکان شیشہ گر اور سلومی خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ سرود رفتہ یونانی شاعرہ سیفو۔۔ کی نظموں کا منظوم ترجمہ ہے۔ غزل الغزلات عہد نامۂ عتیق کے نغمۂ سلیمان کا منظوم ترجمہ ہے۔ زنجیر رم آہو میں خالد کی طویل اور مختصر طبع زاد نظمیں شامل ہیں۔ دکان شیشہ گر اور سلومی منظوم ڈرامے ہیں۔ عبدالعزیز خالد جدت پسند شاعر ہیں۔ یہ جدت پسندی ان کے ان مجموعوں میں بھی نمایاں ہے۔ ابن انشا نے چینی نظموں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جو لاہور اکیڈمی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں قدیم و جدید چینی نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ ابن انشا خود اچھے شاعر ہیں، اس لئے انھوں نے اصل چینی نظموں کی شعریت کو حتی الامکان برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

آج کل ہمارے یہاں ترجموں کا بہت زور ہے۔ مکتبۂ فرینکلن نے بہت سی امریکی کتابوں کے اردو ترجمے شائع کئے ہیں۔ ان میں آبادی کا مسئلہ (مترجمہ شبلی ام کام) فلسفے کی نئی تشکیل (مترجمہ انتظار حسین) عجائبات کیمیا (مترجمہ محمد فاروق) سائنس باتوں باتوں میں (مترجمہ علی ناصر زیدی) عرب دنیا (مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین)، ستاروں سے آگے (مترجمہ مولانا صلاح الدین احمد) حیوانی زندگی کا ماضی وحال (مترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد) وغیرہ اہمیت رکھتی ہیں ــــ ٹی ایس ایلیٹ کے مضامین کا ترجمہ "ایلیٹ کے مضامین" اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مترجم جمیل جالبی صاحب ہیں، اور انھوں نے یہ ترجمہ کرکے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں ایلیٹ کے دو مضامین شامل ہیں جو اس نے شاعری پر لکھے ہیں ــــ امریکی ناول کا ترجمہ سید وقار عظیم صاحب نے کیا ہے اور آئینہ ادب لاہور نے اس کو شائع کیا ہے ــــ بعض عربی کتابوں کے ترجمے بھی لاہور اور کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر کا مقصد کاروباری ہے ــــــــ یہ ہے مختصر جائزہ پاکستان کی ان اردو مطبوعات کا جو گزشتہ سال شائع ہوئی ہیں۔ اس سے اس ادبی ماحول کی ایک جھلک نظر آتی ہے جو آج کل ہمارے یہاں موجود ہے، اور ان رجحانات کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو آج ہمارے ادبی ماحول میں نمایاں ہیں۔

پچھلے دو سال کا تحقیقی اور تنقیدی ادب

جناب راجندر ناتھ شیدا

[پیش نظر مضمون جامعہ کے تعلیمی میلا منعقدہ
نومبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں
دو سال کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے،
نظر ثانی اور اضافے کے بعد سالنامہ میں
شائع کیا جا رہا ہے۔]

۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں اردو میں تحقیقی اور تنقیدی ادب کا جو اضافہ ہوا ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے پیشتر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے اس مقالے کا تعلق محض ان تصانیف سے ہے جو ان دو برسوں میں ہندوستان میں شائع ہوئی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسی زمانے میں پاکستان میں بھی اس طرح کی کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن فی الحال وہ میرے پیش نظر نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان میں شائع ہونے والی بھی کوئی واقعی اچھی کتاب نظر انداز ہو گئی ہو یا انتخاب کے معاملے میں کوئی صاحب مجھ سے متفق نہ ہوں اگر ایسا ہے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں اس لئے اس سے قطع نظر ہمیں اپنی توجہ کو محض انہی مطبوعات پر مرکوز رکھنا چاہیئے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ان کے نام ہیں "گل کرسٹ اور اس کا عہد"۔ "غالب۔" غالب کی نادر تحریریں"۔ "پردیسی کے خطوط"۔ اور "انشاء اللہ خاں عہد اور فن"۔

تحقیق اور تنقید ادب کی دو جداگانہ شاخیں ہیں اگرچہ اکثر اوقات یہ یکجا نظر آتی ہیں۔ ان کے مقاصد میں بھی بڑا اختلاف ہے تحقیق کا کام زیادہ تر معلوم ادبی حقائق کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ چلانا اور نئے حقائق کی جستجو کرنا ہے جب کہ تنقید کا کام ادب کی قدروں کا تعین ہے یہ دونوں چیزیں اس لئے گھل مل جاتی ہیں کہ محقق کو ادبی قدروں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے اور نقاد حقائق سے

روگردانی کر کے اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بہر کیف تنقید کا کام نسبتاً زیادہ علمی نوعیت کا ہے اور تنقید کا زیادہ جانچ پرکھ کا۔ آج ادبی قدروں کا تعین محض جمالیاتی اور فنی حقائق ہی کو نظر میں رکھ کر نہیں کیا جا سکتا بلکہ نقاد کے لئے ادب کے محرکات اور اثرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اسے ادب کو سماج کے وسیع تر رجحانات کی روشنی میں دیکھنا ہوتا ہے اور تاریخ کے پراگندہ واقعات میں سے ان حقائق کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو ادیب کے شعور پر اثر انداز ہو کر اس کے ادب کو ایک مخصوص صورت دینے کا باعث بنے۔ ایسا نہ کر سکنے کی صورت میں نقاد کی رایوں کو زیادہ قابلِ اعتنا قرار نہیں دیا جا سکتا یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے اور وہ یہ کہ نقاد کو واقعی اچھا نقاد بننے کے لئے انسان کے متعلق مختلف علوم کے وسیع علم ہی کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ اس کا انصاف پسندی اور دیانت داری کی خوبیوں سے متصف ہونا بھی ضروری ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ عمرانی تصورات اور تاریخی حقائق اختلافی چیزیں ہیں۔ ان سے متعلق اظہارِ رائے کرنا اختلاف و تصادم کو دعوت دینا ہے اور ایسا صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس میں اپنے محسوسات کو بے جھجک قوم کے سامنے پیش کرنے کی اخلاقی جرات بھی موجود ہو۔

مذکورہ مطبوعات پر نظر ڈالنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ آج بھی تحقیقی کام میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن تنقید میں ٹھہراؤ ہی نہیں انحطاط بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب نقاد کی نظر نہ تو زندگی اور شعور کے باہمی روابط کے بارے میں نئی گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہے اور نہ اس میں حق گوئی کی ہمت ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ قوم کے فکری اور اخلاقی معیار کا گرنا ہے۔ سیاسی آزادی بیشک ایک بڑی نعمت ہوتی ہے اور ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حصولِ آزادی سے ہمارے سیاسی حقوق میں اضافہ ہوا ہے، بین الاقوامی معاملات میں بحیثیت قوم ہماری قدر و منزلت بڑھ گئی ہے، ہمیں سامراجی استحصال سے چھٹکارا بھی مل گیا ہے، اقتصادی لحاظ سے ہم نے اپنے محدود وسائل کے باوصف بہت قلیل عرصے میں کافی ترقی بھی کی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ہم زوال آمادہ نظر آتے ہیں۔ ہمارا کردار گرتا جا رہا ہے۔ نئی نسل کوئی بھی ایسا بڑا مفکر یا رہنما پیدا نہ کر سکی جو قوم کے کردار کو گرنے سے روک سکتا اور اسے زندگی کا کوئی پُرکشش مطمحِ نظر دے کر اس کے حصول کے لئے سینوں میں تڑپ پیدا کر سکتا۔ سیاسی آزادی اہلِ قوم کو راحت اور عیش و عشرت کا سامان ہی فراہم نہیں

...ن ان سے کچھ مطالبے بھی کرتی ہے کچھ ذمہ داریاں بھی ان پر عائد کرتی ہے۔ ہم آزادی کی عطا کردہ سہولتوں سے استفادہ کرنے کے آرزومند تو ہیں لیکن آزاد شہریوں کی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کرتے ہیں، ہم فروعی اغراض، گروہ بندیوں، باہمی سازشوں اور سیاسی مصلحت کوشیوں کو قومی مفاد پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ ان کے ذریعوں ہم زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی شاہراہ سے بھٹک گئے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے سچائی، انصاف، اخوت، خدمت اور ایثار ایسی قدروں سے روگرداں ہوگئے۔ مطلب برآری کے لئے گھٹیا قسم کے جوڑ توڑ دانش مندی قرار دی جانے لگی۔ آدمی جن باتوں کا دوسروں کے سامنے ذکر کرتے ہوئے ہچکچاتا اور شرماتا تھا اب انہی باتوں کو وہ علانیہ اور فخریہ بیان کرنے لگا۔ اس صورت حال کا ادب کی تخلیق اور خصوصاً تنقید پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ آج نقاد میں نہ تو غور وفکر کی فراوانی صلاحیت نظر آتی ہے اور نہ ان میں سچ بات کہنے کی اخلاقی جرأت ہے۔ وہ عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ معروف اور صاحبِ اقتدار ادیبوں اور ان کے سرپرستوں کی ہاں میں ہاں ملائے۔ ان کے محسوسات اور مفادات کو ملحوظ رکھ کر ادب کی تعبیریں اور قدریں متعین کرے، ان کا اشاعت کار بن جائے۔ سستی شہرت حاصل کرنے، مخالفتوں کے طوفان سے بچنے اور طرح طرح کے فائدے اٹھانے کا سب سے آسان، مفید اور بے خطر راستہ یہی ہے، سہل پسندی، مفاد پرستی اور پست ہمتی کے اس دور میں زیادہ تر نقادوں نے یہی راہ اختیار کر لی ہے اس لئے تنقید اگر آج ایک جسدِ بے روح بن کر رہ گئی ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

مجھے تنقید کی یہ کمزوری اس لئے بھی زیادہ کھٹکتی ہے کہ میں سمجھتا ہوں جب قوم اخلاقی انحطاط کا شکار ہو، ناقص سیاست کی پیدا کردہ فضا میں تنگ نظری اور خود پروری کے امراض عام ہو گئے ہوں تو ادب کا فرض ہے کہ وہ قوم کو اس کی بے راہ رویوں اور غلط اندیشیوں سے آگاہ کرے اور اور اسی طرح اگر ادب سماج کے لئے اپنے فرض سے عہدہ برآ نہ ہو رہا ہو تو نقاد کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ادب کے نقائص بتا کر اس کی رہنمائی کرے لیکن یہ ہو کیسے؟ آج تو نقاد خود وقت کی عام رَو میں بہتا نظر آتا ہے۔

میں نے اس تبصرے کے لئے جو کتابیں منتخب کی ہیں ان میں زیادہ تحقیقی ہیں لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، تحقیق تنقید سے قطعی بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا ان تحقیقی کتابوں میں بھی ضمنی طور پر

ہی ہی، تنقیدی عناصر موجود ہیں اگرچہ ان تنقیدات میں گہرائی شاذ و نادر ہی نظر آتی ہو۔

ان دو برسوں میں شائع ہونے والی اس قسم کی کتابوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ توجہ محمد عتیق صدیقی کی کتاب "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ہے جسے انجمن ترقی اردو نے علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اصل ماخذوں کا مطالعہ کرکے معلومات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے نیشنل آرکائیوز اور لائبریریوں میں اس سلسلے میں چھان بین کرکے جن مفید دستاویزات اور مطبوعات کا پتہ چلایا ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے مصنف کی کاوش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہو۔

گل کرسٹ کو پہلے بھی اردو ادب کے بڑے سرپرستوں میں شمار کیا جاتا تھا اور زیرِ نظر تصنیف سے تو ان کی ادبی دلچسپیوں اور خدمات کے اور بھی نئے پہلو نظروں کے سامنے آگئے ہیں۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں گل کرسٹ کی زندگی، ہندوستانی زبان سے ان کا لگاؤ، زبان سیکھنے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے لئے ملازمت کو خیرباد کہنے، شمالی ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کا قیام اور وہاں لسانی اور ادبی کاموں میں مصروفیت، ان کی مالی حالت کا نشیب و فراز، ان کے کام میں کمپنی کے حکام کی اعانت اور حوصلہ افزائی یہ اور ایسی ہی باتوں کے بارے میں اب تک جو معلومات حاصل تھیں ان میں اس کتاب سے بہت کافی اضافہ ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ کچھ غلط فہمیاں جو گل کرسٹ کے متعلق پیدا ہوگئی تھیں وہ بھی اس کی روشنی میں دور ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر گل کرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا پرنسپل تصور کیا جاتا رہا ہے لیکن مصنف کا کہنا ہے کہ وہ کالج کے پرنسپل نہ ہوکر محض ہندوستانی کے پروفیسر تھے، اس کے علاوہ کچھ نسبتاً کم اہم حقائق ہیں مثلاً صدیقی کی تحقیق کے مطابق گل کرسٹ ۱۷۸۳ء میں کمپنی کے ملازم ہوکر کلکتے میں وارد نہیں ہوئے بلکہ وہ ۱۷۸۲ء میں خود بخود بمبئی آئے اور اس کے بعد سورت میں کمپنی کے ایک فوجی دستے میں اسسٹنٹ سرجن مقرر ہوئے جہاں سے تبدیل ہوکر ۱۷۸۳ء کے اواخر میں فتح گڑھ آئے۔ گل کرسٹ کی آئندہ زندگی کی تفصیلات بھی دلچسپ ہیں۔

اس کتاب سے گل کرسٹ کی تالیفات کے متعلق بھی معلومات میں اضافہ ہوتا ہو۔ وہ کب کب اور کن کن حالات میں لکھی گئیں اور شائع ہوسکیں۔ ان کی قیمتیں کیا کیا تھیں اور فروخت کا طریقہ

کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس طرح کا کام گل کرسٹ سے پیشتر کون کون کر چکے تھے اور اس زمانے میں کون کون کر رہے تھے۔ مصنف نے گل کرسٹ کی تالیفات کے عکس بھی نمونتہً پیش کئے ہیں جن سے اصل کا اندازہ لگانے میں سہولت ہوتی ہے۔

اردو ادب کے طالب علموں کے لئے اس کتاب میں اس سے بھی زیادہ دلچسپی کا سامان ان مصنفین سے متعلق معلومات ہیں جنھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کرکے اردو میں کتابیں لکھیں۔ مصنف نے ان کی تصنیفات کے بھی نمونے پیش کئے ہیں اور ان میں سے کچھ کے خود نوشت سوانح جات بھی ضمیمے کے طور پر درج کر دیے ہیں۔

غرض جس طرح پروفیسر مسعود حسن رضوی کی قیمتی تصانیف "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" اور "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" اردو ڈراما کی تاریخ کے ایک اہم دور کو روشنی میں لاتی ہیں اسی طرح محمد عتیق صدیقی کے اس کام سے اٹھارہویں صدی کے ربع آخر اور انیسویں کے اوائل میں اردو نثر کے ارتقا اور لسانی قواعد و لغات سے متعلق واقعات سے پردہ اٹھتا ہے۔

سال رواں کی مطبوعات میں ایک دلچسپ کتاب "پردیسی کے خطوط" ہے جس کے مصنف مجنوں گورکھپوری ہیں اور جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتاب لکھنے کا مقصد کچھ ایسے موضوعات پر روشنی ڈالنا بتایا گیا ہے جو مصنف کے زیر غور رہے ہیں۔ یہ موضوعات علمی بھی ہیں اور ادبی بھی۔ اگرچہ زیادہ تر ادبیات بلکہ شاعری سے متعلق ہیں پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مباحث میں تنوع کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ جن شاعروں اور ادیبوں سے خاص طور پر بحث کی گئی ہے ان میں اردو، فارسی، انگریزی اور روسی زبانوں کے مشاہیر شامل ہیں۔ شاد عظیم آبادی، اکبر الہ آبادی، میر تقی، مرزا بیدل، شیلی اور پاسترنک پر خاص طور پر توجہ کی گئی ہے۔ پاسترنک کو ایک بڑا شاعر تسلیم کرتے ہوئے بھی اس پر اظہار افسوس کیا گیا ہے کہ اس نے "ڈاکٹر ژیواگو" لکھ کر اپنی قوم کو رسوا کیا۔ اس سلسلے میں انفرادیت اور اجتماعیت کی نظریاتی بحث بھی آ گئی ہے جسے معقول تصور کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی فرد بھی اپنی قوم کے برسر اقتدار طبقے اور جماعت کے قول و فعل کے خلاف لب کشائی کا حق نہیں رکھتا۔ اس طرح مجنوں نے انگریزی کے مشہور شاعر شیلی کی رومانی زندگی پر بحث کے ضمن میں عشق سے متعلق تصورات پر بحث

کی گنجائش نکال لی ہے۔ کچھ علمی بحثوں کے لیے ایسی صورتیں پیدا کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ براہِ راست آتی ہیں مثلاً ایک موقع پر لفظ "مہربان" کے ماخذ اور ارتقائی پیچ وخم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ایک جگہ حضرت موسیٰ اور ان سے متعلق روایات سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

مجنوں کو محقق قرار دینا تو دشوار ہے لیکن وہ ایک افسانہ نگار اور نقاد ضرور ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر کتاب میں انھوں نے ان تمام مباحث کو ایک افسانوی رشتہ میں منسلک کرکے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کالج میں پڑھنے والی ایک نوجوان طالبہ یاسمین کے نام آٹھ خطوط کی صورت میں ہیں۔ یاسمین مصنف سے علمی اور ادبی امور سے متعلق استفسارات کرتی رہتی ہے کیونکہ وہ اس کی ادبی عظمت اور علمی تجربے سے مرعوب ہے اور مصنف استفسارات کے جوابات ان خطوط کی شکل میں دیتا ہے۔ مجنوں نے تمہیدی سطروں میں کچھ خطوط کے بارے میں قارئین کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے علمی اور ادبی مباحث کے لئے یہ اسلوب بیان اختیار کرنے کی تین خاص وجہیں بتائی ہیں۔ اول تو یہ کہ وہ پہلے ہی سے سنجیدہ مضامین کو دلچسپ اسالیب میں شامل کرتے رہے ہیں تاکہ آسانی سے ذہن نشین ہو سکیں۔ دوسرے ان کا کہنا ہے کہ وہ کچھ سال سے واقعی خود کو اپنے ملک میں "غریب در وطن" محسوس کرتے ہیں اس لئے انھوں نے خود کو پردیسی کے لفظ سے تعبیر کیا اور تیسرے چونکہ انھوں نے اپنی زندگی کے تقریباً تیس برس درس و تدریس میں گزارے اس لئے ان کے دل میں نوجوانوں کو معلومات فراہم کرنے کی فطری خواہش موجود ہے۔ نوجوانوں سے خطاب اس لئے کیا گیا کیونکہ ان میں بڑوں کے مقابلے میں نئی باتیں سیکھنے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔

بہرکیف یہ مخصوص اسلوب بیان اختیار کرنے میں مصنف کے پیش نظر کوئی بھی مصلحتیں کیوں نہ رہی ہوں میری نظر میں اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔ علمی باتوں پر مباحث کا عالمانہ اسلوب بھی اپنی جگہ اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ اور ہلکے پھلکے انداز میں بھی ایسے مباحث کی مثالیں ناپید نہیں۔ اگر نیٹشے بقول زرتشت" کا مصنف ہونے کے باوصف اپنے فلسفیانہ وقار کو برقرار رکھ سکتا ہے بلکہ اس پر ہی اس کی مفکرانہ عظمت کو منحصر قرار دیا جا سکتا ہے اور مولانا آزاد کی "غبار خاطر" ایسے ہی خطوط پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی مصنف کی عالمانہ وجاہت کو نقصان نہیں پہنچاتی تو اصولاً مجنوں کے لئے ایسا

اسلوب اختیار کرنا کس طرح ناقص قرار پاسکتا ہے۔ علمی باتوں کی قدر کا تعین درحقیقت سچائی اور اس کی گہرائی سے ہوتا ہے نہ کہ کوئی مخصوص اسلوب اختیار کرنے یا نہ کرنے سے۔

یہ سوال البتہ الگ ہے کہ مجنوں کے ایسا کرنے سے مباحث کے مقبول عام بننے میں واقعی کوئی اضافہ ہوا بھی ہے یا نہیں؟ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی بحثوں میں دلچسپی انہی لوگوں کو ہوسکتی ہے جو علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہوں محض ہلکے پھلکے ناول پڑھنے والے ان میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس لیے اگر مصنف نے انہیں مقالات کی صورت میں بھی پیش کیا ہوتا تب بھی ان کی مقبولیت کم و بیش انہی حلقوں میں ہوتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جب ہم علمی مباحث کو افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہیں تو پڑھنے والوں کی توجہ کلیتاً مباحث ہی پر مرکوز نہیں رہتی بلکہ قارئین کتاب میں افسانوی لوازم کو بھی تلاش کرنے لگتے ہیں اگر اس اعتبار سے کتاب میں خامیاں نظر آتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کا ردعمل خوشگوار نہیں ہوتا۔ ویسے مجنوں گورکھپوری ایک سلجھے ہوئے ادیب اور نقاد ہیں۔ ان کا ادبی ذوق اور نکتہ رس نظر انہیں دقیق ادبی مسائل کی تہوں تک پہنچا دیتی ہے۔ ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں کا بھی ان کا اچھا مطالعہ ہے۔ ان کی مدد سے وہ علمی اور ادبی مسائل کے متعلق اپنی نجی رائے قائم کرسکتے ہیں اس کی شہادت ہمیں "پردیسی کے خطوط" میں بھی جابجا ملتی ہے۔ ادھر غالب میں بہت دلچسپی لی گئی ہے۔ یہاں میں غالب سے متعلق دو حالیہ کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں ایک ڈاکٹر خورشید الاسلام کی ہے جو "غالب" ہی کے نام سے ہے اور دوسری "غالب کی نادر تحریریں" ہے جسے خلیق انجم نے مرتب کیا ہے۔ اول الذکر انجمن ترقی اردو علی گڑھ نے شائع کی ہے اور دوسری مکتبۂ شاہراہ دہلی نے۔ دونوں کا غالب سے تعلق ہونے کے باوصف موضوعات کی نوعیت کے اعتبار سے ان میں بڑا فرق ہے۔

خورشید الاسلام نے اپنی کتاب میں غالب کے ابتدائی دور یعنی تقریباً پچیس سال کی عمر تک کی شاعری سے بحث کی ہے۔ مصنف کے قول کے بموجب اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ غالب کی ابتدائی شاعری میں جو اثرات کام کر رہے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے اور ہر اس شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے جس کا براہِ راست اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر پڑا۔ خورشید الاسلام ان لوگوں سے متفق نہیں ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ابتدائی دور میں غالب کی کج روی کا اصل باعث بیدل کا اتباع ہے۔ یہ تو وہ مانتے ہیں

کہ غالب نے فارسی کے شعرائے متاخرین شوکت، اسیر، بیدل، غنی، ناصر علی، صائب اور یہاں تک کہ ناسخ کی گوناگوں خصوصیات کو اپنایا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ غالب پر نظیری، عرفی، میر تقی میر اور سودا کے مثبت اثرات بھی ابتدا ہی سے پڑ رہے تھے جن کے باعث آئندہ زمانے میں غالب نے اپنی شخصیت کو پہچانا اور اپنی انفرادیت قائم کی۔ اس کے ثبوت میں غالب کی ایسی غزلیں نقل کی گئی ہیں جو ان اساتذہ کی زمینوں میں ہیں۔

غالب کے فکری رجحانات اور ان کے عوامل کو مصنف نے شاعر کے ذاتی اور عصری ماحول اور تاریخی روایات میں بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ خیال صحیح ہے کہ شاعر کا شعور اکثر و بیشتر اس کے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے جہاں کسی مخصوص دور کے شاعروں میں طبیعتوں کا اختلاف پایا جاتا ہے وہیں ان کے یہاں کچھ مشترکہ قدریں بھی ہوتی ہیں۔ ہندوستانی سماج کا انحطاط خورشید الاسلام کے خیال میں بیدل ہی کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا جو ایک مدت تک برقرار رہا۔ فارسی کے ہندوستانی شعرائے متاخرین کا تعلق چونکہ اس انحطاطی دور سے رہا ہے اس لئے ان میں سے ہر ایک کے یہاں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ ہاں اثرات کی صورتوں اور کمی بیشی میں فرق ضرور ہے۔ مصنف نے یہ بھی کہا ہے کہ غالب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اس میں بھی اس سماجی انحطاط کے اثرات موجود تھے پھر غالب کی ذاتی زندگی کا ماحول بھی ایسا تھا جو فطری طور پر انھیں شکست خوردگی اور بے عملی کی طرف مائل کرتا تھا اس پر فارسی کے شعرائے متاخرین کے مطالعے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ لیکن جیسا کہ ذکر آچکا ہے یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ مصنف کے قول کے بموجب غالب کی طبیعت ساتھ ہی ساتھ مثبت اثرات بھی قبول کرتی جا رہی تھی۔

خورشید الاسلام نے ہم عصر شعر و ادب پر سماجی انحطاط کے جن برے اثرات کا ذکر کیا ہے اس میں اگرچہ کوئی خاص جدت نظر نہیں آتی لیکن اس سے اختلاف کی بھی گنجائش بہت کم ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جب زندگی کے فطری بہاؤ میں ٹھہراؤ آجاتا ہے، اس میں اپنی قوت سے آگے بڑھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، تو وہ لازمی طور پر غلط سمتوں میں بہہ نکلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان شعرائے متاخرین کی نظروں سے بھی زندگی اور شاعری کے اصل مقاصد اوجھل ہو گئے

تھے وہ درایت کے مقابلے میں روایت کو اور خارجی کے مقابلے میں داخلی زندگی کو زیادہ اہم تصوّر
کرنے لگے تھے۔ ان کے یہاں حسن وعشق چند بے سروپا تصورات کا مجموعہ بن کر اپنی فطری دل کشی اور
حرارت کھو بیٹھے۔ اس طرح انھوں نے کچھ فنی مفروضات کو حقیقت سمجھ کر شاعری شروع کی، فن نے
صناعی بن کر اپنے حسن کی قدریں بدل لیں۔ ان مفروضہ محاسن میں خیال بندی، نکتہ آفرینی، سیدھی سادی
بات کو گھما پھرا کر کہنا، رعایت لفظی اور صنائع بدائع کا کثرت سے استعمال، حُسن تعلیل اور مبالغے
کی بے اعتدالی، عروضی اصول کی نہایت سختی سے پابندی، زبان اور محاورے کے روایتی استعمال پر اصرار
سنگلاخ زمینوں کا انتخاب - یہ اور ایسی ہی بہت سی باتیں شامل ہیں۔

ان باتوں کی وضاحت کے لئے کتاب کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں غالب
کے خاندانی حالات اور عہد عالم گیری سے اٹھارہویں صدی کے اختتام تک کے اہم رجحانات کا خاکہ
پیش کیا گیا ہے، دوسرے میں شوکت بخاری، مرزا جلال، اسیر، بیدل، غنی، ناصر علی اور ناسخ کی
شاعری کی ایسی خصوصیات کا ذکر ہے جو مصنف کے خیال میں غالب کے ابتدائی دور کے کلام پر اثر انداز
ہوئیں۔ تیسرے باب میں ہیئتی اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری میں غالب کی امتیازی خصوصیات
کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کتاب میں دو ضمیمے بھی شامل ہیں ایک میں غالب کی غزلوں کے ساتھ
نظیری، عرفی، میر اور سودا کی ہم طرح غزلیں نقل کی گئی ہیں اور دوسرے میں کچھ الفاظ سے
تلازمے ہیں، غالبًا یہ دکھانے کے لئے کہ ان شعراء کا غالب پر واقعی اثر پڑا اور اس دور کے
شاعروں کے یہاں فکر کا اصل محور زندگی نہ ہو کر چند الفاظ اور ان کے متعلقات بن گئے تھے۔

غرض مصنف نے غالب کی شاعری کے ابتدائی دور میں اس کے شعور کا تجزیہ کر کے
اس کے محرکات کی جو نشان دہی کی ہے عمومی حیثیت سے تو وہ ایک بڑی حد تک حقیقت پر مبنی
نظر آتی ہے لیکن ان محرکات کی تفصیلات جس وثوق سے پیش کی گئی ہیں اس سے اتفاق کرنا
دشوار ہے۔ سچ یہ ہے کہ اس دور کے شاعروں کی امتیازی خصوصیات کا تعین ان کی طبیعتوں کے
رجحانات کی کمی بیشی کی بنیاد پر تو کیا جا سکتا ہے، رجحانات کے عدم و وجود کی بنیاد پر نہیں کیا جا
سکتا۔ اس کے علاوہ کائنات اور زندگی کو بے حقیقت اور مکروہ سمجھنے اور ان سے بھاگ کر

روح کے خلوت کدے میں پناہ لینے وغیرہ کے میلانات اس انحطاطی دور ہی کی پیداوار نہیں ہیں وہ ان ادوار میں بھی موجود تھے جنھیں مورخین انحطاط کے دور قرار نہیں دیتے۔ وجہ یہ ہے کہ میلانات وقتی حالات کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ زندگی کے عمیق تر حقائق کے زیراثر وجود میں آئے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو غالب پر سب سے زیادہ اثر (کم از کم ابتدائی دور میں) بیدل کا تھا۔ خود مصنف نے نکات بیدل سے جو اقتباسات نقل کئے ہیں انہی سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے حالانکہ اپنی جگہ پر یہ بات بھی صحیح ہے کہ غالب کو تصوف سے بیدل کا سا لگاؤ نہیں تھا اور نہ اس کے ذہن میں بیدل کی طرح صوفیانہ نظریات ایک منضبط صورت میں موجود تھے۔ ایک بات اور۔ اس کتاب میں امثال اور اقتباسات کی اس قدر فراوانی ہے کہ اس کا تقریباً آدھا حصہ انہی کی نذر ہو گیا ہے جن میں اکثر بے مصرف ہیں۔ ان سے موضوع بحث کے سمجھنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

غالب سے متعلق دوسری کتاب "غالب کی نادر تحریریں" ہے۔ اس میں خلیق انجم نے غالب کی نظم و نثر کی ان چیزوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف رسائل میں تو شائع ہو چکی ہیں لیکن غالب کی مروجہ کتابوں میں سے کسی میں شامل نہیں۔ غالباً اسی لئے مرتب نے انھیں "نادر" کہا ہے۔ مگر ساتھ ہی مشمولہ تحریروں کے متعلق مقدمے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "دو تین خطوط ایسے بھی ہیں جو خطوط غالب مرتبۂ مولوی مہیش پرشاد اور خطوط غالب" مرتبۂ غلام رسول مہر میں آگئے ہیں۔ ان خطوط کو چند مصلحتوں کی وجہ سے اس مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔ مصلحتوں کی بات تو مرتب ہی کو معلوم ہوگی ہاں یہ واضح ہے کہ اس طرح اس مجموعے میں کچھ ایسی چیزیں بھی شامل کر لی گئی ہیں جو غالب کے خطوط کے معروف مجموعوں میں پہلے ہی سے شامل تھیں۔ دوسری طرف اس میں ایک ایسا خط بھی نقل کیا گیا ہے جسے خود خلیق انجم جعلی خیال کرتے ہیں اور جس کے متعلق حاشیے میں لکھا گیا ہے کہ اسے قاضی عبدالودود نے معتبر دلائل سے جعلی ثابت کر دیا ہے۔ پھر اسے غالب کی نادر تحریروں میں شامل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اس کا علم بھی مرتب ہی کو ہوگا۔

اس مجموعے میں خطوط کے علاوہ لطائف غیبی، تیغ تیز اور انتخاب غالب کے دیباچے، چند مختصر مضامین، نظمیں اور لطائف، سوال و جواب اور متفرق اشعار وغیرہ ہیں۔ مرتب نے حواشی میں

ہے۔ ماخذوں کی نشان دہی بھی کی ہے اور کتاب کے آخری حصے میں ان پر مزید روشنی ڈالی ہے جو مرتب کے احساس ذمہ داری کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تمام چیزیں غالب کی ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے اُن لوگوں کے بیانات پر بھروسہ کیا ہے جنھوں نے انھیں رسائل میں شائع کرایا۔ بہرحال اگرچہ ان سب کی واقعیت کو مسلمہ قرار دیا جانا مناسب ہے، پھر بھی اتنا قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ ان میں سے اکثر تحریریں غالب ہی کی ہوں گی۔ اور بادی النظر میں معلوم بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان تحریروں میں زیادہ تر تو تبرکات کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن کچھ واقعی دلچسپ ہیں۔ ان سے غالب سے متعلق معلومات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہو سکتا ہے۔

مکتبۂ شاہراہ ہی نے اسلم پرویز کی کتاب "انشاء اللہ خاں، عہد اور فن" بھی شائع کی ہے۔ یہ بھی ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں کچھ قلمی اور مطبوعہ کتابوں اور کچھ رسائل میں شائع ہونے والے مقالات کی مدد سے انشاء کی زندگی، کردار، ادبی تخلیقات اور اس کے زمانے کے بارے میں مواد اخذ کرکے مرتب کیا گیا ہے۔ ماخذوں کے ضروری حوالے اس کتاب میں بھی درج ہیں۔ انشاء کو اردو شاعری کے دبستان لکھنؤ کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن خصوصیات کو لکھنوی شاعروں کی امتیازی خصوصیات سمجھا جاتا ہے وہ امتیازی محض ان معنوں میں ہیں کہ ان پر لکھنؤ کے شاعروں نے خاص طور پر زور طبع صرف کیا اور انھیں اپنی جدت پسند طبیعتوں کے مایۂ ناز کارناموں کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ورنہ دیکھا جائے تو اردو، فارسی کے دوسرے شاعروں کے یہاں بھی یہ رجحانات ناپید نہیں ہیں۔ یہ کہنا البتہ صحیح ہوگا کہ لکھنؤ کی فضا نے ان مخصوص رجحانات کو فروغ دے کر ان کی شدت میں اضافہ کر دیا۔

انشاء کی زندگی کا بھی زیادہ حصہ تمول اور فارغ البالی میں بسر ہوا۔ وہ نواب الماس علی خاں، مرزا سلیمان شکوہ اور سعادت علی خاں ایسے لوگوں کے ممتاز مصاحبین میں شامل رہے۔ مصاحبین پر انحطاط پذیر سماج اور درباداری کے اثرات پڑنا ناگزیر تھا چنانچہ انشاء پر بھی یہ اثرات پڑے۔ اس کے علاوہ انشاء کے سپاہیانہ مزاج کو میدان جنگ سے زیادہ درباروں میں ادبی معرکہ آرائیاں

کے موقعے ملے جس سے دلّی میں عظیم اور فائق سے اور لکھنؤ میں قتیل اور مصحفی وغیرہ سے ان کی جھڑپیں ہوائیں۔ یہ معرکے اردو ادب کی تاریخ کا ایک افسوسناک باب بن کر رہ گئے ہیں۔ اسلم پرویز نے بھی ان کا مجملاً ذکر کیا ہے اور اس ذکر میں انھوں نے جانب داری سے کام نہیں لیا۔ مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے مواد کی فراہمی، ترتیب اور نتائج اخذ کرنے میں کافی محنت کی ہے اور سلیقے سے کام کیا ہے۔

آئندہ اُردو میں ادبی تخلیق کی کیا صورت ہوگی اس کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کرنا آسان نہیں کیونکہ یہ بہت کچھ مستقبل کے حالات پر منحصر ہوگا۔ پھر بھی اتنا کہہ دینا غلط نہ ہوگا کہ اُردو ملک کی ایک ایسی زبان ہے جسے کروڑوں آدمی سمجھتے بولتے اور طرح طرح سے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس میں بڑا قیمتی ادب موجود ہے اور اس سے بھی بہتر ادب پیدا ہونے کا امکان ہے بشرطیکہ اچھے ادب کی تخلیق کے لئے زیادہ سازگار ماحول پیدا کیا جا سکے اور ادیب ادب تخلیق کرتے وقت اپنے وقتی مصالح اور مفادات سے زیادہ اپنے فرض منصبی اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کو ملحوظ خاطر رکھ سکیں۔ اور نقادوں کے لئے تو اس کا خیال رکھنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ ان کی رائیں ادب کی تخلیق کو اوروں کی بہ نسبت زیادہ متاثر کرتی ہیں۔

اُردُو افسانہ اور ناول

ڈاکٹر قمر رئیس

صرف ایک سال ۱۹۶۱ء کی مدت میں شائع ہونے والے افسانوی ادب کا جائزہ اور اس صنف میں نمایاں ہونے والے رجحانات اور معیاروں کی تلاش بہت نازک اور دشوار کام ہے۔ اگرچہ اعظمی صاحب مدیر جامعہ کی اس ہدایت نے یہ کام کچھ آسان کر دیا ہے کہ یہ جائزہ صرف ہندوستانی ادیبوں یا ہندوستان میں شائع ہونے والی تحریروں تک محدود ہو۔ مختصر ہو اور صرف کتابوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ تاہم اس پابندی سے جہاں کچھ آسانیاں ہوئیں وہاں کچھ مشکلات بھی پیدا ہوتیں۔ پہلی بات تو یہ کہ رجحانات یا ادب میں فکر و فن کے تغیرات کیلنڈر کے پابند نہیں ہوتے۔ گزرتا ہوا وقت اتنی سرعت سے ادبی روایات پر اثر انداز نہیں ہوتا جس تیزی سے وہ سیاسی، تمدنی یا زندگی کے مادی مظاہر اور حالات کو متاثر کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے ادیبوں کی تحریریں پہلے رسائل میں شائع ہوتی ہیں اور کتاب کی شکل میں ذرا دیر میں سامنے آتی ہیں اس لئے صرف کتابوں کی روشنی میں ایک سال کے افسانوی ادب کی جو تصویر بنے گی وہ بہت دھندلی بلکہ ادھوری ہوگی۔ اس لئے رسائل میں شائع ہونے والی بعض نمائندہ تحریروں کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا۔

جہاں تک میری رسائی اور مطالعہ کا تعلق ہے گزشتہ سال اردو میں سب سے زیادہ اور سب سے وقیع کتابیں نظم کی شائع ہوئیں۔ اس کے بعد تنقید و تحقیق اور سب سے آخر میں افسانہ اور ناول۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کہتے ہوئے ادبی لحاظ سے قابلِ ذکر تحریروں کو ہی میں نے ذہن میں رکھا ہے۔ ورنہ سستے رومانی ناول اور افسانے اس سال بھی کثرت سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کچھ مدت سے ہندوستانی رسالوں میں نئے اور نومشق افسانہ نگاروں کی کہانیاں ہی زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے بیشتر ممتاز اور کہنہ مشق ادیب پاکستان کے مستند ادبی پرچوں

میں ہی شائع ہونا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ بعض ہندوستانی ادیب تو اپنی کتابیں بھی پاکستان ہی میں شائع کراتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی کچھ مجبوریاں ہوں اور کچھ فائدے۔ تاہم چونکہ پاکستانی کتب و رسائل ہندوستان میں بہت کم اور مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں اس لئے ہندوستانی پرچوں کا پیٹ بھرنے والی ادنیٰ درجہ کی کہانیاں پڑھ کر اگر ہندوستانی قارئین یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اردو افسانہ مائل بہ انحطاط ہے تو یہ ایسی تعجب کی بات نہیں ہوگی۔

سچ تو یہ ہے کہ قومی آزادی تک اردو افسانہ اپنے ارتقاء و عروج کی جس منزل تک پہنچ گیا تھا آزادی کے بعد پانچ چھ برسوں میں جو کچھ لکھا گیا وہ اس معیار و مرتبہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس دور کے بعض ہنگامی اور ہیجان خیز واقعات کے زیرِ اثر اگر ایک طرف فن میں سطحیت اور بے روح جذباتیت نمایاں رہی تو دوسری طرف عشقیہ اور رومانی کہانیوں نے عارضی طور پر اپنا تسلط جما لیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ گزشتہ چند سال کی مدّت میں اردو افسانہ فن اور فکر و نظر کی نئی منزلوں کی طرف بڑھا ہے۔ اس نے نئی حقیقتوں کو جذب کیا ہے۔ نئی صلاحیتوں اور نئے زاویوں کی ترجمانی کی ہے۔ اس طرح اس میں تنوع تازگی اور توانائی کے نئے آثار پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے بعض ممتاز اور معمر ادیب جیسے ماندگی کے وقفہ کے بعد دم لے کر آگے بڑھے ہیں۔ اور بڑھ رہے ہیں اس دور میں راجندر سنگھ بیدی کرشن چندر اختر اورینوی سہیل عظیم آبادی اور پریم ناتھ در نے جو کہانیاں لکھی ہیں وہ اس حقیقت کا احساس دلاتی ہیں کہ افسانہ محض زندگی کی تصویر کشی نہیں۔ اس کی تخلیق کا عمل فی الاصل ایک فلسفیانہ اور حکیمانہ عمل ہے۔ وہ زندگی کی ترجمانی سے زیادہ اس کی تفہیم اور تنقید کا عمل ہے۔ اور اردو افسانہ اس منزل تک پہنچ گیا ہے۔ اسی دور میں بعض نئے اور نوعمر افسانہ نگاروں نے بھی کچھ چونکا دینے والی کہانیاں لکھیں اور اپنی اپج اور انفرادیت سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان میں بلونت سنگھ جیلانی بانو واجدہ تبسم رتن سنگھ اور ڈاکٹر (قاضی) عبدالستار کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ بلونت سنگھ اگرچہ آزادی کے قبل سے لکھ رہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی بہترین کہانیاں اسی دور میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۹۶۱ء میں بھی اردو افسانہ اسی رنگ و آہنگ اور رفتار کے ساتھ داخل ہوا۔ تاہم یہ سال اس لحاظ سے ممتاز اور اہم ہے کہ ایک مدّت کے بعد اردو میں دو قابل قدر ناول شائع ہو کر

سامنے آئے میری مُراد قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" اور شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" سے ہے قرۃ العین اور شوکت صدیقی اگرچہ پاکستانی ادیب ہیں۔ لیکن چونکہ ان کے ناولوں کے ہندوستانی ایڈیشن اسی سال شائع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہاں ان کے ذکر کا جواز مل گیا ہے۔

اردو ناول اس فن کے عالمی معیاروں سے اتنا پچھڑ گیا ہے کہ اب ان معیاروں تک پہنچنے کے لئے تدریجی ارتقا کی نہیں جست کی ضرورت ہے۔ اور "آگ کا دریا" بلاشبہ ایک طویل جست ہے۔ اس کی صحیح تنقید اور تحسین کے لئے فن کے کلاسکی تصور سے زیادہ اس کے جدید معیاروں اور نئے سانچوں کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ شعور کی رو، زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ اس ناول میں اس تکنیک کا استعمال بڑے سلیقہ توازن اور تخلیقی حسن کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ڈھائی ہزار سال کی ہندوستانی تہذیب اور تاریخ کے بے کراں سمندر میں گوتم نیلمبر، ابو المنصور اور چمپا کی روحیں نہ جانے کتنے طوفانوں سے گزرتی ہیں اور کتنے روپ بھرتی ہیں لیکن اپنی تنہائی خاموشی اداسی اور باطنی محویت سے ایک پل کے لئے جدا نہیں ہوتیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے وجود کی نیرنگی اور ان کے تجربات کی تازگی میں ارضیت واقعیت اور انسانی جذب و شعور کا رنگ کچھ اس طرح مل گیا ہے کہ اس مرقع کا ہر نقش اور ہر تصویر بے مثل نظر آتی ہے۔

'خدا کی بستی' میں شوکت صدیقی نے بڑی بے باکی اور بصیرت سے اس معاشرہ کا مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان میں تشکیل پا رہا ہے۔ یہ ناول پاکستان کی شہری زندگی کے ہر گوشہ اور ہر ادارہ پر محیط ہے۔ لیکن اس میں زندگی کے تاریک گوشے زیادہ روشن ہیں۔ ناول پڑھ کر پہلا تاثر یہی ہوتا ہے جیسے افلاس جہالت سیاسی ابتری اور اہل اقتدار کی سیاہکاری نے اس زندگی کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس کے اندر زہر گھول دیا ہے۔ اس ناول میں حقیقت نگاری کا وہی تصور کارفرما ہے جو شوکت صدیقی کے بیشتر افسانوں میں نظر آتا ہے۔ سماجی اعتبار سے مظلوم پامال مجہول اور منفی کردار انھیں عزیز ہیں۔ پیشہ ور مجرم جیب کترے لیٹرے گداگر رنگے سیار اور فٹ پاتھ پر سونے والے بے روزگار اور آوارہ نوجوان ان کے فن کا محرک اور موضوع ہیں۔ اس ناول میں بھی ایسے کرداروں کی کثرت ہے۔ راجہ نوشا شاہی نیاز ڈاکٹر موٹو کالے صاحب

اور خان بہادر فرزند علی سب جیتے جاگتے کردار ہیں۔ یہ ایسے کہنہ ناسور ہیں جن کی عفونت سے اس سماج میں مہلک وبائیں پھوٹ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ سلمان صفدر، شبیر احمد علی اور سلطانہ جیسے معصوم نوجوان بھی اس مسموم اور گھٹے گھٹے مریضانہ ماحول میں دم توڑتے نظر آتے ہیں۔ اپنی پُرجوش انسانیت اور بے پناہ قوت کے باوجود وہ قدم قدم پر شکست کھاتے ہیں اور ان کے سماجی اصلاح کے منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔

فنّی اعتبار سے اس ناول میں بعض اہم خامیاں بھی ہیں۔ ناول نگار کا نقطۂ نظر سلجھا ہوا اور صاف نہیں۔ تاریخی اور سماجی اعتبار سے اس نے زندگی کے بعض بنیادی حقائق کو نظرانداز کیا اور بعض کو بے جا اہمیت دی ہے۔ حقیقت نگاری میں ہمواری نہیں۔ فلک پیما کی سرگرمیاں کہیں کہیں ایک تخیّلی اور تمثیلی رنگ اختیار کر لیتی ہیں لیکن ان کوتاہیوں کے باوجود اس ناول کو اردو کے چند معیاری ناولوں کے ساتھ جگہ دی جائے گی۔ یہ ناول 'گئودان' کی عظمت کو نہ پہنچ سکا لیکن اس کا مصنف یقیناً 'گئودان' سے بلند تر ناول لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ناول کے باب میں خواجہ احمد عباس کے ناولٹ 'سیاہ سورج، سفید سائے' کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے یہ ایک اچھوتی تخلیق ہے۔ اس کا موضوع افریقہ کی حریت رہنما لومبا کی شہادت ہے اور اس کی تکنیک میں علامتی اور ایمائی رنگ غالب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر قومی ادب کی اصطلاح صحیح ہے تو اس ناولٹ کو بین الاقوامی یا آفاقی ادب کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ حریت کے اس دیوتا کی موت پر ساری دنیا کی حریت پسند قوموں نے جو ماتم کیا اور اس کے نتیجہ میں سامراجی درندوں کے خلاف نفرت کے جو شعلے بھڑکے اس ناول میں ایک اچھوتے اور حسین کارانہ ڈھنگ سے اس کی مصوّری کی گئی ہے۔

افسانوی ادب میں اس سال سب سے قابلِ ذکر حصہ خواجہ احمد عباس، کرشن چندر اور سہیل عظیم آبادی کی نگارشات کا ہے۔ خواجہ صاحب ادھر بڑی تیزی سے لکھ رہے ہیں۔ دانتے کی کہانی سے لے کر "واپسی کا ٹکٹ" تک انھوں نے کئی دلکش کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں وہ فلسفیانہ گہرائی تو نہیں جس کے بارے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ انسان اور کائنات کے ابدی مسائل

غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر انسان کی معاشی اور معاشرتی غلامی کے مسائل کچھ اہمیت رکھتے ہیں تو خواجہ صاحب کی کہانیوں میں ان کے بارے میں ہمدردانہ غور و فکر کے آثار واضح طور پر نظر آئیں گے۔ خطابت بلند آہنگی سیاسی اشارے اور سماجی انقلاب کا عزم ایسے پہلو ہیں جو ان کے افسانوں میں کہیں تو بلا کا تاثر پیدا کر دیتے ہیں اور کہیں محض صحافت بن جاتے ہیں۔

کرشن چندر نے متعدد کہانیوں کے علاوہ اس سال بچوں کے لئے بھی دو قصے "خرگوش کا سپنا" اور "ستاروں کی سیر" لکھے ہیں۔ 'خرگوش کا سپنا' لوک کہانیوں کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ ایک غریب اور نحیف خرگوش کس طرح اپنی عقل حوصلہ اور ہمت سے دوسرے خوفناک اور چالاک جانوروں کے جبر و ظلم کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہی اس کا موضوع اور مرکزی خیال ہے۔ "ستاروں کی سیر" ایک سائنسی ناول کہا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اتنی دلچسپ واقعات اتنے بامزہ اور انداز تحریر اتنا دلنشیں ہے کہ صرف بچے ہی نہیں ہر عمر کے لوگ انھیں ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔

کرشن چندر نے ان سیدھی سادی کہانیوں میں معنویت کی کئی تہیں پیدا کی ہیں اور ایک علامتی رنگ میں دور حاضر کی زندگی کے بعض بنیادی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے علاوہ کرشن چندر نے "تائی ایسری" "شہزادہ" اور "جولی" جیسی کامیاب کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اور اس طرح اردو افسانہ کو کچھ جیتے جاگتے موثر اور حقیقت سے معمور کردار بھی دئے ہیں۔ یہی وہ کہانیاں ہیں جن میں کرشن چندر اپنے فن کی بعض روایات کو برقرار رکھ سکے ہیں۔ ورنہ 'پھول کی تنہائی' 'دو چور' اور 'چوراہے کا کنواں' جیسی کہانیاں عام لوگوں کے لئے دلچسپ اور دلکش سہی فنی اعتبار سے زیادہ قابل قدر نہیں ان میں واقعیت پسندی کے بجائے تخیلی، تمثیلی اور ظریفانہ انداز رنگ غالب ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے ایک طویل وقفہ کے بعد پھر قلم اٹھایا ہے۔ اس سال ان کی متعدد کہانیاں ہند و پاک کے رسالوں میں شائع ہوئی ہیں۔ 'دل کا کانٹا' اور 'یوں بھی ہوتا ہے زمانہ میں' ایسی کہانیاں ہیں جن میں ان کے فن کی سلامت روی تنقیدی بصیرت اور انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کی کہانیوں میں خلوص، انسانی دردمندی، سادگی اور سچائی کے وہی عناصر ملتے ہیں جو منشی پریم چند کا سب سے قیمتی ورثہ ہیں۔ سماجی بے انصافی اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے پیدا ہونے والی آلودگیاں

ان کا خاص موضوع ہے۔ تاہم ان کی تازہ کہانیاں پڑھ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں پیدا ہونے والے اہم مسائل نے ابھی ان کی توجہ کو جذب نہیں کیا ہے۔

اس سال افسانوں کے جو مجموعے شائع ہوئے ان میں واجدہ تبسم کا 'شہر ممنوع' اور ایک نئے افسانہ نگار جوگیندر پال کا مجموعہ 'دھرتی کا کال' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ واجدہ تبسم کی کہانیوں نے گزشتہ چند سال میں اردو افسانہ کو ایک نئی سمت ہی نہیں نئی سطح بھی دی ہے۔ 'حوا کا گناہ'، 'اے رود موسیٰ اور 'باندان' خوبصورتی نزاکت اور فنی مہارت سے تراشی ہوئی کہانیاں ہیں۔ سماج میں عورت کی پامالی، متوسط طبقہ کی معاشی زبوں حالی اور گھریلو زندگی میں پیدا ہونے والی الجھنیں کش مکش اور گھٹن ان کی کہانیوں کے خاص محرکات ہیں۔ وہ اردگرد کی مانوس چیزوں سے ایسی فضا پیدا کرتی ہیں کہ قاری اس میں ڈوب جاتا ہے اور تاثرات کی دھیمی دھیمی لہروں کے سہارے حقائق کی تہ تک پہنچتا ہے۔

جوگیندر پال کی کہانیوں کا موضوع افریقہ کی زندگی ہے۔ وہ ایک مدت سے افریقہ میں رہ رہے ہیں وہاں کی تہذیب و معاشرت عوام کی معاشی حالت اور قومی آزادی کی تحریک کا مطالعہ انھوں نے بہت قریب سے کیا ہے۔ ان کہانیوں میں بھی انھوں نے افریقہ کی سرزمین پر گوروں اور کالوں کی کش مکش اور ان کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوگیندر پال کا مطالعہ وسیع ہے مغربی ادیبوں میں وہ موپساں اور اس کے مقلدین کے فن سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی اکثر کہانیوں کا طلسم آخر میں کھلتا ہے۔ اشخاص سے زیادہ حیرت زا اور نتیجہ خیز واقعات پر ان کی نظر رہتی ہے۔ اس مجموعہ میں 'معجزہ'، 'سب کا سوال' اور 'دھرتی کا کال' ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی ان کی کہانیوں میں ایک آنچ کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن ان کہانیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلد ہی ان کے فن میں زیادہ پختگی صفائی اور دلکشی پیدا ہوگی۔

اس سال کے افسانوی ادب پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا بھی احساس ہوا کہ چند نوجوان اور ہونہار افسانہ نگار جنھوں نے ۱۹۵۵ء کے بعد کچھ کامیاب کہانیاں لکھی تھیں۔ اس سال خاموش رہے۔ ان میں مسیح الحسن، قیصر تمکین اور ظفر پیامی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں تک کہ جیلانی بانو جیسی

شعور اور ذہین افسانہ نگار کا قلم بھی اب کچھ تھکا تھکا سا نظر آتا ہے۔ اس کا ثبوت ان کا افسانہ سیاہ ماتم طائی ہے۔ جو کسی طرح ان کے پچھلے دور کے افسانوں "ڈریم لینڈ" اور "موم کی مریم" کے مقابل نہیں رکھا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سال پرانے افسانہ نگاروں کی تحریریں اور کاوشیں غالب رہیں۔ نئے افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے باوصف محنت فنی ریاضت مطالعہ اور غور و فکر سے گریز کر رہے ہیں جبکہ پرانے فنکار نئے حوصلوں سے لکھنے اور نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے بھی اس سال 'محرومی' اور 'فنکار' جیسی دو موثر اور دلکش کہانیاں لکھی ہیں جن میں ٹیگور کا اثر نمایاں ہے۔ 'محرومی' میں ماتما کا جذبہ بڑے لطیف اور شدید تاثراتی رنگ میں نمایاں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پرانے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، بلونت سنگھ اور رام لال کی چند کہانیاں بھی اس سال کے افسانوی ادب کا قابل قدر حصہ ہیں۔

جہاں تک اردو افسانوی ادب کے نئے رجحانات کا تعلق ہے اس کے لئے ذرا تفصیلی تجزیہ کی ضرورت ہے اور اس کا یہاں موقع نہیں۔ اس کے علاوہ اس مطالعہ کے لئے زمان و مکاں کی قید بھی مناسب نہیں تاہم یہاں مختصر الفاظ میں ان میلانات کا ایک اجمالی خاکہ دیا جا سکتا ہے جو اس دور میں نمایاں رہے یا نمایاں نظر آئے۔

(۱) یوں تو ہر دور میں سنجیدہ ادب کے مقابلہ میں غیر سنجیدہ یا تفریحی اور سستے رومانی ادب کی کثرت رہی ہے لیکن اس دور میں شائع ہونے والے تفریحی ناولوں اور افسانوں کے سیلاب نے سنجیدہ ادبی تخلیقات کی رفتار اور کردار کو کئی پہلوؤں سے نقصان پہنچایا ہے۔ (۲) واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کے نئے امکانات کی تلاش کے بجائے نفسک کے اعتبار سے غیر ارضی اور تخیلی کہانیاں لکھنے کے تجربے ہو رہے ہیں لیکن کوشش یہ ہے کہ ایسی کہانیوں کو ایک علامتی رنگ دے کر معنویت پیدا کی جائے۔ (۳) نئی پود کے ادیب اب دوسری زبانوں کے ادب ان کے میلانات اور معیاروں سے باخبر رہنے اور ان سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کے بجائے وہ اپنے ادب کی اعلیٰ روایات کے زیر اثر — اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی حدوں میں رہ کر اعتماد سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے نقش گر حادثات نہیں ان میں معمولات کا گہرا رنگ جزئیات کا روپ اور تحلیل نفسی کی روشنی ہے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ رنگ نکھر کر کیا رُخ اختیار کرے۔

سنہ ۱۹۶۰ء، ۶۱ء کا مزاحیہ ادب

جناب غلام احمد فرقت کاکوروی

طنز و مزاح کے گل بوٹے اور شگوفے صرف ایسی فضا میں چٹکنے اور آنکھ کھولنے کے عادی ہوتے ہیں جو تموّل، اطمینان اور سکون میں رچی بسی ہو اس لئے سنہ ۶۰ء اور سنہ ۶۱ء کے بحرانی دَور میں اگر اردو ادب میں مزاحیہ مضامین کے صرف گنے چُنے مجموعے شائع ہوئے ہوں تو اس پر حیرت و استعجاب سے آنکھیں پھاڑنے دیدے نکالنے یا بوٹیاں نوچنے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ ان لوگوں کے دل گُردوں پر ضرور حیرت کرنا چاہئے جنھوں نے اس سنگ لاخ دَور میں بھی جو نک نگار اور مزاحیہ مضامین لکھ کر ہماری اور آپکی دلبستگی کا سامان فراہم کیا۔

سنہ ۱۹۶۰ء، ۶۱ء میں احمد جمال پاشا کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ اندیشۂ شہر، تخلص بھوپالی کے مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ 'پوسٹ مارٹم'، فکر تونسوی کا ناول 'پروفیسر بدھو'، چودھری وجاہت علی سندیلوی کے مزاحیہ مضامین اور کہانیوں کا مجموعہ 'بے ساختہ اور بے ضابطہ'، کنہیا لال کپور کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'گرد کارواں' اور راقم الحروف کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں" شائع ہو سکے یا ان نثری مجموعوں کے علاوہ پروفیسر دلاور فگار صاحب کی مزاحیہ اور طنزیہ نظموں اور غزلوں کا مجموعہ 'ستم ظریفان'۔

جمال پاشا ہمارے اُن نوجوان مزاح نگاروں میں ہیں جنھوں نے گزشتہ آٹھ دس سال کے عرصہ میں بعض ایسے طنزیہ مضامین لکھے ہیں جنھیں اُردو کے مزاحیہ ادب میں ایک اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے بالخصوص ادب میں پوسٹ مارٹم اور مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں، ان کے انداز بیان میں بڑا ٹھہراؤ اور سنجیدگی ہے ان کے یہاں ایک اچھے مزاح نگار کا سلیقہ اور ایک خوش فکر طنز نگار کا شعور ملتا ہے۔ موضوعات کی تلاش سے ان کے غیر معمولی ذہین

...ے کا اندازہ ہوتا ہے وہ بغیر فقرہ بازیوں کے بھی اپنے طنز میں مزاح کی چاشنی پیدا کرنے کا پورا
...وا سلیقہ رکھتے ہیں۔ وہ دوسروں کی کمزوریوں پر ہنستے ہیں مگر اس ہنسی میں اس کا لحاظ بھی رکھتے ہیں
...جس پر وہ ہنس رہے ہیں اس کے ماتھے پر شکن تو نہیں پڑ رہی ہے اور ایک طنز نگار کی یہی سب سے
...ڑی خوبی ہے کہ وہ جس پر طنز کرے اُسے بھی اپنے مزاح میں شریک کرے ان میں نثر کی پیروی کرنے کا غیر معمولی
سلیقہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں اگرچہ انھوں نے تخلص صاحب
کو طنز نگار سے زیادہ مزاح نگار قرار دیا ہے۔ مگر راقم الحروف کو ان کی اس رائے سے
اتفاق نہیں۔ راقم الحروف ان کو مزاح نگار سے زیادہ طنز نگار سمجھتا ہے۔
ان کا یہ مجموعہ غالباً پہلا مجموعہ ہے جو زمانۂ طالب علمی سے اس وقت تک کے تمام مضامین پر مشتمل ہے
اسی لئے اس میں نرم گرم ہر قسم کے مضامین شامل ہیں۔ ان کے بعض مضامین ان کے درخشاں مستقبل
پر روشنی ڈالتے چلتے ہیں۔

دوسرا مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ عبدالاحد خاں تخلص بھوپالی مدیر بھوپال پنچ کا ہے جو پوسٹ مارٹم
کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں کچھ بھوپالی اور کچھ غیر بھوپالی حضرات شامل ہیں جن سے تخلص صاحب
کی یا تو یاد اللہ ہے یا غیر معمولی بے تکلفی۔ تخلص صاحب اگرچہ اس کوچہ کے نو واردوں میں ہیں مگر خدا جانے
کیوں وہ اس وقت تک اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی پال ڈالے پڑے رہے اور ان کا خمیر اتنی دیر میں
کیوں پھولا۔ ان کی تحریروں میں بلا کا رکھ رکھاؤ اور قیامت کا طنز ہوتا ہے۔ ان سے اگرچہ راقم الحروف
کا تعارف محض تحریری ہے مگر ان کے طنز میں اس بلا کی شوخی ہے کہ ان کی تحریر پڑھ کر اُن سے ملنے
کو دل چاہتا ہے۔ ان کے مضامین پڑھ کر زلیخا کی جوانی کا بھی قائل ہی ہونا پڑتا ہی کیونکہ انھوں نے
زلیخا کی تجدید جوانی کے لگ بھگ زمانہ گمنامی میں بسر کیا۔ ان کے فقروں میں ہم کو ایک ساندار طنز ملتا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ان کی تحریریں بڑی شوخی، رنگینی اور مٹھاس ہے وہ جگہ جگہ فقرے بھی چست کرتے چلتے ہیں بہ اعتبار
عمر خواہ ان کے قویٰ کمزور ہو گئے ہوں مگر ان کے قلم میں وہ زندگی اور جان ملتی ہے کہ پڑھنے والے کے

سامنے ایک ایسے گبر دجوان کی تصویر آجاتی ہے جو جوان بھی ہے اور گرگِ باراں دیدہ بھی ان کے خاکوں کا مجموعہ جوان کے کہنے کے مطابق نقش اول ہے بہتوں کے نقش دوم اور نقش سوم کو ماند کر دینے کی بدرجۂ اتم صلاحیت رکھتا ہے۔
یارب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی

تخلص کے طنز میں توازن، گہرائی اور سلیقہ مندی کے ساتھ ساتھ روزمرہ بھی شامل ہے جس پر انھیں بڑی قدرت ہے جب وہ عورتوں کی زبان استعمال کرتے ہیں تو بعض اوقات ان کے عبدالاحد خاں ہونے میں شک ہونے لگتا ہے۔ وہ ہنس ہنس کر اس انداز میں نشتر زنی کرتے ہیں کہ مریض ان کی ہنسی میں گم ہو کر اپنی تکلیف بھول جاتا ہے۔ وہ ایک کامیاب طنز نگار صحافی بھی ہیں اس کوچہ میں آنے کے بعد اگرچہ طنز نگار کی عزت و آبرو خطرہ میں پڑ جاتی ہے مگر وہ صحافت کے داؤں پیچ بھی پیٹ سے لے کر آئے ہیں۔ ان کے اخبار بھوپال پنچ کے سیاسی اور طنزیہ مضامین پڑھ کر اودھ پنچ والے منشی سجاد حسین کاکوروی مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ سیاست کے اُتار چڑھاؤ اور پریس ایکٹ کی دفعات کے داؤ بھی بخوبی سمجھتے ہیں اور ان کو خالی دینے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعر کے بارے میں جو غالباً داڑھی زدہ اشتراکی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جب رب کا شکر ادا کر بھائی" سے متاثر ہوئے تو کلام مجید کو منظوم کرنا شروع کر دیا۔ بیک وقت ماسکو اور مکہ شریف پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ دونوں کے شاعر ہیں اور دونوں سے دور"

جوہر قریشی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"حضرت آصف شاہمیری نے بہ بانگ دہل آواز دی ــــ بھائیو۔ مٹی دو اچاروں طرف سے پبلک پل پڑی اور دیکھتے ہی دیکھتے مرحوم منوں مٹی کے نیچے خاموشی سے دب گئے مٹی اس قدر کثرت سے دی گئی کہ آس پاس کی دوسری لاوارث قبریں مرحوم کی قبر میں ضم ہو کر پہاڑ گنج کی صورت اختیار کر گئیں۔ اور اس طرح ہزاروں من مٹی میں بھوپال کے شہنشاہ طنز و مزاح پناہ کو داب دیا کہ مبادا ابھر نہ نکل آئیں۔ قبرستانی رجسٹر میں "وجہ موت" کے خانہ میں مرض طنز و مزاح لکھ دیا گیا۔ قبر کے سرہانے ایک دیوالیہ اردو پریس کا پتھر جس کو کباڑیوں نے

جزائے خیر کے لئے فی سبیل اللہ دیا تھا ۔ تاریخ وفات حسرت آیات اور سن وفات کا نصف قطعہ ــــ جوہر پیوند زمیں شد ۔ لکھ کر آخری تکمیل بھی کر دی گئی ۔"

ایک مشہور ادیب کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے ۔

"مقدمہ چلا ــ صفائی کا موقع دیا گیا ــــ آپ نے مدعی کو منہ توڑ جواب دیا کہ ــــ حضور ! مدعی پیدائشی بے عزت ہے غیر ملکیوں نے بارہا اس کو گرفتار کر کے ذلیل کیا ہے ۔"

"نادم صاحب نے اس تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا ۔ اور وجہ اختلاف یہ بتائی کہ قصبہ سیتا پور میں کوئی انگریز نہیں ہے اور اگر ہے تو ایک بوڑھا با دری جو امروز فردا میں ہندوستان تو ہندوستان دنیا ہی چھوڑ دے گا ۔ ہائی کمانڈ نے ہدایت کی کہ آپ بمبئی یا کلکتہ جا کر اس تحریک کو چلاؤ تو آپ نے صاف کہہ دیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے رہنے والے انگریزوں سے میں قطعاً نا واقف ہوں اور مجھے اتنی دوری پر رہنے والے انگریزوں سے کوئی ذاتی پرخاش بھی نہیں ۔ نیز انگریزی زبان سے بھی نا واقف ہوں پھر کس طرح انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے پر ہموار کر سکوں گا ۔"

فکر تونسوی کے یوں تو طنزیہ مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں مگر پروفیسر بدھو ان کا پہلا طنزیہ ناول ہے جو جنوری ۶۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا ہے ۔ چونکہ ۶۱ء کا پورا سال اس کو کتابت اور طباعت کے قید و بند میں گذارنا پڑا اس لئے اس کی لکھائی چھپائی پر وہ رونق اور شادابی آپ کو نظر آئے گی جو اصل ناول میں ہے ۔ اس ناول میں فکر تونسوی نے اپنے مخصوص انداز میں سماج کی بہت سی دکھتی رگوں کو چھیڑ کر طنز کی ضربیں لگائی ہیں ۔ پروفیسر بدھو جو اس ناول کے ہیرو ہیں ان کے کندھوں پر رکھ کر فکر صاحب نے بندوق چلائی ہے اور بعض جگہ تو موجودہ سیاست اور نظام حکومت پر ایسے فنی وار کئے ہیں کہ پڑھنے والا لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے ۔ فکر صاحب صحافتی طنز نگاری میں جواب نہیں رکھتے ۔ وہ ایک کہنہ مشق ترقی پسند ہیں ۔ ملاپ کے مزاحیہ کالم میں وہ پیاز کے چھلکوں کی طرح سماجی کمزوریوں کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں ۔ وہ ادب میں ایک صحافی اور صحافت میں ایک ادیب کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ پروفیسر بدھو میں ایک جگہ وہ کس درجہ لطیف انداز میں سیاست پر طنز کرتے ہیں ۔

"آخر وہ کون لوگ تھے جو ماضی میں لافانی عشق کر گئے۔ مثلاً ایک فرہاد تھا جو پہاڑ کھود کر نہر نکال لایا تھا۔ پہاڑ آج کل بھی موجود ہیں۔ مگر نہریں نکالنے کا کام فرہاد کے بجائے گورنمنٹوں نے سنبھال لیا ہے اور شاید کوئی فرہاد اگر پہاڑ کاٹنے کے لئے جائے بھی تو اُسے سرکاری جائداد کو نقصان پہنچانے کے جرم میں دھر لیا جائے۔"

اگلے زمانہ کی گورنمنٹیں کچھ زیادہ فراخ دل ہوا کرتی تھیں مگر آج کل کی گورنمنٹیں ......؟ آہ.... عشق کو بھی سرکاری جائداد سمجھتی ہیں۔"

فکر کا دماغ معلومات کا ایک اچھا بھلا مال گودام ہے جس میں ارسطو کے وقت سے اب تک کے نئے اور پرانے اقوال، ضرب الامثال، محاورات اور لطائف بھرے پڑے ہیں صحافت نگاری میں ادیب کو قدم قدم پر با ادب با ملاحظہ ہوشیار کے نعرے بلند کرنا پڑتے ہیں مگر اب وہ اس قدر مشاق ہو گئے ہیں کہ وہ بغیر کسی جھجک مسکرا مسکرا کر انھیں پھینکتے جاتے ہیں اور لوگ انھیں گل سمجھ کر اپنے دل کے دامن میں جمع کرتے رہتے ہیں۔

چودھری وجاہت علی سندیلوی کے مزاحیہ مضامین اور افسانوں کا مجموعہ 'بے ساختہ اور بے ضابطہ' کے نام سے ۱۹۶۰ء کے آخر میں شائع ہوا ہے وجاہت صاحب ہمارے ادب میں ایک سنجیدہ افسانہ نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی نے ان کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ورنہ وہ ایک محقق کا دماغ، ایک ادیب کا مزاج، ایک طنز نگار کا شعور اور انگریزی اور اُردو کے بلند پایہ صحافی کی صلاحیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ 'بے ضابطہ اور بے ساختہ' ان کے کم و بیش چوبیس پچیس مزاحیہ مضامین، خاکوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں سنجیدہ مزاح اور سماج پر گہرا طنز ملتا ہے۔ ان کے انداز بیان میں مغربی طنز نگارش کی شوخی اور مسکراہٹیں ملتی ہیں ان کی زبان شگفتہ ہے وہ اس دنیا میں بھی ہارے ہوئے مقدمات کی اس طرح وکالت کرتے ہیں کہ آخر میں فتح اور کامرانی ان کے قلم کا مقدر ہوتی نظر آتی ہے۔ ان کو روزمرہ اور زبان پر بڑی قدرت ہے۔ سندیلے میں سب لے دے کر کوئی چیز مشہور ہے تو اول سندیلے کے لڈو، دوسرے وہاں کے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، اور تیسرے وجاہت سندیلوی۔ اور سیاسی دنیا میں بیگم اعزاز رسول جن کے بارے میں سنا جاتا ہے کہ وہ بھی

... غیر معمولی شہرت سے اس درجہ متاثر ہیں کہ خود اپنا تعارف اِن الفاظ میں کراتے ہیں۔ میں ہوں بیگم ... رسول کا شوہر۔

اس دو سال کے عرصہ میں موجودہ مزاح نگاروں کا کنہیا یعنی جناب کنہیا لال کپور کے مزاحیہ مضامین کا ... ایک سیا مجموعہ گرد کارواں کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ کا نام جس قدر شاعرانہ ہے اسی قدر ... ہے تمام تر مضامین طنزیہ ادب کا شاہکار ہیں۔ یہ مجموعہ چودہ پندرہ خاکوں، افسانوں، کہانیوں اور ... چیزوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ترقی پسند غالب۔ سامع اور اندیشۂ شہر بی جمالو۔ اور متقل صاحب کے ... عنوان سے جو مضامین شامل ہیں وہ ہمارے ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ ان مضامین کو لکھ کر کپور صاحب ... نے ہمارے ادب میں نئے تجربوں کا آغاز کیا ہے۔ ترقی پسند غالب کے عنوان سے جو مضمون ہے اس میں ... نے غالب ہی کے اشعار کے ایک ہی بحر کی دو غزلوں سے دو علیحدہ علیحدہ مصرعے کر ایسا مزاح ... پیدا کیا ہے کہ زبان بے اختیار چٹخارے لیتی ہے۔ ان اشعار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

موت کا ایک دن معین ہے
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اسی مضمون میں ایک طنزیہ نظم بھی ہے جو اشتراکی اور ترقی پسند شاعروں پر ہے جو ادب سے سیاسی ... پروپیگنڈے کا کام لینے لگے ہیں۔

کبھی قلم ہاتھ میں تھا میرے
غزل بھی کہہ لیتا تھا میں خاصی
نہ جانے کیا میرے دل میں آئی
کہ توڑ ڈالا قلم کو ساتھی
پکڑ کے ہاتھوں میں اک ہتھوڑا
ادب کی تخلیق کر رہا ہوں
ہتھوڑے سے یعنی لکھ رہا ہوں
ادب برائے یہ ماسکو ہے
نہیں ادب یہ برائے دلّی
میں صاف اعلان کر رہا ہوں
کہ بن گئی ہے مرکھنی گائے
ہوا جو کرتی تھی بھیگی بلّی
قسم مجھے گورکی کی ساتھی
ادب کو رہنے ادب نہ دوں گا
قسم مجھے ایلیا کی ساتھی
میں شاعری تو نہیں کروں گا
لگاؤں گا میں ادب میں نعرے
کہ آرہا ہے نیا سویرا
کہ شاعری ختم ہو چکی ہے
درانتیاں گیت گا رہی ہیں

اسی مجموعہ میں "نوزہ کا نرڑ کا ہوا" کے عنوان سے ایک مضمون ہے جس میں سویرے سویرے جو بوڑھے اور ازکار رفتہ اپنی صحت درست کرنے کی غرض سے پارکوں اور میدانوں میں ٹہلنے نکلتے ہیں اُن کی بات چیت کا انداز نہایت

و لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ دوسرے نے جواب دیا: اجی آپ ہماری توند کی فکر میں سوکھ کر بے ٹا ہو گئے ہیں ننانوے کے پھیر سے نکلئے اور کچھ کھایا پیا کیجئے۔ اس تمہید کے بعد جو دوسری دلچسپ ٹیں ہوئیں وہ اس قسم کی تھیں۔

کہیئے خارش کا کیا حال ہے ؟
ایک پل چین نہیں لینے دیتی
جوڑوں کے درد سے کچھ افاقہ ہوا
اجی کہاں ہڈی ہڈی دکھتی ہے
آپ کی آنکھ کا کیا حال ہے
جب سے آپریشن کرایا ہے نگاہ کمزور ہوگئی ہے
سُنا ہے آپ نے بھینس فروخت کردی
جی ہاں اب مرغیاں پالنے کا خیال ہے
پیاز اوپر جا رہے ہیں سٹاک کرنے کا بہت اچھا موقع ہے
آپ کے پاس کھٹی ڈکاروں کا نسخہ تھا وہ ہمیں بھی دیجئے۔

ان ہی مزاحیہ مجموعوں میں ایک مجموعہ راقم الحروف کے مزاحیہ مضامین کا بھی ہے جو "مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں" کے عنوان سے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا ہے۔ اس کی ایک جلد راقم الحروف نے قومی آواز لکھنؤ کو بغرضِ ریویو بھیجی تھی مگر خدا جانے کس غلط فہمی کے تحت اس کے تبصرہ نگار مولانا رضا انصاری نے بجائے کتاب کے ناشر کی ذات پر ریویو کر دیا اور کتاب اپنی جگہ اُسی طرح بے داغ رہی اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری مزاح نگاری کس درجہ انفرادیت سے پُر ہے اور خاکسار دوسرے مزاح نگاروں سے کس درجہ پست یا بلند درجہ کا انسان ہے۔ بہرصورت جہاں تک طنز و مزاح کے موضوع کا تعلق ہے میں اُس خاکہ، فیچر یا مضمون کو کسی قیمت پر طنزیہ یا مزاحیہ ماننے کو تیار نہیں۔ جس میں کسی قسم کی دلآزاری کا پہلو ہو اور جس سے پڑھنے والے کے ماتھے پر شکن آجائے۔ میں نے اب تک جس قدر مزاحیہ مضامین یا فیچر لکھے ان میں اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا چنانچہ اس مجموعہ میں

بھی آپ کو اِسی نوعیت کا مزاح یا طنز ملے گا۔

مجھے تو پسند اور مجنوں کو لیلیٰ
نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی

پروفیسر دلاور فگار جو ابھی ڈال کے ٹوٹے مزاحیہ شاعر ہیں ان کی غزلوں نظموں اور قطعات کا ایک مجموعہ "ستم ظریفاں" کے نام سے ابھی حال میں شائع ہوا ہے۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہر شخص اُن کی جوانی کا منکر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

ان کی ایک نظم انٹرویو کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کوئی لڑکا؟ ایک وہ بھی ناخلف — گر قبول افتد زہے عزّ و شرف
جائے پیدائش؟ بھگوتی پور حضور — رچھورہ سے صرف بارہ کوس دور
ایج یعنی عمر؟ پورے تیس سال — اور سرکاری سند سے بیس سال
کوئی والی ہے تمہارا نزد و دُور — جو بھی کچھ ہیں اوّل و آخر حضور
کیا کوئی اونچی سفارش لائے ہو؟ — جی نہیں۔ تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟

کرکیٹ میچ بھی ان کی ایک مزاحیہ اور طنزیہ نظم ہے اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہاں کچھ ایسے بھی کپتان پائے جاتے ہیں
جو رن بناتے نہیں ہٹ لگائے جاتے ہیں
ادب نوازوں میں شاؤٹ یہاں بھی ہوتے ہیں
یہ بدنصیب رن آؤٹ یہاں بھی ہوتے ہیں
بجائے فضل کے سکسر پہ مرحبا کہنا
مگر فراق کی باؤنڈری کا کیا کہنا
حنیف بھی کوئی بوگس کرکیٹر تو نہیں
مگر عدم سے زیادہ فسری ہٹر تو نہیں

میرے خیال کو اہل نظر کریں گے کچ
مشاعرہ بھی ہے اک طرح کا کرکٹ میچ

ان کی ایک نظم "اے خاصۂ خاصانِ ادب" جو مسدس حالی کے رنگ میں ہے بہت ہی اچھی ہے۔
اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب شعر ہے ہر جملۂ بے معنی و موزوں
لیلیٰ کی کہانی ہے نہ افسانۂ مجنوں
تشریح کرے اس کی کوئی یوں تو کوئی یوں
مطلب مگر اس کا نہ سمجھ پائے فلاطوں
مطلب ہی نکل آئے تو پھر شعر ہی کیا ہے
اے خاصۂ خاصانِ ادب وقتِ دعا ہے

ان کی ایک نظم مشاعرہ کے عنوان سے ہے جو غالباً ان کی سب سے زیادہ کامیاب نظم ہے۔ افسوس کہ اس وقت ان کی اس نظم کا کوئی بند مجھے یاد نہیں۔

ان کا کلام پڑھنے سے ان کے عربی النسل ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے جہاں لڑکیاں سن بلوغ کو پہنچنے سے قبل ہی بالغ ہو جاتی ہیں۔ اس عمر میں جب ان کے کلام میں یہ پختگی ہے تو آئندہ ان کی پختگی اگر قطب مینار اور تاج محل کو شرمائے تو چنداں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔

تراجم

عبداللطیف اعظمی

ہر زبان کی نشو ونما اور اس کی ترقی میں ترجموں کو بہت دخل ہے۔ یہ دور اردو ادب میں بھی آیا اور اس میں شبہ نہیں کہ ترجموں سے، بالخصوص مغربی ادب کے ترجموں سے اردو ادب کو بہت کافی فائدہ پہنچا ہے۔ آج بھی جبکہ اردو ادب بہت کافی ترقی کر چکا ہے، ترجموں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

آزادیٔ وطن سے قبل جن اداروں نے ترجموں کے ذریعہ اردو ادب کی قابلِ ذکر خدمت کی ہے، ان کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن آخری دور کے اداروں میں دار الترجمہ حیدرآباد اور مکتبہ جامعہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اول الذکر کے ترجموں کی زبان مشکل اور ان کے اسلوب میں پیچیدگی اور الجھاؤ ہے، اس لئے وہ زیادہ مقبول نہ ہو سکے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی کوششوں سے اردو کے خزانے میں بڑا قیمتی سرمایہ منتقل ہوا ہے مگر افسوس کہ یہ ادارہ نئے حالات میں جاری نہ رہ سکا۔ مکتبہ جامعہ کے ترجمے سلیس اور عام فہم ہیں اور انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، مگر اب اس ادارہ کی توجہ اس طرف بہت کم ہو گئی ہے۔ اس وقت جو ادارے ٹھوس علمی اور کلاسیکی ادب کے اردو میں ترجمے شائع کر رہے ہیں، ان میں دو نیم سرکاری ادارے —— ساہتیہ اکیڈمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کو بہت اہمیت حاصل ہے اور در اصل اس وقت ان ہی کی بدولت اردو ترجمے کی آبرو قائم ہے۔

سنہ ۶۱ء میں اردو ترجموں کی تعداد اچھی خاصی ہے، مگر میری جن ترجموں تک رسائی ہو سکی ہے ان میں کلاسیکی ادب کا کوئی ترجمہ نہیں ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی کے پروگرام میں مختلف زبانوں کے کلاسیکی ادب کے اردو ترجمے شامل ہیں اور پچھلے برسوں میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے گوئٹے کے مشہور ناول ولہیلم مائسٹر کی جلد اول کا ترجمہ براہ راست جرمن زبان سے کیا ہے، جو دو جلدوں میں

... ہوچکا ہے۔ اب وہ اصل کتاب کی دوسری جلد کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ غالباً یہ ترجمہ بھی اردو میں دو جلدوں میں شائع ہوگا۔ اسی طرح سجاد ظہیر صاحب نے فرانسیسی کے مشہور ادیب والٹیر کے طویل افسانے کا ترجمہ کیا ہے، جو کاندید کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مگر زیر تبصرہ سال میں ساہتیہ اکیڈمی کی تمام تر توجہ ٹیگور کے ڈراموں، ناولوں اور نظموں کی طرف رہی۔ یہ کام بھی بہرحال اہم ہے اور اکیڈمی نے ہندوستان کے شاعر اعظم کے علمی کارناموں سے اردو خواں طبقہ کو روشناس کر کے بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ٹیگور کے ڈراموں، افسانوں، ناولوں اور نظموں کے ترجمے اُردو میں پہلے سے موجود ہیں، مگر عام طور پر یہ ترجمے تجارتی نقطۂ نظر سے کئے گئے ہیں اور ایک دو کے علاوہ تمام تر غیر مستند ادیبوں کے کئے ہوئے ہیں۔ ساہتیہ اکیڈمی یقیناً شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے اُردو کے بہترین مترجمین کی خدمات حاصل کر کے ٹیگور کی نمائندہ چیزیں اُردو میں منتقل کیں۔ ان مترجمین میں ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، اور فراق گورکھپوری جیسے ادیب و شاعر شامل ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد صاحب نے ٹیگور کے ایک ناول چوکھیر بالی کا ترجمہ کیا ہے۔ موصوف اُردو کے ان چند بلند پایہ مترجمین میں سے ہیں، جن کے ترجمے اور خالص تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور جنھیں اپنی زبان اور دوسری زبان پر یکساں عبور حاصل ہوتا ہے اور دوسری زبان کے مطلب کو پوری صحت کے ساتھ ادا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ پروفیسر مجیب صاحب نے ٹیگور کے تین مشہور ڈراموں — لال کنیر، راجہ اور ڈاک خانہ — کے ترجمے کئے ہیں۔ مجیب صاحب کو ڈراموں سے فطری لگاؤ ہے اور خود نہ صرف یہ کہ کئی ڈراموں کے مصنف ہیں، بلکہ ٹیگور کی طرح ڈرامے کے فن اور اسٹیج کی تکنیک سے بخوبی واقف ہیں، اس لئے ان ڈراموں کے ترجمے کے لئے ان سے زیادہ اور کوئی شخص موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ پروفیسر فراق گورکھپوری انگریزی ادب کے استاد رہ چکے ہیں اور اردو کے بہترین شاعروں میں سے ہیں، اس لئے ایک طرف ادب کے رمز شناس ہیں، دوسری طرف شاعری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، لہٰذا ان سے یہ توقع رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے ٹیگور کے شاعرانہ کمال کو بڑی حد تک اردو ترجمے میں باقی رکھا ہوگا۔ اس ترجمے کے کچھ نمونے "آجکل" کے ٹیگور نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ اس ترجمے پر ایک تنقیدی مضمون بھی شائع ہوا ہے، جس میں ترجمے کی خامیاں بیان کی گئی ہیں

مگر جب تک پوری کتاب چھپ کر سامنے نہ آجائے فی الحال کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

ٹیگور کے یہ ترجمے جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، زیرِ تبصرہ سال میں کئے گئے ہیں، مگر ابھی کتابی صورت میں مکمل ہو کر شائع نہیں ہوئے ہیں۔ شاید ابھی کچھ وقت لگے گا۔ البتہ حسبِ ذیل کتابیں سنہ۶۱ء میں شائع ہو چکی ہیں:-

(۱) INDIA WINS FREEDOM از مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔

(۲) EDUCATIONAL RECONSTRUCTION IN INDIA از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

(۳) KALKI OR THE FUTURE OF CIVILISATION از رادھا کرشنن۔

(۴) INDIA. TODAY & TOMORROW از پنڈت جواہر لال نہرو۔

(۵) امریکی ناول اور اس کی روایات۔ از رچرڈ چینز۔

(۶) مسالک الابصار فی ممالک الامصار۔ مولف ابن فضل اللہ عمیری

(۷) تفسیر مظہری، مولف قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی مرحوم۔

(۸) آتم کتھا۔ از ڈاکٹر راجندر پرشاد۔

(۹) شکنتلا از کالی داس۔

(۱۰) ASPECTS OF SCIENCE از سی، وی رامن

مولانا آزاد مرحوم کی کتاب اپنے دور کی مقبول ترین اور اہم ترین کتاب ہے ترجمہ "ہماری آزادی" کے نام سے پروفیسر محمد مجیب صاحب نے کیا ہے۔ یہ کتاب جتنی اہم ہے، اس کا تقاضا تھا کہ اتنا ہی اہم مترجم بھی ہو۔ مجیب صاحب کا خاص مضمون تاریخ اور سیاست ہے اور جن لوگوں نے پچھلے دور کے رسالہ جامعہ کا پابندی اور غائر نگاہ سے مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ سیاسیات حاضرہ پر مجیب صاحب کے ماہانہ تبصرے کتنے متوازن اور ان کی رائیں کتنی معروضی ہوتی تھیں۔ اس کتاب کے لئے ایک ایسے ہی مترجم کی ضرورت تھی۔ البتہ مجیب صاحب کے طرزِ تحریر پر مغربی اسلوب کا بہت اثر پڑا ہے۔ وہ جرمن، فرانسیسی، اور روسی سے بھی بخوبی واقف ہیں اور ان سب کی خوبیوں کو بڑی فیاضی سے اپنایا ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کی تحریروں میں مغربی اسلوب نمایاں ہو جاتا ہے

ترجمے میں تو اس کا احساس اکثر ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اردو کی طرح انگریزی کے بھی بہترین مصنفین میں سے ہیں اس لئے ان کا انگریزی طرز نگارش بھی بڑا دل کش ہوتا ہے، اس لئے ان کے ترجموں میں انگریزی کی نزاکتیں اور باریکیاں بھی اسی خوبی کے ساتھ منتقل ہوجاتی ہیں۔

دوسری کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے، جو نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اردو کے صاحب اسلوب ادیب ہیں۔ اگر انہوں نے اسے اردو میں لکھا ہوتا یا خود انہی نے اس کا ترجمہ کیا ہوتا، تو یہ کتاب زبان اور طرز تحریر کے لحاظ سے بھی اردو ادب میں ایک مستقل جگہ کی مالک ہوتی، لیکن ان کے علاوہ اگر کوئی اور مترجم ذاکر صاحب کی خوبیوں کو باقی رکھ سکتا تھا، تو وہ صرف ڈاکٹر عابد صاحب ہیں۔ عابد صاحب ذاکر صاحب کے نہ صرف یہ کہ ہمدم دیرینہ ہیں، بلکہ تعلیم کا بھی وسیع تجربہ اور گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، اس لئے ایک طرف وہ ذاکر صاحب کی اداؤں کو سمجھتے ہیں، دوسری طرف تعلیم کے پیچ و خم سے بھی خوب واقف ہیں، اس لئے اس ترجمے میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ایک خالص تخلیقی کتاب میں ہوتی ہیں۔

تیسری کتاب کا ترجمہ بھی کلکی یا تہذیب کا مستقبل کے نام سے نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ اردو کے مشہور اور مستند ادیب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب نے کیا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے احتشام صاحب کا یہ پہلا ترجمہ ہے۔ ترجمہ ایک مستقل فن ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص اپنی زبان میں اچھا لکھتا ہے، وہ دوسری زبان سے اچھا ترجمہ بھی کرسکتا ہے۔ مگر احتشام صاحب کا ترجمہ دیکھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جتنا اچھا وہ لکھتے ہیں، اتنا اچھا ترجمہ بھی کرسکتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھتے وقت بہت کم محسوس ہوتا ہے کہ ہم ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں بعض چیزیں کھٹکتی ہیں، تو بظاہر اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ہمارے یہاں اصطلاحات کے متعین ترجمے نہیں ہیں، اس لئے کبھی کبھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مترجم نے یہاں انگریزی کی کس اصطلاح کا ترجمہ کیا ہے۔ اس ابہام یا الجھاؤ کی وجہ سے مفہوم کے تعین میں دقت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ احتشام صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ "وہ نئی قدروں اور مطابقتوں کو قبول کرلیں"۔ یہاں اردو خواں کو مطابقتوں کے مفہوم کے تعین میں بڑی دقت پیش آئے گی۔ اسی طرح ایک جگہ (صفہ) خود اظہاری کا لفظ

استعمال کیا گیا ہے، جو مناسب نہیں ہے۔ دوسری بات میں نے یہ محسوس کی کہ ہر جگہ لفظ کی جگہ لفظ نہیں رکھنا چاہیئے، بلکہ اُردو خواں طبقہ کی مناسبت اور اس کے ماحول کے لحاظ سے اس مفہوم کو ادا کرنا چاہیئے مثلاً ایک جگہ احتشام صاحب نے ترجمہ کیا ہے: "سماجی انتشار کا واحد حل" آزمائشی شادیاں ہی معلوم ہوتی ہیں"۔ (ص ۱۳) میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے لوگ "آزمائشی شادیوں" سے واقف نہیں ہیں۔ احتشام صاحب نے اردو خواں طبقہ کی مناسبت سے جابجا مفید فٹ نوٹ دئے ہیں۔ اگر اس کی بھی وضاحت کر دیتے تو اچھا تھا۔

اس ضمن میں ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اُردو میں پہلے سے کوئی لفظ یا محاورہ موجود ہے، تو لفظی ترجمہ کے بجائے اُردو کے مروّج لفظ کو ترجیح دینا چاہیئے۔ مثلاً ایک جگہ احتشام صاحب نے ترجمہ کیا ہے: "..... عجیب عجیب باتوں کے متعلق "غیر منہضم" معلومات اکٹھا کر دی ہیں"۔ (ص ۲۰) غیر منہضم "Undigested" کا لفظی ترجمہ ہے۔ یہ لفظ جب فیکٹس (Facts) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی غیر مرتب یا غیر مربوط کے ہوتے ہیں۔ یہی ترجمہ یہاں مناسب تھا۔ "غیر منہضم" معلومات اُردو محاورے کے خلاف ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی خامیوں کے علاوہ یہ ترجمہ ہر لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

چوتھی کتاب کا ترجمہ راقم الحروف نے کیا ہے، جو نیشنل بک ٹرسٹ سے "بھارت — آج اور کل" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ مجھے ترجمہ سے دلچسپی ہے، اور چاہتا ہوں کہ ترجمے کے مسائل کو اصحاب فکر و نظر کی مدد سے حل کیا جائے۔ جامعہ ملّیہ میں اس کے مواقع بھی ہیں، رسالہ جامعہ میں بھی اصطلاحات کے ترجمے کا آغاز کرنے کا خیال آیا، مگر ابھی اس خیال کو عملی شکل دینے کی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ یہ ترجمہ چوں کہ خود میرا ہے، اس لئے ظاہر ہے اس کی خامیوں کا اندازہ دوسرے حضرات ہی کر سکتے ہیں، اس لئے اس پر تبصرہ ان کے لئے چھوڑتا ہوں۔

پانچویں کتاب کا ترجمہ اُردو کے مشہور نقاد سید وقار عظیم صاحب نے کیا ہے۔ مجھے یہ کتاب مضمون لکھنے کے بعد اتفاق سے ایک دوکان پر نظر آئی، اس لئے غور سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ مترجم نے مصنف اور کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ "ڈاکٹر رچرڈ چیز کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی کے اُستاد ہیں اور ان کا شمار امریکہ کے ممتاز نقادوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے امریکی ناول

کی بعض بنیادی اور امتیازی خصوصیات کی نشان دہی کی ہے۔ ان کی رائے میں امریکی ناول تاریخ نگاری اور ان کے امتزاج و عروج کی تاریخ ہے اور اس میں غالب عنصر رومان کا ہے۔" (ص۷)

چھٹی کتاب کا ترجمہ مولانا خورشید احمد فارق صاحب نے عربی سے کیا ہے، جو تاریخ ہند پر نئی روشنی کے نام سے شائع ہوا ہے۔ فارق صاحب اس سے پہلے بھی عربی سے کافی ترجمے کر چکے ہیں ان کے ترجمے سلیس اور شگفتہ ہوتے ہیں۔ کتاب پر تبصرہ تنقید و تبصرہ کے ماتحت کیا جائے گا۔

ساتویں کتاب بھی عربی سے ترجمہ کی گئی ہے، مگر ٹائیٹل کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب ضرورت تشریح اور اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ یہ پہلی جلد ہے، جو ابتدائی دو پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تفسیر کا انداز پرانا ہے اور ترجمے کی زبان بھی وہ ہے، جو عام طور پر قدیم مذہبی مدارس میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔

آٹھویں کتاب کا ترجمہ ہندی سے جناب گوپی ناتھ امن نے کیا ہے، جو اپنی کہانی کے نام سے ساہتیہ اکیڈیمی سے شائع ہوا ہے۔ امن صاحب تجربہ کار جرنلسٹ اور اچھے ادیب ہیں۔ موصوف اردو ہندی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں اور قومی تحریکوں میں ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ اس لئے ہندی کی اس کتاب کی، زبان، مواد اور جذبات کے لحاظ سے، ترجمانی ان سے بہتر اور کون کر سکتا تھا، لہذا امن صاحب کا انتخاب ہر لحاظ سے موزوں اور مناسب ہے، لیکن تعجب ہے کہ بعض مواقع پر ترجمہ بری طرح کھٹکتا ہے بعض جگہ زبان میں وہ روانی اور سلاست نہیں ہے جس کی امن صاحب سے توقع کی جاتی ہے، اس کے علاوہ کہیں کہیں عربی کے ناموزوں اور ہندی کے نامانوس الفاظ اور عامی محاورے ذوق پر بہت گراں گزرتے ہیں مثال کے طور پر ذیل کے جملوں میں خط کشیدہ الفاظ ملاحظہ ہوں۔

" یہ انتخاب کہیں زیادہ بسیط تھا (ص۲۰) " سب جھگڑوں کا وہی نپٹارہ کرتے " (ص۴۴) وہ عہد و پیمان کی توثیق رکھتے تھے۔ (ص۷۸) " انھوں نے ان شن (ترک غذا) شروع کر دیا۔ (ص۷۹) " مشرجی سے ست سنگھ رہا۔ (ص۱۰۵)۔

پورا ترجمہ یکساں نہیں ہے۔ شروع میں بہت رواں اور سلیس ہے، لیکن آخر میں کچھ زیادہ

اچھا نہیں۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ کانگریس کے منشورہ کا تذکرہ ہے :۔

"مزدوروں کی حالت سدھارنے کا وعدہ تھا۔ ان کی نوکری مستقل بناکر، ان کے رہن سہن کا معقول تدارک کراکر اور ان کی مزدوری میں ترقی دلاکر ساتھ ہی مزدور جماعتوں کو قائم و منظم کرکے حقوق دلوانے اور دوسرے طریقے سے ان کی حالت سدھارنے کی بات بھی کہی گئی تھی۔" (ص ۶۹)

اس خامی کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ شاید موصوف کو اپنی روزمرہ کی مصروفیات کی وجہ سے ترجمے میں جس ریاض کی ضرورت ہوتی ہے اس کا موقع نہیں ملا۔

نویں کتاب سنسکرت کے زندہ جاوید شاعر کالی داس کی مشہور و معروف کتاب شکنتلا کا منظوم ترجمہ ہے، جسے اردو کے مقبول ترین شاعر حضرت ساغر نظامی نے انجام دیا ہے۔ کتاب ظاہری حسن کے لحاظ سے بڑی دیدہ زیب اور ساغر صاحب کے ستھرے ذوق کی آئینہ دار ہے ۱۹۶۱ء میں ہندوستان و پاکستان میں حسن و خوب صورتی میں اس کے مقابلہ میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اس کو صحیح معنی میں ترجمہ کہنا مشکل ہے۔ اولاً تو نظم میں مصنف کے خیالات، اسلوب اور الفاظ کی پابندی ممکن ہے ہی نہیں۔ دوسرے اصل زبان سے جب تک براہِ راست گہری واقفیت نہ ہو، مصنف کے جذبات و خیالات کو بے کم و کاست ترجمہ میں ادا کرنا مشکل ہے۔ خود مترجم نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے ترجمہ میں اصل کی پوری پابندی نہیں کی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :۔

"یہ ترجمہ کہیں اصل کا ڈائرکٹ (پابند ؟) ترجمہ ہے، کہیں کالیداس کے جذبات اور مقاصد کو ایک مختار اسلوب میں ظاہر کیا ہے اور کہیں کہیں اپنی تخلیقی اہلیت سے کام کے کر ان کے دائرہ مطالب و مفاہیم میں لطیف اضافے کئے ہیں۔ یہ اضافے کالیداس کے مقاصد منجلی (؟) کرنے کے لئے ہیں۔ (صفحہ ۹۸)۔

فن شاعری کے لحاظ سے اس ترجمے پر ایک اعتراض یہ ہے کہ قدم قدم پر اس کی بحریں بدل جاتی ہیں۔ کہیں کہیں نظم معریٰ بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اس "بدعت" کی حمایت یا توجیہہ میں ساغر صاحب

نے مقدمہ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ "ادبی مغنی" اس وضاحت کے بعد اس بدعت
کو جائز سمجھیں گے یا نہیں، مجھے تو بحروں کی یہ تبدیلی ذوق پر بہت گراں گزرتی ہے اور ذہن میں
ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔

ساغر صاحب نے ایک طویل اور مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے، جو واقعی بڑی محنت اور تلاش و جستجو
کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے بہ الفاظ خود "سنسکرت زبان کے آغاز و ارتقا، اس کی تاریخ
وار ادوار، اس کے ادب، ناٹک، اس کی تاریخ آغاز و ترقی اور جملہ متعلقات پر اجمالی طریقے
سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے" (ص۱۲) میرے خیال میں اس موضوع پر اس قدر بسیط و تفصیلی
ہے اردو میں کسی نے نہیں لکھا ہے اور واقعی ساغر صاحب کی سعی و کوشش تعریف کی مستحق ہے
لیکن اس کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساغر صاحب بہترین ادب اسے سمجھتے ہیں،
جس میں بڑے بڑے الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ ان کے اس شوق نے مقدمہ کی سلاست اور
روانی کو بری طرح مجروح کیا ہے اور کہیں کہیں عبارت آرائی میں مطلب بالکل خبط ہو کر رہ گیا
ہے۔ موصوف نے ان بوجھل الفاظ کے استعمال کی حسب ذیل توجیہہ کی ہے:-

"لیکن خالص اردو ہندی کے الفاظ کے استعمال کے ساتھ میں اس کا قائل نہیں کہ
فارسی کے پرشکوہ اور خوش آہنگ لفظوں سے ارادتاً بچا جائے، جیسے ان کی مسموم ہوائیں
ہمارے جذبہ و خیال کو جھلسا دیں گی۔ صدیوں میں اردو کا جو سانچہ بنا ہے اس میں فارسی
کی شیرینی اور قوت اس کی زندگی کا تازہ خون بن کر حل ہوئی ہے۔ یہ قوت برسوں کی
مسلسل کوششوں کے بعد ایک کارگر عنصر بن سکی ہے، اس سے بچنا قوت سے محروم
ہو جانے کے مترادف ہے۔ (صفحہ ۸۱)۔

ساغر صاحب کے اس خیال سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ خوش آہنگ الفاظ سے ارادتاً بچنا
مناسب نہیں لیکن ساغر صاحب کے یہاں تو پرشکوہ الفاظ کے شوق میں عبارت کا آہنگ بگڑ گیا ہے
اور الفاظ کے معنی غلط ہو گئے ہیں۔ مثلاً موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے: "سنسکرت کرداروں کی تشکیل
گو بہت فنکارانہ ہوتی ہے مگر مشخص نہیں بلکہ تمثیلی ہوتے ہیں" (۳۸) یہاں "مشخص" کا استعمال

لفظی غلط ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے اپنی شاعری میں نفسِ گرم" بہت استعمال کیا ہے۔ ساغر صاحب کے اس ترجمے میں گرم نفس" ہو گیا ہے۔ (۴۶) موصوف نے کئی جگہ لفظ "امتداد" تنہا استعمال کیا ہے۔ (۴۶) مقصد ہے امتداد زمانہ۔ ایک جگہ ساغر صاحب نے لکھا ہے "ہماری زبان کی امارت اور انجذابی اہلیت مصدّق ہو گی (۸۵) "انجذاب" لازم ہے متعدی نہیں۔ میں نے اوپر ایک جگہ ساغر صاحب کا ایک مختصر اقتباس نقل کیا ہے۔ اس میں موصوف نے "منجلی" استعمال کیا ہے۔ اردو میں جلا لکھتے اور بولتے ہیں۔ عبارت میں شکوہ پیدا کرنے کیلئے جلا سے انجلاء اور انجلاء سے منجلی بنا یا گیا۔ انجلاء بھی لازم ہے جس کے معنی ہیں روشن اور نمایاں ہونا۔ منجلی اسم فاعل ہے، جس کے معنی ہوئے روشن ہونے والا۔ ظاہر ہے یہاں یہ لفظ غلط ہے۔ ایک روزمرہ ہے "عوام کالانعام"۔ اسے ساغر صاحب نے "عوام کالعنام" کر دیا۔ معلوم نہیں موصوف نے "عنام" کے کیا معنی لئے ہیں اور کیا سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ موصوف نے لکھا ہے: "نئی بحروں کی تخلیق، الفاظ کی تال اور سُر اور متعارفہ الفاظ سے غریب الفاظ کی عقد کا ذمہ دار ہے۔" (ص۹۱) اگر "الفاظ" کی رعایت سے "متعارفہ" لکھا گیا ہے تو بچارے "غریب" نے کیا قصور کیا تھا کہ اسے "ۃ" سے محروم رکھا گیا؟ اگر "متعارفہ" لکھنا تھا تو صحیح ترکیب ہوتی: "الفاظِ متعارفہ اور الفاظِ غریبہ" لیکن زیادہ بہتر یہ ہوتا کہ "معروف الفاظ اور غریب الفاظ لکھا جاتا۔

دسواں ترجمہ نیشنل بک ٹرسٹ سے: "سائنس کے چند پہلو" کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے مترجم کوئی سید حسین صاحب ہیں۔ سائنس کے ترجمے عام طور پر اچھے نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ سائنس کے استاد عام طور پر ادیب اور زبان داں نہیں ہوتے، اس لئے انھیں ترجمہ پر پوری قدرت نہیں ہوتی، دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو میں اصطلاحات کا ترجمہ نہیں ہوا ہے، اس لئے بھانت بھانت کے ترجمے کئے جاتے ہیں۔ اصطلاحات کے انفرادی ترجمے یوں بھی سب کے لئے قابل قبول مشکل ہی سے ہو سکتے ہیں، لیکن اگر مترجم یا مترجمین عربی سے اچھی واقفیت نہ رکھتے ہوں تو ان کے ترجمے اکثر مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں: زیرِ تبصرہ ترجمہ "سائنس کے چند پہلو" کی زبان اور اسلوب میں بڑا الجھاؤ ہے، متعدد مقامات پر غور کرنے پر بھی آسانی سے

مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اصطلاحات کے بارے میں بھی اختلاف کی بہت کافی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے جن کو میرے نزدیک اردو کے مترجمین میں ترجمے کی کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے سب سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔ اچھے اور برے ترجمے کی بہت مناسب تعریف کی ہے۔ موصوف نے ترکیبی ادب کے نام سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے، جس میں اچھے ترجمے کے بارے میں فرماتے ہیں: ”ایک شخص جو اپنی زبان کا مانا ہوا ادیب ہے اپنی زبان پر پوری قدرت اور دوسری زبان سے گہری واقفیت رکھتا ہے، اس زبان کے ادبی شہ پاروں کے مطالعے میں ڈوب کر تہ تک پہنچ جاتا ہے اور ان کے مطلب کو صحت اور وضاحت، روانی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنی زبان میں ڈھال دیتا ہے، تو یہ ترکیبی ادب نہیں بلکہ بڑی حد تک تخلیقی ادب ہے جسے خالص تخلیق سے الگ کرنے کے لئے ترجمہ کہہ دیتے ہیں۔“ ایسے ترجمے جو مذکورہ بالا تعریف پر پورے اترتے ہیں شاذ و نادر ہوتے ہیں اور جو لوگ ایسے ترجمے کر سکتے ہیں، ان کی خدمات حاصل کرنا آسان نہیں، لیکن کلاسیکی کتابوں کے ترجمے ادب کے لئے مفید اور اس میں اضافہ اسی وقت سمجھے جائیں گے، جب مذکورہ بالا معیار کے مطابق ترجمے کئے جائیں۔

برے ترجمے کی تعریف ڈاکٹر صاحب نے یہ کی ہے کہ ”دوسری زبانوں کی کتاب سامنے رکھ کر، ڈکشنری کی مدد سے لفظ کے مقابلے میں لفظ ٹانکتے چلے گئے تو یہ ترجمہ نہیں بلکہ اندھا دھند نقل ہے جسے محاورے میں مکھی پر مکھی مارنا کہتے ہیں۔ کسی خیال یا مضمون کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اکھڑی اکھڑی، ناہموار، الجھی ہوئی عبارت میں ادا کرنا جسے عام طور پر ترجمہ کہا جاتا ہے، ترکیبی ادب کا سب سے سہل نسخہ اور اس کی سب سے بھدی صورت ہے۔“ ہر سال کی طرح سنہ ۱۹۶۱ء کے ترجموں میں بھی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔ میں نے اس مضمون میں ان ترجموں پر تبصرہ کیا ہے، جو مجھے مل سکے عام طور پر ترجمے بہت کثرت سے ہوتے رہتے ہیں۔ بیرونی ممالک کے سفارت خانوں کی سیاسی ضرورتوں نے ترجمے کے معاوضے کو کافی اونچا اور ترجمے کے معیار کو کافی پست کر دیا ہے، جس کی وجہ سے سفارت خانوں میں مترجمین کی قطار کی قطار نظر آئے گی، جس میں اگر اتفاق سے کوئی ”اہل نظر“ پھنس جائے تو غالب کا مشہور شعر ”ہر بوالہوس . . . . پڑھتا ہوا واپس جاتا نظر آئے گا۔ اگر اصل سے ملا کر دیکھا جائے تو ایسے ترجمے بہت مل جائیں گے، جنہیں ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی اصطلاح میں ترکیبی ادب کہتے ہیں۔ ایسے ترجموں سے اردو ادب کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ افسوس میں بہت سے غلط ترجمے رائج ہو گئے

ہیں، مثلاً Vested Interest کا مفاد پرست Co-existence کا ترجمہ بقائے باہم اور
اور ان میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ترجمہ کا کوئی معیار نہیں ہے۔ علمی وادبی اصطلاحوں کا کوئی مستند ترجمہ
نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی اصطلاح کے مختلف ترجمے کئے جاتے ہیں مثلاً Satire کا ترجمہ کوئی ہجو
کرتا ہے کوئی طنز۔ Irony کا ترجمہ کوئی رمز کرتا ہے، کوئی طنز۔ نیز ایک ہی ترجمہ کئی اصطلاحوں کے
لئے استعمال ہوتا ہے، مثلاً ایمائیت یا اشاریت Suggestiveness اور Symbolism
دونوں کا ترجمہ کیا جاتا ہے، اسی طرح مزاح Humour کا بھی ترجمہ کرتے ہیں اور WIT کا بھی۔ ایک
ادیب نے تضاد Incongruity کا ترجمہ کیا ہے اور ایک استاد سائنس نے Contrast
کا ــــــ ضرورت ہے کہ اردو کے علمی وادبی ادارے اس طرف فوری توجہ کریں اور وضع اصطلاحات
کا اہم کام شروع کریں۔ ورنہ ہمارے بیشتر ترجمے مصنوعی ادب میں اضافہ تو کریں گے، اچھا ادب پیدا
نہ کر سکیں گے۔

نوٹ :

اس مضمون کی کتابت ہو چکی تھی، اس وقت ایک کتاب "ہندوستان کا
دستور اور اس کی شرح" موصول ہوئی۔ یہ ہندوستان کے دستور کا انگریزی سے
ترجمہ ہے اور جہاں تہاں مترجم نے وضاحت اور تشریح بھی کر دی ہے۔ یہ ترجمہ بھی
سنہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس پر تبصرہ "تنقید و تبصرہ" کے صفحات میں
ملاحظہ ہو۔

بچّوں اور بالغوں کی کتابیں

جناب محمد حسین حسّان

اُردو زبان میں بچّوں کا ادب اور بالغوں کا ادب دونوں ہمیشہ بے توجہی کا شکار رہیں انھیں اتنی اہمیت کبھی حاصل نہ ہوئی جتنی اہمیت کے یہ مستحق ہیں۔

بالغوں کی تعلیم کا مسئلہ تو اب سے کوئی ۲۵، ۳۰ برس پہلے سامنے آیا ہے، اس سے پہلے ہندوستان کی بیشتر آبادی کے اَن پڑھ ہونے کا احساس ضرور تھا مگر اسے دور کرنے کے لئے عملی قدم اٹھانے کی نوبت بعد میں آئی۔ ۱۹۳۷ء میں جب انگریزوں کی بنائی ہوئی اسمبلیوں اور کونسلوں میں قومی رہنماؤں نے شرکت کی تو اور مفید کاموں کے ساتھ انھوں نے ادھر بھی توجہ کی اور لوگوں میں خاصا جوش پیدا کر دیا اردو پڑھانے کے لئے قاعدے بھی تیار ہو گئے 'ہل' کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری ہو گیا۔ لکھنؤ صدیق بک ڈپو سے بھی ایک رسالہ اسی مقصد سے نکلنے لگا۔

مگر یہ سب ابتدائی کوششیں تھیں کام کرنے والوں کے سامنے ایک لق ودق میدان تھا مگر کوئی صحیح راہ متعین نہیں ہوئی تھی کوئی عملی واقفیت نہیں تھی کوئی تجربہ نہ تھا۔ نہ دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے تجربات نظر کے سامنے تھے۔ ملک میں جگہ جگہ بالغوں کے لئے شبینہ مدرسے قائم ہو گئے تھے مگر پڑھانے کے لئے موزوں کتابیں نہیں ملتی تھیں، اور یہ اس راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔

اَن پڑھ بالغوں کی تعلیم کی طرف جامعہ نے بھی توجہ کی۔ بہت دنوں تک شبینہ مدرسے چلتے رہے مگر اس اسکیم نے منظم شکل اس وقت اختیار کی جب شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم نے اسے اپنے ہاتھ میں لیا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک جامع اسکیم بنائی اور بالغوں کے لئے کتابوں کی تیاری کو اس اسکیم میں خاص اہمیت دی۔ خود کتابیں لکھیں، اپنے ساتھیوں اور اس وقت کے منجھے ہوئے ادیبوں سے لکھوائیں اور دیکھتے دیکھتے بالغوں کے ادب کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ سامنے آگیا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے لگ بھگ

۹۲ کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور بہت سی کتابیں اشاعت کی منتظر تھیں۔ اتنے میں ملک کی تقسیم کے سلسلے میں ایک طوفان آیا اور ادارۂ تعلیم و ترقی کا سارا کام درہم برہم ہو گیا لیکن شفیق صاحب ہار ماننے والے نہیں تھے انھوں نے دلّی میں پوری طرح حالات سازگار ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا اور اپنے کام میں لگ گئے۔ اسی ہمت اسی تندہی اور اسی لگن کے ساتھ۔ اس مرتبہ دیس کی آزاد حکومت نے بھی ان کی ہمت افزائی کی اور کتابوں کی تیاری کے لئے ایک بڑی رقم تعلیم و ترقی جامعہ کو مرحمت کی لیکن یہ رقم ہندی کتابوں کی اشاعت کے لئے تھی۔ تاہم شفیق صاحب نے بہت سی ہندی کتابوں کے اردو اڈیشن بھی مکتبہ جامعہ سے شائع کرلئے۔ اور اس طرح اردو میں بھی بالغوں کے ادب کا ذخیرہ کچھ نہ کچھ بڑھتا رہا۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ شروع سے اب تک بالغوں کے ادب کی تیاری کرنے والا ہندوستان میں لے دے کے یہی ایک ادارہ ہے۔ اسی لئے اس کی ذمّے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد کچھ عجیب ہمّت شکن فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اردو میں بالغوں کے ادب کی تیاری بس ایک سہانا خواب معلوم ہوتی تھی بارے خدا کا شکر ہے کہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی دُور اندیشی اور کارکنوں کی سوجھ بوجھ سے اب یہ فضا چھٹ گئی ہے اور اُردو میں بھی اس ادب کی تیاری کو غیر معمولی اہمیت دی جارہی ہے، ادارہ تعلیم و ترقی نے سائنس، جغرافیہ، اور دوسرے اہم، مفید اور کارآمد عنوانات کے تحت کافی کتابیں مرتب کرلی ہیں۔ ان میں سے چند چھپ گئی ہیں کچھ زیر طبع ہیں۔ سرمایے کی کمی ان کتابوں کی اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

کئی سال سے بالغوں کی کتابیں لکھنے والوں کی ہمّت افزائی کے لئے مرکزی حکومت انعام بھی دیتی ہے۔ یہ انعام چودہ زبانوں کے لئے ہے۔ انھی میں اردو بھی ہے۔ اردو میں اس طرح کی بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں یہ کتابیں لکھائی، چھپائی، کاغذ اور ظاہری خوشنمائی کے اعتبار سے بہت دیدہ زیب ہوتی ہیں۔ اس سال ان دو انعامی کتابوں کے علاوہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کی "پریم اور سیوا کی جیت" بھی چھپی ہے۔ اردو ادب میں صالحہ عابد حسین کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ شروع شروع میں ایک عرصے تک آپ نے پیام تعلیم کی بھی سرپرستی فرمائی ہے۔ پھر بڑوں کے لئے لکھنے لگیں۔ اب خیر سے بالغوں کی طرف بھی آپ نے توجہ فرمائی ہے۔ "پریم اور سیوا کی جیت" بہت آسان اور سادہ زبان میں ایک چھوٹا سا ناول یا نادلچسپ انداز بیان

بہت ولولہ انگیز ہے محترمہ صالحہ عابد حسین نے کتاب میں ہندی الفاظ بھی بڑی فراخدلی سے کھپائے
ہندی الفاظ موقع موقع سے استعمال کئے جائیں تو مزہ دے جاتے ہیں ورنہ خواہ مخواہ کی ٹھوس ٹھانس
ہوتی ہے ادبے چاری اردو زبان کی دُرگت بن جاتی ہے ۔ یہ کتاب بہت اہتمام سے چھپی ہے سوائے
کاغذ کے لکھائی چھپائی ٹائیٹل ہر چیز معیاری ہے۔ اندر کی عبارت دو رنگوں میں چھپی ہے ۔
بالغوں کے ادب کے مقابلے میں بچوں کے ادب کی حالت کچھ غنیمت ہے ۔ سے شروع سے اردو کے
بڑے کے ادیبوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ ان میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا نام سرفہرست ہے پھر شمس العلماء مولانا
نذیر احمد کا نام آتا ہے۔ آپ کی بدولت بچوں کا بہت صاف ستھرا اور مفید لٹریچر وجود میں آیا اور آپ کی
سرپرستی کی بدولت بچوں کے اچھے اچھے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ۔ ان کے علاوہ بعض شخصی اور انفرادی
کوششوں سے بھی اسے سہارا ملا، اور بچوں کا ادب دھیمی رفتار سے سہی کچھ نہ کچھ ترقی کرتا رہا ۔
بچوں کے ادب کی ترقی میں جامعہ نے بھی اپنے بس بھر کوشش کی ہے۔ جامعہ کے دارالاشاعت
مکتبہ جامعہ نے بڑوں کی کتابوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی کتابوں کی اشاعت کو بھی پیش نظر رکھا ۔
ڈاکٹر صاحب عابد صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس طرف خاص توجہ کی، خود کہانیاں لکھیں،
ڈرامے لکھے، اور معلوماتی مضمون لکھے ۔ یہ بچوں کے ادب کے لئے گویا ایک نیا موڑ تھا۔ مکتبہ سے پیامِ تعلیم
بھی بچوں کے لئے نکلتا تھا۔ اس رسالے کے ذریعے اس کام کو آگے بڑھانے میں بہت مدد ملی۔ اس نے
بہت سے اچھے لکھنے والوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالا بہت سے اچھے لکھنے والے پیدا کئے، ان
کوششوں کی بدولت خود پیام تعلیم بہترین مضامین کا گلدستہ بن گیا۔ بچوں کے لئے اچھے لکھنے والوں
کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا۔ بہت سی اچھی اچھی کتابیں وجود میں آگئیں ۔ مکتبہ جامعہ کے علاوہ دارالاشاعت
لاہور، فیروز سنز لاہور (انڈین پریس الہ آباد) وغیرہ چند گنے چنے ادارے نسبتاً سلیقے سے یہ کام انجام
دے رہے تھے ۔

لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے اردو زبان اور اردو کا کام کرنے والے اداروں کو ناقابل تلافی
نقصان پہنچایا۔ مکتبہ جامعہ خصوصاً بُری طرح ہنگامے کا شکار ہوا۔ ساری کتابیں آگ کی نذر ہو گئیں ۔
کارکن منتشر اور بچوں کے لئے لکھنے والے تتر بتر ہو گئے۔ ادارہ تعلیم و ترقی کی طرح جامعہ نے اس کی بھی

ازسرِنو تنظیم کی۔ اللہ شکر ہے کہ بڑی جدوجہد کے بعد اب وہ اپنی اصلی حالت پر آ رہا ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ اسے اس مرتبہ بھی بچوں کے لئے خاص طور پر چند اچھے اچھے لکھنے والے مل گئے۔ ان میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، اور قدسیہ زیدی (مرحومہ) کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی مکتبہ جامعہ کی کوشش یہ ہی کہ معیاری قصے کہانیوں کے ساتھ، بچوں کے لئے معلوماتی مواد فراہم کیا جا تاکہ ایک طرح کا توازن رہے۔

اس سال اس نے پچھلی چھ سات کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کئے ہیں۔ تین نئی کتابیں شائع کی ہیں۔ ۱۔ خرگوش کا سپنا۔ ۲۔ ستاروں کی سیر۔ ۳۔ نہرو دادا۔

"خرگوش کا سپنا" میں یہ بتایا گیا ہی کہ کس طرح ایک خرگوش جس کے چاروں طرف اس کے دشمنوں کا حلقہ سا بنا ہوا تھا محض اپنی سوجھ بوجھ اور عقل کی بدولت ان کی زد سے محفوظ رہا۔ نہ صرف محفوظ رہا بلکہ بہت سے دشمنوں کو اپنی چالوں سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اصل میں خرگوش سے متعلق بہت سی کہانیوں کو کرشن چندر نے کچھ اس ڈھب سے جوڑا ہے کہ کتاب نے ناول کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پھر اس میں انھوں نے اخلاقی قدروں کو بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ کتاب شروع سے آخر تک بڑی دلچسپ ہے اور ہمیں یقین ہے کہ لکھتے لکھتے کرشن چندر کو "بچوں والی" زبان لکھنے پر پورا عبور ہو جائے گا۔ دوسری کتاب ستاروں کی سیر بھی بچوں کا ناول ہے۔ یہ اب سے پچاس برس بعد کا قصہ ہی: آپس کی ایٹمی لڑائیوں کی بدولت دنیا تباہ ہو چکی ہی۔ ایک سائنس داں نے ان حالات سے بددل ہو کر ایک پہاڑ پر پناہ لی ہی۔ وہ امن کی فاختہ کی تلاش میں ستاروں میں جانا چاہتا ہی۔ اس کے لئے اس نے ایک راکٹ تیار کیا تھا۔ وہ اس راکٹ میں بیٹھ کر اڑنا ہی چاہتا تھا کہ پولس نے آکر اسے گرفتار کر لیا۔ اس نے اپنے بچوں کو راکٹ چلانا سکھا دیا تھا۔ گرفتار ہونے سے پہلے اس نے اپنے بچوں کو تاکید کر دی کہ وہ اکیلے اس پر سوار ہو کر جائیں اور امن کی فاختہ کو تلاش کر کے لائیں۔ چنانچہ بچے اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے اور طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانے اور کئی ستاروں میں گھومنے کے بعد آخر انھیں امن کی فاختہ مل گئی اور بڑی ردوکد کے بعد اپنے بچوں کو بھیجنے پر راضی ہو گئی۔ ان بچوں کے زمین پر پہنچتے ہی یہ برباد دنیا پھر آباد ہونے لگی یہ ایک سائنسی کہانی ہی اور بڑے ہی اچھے انداز میں لکھی گئی ہے۔ البتہ زبان دو چار جگہ کھڑی

آمد نی ہوئی معلوم مگر بس دو چار جگہ۔ اس کہانی میں بھی جگہ جگہ اخلاقی قدروں کو بڑی خوبصورتی سے سمویا گیا ہے
... نہرو پنڈت موتی لال نہرو کی مختصر سوانح حیات ہے۔ ان کی صد سالہ جینتی کی تقریب پر
... منور لکھنوی سے لکھوائی گئی ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو دیس کی آزادی کی تاریخ میں بہت اہمیت
رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی باوقار اور بھاری بھرکم شخصیت، ہوش مندی، سیاسی بصیرت، جرأت و
بے باکی سے ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں نئی زندگی پیدا کر دی تھی۔ ہندوستان کے لئے یہ بڑے
فخر کی بات ہے کہ اس کے غلامی کے دور میں ایسے بڑے لوگ پیدا ہوئے اب اس آزادی کے دور میں ایسی
مخلص اور باوقار شخصیتوں کو آنکھیں ڈھونڈھتی ہیں۔ کتاب کی زبان بہت سادہ اور آسان ہے۔ اندازِ
بیان بھی بچوں کے لئے بہت موزوں ہے۔ منور صاحب نے بڑی خوبی سے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے
... چار صفحے کی اس مختصر کتاب میں پنڈت موتی لال نہرو کی شخصیت اُبھر کر سامنے آگئی ہے۔ ان
تینوں کتابوں کی ظاہری خوشنمائی بھی مکتبے کے معیار کے مطابق ہے۔

کچھ عرصے سے اطہر پرویز صاحب نے بھی بچوں کی کتابوں کے سلسلے میں ایک اردو اشاعت گھر
(علی گڑھ) کی بنیاد ڈالی ہے۔ پرویز صاحب خود بھی بچوں کے لئے لکھتے ہیں دوسروں سے بھی لکھواتے ہیں
اس مرتبہ اپنے اردو گھر سے انھوں نے تین قیمتی کتابیں شائع کی ہیں (۱) کاغذ کی کہانی (۲) ہماری
سائنس (۳) سائنس کے کرشمے۔ کاغذ کی کہانی محمد آفاق صاحب نے لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے
بڑے دلچسپ انداز میں کاغذ کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ کتاب کی تمہید بھی بچوں کے لئے مزے دار پہیلی ہے
مصنف نے اس کی زبان بھی بہت سادہ اور آسان رکھی ہے۔ لیتھو کی اور بلاک کی تشریحی تصویریں بھی
فراوانی کے ساتھ ہیں۔ غالباً اسی لئے کتاب کی تیاری کی لاگت بڑھ گئی ہے اور اڑتالیس صفحے کی کتاب کی
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے رکھنا پڑی ہے۔

ہماری سائنس اور سائنس کے کرشمے دونوں کتابیں وزارت حسین صاحب (استاد مسلم یونیورسٹی
ہائی اسکول) نے لکھی ہیں۔ ان کی ترتیب کے وقت ساتویں آٹھویں نویں درجے کے تعلیمی معیار کا خیال
رکھا گیا ہے۔ دونوں کتابوں میں سائنس کے نصابی اور غیر نصابی مسئلوں کو بہت سادہ زبان میں سمجھانے
کی کوشش کی گئی ہے۔ وزارت حسین صاحب استاد بھی ہیں اور بچوں کے معیار، فہم اور ان کی نفسیات کو

باخبر ہیں۔ اس لئے انھیں اس سلسلے میں بہت کامیابی ہوئی ہے۔ دونوں میں تشریحی تصاویر بھی بے شمار ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی کتابت نسبتاً خفی اور ضخامت ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ ہے۔ ان تینوں کتابوں کی ظاہری زیب و زینت پر بھی اردو گھر نے پوری توجہ کی ہے۔

یہاں ہندوستان کی صرف ان چند کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہمیں بڑی کوششوں کے بعد مل سکیں ہمیں یقین ہے کہ اتنے بڑے ملک میں بچوں کے لئے کتابیں اور بھی لکھی گئی ہوں گی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس سلسلے میں ہمیں زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ بعض اداروں نے خطوط کے جواب کی زحمت بھی نہ کی۔ ایک ادارے کی طرف سے یہ جواب ملا: "ہم دوسروں کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہیں نہ اپنی کتابیں تبصرے کے لئے بھیجتے ہیں۔" اس ایک مثال سے اپنے اردو کے پبلشرز کی خوش اخلاقی کا آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے دیکھئے تو اردو میں بچوں کے ادب کی ترقی کی رفتار خود ملک کی بہت سی زبانوں کے مقابلہ میں بہت سست ہے۔ یورپ کی زبانوں کے مقابلے میں تو یہ منزلوں پیچھے ہے۔ صورت حال یہی رہی تو شاید سو پچاس برس میں بھی ہم اس معیار تک نہ پہنچ پائیں۔

اس سست رفتاری کے بہت سے اسباب ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد عام اردو ادب کی ترقی پر نمایاں اثر پڑا۔ بچوں کا ادب خاص طور پر کس مپرسی کا شکار رہا۔ دوسرے ملک میں بچوں کے ادب اور ادیبوں کی قدر و قیمت کبھی صحیح طور پر محسوس نہیں کی گئی۔ بچوں کے بہت سے چوٹی کے ادیب گمنامی کی موت مر گئے اور کوئی ان کے ناموں سے بھی واقف نہیں۔ مرزا فہیم بیگ چغتائی اور سید ابو طاہر داؤد کے نام مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ (۲) بچوں کے رسالے مضامین کا معاوضہ نہیں دیتے نہ پبلشر کتابوں کا اتنا معاوضہ دے پاتے ہیں کہ لکھنے والا اطمینان و آرام سے زندگی گزار سکے اور اسی کام کو اوڑھنا بچھونا بنا لے۔ اس لئے بہت سے لکھنے والے محض اپنے شوق کی بنا پر فرصت کے مشغلے کے طور پر یہ کام کرتے ہیں اور جب زندگی کے دوسرے مشاغل میں گھر جاتے ہیں تو یہ "غیر ضروری شغل" آپ سے آپ ان سے چھوٹ جاتا ہے۔

بچوں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لئے مرکزی حکومت اچھی کتابوں پر سالانہ انعام بھی دیتی ہے۔ اردو کا بھی اس میں حصّہ ہے۔ اس انعام کی بدولت دو ایک اچھی کتابیں شائع ہو جاتی ہیں

بچوں کی حیثیت یوں سمجھئے کہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ ضرورت ہے کہ لوگوں میں بچوں کے ادب کی قدر شناسی عام ہو۔ نیز عام لوگوں کو اس اہمیت کا احساس پیدا ہو۔ یہ کام مکتبہ جامعہ کا ہے۔ وہ بھی اپنی بساط کے مطابق یہ کام کر رہا ہے۔ پر اب قدم کو تیز کرنے کی ضرورت ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اب تک بڑوں کے ادب کے لئے اپنے کو مخصوص کر رکھا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انجمن کے ارباب حل و عقد اس ضروری مسئلے پر بھی سنجیدگی سے غور کریں گے اور بچوں کے ادب کی ترقی کے لئے بھی نئی راہیں نکالیں گے۔

نظم

۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۱ء میں شائع ہونے والے مجموعے

جناب رشید حسن خاں

پیش نظر مضمون جامعہ کے تعلیمی میلا منعقدہ نومبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا تھا۔ فاضل مضمون نگار نے نظر ثانی اور اضافے کے بعد سالنامے کے لئے عنایت فرمایا ہے۔ (مرتب)

۱۹۶۰ء سے اب تک نظم کے بہت سے مجموعے سامنے آئے ہیں۔ پرانے اور معروف شاعروں کے دوش بدوش، نو واردانِ بساط ہوا دل نے بھی، جرأتِ عرضِ ہنر سے کام لیا ہے بعض مجموعے ہندوستان کے ایسے دور دراز گوشوں سے شائع ہوئے ہیں کہ اردو کی ہمہ گیری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ جیسے اڑلیسہ سے امجد نجمی کی نظموں کا مجموعہ "طلوع سحر" اور ناسک سے ادیب مالیگانوی کی غزلوں کا مجموعہ "تبسم"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے حد ناموافق حالات کے باوجود، ہر گوشۂ بساط پر شعر و ادب کی شمعیں جل رہی ہیں۔

۲۰، ۲۲ ماہ کی اس مدت میں شائع ہونے والے بیش تر مجموعوں میں، شعرا کی دس پندرہ سال کی ذہنی کاوشیں محفوظ ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد، شاعری میں کئی میلانات اُبھرے اور کئی عنوانات عمرِ برق و شرار کے حریف ثابت ہوئے۔ یہ مجموعے شاعری کے موجودہ معیار، مزاج اور میلانات کے عکاس بھی ہیں، اور پچھلے پندرہ بیس سال کے ادبی انتشار کے آئینہ دار بھی ـــــ میں یہاں پر یہ بات واضح کر دوں کہ محرکات یا میلانات، کیلنڈر کی طرح ہر سال نہیں بدلتے ہیں، لیکن اُن کے تہ نشین اثرات کام کرتے رہتے ہیں۔ پس منظر کو سمجھنے کے لیے، اُن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

جن لوگوں نے ۴۷ء سے پہلے اور اُس کے بعد کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے، اُن کو اندازہ ہوگا کہ ۴۷ء تک ایجی ٹیشنل شاعری، معراج پر پہنچ چکی تھی۔ طویل سیاسی جد و جہد اور مختلف پر شور

[illegible] کے سبب سے، ذہن بے انتہا مشتعل رہتے تھے۔ اس لیے ایسی نظمیں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ تقسیم ہند کے ہنگامۂ خون نے، ہیجانی موضوعات کے ختم ہوتے ہوئے ذخیرے میں، کئی تلخ و تند عناصر کا اضافہ کیا، اور پھر چند سال کے لیے، موضوعات کا ایک چھوٹا سا سرمایہ ہاتھ آ گیا۔ ۵۰ء کے بعد جب سیاسی اور ہنگامی موضوعات، یا تو دم توڑ چکے تھے، یا اُن کی تکرار وبالِ ہوش دگوش ہو کر رہ گئی تھی، ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ یک وقت عظیم خلا کا احساس ہوا، جس کو جمود سے تعبیر کیا گیا۔ ۱۵،۲۰ سال کی لمبی مدت میں، اِس وسیع کائنات کے ان گنت مناظر و مظاہر اور غیر محدود جذبات زندگی کی عکاسی سے کچھ زیادہ ربط نہیں رکھا گیا تھا۔ غم و آلام کو سیاسی نظریوں کی عینک سے دیکھنا اور بنے بنائے فارمولوں کے سانچے میں ڈھال لینا، فنی رکھ رکھاو، طرزِ ادا کے آداب اور خیال یا حادثے کے ردِّ عمل کو، فکر کی آنچ میں تپا کر اس طرح پیش کرنا، کہ وہ خلوصِ فکر اور تاثیر سے مرکب ہو جائے، اِن باتوں سے بہت دور کا تعلق رہ گیا تھا ــــ اس لیے ہنگامی موضوعات کے ختم ہوتے ہی اُس برجستہ نگاری پر بھی زوال آ گیا۔ ڈیڑھ دو سال کی اس مدت میں جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، اُن میں اچھی نظمیں کم ہیں، لیکن یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے، کہ ماندگی کے لمبے وقفے کے بعد، کچھ نئے شاعروں نے قدم بڑھانا شروع کیا ہے، اُن کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور انداز بیان میں بھی وہ تلخی نہیں ہے۔ یہ بات لائقِ تحسین ہے۔ اچھے رسالوں کی ورق گردانی کی جائے تو ہر ماہ ایسی ایک دو نظمیں مل جائیں گی۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ۴، ۶ سال بعد ہی، اس کے دائرۂ اثر میں اتنی توسیع ہوئی کہ چند سخت جانوں کے سوا، سب ہی اس کے زیرِ سایہ آ گئے۔ کچھ لوگ اس کو دینِ حق سمجھ کر، اور کچھ لوگ محض اس ڈر سے کہ رجعت پرست نہ کہلائیں ــــ موضوعات کو ترقی پسندی اور رجعت پرستی کے خانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ حقیقت نگار اور باشعور ہونے کے لیے لازمی تھا کہ اس شریعت کے مبلغین کی ہر بات کو آیت و حدیث سمجھا جائے۔ دس بارہ سال تک یہ جہادِ کم نظری جاری رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری چند ہنگامی موضوعات میں محصور ہو کر رہ گئی۔ دوسری طرف اسلوب کا حشر اس سے بھی برا ہوا۔ مطالعہ، مشق، قدرت کلام، صحت زبان، غرض ہر معقول بات کو

نظر انداز کر دینا، لازمۂ ترقی پسندی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے فیض سے، حسن بیان، دل کشی اور تاثیر معدوم ہو گئی تھی۔

لیکن اب محسوس ہوتا ہے، کہ مفروضات کا وہ طلسم ٹوٹ چکا ہے، اور شاعری اس پنچایتی عدالت کی عطا کی ہوئی قید بے میعاد سے آزاد ہو چکی ہے۔ اب موضوعات کو ترقی پسندی یا رجعت پرستی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حسن ادا، اور صحت زبان کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے۔ یہ فالِ نیک ہے۔

دو سال کی اس مدت میں جو مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان کا بہ غور مطالعہ کیا جائے، تو محسوس ہوگا، کہ نئے شاعروں میں جلد سے جلد صاحب کتاب بن جانے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ شہرت کی خواہش اور مصنف بن جانے کی ہوس نے بہت سی برائیوں کے دروازے کھول دیے ہیں۔ شاعری ایسی چیز نہیں، جس میں "کاتا اور لے دوڑی" کی گنجایش ہو۔ شعر کہہ لینا کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے مشق و مطالعہ، اور قدرت کلام سے، جب تک ذہن و فکر پر جلا نہ ہو، اور ہر مصرعے پر حسن و تاثیر کی مہر نہ لگ جائے، اس وقت تک بات نہیں بنتی۔ کئی مجموعوں میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ سہل پسندی یا عجلت پسندی نے، خوب سے خوب تر کی منزل پر پہنچنے سے ہی باز نہیں رکھا ہے، کلام کی خوبی پر بھی حرف آ گیا ہے۔

مشہور ناقدین کے مقدمات نے اس کج خرامی کو بڑا سہارا دے رکھا ہے۔ اس غلط نوازش سے بے راہ روی اور بے جا خود اعتمادی کو برابر شہ ملتی رہتی ہے۔ اور شاعر دوسروں کی صحیح بات سننے اور سمجھنے سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا ہے۔ ستم یہ ہے کہ بعض سنجیدہ حضرات بھی اس بدمذاقی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جس طرح الکشن کے زمانے میں کمزور امیدوار، کسی بڑے لیڈر کو بلانا اور اس سے کلمات خیر کہلانا ضروری سمجھتا ہے، اسی طرح بعض شاعر کسی مشہور ناقد سے مقدمہ لکھوانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کی سب سے بری مثال خورشید الاسلام کے مجموعے "رگِ جاں" پر جناب مجنوں گورکھپوری کا دیباچہ ہے۔ مجنوں صاحب نے اس مجموعے میں وہ ساری خوبیاں بتائی ہیں، جو کئی واقعی اچھے شاعروں کے یہاں الگ الگ ملیں گی۔ جب کہ اس مجموعے میں بہ مشکل ایک یا دو نظمیں ایسی ہیں، جن کا

...جا سکے، اور غزل کے چار، چھ شعر ایسے ہیں، جن کو گوارا کیا جا سکے۔

...زمانے میں نظم آزاد کا بہت چرچا تھا۔ سلیقے سے کام لیا جاتا تو یہ بھی ایک اضافہ ہوتا، ...بری طرح مشق ناز کا شکار ہوئی، یہاں تک نظم اور نثر کا فرق ختم ہوتا ہوا نظر آیا۔ جو مجموعے ان ...میں شائع ہوئے ہیں، اُن میں آزاد نظمیں نسبتہً کم ہیں۔ اور جو ہیں، وہ دل کشی سے معرا ہیں۔ ...میں بھی یہ عجیب الخلقت مخلوق کم دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نظم ...ہماری شاعری کو ابھی تک راس نہیں آئی ہے۔

...اور ان کے بعض ساتھیوں کے اثر سے نظم میں ابہام کا رواج اس حد تک بڑھا تھا کہ اہمال ...ابہام پر بہم معنی لفظ ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ پاکستان میں کچھ شاعر پھر اس جادۂ پر پیچ و خم پر تیزی کر ...ہیں۔ لیکن ہندوستان میں اس کی مثالیں کم یاب ہیں۔ کبھی کبھی کسی رسالہ میں اس ذہنی ورزش کا مظاہرہ دیکھنے میں آ جاتا ہے۔ البتہ یہ رجحان ایک اور شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ اور وہ ہے بے حد مختصر نظمیں کہنا۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ تسلسل فکر، اور نظم کے وسیع کینوس پر گل کاری بہت سے شعرا کے بس کی بات نہیں۔ اس لیے چند لائنیں لکھ کر فرض کفایہ ادا کر دیا جاتا ہے۔ ایسی نظموں میں غیر ضروری یا ...الفاظ میں، غیر فطری اختصار سے وہی الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے، جو ابہام پسندی کا خاصہ ہے۔ (خورشید الاسلام کی بعض نظمیں صرف تین مصرعوں پر مشتمل ہیں) بعض نوجوان شاعر اس مرض کا بری طرح شکار ہیں۔ ان کی ایسی اعجوبہ زائیاں کبھی کبھی رسائل کے صفحات پر نظر آ جاتی ہیں۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ بعض نہایت معروف شاعروں کے مجموعے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے پچھلے سرمایے میں مطلق اضافہ نہیں کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹھٹک کر رہ گئے ہیں، گویا ساری متاع شوق صرف رہ گزر کر چکے ہیں، اب نہ ہاتھوں میں جنبش ہے نہ آنکھوں میں دم۔ جذبی کا مجموعہ "سخن مختصر" اس کی سب سے اچھی مثال ہے۔ اور بعض نئے شاعروں نے اس محفل میں اس انداز سے قدم رکھا ہے کہ ان کی ہوش مندی گراں مایگی مستقبل کی بشارت دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

منظومات

اس زمانے میں اردو کے بزرگ شاعر، تلوک چند محروم کی نظموں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں

۱۔ کاروانِ وطن ۲۔ نیرنگِ معانی ۳۔ بہارِ طفلی: ـــ بہارِ طفلی بچّوں کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ ایسے مجموعے اردو میں کم ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ تصویریں بھی ہیں جن سے اس کی دلکشی بڑھ گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چھٹے ساتویں درجے کے بچّوں کے لیے اس مجموعے کی بیشتر نظمیں نہایت مفید ہیں۔ یہ کتاب بہت معمولی کاغذ پر چھپی ہے۔ یہی اس کا سب سے بڑا عیب ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کی بعض نظمیں یقیناً بچّوں کے معیار پر پوری نہیں اتریں گی۔ مثلاً ایک نظم ہے "نرم گفتاری" اس کا پہلا بند ہے۔

کرو کلام بہ نرمی کہ نرم گفتاری	ہزار سخت کلامی سے کارگر ہے سوا
کرو کلام بہ نرمی کہ تیز و تند کلام	نہ کار خیر کو کر دے ذلیل اور رسوا

اچھا تھا کہ اس کا بھی لحاظ رکھا جاتا۔

"کاروانِ وطن" اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ یہ آزادی کی لمبی جد و جہد کی مختلف شخصیتوں، تحریکوں اور حادثوں کی آئینہ دار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی بیشتر نظموں میں شعریت اور فکرِ بلیغ کا وہ رنگ نہیں ہے جو آج پسندیدہ بھی ہے اور ضروری بھی۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اس کی ہر نظم سے ہندوستان کی سرزمین اور اس کی ترقی سے بے پناہ شغف کا اظہار ہوتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کئی سال تک آزادی کا ماتم کرنا، اور ایک نئے انقلاب کی بشارت دینا فریضۂ شاعری رہا۔ اس اندازِ فکر اور طرزِ سخن نے وطن دوستی اور تعمیر و ترقی کی طرف توجہ کو مبذول نہیں ہونے دیا۔ اسی طرزِ فکر کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری شاعری میں نشاط کاری کی جھلکیاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ کئی سال تک مسلسل اس شدّ و مد کے ساتھ بہت سی مفروضہ مصیبتوں کا رونا رویا گیا، اور اس حد تک کہ شاعری پر یاسیت کے پہرے بیٹھ گئے۔ ایک مفروضہ نئی صبح کے انتظار نے اس طرزِ فکر کو اور دو آتشہ کر دیا۔ جس کے کچھ اثرات آج تک کارفرما ہیں۔

"نیرنگِ معانی" غیر سیاسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ محرومؔ صاحب بڑے قادر الکلام شاعر ہیں مشقِ سخن اور قدرتِ کلام ان کے ایک ایک مصرع سے نمایاں ہے۔ لیکن اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ ان مجموعوں میں اصولِ انتخاب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آدمی دن بھر جتنی باتیں کرتا ہے وہ سب درج گزٹ ہونے کے لائق نہیں ہوتیں۔

علی جواد زیدی کا مجموعہ "دیارِ سحر" نظموں اور غزلوں کا مِلا جُلا مجموعہ ہے۔ موضوعات کے تنوع کے لحاظ سے یہ مجموعہ ضرور قابلِ لحاظ ہے۔ لیکن اثر انگیزی کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔ جو نظمیں خالص سیاسی موضوعات پر کہی گئی ہیں، ان میں برہنہ گوئی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ جو آدابِ شاعری کے خلاف ہے۔

ساحر لدھیانوی کا مجموعہ "تلخیاں" چودھویں بار شائع ہوا ہے۔ یہ مقبولیت شاید ہی کسی نئے شاعر کے مجموعے کو حاصل ہوئی ہو۔ اس میں رومانی نظمیں بھی ہیں اور خالص سیاسی نظمیں بھی ہیں بہت سے نئے نظم گو شعرا کے مقابلے میں، ساحر حسنِ ادا اور طرزِ اظہار پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں نہ لفظوں کی بازی گری ہے نہ اندازِ بیان کا پیچ و خم۔ لیکن فکر کی گہرائی اور گیرائی کم سے کم ہے۔ خالص رومانی نظموں میں، ان کا حسنِ بیان کچھ اس طرح چمک اٹھا ہے کہ یہ چمک نوجوان نگاہوں کو بے طرح خیرہ کر دیتی ہے۔ مثلاً ان کی ایک مشہور نظم کے یہ دو بند دیکھیے۔

ان سلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دوں	لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اجالے میں بیاں تو کر دوں	لیکن ان خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن تیری نگاہوں کا سکوت	درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں	وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

یہ انداز عام نوجوانوں خصوصاً طالب علموں اور طالبات کو بے طرح متاثر کر سکتا ہے اور کرتا ہے یہی اس مجموعے کی مقبولیت کی بڑی وجہ ہے۔ اس مجموعے کی سیاسی نظمیں، رومانی نظموں سے بھی کہیں کم رتبہ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حوادث کو فکر و خیال کی آنچ میں تپائے بغیر نظم کر دیا گیا ہے۔ واقعات یا حوادث کو اس طرح نظم کر دینا، کہ محض کچھ دیر کے لیے دل کی دھڑکن بڑھ جانے کا احتمال ہو، وقتی مقبولیت کا ذریعہ تو بن سکتا ہے مستقل قدر و قیمت کا نہیں۔ یہ مجموعہ نہایت نفیس کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ لیکن لیتھو کی چھپائی نے اس کے حسن کو محدود

کر دیا ہے اور کہیں مجروح۔ اس اشاعت میں کچھ نئی نظمیں بھی شامل ہیں۔

جذبی کے تازہ مجموعے "سخن مختصر" میں کئی نظمیں ہیں، اور مختلف موضوعات پر، ان میں دو نظمیں "احساس" اور "تیرے سوا" قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں رومانیت کی جھلکیاں اور تغزل کی لہریں تہ نشین ہیں۔ جس کے فیض سے ان میں حسن بیان بھی ہے اور دلکشی بھی، لیکن باقی نظمیں تلخی بیان سے معمور ہیں۔ ان نظموں میں تقسیم، آل احمد سرور کی خدمت میں، میری شاعری اور نقاد، میرا ماحول، خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ جذبی بنیادی طور سے رومانی شاعر ہیں۔ اس لیے ویسے بھی اس سے دامن چھڑا کر نظم کہنا ان کے بس کی بات نہیں۔ خصوصاً جبکہ ہر مصرع پر تلخی بیان کی مہر لگی ہوئی ہو۔ یہ المیہ کئی شاعروں کے ساتھ ہوا ہے کہ وہ صرف رومانی شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے، لیکن انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو پہچانا نہیں، اور دوسرے متضاد موضوعات میں الجھ کر اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرتے رہے۔ جذبی کی ان نظموں میں جو تلخی ہے وہ ایک عجیب گھٹن، احساس کمتری اور گھٹے گھٹے سے احساس نفرت کی پیدا کردہ ہے۔ یہ کوئی خوبی نہیں ہے — جذبی کی نظم نگاری میں ایک اور عیب ہے اور وہ ہے عدم توازن! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی طویل نظم کو تناسب بیان اور نظم کی تکنیک کے لحاظ سے مکمل کرنا، یا مناسب نہیں سمجھتے ہیں یا اس پر انھیں قدرت نہیں ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال وہ مشہور نظم ہے، جو انھوں نے مجاز کی موت پر کہی ہے۔ اس کا پہلا بند خوب ہے لیکن دوسرا بند پہلے بند کے مقابلے میں کمزور اور بے ربط باتوں کا مجموعہ ہے۔

خورشید الاسلام کے مجموعے "رگِ جاں" کا ذکر اس سے پہلے بھی آ چکا ہے۔ کچھ نظموں پر حد سے بڑھی ہوئی مختصر نویسی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ مثلاً ایک نظم "انقلاب" صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور نظم "ایک تاثر" صرف تین مصرعوں پر۔ ان کو پڑھ کر ناتمامی کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ انداز تقلید کرنے والوں کے لیے بھی خطرناک ہے اور خود شاعر کے لیے بھی۔ اردو میں قطعہ اور رباعی بھی اصناف سخن میں شامل ہیں۔ اور مختصر گوئی کے کام آتے ہیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ کئی نظمیں غزل اور نظم کے درمیان معلق نظر آتی ہیں نیز زبان و بیان پر مکمل قدرت حاصل نہ ہونے کے نتیجے میں جگہ جگہ سخت ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ آل احمد سرور اور مجنوں گورکھپوری نے جی کھول کر اس مجموعے کی تعریف کی ہے۔ اس مجموعے میں بعض

بحر حال مزاق کے دلچسپ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔ صرف ایک نمونے کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ اس مجموعے کا انتساب جان بار قدسیہ آپا" کے نام کیا گیا ہے "قدسیہ آپا" کے نام کے نیچے یہ مصرع بھی درج ہے ؏

اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

اس حوش ذوقی کی داد بھی سرور صاحب ہی دے سکتے ہیں مجموعی طور سے ان کی نظمیں فکر کی گہرائی اور انداز بیان کے حسن سے محروم ہیں۔ مشق کی کمی نے اس عیب کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔

باقر مہدی کا مجموعہ "شہر آرزو" پہلی بار ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں رباعیاں، غزلیں اور نظمیں سب ہیں۔ باقر مہدی کی نظموں کا بڑا حصہ کراہتے ہوئے انسان کی کرب آمیز پکار بن گیا ہے۔ جس میں ذاتی غم کی ایسی آمیزش ہے کہ اکثر جگہ تلخی بہت بڑھ گئی ہے۔ اس سے دائرہ اثر اور حسن نظم دونوں پر برا اثر پڑا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص ضبط غم کی منزل سے قصداً دور دور رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ذاتی غم کا بیان کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ لیکن اس میں اس حد تک تلخی کا پیدا ہو جانا کہ حسن بیان اور تاثر دونوں مجروح ہو جائیں، مناسب نہیں فریاد کی کوئی مقررہ لے نہیں۔ لیکن اس کو آداب فریاد کی حدوں میں ضرور رہنا چاہیے ——— البتہ جو نظمیں اس رنگ سے ہٹ کر کہی گئی ہیں۔ ان میں وہ ساری خوبیاں ہیں جو ہونا چاہیے مثلاً "خط"، "ایک ملاقات"۔ باقر مہدی میں شاعرانہ صلاحیتوں کی کمی نہیں معلوم ہوتی، ہاں ان کی خود ساختہ ذہنی یا جذباتی حد بندی نے ان کی شاعری کا دائرہ بہت محدود کر دیا ہے۔

نوجوان شاعروں میں مخمور سعیدی کا مجموعہ "گفتنی" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا اڈیشن ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں غزلیں نظمیں رباعیاں سب ہی ہیں ــ موضوعات کے تنوع، فکر، اور حسن ادا کے اعتبار سے اس مجموعے کی کئی نظمیں نظم کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ایسی نظموں میں ناستک، ماضی، ایک لڑکی، زندانی، خرابے میں، اعتراف، سرراہ، زیادہ قابل توجہ ہیں۔ ان نظموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے، کہ شاعر میں نظم کہنے کا سلیقہ ہے۔ ان نظموں میں فکر اور جذبے کی آمیزش اور ترتیب، اس خوبی کے ساتھ عمل میں آئی ہے، اور حسن ادا کا اس حد تک لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہ گہرائی کے باوجود نہ اشکال ہے نہ ابہام۔ شاعر نے محض جدت پسندی کے زعم میں، یا صرف چونکا دینے والا انداز پیدا کرنے کے لیے

کہیں غیر شاعرانہ دراز دستی سے کام نہیں لیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فرسودگی کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ موضوعات کے تنوع سے شاعر کی دیدہ وری اور فکر پسندی کا اندازہ ہوتا ہے —— اس مجموعے میں چند نظمیں خالص سیاست زدہ ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض "ضد" میں لکھی گئی ہیں۔ اسی لیے یہ حسن بیان اور تاثیر، دونوں سے معرا ہیں۔ کسی نقطۂ نظر کی خواہ مخواہ تردید، یا اس کے اعلان و اشتہار کے لیے جو کچھ کہا جائے گا، اس میں اگر حسن و تاثیر نہ ہو، تو یہ کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہوگی۔

مخدوم محی الدین کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "گل تر" اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس میں نظمیں زیادہ ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھ کر مخدوم کی شاعری کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے ماسکو، "تلنگانہ" نیا چین، گگارن، کے عنوان سے جو نظمیں ہیں، ان کو تو نظم کہنا، نظم کی جان پر ستم کرنا ہے ان میں وہی نعرہ زنی اور بے کیفی بیان ہے، جو ایک زمانے میں حاصلِ شاعری سمجھی جاتی تھی۔ دوسری نظمیں بھی، شاعری سے زیادہ "سطر نگاری" کا مجموعہ ہیں۔

سلیمان اریب کے مجموعے "پاس گریباں" میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ انھوں نے مقدمہ میں خود لکھا ہے: "میں اگرچہ ۱۹۴۲ء سے شعر کہتا ہوں لیکن "پاس گریباں" میں جو تخلیقات شامل ہیں وہ ۱۹۴۴ء سے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے جو کچھ کہا تھا، یا ۱۹۶۰ء تک جو کچھ کہا بالخصوص ۱۹۵۱ء تک جو نظمیں لکھیں، ان کا بڑا حصہ میں نے خارج کر دیا ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر نظمیں مسائلی اور سیاسی ہیں، شاعری مقصدی ہو یا غیر مقصدی..... اسے پہلے ادب ہونا چاہیے اور میں نے جو نظمیں اور اشعار قلم زد کر دیے ہیں وہ اس بنا پر کہ ان میں نعرہ بازی زیادہ آ گئی تھی۔ اور ادب کا تناسب کم ہو گیا تھا۔"

اریب نے جس وضاحت کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے اور نئے شعرا کے لیے قابلِ توجہ۔ اس مجموعے میں اس احتیاط کے باوجود، کئی نظمیں ایسی ہیں، جن پر غیر شاعرانہ مقصدی ادب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ان میں شعریت بالکل نہیں ہے۔ رومانی نظموں میں تلخ بیانی تو نہیں ہے لیکن حسنِ بیان کا نکھار بھی نہیں ہے۔ یہ نتیجہ ہے برسوں تک شعریت سے معرا نظم گوئی کی مشق کا۔ کہ اس اندازِ فکر سے دامن کش ہو جانے کے باوصف، ابھی تک لہجے اور طرزِ اظہار پر قدرت

(...) اور حسنِ بیان کی چھوٹ نہیں پڑی ہے۔ جگہ جگہ غیر مناسب تشبیہیں، تعبیریں۔ اور غیر مانوس طرزِ کلام بھی (...) حسنِ کلام کے راستے میں سنگِ گراں بن گیا ہے۔ مثلاً ع

آگ اور خون کے بھرے ہوئے اندھے دھارے

ع کتنے پائل کی چھما چھم کتنے جاموں کی کھنک

ع بطونِ خاک میں بوتے ہوئے مہ و انجم

ع وہی گھنا دنے منظر وہی کریہہ جذام

ع کیا عشق میں یونہی ہوتا ہے اک آگ سی ہے دل تا بہ جگر

”طلوعِ سحر“ امجد نجمی کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے۔ البتہ اس مجموعے کی یہ خصوصیت ضرور قابلِ ذکر ہے کہ اس میں بارہ اربابِ قلم کی رائیں بہ طور دیباچہ شامل ہیں۔ ایک طویل مقدمہ مزید برآں۔ ان ۱۳ حضرات میں معروف نقاد بھی ہیں اور معمولی شاعر بھی۔ بیشتر رائیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ معتبر ناقدین نے حسبِ معمول مجموعہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔

”شبنم شبنم“ کرشن موہن کا مجموعہ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی کہ اس نے حسنِ طباعت کا ایک معیار قائم کر دیا ہے۔ کرشن موہن بہت شریف انسان ہیں۔ اسی مناسبت سے ان کی نظمیں بھی ”سیدھی سادی“ ہیں۔ وہ دل کی بات بے جھجک کہنے کے قائل معلوم ہوتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے ہیں کہ اس کو دوسرے عناصر سے بوجھل بنائیں۔ اس مجموعے میں کچھ آزاد نظمیں بھی ہیں۔ ان کی یہ خصوصیت مجھے پسند آئی کہ ان میں دوسرے بہت سی آزاد نظموں کی طرح، جگہ جگہ ترنم یا آہنگ کو دم توڑنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا ہے۔ ایک آہنگ آخر تک قائم رہتا ہے یہ بڑی بات ہے۔ یہ مجموعہ بھی پہلی بار سنہ ۶۰ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا اڈیشن سنہ ۶۱ء میں شائع ہوا ہے

قصائد

محسن کاکوروی اور عزیز لکھنوی کے بعد، نعت و منقبت کے قصائد کا چلن اُٹھ گیا تھا۔ یہ بڑا خلا تھا۔ قصیدے میں تشبیب، گریز، مدعا اور خاتمہ پر مشتمل کئی حصے ہوتے ہیں۔ سلیقہ ہو تو یہ کئی رنگوں کا دلفریب مجموعہ بن سکتا ہے۔ قدما نے اس سے صرف بادشاہوں کی مدح طرازی کا کام نہیں

بنا ہی، اور بہت سی باتیں بھی کہی ہیں۔ قصیدے میں ایک خاص انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے، جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے معنی آفرینی، زور بیان اور قدرت کلام کی اس میں بنیادی حیثیت ہے ــــ اقبال سہیل مرحوم کی نعت و منقبت پر مشتمل نظموں اور قصیدوں کا مجموعہ "ارمغان حرم" اس لحاظ سے قابل ذکر ہے۔ اس مجموعے کے قصیدے معیار قصیدہ گوئی پر پورے اترتے ہیں۔ خصوصاً تشبیبیں نہایت دل کش ہیں۔ مثلاً

سرشت حسن تغافل مزاج عشق غیور	وہ التفات سے ہم التجا سے ہیں معذور
بہت بلند نظر ہیں شہید ناوک دوست	وہ اور ہیں جنھیں ہوگی تلاش جلوۂ طور
مری بلا کرے دریوزۂ زکوٰۃ جمال	لب سوال یہ ہے مہر لن ترانی طور
نہ پوچھ اسیر محبت کی لذت تعزیر	ہر ایک دام بلا ہے شکنج طرۂ حور

ان اشعار سے شاعر کی قوت شعر گوئی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان قصائد میں شکوہ الفاظ اور چستی بندش کی کمی نہیں۔ ہاں وہ شگفتگی و ربودگی نہیں ہے۔ جو بعض خالص نعت گو شعرا کا حصہ ہے۔ جو مثلاً شہیدی کے کلام میں ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو قصیدے اور نعت کا فرق ہے اور کچھ افتاد طبع۔ کہیں کہیں فارسی عربی الفاظ کی کثرت نے بھی روانی کو مجروح کر دیا ہے۔

غزلیات

دوسری جنگ عظیم کے آغاز ہی سے سیاسی و سماجی انتشار اور بعض دوسرے محرکات کے سبب سے، بہت سے اچھے شاعروں کی توجہ غزل گوئی کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ سنہ ۵۰ء کے بعد جب ہنگامی موضوعات کا خزانہ قریب قریب ختم ہوگیا، اس وقت پھر یہ صنف یاد آئی اور بے طرح یاد آئی۔ غزل کے حسن ظاہر میں مشق سخن اور آداب تغزل کی رعایت کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اور حسن باطن کے لیے گداز دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۰، ۱۵ سال تک غزل سے بے تعلق رہنے کی بنا پر اور چیخ پکار کو الفاظ کا لباس پہناتے رہنے کی وجہ سے، نہ مشق سخن رہی نہ دل دوزی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ رجعت بہتوں کو راس نہیں آئی ــــ سنہ ۵۵ء کے قریب قریب، جب مختلف حالات کی وجہ سے، ذہن و قلب میں مایوسی و ناکامی کی لہریں دوڑ رہی تھیں، قدیم شعرا کے رنگ میں شعر کہنے کا رجحان بڑھا۔

حالات میں سب سے زیادہ میر کی یاد آئی۔ اور کئی اچھے شاعر اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ کوئی صحت مند وہ نہیں تھا۔ میر کے زمانے کے کچھ لفظ استعمال کرنے سے، یا محض ناکامی و نامرادی کے بیان سے تقلید بے ہونے سے رہی۔ اس کے لیے تو اس دل خوں شدہ اور اس خلوص و وفا کی بھی ضرورت ہے، جو میر کا طرۂ امتیاز تھا ــــ نتیجہ یہ ہوا کہ دو چار سال کے بعد، اس رجحان نے دم توڑ دیا ــــ اس وقفہ وقفہ میں ذاتی رجحانات اور انفرادیت کو ٹھیس پہنچتی رہی۔

اب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رنگ ختم ہو گیا ہے۔ نیز ہمارے بعض غزل گو آداب غزل گوئی کا احترام ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ یہ فال نیک ہے۔ البتہ سہل پسندی، عجلت پسندی، عدم مطالعہ، اور عدم قدرت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو، اور ڈوب کر شعر کہنے کا انداز کم دیکھنے میں آتا ہے حالانکہ معیاری غزل گوئی کے لیے یہ لازمی شرائط ہیں۔

ایک زمانے میں غزل کے خلاف خاصا جہاد کیا گیا۔ ایک گروہ نے تو اس کو جاگیردارانہ محرکات کی دین بتا کر اس سے زبان و قلم کو آلودہ نہ کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ یہ سارے مہمل دعوے خود بخود ختم ہو گئے ہیں۔ جو لوگ پہلے غزل کو کشتنی سمجھتے تھے، اب کفارہ ادا کرنے کے لیے سب سے زیادہ غزلیں کہہ رہے ہیں۔

صرف غزلوں کے جو مجموعے میرے پیش نظر ہیں، ان میں شاہد صدیقی اور غلام ربانی تاباں کے مجموعے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ شاہد صدیقی کا مجموعہ پڑھ کر یہ احساس ایک بار پھر تازہ ہو جاتا ہے کہ جب تک ڈوب کر شعر نہ کہا جائے، بات نہیں بنتی۔ شاہد صدیقی کی غزلوں پر مقصدی یا مسائلی شاعری کی بہتات ہے۔ انھوں نے زندگی کی محرومیوں اور سماجی مصیبتوں کا بار بار ذکر کیا ہے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بیان غم کو محض انسانی فرض سمجھ کر شریک غزل کیا ہے، یہ نہ ان کے ذاتی تجربات کا جزو بن سکا ہے، نہ شریک فکر و خیال ہو سکا ہے ــــ ہمارے یہاں ایک رسم ہے کہ شاعر محض اس خیال سے کہ اس کا شمار باشعور اور حقیقت نگار شعرا میں کیا جائے، غم دوراں، شکایت، نامرادی، محرومی، اور ایسے ہی کچھ حقیقی اور کچھ مفروضہ بیانات کی تکرار ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تصورات دل کی گہرائیوں میں تہ نشین نہیں ہوتے ہیں۔ اس لیے حقیقت نگاری

کے باوصف، حسن بیان، اور تاثیر دونوں عنصر معدوم رہتے ہیں — ورنہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی جب کوئی شاعر مسائلی شاعری پر زور طبع صرف کرتا ہے تو اکثر و بیشتر اس میں تکرار محض اور بے کیفی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور جب وہی شخص کچھ دیر کے لیے اس مصنوعی نوحہ گری سے دامن کش ہو جاتا ہے۔ تو شعر خلوص و تاثیر کی روشنی میں ڈوب جاتے ہیں۔

شاہد کے اس مجموعے میں زیادہ غزلیں، غم زمانہ کے سادہ و بےرنگ بیان کی آئینہ دار ہو کر رہ گئی ہیں۔ لیکن جہاں وہ اس عام انسانی فرض کو ادا کرنے سے کچھ دیر کے لیے رک گئے ہیں، اور آداب تغزل کا لحاظ رکھا ہے، وہاں دل کشی و حسن بیان کا رنگ چمک اٹھا ہے۔ مثلاً

ان کو منظور نہیں درد کا رسوا ہونا — آہ کرتا ہوں تو آواز بدل جاتی ہے

ترا کرم کہ مجھے سوز زندگی بخشا — مری خطا کہ اسے زندگی بنا نہ سکا

ایک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل — صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں

آداب تغزل کی رعایت کے فیض سے کہیں کہیں سیاسی اشارے بھی جزو غزل بن گئے ہیں۔

مثلاً ہم ہی رہ گئے پیاسے ورنہ بزم ساقی میں — جس طرف نہ تھا کوئی اس طرف بھی جام آیا

رفتہ رفتہ یاد ان کی بن گئی غم دنیا — زندگی کا سرمایہ زندگی کے کام آیا

یہ صحیح ہے کہ ان اشعار میں، اول الذکر اشعار کی طرح، شعریت کا وفور نہیں ہے، پھر بھی ایک حسن ضرور ہے، لیکن ایسے اشعار کی تعداد اس مجموعے میں بہت کم ہے۔ زیادہ غزلیں ایسی ہیں، جو محض فرض انسانیت کی یادداشتوں کا مجموعہ، اور عام مفروضہ حقیقت نگاری کا بے رنگ مرقع ہیں۔ یہ مجموعہ اس لحاظ سے نئے شعراء کے لیے عبرت و نصیحت کا مرقع ہے، کہ ایک ہی شاعر کے یہاں دو رنگ ہیں۔ بہت واضح، ایک طرف پل گل اندھیرا ہے، دوسری طرف کچھ چنگاریاں چمک رہی ہیں۔ کتنی حسرت کے ساتھ دل چاہتا ہے کہ یہ چنگاریاں شعلوں میں تبدیل ہو جائیں اور آتش مقدس کی طرح مجموعۂ نور و حرارت بن کر رہ جائیں۔

بعض شاعر جن کو فطرت نے غزل گوئی کی بہترین صلاحیتیں عطا کی تھیں، ایک مدت تک سیاسی شاعری کے پھیر میں پڑے رہے۔ لیکن اس تضاد کو دیر تک نہیں نباہا جا سکا۔ عرصے تک بے روح شاعری

... صرف کرنے کے بعد وہ بل آخر صحیح راستے پر آ گئے۔ ایسے شاعروں میں غلام ربانی تاباں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ موصوف نے ایک زمانے میں دوسرے بہت سے شعرا کی طرح اپنی فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے، سیاست زدہ نظم نگاری کو مطمح نظر بنا لیا تھا۔ جس میں شعریت سے زیادہ ... کا پر شور آہنگ تھا۔ لیکن ان کی غزلیات کے مجموعے "حدیثِ دل" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اب اُس بد مذاقی سے بھی قطع تعلق کر لیا ہے۔ اور نظم گوئی سے بھی، جو درحقیقت ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ تاباں کی غزلوں میں کلاسکل اندازِ سخن کی کیفیت پیدا ہو چلی ہے اور اشعار میں گداز دل کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اس مجموعے میں چند غزلیں ایسی ضرور ہیں، جن میں ... اشاریت حسنِ ادا پر غالب آ گئی ہے۔ ان میں وہی بے رنگی ہے جس کو ہونا چاہیے لیکن ایسے شعر نسبتہً کم ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا ہے۔ اور عرفان ذات کی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ جس کے اثرات جگہ جگہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ چند اشعار سے ان کے اس رنگِ سخن کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

کہاں سے لائیں گے اہلِ حرم مذاقِ سجود	مری جبیں بھی نہیں تیرا نقشِ پا بھی نہیں
عشق کیا خود حسن محوِ آرزو رہنے لگا	دل فریبیٔ تمنا کارگر ہونے لگی
پیام آتے رہے اکثر کسی محوِ تغافل کے	ادائے برملا بن کر نگاہِ شرمگیں بن کر
لبِ نگار کو زحمت نہ دو خدا کے لیے	ہم اہلِ شوق زبانِ نظر سمجھتے ہیں

بسملؔ سعیدی کے مجموعے "مشاہدات" میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی، لیکن وہ دراصل غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے اچھے اشعار میں سوز و گداز کی فراوانی ہے۔ لیکن اس کا تعلق سوزِ عشق سے نہیں، سوزِ زندگی سے ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی مایوسیوں، ناکامیوں اور حادثوں نے ان کو گدازِ دل کی دولت بخشی ہے۔ بسملؔ صاحب بہت مشاق اور باخبر شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں استادانہ ... اور فکر و فن کا اچھا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے بہت سے دلدوز شعر پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے جو حالات و حوادث کی دھوپ چھاؤں سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اس کے تاثرات

اشعار کی صورت میں نمایاں ہوتے جا رہے ہیں ۔ چند اشعار سے ان کے اس رنگ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

وہ کچھ اس طرح مجھ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں ۔۔۔ کہ جیسے میری حالت واقعی دیکھی نہیں جاتی
غضب ہے ٹھیس لگنا عشق کی خودار فطرت کو ۔۔۔ بس اے چشم کرم اب التفات سرگراں کب تک
ولے بیداد جنوں دشت میں دیوانے کو ۔۔۔ ہر طرف کچھ در و دیوار نظر آتے ہیں

لیکن مجموعی طور سے یہ مجموعہ اُن کے پچھلے مجموعوں سے ہلکا ہے ۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انتخاب کے اصول کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے ۔ کئی غزلیں اور نظمیں اس مجموعے میں ایسی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں ، تو بہتر ہوتا ۔

جذبی جانے پہچانے شاعر ہیں ۔ ان کے مجموعے "سخن مختصر" کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے " فروزاں " کے بعد کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا ہے ۔ بلکہ پچھلی روایت کو مجروح کر لیا ہے ! اس مجموعے کی بیش تر غزلیں ، حسن ادا ، گداز دل اور تاثیر سے محروم ہیں ۔ کہیں کہیں تو غزل اور نظم کا امتیاز بھی ختم ہو گیا ہے ۔ اور سطحیت نمایاں ہو گئی ہے ۔ یہ رنگ ۵۶ء تک کی غزلوں پر چھایا ہوا ہے ۔ اس کے بعد کی دو تین غزلیں ضرور ایسی ہیں ، جن میں کہیں کہیں حسن بیان کی چنگاریاں چمک اٹھی ہیں ۔ اور جذبے کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا ۔۔۔ کم نگاہ یہ سمجھے موسم بہار آیا
ہم نے غم کے ماروں کی محفلیں بھی دیکھی ہیں ۔۔۔ ایک غمگسار اٹھا ایک غمگسار آیا
چمن کا گوشہ ، راحت قفس کا کنج عذاب ۔۔۔ کہاں کہاں نہ تری انجمن کی یاد آئی

لیکن ان چنگاریوں کی چمک جلد ہی ختم ہو جاتی ہے اور پھر وہی سطحیت سے لبریز غزلیں سامنے آجاتی ہیں ۔ جذبی نے محض دوسروں کی دیکھا دیکھی ایک زمانے میں سُنی سنائی باتوں اور چلتے ہوئے سیاسی نعروں کو غزل میں نظم کرنا فریضۂ غزل گوئی سمجھ لیا تھا جس کی وجہ سے ان کی اُس زمانے کی غزلیں حسنِ تغزل سے یکسر تہی داماں ہیں ۔ مثلاً اس زمانے کی ایک غزل کے یہ شعر دیکھیے ۔ اس سے رنگ سخن کا کچھ اندازہ ہوگا ۔

ابھی زمیں میں ہے نہ آسماں حسیں — ابھی بنی ہی کہاں ہے مری بہشت بریں

ابھی ہے ذوقِ جنوں اپنا مصلحت آگیں — ادھر بھی ایک نظر اے نگارِ خطۂ چیں

یہ سوچتا ہوں کہ بدلا ابھی ہے نظامِ الم — یہ دیکھتا ہوں کہ موجِ نشاط بھی ہے کہیں

یہ اہتمام یہ تیاریاں تباہی کی — عرق عرق ہوئی جاتی ہے زرفشاں سی جبیں

یہ غزل ۵۵ء کی ہے۔ جذبی نے ۵۶ء کے بعد اس طرزِ سخن کو ترک کر دیا لیکن بے کیفی کے جو اثرات ۸، ۱۰ سال مسلسل محیط رہے، ان کے عکس ابھی نظر آتے ہیں۔ حسن بیان و تاثیرِ سخن، کی کبھی کبھی ہلکی سی جھلک دکھائی دے جاتی ہے، اس قدر ہلکی، کہ محض گمان ہوتا ہے۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جذبی کے کلام میں عجزِ بیان اور الفاظ کے غلط استعمال کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ یہ خامی خورشید الاسلام کے یہاں بھی ہے اور بہ کثرت۔ جذبی عمر اور مشقِ سخن کی بہت سی منزلیں طے کر چکے ہیں، ان کے یہاں معائب اور اسقام کی ایسی مثالیں تعجب خیز ہیں، ان ناہمواریوں نے ان کے کلام کے ایک خاصے حصّے کو مجروح کر دیا ہے۔ جیسے

ع ہر قدم آگے بڑھانے کے لیے خون کی بھینٹ

ع نئے بل نئے زور ان کو سکھائے

ع اس اندھیرے میں اجالے کے سماں ملتے ہیں

ع تو یہ وہ تیر ہے جس کے لیے خطا ہی نہیں

ع دھڑکا رہے ہیں پھر بھی دلِ کائنات ہم

بعض مقامات پر رعایت لفظی اور غیر مانوس تعبیرات کی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں کہ مذاقِ سلیم الاماں پکار اٹھتا ہے مثلاً ؎

جب ذکر ان کے شہدِ لب و رخ کا چھڑ گیا — ہم چپ رہے ہیں تلخی کام و دہن لیے

ع اک مہکتی ہوئی سرشار نگاہی گم ہے

ایسے اسقام صرف شاعر کے کلام کو مجروح نہیں کرتے ہیں، بہت سے نئے شعرا کو گمراہ کرنے کا فرض بھی انجام دیتے ہیں۔

خورشید الاسلام کی غزلیں، ان کی نظموں سے بھی کم دل کش ہیں کہیں ردیفیں اکھڑی اکھڑی سی ہیں، کہیں غزلوں پر نظم کا سایہ پڑ گیا ہے جس سے نہ غزل کا حسن باقی رہا ہے نہ نظم کا رنگ چمک سکا ہے۔ مثلاً

یار کا دامن نہ جانے کب چھٹا — گرمی بازار میں کھویا گیا

بیچ دی ہیں نے بنوت کی قبا — کوچۂ عطار میں کھویا گیا

حیف وہ راہی کہ منزل کے قریب — چشمہ و کہسار میں کھویا گیا

خورشید الاسلام سوداؔ سے متاثر ہیں کہیں کہیں یہ رنگ نمایاں بھی ہے لیکن اور بہت سے رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں فراقؔ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

کوئی فریب تراشو کوئی چراغ جلاؤ — یہ ایک رات کسی طور سے بسر کر جاؤ

طرح طرح سے دلوں کو تپا تپا کے رجاؤ — فریب غیر تو کھائے فریب یار بھی کھاؤ

یہاں تو کوئی نہیں دل تلک اکیلا ہے — قبا کے بند تو کھولو، ہمارے پاس تو آؤ

کہیں آتشؔ کی قلندرانہ آواز کی گونج سننے میں آتی ہے۔

اتنا تو ذرا سوچو کہ جس شہر کے تم ہو — اس شہر کا میں بھی ہوں میاں مجھ کو نہ چھیڑو

عاشق ہوں سپاہی ہوں مجھے سہل نہ جانو — کھیلو کوئی دن تیر و کماں مجھ کو نہ چھیڑو

کہیں محض لفظوں کی الٹ پھیر ہے۔

وہ چند روز کہ جن کی بہار لٹ نہ سکی — وہ چند روز جنھیں ہم بہار کر نہ سکے

وہ ابتدا جو ہمیں آشنا کر نہ سکی — وہ انتہا جسے ہم آشکار کر نہ سکے

وہ زندگی جو ہمیں معتبر سمجھ نہ سکی — وہ موت ہم جسے بے اعتبار کر نہ سکے

غزل میں معائب زبان اور عجز بیان کی نمود بہت کھٹکتی ہے۔ اس مجموعے میں ایسے مصرعے بہت ہیں، جن پر ان عیوب کی مہریں لگی ہوئی ہیں مثلاً

ع تمھیں بھی ہم سے رم ہونے لگا ہے

ع ہم پی بھی پلا چکے بھی کب کے

ع کوئی وہ خندہ جو برپا نہ ہو پگھل جائے

ع بہم رہے ہیں سرد سینہ یک دگر کیا کیا

غرض ان کی غزلیں تغزل ہی سے عاری نہیں، حسن بیان سے بھی محروم ہیں۔ اب غزلوں میں ایسے شعر گوارا کرنا بہت صبر آزما کام ہے۔

سوچنا پڑتا ہے یاں رک رک کے اک اک لفظ کو　　اور داں چلتے ہوئے فقروں کی اک فرہنگ ہے

یہ توازن یہ تکلف یہ نہیں یہ ناپ تول　　معجزہ ہے معجزہ نیرنگ ہے نیرنگ ہے

اس مجموعے میں مجھے کہیں معجزۂ شاعری درکنار کرشمۂ شاعری بھی نہیں ملا۔ کہیں کہیں سیمیا کی سی نمود ضرور ہے۔ جس کا رنگ اڑتے دیر نہیں لگتی۔

"تبسم" ادیب مالیگانوی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ادیب پرانے غزل گو ہیں۔ جذبات آمیز سادگی بیان ان کے اچھے اشعار کا امتیازی وصف ہے۔ مثلاً

لٹ گیا رات بس اس بزم میں کس طرح ادیب　　تم تو بیٹھے تھے بہت دور تمھیں کیا معلوم

یہ مست مست گھٹائیں یہ سرد سرد ہوا　　سمجھ رہا ہوں کہ در پردہ کیا اشارا ہے

سجائی تو ہے انجمن حسرتوں نے　　دل اس انجمن سے بھی اکتا نہ جائے

کہیں کہیں فکر کے ہلکے ہلکے انعکاسات نے شعر میں لطف مزید کا اضافہ کر دیا ہے مثلاً

ہم اپنا ساتھ دیے جائیں یہ بھی کیا کم ہے　　نہ ہو ہوائے گلستاں جو سازگار نہیں

لذت آموز غم عشق ہے ساری محفل　　عام سوز دل پروانہ ہوا جاتا ہے

یہ مجموعہ نہایت اچھے کاغذ پر شائع ہوا ہے۔ جلد بھی بہت خوب صورت اور مضبوط معلوم ہوتی ہے کتابت اور طباعت بھی بہت سے مجموعوں سے اچھی ہے۔

سراج لکھنوی کا مجموعہ "شعلۂ آواز" صرف غزلوں کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۳۱ء سے اکتوبر ۱۹۴۶ء تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ سراج صاحب کی غزلوں میں مرصع سازی کی رنگ غالب ہے۔ وہ الفاظ کے نگینوں کو

کبھی مناسب اور کبھی غیر ضروری رعایتوں کے ساتھ جڑنے کے شائق معلوم ہوتے ہیں، چند اشعار سے ان کے عمومی رنگ سخن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

گنگنے آنسو نفس میں ہلکا ہلکا سا گداز — یوں ترے شائستۂ غم گرم افسانہ رہے

دہی پانی کی چادر اوڑھ کر لب پر ہنسی آئی — خوشی کے آنسوؤں نے بھی مزاج غم کہاں بدلا

جو اشک سرخ ہے نامہ نگار ہے دل کا — سکوت شب میں لکھے جا رہے ہیں افسانے

آ طور پہ پھر ل کے چڑھائی کریں اے دوست — سب ڈھنگ وہی ہیں ترے چھپنے کی ادا میں

تنکے قفس تک اڑ کے نشیمن کے آ گئے — رخ پر ہوا کے تیر لگائے بہار نے

ستم ہے غم کی دولت بھی عطا کی جائے قسطوں میں — تکلف ہر طرف ہونا ہی جو اک بار ہو جائے

ان کی غزلوں میں داخلیت اور سوز و گداز کے بجائے، فن تزئین شعر کی فراوانی ہے۔ اور یہی ان کا خاص رنگ ہے۔ جو شعر اس تکلف سے بری ہیں، وہ خوب ہیں۔ مثلاً

ہمیں خود بن گئے آئینہ دنیا کے تغیر کا — زمیں کی گردشیں بدلیں نہ دور آسماں بدلا

ہاں تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم — تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خیال میں

لیکن ایسے شعر بہت کم ہیں ــــ معمولی خیالات کو بھاری بھرکم الفاظ اور بوجھل انداز بیان میں اس طرح پیش کرنا، کہ ان میں بہ ظاہر نیا پن جھلکنے لگے، سیماب صاحب کی خصوصیت تھی۔ سراج صاحب کے یہاں بھی قابل ذکر تعداد ایسے اشعار کی ہے۔ جیسے

امانت سونپ کر بنیاد بھی حشر آفریں رکھ دی — جہاں سے ایک مٹھی خاک اٹھائی تھی وہیں رکھ دی

سراج آہ وہ نادیدہ مرکزی جلوے — ہزار زاویے بدلے نگاہ کر نہ سکے

سلیمان اریب کے مجموعے "پاس گریباں" میں غزلوں کی قابل ذکر تعداد ہے۔ ان میں تغزل کا رنگ بے حد ہلکا ہے۔ مشق کی کمی، الفاظ کے بے محل استعمال اور سست بندشوں نے بے رنگی کو اور بڑھا دیا ہے ــــ باقر مہدی کی غزلیں ان کی نظموں سے بھی کم رتبہ ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ حسن بیان نہ ہونے کے برابر ہے جو غزل کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

محسن زیدی کی غزلوں کا مجموعہ "شہرِ دل" اسی سال شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے آج کل کی عام روایت کے برخلاف، زبان و بیان کو خواہ مخواہ مجروح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ نہ غزلوں میں کرتب دکھانے کی نمائش کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی غزلوں میں وہ گھلاوٹ اور دل میں سما جانے والی بات نہیں ہے، جو دل خوں شدہ کا پتا دیتی ہے۔ لیکن آدابِ تغزل کو ملحوظ رکھنے کے فیض سے متعدد اشعار میں حسنِ بیان کا رنگ ضرور جھلک اٹھا ہے۔ عشرت کرتپوری اور محمور سعیدی کے مجموعوں میں بھی غزلیں ہیں، جن میں اچھے اشعار تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مخمور کے یہاں حسنِ بندش اور مشقِ سخن کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن غزلوں میں جذبات نگاری کا رنگ مدھم ہے۔ وہ دراصل نظم کے شاعر ہیں۔ اور اس میں ان کے جوہر کھلتے ہیں۔ ان شعرا کی غزلیں پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محض خیالات کے شیش محل میں بند نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے افکار و حوادث سے چشم پوشی نہیں کی ہے لیکن ان کی تبلیغ و تشہیر بھی نہیں کی ہے۔ یہ سلامت روی گرانمایگی مستقبل کی ضامن ہے۔ اگر صاحبِ کتاب بن جانے کے سرور نے بےخود نہ کیا (اور یہ حادثہ اکثر نئے شعرا کو پیش آتا ہے) اور ریاض میں مصروف رہے، تو یقیناً اس منزل پر پہنچ جائیں گے، جہاں پہنچ کر "خونے بہ جگر جمع کن و رنگ بروں آر" کا مفہوم خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے۔

حمید ناگپوری کا مجموعہ "حرفِ خاموش" اسی سال کامٹی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں غزلیں زیادہ ہیں جن میں سادگیِ بیان و سادگیِ فکر کا رنگ نمایاں ہے کہیں کہیں ضبطِ شوق کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ ایسے اشعار میں دلکشی و تاثیر کا ہلکا سا رنگ نظر آ جاتا ہے مثلاً

ہم سمجھتے تھے غمِ دل کا مداوا ہوگی	وہ نظر پرسشِ حالات سے آگے نہ بڑھی
اس کی نگہ مہر کا اٹھنا ہی ستم تھا	بل پڑ گئے بے رحم زمانے کی جبیں پر
اپنی ہستی کا نہیں ہوش مگر حال یہ ہے	دل تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتا

رُباعیات

غزل گوئی کے ساتھ ساتھ رباعی کی طرف بھی توجہ بڑھتی جا رہی ہے۔ رباعی ان شاعروں کی ذہنی تسکین کے کام بھی آتی ہے، جو گہرے اور نسبتہً بڑے خیال کو پیش کرنا چاہتے ہیں، اور نظم کے وسیع کینوس

پر گل کاری سے بچنا چاہتے ہیں۔ رباعی میں اس کی ہیئت اور مخصوص وزن کے لحاظ سے زورِ بیان کا رنگ زیادہ چمکتا ہے لیکن اسی نسبت سے یہ مشکل بھی ہے نظم کے بیشتر مجموعوں میں رباعیوں کی خاصی تعداد موجود ہے لیکن بہت کم رباعیاں قابلِ ذکر ہیں۔ اس عرصے میں شائع ہونے والے مجموعوں میں، تین مجموعے ایسے میرے پیش نظر ہیں جن میں صرف رباعیاں ہیں۔ ۱۔ رس ۲۔ شام و شفق ۳۔ گل رعنا۔

"رس" جناب جگر بریلوی کی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ جگر صاحب نہایت پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی رباعیوں پر بھی قدرت کلام کا رنگ چھایا ہوا ہے لیکن تقاضائے عمر یا بجھی ہوئی طبیعت، جو بھی سبب ہو، اس مجموعے کی رباعیاں بالعموم زورِ بیان اور جوشِ پنہاں سے خالی ہیں۔

"گل رعنا" رعنا جگی کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک قابلِ ذکر حصہ، حسن بیان و چستی بندش کے لحاظ سے خوب ہے خصوصاً جو رباعیاں "عورت" کے موضوع پر کہی گئی ہیں، وہ پاکیزگی خیال اور حسن بیان کی بنا پر خصوصی توجہ کی مستحق ہیں۔ ان میں عورت کو محض فشارِ آغوش کا مستحق نہیں بتایا ہے۔ نہ صرف رنگینی پیرہن تک بات کو محدود رکھا ہے، اس کی صنفی پاکیزگی، تقدس، غم گساری، اور عظمت کو دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک رباعی سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تسکین دہ ذوق تمنا تو ہے	آسودگی شوق تماشا تو ہے
انسان کے دل میں جو ازل سے ہے نہاں	اس دردِ محبت کا مداوا تو ہے

اندازہ ہوتا ہے کہ رعنا کے مزاج کو رباعی سے گہرا تعلق ہے۔ اور یہ بڑی بات ہے۔

"شام و شفق" ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تلمیحی رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ سلام صاحب نے رباعی پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس مجموعے کی دو خصوصیتیں قابلِ ذکر ہیں، (۱) اس مجموعے کی ہر رباعی میں کسی تلمیح کو نظم کیا گیا ہے۔ اور حاشیے میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ پورا مجموعہ پاکٹ سائز کا تاریخچہ، تلمیحات بن کر رہ گیا ہے جس کو شاعری سے کہیں تو بہت دور کا علاقہ ہے اور اکثر وہ بھی معدوم ہے۔ سلام صاحب نے آغاز میں لکھا ہے: "مجھے اس کا احساس ہے کہ بہت سی رباعیاں خشک اور روکھی پھیکی ہیں اور محض واقعات کی کھتونی معلوم ہوتی ہیں تاہم اتنا عرض کروں گا کہ اس طرز کی رباعیاں اردو میں نہیں کہی گئی ہیں۔" سلام صاحب نے کچھ زیادہ احتیاط اور کسرِ نفسی سے کام لیا ہے

حقیقت یہ ہے کہ سب ہی رباعیاں "خشک اور روکھی پھیکی" ہیں۔ ممکن ہے سلام صاحب نے ایک تاریخی ضرورت کو پورا کیا ہو، لیکن شاعری سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ دوسری اس سے بھی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس مجموعے کی ۱۵۰ رباعیوں میں سے کم از کم ۴۸ رباعیاں ایسی ہیں، جن کا ایک مصرع یا دو مصرع ساقط الوزن ہیں۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!! ۔ اس کا دیباچہ نیاز صاحب نے لکھا ہے۔

تراجم

دوسری زبانوں سے ترجمے کے سلسلے میں دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ (۱) شکنتلا۔ (۲) تجدید جنوں ساغر نظامی نے کالی داس کی شہرۂ آفاق تصنیف "شکنتلا" کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس ترجمے میں ساغر صاحب نے بہ قول خود "کہیں کہیں اپنی تخلیقی اہلیت سے کام لے کر ان کے (کالی داس کے) دائرۂ مطالب و مفاہیم میں لطیف اضافے کیے ہیں"۔ بدقسمتی سے میں سنسکرت سے ناآشنائے محض ہوں اس لیے اس ترجمے اور ان لطیف اضافوں کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کر سکتا۔ اس منظوم ترجمے کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں جگہ جگہ اوزان کے تغیر سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں ایک ہی مکالمے میں اس تغیر سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے۔ تجربے کا فیصلہ ہمیشہ قبولِ عام سے ہوتا ہے اور اس کے لیے کچھ وقت کی ضرورت ہے۔

"تجدید جنوں" میں روس اور اس کے زیر اثر ممالک پولینڈ، ہنگری وغیرہ کے کچھ شاعروں کی نظموں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ مخمور سعیدی اور ملیس عابدی نے انگریزی سے کیا ہے۔ اصل میں رابرٹ کنکوئسٹ نے انگریزی میں ان ملکوں کے شعرا کی کچھ نظموں کا ترجمہ مع مقدمہ شائع کیا تھا۔ "تجدید جنوں" اسی کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ پہلی بار اردو میں کئی ملکوں کی ایسی نظموں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے ایک دوسرے سے دور رہ کر، گرد و پیش چھائے ہوئے حالات کی یکسانیت کی بنا پر، کچھ مشترک باتیں کہی ہیں۔ فکر کی گہرائی یا جذبات کی فراوانی کی تلاش ان نظموں میں عبث ہے۔ ان کا مقصد بھی یہ نہیں ہے۔ ان سب کا موضوع قریب قریب ایک سا ہے۔ اسی لیے یہ لطافتِ بیان اور تنوعِ جذبات یا تنوعِ فکر سے معرّا ہیں۔ کچھ نظموں میں سپاٹ پن بے حد نمایاں ہے۔ البتہ بعض نظموں میں ایمائی اندازِ بیان کے بعض اچھے نمونے مل جاتے ہیں — ایک بات کا اور واضح

احساس ہوتاہے کہ جو ترجمے نظم آزاد کی صورت میں کیے گئے ہیں، ان میں حسن بیان نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ پابند ترجموں میں سے بعض میں دو چار جگہ حسن بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔

انتخابات

اچھے انتخابات کی اہمیت سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ ان سے اس دور کے رجحانات اور رفتار ادب کا صحیح اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ قدیم ادب کے اچھے انتخابات تیار کرنے کی تو بے حد ضرورت ہے۔ مولانا حسرت موہانی اور کیفی چڑیا کوٹی کے انتخابات اپنی نوعیت کے لحاظ سے آج بھی پر اہمیت ہیں۔ آج کل خالص علمی شغف کے بجائے تجارتی ذہنیت غالب ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی کام کیا بھی جاتا ہے تو اس کا مقصد نفع حاصل کرنا ہوتا ہے ــــ ان دو برسوں میں جو انتخابات شائع ہوئے ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۔ اردو شاعری کا انتخاب۔ ۲۔ گل صد رنگ ۳۔ دیوانِ میر، ۴۔ ارمغان نعت، ۵۔ غزلیں، ۶۔ انتخاب داغ۔

"اُردو شاعری کا انتخاب" ملک کے مقتدر ترین ادارے، ساہتیہ اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ مرتب اُردو کے مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین قادری زور ہیں۔ مرتب کے الفاظ میں یہ اُردو شاعری کا نمایندہ اور مکمل انتخاب ہے۔ لیکن درحقیقت غلط نگاری، بد مذاقی، تحریف اور بدسلیقگی کا شاہکار ہے۔ دکنی اشعار کا آسان اُردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور آسان اُردو اشعار کو غالباً مزید آسان بنانے کے لیے بہ تبدیل الفاظ لکھا گیا ہے۔ بیش تر شاعروں کے حالات و سنین غلط ہیں، اور مختصر سی تنقیدی رائیں بچکانہ لطائف کا مجموعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اردو کے بہت سے بہترین شاعر اس انجمن میں نہیں ہیں۔ نیز شاعری کی جملہ اصناف کی صحیح نمایندگی بھی نہیں ہوئی ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اور مکتبہ کی روایت کے برخلاف اس کے ہر صفحے پر کتابت کی دو چار غلطیاں موجود ہیں، جنھوں نے رہی سہی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔ البتہ اس طرح مرتب اور ناشر کی کارکردگی میں ایک حد تک توازن ضرور پیدا ہوگیا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی جیسے ادارے سے ایسی بے سروپا اور مجموعۂ اغلاط کتاب کا شائع ہونا افسوس ناک بھی ہے اور شرمناک بھی۔ یہ طالب علموں کی گمراہی کا سامان ہی نہیں، اُردو شاعری کو رسوا کرنے کی عالمانہ کوشش بھی ہے۔

دیوانِ میر، سردار جعفری کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے دیوانِ غالب، کے بعد میر کے انتخاب کو مع فرہنگ ؤ غذہسا اُردو ہندی دونوں رسم خط میں شائع کیا ہے۔ اس کا کاغذ نہایت دبیز رنگین اور بہت ہی اچھا ہے۔ جلد بہت ہی خوب صورت ہے، بس اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کا ٹائپ بہت خراب ہے۔ جس میں جگہ جگہ حرفوں کے جوڑ علاحدہ علاحدہ نظر آتے ہیں۔ بعض صفحوں پر سیاہی اس طرح پھوٹ گئی ہے۔ کہ پورا صفحہ کسی گناہ گار کے نامۂ اعمال کا ورق معلوم ہوتا ہے اس ٹائپ کو دیکھ کر اُردو کے ٹائپ کی طرف سے کراہت سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب کہ مقابل کے صفحے پر ہندی کا ٹائپ نہایت پاکیزہ ہے۔ اگر یہ اُردو کی یا ٹائپ کی خدمت ہے تو پھر خدا حافظ ہے! صحتِ متن کے لحاظ سے بھی پریشان کن صورتِ حال ہے۔ جگہ جگہ غلطیاں ملتی ہیں۔ اور بہت بری عبادت صاحب نے بھی کلیاتِ میر کراچی سے شائع کیا ہے، فرقت کا کوروی کا یہ جملہ اس پر مکمل تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے کہ "دو کتابیں ایک ساتھ مرتب کر دیں ایک کلیاتِ میر، دوسرا اس کا غلط نامہ" سردار جعفری نے اسی نسخہ عبادت کو بھی اپنے مآخذ میں گنایا ہے۔ اس کے بعد اگر متن غلط ہو، تو کیا جائے تعجب ہے!! یہ محسوس ہوتا ہے کہ ساری توجہ کاغذ، اور جلد پر مبذول کی گئی ہے۔ کیوں کہ اس کی قیمت بیس روپیہ رکھی ہے۔ یہ ادب دوستی نہیں ادب کے پردے میں تجارت ہے۔ یہ کہاں کی ادب دوستی ہے کہ آپ ایک انتخاب کے بیس روپے وصول کر کے، غلط سلط اشعار اور بھونڈے ٹائپ کا مجموعہ حوالے کر دیتے ہیں ـــــ کچھ کتابیں اس لیے بھی ہوتی ہیں کہ بعض نمود و نمائش کے شوقین ان کو خرید کر ڈرائنگ روم میں احتیاط سے رکھ دیتے ہیں کہ نگاہوں کا مرکز بنتی رہیں۔ یہ کتاب بھی اسی فہرست میں شامل کی جا سکتی ہے۔ اور اس کا کوئی مصرف نہیں معلوم ہوتا۔

شارب ردولوی نے غزلوں کا ایک انتخاب "گلِ صد رنگ" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات کا یہ انتخاب بالکل بنیے کی دکان کا منظر پیش کرتا ہے۔ جس میں نہ کوئی اصول ہے نہ وجہِ انتخاب سمجھ میں آتی ہے۔ ۳۶۵ غزل گو شعرا کے جواہر پارے اس میں شامل ہیں۔ مرتب نے وجہِ انتخاب یہ بتائی ہے کہ اس سے شاعری کے موجودہ رنگ و آہنگ کا کچھ اندازہ ہو گا لیکن افسوس ہے کہ یہ اندازہ مطلق نہیں ہوتا۔ محض کتاب کو زیادہ سے زیادہ ضخیم بنانے کی کوشش کی

گئی ہے۔ ممکن ہے تجارتی نقطۂ نظر سے یہ بات مناسب ہو، لیکن مرتب کے دعوے کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے ـــ "ارمغانِ نعت" نعتیہ کلام کا انتخاب ہے، جس کو آلی آسی اور ساجد صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ مرتبین نے محنت کی ہے۔ اور بہت سے فارسی و اردو شعرا کا کلام جمع کر دیا ہے۔ لیکن کسی اصول کو پیشِ نظر نہیں رکھا ہے۔ نعتیہ قصائد، اور مثنویات کے شعر اس طرح درج ہیں کہ غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ طویل قصائد میں سے ۸، ۱۰ شعر منتخب کیے گئے جس سے ان شعرا کی نمایندگی نہیں ہوتی ہے۔ کسی جگہ کوئی حوالہ بھی نہیں دیا گیا ہے۔ حالاں کہ یہ بہت ضروری بات ہے۔ مرتب حضرات اگر اس پر نظرِ ثانی کر کے، اس کی ان خامیوں کو دور کر دیں، تو اپنی نوعیت کا یہ اچھا انتخاب ہوگا۔ بعض نہایت غیر معروف اور غیر اہم شعرا کو معلوم نہیں کیوں شامل کیا گیا ہے؟ کتاب کو اگر سلیقے سے مرتب کرنا ہو، تو دوست نوازی یا مروت سے کچھ دیر کے لیے قطع تعلق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دوسری اشاعت میں غیر اہم شعرا کا کلام نکال کر اُن کے بجائے معروف شعرا، کا کلام بڑھا دیا جائے اس حد تک کہ اس کی صحیح نمایندگی ہو، تو بہتر ہے۔

"غزلیں" شاہد علی خاں کا مرتب کیا ہوا، غزلوں کا انتخاب ہے۔ جو اس سال پانچویں بار شائع ہوا ہے۔ یہ انتخاب اچھا ہے، لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ پچھلے اڈیشن کی بعض اچھی غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ اس طرح یہ نیا اڈیشن مرتب کی نظرِ ثانی کا محتاج ہو گیا ہے۔ شاہد صاحب اگر اس میں قدیم و جدید شعرا کی کچھ نمایندہ غزلیں اور شامل کر دیں، اور ایک مفصل مقدمہ لکھ دیں، تو اس انتخاب کی خوبی اور افادیت میں اور اضافہ ہو جائے۔ مقدمے کی کمی بری طرح محسوس ہوتی ہے۔

"انتخابِ داغ" ڈاکٹر عقیل کا مرتب کیا ہوا ہے جسے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا ہے۔ اس سے پہلے داغ کے دو قابلِ ذکر انتخاب شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مولانا احسن مارہروی مرحوم کا دوسرا مولانا حامد حسن قادری کا مرتب کیا ہوا۔ جس کا نام "کمالِ داغ" ہے۔ مرتب نے ۴۰ صفحے کا مقدمہ بھی لکھا ہے۔ انتخاب کا تعلق ذاتی پسند و ناپسند سے بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش کچھ نہ کچھ تو نکل ہی سکتی ہے۔ لیکن مجموعی طور سے یہ اچھا خاصا انتخاب ہے۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس میں اغلاطِ کتابت بہت کم ہیں۔ اور یہ مسرت آمیز تعجب کی بات ہے۔ البتہ مقدمہ کچھ ناتمام سا

معلوم ہوتا ہے۔ داغ کی شاعری پر اچھے زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر بھی تمہید، ذاتی حالات اور رنگ سخن کے ذیل میں کچھ اور ضروری باتیں بھی کہی جاسکتی تھیں۔ آج کل مذاق تحقیق بڑھ رہا ہے۔ اس لیے کسی ادیب و شاعر کے حالات پڑھتے وقت اصول تحقیق اور معیار تحقیق کا خیال آجانا لازمی سا ہے۔ مقدمہ میں اس کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ پچھلے دو اچھے انتخابات کی موجودگی میں حسن ترتیب اور مقدمے کی جامعیت یہی دو چیزیں کسی نئے انتخاب کے جواز کی وجہ بن سکتی ہیں۔

تحقیقی اڈیشن

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے دو قدیم مثنویوں کو مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ (۱) مثنوی سراپا سوز مصنفہ قاضی محمد صادق خاں اختر (۲) طوطی نامہ مصنفہٗ جعفر علی حسرت بعونہٖ یہ دونوں مثنویاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ ان کو شائع کرکے ہاشمی صاحب نے اچھا کام کیا، لیکن زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ حسرت کی اس معمولی سی مثنوی کے بجائے اس کا دیوان شائع کردیتے۔ ہمارے یہاں قدیم دواوین کو مرتب کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ابھی تک میر، سودا، سوز، درد، قائم مصحفی، ذوق اور دوسرے قدیم شعرار کے مکمل اور قابل اعتماد مجموعے ہمارے پاس نہیں ہیں۔ عالم یہ ہے کہ کلیات سودا کے نول کشوری اڈیشن میں نہ معلوم کتنی غزلیں میر سوز کی ہیں۔ یہی صورت اور دواوین کی ہے۔ اس طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس عرصے میں میرے علم کے مطابق اور کوئی قابلِ ذکر کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔

حسن طباعت

ادھر پندرہ سال کے عرصے میں، کتابوں کو سلیقے سے پیش کرنے کا رجحان بڑھا ہے۔ ان دو برسوں میں بھی کتابوں کو اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کی طرف خصوصی توجہ کی گئی ہے۔ کاغذ، طباعت، گردپوش غرض آرائش بیرون در کے سارے انداز جلوہ فرما ملتے ہیں۔ اور بعض کتابیں تو ایسی ہیں کہ ان کے حسن ظاہر کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ ایسی کتابوں میں شبنم شبنم، شکستلا، تلخیاں، سخن مختصر، رگ جاں، تجدید جنوں، دیوان میر مرتبہ سردار جعفری قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب میں حسنِ طباعت کے لحاظ سے شبنم شبنم کو درجۂ فضیلت حاصل ہے۔ اور نفیس ترین کاغذ کے لحاظ سے "تلخیاں" کو۔ لیتھو میں چھپنے والی کتابوں میں بہ لحاظ حسنِ طباعت

"شکنتلا" سب سے اچھی کتاب ہے۔

ایک کمی کا احساس بری طرح ہوتا ہے۔ عام طور سے اچھے کاغذ، اچھی طباعت اور بہت اچھے گرد پوش کا تو خیال رکھا جاتا ہے، لیکن اچھے ٹائپ یا حسن کتابت کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے۔ کتابت ایک فن ہے، جو کاروبار کی حد تک تو اب بھی جاری ہے، لیکن بہ لحاظ فن رو بہ زوال ہے اس کے مختلف اسباب ہیں۔ من جملہ ان کے ایک سبب ناشرین یا مصنفین کی کم توجہی بھی ہے۔ بلاک اور آفسٹ نے چمک دمک میں اضافہ کر دیا ہے۔ کاغذ کی اچھائی بھی اس میں چار چاند لگا دیتی ہے لیکن جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتابت اتنی اچھی نہیں ہے۔ پہلے کتابت اچھی ہوتی تھی طباعت خراب تھی، اب کاغذ وطباعت خوب ہے تو کتابت اچھی نہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے۔ مثلاً شبنم شبنم کو دیکھ کر "عروس جمیل" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، لیکن بہ لحاظ کتابت یہ بھی عام کتابوں کی ہم پلہ ہے۔

پاکٹ بک سیریز

اسی زمانے میں پاکٹ سائز کتابوں کا سلسلہ بھی شروع ہوا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ اس میں بیش تر نظم کی کتابیں چھپی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے اس سلسلے نے بہت مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ اس وقفۂ مختصر میں اس کی کئی لاکھ جلدیں بک چکی ہیں۔ ذیل میں صرف چند کتابوں کی تعداد اشاعت درج کی جاتی ہے، جن سے اس سلسلے کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دیوانِ غالب، ۱۳ ہزار؛ انتخاب ظفر، ۱۲ ہزار؛ انتخاب داغ، ۸ ہزار، بانگ درا، ۵ ہزار؛ دیوانِ ذوق، ۵ ہزار؛ رومانی شاعری کا انتخاب، ۷ ہزار، ساقی نامے، ۳ ہزار؛ ارمغانِ حجاز، ۳ ہزار؛ شاہنامۂ اسلام، ۸ ہزار (یہ اعداد و شمار جناب انور کمال حسینی کے فراہم کیے ہوئے ہیں۔ میں موصوف کا مشکور ہوں۔)

اندازہ ہے کہ اب تک ایسی کتابوں کی کئی لاکھ جلدیں بک چکی ہیں — ہمارے یہاں بعض ضروری کاموں کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے، یا بہت دیر میں، اس وقت تک کسی خالص ادبی اور معیاری ادارے نے اس کام میں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صحت متن تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔

انعامات بھی اچھے نہیں ہیں۔ اسی بنا پر اب پہلے کی بہ نسبت ان کتابوں کی بکری کچھ کم ہوگئی ہے ایسی سلسلے کی بدولت اُردو کتابوں کی اشاعت اور مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ آج ہم کو ہر ایسی تحریک کی طرف ضرور توجہ کرنا چاہیے، جو اُردو کی اشاعت اور مقبولیت میں معاون ہو۔ اب بھی اگر مکتبۂ جامعہ یا اسی سطح کا کوئی ادارہ، اس طرف توجہ کرے، اور اپنے روایتی اہتمام کے ساتھ اس سلسلے کو جاری کرے تو یہ بات ہر لحاظ سے ادب و زبان کے لیے مفید ہوگی۔ جو لوگ آج بھی قیمتی دیوان خریدتے ہیں وہ کل بھی خریدیں گے۔ البتہ جو لوگ چھ روپے یا دس روپے خرچ کرکے کتاب نہیں خرید سکتے ہیں، اور خریدنا چاہتے ہیں، وہ اس سے مستفیض ہوں گے۔

۲۰، ۲۲ ماہ کی مدت میں شائع ہونے والے مجموعوں کا یہ سرسری سا جائزہ ہے۔ بعض کتابیں اس تبصرے میں شامل نہ ہوسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بروقت دستیاب نہیں ہوسکیں۔ ان میں منور لکھنوی کی غزلوں کا مجموعہ "نوائے کفر" تلوک چند محروم کی غزلوں کا مجموعہ "شعلۂ نوا" مانی جائسی کے قصائد کا مجموعہ "وادی ایمن" اور اختر الایمان کی نظموں کا مجموعہ "یادیں" قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مضمون حوالۂ کاتب ہوچکا تھا، تب اختر الایمان کا یہ مجموعہ سامنے آیا۔ افسوس رہا کہ ایک واقعی اچھی کتاب شاملِ تبصرہ نہیں ہوسکی۔ ایک بات اور عرض کرنا ہے کہ ہمارے باشعور ناقدین اگر معمولی معمولی مجموعوں پر مبالغہ آمیز دیباچے لکھنے سے پرہیز کریں اور کچھ دیر کے لیے جانب داری و مصلحت پسندی سے بے نیاز ہوجایا کریں، تو صورتِ حال اور بہتر ہوسکتی ہے۔ ہمارے کچھ ناقد بہت سے شعرا کو بے راہ رو بنانے یا ضروری امور کی طرف سے تغافل برتنے میں مدد دینے کے ضرور مجرم ہیں، یہ سلسلہ جس قدر جلد ختم ہوجائے، اچھا ہے۔

وفیات سنہ ۱۹۶۱ء

جناب خواجہ حافظ نبی احمد

۹ مارچ : مولوی محمد ظفر صاحب ایم اے، ایل ایل۔ بی وکیل گوڑ گاؤں کا سرگودھا (پاکستان) میں انتقال ہوا۔ آپ نے کئی مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ کئی رسالوں کے مستقل مضمون نگار تھے۔

۱۴ مارچ : ڈاکٹر خان بہادر حاجی محمد حبیب اللہ خاں ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ سرسید کے خاص صحبت یافتہ اور ان کا فیض اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کا حافظہ بلا کا تھا ۱۸۸۶ء سے انھوں نے روزنامچہ لکھنے کا جو اہتمام کیا تھا اسے مرتے دم تک ترک نہیں کیا۔ اگر یہ چھپ گیا تو تحریک علی گڑھ سے متعلق بہت سی عجیب و غریب معلومات سامنے آئیں گی۔ آپ نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی سوانح عمری حیات آفتاب کے نام سے لکھی تھی۔ ۱۴ مارچ کو انتقال کیا۔

۲۹ مارچ : سید احمد حسین امجد حیدر آبادی۔ ۷ فروری ۱۸۸۶ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے اپنے دور کے ممتاز شاعر تھے۔ رباعی گوئی میں اس زمانہ میں ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں
۱۔ ریاض امجد دو جلدیں ۲۔ رباعیاتِ امجد۔ ۳۔ حج امجد ۴۔ جمال امجد ۵۔ پیام امجد ۶۔ گلستان امجد۔
۲۹ مارچ ۱۹۶۱ء کی رات میں ساڑھے دس بجے انتقال کیا۔

۲۷ مئی : خواجہ دل محمد مشہور ریاضی داں تھے۔ اور اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں تقریباً ۷۷ سال کی عمر پائی۔ ریاضی پر ان کی ۳۲ کتابیں درسی کتب میں شامل تھیں۔

۲۷ مئی : سید تمکین کاظمی۔ حیدر آباد کے ممتاز ادیب کا حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہوا۔ آپ ادارۂ ادبیات اردو کے لئے تذکرہ نو واردانِ دکن لکھ رہے تھے انھیں مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے سو روپے کا علمی وظیفہ ملتا تھا۔ آپ داغ کے شاگرد تھے۔ تقریباً ۶۰ سال کی عمر پائی۔ حکومت ہند نے ان کی بیوہ کے لئے بھی سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ہے آپ ۲۵ نومبر ۱۹۰۲ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے تقریباً ایک درجن کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے

بعض کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ تذکرہ ریختی ۲۔ فریادِ داغ ۳۔ مرزا داغ ۴۔ سکردا اٹیلڈ کی کتاب ارنسٹ کا ترجمہ۔

جون : صدیق حسن مولانا شرر کے لڑکے تھے۔ آپ کافی مدت سے بیمار تھے۔ آپ عرصے تک دلگداز کے اڈیٹر رہے۔ اس کے بعد انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوگئے اور کئی سال وہاں رہے۔ حکومت نے ان کا ایک سو روپے وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے والد کی سوانح عمری لکھ رہے تھے۔

۳۰ جون : پروفیسر سید نواب علی ایک عرصے سے بیمار تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں لیکن ان میں سے دو کتابیں نہایت ہی قابل قدر ہیں۔ ایک سیرۃ الرسول اور دوسری تاریخ صحف سماوی۔ آپ مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے۔ ان کا اصل وطن نیوتنی ضلع اناؤ تھا۔ بڑودہ اور گجرات میں سرکاری ملازم رہے۔ ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ریاست جوناگڈھ میں وزیر تعلیم ہوگئے تھے۔ اس سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن لوٹ آئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے۔ آپ بمبئی یونیورسٹی کی سینٹ کے ممبر بھی رہ چکے ہیں اور عربی فارسی کے ممتحن بھی۔ تقریباً ۸۴ سال کی عمر پائی۔

۱۳ جولائی : خان بہادر ظفر حسین خاں انسپکٹر آف اسکولز کے ممتاز عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک شیعہ کالج لکھنؤ کے پرنسپل رہے۔ ان کا خاص موضوع فلسفہ تھا۔ اس موضوع پر ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ان کی کتاب آل وشنیت پر ساہتیہ اکاڈمی نے پانچ ہزار روپے کا انعام دیا تھا۔ آپ علامہ شبلی کے شاگرد تھے۔ آپ کا لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

۱۶ اگست : مولوی عبدالحق بابائے اردو ۱۸۷۰ء میں ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ اگست ۱۹۶۱ء کو کراچی میں وفات پائی۔ (رسالہ جامعہ بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے۔)

۲۱ اگست : مولوی سید عطاء اللہ شاہ بخاری شعلہ بار مقرر خوش گو واعظ، کٹر نیشنلسٹ اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ علم و مذہب اور ملک و ملت کی بڑی خدمت کی۔ ۲۱ اگست کو ملتان میں انتقال کیا۔

۲۵ ستمبر : ہادی مچھلی شہری مشہور شاعر عرصہ سے دمہ کے مریض تھے۔ آپ کی طبیعت غزل گوئی سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔ آپ جگر مراد آبادی کے قدیم دوستوں میں تھے۔ آپ کا ایک مجموعہ کلام نوائے دل کے نام سے ۱۹۴۴ء میں الہ آباد سے شائع ہوا تھا۔ آپ کے والد عبدالرزاق صاحب شاکر، مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ان کے نام سے بہت سے خطوط مکاتیب غالب میں موجود ہیں۔ آپ نے ۸۰ سال کی عمر پائی۔

۲۶ ستمبر : ابوالعلا چشتی (حاجی لق لق) آپ پاکستان کے پرانے صحافی تھے۔ صحافت میں مولانا ظفر علی خاں کے شاگرد تھے۔ ان کی مزاحیہ نظمیں بہت مقبول تھیں۔ ان کے فکاہات دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ آپ طویل عرصہ سے بیمار تھے۔ میو ہسپتال لاہور میں انتقال ہوا۔

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر ملاحظہ فرمایئے)

تنقید وتبصرہ

۶۱ء کی مطبوعات پر ایک نظر

علمی ومذہبی کتابیں

ہندوستان اور پاکستان میں ایسے ادارے صرف چند ہیں، جو سنجیدہ اور معیاری علمی ومذہبی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ پاکستان کے اداروں کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ہندوستان میں ایسی کتابیں زیادہ تر دار المصنفین سے شائع ہوتی ہیں۔ خط لکھنے کے باوجود ہمیں معلوم نہ ہو سکا کہ زیر تبصرہ سال میں دار المصنفین سے کوئی کتاب شائع ہوئی ہے۔ البتہ ندوۃ المصنفین سے آخر دسمبر اور شروع جنوری میں کچھ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ چند کتابیں پاکستان سے بھی موصول ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کا مختصراً تعارف ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

علمائے سلف و نابینا علماء از مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم۔

علمائے سلف اور نابینا علماء، نواب صدر یار جنگ مرحوم کی دو مشہور ومقبول کتابوں کو مزید تشریح وتوضیح کے ساتھ بڑے سائز پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک طویل مضمون اور مفتی محمد انتظام اللہ شہابی صاحب کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس نئی شکل میں کتاب پہلے سے کہیں زیادہ مفید ہوگئی ہے۔ قیمت نو روپے

شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ اور ان کی تعلیمات از اعجاز الحق قدوسی

شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے نامور صوفی گزرے ہیں۔ اس کتاب میں حضرت شیخ کے حالات زندگی، ان کی تعلیمات، سلسلہ چشتیہ صابریہ کی مختصر تاریخ اور تصوف کے اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب بہت مفید اور قابل مطالعہ ہے۔ قیمت نو روپے۔

اوپر کی دونوں کتابیں "اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی" سے شائع ہوئی ہیں۔

تفسیر مظہری (جلد اوّل) تالیف: قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی مرحوم۔
ترجمہ: مولانا سید عبدالدائم الجلالی۔
پارۂ آلم اور سیقول کی تفسیر ہے۔ قدیم طرز کی تفسیر ہے۔ بڑے سائز پر ۵۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔
قیمت غیر مجلد ساڑھے دس روپے۔ مجلد ساڑھے بارہ روپے۔

قرنِ اول کا ایک مدبر ۔ از خورشید احمد فارق

اس کتاب میں پہلی صدی ہجری کے ایک مدبر مختار بن ابی عُبید (وفات ۶۷ھ) کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ اس مدبر کے بارے میں مؤلف نے لکھا ہے کہ "مختار نے اپنے دست و بازو سے یہ اقتدار حاصل کیا اس کے حصول میں اس کی فکر و اجتہاد نے تو اس کا ساتھ دیا ہی، لیکن جس صفت نے سب سے زیادہ اس کی یاوری کی وہ تھی اس کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیت، مذہبی بہروپ اور اہل بیت (خاندان حضرت علی) کی ہوا خواہی"۔ قیمت غیر مجلد ڈھائی روپے۔ مجلد تین روپے۔

عرب دُنیا از مولانا محی الدین الوائی۔

اس کتاب میں خلیج فارس سے مراکش تک پھیلے ہوئے تمام عرب ملکوں کے جغرافیائی، معاشرتی اور عام حالات سے بحث کی گئی ہے۔ جدید عرب ممالک کے متعلق شاید اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ قیمت مجلد ۴/

اسلامی کتب خانے از الحاج محمد زبیر (اسسٹنٹ لائبریرین مسلم یونیورسٹی)

اس کتاب میں قرون وسطیٰ کے اسلامی کتب خانوں کے حالات درج ہیں۔ مؤلف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں ان سارے کتب خانوں کا ذکر موجود ہے جو قرون وسطیٰ کی وسیع و عریض اسلامی سلطنتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بارہ برس کے کتب خانوں کی ایک واضح تصویر پیش کی گئی ہے اور مسلمانوں کے علمی شغف اور ان کی تعلیمی و تصنیفی سرگرمیوں کی ایک جھلک دکھلائی گئی ہے"۔ قیمت مجلد پانچ روپے۔

تاریخ ہند پر نئی روشنی : مترجم: خورشید احمد فارق

یہ عربی کی ایک کتاب "مسالک الابصار فی ممالک الامصار" کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب چونکہ قلمی ہے اس لئے ترجمے کے ساتھ اسے بھی شائع کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے بارے میں مترجم نے لکھا ہے کہ "اس میں

ایسی نادر اور تاریخی، اجتماعی اور اقتصادی معلومات ہیں جن سے خود ہندوستان میں لکھی تاریخوں کا دامن خالی ہے
اس کے علاوہ اس باب میں تغلق شاہ کی آئینِ جہاں داری اور پبلک سیرت کی ایک ایسی تصویر بھی نظر آتی ہے
جو اُس تصویر سے مختلف ہے، جو بعض ہم عصر مورخوں نے ان سے ذاتی ناراضگی یا فقہی و مسلکی اختلافات کی بنا
پر پیش کی ہے..... ایسی دلچسپ معلومات ہیں جو عینی شاہدوں یا موجودہ وقت میں نایاب کتابوں سے لی گئی
ہیں اور جن سے قرونِ وسطیٰ کے ہندی رسم و رواج، کلچر و عقائد کے چہرہ کے بہت سے خط و خال واضح
ہو جاتے ہیں۔" قیمت مجلد چار روپے۔

اوپر کی پانچوں کتابیں ندوۃ المصنفین، اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع ہوئی ہیں۔

انیس زندگی از محمد انیس الرحمٰن (ایڈوکیٹ)

اس کتاب میں عورت کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ لفظ "عورت" میں مصنف کے نزدیک
نکتہ ہائے لطیف پوشیدہ ہیں یعنی ع سے عفت، و سے وفاداری، ر سے رفعت، ت سے تمکنت
اس کتاب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) شادی کو لازمی قرار دیا جائے (۲) مردوں کو ایک زوجگی
کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ انھوں نے "کوشش کی ہے کہ جنسی اور نفسیاتی پہلوؤں
پر جذباتی نہیں بلکہ حکیمانہ نظر پڑ سکے"۔ قیمت پونے تین روپے۔ ناشر: دانا اکیڈمی۔ تنسکر بلڈنگ
اے، ایم ۲ فریر روڈ۔ کراچی ۱ (پاکستان)

خط و خطاطی از شیخ ممتاز حسین جون پوری و محمد ایوب قادری

یہ مختصر کتاب دراصل دو مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلا مضمون شیخ ممتاز حسین جونپوری صاحب کا
ہے جس میں خط اور فن خطاطی پر تاریخی نظر ڈالی گئی ہے اور مختلف خطوں کی خصوصیات اور ان کی فنی نوعیت
سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا مضمون قادری صاحب کا ہے، جس میں خطاطی کے ایک نادر ذخیرے کا تعارف کرایا
گیا ہے۔ فن خطاطی کا یہ نادر ذخیرہ ۱۴ قطعات پر مشتمل ہے، جس میں بعض مشہور و معروف خطاط مثلاً میر
پنجہ کش، میر جلال الدین، عباد اللہ بیگ اور شنکر ناتھ دہلوی وغیرہ کے قطعات نیز عبدالرشید دیلمی
اور میر علی کے قطعات کی نقول شامل ہیں"۔ قیمت مجلد ڈیڑھ روپے۔ ناشر: آل پاکستان ایجوکیشنل
کانفرنس۔ سعیدہ منزل۔ ناظم آباد۔ بی روڈ۔ کراچی۔

ڈھاکہ ــ میرے خوابوں کا شہر از عارف حجازی

اس مختصر کتاب میں ڈھاکہ کی ابتداء سے آج تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ آخری باب کا عنوان ہے، میرے خوابوں کا شہر" جس میں موجودہ حکومت کے منصوبوں کی وضاحت کی گئی ہے، اور درخشاں مستقبل کی توقع ظاہر کی گئی ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپے۔ ملنے کا پتہ: مشتاق بک ڈپو۔ نزد اردو کالج۔ شولڈن روڈ۔ کراچی ۱

انتظام کتب خانہ از شیخ محبوب قریشی

یہ مختصر کتاب کتب خانوں کی تنظیم کے فن پر لکھی گئی ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ "میں نے اس کتاب میں کوشش کی ہے کہ مختلف موضوعات پر صرف انھیں باتوں کو عام فہم انداز میں پیش کر دوں جو کتب خانوں کے انتظام اور کتابوں کی درجہ بندی کے سلسلہ میں عملی اہمیت رکھتی ہیں۔ غیر ضروری تفصیلات اور نظری باتوں کو میں نے نظر انداز کر دیا ہے۔" ۱۹۵۳ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا، اب ۱۹۶۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن جدید اضافوں اور نئی معلومات کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت غیر مجلد ڈیڑھ روپے۔ ناشر: محبوبیہ کارخانہ جلد سازی۔ جعد آباد کالونی ۲۴، کراچی ۵۔

تعلیمی کتابیں

شاید تعلیم ہی ایک ایسا بد قسمت موضوع ہے، جس پر اردو میں سب سے کم کتابیں ہیں۔ مکتبہ جامعہ اور بعض دوسرے اداروں نے چند کتابیں شائع کی ہیں، مگر ہندوستان میں کوئی ایسا مکتبہ نہیں ہے، جو اس موضوع کی طرف خصوصی توجہ کرتا ہو۔ سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس کے مقاصد میں تعلیم پر کتابیں لکھوانا اور شائع کرنا بھی تھا، مگر اب وہ ختم ہو گیا ہے۔ پاکستان میں اسی نام سے ایک ادارہ ۱۹۵۱ء میں قائم ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ سرسید کے اس ادارہ کا احیاء کیا گیا ہے۔ اس نے تعلیم پر متعدد کتابیں شائع کی ہیں مگر اس نے ۱۹۶۱ء کی جو مطبوعات تبصرہ کے لئے ہمیں بھیجی ہیں ان میں تعلیم پر کوئی کتاب نہیں ہے۔ ہمارے علم کے مطابق ۱۹۶۱ء میں صرف مکتبہ جامعہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی مقبول ترین کتاب تعلیمی خطبات کا یہ ایڈیشن مزید اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا، اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ پانچواں ایڈیشن شائع ہوا ہے، یہ خطبے تعلیمی لحاظ سے

تو اچھے اور قابل مطالعہ ہیں ہی، ادبی لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہیں اور بقول مولانا عبدالماجد دریابادی "بڑی بات یہ ہے کہ ان میں مذہبی رنگ بھی اچھا خاصہ جا بجا ملتا ہے۔" قیمت تین روپے ۵، نئے پیسے

سیاسی و معاشی کتابیں

سیاسیات اور معاشیات پر بھی معیاری کتابیں بہت کم شائع ہوئی ہیں۔ ان دونوں موضوعات پر ہمیں صرف دو کتابیں تبصرہ کے لئے ملی ہیں۔

ہندوستان کا دستور اور اس کی مختصر شرح از پروفیسر ہارون خاں شروانی

یہ کتاب ہندوستان کے دستور کا ترجمہ ہے اور جہاں جہاں مترجم نے ضرورت محسوس کی ہے وضاحت کر دی ہے۔ فاضل مترجم تاریخ اور سیاسیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں، ان دونوں موضوعات پر اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھی اور ترجمے کئے ہیں۔ حکومتِ ہند نے دستور ہند کا ترجمہ کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائی تھی، موصوف بھی اس کے ایک ممبر تھے۔ اس لئے ان کا ترجمہ اور ان کے تشریحی نوٹ ظاہر ہے، دونوں معتبر اور مستند ہوں گے۔ حیدر آباد کے ترجمے عام طور پر مشکل اور اصطلاحوں کے ترجمے غیر مانوس ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ترجمے میں عام فہم زبان استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اصطلاحوں کے معاملے میں ہندی کی اصطلاحوں سے مدد لی گئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں انمل بے جوڑ ہو گیا ہے۔ مثلاً (ص۷۱) بعض اصطلاحوں میں ہندی فارسی کی قلم لگانے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً اپر ہاؤس کا ترجمہ اپری ایوان کیا گیا ہے، حالاں کہ یا تو اردو کی مروّج اصطلاح ایوان اعلیٰ کرنا چاہیے یا ہندی کی اصطلاح جو اب کافی رواج پا چکی ہے، راجیہ سبھا کرنا چاہیے تھا۔ بعض اصطلاحات کے وہ ترجمے کئے گئے ہیں، جو کسی اور کے کئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس کتاب میں پروسیجر کا ترجمہ ضابطہ کیا گیا ہے، حالانکہ "ضابطہ" اسٹیچوٹ کا کیا جاتا ہے۔ اس سے ممیز کرنے کے لئے "پروسیجر" کا ترجمہ طریق کار کیا جا سکتا تھا۔ بعض انگریزی کی اصطلاحیں اردو میں اس کثرت سے استعمال ہونے لگی ہیں کہ اب ان کے ترجمے کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً چیرمین کا ترجمہ میر مجلس یا ٹرسٹی کا ترجمہ امانت دار کیا گیا ہے۔ بہر نوع اس قسم کے اختلافات تو اس وقت تک موجود رہیں گے، جب تک چوٹی کے

ہیون کی یک جماعت تمام اہم اصطلاحات کا ترجمہ نہ کردے۔ کتاب بہرحال مفید اور قابل مطالعہ ہے۔
قیمت مجلد دس روپے۔ تلگو اردو اکیڈمی برائے سائنس و تاریخ حیدر آباد نے سے شائع کیا ہے۔

پاکستان کا معاشی پس منظر از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی

اس کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر سید ظہیر الدین احمد نے مصنفہ کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔
"سیدہ انیس فاطمہ بریلوی عرف عام میں ماہر معاشیات نہیں ہیں، مگر کافی پڑھی لکھی پرانی اہل قلم ہیں۔
.... وہ پاکستان کے غریب طبقہ کی زبوں حالی سے متاثر ہوکر معاشیات کے مسائل مہمہ پر قلبی سوز و
گداز سے لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کے دل میں سچا درد ہے، لہذا اسلام ہی کے بتائے ہوئے معاشی
نظام کے مطابق زر اور زمین کا صحیح صحیح استعمال اور ان کی مساویانہ تقسیم چاہتی ہیں" اور کتاب کے بارے
میں لکھا ہے کہ "یہ کتاب قیام پاکستان سے پہلے کے تاریخی پس منظر اور پاکستان بننے کے بعد ۱۹۴۷ء کی
اکتوبر ۱۹۵۸ء تک کے معاشی حالات کا ایک اچھوتا تاریخی ریکارڈ ہے"۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے
ملنے کا پتہ: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ سعید منزل ناظم آباد
بی روڈ۔ کراچی (پاکستان)

ادبی کتابیں

GLIMPSES OF URDU LITERATURE از پروفیسر این ایس گوریکر

یہ کتاب اگرچہ انگریزی میں ہے، مگر چونکہ اردو ادب سے متعلق ہے، اس لئے ہم نے اردو ادب کے اس
جائزے میں اسے شامل کر لیا ہے۔

پروفیسر گوریکر سینٹ زیویرس کالج بمبئی میں شعبۂ اردو اور شعبۂ اسلامی تہذیب کے صدر ہیں
اور تولئے وقت کے مصنف اور کاروانِ ادب کے مرتب ہیں، نیز کیفِ ادب، سرورِ ادب اور انتخاب
اُردو کے مرتبین میں سے ایک یہ بھی ہیں۔ پیش نظر کتاب موصوف کے چار لیکچروں کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۵۹ء
میں بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر دئے گئے تھے۔ ان لیکچروں میں بڑی خوبی کے ساتھ اردو ادب کا جائزہ لیا گیا
ہے، اختصار کے ساتھ اس پر تاریخی اور تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور آغاز سے آج تک کے مختلف

ادوار کی خصوصیات اور ان کے رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں مشہور جرنلسٹ ڈاکٹر رفیق زکریا کا ایک مبسوط اور فکر انگیز مقدمہ بھی شامل ہے۔ قیمت مجلد دس روپے ۔ ناشر : جیکب پبلشنگ ہاؤس ۱۲۵ مہاتما گاندھی روڈ ۔ بمبئی ۱

اردو زبان اور اسالیب (جلد اول) از سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی ۔

برصغیر ہند و پاک میں انگریزی کی تعلیم کی اشاعت اور مغربی ادب کے مطالعہ اور واقفیت سے خیالات میں گہرائی اور نظر میں وسعت پیدا ہوئی مگر عربی و فارسی پر زوال آنے اور انگریزی کے ذریعہ تعلیم ہونے سے اردو زبان کا معیار خاصا پست ہو گیا۔ تلفظ، تذکیر و تانیث اور محاورے کی غلطیاں جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں عام ہو گئیں۔ پیش نظر کتاب اسی خرابی کو دور کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے غلطیوں پر سخت محاسبہ کیا ہے اور صحت زبان پر بہت زور دیا ہے، مگر اتنا ہی جتنا ضروری ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "زبان کے سیاق میں صحت اور صحت پرستی دو باتیں ہیں ۔ صحت یا شُدھتائی کا پاس، زبان کو معزتوں سے بچانے اور پاکیزگی برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے، لیکن اس اصول کو اتنا لبے لوچ بے محل بے عمل نہ بنا دینا چاہیئے کہ بے مقصد ہو جائے اور دفع مضار کا تریاق، خود ہی سم قاتل بن کر رہ جائے ..... ہم اگر طرح طرح کی غیر فطری اور خود ساختہ بندشوں سے زبان کو، جدید خیالات، ترقی پسند عناصر اور معارف حیات کا ہم آہنگ نہ بننے دیں گے تو زبان معکوس ترقی کی راہ پر چلنے لگے گی، تنگ اور محدود ہو کر، بے مصرف و مفاد ہو کر رہ جائے گی۔" اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اس قابل ہے کہ نصاب تعلیم میں شامل کی جائے۔ قیمت مجلد نو روپے ۔ ناشر : اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ۔ کراچی ۔

ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ ۔ مولفہ : ڈاکٹر سیدہ جعفر

ماسٹر رام چندر انیسویں صدی کے نصف اول کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ہیں ۔ ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے اور اگست ۱۸۸۰ء میں انتقال کیا۔ ریاضی کے بہت بڑے عالم تھے، اُس دور کی صحافت میں ان کا ممتاز مقام ہے، اردو زبان کو عام فہم بنانے میں ان کی خدمات قابلِ تعریف ہیں اور بقول غلام یزدانی صاحب "دلی والے جہاں غالب، مومن، صہبائی اور مفتی صدرالدین پر فخر کرتے تھے، وہیں ماسٹر رام چندر کا نام بھی

بہت محبت اور احترام سے لیا جاتا ہے" مگر یہ افسوسناک بات تھی کہ اُردو میں ایسے خادم قوم اور محسن اُردو پر کوئی مستقل کتاب نہیں تھی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر شکریہ کی مستحق ہیں کہ زیر تبصرہ کتاب لکھ کر انھوں نے اردو دوستوں کا فرض کفایہ ادا کر دیا ہے۔ موصوفہ نے اس کتاب میں ماسٹر رامچندر کے حالاتِ زندگی اور ان کے علمی کارناموں کو بڑی چھان بین کے بعد لکھا ہے اور ان کے اہم مضامین کا انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ ماسٹر رام چندر کی علمی و ادبی صلاحیتوں اور ان کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مگر مولفہ کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ "مضمون نگاری کے ارتقار میں سرسید کے مضامین ایک توسیع ہیں، آغاز نہیں۔ ماسٹر رام چندر اُردو کے پہلے مضمون نگار ہیں، جنھوں نے شعوری طور پر اردو ادب میں اس صنف کی ابتدا کی"۔ (ص ۵۲) ہمارے نزدیک اس معاملہ میں اس کتاب کے مقدمہ نگار غلام یزدانی صاحب کی رائے زیادہ صحیح ہے کہ "ان کے مضامین کی زبان میں وہ ادبی شان و شوکت اور وہ سلاست اور روانی نہیں ہے جو سرسید یا ماسٹر رام چندر کے چند ہم عصر ادیبوں میں پائی جاتی ہے"۔ (معمولی تصرف کے بعد) اس لئے انھیں انشائیہ کا بانی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

یہ کتاب ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ خیرآباد۔ حیدرآباد ۲۹ سے خوبصورت ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔ اس پر سنہ طباعت ۱۹۶۰ء درج ہے، مگر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت غیر مجلد ساڑھے تین روپے۔

انشاء اللہ خاں انشاء — عہد اور فن از اسلم پرویز

اس کتاب میں انشاء کے سوانح حیات اور علمی کارناموں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب پر تنقید و تحقیق کے مضمون میں تفصیل سے تبصرہ کیا جا چکا ہے اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد چار روپے۔ ناشر: مکتبہ شاہراہ۔ دہلی ۶

دلّی کا دبستان شاعری مرتبہ: ظہیرالدین احمد صدیقی۔

دلّی کالج میگزین کا یہ خاص نمبر ہے جس کا موضوع "دلّی کا دبستان شاعری" ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ ایک شخصیات سے متعلق ہے، جس میں دلّی کے اساتذہ شعراء پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں "دلّی کے دبستان شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے اہم رجحانات و میلانات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جناب اڈیٹر نے اس خاص نمبر کے متعلق لکھا ہے کہ "بہت سے گوشے تشنہ رہ گئے ہیں، اگرچہ کچھ

بھی پیش کر رہے ہیں، وہ اس یقین کے ساتھ کہ قدر شناسانِ ادب کے لئے نایاب چیز ہوگی۔ قیمت پانچ روپے

ملنے کا پتہ: دلّی کالج دہلی۔

امراؤ جان ادا از مرزا محمد ہادی رسوا

امراؤ جان ادا اردو کے مقبول ترین ناولوں میں سے ہے اور اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیش نظر ایڈیشن مکتبہ شاہراہ سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا ہے، اس میں ڈاکٹر قمر رئیس کے قلم سے مصنف کا سوانحی خاکہ اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا ایک مبسوط مضمون شامل ہے، جس میں ناول کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے کتاب کی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس ایڈیشن کی ساڑھے پانچ روپے قیمت ہے۔ ایک عام ایڈیشن بھی شائع کیا گیا ہے جس میں یہ دونوں مضمون شامل نہیں ہیں۔ اس کی قیمت ساڑھے چار روپے ہے۔ ناشر مکتبہ شاہراہ۔ دہلی ۶

اُردو ڈرامہ مرتبہ: ڈاکٹر قمر رئیس

اردو میں ڈرامے کی طرف توجہ بہت کم ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے چند مطبوعہ ڈراموں کا یہ مختصر مجموعہ مرتب کرکے اردو ادب میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔ اس میں کل نو ڈرامے شامل ہیں، جن میں دو ترجمے ہیں اور سات طبع زاد۔ مرتب کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں موصوف نے ڈرامے کے فن پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اُردو ڈرامہ نگاروں کا جائزہ لیا ہے۔ جائزے کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے کہ "اس مختصر جائزے میں صرف ایسے ڈرامہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے، جن کی سنجیدہ کوششیں اُردو ڈرامہ کے نشو ونما اور ترقی میں معاون رہی ہیں اور جن کی تخلیقات سے اُردو ڈرامہ کا فنی معیار بلند ہوا ہے"۔ قیمت مجلد چار روپے۔ ناشر: سرسید بک ڈپو۔ علی گڑھ۔

حالی کی ایک جھلک از صالحہ عابد حسین

یہ ایک ۹۵ صفحے کا مختصر ڈراما ہے، جس میں بڑی خوبی کے ساتھ مولانا حالی کے علمی کارنامے اور ان کی شخصیت بیان کی گئی ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین چھوٹوں کے لئے بھی لکھتی ہیں اور بڑوں کے لئے بھی، وہ افسانے بھی لکھتی ہیں اور ڈرامے بھی، ناول بھی لکھتی ہیں اور سنجیدہ علمی وادبی مضامین بھی۔ اور جو کچھ لکھتی ہیں خوب لکھتی ہیں۔ یہ ڈراما بھی خوب ہے اور اپنی نوعیت کا شاید اکیلا۔ قیمت ڈیڑھ روپے ناشر: انجمن ترقی اردو علی گڑھ

حاجی بغلول مصنفہ: منشی سجاد حسین مرحوم

منشی سجاد حسین مرحوم مشہور مزاحیہ نگار ہیں اور حاجی بغلول اُردو کے بہترین مزاحیہ ناولوں میں ہے اور بقول رشید احمد صدیقی "حاجی بغلول اردو طنزیات وظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آتا۔" مگر اس کے پرانے ایڈیشن میں بہت سی خامیاں تھیں مثلاً کتابت میں صحیح اصول املا کو محفوظ نہیں رکھا گیا تھا کسی باب کا عنوان تھا کسی کا غائب۔ غرض اس قسم کے متعدد نقائص تھے، جنھیں اس کتاب کے مرتب جمیل جالبی صاحب نے اس ایڈیشن میں دور کر دیا ہے۔ اس میں مرتب کا ایک مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں موصوف نے اس ناول کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ قیمت مجلد ساڑھے چار روپے۔ ناشر: مشتاق بک ڈپو۔ شلڈن روڈ۔ کراچی ۱۔

پروفیسر بدھو ازفکر تونسوی

فکر تونسوی ایک خوش فکر طنزیہ اور مزاحیہ نگار ہیں۔ پیش نظر طنزیہ ناول میں خود اپنا تعارف کرایا ہے۔ اس میں ان کا اپنا انداز پوری طرح نمایاں ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ پہلے انھوں نے ڈرامے لکھے، پھر شاعری کی ان دونوں میں ناکام ہونے کے بعد طنز و مزاح کی طرف توجہ کی اور لوگ، خود فکر صاحب کے الفاظ میں ان کی "طنزیہ تحریروں پر لٹو ہونے لگے...... چنانچہ مقبولیت کی اس گہما گہمی میں مصنف نے سات آٹھ کتابیں لکھ ڈالیں، جو تمام و کمال طنز و مزاح کے گرد گھومتی ہیں۔" قیمت مجلد پونے چار روپے ناشر: مکتبہ شاہراہ دہلی ۶

اردوئے مصفّٰی (مولانا عبدالحق مرحوم کے خطوط کا مجموعہ)

کراچی میں مولانا عبدالحق صاحب بابائے اردو کی نوّے سالہ جوبلی منائی گئی تھی۔ اس موقع پر ایک جوبلی کمیٹی بنائی گئی تھی جس کے صدر بابائے اُردو کے دست راست سید ہاشمی فرید آبادی تھے۔ کمیٹی کی تحریک پر طے کیا گیا کہ اس موقع پر بابائے اُردو کے خطوط جمع کرکے شائع کئے جائیں۔ چنانچہ صدر کمیٹی کی کوششوں سے کافی خطوط جمع ہو گئے، جنھیں جلیل احمد قدوائی صاحب نے مرتب کیا اور حسب ضرورت ذیلی حواشی لکھے اور سید ابو نعیم صاحب فرید آبادی نے انھیں اُردوئے مصفّٰی کے نام سے شائع کیا ہے۔ بابائے اُردو کی زبان کی سادگی اور ان کے اسلوب کی دلکشی اور شگفتگی مسلم ہے اور اس کا بہترین اظہار خطوط میں ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ خطوط بابائے اردو کے طرز نگارش کے بہترین نمونے اور مواد کے لحاظ سے بھی کچھ خطوط تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ قیمت ساڑھے سات روپے۔ ناشر: سید ابو تمیم فرید آبادی، ۱۲۔ اردو بازار۔ لاہور۔

جگہ کم ہے، اس لئے اب صرف کتابوں کی فہرست ذیل میں درج کی جارہی ہے، ان پر تبصرہ کسی اگلی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

اقبالیات

اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ؛ اسرارِ رموز پر ایک نظر۔ از پروفیسر محمد عثمان

اقبال اور حیدر آباد از نظر حیدر آبادی ؛ حدیث اقبال از طیب عثمانی ندوی

نظم

رگِ جاں از خورشید الاسلام ؛ اردو غزل دلی تک۔ مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی

شکستِ شب از محسن بھوپالی ؛ نیرنگِ نظر۔ از روحی علی اصغر

نیرنگِ نظر پر دسمبر ۱۹۶۱ء کے جامعہ میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ ذیل کی دو کتابیں بھی ۱۹۶۱ء کی مطبوعات میں شامل ہیں اور ان پر بھی جامعہ میں (اکتوبر ۱۹۶۱ء) تبصرہ ہو چکا ہے۔

تذکرۂ جگر از محمود علی خاں ؛ جگر ۔۔ فن اور شخصیت از شارب ردولوی۔

(بقیہ صفحہ ۹۱)

اکتوبر: سید علی اصغر بلگرامی۔ ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ممتاز مورخ اور ماہر آثار قدیمہ تھے۔ آپ سنسکرت اور پالی کے بھی ماہر تھے۔ آپ نے حسب ذیل کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۔ فلسفۂ ازدواج ۲۔ ساتر دکن ۳۔ سیاحت نامہ مصر ۴۔ فارسی بلگرام۔ ۵۔ حدیقۃ السلاطین۔ ۶۔ Landmarks of Deccon. Landmaks of Aurangabad

۲ر دسمبر: ڈاکٹر سید محمد حفیظ آج سے کوئی ۶۰ سال قبل قصبہ نونہرہ ضلع غازی پور کے ایک شیعہ خاندان سادات میں پیدا ہوئے اصل نام کے بجائے ایم ایچ سید کے نام سے مشہور تھے۔ کوئی پندرہ سولہ سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دینے کے بعد ریٹائر ہو کر الہ آباد میں مستقل قیام کر لیا۔ کلیات معری (دکنی) کو ایڈٹ کیا اور ایک کتاب گوتم بدھ پر اور ایک ٹمیر پر لکھی۔ اردو سے زیادہ انگریزی میں لکھتے تھے۔ ۲۱ر دسمبر ۶۱ء کو دل کا دورہ پڑا اور داعی اجل کو لبیک کہا۔

کچھ سالنامہ کے متعلق

رسالہ جامعہ کا سالنامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگر آپ آج کل کے ضخیم سالناموں اور خاص نمبروں کے معیار پر اس کو جانچیں گے، تو آپ کو مایوسی ہوگی، لیکن اگر اس کے مضامین کے معیار، موضوعات کی اہمیت اور اس کے افادی پہلو پر نظر ڈالیں گے، تو امید ہے کہ بڑی حد تک پسند آئے گا۔ آج کل اعداد و شمار کا زمانہ ہے کسی چیز کا صحیح اندازہ کرنا یا جائزہ لینا ہو تو پہلے اس کی تعداد معلوم کی جاتی ہے، اس لئے ہم نے سب سے پہلے پچھلے سال کی تمام مطبوعات کے متعلق معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی، مختلف رسالوں میں اعلانات شائع کئے اور متعدد ناشروں کو خطوط لکھے۔ ہم نے جن ادیبوں سے مضامین لکھنے کی درخواست کی تھی انھوں نے بھی اپنے طور پر اپنے اپنے موضوع سے متعلق کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے باوجود اگر اس سالنامہ میں کوئی اہم کتاب تبصرہ سے رہ گئی ہو تو اس میں ہماری کوتاہی کو کوئی دخل نہیں ہے۔

اس موقع پر جہاں ہمیں شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ اردو کے ناشر اپنی مطبوعات کی نشر و اشاعت کے لئے جدید طریقے اختیار نہیں کرتے، وہاں اس تکلیف دہ حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ بڑے سے بڑے تعلیمی اداروں میں اردو کی تمام اہم کتابوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہم نے جن ادیبوں سے مضمون لکھنے کی درخواست کی تھی، ان میں سے ہر ایک بلا استثنا کسی نہ کسی بڑے ادارے سے وابستہ ہے مگر ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے کتابوں کو حاصل کرنے میں غیر معمولی کوشش اور محنت نہ کرنی پڑی ہو، اگر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے کتب خانوں میں بھی ہر سال کی تمام اہم مطبوعات اور نئے اڈیشن موجود نہ ہوں گے تو پھر کس سے توقع کی جا سکتی ہے اور کتابیں لکھی اور شائع کی جائیں گی تو کس امید پر؟!

ہم نے پچھلے شمارہ میں جن مضامین کا اعلان کیا تھا، ان میں سے تین مضمون ——— علمی و مذہبی کتابیں، تعلیمی کتابیں اور ڈرامے ——— سالنامہ میں شامل نہیں ہیں۔ تیسرا مضمون باوجود متعدد وعدوں کے موصول نہیں ہوا اور پہلے دو مضمون اس لئے لکھے نہ جا سکے کہ آخر وقت تک ان کے لئے مناسب تعداد میں کتابیں نہ مل سکیں۔ اردو میں تعلیم کے موضوع پر کتابوں کی کمی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے

کہ پچھلے سال ہندوستان و پاکستان میں صرف ایک ہی کتاب شائع ہوئی ہے۔

ہم نے صرف ۱۹۶۱ء کی مطبوعات کا جائزہ شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ لیکن تین مضامین میں پچھلے دو برسوں کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں یہ نقص پیدا ہوا ہے کہ تمام مضامین میں یکسانیت باقی نہیں رہی، وہاں یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ بعض اصناف ادب کا جائزہ زیادہ وسیع ہو گیا ہے اور معلومات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستانی ادیبوں کو پاکستان کی تمام کتابوں کا نہ تو علم ہوتا ہے اور نہ وہ آسانی سے یہاں ملتی ہیں اس لئے ان پر ایک مستقل مضمون لکھوایا گیا ہے۔ ظاہر ہے ایک مضمون میں جائزہ کا پورا حق ادا نہیں کیا جا سکتا تھا، مگر ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے اپنا مضمون اس خوبی سے لکھا ہے کہ اس کی روشنی میں وہاں کی رفتار ادب کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مضمون نگاروں نے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھا ہے اور اپنے اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

ارادہ تھا کہ اس سالنامہ میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان کا جائزہ لینے کے لئے ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو تکلیف دی جائے۔ لیکن شیخ الجامعہ کے عہدہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ اس زمانہ میں بے حد مصروف رہے، اس کے علاوہ سوائے ایک کے بقیہ کوئی مضمون ہمارے اپنے پروگرام کے مطابق وقت پر موصول نہیں ہوا۔ افسوس ہے کہ اس کی وجہ سے یہ سالنامہ ڈاکٹر صاحب کے مفید تبصرہ سے محروم رہا۔

آخر میں ادارے کی طرف سے تمام مضمون نگاروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ انھوں نے کن مشکل حالات میں مضمون لکھے ہیں۔ اور اپنے جائزہ کو مکمل کرنے کے لئے ایک ایک کتاب کی تلاش میں کس قدر وقت اور محنت صرف کی ہے۔ انھوں نے یہ سب کچھ محض جامعہ اور اردو ادب کی خاطر کیا ہے۔ ان کے اس خلوص بے پایاں کا شکریہ ادا کرنے سے زبان قلم قاصر ہے۔

عبد اللطیف اعظمی

۲۴ جنوری ۱۹۶۲ء

Printer & Publisher . A L Azmi
Printed at · Union Printing Press Delhi-6.
Only cover printed at : Dayals' Printing Press, Delhi-6.

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھے روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶ || بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء || شمارہ ۵

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ
رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

مغربی دُنیا پر ایک نظر

(۱)

پروفیسر محمد مجیب

آج کل یورپ اور امریکہ کا سفر کرنا ایک معمولی سی بات ہے، اور ایسے سفر کے حالات بیان کرنا جانی بوجھی باتوں کو خواہ مخواہ دہرانا ہے۔ مگر جو لوگ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں انھیں بھی ہر دفعہ یورپ یا امریکہ پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ایک تصور اور ایک نظام سے نکل کر کسی دوسرے ماحول میں آگئے ہیں۔ تبدیلی کے اثر کو زائل رہنے کے لئے وہ سوس، جرمن، فرانسیسی، انگریز، امریکن کا ایک نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیتے ہیں، اور اس طرح جو کچھ پیش آتا ہے وہ خود بخود دماغ کے مقررخانے میں داخل ہو جاتا ہے۔ نقشہ قائم کرنے میں کوئی خوش فہمی سے کام لیتا ہے، اور جہاں جاتا ہے اسے تعریف کے قابل طریقے اور آدمی ملتے ہیں، کوئی تعریف کے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اعتراض اور شکایت کے موقعے نکالتا ہے اور اسے یہ ملتے رہتے ہیں۔ تعریف زیادہ تر انتظامات کی خوبی اور زندگی کی سہولتوں کی ہوتی ہے، اعتراض انھیں انتظامات اور سہولتوں کی روح، یعنی دولت اور لالچ پر کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی تعریف اور اعتراض اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ ہم ایسے نظام کی جانچ کرتے ہیں جسے دوسروں نے بنایا ہے، اور وہ اسے اپنی بنائی ہوئی چیز سمجھ کر دیکھتے ہیں، اور اس میں کسی وجہ سے رکاوٹیں یا دشواریاں پیدا ہوں تو اس میں انھیں اپنی حق تلفی محسوس ہوتی ہے، اور انھیں اسی طرح کا غصہ آتا ہے جیسے اپنی گھڑی کے غلط وقت دینے یا رک جانے پر، موٹر کے خواہ مخواہ بگڑ جانے پر۔ میں ایک مرتبہ جرمنی میں سفر کر رہا تھا۔ اتفاق سے گاڑی بہت لیٹ ہوگئی۔ ایک جنکشن پر لوگوں نے کنڈکٹر کو گھیر لیا اور اس طرح لعنت ملامت کرنے لگے کہ گویا اس نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ مغربی دنیا کا سارا نظام اس مفروضے پر چلتا ہے کہ سب اس کو قائم اور جاری رکھنے میں شریک ہیں، اور کوئی رکاوٹ پیدا ہو تو ایسا اثر ہوتا ہے جیسے کسی بدعہدی کا۔ یہ نظام بنیادی طور پر صنعت اور تجارت کے ذریعے نفع اندوزی کی مسلسل جد و جہد کا نتیجہ ہے لیکن نفع اندوزی کا ایک طریقہ دوسرے طریقوں کے لئے راہ نکالتا ہے اور چاہے یہ ثابت کیا جا سکے کہ ان طریقوں کو

اختیار کرنے میں نیت محض نفع حاصل کرنے کی تھی، مجموعی طور پر ان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہزار قسم کی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ نفع حاصل کرنے والوں میں برابر مقابلہ رہتا ہے، اور کامیاب وہ ہوتا ہے جو خریدار کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ خریدار چاہے اپنی ضرورت یا خواہش کی وجہ سے مجبور ہو، لیکن اسے محسوس یہ کرایا جاتا ہے کہ مال خریدنے یا کسی سہولت سے فائدہ اٹھانے میں وہ دوسروں پر احسان کر رہا ہے۔ اس کا دوسرا اور مضر پہلو یہ ہے کہ اشتہار کی بہت بیجا اہمیت ہو گئی ہے۔ شہروں کو روشن اور رنگین اشتہاروں سے اس طرح سجایا جاتا ہے کہ گویا زندگی اور کاروبار کی آبرو اسی میں ہے، اخباروں اور رسالوں کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذریعے اشتہار دیے جا سکیں۔ یورپ میں یہ عیب بہت نمایاں ہے۔ متحدہ ریاستوں میں یہ ایک ذہنی بیماری کی حد تک پہنچ گیا ہے۔ میں نے ایک امریکن خاتون سے کہا کہ آپ کے یہاں بیشتر مصور رسالوں میں مضامین اشتہاروں کی پشت پر چھاپے جاتے ہیں۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئیں اور کچھ دنوں بعد مجھے نفسیات کے مشہور عالم ڈاکٹر ٹینگ کا ایک مضمون کسی رسالے سے کاٹ کر بھیجا جو انھیں پسند آیا تھا، اور اسی کے ساتھ یہ معذرت بھی کی کہ یہ اشتہاروں کی پشت پر چھپا ہے۔ اشتہار دینے اور مال بیچنے کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ اس کے لیے ہر بات جائز سمجھی جاتی ہے، لوگوں کو اشتہاری تصویریں دکھایئے اور پوچھیے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی قاعدے اور اصول کے مطابق اخلاقی تربیت ہو سکتی ہے یا نہیں تو وہ فوراً کہہ دیں گے کہ نہیں ہو سکتی، یہ بھی کہہ دیں گے کہ یہ اشتہار واقعی بہت نقصان پہنچاتے ہیں، مگر اصلاح کی کوئی تدبیر ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سرمایہ داری اور کھلا مقابلہ معاشی زندگی، آزادی اور جمہوریت کی بنیاد ہوں تو وہ اپنے تحفظ کی صورتیں پیدا کر لیتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نامناسب اشتہاری تصویروں کی ممانعت کرنا آزادی اور جمہوریت کا گلا گھونٹنا ہے۔

یورپ میں سرمایہ داری اور صنعت کی وجہ سے بہت ترقی ہوئی ہے، مگر آبادی اتنی کم اور خام اور صنعتی مال کی پیداوار اتنی افراط سے نہ تھی کہ اسراف کو ایک معاشی قدر کی حیثیت دینا ضروری ہو جائے۔ امریکہ میں آبادی کی کمی، قدرتی اور صنعتی پیداوار کی فراوانی اور زندگی کے معیار کو "اونچا" کرنے کی مسلسل جدوجہد نے ایسا کچھ کر دیا ہے کہ ہر طرح کا مال ضائع نہ کیا جائے تو معاشی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ کفایت شعاری کی تعلیم دینا گویا نصیحت کرنا ہے کہ کھانا اس طرح کھاؤ کہ نوالہ حلق میں پھنس جائے۔ کاغذ کی

.. رون قسمیں ہیں اور اس سے ہزاروں کام لئے جاتے ہیں، اس کی خاص قدر اس وجہ سے ہے کہ استعمال کے
بعد سے سب سے زیادہ آسانی سے پھینکا اور جلایا جا سکتا ہے جسے لکھنے کی عادت ہو، اور وہ بھی ہندوستانی کاغذ
پر، اسے بڑی الجھن ہو سکتی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز میں مجھے بہت سا کاغذ لکھنے کے لئے دیا گیا
پہلے تو اس بات سے وحشت ہوئی کہ اتنا اچھا کاغذ محض مشق کے لئے استعمال کیا جائے، پھر جب طبیعت
پر جبر کر کے لکھنا شروع کیا تو دیکھا کہ کھردری سطح پر چلنے کا عادی قلم چکنے کاغذ پر پھسلتا ہے، اور روشنائی بہہ کر
اپنی عاجزی ظاہر کرتا ہے۔ پھر بھی کوشش جاری رکھی۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ٹائپسٹ کو عبارت
پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ میں نے اپنی لکھائی کو ملزم ٹھہرایا، اور حرفوں کی نوک پلک کی طرف توجہ
کرنے لگا۔ ایسی لکھائی کاغذ نے گوارا نہیں کی۔ پھر میں نے سستے، خراب، بلکہ خراب سے خراب کاغذ
کی فرمائش کی، اس امید میں کہ غریب کا غذ غریب کے قلم کی سنگت کو پسند کرے گا، انسٹی ٹیوٹ کی منتظمہ
دفتر مسز ڈونسکالنے الماری کھول دی اور کہا کہ جو کاغذ پسند ہو لے لیجئے۔ میں نے ایک زرد رنگ کا نسبتاً
ہلکا کاغذ پسند کیا، مگر اس میں بھی وہ آن بان تھی کہ میرا قلم اس سے مانوس نہ ہو سکا۔ دریافت کرنے
پر معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کی کتابوں کی دکان میں سستا کاغذ ملتا ہے، وہاں گیا اور سب سے سستا
کاغذ خرید لایا، اس سے بھی کام نہ بنا۔ آخر میں نے خشک روشنائی کا سستا سا قلم لے کر حرفوں کی
صحیح اور اچھی شکل کا خیال کئے بغیر لکھنے کی عادت ڈالی، کاغذ زیادہ صرف میں آیا، مگر جتنی ناپسند مجھے اپنی
لکھی ہوئی عبارت تھی اتنی ہی وہ ٹائپسٹ کے لئے پڑھنے میں آسان ہو گئی۔ کاغذ کے بیجا صرف
میں مجھے اس وجہ سے بھی تامل ہوتا تھا کہ میونخ میں میرا کوریا کے ایک طالب علم سے تعارف کرایا گیا تھا
جو اتنا غریب تھا کہ ادھر اُدھر سے ردی کاغذ جمع کر کے اپنا کام چلاتا تھا۔ یہ طالب علم ایک اور موقع
پر بھی بہت یاد آیا۔ میں نے ایک بڑی دوکان سے اوورکوٹ خریدا، اور دوکاندار سے کہا کہ اسے
میرے پتہ پر بھجوا دے۔ دوسرے دن شام کو کمرہ پر آیا تو دیکھا کہ ایک لمبا چوڑا دفتی کا بکس رکھا ہے
اسے کھولا تو ململی کاغذ کی ایک موٹی تہ نظر آئی۔ اسے ہٹایا تو اوورکوٹ نکلا۔ اوورکوٹ کو اٹھایا تو اس
کے نیچے بھی ململی کاغذ کا ایک بستر تھا۔ یہ ململی کاغذ ایسا نفیس تھا کہ میں اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک نہ سکا۔
اور میں نے اسے بہت احتیاط سے میز کے خانے میں رکھ لیا۔ مگر سوائے اس کے کہ میں اسے کوریا کے

طالب علم کے لئے بچا کر رکھتا اور واپسی پر میونخ میں اسے دے دیتا کاغذ کا اور کوئی مصرف سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خانے میں رکھا رہا۔ آخر میں اسباب باندھتے وقت اس کے لئے جگہ نہیں نکلی، اور اسے میں میز کے خانے میں ایسے شخص کے لئے چھوڑ آیا جو اسے اس کی منزلِ مقصود، یعنی ردی کی ٹوکری تک پہنچانے کا دل گردہ رکھتا ہو۔

آپ بیتی کی ان چھوٹی موٹی مثالوں سے اس کا ہرگز اندازہ نہیں ہوسکتا کہ امریکہ میں کاغذ کس مقدار میں ضائع ہوتا ہے۔ اور کاغذ بھی صرف ایک مثال ہی ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں اس سے بھی زیادہ ضائع ہوتی ہیں۔ کئی لوگوں نے حساب لگایا ہے کہ صرف نیویارک شہر میں جتنا کھانا پھینک دیا جاتا ہے اس سے دنیا کے کتنے بھوکے پیٹ بھرے جا سکتے ہیں۔ لکڑی، لوہے، پٹرول کا خرچ بے پناہ ہے۔ امریکہ کی خوش حالی موٹروں کی تعداد سے ظاہر کی جاتی ہے۔ میں وہاں کے ایک بہت چھوٹے شہر منسی میں کوئی دو ہفتہ رہا۔ اس کی آبادی پچھتر ہزار ہے اور موٹروں کی تعداد پچیس ہزار۔ لوگ قریب کے مکانوں میں ملاقات کے لئے موٹروں پر جاتے ہیں، پارکنگ کا مسئلہ اتنا اہم ہوگیا ہے کہ شہر کے باہر کی وہ دوکانیں پسند کی جاتی ہیں جس کے ساتھ موٹر کھڑے کرنے کے لئے جگہ ہوتی ہے، شہر میں ایسی جگہ کبھی کبھی اتنی دور ملتی ہے کہ موٹر پر جتنا فاصلہ طے کیا جاتا ہے اس سے زیادہ پیدل طے کرنا ہوتا ہے۔ اس دستور کا کہ ہر شخص کے پاس موٹر ہو اور عادتاً موٹر کی سواری کی جائے ایک یہ نتیجہ نکلا ہے کہ لوگ پیدل چلنے کو معمول کے خلاف سمجھتے ہیں۔ منسی میں ایک مرتبہ میں اپنے میزبان کے ساتھ خط ڈاک میں ڈالنے گیا۔ مطلب یہ تھا کہ اس بہانے کچھ سیر بھی ہو جائے۔ خط ڈالنے کے بعد ہم دونوں واپس آ رہے تھے کہ ایک پولیس والے نے اپنی گاڑی روک کر ہم سے پوچھا کہ آپ کی موٹر کو کچھ ہو تو نہیں گیا ہے۔ میرے میزبان اور ان کی بیوی کے لئے شہر میں پیدل چلنا ایک انوکھی بات تھی، اور میرے اصرار سے ٹہلنے کے لئے جانے کا ان کے ہاضمے پر جو خوشگوار اثر پڑا اسے انھوں نے میرا ایک احسان سمجھا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ چل نہیں سکتے تھے، یا امریکہ میں عام طور پر لوگ چل نہیں سکتے۔ وہاں لوگوں کو چلنے پھرنے کا بہت شوق ہے، صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں، مگر روزمرہ کا ٹہلنا یا گھر سے دفتر تک پیدل جانا، چاہے دفتر قریب ہی ہو، کسی شوق کو پورا کرنے یا صحت کو قائم رکھنے کا ذریعہ نہیں مانا جاتا۔

شہروں میں آمدورفت کے قاعدے یہ سمجھ کر بنائے گئے ہیں کہ ہر شہری کے پاس موٹر ہوگا۔ بے چارے پیدل چلنے والوں کو چوراہوں پر سڑک پار کرنے کا موقع اس وقت ملتا ہے جب ایک سمت سے آنے جانے والے موٹروں کو اس لئے روکا جاتا ہے کہ مقابل کی سمت والوں کو چوراہے سے گذرنے کا موقع ملے، جہاں موٹروں کی آمدورفت میں آسانی پیدا کرنے کے لئے وَن وے ٹریفک کا قاعدہ ہے وہاں موٹروں کا سیلاب مسلسل بہتا رہتا ہے، اور پیدل چلنے والا کھڑا انتظار کرتا رہتا ہے جب تک کہ یہ سیلاب نہ تھمے۔ مجھے روزانہ ایک ایسی ہی سڑک کو پار کرنا ہوتا تھا، اور روز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس بال بال بچا۔

یورپ اور امریکہ کی تہذیب پر کاروبار کی مصلحتیں اور ضرورتیں حاوی ہیں، اور ان سے یا تو اتنا فائدہ پہنچتا ہے یا ان کی پشت پر ایسی طاقتیں ہوتی ہیں کہ ان کے مقابلے پر دوسری مصلحتوں کو پیش کرنا بیکار ہوتا ہے۔ اسّی بچاسی منزلوں کی عمارتیں بنانے کا رواج غالباً نیویارک سے شروع ہوا، اور کاروباری مقابلے نے ان کی بلندی کو سو منزلوں سے بھی اوپر پہنچا دیا، لیکن اس کے بعد اس قسم کی عمارتیں ان شہروں میں بھی بننے لگیں جہاں زمین کی اتنی کمی نہیں تھی کہ شہر پھیل کر آباد نہ ہو سکیں، یہاں تک کہ لندن میں بھی ایوان پارلیمنٹ اور بگ بن کو نیچا دکھانے کے لئے ایسی ہی ایک عمارت بن گئی ہے۔ یورپ اور امریکہ کا نظام زندگی ایک مدت سے وہاں کے انسانوں کے ذہن پر حاوی ہے اور اس کی حکومت میں مطلق العنانی کی وہی کیفیت ہے جو فرعون، سکندر اور دارا کی فرمانروائی میں تھی ہر شخص کے لئے سلامتی اسی میں ہے کہ قاعدے پر عمل کرے۔ قاعدے کی خلاف ورزی کرنے والے کے ساتھ ہر طرح کا سلوک ہو سکتا ہے۔ اگر اس سے کسی شخص کو نقصان پہنچا ہو تو وہ فوراً اعتراض کرتا ہے، اگر صرف پبلک قاعدہ کو توڑا جائے، مثلاً پارک میں کوئی پھول توڑے تو پارک کے نگراں ہی نہیں بلکہ راستہ چلتے لوگ ٹوک سکتے ہیں، جرمنی میں طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ میں گھاس پر، جو سڑک کے دونوں طرف لگی ہوئی تھی کھڑا ہو گیا۔ ایک آدمی نے مجھے ڈانٹ کر وہاں سے ہٹایا، اور ایک نوٹس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ گھاس پر کھڑے ہونے کی ممانعت ہے۔ اگر نقصان قاعدہ کی خلاف ورزی کرنے والے ہی کو پہنچ رہا ہو تو اس سے شاذ و نادر کسی کو ہمدردی ہوتی ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو خاص ایسی صورتوں کے لئے مقرر ہوں۔ ہندوستان آتے ہوئے پیرس

میں اترا تو پاسپورٹوں کی جانچ کرنے والے نے مجھے روک لیا، اور ایک طرف کھڑے ہو جانے کو کہا۔ میرے سامنے سے لوگ گذرتے رہے اور کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ پاسپورٹ آفیسر اپنے کام میں لگا رہا اور میری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس طرح میں آدھے گھنٹے کے قریب کھڑا رہا۔ آخر میں ایک عورت کو جس کے سپرد یہ کام تھا کہ ہر ہوائی جہاز کے مسافروں کو گن کر دیکھے کہ جتنے جہاز سے اترے تھے اتنے شہر جانے کی بس پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے اپنی فہرست میں ایسے مسافر کا نام ملا جو جہاز سے اترا تھا مگر بس پر سوار نہیں ہوا تھا۔ تلاش کرتے کرتے وہ میرے پاس پہنچی، اور پاسپورٹ آفیسر سے میرے روکے جانے کی وجہ دریافت کی۔ معلوم ہوا کہ میں نے ویزا نہیں لیا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ پیرس میں کتنے دن ٹھہروگے، اور جب میں نے یقین دلایا کہ تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہروں گا تو اس نے ایک طرف میونخ کے جہاز میں میری سیٹ ریزرو کرادی اور دوسری طرف ویزا دلوا دیا۔ ایسے واقعات بہت سے لوگوں کے ساتھ پیش آتے ہیں، اور مغربی نظام زندگی کی یہ بڑی تعریف کی بات مانی جاتی ہے کہ اگر قاعدوں سے واقف ہونا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے تو غلطی کرنے والوں کو راہ راست پر لانے کا انتظام بھی ہے۔

لیکن اس نظام میں جو اپنے بل بوتے سے اپنے قاعدوں کے مطابق چلتا ہے افراد کی تسکین کا سامان بہت کم ہے، اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ نظام ان کی ضرورتوں کو اس حد تک پورا کر دیتا ہے جہاں تک وہ اس کی قیمت ادا کر سکتے ہیں، باقی جو کچھ ہے اس سے اس نظام کو مطلب نہیں۔ اس کی لوازمات افراد کو ایک دوسرے سے متعلق کر دیتی ہیں، کارخانوں میں مختلف قسم اور درجے کے مزدور، نگراں اور منتظم ہوتے ہیں، سب کو قابلیت اور کام کی نوعیت کے مطابق معاوضہ ملتا ہے، لیکن سب کا معاملہ الگ، رائج قاعدوں کے مطابق ہوتا ہے، مدرسوں اور کالجوں میں استاد رکھے جاتے ہیں جو اپنے انفرادی اور مشترک کام شوق اور خوبی سے انجام دیتے ہیں، کچھ لوگوں میں دوستی ہو جاتی ہے، جن میں دوستی نہیں ہوتی وہ بھی ہنسی خوشی کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں، مگر یہ سب جانتے ہیں کہ ان کی اجتماعی زندگی کا اصول انفرادی آزادی ہے اور ہر ایک کو اس آزادی کا بوجھ اٹھا سکنا چاہیئے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر صحیح اور اچھی ہیں، ان پر عمل کرنے سے بہت اچھے نتیجے نکلے ہیں، مگر جس میں جتنا زیادہ حسن ہو

اتنا ہی وہ اپنی بے پناہ تنہائی کو محسوس کرتا ہے۔

ہجوم اور ہنگاموں میں افراد کو تنہائی کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ مجھے اس سفر میں خاص طور پر نظر آئی، اس لئے کہ اس مرتبہ ایک محدود حلقے میں کافی عرصہ تک رہنے کا موقع ملا۔ میرا قیام شام کے سات بجے سے صبح نو بجے تک ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رہتا تھا۔ وہاں ایک روز کھانے کے وقت ایک پچاس پچپن برس کی خاتون میرے سامنے آکر بیٹھ گئیں، کہا کہ میں آپ کی شکل اور لہجے سے سمجھ گئی کہ آپ ہندوستانی ہیں، میرے شوہر کراچی میں پیدا ہوئے تھے اور اس نسبت سے مجھے ہندوستان سے بڑی دلچسپی ہے، میں نے جواب دیا کہ میں شکل سے یہودی یا اٹلی یا جنوبی امریکہ کا باشندہ سمجھا جاتا ہوں اور میرے لہجے میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے میں خالص انگریز نہ مانا جاؤں۔ اس طرح اختلاف کا سلسلہ شروع ہوا جس کی شدت کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑی بی کی بے تکلفی بڑھتی رہی۔ کچھ مذہب کی بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ آپ عیسائی مذہب کے بارے میں کیا جانیں، آپ تو گمراہ ہیں، پھر ایک مرتبہ گویا بھولے سے انھوں نے کہہ دیا کہ آپ بڑے بیوقوف ہیں۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ مجھے ایسے مذاق پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو انھوں نے اپنا سارا حال سنایا، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایک مدت سے ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جس سے وہ کہہ سکیں کہ تم بڑے بیوقوف ہو اور میں بھی بڑی بیوقوف ہوں۔ وہ ایک بینک میں اچھے عہدے پر ملازم تھیں۔ ان کا جوان لڑکا دینیات کے ایک مدرسے میں تعلیم پا رہا تھا، ان کے ملاقاتیوں کی تعداد خاصی تھی، مگر ایسا کوئی نہ تھا جو فی سبیل اللہ ان کی الٹی سیدھی باتیں سنتے انھیں تنہائی کے احساس کو دور کرنے کا موقع دے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ایک استاد سے بھی میرے ایسے ہی تعلقات ہو گئے، انھوں نے بھی فی سبیل اللہ مجھے اپنی زندگی کے سارے حالات سنائے اور ایک مرتبہ یہ بھی بتا دیا کہ ان کے والد کے کسی خاتون سے تعلقات تھے۔ اور اس بنا پر کہ باپ کو بیٹے سے کچھ چھپانا نہ چاہیئے ان کے والد نے ان خاتون سے ان کی ملاقات کرائی۔ ایک اور استاد نے جن کی بیوی انھیں چھوڑ کر چلی گئی تھیں اس علیحدگی کی وجہ تفصیل سے سمجھائی۔ امریکہ میں جو میاں بیوی میرے میزبان تھے وہ بھی اپنی اپنی جگہ تنہائی میں مبتلا تھے۔ دونوں خوش مزاج تھے دونوں کو اچھی تنخواہیں مل رہی تھیں، بظاہر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے، زندگی سے اور دنیا سے

خوش نہ ہوں۔ بیوی کو شکایت تھی کہ ان کے ماں باپ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور علمی گفتگو نہیں کر سکتے، شوہر کہتے تھے کہ ان کے بھائی بہنوں کو علم اور تعلیم سے کوئی شوق اور کوئی مناسبت نہیں ہے۔ مگر اس کا اثر یہ نہیں ہوا تھا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے اور قریب آجائیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا انھیں اپنے کام کی وجہ سے ایک دوسرے سے بات کرنے اور دوسرے کو خوش رکھنے کی مہلت ہی نہیں۔ جامعہ میں لوگوں کی شکایتیں سنتے سنتے شاید میری صورت کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ بعض اجنبی بھی مجھے دیکھ کر میرے خاص منصب کو تاڑ جاتے ہیں، بہر حال مجھے کسی کے ذاتی معاملات سے مطلب نہیں تھا، نہ انھیں معلوم کرنے کی خواہش تھی۔ میرے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس سے اس علمی تحقیق کی تصدیق ہوتی ہے کہ مغربی تہذیب کے حالات اور آداب نے انسان کو بالکل تنہا کر دیا ہے، اور جس کسی کے انداز سے ظاہر ہو کہ وہ توجہ اور ہمدردی سے سننے پر تیار ہے اسے تنہائی کی ہزاروں شکایتیں سننے کو مل جائیں گی۔

(باقی آئندہ)

ساقیِ محفلِ صاحب نظراں
(ابوالکلامؒ کی یاد میں)

حضرت رَوش صدیقی

خامشی، تمکنتِ کوہِ گراں کی صورت
گفتگو، زمزمۂ جوئے رواں کی صورت
خلوتِ حسنِ یقیں تھی تری محفل کہ جہاں
نظر آتی ہی نہ تھی وہم و گماں کی صورت
ترے ایثار نے پھونکا ہے کچھ ایسا افسوں
زندگی بھول گئی سود و زیاں کی صورت
اِک نفس، معتکفِ منزلِ آرام و سکوں
اک نفس، قافلۂ دردِ نہاں کی صورت
اک نفس، مشعلہ افروزِ حریمِ دانش
اک نفس، شمعِ خراباتِ فغاں کی صورت
تونے اس طرح اٹھایا رخِ دوراں کا نقاب
بول اٹھی مُنہ سے بہار اور خزاں کی صورت
اک نظر تشنگیٔ صبحِ ازل کی تصویر
اک نظر سلسلۂ رطلِ گراں کی صورت

اک نظر شورشِ طوفانِ بغاوت کا پیام
اک نظر ناقدِ آئینِ جہاں کی صورت
پختگی، مدرسۂ حکمت خارا شکنی
نرمگی، کارگہِ شیشہ گراں کی صورت
سادگی، چشمِ غزالیں کے لئے آئینہ
برہمی، شعلۂ رخسارِ بتاں کی صورت
وہ صداقت کا جلال اور محبت کا جمال
چادرِ ابر میں خورشیدِ رواں کی صورت
ہمہ اسرارِ دل آرائی و دل باختگی
تجھ سے مانوس، دلِ ہم نفساں کی صورت
تیرے افکار کا آئینہ، وہ کردار ترا
لالہ و گل کے لئے جوئے رواں کی صورت
جیسے اک معجزۂ جنبشِ لب یاد آئے
وہ دل آویز، ترے حسنِ بیاں کی صورت
خود بہ خود لوحِ تخیل پہ ابھر آتی ہے
ساقیٔ محفلِ صاحب نظراں کی صورت

دور میں جب مہ و خورشید کا جام آتا ہے
اہلِ محفل کی زباں پر ترا نام آتا ہے

ساحر لدھیانوی

۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء

ارسطو کے سیاسی افکار

جناب ضیاء الحسن فاروقی

ارسطو (۳۸۴-۳۲۲ ق م) کی عظمت اس کی زندگی کے نشیب و فراز میں نہیں بلکہ اس کے افکار و خیالات میں تلاش کی جاتی رہی ہے، تقریباً دو ہزار سال تک سائنس اور فلسفہ کی دنیا پر اس کا فکری اثر قائم رہا اور ذہنی ترقی کی راہ مسدود رہی، سترھویں صدی کے آغاز میں جب صدیوں کے بند سوتے پھوٹے اور انسانی ذہن نئی پہنائیوں کے لئے بے چین ہوا تو اُسے سب سے پہلے ارسطو کے اصولوں ہی سے برد آزما ہونا پڑا، عہد جدید کی غالباً تمام فکری ترقیاں اسی یونانی عالم کے کسی نہ کسی اصول کی تنقید کر شروع ہوتی ہیں اور اس میں اس کا کوئی قصور بھی نہیں تھا، قصور ان عالموں اور فلسفیوں کا تھا جنھوں نے اس طویل عرصے میں اس کے خیالات کی تنقید کا حوصلہ نہیں کیا۔

ارسطو کی زندگی ہنگامہ پرور زندگی نہیں تھی، اور نہ تو اس میں اخلاقی جرأت ہی تھی کہ جب اس پہ بد عقیدگی اور عدم تقویٰ کا الزام لگایا گیا تھا تو سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پینے کے لئے تیار ہو جاتا، سکندر اعظم کا وہ اتالیق ضرور رہا، مگر سکندر کی شخصیت عظمت اور کارناموں میں اس کی تعلیم و تربیت کا کوئی اثر نہیں ملتا، ہاں تعجب اس پر ہے کہ سکندر کا کوئی اثر ارسطو پر کیوں نہیں پڑا جسے اپنے شاگرد کی فتوحات سے یہ یقین ہو جانا چاہیئے تھا کہ اب شہری ریاستوں کا دور ختم ہو گیا تھا اور شہنشاہتیں قائم ہونے والی تھیں۔ ارسطو کے نزدیک شہری ریاستیں نمونے کی ریاستیں تھیں، اس کا خیال تھا کہ اعتدال بڑی برکت کی چیز ہے۔ اور کسی ریاست میں ایک لاکھ "شہری" سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں۔ اور یہ باتیں اس نے اس وقت کہیں جب سکندر مقدونی شہنشاہیت قائم کر رہا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ارسطو کا علم بہت وسیع، نظر بڑی نکتہ رس اور بصیرت اعلیٰ درجہ کی تھی، وہ ایک طبیب کا بیٹا تھا جو مقدونیہ کے بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھا، اپنے باپ کی نگرانی اور رہنمائی میں اس نے

طب کی تعلیم حاصل کی، دوسرے طبیبوں سے بھی اس نے استفادہ کیا، طب کے علاوہ اس نے دوسرے مروجہ علوم کی بھی تحصیل کی اور اس میں اُسے اپنے والد کی خوشحالی اور امارت سے بہت مدد ملی، اس لئے کہ باپ کی دولت سے وہ تعلیم سے متعلق تمام ضروری وسائل فراہم کرسکتا تھا۔ ۳۶۶ ق،م۔ میں جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ ایتھنز آیا اور افلاطون کی اکادمی میں داخل ہوگیا، یہ وہ زمانہ تھا جب یونانی فکر کا تخلیقی دور اپنی آخری منزلوں میں تھا اور اس کا جو کچھ بھرم قائم تھا وہ درحقیقت اسی اکادمی سے تھا۔ یہاں وہ تقریباً بیس سال رہا، افلاطون کی وفات کے بعد وہ ایتھنز سے چلا گیا اور مقدونیہ اور دوسرے مقامات پر چند سال گذارنے کے بعد وہ ۳۳۴ ق م میں پھر ایتھنز آیا اور فلسفہ کا اپنا اسکول لی سے اَم (Lyceum) قائم کرکے درس دینا شروع کیا، بارہ سال تک وہ یہاں علم کا چراغ جلاتا رہا، ۳۲۲ ق م میں ایتھنز میں سیاسی انقلاب ہوا اور جو پارٹی برسرِ اقتدار آئی وہ مقدونیہ اور مقدونیہ والوں کے خلاف تھی، اس پارٹی نے اُس پر بدعقیدگی کا الزام لگایا، اور وہ نتائج سے خوفزدہ ہوکر بھاگ نکلا اور اسی سال اُسی کی موت واقع ہوئی۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے، ارسطو کا علم بہت وسیع تھا اور اس کی شائدہ تحریریں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ ریاضی کے علاوہ علم کے تقریباً تمام گوشوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اس نے تھیاوجی مابعد الطبیعیات، علم الاخلاق، معاشیات، سیاسیات، جمالیات، طبیعیات اور عالم طبیعی کے ہر شعبہ سے متعلق اپنے خیالات پیش کئے اور اصولی بحثیں کیں، منطق کے علم کا تو وہ بانی تھا، خاص طور سے اس لحاظ کہ اس نے ان اصطلاحات کے مفہوم متعین کئے جن سے ہم آج بھی اصولی تفحص اور تجریدی تفکر میں کام لیتے ہیں، منطق کی دنیا اس زمانے میں بھی ارسطو سے بے نیاز نہیں ہوسکی ہے۔

اس مضمون میں ہم اس کے سیاسی افکار کا ایک جائزہ پیش کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہمارا موضوع بحث اس کی مشہور کتاب 'سیاسیات' ہے جس کے بارے میں کچھ مبصروں کا خیال ہے کہ یہ اس کا شاہکار ہے' یہ خیال صحیح ہے یا غلط، یہاں اس سے بحث نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی بنا پر ہم اُسے علم سیاسیات کا 'بادا آدم' کہہ سکتے ہیں۔

ارسطو کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ اس کے فلسفے کے سمجھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ افلاطون اور

اس کے طرزِ فکر کے بنیادی اختلاف کو سمجھا جائے، ایک حد تک یہ بات صحیح ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ارسطو کے خیالات میں "افلاطونیت" کا کوئی اثر نہیں، سخت غلطی ہوگی، تقریباً بیس سال تک وہ افلاطون کی اکادمی کا ممبر رہا، افلاطون سے اُس کے بہت قریبی تعلقات تھے، افلاطون اسے اپنے مکتب خیال کے ذہن سے تعبیر کرتا تھا، ایسی صورت میں وہ اپنے استاذ سے کتنا متاثر ہوا ہوگا، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس کے فلسفیانہ افکار میں "افلاطونیت" کے خد و خال اس حد تک نمایاں ہوئے ہیں کہ کسی بڑے فلسفی کے یہاں کسی دوسرے مفکر کے افکار کا اتنا اثر نہیں ملتا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ارسطو اپنے استاذ کے ہر اصول سے متفق بھی نہیں تھا، یہی نہیں بلکہ جہاں جہاں اُس نے اختلاف کیا ہے، اتنی شدت سے کیا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ دونوں مفکرین کا فکر ایک دوسرے کی ضد ہے۔

ارسطو نے اپنی کتاب "سیاسیات" سلسلہ وار نہیں لکھی، جرمن عالم یےگر کا خیال ہے کہ اس کی تصنیف کے دو دور ہیں، اس کا دوسرا، تیسرا، ساتواں اور آٹھواں حصہ اس وقت لکھا گیا جب ارسطو افلاطون کی وفات کے بعد اکادمی چھوڑ کر ایتھنز سے چلا گیا تھا، دوسرے اور تیسرے حصے میں اس نے عینی ریاست اور اس سے متعلق پچھلے نظریات سے بحث کی ہے، اور اس سلسلہ میں افلاطون کی عینیت پر تنقید بھی کی ہے یہیں اس نے ریاست اور شہریت کی ماہیت کی بحث بھی چھیڑی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کے بعد وہ عینی ریاست سے متعلق اپنے خیالات پیش کرنا چاہتا ہے۔ ساتواں اور آٹھواں حصہ عینی ریاست کی تشکیل اور اس کے امکانات کے بارے میں ہے، چوتھا، پانچواں اور چھٹا حصہ جو یےگر کے خیال میں لیسی ام کے قیام کے بعد کی تصنیف ہیں، عینی ریاست کے تصورات سے خالی ہیں اور ان میں اس نے موجودہ ریاستوں اور ان کی مختلف شکلوں کی داستان بیان کی ہے اور ان کے انحطاط اور زوال کے اسباب اور دستور اور ریاست کے استحکام کے ضروری لوازمات کا قصہ چھیڑ دیا ہے، پہلا حصہ سب سے آخر میں لکھا گیا اور یہ ایک طرح سے پوری کتاب کی تمہید ہے۔ یےگر کا خیال ہے کہ اگر بعد میں کتاب پر نظرثانی کی گئی ہوتی تو کتاب میں ترتیب اور موضوعات میں ربط قائم ہو جاتا اور پڑھنے والے کو بار بار بے محل تکرار،

لہ سیبائن، A History of Political Theory، ہنری کولٹ اینڈ کمپنی، نیویارک، ۱۹۵۰ء
بحوالہ یےگر، Aristotles.

سے دوچار نہ ہونا پڑتا،" لیکن اگر ہم اسے ایک ایسی تصنیف مان لیں جس میں ایک دور کے خیالات نہیں بیان کئے گئے ہیں بلکہ 'مختلف دوروں کے' اور تصنیف کے دوران میں مصنف کے ذہن میں ایک خاص نظریہ نشوونما پاتا رہا ہے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور ہم ارسطو کی قدر شناسی کا حق بہتر طریقے سے ادا کر سکتے ہیں۔[۵]"

ارسطو سوفسطائیوں کے اس نظریے کا مخالف تھا کہ سیاسی معاشرہ کے ادارے فطری نہیں ہوتے بلکہ روایت کی گود میں جنم لیتے ہیں۔ وہ افلاطون کے اس خیال سے متفق ہے، اور اپنے سیاسی تفکر کا آغاز اسی سے کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی یا ریاست کا آغاز انسانی حاجتوں سے ہوتا ہے، لیکن وہ ریاست جو محض حاجتیں پوری کرے "سوروں کا شہر" ہے۔ ارسطو بھی اجتماعی زندگی کا اصل مقصد اچھی زندگی کا قیام بتاتا ہے، لیکن وہ ریاست کے سلسلہ میں اس کے نامیاتی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ زندگی کی ضرورتوں کی بنا پر خاندان بنتے ہیں جس میں مرد اور عورت اور آقا اور محکوم مختلف ضرورتوں کی بنا پر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں، لیکن جب بہت سے خاندان متحد ہو جاتے ہیں اور اس اتحاد کا مقصد روزمرہ کی حاجتیں پوری کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتا ہے تو معاشرہ کی جو شکل ظاہر ہوتی ہے وہ گاؤں ہوتا ہے، اور جب کئی گاؤں متحد ہو کر ایک مکمل جماعت بن جاتے ہیں جو خاصی بڑی اور تقریباً خود مکتفی ہوتی ہے تو ریاست وجود میں آتی ہے، اس طرح ریاست کا ظہور زندگی کی ضروریات کا رہین منت ہوتا ہے لیکن یہ قائم اسی صورت میں رہتی ہے جب مقصود ایک اچھی زندگی کی تشکیل ہو۔ اس بحث سے ارسطو کا مقصد یہ ہے کہ وہ یہ بتائے کہ ریاست ایک فطری مظہر ہے اور "انسان فطرتاً ایک حیوان سیاسی ہے"، لیکن ریاست میں ایک 'غیر فطری' عنصر بھی شامل ہے اور اسی وجہ سے ریاست کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور انقلابات رونما ہوتے رہتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ریاست کی بحث میں اخلاقی بحثیں بھی آجاتی ہیں۔ یہ 'غیر فطری' عنصر انسان کا خیر و شر کا شعور ہے جو دوسرے مل جل کر رہنے والے جانوروں میں نہیں ہوتا، انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے معیاروں کے مطابق اجتماعی زندگی کی تشکیل کرے۔

---

[۵] پروفیسر محمد مجیب، 'تاریخ فلسفۂ سیاسیات' ہندستانی اکیڈیمی، الہ آباد، ۱۹۳۶ء، صفحہ ۶۰ بحوالہ یےگر، ARISTOTELES

وہ معیار کیا ہوں اور اُس بھی زندگی کا شوق کسی طرح پورا ہو۔ بنیادی طور پر یہی وہ مباحث ہیں جن پر ہر زمانے میں ہر سیاسی مفکر نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں اور یہ بحث آج بھی جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک انسان اس کائنات کا ایک فعال عنصر ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

ارسطو اس حقیقت سے واقف تھا کہ ریاست سیاسی نظام یا حکومت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، چاہے وہ کسی طرز کی حکومت ہو، لیکن وہ استبدادی حکومت کے مقابلہ میں، خواہ وہ کسی فلسفی بادشاہ کا روشن خیال اور وسیع النظر استبداد ہی کیوں نہ ہو، دستوری حکومت کو ترجیح دیتا ہے۔ اسی لئے وہ افلاطون کے اس نظریے کا جو اس نے اپنی کتاب نوامیس (Laws) میں پیش کیا ہے۔ شروع ہی سے قائل ہے۔ یعنی یہ کہ اچھی ریاست وہی ہے جہاں قانون کی فرمانروائی ہو اور کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی بڑا مدبر اور دانشمند کیوں نہ ہو قانون سے بالاتر نہ ہو۔ یہی اُس کی عینی ریاست ہے اور قانون کی فرمانروائی ہی کو وہ اپنی عینی ریاست کا اصل وصف تصور کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ دستوری حکومت میں حکمراں کا اپنی رعایا سے جو تعلق ہوتا ہے وہ آقائی اور محکومی کی اور نوعیتوں کے مقابلہ میں مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس میں دونوں فریق پابند بھی ہوتے ہیں اور آزاد بھی اور اس وجہ سے ایک متوازن قسم کی مساوات قائم رہتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک مساوات انصاف ہے اور انصاف مساوات کا نام ہے، اگر ریاست اس انصاف سے محروم ہو جائے تو پھر اس کا انتشار شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ انصاف وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں قانون کی حکمرانی ہو، اس طرح کا سیاسی نظام اُس اقتدار و اختیار سے مختلف ہوتا ہے جو خاندان کے بزرگ کو خاندان والوں پر یا غلاموں پر ان کے آقاؤں کو حاصل ہوتا ہے۔ ارسطو کا خیال ہے کہ افلاطون کی یہ بڑی غلطی تھی کہ اس نے ریاست کو ایک بڑے خاندان سے تعبیر کیا اور خاندان کے اقتدار اور سیاسی اقتدار کے فرق کو سمجھنے میں ناکام رہا، یہی وجہ ہے کہ وہ افلاطون کے اس خیال سے متفق نہیں ہے کہ قانون کی حکومت اور دانشمند حکمرانوں کی حکومت ایک ہی درجہ کی چیزیں ہیں، بڑے سے بڑا دانشمند حکمراں بھی قانون سے نہ تو بے نیاز ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر کام چلا سکتا ہے کیونکہ قانون میں ایک لاشخصی (Impersonal) وصف ہوتا ہے جسے کوئی

شخص خواہ وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، حاصل نہیں کرسکتا۔" قانون عقل کی اس حالت کا نام ہے جب کہ اس پر خواہشات کا بُرا اثر نہ پڑا ہو۔ قانون کا اختیار جو جذبات سے معرّیٰ ہوتا ہی مجسٹریٹ کی جگہ نہیں لیتا لیکن مجسٹریٹ کے اختیار میں اخلاقی وصف کا رنگ بھرتا ہی، قانون کی فرمانروائی کے طفیل رعایا کا وقار قائم رہتا ہی جبکہ شخصی حکومت میں معاملہ برعکس ہوتا ہی، دستوری حکومت کے موجودہ نظریوں سے کس قدر مطابق ہی ارسطو کا یہ نقطۂ نظر، یہ اور بات ہی کہ آج بھی حقیقت میں وہی لوگ حکمراں ہیں جو اپنے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے بے پناہ وسائل رکھتے ہیں اور حکمراں طبقہ کی حیثیت سے عوام کے آزاد ارادوں کے اظہار کا موقع نہیں دیتے۔

ارسطو کے نزدیک دستوری حکومت کا ایک خاص مفہوم تھا، اس نے اس کے تین پہلو بتائے ہیں:
اول یہ کہ اس سے یہ مقصود نہیں ہوتا کہ کسی خاص فرد یا طبقہ کے مفاد کے حق میں کسی مُستبد یا کسی طبقہ کی حکومت قائم کی جائے بلکہ اس کا مطمحِ نظر مفادِ عامہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت کا کاروبار مسلّمہ قاعدوں کے مطابق ہو اور مطلق العنانی کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور تیسرے یہ کہ دستوری حکومت کا مطلب یہ ہوتا ہی کہ یہ رضامند اور مطمئن رعایا کی حکومت ہی کسی جابر حکمراں کے جبر کا پنجہ اس پر نہیں ہی۔ اس نے دستوری حکومت کی ان تین خصوصیات کا ذکر وضاحت سے کیا ہی لیکن انھیں کسی خاص سسٹم کے مطابق جانچا نہیں ہی اور یہ بھی نہیں بتایا ہی کہ اس کے علاوہ اور کوئی خصوصیت ہوسکتی ہے یا نہیں، اُسے اس بات کا احساس تو تھا کہ ہوسکتا ہی دستوری حکومت میں بیک وقت یہ تینوں خصوصیات موجود نہ ہوں: مثلاً ایک مستبد حکمراں ، ہی جو مطلق العنانی سے حکومت کرتا ہے لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا ہے مفادِ عامہ کے حق میں کرتا ہی، یا یہ کہ حکومت تو دستوری ہی مگر ناانصافی اپنا شعار بنائے ہوئے ہے اور ایک خاص طبقہ کے مفاد کا زیادہ خیال رکھتی ہی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے دستوری حکومت کی کبھی باقاعدہ تعریف نہیں کی۔

افلاطون نے نوامیس (Laws) میں کہا تھا کہ قانون کی اہمیت کو محض دفع الوقتی کے لئے نہیں تسلیم کرنا چاہیئے بلکہ مہذب اور اخلاقی زندگی بسر کرنے کے لئے ناگزیر تصور کرنا چاہیئے۔ ارسطو نے اپنے استاد کے مشورہ سے اتفاق کیا، سیاسیات میں اس نے ایک جگہ لکھا ہی اور افلاطون ہی کے قول کو دہرایا ہے: "انسان، اگر کامل ہوجائے، تو بہترین حیوان ہی، لیکن اگر قانون اور انصاف سے اسے کوئی واسطہ نہ ہو، تو وہ بدترین مخلوق ہی۔"

عینیت کی سطح سے اتر کر حقیقت کی دنیا میں اگر موجودہ اداروں اور ریاستوں کی رسم و روایات کی روشنی میں مجرد اصولوں کو پرکھا جائے تو مشکلات اور تضادات کا سامنا ہوتا ہے، افلاطون کی قسم کے عینیت پرست حقائق کی پرواکئے بغیر فلک پیمائی کرتے رہتے ہیں، یہ انتہا پسندانہ رویہ ہوتا ہے لیکن ارسطو خوابوں کی دنیا کا باشندہ نہیں تھا، اس لئے اس کے یہاں اعتدال اور اصلاح پسندی کے رجحانات ملتے ہیں، وہ تاریخ کو جو صدیوں پر پھیلے ہوئے انسانی تجربات کا خزانہ اپنے دامن میں رکھتی ہے، اصول ارتقاء کو جو کائنات کے نظام میں کارفرما ہے، انسانی نفسیات کو جو فرد اور جماعت کے انداز و کردار پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے اور انسان کی عقل سلیم کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خیالات میں اس رجحان کی جھلک ملتی ہے کہ آئیڈیل ایک موثر طاقت ہے اور واقعی زندگی اور موجود حالات میں اس کی اثر آفرینی اور متحرک قوت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ احوال و حقائق کی دنیا میں بھی یہ فعال اور زندہ رہتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ارسطو نے اس نکتہ کی وضاحت نہیں کی اور آنے والی نسلوں کے لئے سوچنے کا ایک موضوع دے دیا۔ اور غالباً وہ اس کی وضاحت کر بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اس کی مشکل یہ تھی کہ افلاطون سے اسے جو سیاسی آئیڈیل ملا تھا اس میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ شہر (ریاست) اور شہری دو لازم و ملزوم اصطلاحیں ہیں، اس کی وجہ سے اس کے سامنے تین سوال ابھرے: ریاست کیا ہے؟ شہری کیا ہے؟ کیا ایک نیک آدمی کے اوصاف وہی ہوتے ہیں جو ایک اچھے شہری کے ہوتے ہیں؟ ریاست انسانوں کی جماعت ہے جس کا مقصد بہترین اخلاقی زندگی کا ساز و سامان فراہم کرتا ہے، انسانوں کی ایک جماعت ہے اور یہ جماعت مشترک طور پر جس قسم کی زندگی گذارے گی اس سے اندازہ ہوگا کہ کس قسم کے انسانوں سے وہ جماعت بنی ہے اور وہ کیا مقاصد ہیں جنھیں وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی طرح اس کے بالمقابل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کے مقصد سے اس کا تعین ہوتا ہے کہ اس کے افراد کس قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں اور الگ الگ وہ کس قسم کی زندگی بسر کر سکتے ہیں، اس نظریئے کے مطابق دستور نظام زندگی کا نام ہے اور حکومت اور اس کی شکل درحقیقت اس نظام زندگی کی آئینہ دار ہے جسے ریاست قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس سے ارسطو یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ

"جب حکومت کی شکل بدل جائے اور کوئی نئی شکل اختیار کی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست وہ نہیں رہی جو پہلے تھی..... نظام حکومت بدلنے کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی زندگی کے اصول اور مقاصد بدل گئے"[1] قانون، دستور، ریاست، نظام حکومت ـــــ اس منزل میں سب ہی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے سب کا تعلق اس مقصد سے ہے جس کے سہارے انسانوں کی یہ جماعت زندہ ہے۔

اس بحث سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ارسطو کی نظر اس حقیقت سے کبھی نہیں ہٹتی کہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ریاستوں کے دستور میں خامیاں ضرور ہوتی ہیں اور ان کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں، افلاطون سے اگر پوچھا جاتا کہ ریاستوں کے دستور میں کیا خامیاں ہوتی ہیں اور کیوں ہوتی ہیں تو وہ یہ جواب دیتا کہ پہلے خیر کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کرو، اگر تم نے اسے سمجھ لیا تو تم کو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔ لیکن پہلے خیر کے تصور کا ادراک کیا جائے اور پھر اس پیمانے سے موجود ریاستوں اور واقعی زندگیوں کو جانچا جائے، یہ طرز استدلال ارسطو کو قبول نہیں، اس کے خیال میں پہلے موجود ریاستوں کا مشاہدہ کرنا چاہیئے پھر یہ امتیاز ہو سکتا ہے کہ کون سی ریاست اچھی ہے اور کون سی بری، اچھا آدمی ایک اچھا شہری ہو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ریاست آئیڈیل ہو۔

نظام حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ریاست کی شکل بھی بدل جاتی ہے، اسی ضمن میں اس نے اس سے بھی بحث کی ہے کہ ریاستیں کتنے قسم کی ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ ریاستوں کی قسموں کا تعین کسی نہ کسی معیار کے مطابق ہونا چاہیئے۔ لہذا" اس معیار کے مطابق کہ حکومت کے مدنظر مفاد عامہ ہے یا ذاتی مفاد اور حاکموں کی تعداد کم ہے یا زیادہ ارسطو نے ریاستوں کی تین صحیح شکلیں اور تین بگڑی ہوئی مثالی شکلیں قرار دی ہیں"[2]۔ بادشاہی (*Monarchy*)' اشرافیہ (*Aristocracy*) اور معتدل جمہوریت (*Polity*) یا دستوری حکومت صحیح شکلیں ہیں، مطلق العنان بادشاہی (*Tyranny*) چند سری حکومت (*Oligarchy*) اور جمہوریت مطلق (*Extreme Democracy*) انھیں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

[1] تاریخ فلسفۂ سیاسیات، صفحہ ۶۶، بحوالۂ ارسطو۔ [2] تاریخ فلسفۂ سیاسیات، صفحہ ۹۹۔

ارسطو کو احساس تھا کہ ریاستوں کی تقسیم اس نہج پر کرنے سے، ان کی الگ الگ خصوصیات بتلانے میں مشکلات کا سامنا ہوگا کیونکہ سب سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اقتدار کے حقدار کون ہیں اور کن لوگوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہونی چاہیئے۔ عام طور پر لوگ چند سری حکومت کو امیروں کی حکومت تصور کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے جمہوریت غریبوں کی حکومت سمجھی جاتی ہے، یہ صحیح ہے کہ غریبوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور امیر کم ہوتے ہیں لیکن زیادہ کا اضافی فرق ریاست کی ان دونوں قسموں پر دلالت نہیں کرتا، اصل معاملہ یہ ہے کہ اقتدار کے استحقاق کے دو نمایاں پہلو ہیں: ایک کا تعلق ملکیت کے حقوق سے ہے اور دوسرے کی بنیاد زیادہ سے زیادہ تعداد میں عام انسانوں کی فلاح و بہبود پر ہے۔

ارسطو اس کا منکر نہیں ہے کہ نجی ملکیت کا تصور بہت قوی ہے۔ وہ نجی ملکیت کے تصور کا مخالف بھی نہیں ہے لیکن وہ جائداد یا دولت کو ایک ذریعہ تصور کرتا ہے اچھی زندگی کے قیام کے لئے۔ اس کے خیال میں دولت جمع کرنا بعینہٖ کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیئے، دولت کے احتکار کی کوئی مناسب حد ہونا چاہیئے ورنہ اس سے ریاست کے اس مقصد کے حصول میں کہ اچھی زندگی بسر کرنے کا ساز و سامان فراہم کیا جائے، رکاوٹ پیدا ہوگی۔ دولت کے لامحدود احتکار کو، خواہ اس کی کوئی شکل ہو، وہ ریاست کے استحکام کے لئے مضر تصور کرتا ہے اور اسی سلسلہ میں وہ متنبہ کرتا ہے کہ امیر اور غریب کا فرق اگر بہت بڑھ جائے گا تو ریاست میں فساد پیدا ہوگا۔ ہر ریاست میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ایک طبقہ بہت امیر ہوتا ہے، دوسرا بہت غریب اور ایک طبقہ یعنی تیسرا متوسط حیثیت کا۔ یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ 'اوسط' یا 'اعتدال' خیرالامور ہے اور اس لئے واضح ہے کہ اعتدال کے ساتھ خوشحال اور امیر ہونا اچھا ہے کیونکہ اس صورت حال میں انسان عقل و ہوش سے محروم نہیں ہوتا، لیکن وہ جو حُسن، طاقت، خاندانی نجابت یا دولت کے لحاظ سے بہت قوی اور دوسروں سے بڑھ کر ہوتا ہے، یا برخلاف اس کے وہ جو بہت غریب یا بہت کمزور یا بہت زیادہ ذلیل و حقیر ہوتا ہے، اپنے لئے دشوار پاتا ہے کہ عقل کی رہنمائی قبول کرے۔[۵۱]

ارسطو کے نزدیک امیر طبقہ کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ وہ فرمانبرداری نہیں کر سکتا اور اگر حکومت اس کے ہاتھ میں ہوگی تو وہ مطلق العنان حکومت ہوگی، غریبوں کا طبقہ چونکہ دوسری انتہا پر ہوتا ہے

---

۵۱ ارسطو، سیاسیات۔

اس لئے وہ یہ نہیں جانتا کہ حکمرانی کسے کہتے ہیں لہٰذا اُسے غلاموں کی طرح محکوم ہونا چاہیئے، اس طرح ان دو طبقوں پر مشتمل جو ریاست بنے گی وہ آزاد انسانوں کی نہیں بلکہ آقاؤں اور غلاموں کی حکومت ہوگی امیر غریبوں سے نفرت اور غریب امیروں سے رشک و حسد کریں گے اور اس لئے رفاقت اور دوستی کی فضا نہیں پیدا ہوسکتی جو ریاست کی پائداری کے لئے ضروری ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ارسطو نے دستور یا ریاست کی "خوبی کا معیار پائداری کو قرار دیا ہے اور موجودہ زمانے کے خیالات کی رو سے یہ صحیح ہے"[۵۱]

ارسطو کا خیال تھا کہ ریاست وہی اچھی ہے جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو جو مساویانہ حیثیت کے حامل ہیں اور مادی معیار زندگی کے اعتبار سے ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ متوسط طبقہ کے افراد ہوتے ہیں، ان میں آپس میں رشک و حسد نہیں ہوتا، کسی کو کسی سے خطرہ نہیں ہوتا اس لئے ظاہر ہے کہ بہترین سیاسی جماعت متوسط طبقہ کے لوگوں سے بنتی ہے اور ان ریاستوں میں اچھا انتظام ہونے کا امکان زیادہ ہے جن میں متوسط طبقہ بڑا ہو۔ اور اگر ممکن ہو تو دوسرے دونوں طبقوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑا ہو، یا کم از کم ان میں سے کسی ایک سے بڑا ہو، کیونکہ متوسط طبقہ کسی ایک سے مل کر صورت حال کو بدل دے گا اور ان میں سے کسی ایک کو غلبہ حاصل کرنے کا موقع نہیں دے گا۔[۵۲] لیکن واقعات کی دنیا میں اس طرح کی صورت حال بہت کم وقوع میں آتی ہے۔ بہرحال متوسط طبقہ کی اشرافیہ جو دستوری حیثیت کی حامل ہو، ارسطو کی عینی ریاست کہی جا سکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایسی ریاست بھی جو بہترین اور قابلِ عمل ہے۔

یونان کی شہری ریاستوں میں انقلابات ہوتے رہتے تھے، ارسطو نے ان کے اسباب پر غور کیا اور سیاسی مظاہر اور تجربات کی روشنی میں ان کا تجزیہ کر کے ان کی روک تھام کے لئے کچھ طریقے بھی بیان کئے اس کا خیال تھا، اور واقعات نے ثابت کیا ہے کہ بہت بڑی حد تک اس کا خیال صحیح تھا، کہ مساوات کی خواہش ہی ہمیشہ بغاوت کا جھنڈا بلند کرتی ہے" جو کمتر ہوتے ہیں وہ اس نیت سے بغاوت کرتے ہیں کہ اوروں کے برابر ہو جائیں اور جو برابر ہوتے ہیں وہ اس غرض سے کہ برتر ہو جائیں۔ کیونکہ انھیں جو کچھ

---

[۵۱] تاریخ فلسفۂ سیاسیات، صفحہ ۶۶ [۵۲] ارسطو، سیاسیات۔

ر اُسے وہ اپنے حق سے کم سمجھتے ہیں"۔[ﮯ۵] کسی دستور کی یہ بھی ایک بڑی خامی ہوتی ہے کہ حکمرانوں اور حکمراں طبقوں کو
کا موقع ملے، کہ وہ لالچ کو اپنا مسلک بنالیں اور محکوموں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ محکوم اُن کی مخالفت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ انقلاب کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی فرد یا کئی افراد کے ہاتھ
میں اقتدار اس طرح آجائے کہ بادشاہی یا چند سری حکومت کے قائم ہونے کا خطرہ پیدا ہوجائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی
ہوتا ہے کہ مجرم افراد اپنی بدکاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کی کوشش کرتے ہیں کہ ہنگامہ برپا کیا جائے، نسلی
اختلافات، شخصی حکومتوں میں ذاتی عداوتیں اور جھگڑے یا ریاست کے کسی حصہ میں علاقائی، معاشرتی، معاشی
یا کسی اور لحاظ سے، تناسب سے زیادہ اضافہ اور ترقی بھی ایسے اسباب ہیں جو انقلابات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

ارسطو نے انقلابات کو روکنے کی تدبیریں بھی بتائی ہیں، اس سلسلہ میں پہلی ضروری بات یہ ہے کہ رعایا میں
قانون کی فرمانبرداری کا جذبہ باقی رہے، کبھی کبھی بے قاعدگی چپکے چپکے ہئیت اجتماعیہ میں رچ بس جاتی ہے۔
اور ریاست کو برباد کردیتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے چھوٹے چھوٹے مستقل اخراجات خزانے کو خالی کردیتے
ہیں۔[ﮯ۶] دوسری چیز یہ ہے کہ کوئی طبقہ جو حکومت میں شریک نہیں ہے، بدسلوکی کا نشانہ نہ بننے پائے بلکہ یہ ہونا
چاہئے کہ اس کے بااثر افراد کو ان کی حیثیت کے مطابق مرتبہ دیا جائے اور ان کی حیثیت کو تسلیم کیا جائے عوام
میں حب الوطنی کا جذبہ کبھی ختم نہ ہو یہ بھی بڑی کارگر تدبیر ہے، اس کے علاوہ حاکموں کو اس کا موقع نہیں ملنا چاہیے
کہ وہ اپنے اقتدار سے ناجائز فائدہ اٹھاکر دولت کمائیں اور یہ اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ دستور میں اس کے
تدارک کے لئے دفعات موجود ہوں، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ کسی ایک شخص یا اشخاص کی کسی جماعت کا اقتدار
حد سے زیادہ نہیں بڑھنے پائے گا، اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ دولت کی تقسیم صحیح اور منصفانہ ہو، نابرابری
کا فرق بہت نمایاں نہ ہو، اور ریاست کا معاشی ڈھانچہ ایسا ہو کہ غریبوں کو بھی صلاحیت پیدا کرنے اور
ترقی کرنے کا موقع ملے۔ لیکن ارسطو کا خیال ہے کہ" ان تمام تدبیروں کے علاوہ جو میں نے بیان کی ہیں ایک
اور تدبیر ہے جو دستور کے استحکام میں سب سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تعلیم طرز حکومت
کے مناسب اور مطابق ہو لیکن یہی وہ اصول ہے جسے ہمارے زمانے میں عام طور پر نظر انداز کردیا گیا ہے"۔ افسوس

ﮯ۵ تاریخ فلسفہ سیاسیات، صفحہ ۶۷ ﮯ۶ ارسطو، سیاسیات۔ ایضاً

ہے کہ ہمارے ملک میں قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا نعرہ بڑی شدت سے لگایا جاتا ہے لیکن ارسطو کے اس اصول پر جو درحقیقت اپنے اندر بنیادی سچائی رکھتا ہے، بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ ابھی حال میں قومی یک جہتی کے سلسلہ میں جو کانفرنس ہوئی تھی اُس میں انتشار اور فساد کی روک تھام کے لئے جن تدبیروں پر بہت زیادہ زور دیا گیا اُن کی حیثیت محض منفی تھی، ہمارا دستور اچھا ہے، ملک کی بھاری اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے لیکن نظام تعلیم ایسا نہیں ہے جس میں اس کا امکان قوی ہو کہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت دستور کی بنیادی خصوصیات کے مطابق ہو۔)

تعلیم طرز حکومت کے مزاج کے عین مطابق ہو، ارسطو کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب اس کا انتظام ریاست کی طرف سے ہو، معاشرہ ایک کل ہے اور شہری اس کے اجزا ہیں، معاشرہ محفوظ نہیں رہ سکتا اگر اُس کے افراد کی اُس کے مقصد کے پیش نظر تعلیم و تربیت نہ کی جائے، اور[۲] ارسطو نے تعلیم کا نصب العین یہ قرار دیا ہے کہ وہ فطرت، عادت اور عقل کو ہم آہنگ کردے اور تینوں کو ریاست کے خاص رنگ میں رنگ دے۔

تعلیم، طرز تعلیم، شہریوں کی سیرت کی تربیت، ریاست کا دستور اور اس کا نصب العین وغیرہ ـــــ درحقیقت یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں اور ارسطو کے سیاسی نظام فکر کا مطالعہ اسی وقت مکمل ہوگا جب سب کو ایک کل سمجھ کر جانچنے اور پرکھنے کی سعی کی جائے۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنیادی طور پر ارسطو کے سیاسی خیالات کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ افلاطون کی طرح وہ کسی عینی ریاست کی تعبیر و تشکیل کا خواب دیکھے اور اس قسم کی خیال آرائی اس کے جینیئس (Genius) کو راس بھی نہیں آسکتی تھی۔ جس قدر بھی اس نے اپنے آزاد طرزِ فکر کو اپنے خاص رنگ میں متعین کرنے کی کاوش اور تحقیق اور مشاہدہ کی دنیا میں جدوجہد کی اسی قدر اس نے موجودہ دستوروں کو بیان کرنے اور ان کا تجزیہ کرنے کی طرف زیادہ توجہ کی، اُس نے اور اُس کے شاگردوں نے ایک سو اٹھاون دستوروں اور اُن کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور اس تحقیق و مطالعہ کا اُس کے فکر پر بڑا انقلابی اثر مرتب ہوا، اور اسی کا اثر تھا کہ اُس نے سیاسی نظریے کے ایک وسیع تر مفہوم کی طرف اشارہ کیا، اس کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے تجرباتی مطالعہ کو سیاسی اصولوں کے خالص فکری مطالعہ سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

---

[۲] تاریخ فلسفۂ سیاسیات، صفحہ ۷۳۔

شگفتہ بچّہ

حضرت سلام مچھلی شہری

(ٹیگور کے مشہور شاہکار گیتانجلی کی نظم نمبر ۶۱ سے متاثر ہو کر کہی گئی)

شگفتہ بچّے کی آنکھوں میں نیند چھائی ہے
کوئی بتلائے یہ آخر کہاں سے آئی ہے
شگفتہ بچّے کی آنکھوں میں نیند کی رانی
چمن بدوش بہاروں کی رہنے والی ہے
حسین پریوں کی اک خوشنما سی وادی میں
نسیمِ صبح کی رعنائیوں کی پالی ہے
وہ ایسی وادیِ گلبار و گلفشاں ہے جہاں
سحر حسین اگر ہے تو شب حسیں تر ہے
جہاں مناظرِ فطرت کا رقص ہوتا ہے
وہیں، پہاڑ کے دامن میں اس کا بھی گھر ہے!

(۲)

یوں یہ موجِ بہاراں جو مسکرائی ہے
کوئی بتلائے یہ آخر کہاں سے آئی ہے
شگفتہ بچّے کے ہونٹوں پہ یہ ہنسی کی لکیر
جوان چاند کی اُن شوخیوں کی ہے تنویر
جو ابر پاروں کے پاؤں میں ڈال دیں زنجیر!

نگارِ صبح نے شبنم میں آنکھ جب کھولی
تو پاس ایک کلی مُسکرا کے یوں بولی
"میں صدقے آپ کے حسن و شباب پر جاؤں
یہ رنگ و نور کسی طفلِ نَو کو دے آوں؟"
شگفتہ بچّے کے ہونٹوں پہ یہ ہنسی کی کرن
عروسِ صبح کے خوابوں کا ہے سہانا پن!!

(۳)

شگفتہ بچّے کی ایسی جو دلربائی ہے
کوئی بتائے یہ آخر کہاں سے آئی ہے؟
جب اس کی مادرِ مشفق جواں و رعنا تھی
تو خود بھی اپنی بہاروں کی ایک دنیا تھی
اُن ہی دنوں وہ کوئی رازِ دلنشیں پاکر
حسین چاند ستاروں پہ ڈالتی تھی نظر
حیات پرتوِ رنگیں تھی حسنِ دلبر کا!
شگفتہ بچّے کا یہ حسن، یہ سلونا پن
ہے ایک عکسِ ضیا بارِ خوابِ مادر کا!!

آئینۂ حیرت

حضرت عبد المجید حیرت

نویدِ آمدِ فصلِ بہار ہوتا ہے — وہ برگِ گل جو سرِ شاخسار ہوتا ہے
وہی شجر جو کبھی سایہ دار ہوتا ہے — خزاں کے دور میں بے برگ و بار ہوتا ہے
مجھے یہ ڈر ہے، کہیں آپ بھی انھیں میں نہ ہوں — جنھیں خزاں پہ گمانِ بہار ہوتا ہے
ابھی تو آپ کے صبر و ثبات کا دامن — خیال ہی میں فقط تار تار ہوتا ہے
یہ باغبان ہی جانے کہ کون سا موسم — شگفتِ گل کے لئے سازگار ہوتا ہے
نہیں بھی ملتا ہے آرام کم نصیبوں کو — اگرچہ سایۂ دیوارِ یار ہوتا ہے
وہ سرزمین جو سورج سے دور ہوتی ہے — وہاں تو شام ہی کا اعتبار ہوتا ہے
نفس نفس میں مشیخت کی جس سے بو آئے — وہ انکسار کوئی انکسار ہوتا ہے
خدا کی شان کہ جس کی نگاہ کچھ بھی نہ تھی — اب ان کا اہلِ نظر میں شمار ہوتا ہے
کسی کو ہم سے تعلق، نہ ہم سے ہمدردی — نظر نظر سے یہی آشکار ہوتا ہے

اُسی پہ قہر کی گرتی ہیں بجلیاں حیرت
جو ان کے لطف کا امیدوار ہوتا ہے

"انارکلی"

محترمہ وحیدہ نسیم (کراچی)

یاد میں تیری ہی راوی دیدۂ پر آب ہے
سینۂ لاہور میں تو ہی دل بے تاب ہے

تخت مغلوں کا تھا تیرے رقص سے لرزہ کناں
تھی نظر تیری عنانِ قسمت ہندوستاں

حسن تیرا تھا قوی تر لشکرِ جرار سے
اکبر فاتح کو اندیشہ تیری رفتار سے

دے کے دھڑکن اپنی مغلوں کے دل خاموش میں
سو گئی تو آہ! سنگ و خشت کی آغوش میں

طائرِ بام محبت کا انوکھا تھا قفس
پتھروں میں رہ گیا گھٹ گھٹ کے تیرا ہر نفس

داد دیتے ہیں فرشتے اس بساطِ عشق کی
جس میں اک حرفِ تمنا کی ہو قیمت زندگی

خاموشی نے بخش دی تاریخ کو تیری زباں
مٹ کے تو نے دی محبت کو حیاتِ جاوداں

خاک میں مل کر چھپے جو یہ وہ تابانی نہیں
سلطنت فانی جہاں کی عشق، پر فانی نہیں

بال جو تھا تیرے دل کے شیشۂ شفاف میں
بن کے کانٹا رہ گیا وہ سینۂ انصاف میں

گونج اٹھا عدل جہانگیری کی ہر آواز میں
آہ وہ نغمہ جو تھا تیرے شکستہ ساز میں

اس طرح ڈوبا سفینہ تیرا ساحل بن گیا
ٹوٹ کر قسمت کا تارا ماہ کامل بن گیا

رشتۂ دل جوڑ کر ہستی سے ناتا توڑنے
خواب بن کر آئی تو بے خواب کرکے چھوڑنے

ناز ہے ہندوستاں کو آج تیرے بخت پر
چین آیا ایک سلطاں کو نہ تجھ بن تخت پر

کی جہانگیری خلش دل کی مٹانے کے لئے
کھیل تھی نورجہاں تجھ کو بھلانے کے لئے

دل بہلنے کو جھکائی ہر جگہ اپنی جبیں
مٹ سکا لیکن نہ دل سے تیرا نقش اولیں

تخت سے یہ دل شہنشاہی سے اکتائی ہوئی
کہہ رہی ہے آج بھی اک روح گھبرائی ہوئی

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را
آہ گر من باز بینم روئے یار خویش را

مغربی ایشیا کی
مُسلم ریاستوں میں فوجی انقلابات

جناب شاہ عبدالقیوم

یہ بات دلچسپ بھی ہے اور کچھ عجیب بھی کہ گذشتہ چند برسوں میں جتنے بھی فوجی انقلابات آئے ہیں ان میں سے اکثر مغربی ایشیا کی مسلم ریاستوں میں آئے ہیں۔ فوجی انقلابات کا یہ سلسلہ ۱۸۸۱ء سے شروع ہوتا ہے جب مصری فوج کے کرنل اعرابی پاشا نے مصری حکومت کے داخلی معاملات میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف احتجاج کیا اور سرکاری ملازمتوں اور عہدوں میں عربوں کے جائز حقوق کی مانگ کی، ملک کی دولت اور تمام ذرائع آمدنی پر غیر ملکیوں کے تسلط کے خلاف جد وجہد کی، لیکن آپس کی نا اتفاقی، فوجی تنظیم کی کمزوری اور اسلحہ کی کمی کے باعث انگریزوں کی منظم اور بے پناہ طاقت کا مقابلہ نہ کرسکا اور اپنے ہی ملک میں غیروں کے سامنے جھکنا پڑا۔

اس کے بعد ترکی میں ۱۹۰۸ء میں "ینگ ٹرکس" کی تحریک نے خود غرض اور سخت گیر سلطان عبدالحمید کو دوبارہ دستوری حکومت قائم کرنے پر مجبور کیا۔ اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر مصطفیٰ کمال اتاترک نے کمزور بنیادوں پر ٹھہری ہوئی عثمانی سلطنت اور خلافت کو ختم کرکے مغربی طرز کی جمہوری حکومت کی بنا ڈالی۔

عراق میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۱ء تک سات بار فوجی حکومتیں قائم ہوئیں جن میں راشد علی گیلانی کی وہ تحریک زیادہ مشہور ہے جس کا ایک مقصد جرمنی کی حمایت تھا۔

اسی طرح شام میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۴ء تک پے در پے پانچ مرتبہ فوجی حکومتیں قائم ہوئیں جن میں کرنل زعیم، کرنل حناوی اور کرنل ادیب شیشکلی کے انقلابات کی داستانیں ابھی تازہ ہیں۔

اسی زمانے میں (جولائی ۱۹۵۲ء) کرنل ناصر اور جنرل نجیب کی قیادت اور سرپرستی میں مصر کا شاندار "انقلاب" رونما ہوا، جس نے شاہ فاروق کو دیس نکالا دیا اور عدل و مساوات کی بنیادوں پر ایک نئے

نظام کی بشارت دی۔

جولائی ۱۹۵۸ء میں بریگیڈیر قاسم کی سرپرستی میں عراقی فوج نے شہنشاہیت کو ہمیشہ کے لئے مٹادیا۔ شاہ فیصل، نوری سعید اور دیگر سامراج نوازوں کو ختم کرکے حکومت کی ذمہ داریاں فوجی افسران کے سپرد کردیں۔

اسی سال ۲۷ اکتوبر کو جنرل ایوب نے پاکستان کے نااہل اور خودغرض حکمرانوں کو سیاسی اقتدار سے معزول کرکے فوجی نظام قائم کیا، جس کی گرفت آج بھی حکومت کے تمام شعبوں اور عوام کی سیاسی زندگی پر اسی قدر مضبوط ہے کہ جتنی انقلاب کے پہلے دن تھی۔

اس کے ایک ہی ماہ بعد ۱۷ نومبر کو سوڈان میں فوجی انقلاب رونما ہوا جس میں سوڈانی فوج کے جنرل ابودنے جمہوری حکومت ختم کرکے فوجی حکومت قائم کی اور جہاں ابھی تک عوامی حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا ہے۔

سوڈان کے انقلاب کے کچھ ہی عرصہ بعد ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کو ترکی میں جنرل گرسیل کی رہنمائی میں فوج نے صدر جلال بائر اور وزیر اعظم مندریس کی سخت گیر حکومت کو ختم کرکے فوج کو ملک قوم کی نگہبانی اور حکومت کی ذمہ داری سونپ دی۔ آج بھی ترکی حکومت کا سارا کام فوج کی نگرانی میں چل رہا ہے اور ابھی کچھ ہی دنوں کی بات ہے (اکتوبر ۱۹۶۱ء) کہ شامی فوج نے مصر کے ساتھ شام کے الحاق کو توڑ کر پھر سے شام کو ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت دی ہے۔

فوجی انقلابات کی یہ داستان دلچسپ اس اعتبار سے ہے کہ ان سب ممالک میں انقلابات کی وجوہ تقریباً ایک سی ہیں، دوسرے جب بھی کسی ملک میں فوجی حکومت قائم ہوئی ہے وہاں کے عوام نے پوری طرح فوج کا ساتھ دیا ہے اور خوش آمدید کہا ہے، کہیں بھی عوام اور فوج کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ کوئی خونریزی نہیں ہوئی کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ رات کو ناکارہ اور نااہل حکومت کے ستائے ہوئے عوام بے خبر سوئے ہیں، صبح اٹھے تو نقشہ ہی اور دیکھا۔ رات کے اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ خودغرض حکمرانوں کی نکمی حکومت اپنے انجام کو پہنچ گئی اور صبح انقلاب اپنے ساتھ ایک پرسکون اور خوش حال زندگی کی امید لے کر آگئی۔

عجیب اس اعتبار سے ہے کہ باوجود اس کے کہ ہر ملک میں فوجی حکومت نے سیاسی زندگی کو بالکل

ختم کردیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندیاں عائد کردیں۔ اخبارات اور تقریر و تحریر کی آزادی چھین لی۔ رائج دستور کو منسوخ کردیا، پارلیمنٹ اور اسمبلیاں توڑدیں، تحریر و تقریر کے ذریعہ اظہار خیال پر فوجی نگرانی قائم کردی لیکن پھر بھی وہاں کے عوام فوجی تحریک سے خوش ہوئے اور اس کا خیرمقدم کیا۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے جو اپنی حریت اور آزادئ فکر و خیال جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، اس سے زیادہ عجیب بات کیا ہوسکتی ہے۔

لیکن ان ملکوں کی تاریخ اور اخلاقی، سماجی اور مذہبی قدروں کے مطالعہ تعلیمی حالت اور معاشی مسائل کے جائزے، کثیر آبادی اور بے روزگاری کی الجھنوں اور سیاسی زندگی کی پیچیدگیوں، عوام کی محرومیوں اور مایوسیوں پر غور کرنے سے شاید اس عجیب سی بات کا بھید کھل جائے اور ان ممالک میں جمہوری نظام کی نامقبولیت اور ناکامی کے کچھ اسباب معلوم ہوسکیں۔

تعلیم کی کمی

جمہوریت کی کامیابی کے لئے دراصل ایک تعلیمی معیار ہونا لازمی ہے۔ سیاسی شعور کی بیداری، حقوق سے واقفیت اور ذمہ داریوں کا احساس، اتفاق اور اتحاد کا جذبہ، ترقی کی لگن، خوشحالی کی تڑپ اور اس کے لئے جد و جہد کا جذبہ، مذہبی رواداری، قومی تمدن اور تاریخ سے آشنائی، یہ باتیں تعلیم ہی سے آتی ہیں اور یہی سب باتیں جمہوریت کو پائدار اور کامیاب بناتی ہیں —— لیکن مغربی ایشیا کے تقریباً سب ہی ممالک میں تعلیم کا معیار بہت پست اور ناقص ہے، ترکی اور شام وغیرہ میں اگرچہ تعلیم کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی گئی ہے، لیکن قومی تاریخ سے ناواقفیت، اور اپنے تہذیبی ورثہ سے روگردانی نظام حکومت کی ناپائیداری کا باعث بنی ہوئی ہے۔

خدائی بادشاہت

اس کے علاوہ اس خطۂ زمین پر صدہا سال سے بادشاہی نظام حکومت قائم رہا ہے جس میں بادشاہ کے حقوق و اختیارات اور حرکات پر کسی بھی فرد یا جماعت کو انگلی اٹھانے کا حق نہیں تھا، جس کا ہر حکم قانون اور مرضی انصاف کا درجہ رکھتی تھی۔ جہاں مذہب کے غلط تصور کا زندگی کے ہر شعبہ پر تسلط رہا ہے۔ اور "خدائی بادشاہت" کا نظریہ حکومت کی اساس سمجھا گیا ہے یعنی اقتدار اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہے اور بادشاہ اس کا خلیفہ ہے، لہذا وہ اپنے کسی فعل کے لئے اپنی رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں۔ ایسے نظام میں حکومت کے ہر

دارے اور سیاسی و سماجی زندگی کے ہر شعبہ پر بادشاہِ وقت کا مکمل اختیار تھا ہر کام اس کی مرضی اور اجازت سے ہوتا تھا۔ سرکاری خزانے اس کی ذاتی ملکیت، فوج، سپاہی اور حکومت کے کارندے اس کے ذاتی نوکر خیال کئے جاتے تھے۔ جنگ اور امن کے معاملات اس کی مرضی پر منحصر تھے۔

ظاہر ہے ایسے ماحول میں رہنے والی قومیں جمہوریت کے تصوّر اور عوامی حکومت کی خوبیوں سے بالکل ناواقف ہوں گی۔ لیکن بیسویں صدی میں اور خاص کر پہلی جنگ عظیم کے بعد جب ان پسماندہ لیکن قدرتی دولت کے مالامال ممالک میں معاشی فائدوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر مغربی طاقتوں کا اثر و اقتدار بڑھا تو انھوں نے ان اہم حقائق کو بھلا دیا۔ اور مغربی طرز کی جمہوریت کی ضرورتوں سے بے خبر قوم میں پارلیمنٹ، سیاسی پارٹیاں، الیکشن، عوامی حکومتیں اور عدالتیں قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایسے ماحول میں یورپی تصورات کا کھپ جانا یقیناً ایک معجزہ ہوتا۔

متوسط طبقہ کی عدم موجودگی

اس قسم کے مغربی اداروں کے قیام کے لئے چونکہ ماحول کو سازگار بنانے اور تغیر کو قبول کرنے کے لئے عوام کے ذہنوں کو تیار نہیں کیا گیا، اس لئے نہ صرف مذہبی جماعتوں نے مخالفت کی بلکہ کمیونسٹ تحریکات نے بھی جمہوریت میں کیڑے نکالنا شروع کر دیئے۔ مذہبی پیشواؤں نے اس لئے اس تحریک کی مخالفت کی کہ عوام کے باشعور ہو جانے سے ان کا اثر ختم ہو جائے گا، کمیونسٹوں نے شاید اس لئے مخالفت کی کہ غریبی دور ہونے اور تعلیم کے پھیلنے سے کمیونزم میں کوئی کشش باقی نہیں رہ جاتی۔ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ نوجوانوں پر مشتمل ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ماضی کے ہر نقش کو مٹانا چاہتا تھا، اپنی تاریخ اور ادب کو بھول کر مغربی تہذیب اور صنعتی تمدن کو پوری طرح رائج کرنا چاہتا تھا، مصر میں خدیو اسمٰعیل ان خیالات کی سرپرستی کر رہا تھا۔ اس کے برخلاف مذہبی پیشواؤں پر مشتمل ایک دوسرا طبقہ تھا جو جمہوریت اور نئی تہذیب کا مخالف تھا۔ اور گذرے ہوئے زمانہ میں لوٹ جانا چاہتا تھا، جسے ماحول اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ بدلنا نامنظور تھا، لیکن جب ان میں سے کوئی بھی تحریک یا جماعت اکثریت کو اپنے ساتھ نہ ملا سکی اور سیاسی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگا، ملک کی قدرتی دولت بیرونی ممالک میں جانے لگی حکمراں اپنی غرض کے بندے بن گئے، تو فوج کے لئے مداخلت کرنا ناگزیر ہو گیا۔

مغربی ایشیا میں انقلابات ہمیشہ فوج ہی کے ذریعہ آئے ہیں اس کی بڑی وجہ متوسط طبقہ کی

تقریباً عدم موجودگی ہو یہاں جاگیرداری نظام بہت پرانا اور بہت مضبوط ہے۔ ملک کی سیاست و معاشرت پر اسی طبقے کے نمائندوں کا قبضہ رہا ہے۔ اس لئے کبھی کوئی معاشی یا سماجی اصلاح کی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ امیروں اور مفلسوں کے درمیان ایک متوسط طبقہ ہوتا ہے۔ جو غریبوں کے لئے ہمدردی رکھتا ہے اور ان کا درد محسوس کرتا ہے، لیکن نسبتاً زیادہ آسودہ حال اور تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ اس جماعت کا اگر سیاسی شعور بیدار ہو تو حکومت کے ظلم اور جاگیرداری نظام کی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہے اور عوام کو اپنے ساتھ ملا کر متحدہ محاذ بنا لیتا ہے۔ جو کبھی انقلاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے، لیکن مغربی ایشیا کے ممالک میں اس جماعت کا وجود بہت کمزور ہے۔ کسان اور مزدور خستہ حال ہیں۔ زمیندار کا دیا کھاتے ہیں، اس کے کرم پر جیتے ہیں، لہذا اس کے خلاف احتجاج کا خیال بھی نہیں کرتے۔ صنعتی ترقی اگر یہاں عام ہوتی، بڑی بڑی ملیں اور کارخانے ہوتے، تعمیری کاموں میں حکومت کی دلچسپی ہوتی تو مزدور تحریک وجود میں آ سکتی تھی، ان مزدوروں میں ٹریڈ یونین کی تحریک بہت جلد مقبول ہوتی ہے، یہی ٹریڈ یونین مزدوروں میں ان کے حقوق کا احساس اجاگر کرتی ہیں اور پھر انہیں منظم کر کے انقلاب پر آمادہ کرتی ہیں۔ لیکن چونکہ مغربی ایشیا کے مزدور اور کسان بہت کمزور اور غیر منظم ہیں اس لئے انقلاب کی ذمہ داری فوج پر ہی آتی ہے جو مستحکم ہوتی ہے اور منظم بھی۔

دوسرے ممالک کے فوجی افسران کے برخلاف مغربی ایشیا کے فوجی افسران جو عام طور سے خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور فوج کو اپنی انفرادی ترقی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اپنے ملک کی سیاست اور قومی تحریکوں میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ ان میں "قومیت" کا جذبہ پوری طرح اجاگر ہوتا ہے، ان افسران میں سے اکثر کی تعلیم اور فوجی تربیت یورپی ممالک میں ہوتی ہے، اسی وجہ سے اپنے وطن واپس آکر وہ ایک سماجی انقلاب کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کی بدحالی اور بگڑی ہوئی تقدیر پر آنسو نہیں بہاتے، بلکہ ترقی و خوشحالی پانے کی لگن کے ساتھ میدانِ عمل میں آتے ہیں۔ ان کے پروگراموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعلیم اور مذہب کا صحیح تصور رائج کرنا چاہتے ہیں، ملک کی بے پناہ قدرتی دولت سے جس سے باہر کی دنیا فیض اٹھا رہی ہے، وہ خود فائدہ اٹھا کر اپنی قسمت بدلنا چاہتے ہیں، یہی لئے جب یہاں کسی ملک میں فوج نے اقدام کیا، وہاں کے عوام نے انہیں خوش آمدید کہا ہے، اور چونکہ اس قسم کا سماجی اور معاشی انقلاب خود غرض

سیاست دان اور نکمے حکمراں نہیں لا سکتے۔ اس لئے فوج ہی اس فرض کی ادائیگی کا ذمہ لیتی ہے۔

قوم پرستی کا جذبہ

پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی ایشیا کے ممالک میں دولت عثمانیہ کے اقتدار سے آزادی پانے کا جذبہ اور نسلی برتری کا احساس اُجاگر ہوا۔ فرانس کے شاندار انقلاب اور امریکہ و برطانیہ کے جمہوری نظام سے متاثر ہو کر آزادی اور قومیت کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ عربی زبان اور عرب تہذیب کو بچانے کے نام پر ترکوں کے خلاف جد و جہد عام ہو رہی تھی۔ اس وقت عرب قوم ہر اس جماعت کا ساتھ دینے کو تیار تھی جو انہیں ترکی کی گرفت سے آزادی دلا سکے اور ان کے نسلی و قومی افتخار کو تحسین کی نظر سے دیکھ سکے۔ چنانچہ اسی امید پر ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں عربوں نے حسین، شریف مکہ کے ساتھ دولتِ عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ لیکن انگریز اپنے وعدہ پر قائم نہ رہ سکے، ملک شام، فلسطین اور عراق کو برطانیہ اور فرانس کے زیرِ نگرانی دے دیا گیا۔ مصر پہلے ہی سے انگریزوں کے زیرِ اثر تھا۔

اسرائیل کا قیام

تولیت (MANDATE) کے اس زمانے میں فلسطین میں یہودیوں کی آبادی اور اثر بڑھا۔ ہزاروں کی تعداد میں یورپی پناہ گزیں فلسطین آنے لگے، جس سے وہاں یہودی حکومت کی مانگ کو بہت تقویت پہنچی۔

ظاہر ہے عرب اپنے سینے میں یہ ناسور کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ مصر، شام، عراق، اردن، سعودی عرب اور یمن نے اسرائیل کے قیام کی زبردست مخالفت کی۔ برطانیہ، جس نے یہودی ریاست کے خیال کو ہوا دی تھی اب عربوں کی مخالفت کے پیشِ نظر اپنے مفاد کی خاطر عربوں سے ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہودی پناہ گزینوں کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ اقوام متحدہ میں بھی اس کا رویہ عربوں کی ہمدردی میں رہا، لیکن بالآخر امریکہ کی کوششوں اور تعاون سے ۱۴ مئی ۱۹۴۹ء کو فلسطین میں جہاں دو ہزار سال سے عربوں کی نوّے فی صدی اکثریت تھی، ایک یہودی ریاست 'اسرائیل' کا قیام عمل میں آیا، اور ہزاروں لاکھوں عربوں کو اپنے آبا و اجداد کی زمین کو خیرباد کہنا پڑا اور جو آج اپنے وطن لوٹ جانے کی امید میں خیموں میں یا، ان کے ٹکڑوں پر پڑے ہوئے ہیں۔

۱۴ مئی کے اعلان کے ساتھ ہی عرب لیگ کی سب ممبر حکومتوں نے اسرائیل سے جنگ کا اعلان کر دیا لیکن جنگ میں شکست عربوں کو ہی ہوئی۔

اس ناکامی کا عرب ممالک کی سیاست پر گہرا اور مستقل اثر پڑا۔ جنگ میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ آپس کی نا اتفاقی اور ذاتی اغراض تھیں۔ اس کے علاوہ جنگ میں فوجیوں کو پرانے اور نکمے اسلحے دیئے گئے تھے، جس کی ذمہ داری شاہ فاروق پر آتی ہے۔ میدان میں لڑنے والی فوجوں کو جنگ کا سامان اور غذا تک نہیں مل سکی، لڑائی کے نقشوں، راستوں اور پلاننگ تک سے واقف نہیں کیا گیا۔ حکومتوں کے سربراہوں نے جنگ کی کسی ضرورت میں دلچسپی نہیں لی، بلکہ الٹا جنگ میں ناکامی کی تمام ذمہ داری فوج پر ڈال دی۔ شام میں اس وقت فوج کے اخراجات گھٹا دیئے گئے جب کہ فوج کو اخراجات کی بہت ضرورت تھی۔

اور انہی سب وجوہات کی بنا پر شام اور مصر میں فوجی انقلابات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں کرنل زعیم نے پہلی بار پارلیمانی حکومت توڑ کر فوجی حکومت قائم کی، لیکن اپنی سخت گیری کے باعث اور دیگر داخلی سیاست کے مسائل کے پیش نظر زعیم کے بعد کرنل حنّاوی اور کرنل ششاکلی نے حکومتیں قائم کیں۔ اسی طرح مصر میں کرنل ناصر کی قیادت میں فوج نے حکومت کا انتظام سنبھالا۔

اسی طرح عراق، پاکستان، سوڈان اور ترکی وغیرہ میں ہر وہ حکومت جس نے عوام کی منشاء اور فلاح کو نظر انداز کر کے بیرونی ممالک سے ناطہ جوڑا، فوج کے عتاب سے نہیں بچ سکی۔ ان میں تقریباً ہر ملک میں فوج نے خود غرض، نکمی اور نااہل سیاسی جماعتوں اور نوری سعید اور مندریس جیسے سامراج پرست قوم فروشوں کو ختم کر کے کہ جن کے سینے میں اپنی قوم کی فلاح و بہبود سے زیادہ دوسروں کی ترقی اور حفاظت کا غم تھا، نئی زندگی کی امید دلائی ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ آج ان میں ہر ملک کے عوام پہلے سے زیادہ مطمئن اور آسودہ حال ہیں، اگرچہ اس اطمینان اور آسودگی کی قیمت ان کی آزادی فکر و خیال اور دوسرے بنیادی جمہوری حقوق ہیں۔

حالاتِ حاضرہ

الجزائر اور فرانس

خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ الجزائر کی عارضی قومی حکومت اور ڈیگال کی حکومت کے مابین عنقریب کوئی سمجھوتہ ہو جائے گا اور الجزائر میں سات سال سے قوم پرست آزادی کی جو لڑائی لڑ رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گی۔ ابھی تک ہر چیز صیغۂ راز میں ہے لیکن فرانسیسی حکومت کے قریبی حلقوں کی اطلاع ہے کہ فریقین مندرجہ ذیل باتوں پر متفق ہو گئے ہیں:۔

(۱) صحارا الجزائر کے علاقے کا حصہ ہوگا اور فرانس کو وہاں معاشی حقوق حاصل ہوں گے۔

(۲) ہوائی اور بحری فوجی اڈے فرانس کو پٹے پر دئے جائیں گے۔

(۳) "حق خود ارادیت" سے متعلق جو استصواب رائے ہوگا اس کے بعد کئی سال تک (فوجی اڈوں کے علاوہ) فرانس کی کچھ فوجیں الجزائر میں رہیں گی۔

(۴) فرانس الجزائر کو کافی معاشی اور مالی امداد بہم پہنچائے گا۔

(۵) الجزائر میں یورپ کے جو لوگ بس گئے ہیں ان کے شہری، مذہبی، قانونی اور ملکیت کے حقوق محفوظ رہیں گے۔

۱۱ فروری کو جب سمجھوتہ سے متعلق گفت وشنید کا دوبارہ آغاز ہوا تھا تو دو اہم معاملات طے ہونے کو باقی تھے۔ (۱) جنگ کے بند ہونے کے بعد استصواب رائے کے لئے جو عارضی حکومت قائم ہو اس کی تشکیل کس طرح ہو اور اس کے اختیارات کیا ہوں؟ یہ بات پہلے ہی طے ہو چکی تھی کہ جو حکومت بھی قائم ہوگی اُس کا چیئرمین مسلمان ہوگا۔)

۲۔ اگر استصواب رائے ایک آزاد الجزائری ریاست کے قیام کے حق میں فیصلہ دیتا ہے تو ہر اس یورپین کو جو الجزائر میں پیدا ہوا ہے خود بخود الجزائر کی قومیت مل جائے گی یا نہیں؟

معلوم نہیں یہ تمام باتیں کہاں تک صحیح ہیں، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس بار ہر دو فریق صلح اور تصفیہ کے خواہاں ہیں اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ الجزائری شہیدوں کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ ہم یہاں اس خونین داستان کو نہیں دہرائیں گے جو "مہذب جمہوری دنیا" کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے، (اگرچہ یہ دنیا ایسے بدنما داغوں کی عادی ہو چکی ہے) ہم الجزائریوں کی جانی و مالی قربانیوں اور ان کے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کی مصیبتوں اور آزمائشوں کا ذکر بھی نہیں کریں گے کہ 'دار و رسن' کی یہ حکایت خونچکاں سب کو معلوم ہے، ہم اُس خفیہ فوجی تنظیم سے بھی بحث نہیں کریں گے جو پلاسٹک بموں کی دہشتناکی کا مظاہرہ کرکے ڈیگال کو خوفزدہ کرتی رہی ہے اور آج بھی ایک طرف اہل فرانس کی نیندیں حرام کئے ہوئے ہے اور دوسری طرف الجزائر کے تمام بڑے شہروں پر خوف و ہراس کا سایہ ڈالے ہوئے ہے کہ یہ خبریں بھی ہر روز اخباروں میں آتی ہیں، ہمیں دراصل بحث اس سے ہے کہ آج جبکہ الجزائری قوم پرست آزادی کی منزل سے قریب آن لگے ہیں، اُن کے افکار و خیالات کے رنگ سے کل کے الجزائر کا کیا نقشہ مرتب ہوگا اور آزاد الجزائری حکومت کے خد و خال کیا ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج یہی چیز اہمیت رکھتی ہے اور ایک حد تک یہی بات اب تک فرانس کو "گو مگو" اور "چہ کنم" کی کیفیت میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

الجزائر کا مستقبل

سامراجی نظام کے خلاف ایشیا اور افریقہ کی اُن قومی تحریکوں کی جو ایک عرصہ تک جد و جہد اور آزمائش و ابتلا کی گوناگوں منزلوں سے گزری ہیں، کم و بیش ایک خصوصیت یہ رہی ہے کہ بدیسی راج کے خلاف محکوم ملک کے مختلف النوع نظریات رکھنے والے سب ہی عناصر ایک جھنڈے کے نیچے جمع رہے ہیں آزادی کی جنگ کے دوران میں فکری اختلافات کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتے تھے، لیکن محکومی سے نفرت اور آزادی کی تڑپ اُن اختلافات کو دبا دیتی تھی یا زیادہ گمبھیر صورت اختیار کرنے سے روک دیتی تھی، لیکن جب محکومی کا سنگ گراں راہ سے ہٹ گیا اور مثبت خطوط پر ایسی قوموں کو 'اثباتِ خودی' کا رنگ بھرنا پڑا اور نئے نظام کی تعمیر کا مسئلہ سامنے آیا تو نظری اختلافات شدت کے ساتھ اُبھرے، دائیں بازو اور بائیں بازو، رجعت پرستی اور ترقی پسندی کی بحثیں چھڑیں اور نئی آزاد قوموں کو نئے نئے چیلنجوں کا جواب دینا پڑا۔ الجزائر جد و جہد اور آزمائشوں سے گذرا ہے اور وہاں کے قومی

کیمپ میں بعد ڑوا قوم پرست، سوشلسٹ، کیمونسٹ اور مذہبی رہنما شامل رہے ہیں، اس لئے آزادی کے بعد الجزائر والوں کو ان عناصر کے فکری اختلافات اور اُن سے پیدا ہونے والے نت نئے مسائل سے دو چار ہونا پڑے گا۔ آزادی کے بعد کا الجزائر اس خاص نقطۂ نظر سے بھی "مغرب" میں ایک دلچسپ تجربہ گاہ ثابت ہوگا۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ قومی آزادی کے محاذ (الجزائر کی قومی تحریک FLN کے نام سے مشہور ہے۔ آئندہ اسے ہم محض قومی تحریک کہنے پر اکتفا کریں گے) اور اس کے فوجی پیرؤں کا فکر کیا ہے، اصول یا عقیدہ کیا ہے، یہاں مذہبی عقیدے سے بحث نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ نئے نظام کو تعمیر کن اصولوں پر کریں گے، اس وقت الجزائر میں برسوں کی مسلسل جنگ کی وجہ سے ہر طرف بربادی اور تباہی کے آثار نمایاں ہیں، نئی نسل جس نے یہ جنگ لڑی ہے سنجیدہ اور منظم ہے، اس لئے یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ ان کے دلوں میں اپنے وطن عزیز کی تعمیر کی جو حسرت ہے وہ کس اصول اور طریقۂ کار کے سہارے پوری ہوگی۔

الجزائر کے قوم پرست انقلاب کے خواہاں کیوں ہیں؟ اُن کا جواب یہ ہے کہ ہم نے قومی جنگ کے سلسلہ میں جو بے پناہ قربانیاں دی ہیں اُن سے مقصود صرف یہی نہیں رہا ہے کہ ہم دنیا پر یہ ثابت کریں کہ ہمارا قومی شعور بیدار ہے اور قومی غیرت کی چنگاریاں ہماری رگوں میں موجود ہیں، ۱۹۵۴ء سے پہلے الجزائر اپنے نوّے فیصدی باشندوں کے لئے قحط، مفلوک الحالی اور مایوسیوں کا ایک ویرانہ تھا، آج یہ بربادیوں کا ایک وسیع صحرا ہے، اس لئے ہمارے سامنے دو مقصد ہیں۔ (۱) آزادی کی لڑائی جیتنا اور (۲) بالکل نئی بنیادوں پر الجزائر کی نئی تشکیل کرنا۔ اس سے کم میں دس لاکھ شہیدوں کے خون کی قیمت ادا نہیں ہوسکتی۔

تعمیر نو کی بنیادیں کیا ہوں گی؟

زرعی اصلاح، ظاہر ہے کہ پہلا قدم ہوگا، اس وقت الجزائر میں ۹۵ فیصدی آبادی ایسی ہے جس کے پاس ملک کی زمین کا دو تہائی حصہ ہے اور وہ بھی دوسرے اور تیسرے درجہ کی زمین کا۔ اور باقی ایک تہائی حصہ جو بہترین ہے، یورپین باشندوں کے قبضہ میں ہے، ۱۸۷۰ء کے بعد الجزائر میں صرف شراب کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ چھتیس گنا، (اس شراب کا بڑا حصہ فرانس بھیجا جاتا ہے)

جبکہ اس صورت میں کہ ۱۸۷۰ء کے بعد وہاں کی آبادی تین گنا بڑھی ہے لیکن غلّہ کی پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے نتیجہ یہ ہے کہ قحط اور فاقہ کشی کی لعنت میں تقریبًا پورا ملک گرفتار رہا ہے۔ لہٰذا قوم پرستوں کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ زرعی اصلاح کی طرف فوری توجہ کریں لیکن اس قسم کی زرعی اصلاح بیکار ہوگی اگر زمین کے ٹکڑے کسانوں میں تقسیم کئے جائیں، یہ تو وہی بات ہوئی کہ نوآبادیاتی نظام سے پہلے کی صورت حال پھر پیدا کر دی جائے، اس لئے قومی تحریک کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ وہ نجی ملکیت کے تصور کو خیرباد کہہ کر اجتماعی ملکیت کے اصول پر کاربند ہوں گے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ سوشلزم کے طریقہ کار کو اپنائیں گے، ظاہر ہے کہ یورپین زمینداروں کے مفاد پر اس کی ضرب کاری ہوگی، ہم نے شروع میں کہا ہے کہ الجزائر اور فرانس میں ہونے والے سمجھوتے کی جو غیر سرکاری خبریں مل رہی ہیں ان کے مطابق الجزائر والوں نے یہ مان لیا ہے کہ یوروپینوں کے ملکیت کے حقوق محفوظ رہیں گے، ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ معلوم نہیں یہ کہاں تک صحیح ہے۔ بہرحال، اگر سمجھوتے کی ایک شرط یہ ہے تو انقلابیوں کے اجتماعی ملکیت کے اس تصور سے اس کا تصادم ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے یہ شرط مصلحتًا دفع الوقتی کے لئے مان لی ہو، اگر ایسا ہے تو آئندہ پیچیدگیاں ضرور پیدا ہوں گی، ممکن ہے اس طرح الجزائر خانہ جنگی کی مصیبت میں مبتلا ہو جائے، یہ بھی ممکن ہے کہ ڈیگال نے خود خفیہ فوجی تنظیم (O A S) کے زور کو کم کرنے اور یوروپی آبادی کی عارضی تسلی کے لئے قوم پرستوں سے یہ بات منوالی ہو، لیکن اس صورت میں بھی پیچیدگی پیدا ہوسکتی ہے خواہ اس کا پیمانہ اول الذکر کے مقابلے میں چھوٹا ہو۔

قومی تحریک کے رہنما اپنے پروگرام کے دوسرے پہلوؤں پر بھی زور دیتے ہیں مثلًا تعلیم، سوشل سروسز، ضروریات زندگی کی فراہمی اور صنعتی ترقی۔ اُن سے جب پوچھا جاتا ہے کہ O A S اور ان کے یوروپین حمایتیوں کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے تو وہ اس پر مسکرا دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے OAS ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں، اگر ڈیگال عبوری دور میں ہمارے ساتھ تعاون کرے تو ہم اس خفیہ تنظیم سے بہت ہی مختصر وقت میں نبٹ سکتے ہیں۔

یہ کہنا غلط ہے کہ آزاد ہوتے ہی الجزائر فرانس سے اپنے تمام تعلقات ختم کر لے گا، اگر فرانس نے آزاد الجزائر کو سمجھ لیا اور اس کی امنگوں کو سہارا دینے کا فیصلہ کیا، تو الجزائر کے رہنما اس کے اشتراک و تعاون کا خیر مقدم کریں گے، مگر قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ الجزائر کے لوگ فرانس کی خاطر کسی طرح بھی سرد جنگ کے مضرت رساں

چکر میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، فرانسیسی اور دوسری غیر ملکی کمپنیوں کو وہ صحارا میں تیل اور گیس کے ذخائر کی دریافت کے لئے مراعات دیں گے لیکن دوسرے ملکوں سے بھی مالی اور تکنیکی امداد لینے سے گریز نہیں کریں گے، قومی تحریک کے تقریباً تمام ذمہ دار ترجمان اس رجحان کے حامل معلوم ہوتے ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آزاد الجزائر کی خارجہ پالیسی کم و بیش وہی ہوگی جو ہندوستان اور مصر کی ہے یعنی اشتراکی تعمیر نو اور آزاد اور غیر جانبدار خارجہ پالیسی، دیکھنا یہ ہے کہ جذباتی فرانسیسی قوم کہاں تک قومی تحریک کے ان عزائم کا ساتھ دیتی ہے۔

الجزائر کی قومی تحریک میں یہ رجحان بھی بہت قوی رہا ہے اور ٹیونس اور مراکش کے نوجوان قوم پرست اس کے حامی ہیں کہ ٹیونس، الجزائر اور مراکش کا ایک وفاق ہو، یعنی کسی نہ کسی روپ میں مغرب کا اتحاد ہو جائے اور بقول فرحت عباس کے جو آج بھی اتنا ہی صحیح ہے، شمالی افریقہ کی ان ریاستوں کا وفاق اس طرح ہو کہ تعلیم، معاشی معاملات، صنعتی پروگرام، قومی دفاع اور خارجہ امور میں یہ ممالک ایک مشترک پالیسی اختیار کریں، اسی کے ساتھ یہ خیال بھی مقبول ہو رہا ہے کہ مغربی سوڈان سے بھی قریبی معاشی و اقتصادی تعاون کی راہ پیدا کی جائے تاکہ وہ بھی صحارا کے تیل اور گیس کے ذخیروں سے فیضیاب ہو سکے۔

الجزائر کی قومی جنگ میں عورتوں نے نمایاں حصہ لیا ہے اور اس جنگ کی وجہ سے معاشرہ کے روایتی نظام میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں، عورتوں کی بیداری نئے الجزائر کا طرۂ امتیاز ہے، یہ فال نیک ہے، آزادی کے بعد معاشرتی سطح پر ایک چیلنج یہ ہوگا کہ عورتوں کی اس بیداری میں توازن کہاں تک قائم رہتا ہے، دوسرا مفید نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ الجزائر کے مختلف قبیلوں کے درمیان جو پرانی دیواریں کھڑی تھیں وہ گر گئی ہیں اور شمالی علاقے اور جنوبی حصے میں جو اجنبیت تھی وہ بھی دور ہو گئی ہے، قومی تحریک نے قومی یکجہتی کی بڑی خوشگوار فضا پیدا کر دی ہے، لیکن یہ یکجہتی پائدار اسی وقت ہو سکتی ہے جب الجزائر میں کسی جماعت یا علاقے کو یہ شکایت نہ ہو کہ وہ قومی تعمیر و ترقی کے منصوبے میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

یمن نے متحدہ عرب جمہوریہ سے اپنا ناتہ توڑ لیا

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ الجزائر کا عزم یہ ہے کہ آزاد ہونے کے بعد ہندوستان اور مصر کی طرح اپنی

معاشی اور معاشرتی تنظیم سوشلسٹ اصولوں پر کرے، مصر نے سوشلزم کو اپنا لیا ہے اور صدر ناصر اسے عرب سوشلزم کے نام سے پیش کرتے ہیں، یعنی مارکسی جدلیاتی تصور سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ مذہب کی دشمن اور خدا سے منکر ہے، لیکن جہاں تک سوشلائزیشن کے اصولوں کا معاملہ ہے، صدر ناصر عرب ممالک کی ترقی کے لئے اُن پر عمل درآمد ناگزیر سمجھتے ہیں اور بغیر کسی فقہی اجتہاد اور علمی استدلال کے وجدان کی بنا پر صاف صاف کہتے ہیں کہ عرب سوشلزم اور اسلام میں کوئی تفاوت و تضاد نہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سماجی انصاف سے متعلق اسلام کا جو تصور ہے وہ سوشلزم کی حد تک پہنچتا ہے لیکن اس بحث میں پڑے بغیر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یمن جیسی قرون وسطیٰ کی خصوصیات رکھنے والی ریاستیں اور ان کا سیاسی اور سماجی نظام اسلام کے اجتماعی عدل کے عین خلاف ہے، عرب سوشلزم کے نظریے کو اگر تقویت ملتی ہے اور اسے شرف قبول حاصل ہوتا ہے تو اس سے مستبد شیخوں اور خود سر امیروں کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے اور مذہبی رجعت پرستی کے رسوا ہونے کے امکانات بھی قوی ہو جاتے ہیں۔ شیخ یمن کو صدر ناصر کی اس آئیڈیالوجی سے خطرہ محسوس ہوا اور انھوں نے متحدہ عرب جمہوریہ سے یمن کی علاحدگی کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر انھوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا، اس قصیدے میں اسلام اور انصاف کے نام پر بے عنان نجی ملکیت کے تصور کی حمایت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ دوسروں کی کمائی پر قانون کی آڑ لے کر، قبضہ کرنا غصب ہے اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، ظاہر ہے کہ روئے سخن صدر ناصر کی طرف ہے جنھوں نے سرمایہ داری کے خلاف ہلّہ بول رکھا ہے، یاد رہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ سے شام کے الگ ہونے کا بھی یہی سبب تھا، شام میں سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کا وہ گروہ جو خمیسہ کہلاتا ہے اور شام کی قومی آمدنی کے تقریباً نصف حصہ پر قابض ہے، صدر ناصر کی زرعی اور مالی اصلاحوں کو اپنے مفاد کے حق میں مُضر تصور کرتا تھا، اس لئے اُس نے فوجیوں سے ساز باز کر کے فوجی انقلاب برپا کیا اور متحدہ عرب جمہوریہ سے شام کا رشتہ منقطع کر لیا۔

عرب ملکوں کا اپنا الگ الگ سیاسی و معاشی نظام رہا ہے، تعلیمی و تہذیبی معیار بھی مختلف رہے ہیں کوئی ترقی کر رہا ہے، کوئی اپنی پسماندگی ہی پر قناعت کئے ہوئے ہے، کہیں ایک باشعور اور بیدار متوسط طبقہ ہے جو سیاست اور معاشرت پر اثر انداز ہوتا رہا ہے، کہیں متوسط طبقہ سرے سے ہی مفقود ہے، کسی کو

عہد جدید کے حلیفوں کا احساس ہے تو کسی کو قرون وسطیٰ کے جاگیری نظام ہی میں ساری برکتیں نظر آ رہی ہیں، شیخوں، امیروں اور شاہوں کی ذاتی مصلحتیں اور خود غرضیاں ہیں کہ ترقی کی راہ کو ردکے کھڑی ہیں، الغرض عرب ملکوں کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ" ہے اور اس کے حل ہونے میں دیر لگے گی۔

ہراساں و لرزاں لبنان

یکم جنوری ۱۹۶۲ء کی شب میں لبنان میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی گئی جو ناکام رہی، مغربی ایشیا کے پریس نے یہاں تک کہ لبنان کے ان اخباروں نے جو مغرب کے ہواخواہ اور ہمدرد ہیں ایک آواز ہوکر یہ بات کہی کہ انقلاب کی اس ناکام کوشش میں بدیسی حکومتوں کا ہاتھ ہے، اس وقت سے لے کر اب تک یہ بات کسی قدر واضح ہو چکی ہے کہ پی، پی، ایس (Parti Populaire Syrien) کی مدد سے برطانیہ اور اُردن مغربی ایشیا کے نقشے میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں، اس علاقے سے جو خبریں موصول ہو رہی ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ لارڈ ہوم اور شاہ حسین کسی نئی مہم جوئی پر آمادہ ہیں، پی۔ پی ایس ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی، انطون سعدہ ایک لبنانی اس کے بانی تھے، اس کے قیام کا سبب تقریباً وہی تھا جو نازی پارٹی کے قیام کا تھا یعنی یہ وارسائی کے معاہدۂ صلح کے خلاف ایک احتجاج تھا، نازی پارٹی کی طرح یہ بھی دائیں بازو کی آمرانہ اور تشدد پر ایمان رکھنے والی جماعت تھی، اس کے دو بنیادی تصورات تھے۔

(۱) عظیم تر سیریا — اس میں اس وقت کا شام، لبنان، اردن اور اسرائیل کا علاقہ شامل تھا، انطون کا کہنا تھا کہ یہ ایک جغرافیائی وحدت ہے اور یہاں کے رہنے والے سیرین ہیں عرب نہیں۔ اُس کے نزدیک عرب وہ بدو تھے جو سعودی عرب کے باشندے تھے۔ اس تصوّر کی تبلیغ سے غالباً اُس کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان اور فرانس کی اُس اسکیم کو جس سے LEVANT کا علاقہ کئی حصّوں میں منقسم ہو جاتا تھا، ختم کر دیا جائے۔

(۲) انطون کا دوسرا بنیادی تصوّر یہ تھا کہ مذہب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے یعنی عظیم تر سیریا کی جو ریاست بنے وہ مکمل طور پر ایک سیکولر ریپبلک ہو، اور کسی قدر سوشلسٹ رجحان رکھتی ہو،

بعد میں عراق کا علاقہ اس منصوبے کا ایک جزو بنا لیا گیا اور سائپرس کا جزیرہ بھی اس تخئیلی

ریاست میں شامل ہوگیا، اس طرح عظیم تر سیریا اور FERTILE CRESCENT میں کوئی خاص فرق نہیں رہ گیا۔

ہم اس موقع پر اس جماعت کی تاریخ نہیں بیان کریں گے بلکہ اس کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ عراق اور مصر کی طرف سے مایوس ہوکر انگریزوں نے اپنی ساری امیدیں شاہ حسین سے وابستہ کررکھی ہیں۔ عرب اتحاد کا نعرہ کافی مقبول ہے اور باوجود اس کے شام اور یمن نے متحدہ عرب جمہوریہ سے علیحدگی اختیار کرلی ہے، معقول اور صحیح عرب قومیت و اتحاد کے نظریے میں بڑی دلکشی ہے اور یہ دیر یا بہ زود عرب سوشلزم کے تصور کے سہارے قومیت و اتحاد کا یہ جذبہ بھی اتنا قوی ہوجائے گا کہ اس علاقہ میں بیرونی طاقتوں کا سیاسی اثر اور معاشی مفاد خطرہ میں پڑجائے گا۔ شاہ حسین عرب قومیت کی کامیابی میں ناصر کا عروج دیکھتے ہیں، وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ عرب قوموں کی رہنمائی کا اعزاز مصر کو ملے، اس لئے انھوں نے پی۔پی۔ ایس سے اپنے قدیم تعلقات کی تجدید کی ہے، ۱۹۵۴ء سے لے کر اب تک یہ تعلق کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا ہے، پی۔پی۔ ایس نے بھی ایک عرصہ سے اپنی توقعات ہاشمیوں سے وابستہ کررکھی ہیں، عراق میں انقلاب سے پہلے شاہ فیصل کی حکومت کے ساتھ ملحق کردہ شام کی فتح کے خواب دیکھا کرتی تھی، لیکن اب شاہ حسین ان کی امیدوں کا مرکز ہے، ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۱ء کو لبنان میں حکومت کا تختہ الٹنے کی جو کوشش کی گئی تھی اس میں انھیں دونوں کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ آج لبنان میں اگرچہ پی۔پی۔ ایس کے کافی لوگ گرفتار ہوچکے ہیں اور امریکہ اور فرانس نے لبنانی حکومت کو اپنی اخلاقی اور مادّی امداد کا یقین بھی دلادیا ہے، لیکن پھر بھی مغربی ایشیا اور مشرقی بحیرۂ روم میں انگریزی فوجوں کی نقل وحرکت کے پیش نظر لارڈ ہوم کی طرف سے لبنان کو اطمینان نہیں ہے، جانسن کے جو مراسلے جنوری اور فروری کے مہینے میں اسٹیٹسمین (دہلی) میں شائع ہوئے ہیں۔ اُن کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ایشیا کے اس علاقے میں کوئی بڑا واقعہ ظہور پذیر ہوجائے تو وہ حالات و خیالات کے سلسلہ کا ایک متوقع منطقی نتیجہ ہوگا، اور دنیا کے باخبر حلقوں کو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوگا۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں ہنگامہ

فروری کے پہلے ہفتہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سہروردی کی گرفتاری کے سلسلے میں مظاہرہ کیا

در پولیس اور فوج سے ان کا تصادم ہوا، حکومت نے جب سہروردی کو گرفتار کیا تو مشرقی پاکستان کے اخباروں کو اس کی ممانعت کردی کہ وہ اس سے متعلق کوئی خبر نہ شائع کریں، اس سے لوگوں میں اور خاص طور سے طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی، حکومت نے حالات کو ناقابل اطمینان دیکھ کر یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے کہا کہ وہ رمضان شریف کے بہانے یونیورسٹی کو ایک ماہ کے لئے بند کردیں، چنانچہ اس کا اعلان کردیا گیا، یہ فیصلہ عام رواج کے خلاف تھا، غالباً مقصد یہ تھا کہ یونیورسٹی کے قریب ہوسٹلوں میں جو طلبہ رہتے ہیں وہ اپنے اپنے گھر چلے جائیں اور اس طرح فضا کی گرمی ٹھنڈی پڑ جائے۔ اس غیر متوقع چھٹی کی خبر پاکر طلبہ نے یونیورسٹی کے احاطہ میں ایک جلسہ کیا جس میں قراردادوں کے ذریعہ یونیورسٹی بند کرنے کے فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا گیا اور پاکستان میں جمہوریت کی بحالی اور سیاسی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، پھر اس کے بعد جلوس نکلا، صدر ایوب کی قلمی تصویریں اور فوٹوگراف جلائے گئے، پولیس اور فوج سے تصادم ہوا، لوگ زخمی ہوئے اور کئی موتیں واقع ہوئیں۔

سہروردی پر حکومت نے یہ الزام لگایا ہے کہ اُن کی سرگرمیاں پاکستان کی سالمیت اور سلامتی کے حق میں مہلک تھیں اور ان کا تعلق اندر اور باہر پاکستان دشمن عناصر سے تھا، رموزِ مملکت، تو خداوندِ مملکت پاکستان کے سربراہوں ہی کو معلوم ہوں گے، ہاں تعجب ضرور ہے کہ سہروردی فوجی حکومت کی نگاہوں کے سامنے سے کس طرح بچ کر باغیانہ سرگرمیوں میں مصروف تھے، ایک خیال یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان میں اب پھر اُن کا اثر بڑھنے لگا تھا، صدر ایوب کو مشرقی پاکستان کی بےچینیوں کا احساس ہے۔ چنانچہ پاکستان کے اس حصہ کے اپنے حالیہ دورے میں انھوں نے وہاں کے عوام کو مستحکم نظم و نسق کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے خلاف انتباہ دیا تھا اور کہا تھا کہ اگر انھوں نے غیر ذمہ دارانہ حرکتیں کیں تو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

مشرقی پاکستان کی ان بےچینیوں کا سبب کیا ہے؟ صدر ایوب کو اس طرف توجہ کرنا چاہیئے، اس کی نوعیت سیاسی اور معاشی دونوں طرح کی ہے، اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں سیاسی بیداری بھی زیادہ ہے اور خاص طور سے طلبہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ حساس ہیں، فوجی حکومت کی زندگی ایک معقول مدت سے زیادہ کی ہوگئی ہے اور چونکہ اس حکومت میں مقامی آزادی اور

شہری آزادیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لئے مشرقی پاکستان کے عوام میں یہ احساس شدت سے بڑھ رہا ہے کہ مغربی پاکستان نے اس مشرقی صوبے کو اپنی نوآبادی تصور کر لیا ہے، یونیورسٹی کے احاطہ میں جو قرار دادیں پاس ہوئیں اُن میں جمہوریت کی بحالی کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں جبر اور طاقت کا پنجہ زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کیا جا سکتا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علاقائی عصبیت مبہم قومیت کے بھیس میں سر ابھارنے لگتی ہے، صدر ایوب نے اعلان کیا ہے کہ پاکستان کے دستور کا اعلان جلد ہی ہو جائے گا، اور جیسا کہ معلوم ہے اس دستور کا طرۂ امتیاز "بنیادی جمہوریت کا نظریہ" ہوگا، لیکن بنیادی جمہوریت کا پودا ایک دن میں پروان نہیں چڑھ سکتا، اس میں وقت لگے گا اور اس عرصہ میں اگر اسی طرح کے تصادم ہوتے رہے اور فوجی نظم و نسق کی چولیں بھی ڈھیلی ہو گئیں تو پھر کیا ہوگا؟ یہ ایک سوال ہے جو پاکستان کے اندر بھی اور باہر بھی پاکستانی معاملات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑی گمبھیرتا اختیار کرتا جا رہا ہے۔

(ض، ح، ف)

۲۰ر فروری ۱۹۶۲ء

رسالہ "جامعہ" کے پُرانے پرچے

۱۹۴۷ء سے پہلے کے پرچے ہمارے یہاں نہیں ہیں بعض حضرات انھیں خریدنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب انھیں بیچنا چاہیں تو تفصیلات سے آگاہ فرمائیں۔

تعلیمی مسائل

اساتذہ کی تربیت

دولتِ مشترکہ کی دو ہفتہ تعلیمی کانفرنس امسال ۵ ۲ر جنوری کو دہلی میں ختم ہوئی۔ اس کانفرنس میں تیرہ ممالک کے دو سو مند وبین شریک ہوئے۔ اس موقعے پر تعلیمی معاملات میں اشتراکِ عمل کے دائرے کو وسیع کرنے کے لئے تجاویز منظور کی گئیں اور آپس کے تعاون کو وسیع بنانے پر زور دیا گیا۔ یہ کانفرنس پہلی بار ۱۹۵۹ء میں آکسفورڈ میں منعقد ہوئی تھی۔ پہلی کانفرنس کے مقابلے میں یہ کانفرنس کہیں زیادہ مختلف اقوام کی نمائندہ اور کہیں کم برطانوی نظر آئی۔ تاہم تعلیم کے میدان میں برطانیہ کی مرکزی حیثیت اور اس کی فوقیت اب بھی مسلّم تھی۔ ادھر چند سال کے اندر جامِ آزادی سے سرشار ہونے والے ممالک میں، ہندوستان کے علاوہ سب ہی نے اپنی اعلیٰ تعلیم کی درسگاہیں، انگلستان کے اداروں کی سرپرستی اور ان کے تتبّع میں ہی تشکیل کی ہیں۔ اور اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں بڑی حد تک محدود اور قدامت پسندانہ رویہ ہی اختیار کیا گیا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر پنڈت نہرو کے الفاظ برمحل اور بصیرت افروز نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افتتاحیہ خطبے میں اس بات پر زور دیا کہ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے والے نو وارد ممالک کو پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو ذہنی اور تعلیمی وسائل میں خود کفیل بننے کی سعی کرنی چاہیئے۔

اگر پہلی کانفرنس کا کارنامہ دولتِ مشترکہ کے ممالک کے لئے وظائف اور تعلیمی امداد قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کانفرنس کا طرۂ امتیاز یہ سمجھنا چاہیئے کہ معاشی اعتبار سے جن ممالک نے اب ترقی کے میدان میں قدم رکھا ہے، اُن میں تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی کو اہمیت دی جائے۔ کانفرنس کے آغاز سے ہی اِن ملکوں نے اس بات پر زور دینا شروع کر دیا تھا کہ وہ ایک مدت تک اپنے آپ کو خود کفیل بنانے کے لئے ترقی یافتہ ممالک سے امداد کے خواستگار رہیں گے اور اُن کی سب سے اہم اور اشد ضرورت یہ ہے کہ ان کے یہاں تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی اور ان کی تربیت کا بہتر انتظام

ہوسکے۔ اس ضرورت کی تکمیل کی غرض سے دولت مشترکہ کے سب ہی ممالک نے واضح طور پر اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کیا اور اساتذہ کی تربیت اور فراہمی کے لئے متعدد نئے وظائف کا اعلان مختلف ممالک کی طرف سے کیا گیا۔ وظائف کی اسکیم کا جائزہ لینے اور اس کی توسیع کے امکانات پر غور کرنے کے علاوہ اس کانفرنس نے تعاون کی تین اور نئی راہیں تلاش کیں۔ اُن میں سے ایک چیز یہ ہے کہ ان ممالک میں سماجی اور دیہی تعلیمی اداروں میں باہمی اشتراک پیدا کیا جائے۔ دوم، اجتماعی طور پر دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک میں انگریزی زبان کو 'دیگر زبان' کی حیثیت سے پڑھانے اور اس کی تدریس کے طریقوں کو بہتر بنانے کی ضرورت کو واضح کیا گیا۔ تیسری بات درسی کتب کی فراہمی، فنی تعلیم اور توسیع تعلیم کے مالی مسائل سے متعلق تھی۔ ہندوستان کی طرف سے اس موقعے پر یہ پیش کش کی گئی کہ ان ممالک میں اساتذہ کی تربیت کے لئے سو مزید وظائف دئے جائیں گے۔ دوم انجینیرنگ کے اداروں میں داخلے کے لئے چند جگہیں متعین کی جائیں گی اور حیدر آباد کی انگریزی زبان کی درسگاہ میں انگریزی کو دوسری زبان کی حیثیت سے سیکھنے کے سلسلے میں تحقیقی کام کرنے والوں کی تربیت کا انتظام کیا جائے۔

اس کانفرنس کی رپورٹ میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے کہ تعلیمی ترقی کا انحصار بڑی حد تک اساتذہ اور ماہرین تعلیم کی ذات پر ہے۔ اس لئے اساتذہ کی تربیت، ان کی فراہمی اور افسرانِ تعلیم کے لئے امدادی نصاب کا انتظام، ان کے نئے نئے آزاد ممالک میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ان مسائل کی طرف توجہ دینے پر زور دیا گیا۔ ریاضی، سائنس اور انگریزی زبان کے مخصوص اساتذہ کو مقرر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ اس کانفرنس نے ابتدائی مدارس میں اساتذہ کے عالمگیر قحط کو بھی تسلیم کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ان اساتذہ کو رہنے سہنے کی بہتر سہولتیں فراہم کرکے اُن کی ملازمت کو برقرار رکھنے کی ضمانت کی جائے۔ جہاں تک صنعتی تعلیم کے اساتذہ کا تعلق ہے یہ محسوس کیا گیا کہ ان کی کمی صرف اعلیٰ تعلیم کے مدارج پر ہی محسوس نہیں ہوتی بلکہ تعلیم کی ثانوی منزل پر بھی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی تجویز کیا گیا کہ اساتذہ کی فراہمی کا جو بھی پروگرام مرتب کیا جائے اُس میں ان کی تربیت کرنے والے معلموں کی فراہمی کا بھی خیال رکھا جائے۔ کانفرنس میں انگریزی کو دیگر زبان کی حیثیت سے پڑھنے کی بابت کئی اہم تجاویز منظور کی گئیں۔ برطانیہ نے اس کام کے لئے تیس

ساتذہ کو تربیت دینے کا اعلان کیا۔ سماجی تعلیم کے کام کو بھی اس کانفرنس نے بڑے پیمانے پر کرنے کے
ے لیا اور زور دیا کہ اس کام کو بہتر اور پہلے سے زائد منظم طور پر ہونا چاہیئے۔ سماجی تعلیم کے بدلتے ہوئے
تصورات اور اس کے اعلیٰ مفہوم کے پیش نظر اس طرف توجہ مبذول کرانے کی واقعی ضرورت تھی۔ آج سماجی
تعلیم کا کام محض خواندہ بنانا نہیں ہے بلکہ شہریت کی تعلیم اور خواندگی کی منزل سے بڑھ کر علم کی روشنی کو
حسب توفیق افراد تک پہنچانے کا انتظام و انصرام بھی ہے۔ دیہی تعلیم کے کارکنوں کو آپس میں معلومات
فراہم کرنے اور ایک دوسرے کے کاموں کو دیکھنے اور سمجھنے سے متعلق تجویز منظور ہوئی اور اس طرح
حاصل کردہ معلومات کو عام بنانے کی ضرورت جتائی گئی تاکہ وسائل کا پورا پورا استعمال ہو سکے۔

اب ذرا اس بات پر غور کیجیئے کہ آئندہ پانچ سال میں اساتذہ کی تربیت کے میدان میں ہمارے
ملک کے اندر کیا کچھ ہو سکے گا۔ ہمارے تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے میں اساتذہ کی تربیت کی طرف
قابل لحاظ توجہ دی گئی ہے۔ اس دوران میں ابتدائی مدارس میں اکسٹھ فیصدی، آٹھویں جماعت تک
کے مدرسوں میں اکیاسی فیصدی اور ثانوی مدارس میں چالیس فیصدی تربیت یافتہ اساتذہ کی
تعداد میں توسیع کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ اس پروگرام کی تکمیل کے ساتھ ہر ایک منزل پر تربیت
یافتہ اساتذہ کی تعداد پچھتر فیصدی ہو سکے گی۔ اساتذہ کی تربیت کی ان باضابطہ کوششوں کے ساتھ
ساتھ توسیعی پروگرام اور اعادی نصاب کے ذریعے بھی تربیت یافتہ اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے
انتظامات کئے گئے ہیں۔ ہمارے سابقہ قومی منصوبے کے دوران میں سائنس اور حرفے کے اساتذہ کی
خاصی کمی رہی۔ تیسرے منصوبے میں چار ایسے علاقائی کالجوں کو قائم کیا جا رہا ہے جو سائنس اور مخصوص
صنعت و حرفت سے متعلق مضامین کے اساتذہ تیار کریں گے۔ تعلیم کے اعلیٰ اداروں میں بھی سائنس کے
اساتذہ کی کافی مانگ رہے گی۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس زمانے میں کالجوں میں جو تقریباً ستائیس ہزار
مزید اساتذہ درکار ہوں گے، اُن میں سترہ ہزار سائنس کے اساتذہ کی تعداد ہوگی۔ اس کے علاوہ صنعتی
تعلیم کے فروغ کے ساتھ نو ہزار مزید اساتذہ انجینئرنگ اور دوسرے فنی مضامین کے اداروں کے
لئے مطلوب ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد فوری اور وقتی اقدام کئے جا رہے ہیں تاکہ فنی ماہرین کی تعداد
میں جلد از جلد اضافہ ہو سکے مگر ان تمام تدابیر کے باوجود تیسرے منصوبے کے زمانے میں بھی ایسے اساتذہ

کی کمی قائم رہے گی۔ صنعتی اداروں کے لئے حرفے کے اساتذہ کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ دوسرے قومی منصوبے کے دوران میں ہو چکا ہے۔ اس وقت ان اساتذہ کی تربیت کے لئے چار مرکزی ادارے موجود ہیں جو پانچ سو پچاس اساتذہ تیار کرتے ہیں۔ اب ان کے اندر اساتذہ کی تعداد ایک ہزار ہو جائے گی اور مزید تین ادارے قائم کئے جائیں گے۔ جو آٹھ سو استاد تیار کر سکیں گے۔ اس طرح اس تیسرے منصوبے کے اختتام تک آٹھ ہزار اساتذہ تیار ہو جانے کی توقع کی جاتی ہے۔ تاہم کثیر المقاصد ثانوی مدارس میں حرفے کے جتنے اساتذہ کی ضرورت ہے وہ اس سے پوری نہ ہو سکے گی۔

ہمارے یہ اقدام حوصلہ افزا تو ضرور ہیں لیکن مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ اس باب میں مزید توجہ اور غیر معمولی مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تعلیم ہی سب سے موثر وہ واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے تیزی کے ساتھ دیس کے اندر اقتصادی ترقی، فنی مہارت اور صنعتی سوجھ بوجھ پیدا کی جا سکتی ہے۔ تاکہ جلد از جلد ایسا سماجی نظام قائم ہو سکے جہاں آزادی، سماجی انصاف اور افراد کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم ہوں۔ لیکن اس علم و عمل کی کشتی کو کھینے والے یہ اُستاد ہیں جنھیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لئے جذبۂ دل کے ساتھ ساتھ نہ صرف تربیتِ فکر و نظر درکار ہے بلکہ کسی قدر آسائشِ تن اور اِک سکونِ دل، بھی چاہیئے۔

"مُعلّم"

کوائف جامعہ

شیخ الجامعہ صاحب کی واپسی

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب پانچ ماہ کے بعد، فروری کے پہلے ہفتہ میں جامعہ واپس تشریف لائے۔ موصوف کا زیادہ تر قیام مونسریول (کنیڈا) میں رہا، جہاں وہ میکگل یونیورسٹی کے ادارۂ اسلامیات کے ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تشریف لے گئے تھے، لیکن اسی زمانے میں متحدہ ریاستوں کی ریاست انڈیانا کے ایک ٹیچرس کالج میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا اور وہاں لکچر دئے اس کے علاوہ لندن، میونخ (مغربی جرمنی)، اور پیرس بھی تشریف لے گئے۔

واپسی کے بعد جامعہ کے تمام تعلیمی اداروں اور اساتذہ اور طلبہ کی انجمنوں میں موصوف کو مدعو کیا گیا، جن میں انھوں نے یورپ وامریکہ کی موجودہ زندگی اور تہذیب وتمدن کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے۔ ہماری درخواست پر موصوف نے اپنے تاثرات قلم بند کر دئے ہیں اور وہ اس شمارہ میں شائع ہو رہے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف ادب پر سمپوزیم

استادوں کے مدرسے کے طالب علموں کی لٹریری سوسائٹی نے ہندوستان کی اہم زبانوں کے ادب پر ایک سمپوزیم کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ سمپوزیم کی ابتدا ۱۶ جنوری کو اردو ادب سے کی گئی ہے۔ اس جلسے کے مقرر خاص دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے قائم مقام صدر جناب ظہیر احمد صدیقی تھے۔ سمپوزیم کا افتتاح قائم مقام شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے فرمایا۔ موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ آج کل جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا ملک میں بڑا چرچا ہے، لیکن اس کا احساس ابھی پوری طرح نہیں ہے۔ جنگ آزادی کے موقع پر تو ایک ہونے کا احساس تھا لیکن آج ملک کی آزادی کے بعد یہ احساس کمزور پڑ گیا ہے۔ آج جب ہر طرف ترقی کی کوششیں ہو رہی ہیں تو

یکجہتی کی زیادہ ضرورت ہے، لیکن ہوا یہ کہ چھوٹی وفاداریوں کی اہمیت بڑھ گئی مثلاً صوبہ پرستی میں اضافہ ہوا ہے، زبان کے جھگڑے زیادہ بڑھ گئے ہیں کنبہ پروری اور ذات پات کا زیادہ خیال کیا جانے لگا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے۔ الگ ہونے کا جذبہ بڑھ گیا ہے اور ایک ہونے کا کم ہو گیا ہے۔ یہ تباہی اور بربادی کی نشانی ہے۔" آپ نے جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم آہنگی کے معنی یہ ہیں کہ ایک ہی طرح کی چیزیں ایک ہی طرح کا جذبہ طاری کریں، احساسات اور میلانات پر جو جذبات اثر ڈالنے والے ہیں، وہ یکساں اثر ڈالیں۔ ادب، شاعری، مصوری، موسیقی یہ تمام چیزیں انسان کے جذبات پر اثر ڈالتی ہیں، بعض خوشی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، بعض جذبات کو ابھارتی ہیں، بعض غم و الم کا جذبہ پیدا کرتی ہیں، ان میں ایسی ہم آہنگی ہونی چاہیئے کہ یہ سب اچھے جذبات کو ابھاریں اور ملک کا اتحاد اور قومی یکجہتی اور مضبوط ہو۔ ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ تہذیب و معاشرت میں بڑی حد تک یکسانی ہے، مگر اس کے باوجود زبانیں الگ الگ ہیں۔ زبانوں کے اختلاف نے جذباتی یکجہتی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ مثلاً ٹیگور کی شاعری سے لطف نہیں اٹھا سکتے اگر آپ بنگلہ سے واقف نہ ہوں۔ اگر آپ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں اور زبان کا پردہ ہٹ جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور ان کے جذبات ایک ہیں، سوچنے کا ڈھنگ ایک ہے، اور خیالات بڑی حد تک یکساں ہیں۔ آپ نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کی خصوصیات اور ان کے ادب سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے سیمینار کا جو سلسلہ شروع کیا ہے مجھے امید ہے کہ اس سے قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو بڑی مدد ملے گی۔"

اس کے بعد جناب ظہیر احمد صدیقی صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔ موصوف کی تقریر کا عنوان تھا۔ "ہندوستانی کلچر میں اردو کا حصہ"۔ فاضل مقرر نے فرمایا کہ "میری تقریر کا عنوان اہم ہونے کے ساتھ پیچیدہ بھی ہے۔ اہم اس لئے کہ اگر کلچر اور ادب کا ربط قائم نہ ہو سکا تو دونوں لفظ مہمل ہو کر رہ جائیں گے پیچیدہ اس لئے کہ جب ہم ہندوستانی کلچر کا ذکر کر رہے ہیں تو ہمارے ذہن میں کونسا کلچر ہے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں کے ہر خطہ کی الگ تہذیب، اور جداگانہ زبان ہے پھر مذہب اور رسم و رواج جداگانہ ہیں۔ اس لئے کلچر کو ہندوستانی کینوس پر وسیع معنوں میں سمجھنا ہوگا۔

کلچر میں لین دین ہمیشہ رہا ہے اور اس لین دین کو ہندوستانی کلچر میں سب سے زیادہ بہتر طریقہ سے

اردو ادب نے کیا۔ اس لئے کہ اردو ادب کی ایک مشترکہ میراث تھی مختلف رجحانات اور احساسات کی امد
یہی سبب ہے کہ کلچر میں جو رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ اُردو ادب کا احسان ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مغربی ادب کو ہندوستان میں بنگالی ادب نے متعارف کرایا۔ مگر انگریزوں کی آمد
پر جو کشمکش لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوگئی تھی اور اس سے جو تنقیدی شعور اجاگر ہوا اس کا اردو ادب
ہی میں اظہار ملتا ہے۔

اردو ادب کا ایک اہم ادارہ مشاعرہ ہے۔ ہندوستانی کلچر میں اس کا ایک اہم رول رہا ہے۔ مغلیہ
تہذیب کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ہندو مسلمانوں کو ایک اسٹیج پر یہ ادارہ ہی لایا۔ ہندو مسلمانوں میں استادی
اور شاگردی کا رشتہ جو ماں باپ اور اولاد سے زیادہ مستحکم ہوتا۔

یہ ضرور ہے کہ اُردو شاعری کا ایک بڑا سرمایہ عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے مگر یہ بھی اردو ادب
کا احسان ہے کہ اس نے عربی اور عجمی تخیلات کو ہندوستان میں اجنبی نہ رکھا۔

سچ پوچھئے تو ہندوستان میں مساوات کا تصور اردو ادب ہی کے ذریعے عام ہوا۔ عربی عجمی
برہمن کی تفریقیں یہاں آکر ختم ہوگئیں۔ اردو ادب کا نظریۂ حیات مساوات پر تھا۔ اس لئے برہمن
اور غیر برہمن تو بڑی چیز ہے شیخ و برہمن کی تفریق بھی باقی نہ رہی۔

اس سمپوزیم کے سلسلہ میں ۱۰ فروری کو جناب رشید حسن خاں صاحب نے "اردو ادب کا اپنے سماج
سے تعلق" پر تقریر کی۔ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ اردو ادب میں سماجی حقائق کی مکمل عکاسی ہے۔ اس
میں علیحدگی پسندی کے بجائے رواداری، میل ملاپ اور لین دین کا زیادہ گزر ہے۔ موصوف نے فرمایا
کہ کسی ملک کی زبان اور اس کے ادب کی اچھائی کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں دوسری
زبانوں کے اعلیٰ ادب کی خوبیوں اور اس کی اچھی باتوں کو اپنے میں سمولینے کی کتنی صلاحیت ہے۔ ہر
زبان کے ادب میں کچھ بنیادی خیالات ہوتے ہیں، جن کا تعلق اس قوم اور اس ملک کی سماجی، مذہبی
اور اخلاقی روایتوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب اور ان
کی کچھ خاص روایتوں کا اثر بھی ڈھکا چھپا مل جائے گا۔ اس میل ملاپ سے زبان اور ادب دونوں کی دولت
بڑھتی ہے، دونوں کے پھیلاؤ، بہاؤ اور گہرائی میں اضافہ ہوتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ ادب

جس پر کئی قوموں اور کئی زبانوں کے ہلکے یا گہرے اثرات پڑ چکے ہوں اور اس زبان و ادب میں ایسے گھل مل گئے ہوں جیسے سنگم پر کئی دریاؤں کا پانی مل کر ایک ہو جاتا ہے اُس ادب میں دنیا کے دوسرے رہنے والوں کے دل و دماغ، خیال اور جذبے کو متاثر کرنے کی صلاحیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔

اس معیار پر اگر ہم اردو زبان اور ادب کو جانچیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں یہ صلاحیت بہت سی زبانوں سے زیادہ ہے۔ اردو کی ابتدائی ترقی میں صوفیوں کے رسالوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ رسالے اردو سے زیادہ اس زمانے کی بولیوں کے آئینہ دار ہیں، اس کا دوسرا دور دکن سے متعلق ہے۔ اس زمانے کے ادب میں فارسی عربی کے لفظوں کے بجائے دکنی لفظ اور اسلوب بیان کا غلبہ ہے۔ اور خیالات میں بھی فارسی کی روایتوں سے کہیں زیادہ وہاں کی مقامی روایتوں کو دخل ہے۔ پھر اس کی ترقی کا زمانہ دہلی میں شروع ہوتا ہے، جہاں زبان کی صفائی، سادگی اور تہذیب پر زور دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ہے کہ اردو کوئی مفرد زبان نہیں ہے، وہ کئی زبانوں کے لفظوں کا ملا جلا مرکب ہے۔ دوسری زبانوں کے جو لفظ ہم آج بولتے ہیں، اگر وہ ان زبانوں کو واپس کر دیں تو ہمارے پاس سادہ کا غذ باقی رہ جائے گا۔ غرض اردو کی بنیاد ہی دوسری زبانوں سے بہت کچھ حاصل کرنے پر پڑی ہے۔ اس لئے اس زبان میں اور اس کے ادب میں دوسری زبانوں کی روایتوں خیالوں اور اسٹائل کو اپنانے کی بہت زیادہ صلاحیت ہے۔ شروع سے لے کر اب تک کے اردو ادب کو غور کے ساتھ پڑھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے ہر زمانے میں اپنی اس روایت کو باقی رکھا ہے۔ کسی زندہ زبان کے ادب کے لئے یہ بات بھی بہت ضروری ہوتی ہے کہ زندگی سے اس کا رشتہ برابر قائم رہے۔ وہ ایسا آئینہ ہو، جس میں ہر زمانے کی طرح طرح کی تبدیلیوں، سیاسی تحریکوں، رسم و رواج اور ملکی حالات کی صاف صاف تصویریں بھی دکھائی دیں۔ اردو ادب کا یہ پہلو بہت روشن ہے۔

اس کے بعد رشید حسن خاں صاحب نے بہت تفصیل سے بتلایا کہ اردو ادب میں ہر دور کے سیاسی و سماجی اثرات کس وضاحت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔

رورل انسٹی ٹیوٹ کا کانووکیشن

جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کا تیسرا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد ۱۳ فروری ۱۹۶۲ء کو تین بجے سہ پہر انسٹی ٹیوٹ کے نئے "اوپن ایئر تھیٹر" میں منعقد ہوا۔ پلاننگ کمیشن کے رکن تعلیم جناب ڈاکٹر اے این کھوسلہ نے کانووکیشن کا خطبہ پڑھا اور شیخ الجامعہ صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔

سورۂ فاتحہ کی تلاوت اور اس کے ترجمے کے بعد ڈائرکٹر صاحب جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب نے اپنی رپورٹ پڑھ کر سنائی جس میں انھوں نے اساتذہ اور طلبہ کی مختلف دقتوں اور مشکلات کے باوجود انسٹی ٹیوٹ کی پچھلی پانچ برس کی کامیابیوں کا ذکر کیا۔ انھوں نے جامعہ کالج اور حکومت ہند کی وزارت تعلیم کا بھی شکریہ ادا کیا۔

ڈائرکٹر صاحب کی رپورٹ کے بعد شیخ الجامعہ صاحب نے ۱۹۶۱ء کے فارغ التحصیل طلبہ کو ڈپلوما تقسیم کئے۔ ڈپلوما دینے سے قبل موصوف نے فرمایا: "میں بحیثیت شیخ الجامعہ، جامعہ کی طرف سے آپ کو یہ سند عطا کرتا ہوں اور تاکید کرتا ہوں کہ اپنے فرائض انجام دینے اور دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں ہمیشہ اور ہر طرح سے آپ اپنی دینی اور تہذیبی قدروں اور روایتوں کا پورا لحاظ رکھیں۔" اس کے بعد شیخ الجامعہ کی درخواست پر ڈاکٹر کھوسلہ نے اپنا خطبہ پڑھکر سنایا، جس میں موصوف نے دیہاتی لوگوں کو اعلیٰ تعلیم دئے جانے کی اہمیت بتائی اور جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کے کام کو سراہا۔ آپ نے فرمایا کہ جو طلبہ ان اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں وہ ملک کی بہت بڑی ضرورت کو پورا کریں گے اور تیسرے پنج سالہ منصوبے کے تحت دیہات کے لئے قومی تعمیر اور ترقی کے جو پروگرام اس وقت بنائے جا رہے ہیں۔ ان کو چلانے کے لئے یہ طلبہ خاص طور پر اہل ثابت ہوں گے۔ اس طرح ان اداروں کا دیہاتی معیشت میں اہم حصہ ہو جائے گا۔ آپ نے فرمایا کہ جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ میں سوشل ایجوکیشن، فنون لطیفہ اور سوشل ورک کے کورس پھر سے شروع کر دینے چاہئیں اور اس کے علاوہ کچھ کورس تجارت اور نقشہ نویسی کے بھی کھولنے چاہئیں۔ کچھ اداروں نے زراعتی سائنس کے کورس کے علاوہ سینیٹری انسپکٹر کے لئے بھی کچھ سرٹیفکیٹ کورس کھولے ہیں۔ ڈاکٹر کھوسلہ نے فرمایا کہ ان کورسوں کے علاوہ رورل انسٹی ٹیوٹ بالغ لوگوں اور عام آدمیوں کی مزید تعلیم میں کافی مدد دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی توسیعی خدمات کے ذریعہ وہ کسانوں اور معمولی تجارت کرنے والوں اور گھر گرہستی والی عورتوں کو بھی ان کے روزمرہ کے کام میں مفید مشورہ فراہم کر سکتے ہیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سول اور رورل انجینئرنگ کے کورس میں عملی تعلیم کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ طلبہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ روپیہ پیسہ بھی کما سکیں۔

ڈاکٹر کھوسلہ کے اس خیال میں کامیاب طلبہ کو عطا کی جانے والی ڈپلوما کی سندیں زندگی کی دشواریوں کو حل کرنے کا وسیلہ یا پاسپورٹ ہیں۔ اور ان کے ذریعہ طلبہ اچھا روزگار حاصل کرسکیں گے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور دعائیہ نظم ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ سب نے کھڑے ہوکر پڑھی اور قومی ترانہ کے بعد یہ تقریب ختم ہوئی جلسہ میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کافی تھی اور یہ حسن اتفاق تھا کہ دوسرے رورل انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ بھی اس موقع پر موجود تھے جو آل انڈیا انٹر رورل انسٹی ٹیوٹ کے مباحثے کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے پہلے ہی سے آئے ہوئے تھے۔

بیان بابت ملکیت رسالہ و دیگر تفصیلات

(فارم نمبر ۴)

مقام اشاعت : جامعہ نگر۔ نئی دہلی نمبر ۲۵

وقفہ اشاعت : ماہانہ

پرنٹر، پبلشر اور اڈیٹر کا نام : عبداللطیف اعظمی

قومیت : ہندوستانی

پتہ : جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ملکیت : جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

میں عبداللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : عبداللطیف اعظمی

۲۵ فروری ۱۹۶۲ء

مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶

صرف ٹائٹل جیال پریس دہلی ۶ میں چھپا

Regd. No. D - 768 March, 1962

THE MONTHLY JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی



جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہ اپریل ۱۹۶۲ء	شمارہ ۶

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ
رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

مغربی دُنیا پر ایک نظر

(۲)

پروفیسر محمد مجیب

میں نے پچھلے مضمون میں انسٹی ٹیوٹ کے جن پروفیسر صاحب کا ذکر کیا تھا انھوں نے اب سے تین چار سال پہلے رومن کیتھلک مذہب اختیار کرلیا تھا۔ رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے درمیان عقائد کا اختلاف ضرور ہے، اور جو لوگ عقائد کی نوک پلک کا بہت لحاظ رکھتے ہیں وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اختلاف بنیادی ہے۔ مگر جس بات نے اس اختلاف کو ایک سیاسی مسئلہ بنا دیا اور عیسائی قوموں میں خوں ریز خانہ جنگیاں اور لڑائیاں کرائیں، وہ پاپا اور کلیسا کی دینی اور دنیاوی حیثیت اور اقتدار کا معاملہ تھا۔ پاپاؤں کی دنیا داری، ظاہری شان و شوکت اور بداخلاقی کا چرچا قریب ایک ہزار برس پہلے سے ہوتا رہا ہے۔ چودھویں، پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں خدا پرست لوگوں کے اعتراض اور احتجاج کے ساتھ خالص سیاسی اغراض شامل ہوگئیں، اور پاپا کے مخالف عناصر کو ان بادشاہوں اور سیاسی رہنماؤں کی تائید حاصل ہوگئی جو دراصل چاہتے تھے کہ جو زمینیں کلیسا کی ملکیت بن گئی تھیں ان پر ان کا قبضہ ہو جائے اور پاپا اور کلیسا میں اس کی طاقت نہ رہے کہ وہ ان کی ملکی اور سیاسی معاملات میں دخل دے سکیں۔ مذہبی جنگوں نے عداوت کا ایسا جذبہ پیدا کیا جس کا اثر اب تک باقی ہے، مگر چونکہ یہ اصول مان لیا گیا ہے کہ مذہب کو سیاست کے مسائل میں الجھانا نہ چاہیئے، اور جو لوگ اسے دل سے نہیں مانتے وہ بھی اسے برتنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے عیسائی ملکوں کے اندر رومن کیتھلک اور پروٹسٹنٹ کی سیاسی مخالفت اب بہت نمایاں نہیں ہے۔ رومن کلیسا پر سولھویں سترھویں صدی سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ علمی تحقیق کے خلاف اور ان لوگوں کا دشمن ہے جو انسانی علم میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ رومن کلیسا صرف علمی تحقیق کی مخالفت ہی نہیں کرتا رہا ہے بلکہ ۱۸۷۰ء میں

پاپا کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ عقائد کے معاملے میں پاپا کا فیصلہ غلط نہیں ہو سکتا، اور ۱۹۰۷ء میں تمام کوششیں غلط اور گمراہ کن قرار دی گئیں جن کا مقصد عیسائی عقائد اور دینی کتابوں اور جدید علوم میں مطابقت کی صورتیں تلاش کرنا تھا، ۱۵۶۳ء میں ٹرینٹ کی کلیسائی کونسل نے عیسائی عقائد کی جو وضاحت کی تھی اس سے رومن کلیسا بال برابر بھی نہیں ہٹا ہے اور جو شخص بھی کلیسائی ملت میں شامل رہنا چاہتا ہے اسے مجال نہیں ہے کہ عقائد کی بحث چھیڑ کر کوئی نیا نظریہ یا خیال پیش کرے۔ اس رویے سے رومن کلیسا کو یہ نقصان پہنچا کہ روشن خیال لوگوں کا ایک حصہ اس کے خلاف رہا، مگر انھیں روشن خیال لوگوں میں ایسے افراد بھی پیدا ہوتے رہے جن کے لئے کلیسا اور اس کا استقلال ایک روحانی گودبن گیا جس میں بے چین ذہن اور دل کو آرام مل سکتا تھا۔ میں نے جس تنہائی کا ذکر کیا تھا اس کا احساس رومن کیتھلک ملکوں میں اس لحاظ سے کم ہے کہ کلیسا اپنے ہر پیرو کار کا ہاتھ پکڑنے کے لئے موجود ہے اور ہر طرح سے جماعت اور افراد کے درمیان ربط قائم رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کیتھلک کلیسا کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب کوئی چاہے گرجا میں جا کر اپنے قصور یا جرم کا اقبال کرے۔ پادری پردے کے ایک طرف بیٹھتا ہے، قصور کا اقبال کرنے والا دوسری طرف، وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھتے اور اس کا اہتمام کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے بالکل واقف نہ ہوں۔ اس طرح وہ خاتون جنھوں نے مجھے بیرون، کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی تھی اگر کیتھلک ہوتیں تو کسی پادری سے کہہ سکتی تھیں کہ مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کو کہوں کہ بڑے بے وقوف ہیں، اس سے میرے دل کو تسلی ہوگی، اور غالباً پادری بربنائے عہدہ مسکرا کر انھیں اس کی اجازت دے دیتا۔ مگر آرزو پوری کرنے کا یہ غیر شخصی طریقہ آزاد گفتگو کی طرح تسکین نہیں دے سکتا۔

یورپ اور امریکہ میں جس تنہائی کی شکایت کی جاتی ہے وہ "انسانیت" کے تصور، صنعتی انقلاب، قانونی آزادی اور مقابلہ کے تصور نے مل کر پیدا کی ہے۔ اس میں "انسانیت" کا حصہ یہ ہے کہ اس نے شوق اور محبت کے جذبے کو اگر وہ اتنا شدید ہو کہ آدمی کو بے اختیار کر دے ایک معیار کی حیثیت دیدی اور اسے مذہبی اور سماجی قاعدوں سے آزاد ہونے کا حق دار مان لیا۔ صنعتی انقلاب کی بدولت کھلتے پینے، نفع پرست، مزدور پیشہ اور بے روزگار لوگ صنعت اور تجارت کے مرکزوں میں اس

تعداد میں جمع ہو گئے اور گھل مل کر رہنے پر ایسے مجبور ہو گئے کہ کسی قسم کی احتیاط کو پوری طرح برتنا مشکل ہو گیا قانون نے مذہب اور اخلاق سے بے تعلق ہو کر ہر بالغ شخص کو ہر ایسے معاملے میں آزاد کر دیا جس سے کسی دوسرے کو جان اور مال اور حیثیت کا نقصان نہ پہنچتا ہو، مقابلے کے تصور نے کاروباری اور سیاسی فائدے کی ہوس اور ارتقا کے علمی اصول سے تقویت حاصل کر کے کامیابی کو زندگی کا اصل مقصد قرار دیا۔ ہم یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ بڑے شہروں میں غریبوں اور روزگار کے امیدواروں کی پروا نہیں کی گئی اور انھیں نفع اندوزی کا آلہ کار بنایا گیا۔ گر انسانیت، صنعت، قانونی آزادی، آزاد مقابلہ بہرحال ایسے تصورات ہیں جن کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ یورپ کے روحانی مسائل پیدا ہونے کی ایک وجہ کیتھلک اور پروٹسٹنٹ کلیساؤں اور پادریوں کی یہ ضد تھی کہ علمی تحقیقات میں سے صرف وہی قبول کی جائیں جن سے دینی تعلیمات کی تردید نہ ہوتی ہو، اور دوسری وجہ ازلی گناہ کا عقیدہ اور رہبانیت کا معیار تھا۔

علمی تحقیق کی مخالفت نے یہ خیال عام طور پر ذہن نشین کر دیا ہے کہ مذہبی ہونے کے معنی ہیں علم کو ترک کرنا، آزادی سے دست بردار ہونا اور اپنے آپ کو ہاتھ پیر باندھ کر کلیسا اور پادریوں کے حوالے کر دینا۔ کلیسا اور پادری کی حکومت کی مثال صرف کیتھلک کلیسا نہیں پیش کرتا، پروٹسٹنٹ فرقوں کے بھی کلیسا اور پادری ہوتے ہیں، اور بعض میں پیروؤں کی مقامی جماعتیں بھی جن کے سرآوردہ لوگ جماعت کے افراد کے قول اور فعل پر نظر رکھتے ہیں، اور قانونی آزادی مدرسہ، کتاب، اخبار اور اشتہار کے ہوتے ہوئے بھی احتساب کی ایک شکل قائم رکھتے ہیں۔ متحدہ ریاستوں کے وسط میں ایک بہت بڑا اور خوش حال علاقہ ہے جس کو اسی وجہ سے "انجیل کا ملک" کہتے ہیں۔ میں سی جہاں میں قریب دو ہفتے رہا، اسی علاقے میں ہے۔ آغا اشرف علی صاحب کا یہاں کئی مہینے سے قیام ہے، ان سے معلوم ہوا کہ لوگوں نے ان کی بڑی مدد کی، مگر ساتھ ہی بعض یہ بھی پوچھتے رہے کہ کس گرجا میں جاتے ہو، یعنی کسی پروٹسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتے ہو، اور جب یہ معلوم ہوا کہ آغا صاحب تک دین حق کی نعمت ہی نہیں پہنچی ہے تو ایک دو نے اسے بھی پیش کیا اور قبول کروانا چاہا۔ اس طرح جو شخص مذہبیت کا میلان رکھتا ہے اور علمی اور شخصی آزادی سے بھی دست بردار نہیں ہونا چاہتا

بڑی الجھن میں رہتا ہے، اور یہی الجھن اس میں تنہائی کا احساس پیدا کرتی رہتی ہے۔ علمی اور شخصی آزادی اس الجھن کو کم کرنے کے بجائے اور بڑھاتی ہے۔ علم کے معنی ہیں حقیقت کی تلاش، یہ تلاش جاری ہے، مگر اتنے عرصہ تک جاری رہ چکی ہے کہ جب تک کوئی نئی اور انوکھی بات نہ کہی جائے، اس کا کہنے والا تلاش میں شریک نہیں سمجھا جاتا، اور پرانی بات کو دہرانے اور اس کو صحیح ماننے کے لئے جو ہمت چاہیئے وہ صرف انھیں لوگوں میں ہو سکتی ہے جن کی پشت پر ہم خیال لوگوں کی جماعت ہو۔ نئی اور انوکھی بات کہنے والے شاعر، ادیب، ڈراما نویس، مصور، مفکر ہوتے ہیں، ان کی شخصیتیں ایسی نہیں ہوتی ہیں کہ جماعتی زندگی کی نئی طرح ڈال سکیں۔ ان کے تصورات اور خیالات کا محرک بڑی حد تک وہی تنہائی کا احساس ہوتا ہے جو دوسروں کو پریشان رکھتا ہے۔ پریشانی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عادت بن جاتی ہے، اور جیسے نشہ کی عادت نشہ آور چیز کے استعمال سے بڑھتی ہے، پریشان طبیعت میں یہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی کیفیت میں شدت پیدا کرے، اور اسی کو علاج سمجھے۔ انسان کا اپنے آپ کو کسی دھوکے میں رکھنا برا ہے۔ اور یورپی ادب میں حقیقت نگاری کی جو تحریک پچھلی صدی سے شروع ہوئی اس نے یورپی سماج کو اس کے بہت سے عیبوں سے آگاہ کر دیا۔ لیکن محض حقیقت نگاری نفسیاتی اور روحانی مسائل کو حل نہیں کر سکتی۔ اگر اسے حق کی تلاش سمجھا جائے تو اس سے حقیقت نگار پر کسی نہ کسی حد تک یہ ذمہ داری ضرور آتی ہے کہ وہ حق کے تصور کو بھی واضح کرے۔ شروع کے حقیقت نگار سماجی عیبوں اور نظر کے فریبوں کی پردہ دری کر کے کوئی نتیجہ نکالا کرتے تھے، اب سماج اور افراد کی اصلاح اور تربیت کا خیال ادب سے بالکل خارج کر دیا گیا ہے، اور حقیقت نگاری آپ اپنا مقصد بن گئی ہے۔ ادبی ذوق لطف اندوزی کی ایک شکل ہے، اور زمانہ اور عام رواداری اشتہار کا اسی طرح پابند جیسے کہ خواتین کا لباس اور وضع قطع فیشن کی۔ دوسری طرف انسان کی طبیعت کیفیتوں کا ایسا خزانہ ہے کہ بیان کرنے والے کی استعداد اور توفیق کو آزماتا رہتا ہے، اور کوئی بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے انسان کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے کہہ دیا ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن نئی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا رہتا ہے اور ہر انکشاف یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی اب بھی حقیقت سے بہت دور ہے۔

حقیقت نگاری کی ادبی تحریک کو فروغ دینے میں کلیسائی مذہب کا ردعمل بھی شامل تھا۔

مذہب کے ماننے والے سمجھتے ہیں کہ مذہب کی پیروی کرنے میں سلامتی ہے، اس سے دنیاوی زندگی بنتی ہے، اور عاقبت کا بھی مناسب انتظام ہو جاتا ہے۔ عیسائی مذہب بھی سلامتی کا ایک تصور پیش کرتا ہے۔ کلیسا اور عیسائی ملت کے روشن خیال یا علمی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کے درمیان جو عداوت پیدا ہو گئی اس کی وجہ سے سلامتی کے اس تصور پر حملے کئے گئے، عقیدے اور اخلاق کی حیثیت حکم کی سی نہیں رہی، بلکہ عملاً اور اصولاً اختیاری ہو گئی، اور جوابدہی کی ذمہ داری اس شخص پر نہیں رہی جو اختیار کا غلط استعمال کرتا بلکہ اس شخص پر جو اختیار سے کام نہ لیتا، اور پرانے طریقے کو کافی سمجھا یہی رد یہ بے چینی کا ایک اور سبب بن گیا ہے۔ بیشتر لوگ غلط اور صحیح کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اس کی ذمہ داری نہیں بننا چاہتے، لیکن حالات نے ان کو خود مختار بنا دیا ہے۔ کلیسا اور مذہب کی رہنمائی وہ قبول نہیں کر سکتے، علم اور ادب بھی ملنے ہوئے سماجی اصولوں اور طریقوں کی جانچ میں لگے ہوئے ہیں اور خود سماج فیشن اور اشتہار کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔

مذہب اور یورپ اور امریکہ کی موجودہ ذہنیت کے درمیان میل کرانے میں ازلی گناہ کا عقیدہ اور رہبانیت کا تصور بڑی رکاوٹیں ہیں۔ مسلمان کو اس کا یقین نہیں ہے کہ آدم اور حوا بہشت سے نکالے گئے تو انھوں نے واقعی کوئی جرم کیا تھا۔ عیسائی تعلیمات کے مطابق یہ اتنا بڑا گناہ تھا جس کا کفارہ خدا کا بیٹا دنیا میں آکر اور صلیب پر چڑھ کر ہی ادا کر سکتا تھا۔ اس دینی منطق کا حق ادا کرنے کے لئے جو آدم اور حوا کے گناہ کا سلسلہ حضرت عیسےٰؑ کے صلیب پر چڑھنے سے ملاتی ہے ضروری ہے کہ ہر عیسائی اپنے آپ کو پیدائشی گنہگار اور سزا کا مستحق سمجھے، اور حضرت عیسیٰؑ کے اس احسان کا ہر طرح سے اعتراف کرے کہ انھوں نے اپنے آپ کو قربان کر کے اسے عذاب سے بچایا۔ عیسائی مذہب میں رہبانیت کی طرف قوی میلان بھی ہے۔ نفس پر قابو رکھنے کے لئے ایک حد تک نفس کشی لازمی ہے، عیسائی تعلیمات نے حضرت عیسیٰؑ کی عظیم الشان مثال کو معیار مان کر نفس کشی کو ایک اعلیٰ دینی مقصد کا مرتبہ دے دیا۔ کلیسا نے بے شک دنیاداروں کے لہو ولعب اور نفس پرستی کو گوارا کیا، مگر نیک اور پاک زندگی اسی کو مانا جس میں نفس کشی نمایاں ہو۔ یورپ کی بڑھتی

ہوئی تہذیب نے انسان اور انسانی خواہشوں کو وہی مرتبہ دینا چاہا جو قدیم یونان نے دیا تھا، اور سولھویں صدی میں فرانسیسی ادیب رابلے نے فخریہ لکھا کہ ہنسنا انسان کا حق اور اس کی امتیازی صفت ہے۔ مگر انسان کی گنہگاری ایسا مسئلہ نہیں ہے جو منسی کے بل پر طے کر دیا جائے۔ انسان کی پیدائشی معصومیت ایک عقیدہ ہے، جو علم اور تجربے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور اسلام کی اس تعلیم کے باوجود کہ انسان معصوم پیدا ہوتا ہے گناہ اور شیطان کے وسوسہ کا خوف مسلمانوں کے ذہن پر حاوی رہا ہے۔ یورپی تہذیب کا میلان انسان کو معصوم قرار دینے کی طرف تو نہیں مگر اسے مجبور قرار دینے کی طرف رہا ہے۔ اور ازلی گناہ کی تعلیم صرف اس علم سے نہیں ٹکراتی ہے جو ماحول کو انسان کے بننے بگڑنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے بلکہ انسانی خودداری کے اس تصور سے جو علم کی ترقی نے یورپ اور امریکہ میں رفتہ رفتہ پیدا کیا ہے، اس وقت وہاں یہ کہنا کہ جنسی جذبات شیطانی وسوسہ ہیں یا زنا کرنا گناہ ہے انسانی فطرت کی توہین کرنے کے برابر ہے اگرچہ ان لوگوں کی عزت کی جاتی ہے جو اپنی طبیعتوں کو قابو میں رکھتے ہیں۔ اسی طرح نفس کشی کے دینی اور اخلاقی ورثہ کو یورپ اور امریکہ میں اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے کسی پرانے اور بھدے رواج کو، اور اس کے علاوہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ نفس کشی کی تعلیم دینا صنعتی ترقی کو غلط اور مضر ٹھہراتا ہے۔ یورپی انسانیت کی مثال گوئٹے کا ڈاکٹر فاؤسٹ ہے، جس نے کامل علم اور ہمہ گیر تجربہ کی خاطر اپنی روح کو شیطان کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس وسوسے کو وہ تمام لوگ برا کہیں گے جو علم اور تجربے سے ڈرتے ہیں، مغربی تہذیب نے یہ سودا کیا ہے اور شوق سے کیا ہے۔ وہ موت سے بے شک ڈرتی ہے اور بہت ڈرتی ہے، مگر اس کی وجہ سے علم اور تجربے کے حق سے دست بردار ہونا یا اس کے میدان کو تنگ کرنا نہیں چاہتی۔

یورپ امریکہ میں ڈاکٹر ایلبرٹ شوائٹزر کی بڑی قدر ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی افریقہ کے وحشیوں کی طبی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے، اور حضرت عیسیٰ اور مہاتما گاندھی کی طرح قول اور عمل سے ایثار اور عدم تشدد کی تعلیم دیتے ہیں۔ بعض حلقوں میں ہندوستان کی رہنمائیت کی بھی قدر ہے۔ ریڈ کراس کے بین الاقوامی نظام سے اور معاشی اعتبار سے پس ماندہ قوموں کی امداد کے جو مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ اور امریکہ میں انسانی ہمدردی

کا جذبہ بہت قوی ہے اگرچہ اسے ہر قدم پر سیاسی اور معاشی خود غرضی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے
پہلی اور دوسری عالم گیر جنگوں نے تہذیب اور ترقی پر جو اعتبار تھا اس کو بہت کم کر دیا ہے۔ اور
اس وجہ سے اب ایسے سہاروں کی تلاش ہے جو ایٹم بم کی زد میں نہ ہوں ۔ کلیسا اور کلیسائی
مذہب کے ماننے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے اب بھی ہیں گناہ کا لفظ سن کر ناک بھوں
چڑھانے والے بھی ہیں، سب سے زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو بغیر سوچے سمجھے زندگی گذارتے
ہیں ، مگر ساتھ ہی ایک تحریک شروع ہوئی ہے کہ تمام مذہبوں کا احترام کے ساتھ مطالعہ کیا جائے
تنگ نظری کو دور کیا جائے ، اور کسی نظام کی ماتحتی قبول کئے بغیر دینی جذبے کی ایسی تربیت
کی جائے کہ وہ انسانوں اور انسانی زندگی کو راہِ راست پر لا سکے گویا اب مغربی تہذیب
کا ایک علمی اور دینی منصوبہ غالبؔ کے اس شعر کی تشریح ہے ۔

سراز حجاب تعین اگر بروں آید
چہ جلوہ ہا کہ بہر کیش می تواں کردن

غزل

حضرت مرزا احسان احمد

ذوقِ نظر تو دیکھیے ایک گدائے راہ کا
رنگ بدل دیا تمام حسن کی جلوہ گاہ کا

دستِ جنوں دراز کر، کام نہیں ہے آہ کا
پایہ بہت بلند ہے عشق کی بارگاہ کا

لطف اسی سے کچھ اُٹھا، طاقتِ دید تھی کہاں
شکوۂ رائگاں نہ کر خیرگیٔ نگاہ کا

گرم طواف جس کے گرد کعبہ و بتکدہ ہیں سب
ہے وہ خرام بےخودی عشق کے مردِ راہ کا

چاہیئے اس کو اور کیا لذتِ زیست کے لئے
حوصلہ ہو جسے نصیب غم سے ترے نباہ کا

لذتِ خستگی سے گر دل نہیں آشنا ترا
طالبِ فیض پھر نہ بن عشق کی درس گاہ کا

چھوڑ دیں ہم تو میکدہ دل یہ مگر ہے کہہ رہا
کوئی مقام بھی تو ہو اس کے سوا پناہ کا

خار و خسِ چمن بھی دیکھ، یہ بھی ہیں زینتِ چمن
جانبِ گل ہی کیوں فقط رخ ہے تری نگاہ کا

اہلِ خرد کا کارواں کھائیگا یوں ہی ٹھوکریں
مل نہ سکا اگر نشان پیرِ مغاں کی راہ کا

بزمِ جہاں سجائی ہے اہلِ ہنر نے گو بہت
کر نہ سکے مگر علاج کچھ بھی دلِ تباہ کا

شکوۂ بےرخی نہ کر، اس کی نزاکتیں سمجھ
تجھ کو ہے ذوق کچھ اگر حسن سے رسم راہ کا

جس نے بدل دیا جہاں میری نگاہ میں تمام
شکر ہو کس طرح ادا آپ کی اس نگاہ کا

المیہ کیا ہے؟

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

یوں تو ڈرامہ کی کسی شکل کا تصوّر بھی عمل کے بغیر ممکن نہیں، لیکن المیہ کے اجزائے ترکیبی میں تو عمل، کشمکش اور نقطۂ عروج کو جو اہمیت حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ارسطو نے اپنی معروف کتاب بوطیقا میں المیہ کی تعریف ہی ان الفاظ میں کی ہے کہ وہ ایک ایسے سنجیدہ عمل کا نقشہ ہے، جو اپنی جگہ مکمل جز و اور اپنے اندر ایک خاص عظمت اور طوالت رکھتا ہے۔ پھر المیہ کی ہئیت کی تفصیل میں ارسطو نے پلاٹ کو کرداروں پر فوقیت دی ہے۔ ارسطو کا یہ نظریہ ممکن ہے بعض لوگوں کو مبالغہ آمیز اور عام تجربے کے خلاف معلوم ہو۔ لیکن غور کرنے پر پتہ چلیگا کہ اس میں ایک ہمہ گیر صداقت پنہاں ہے۔ اور اسطرح یہ ارسطو کی مخصوص بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ کیونکہ ناول اور ڈرامہ دونوں میں صورتِ حال (Situation) ہی کے ذریعہ کرداروں کا ارتقا اور ان کی باہمی کشمکش نمایاں ہوتی ہے۔ پلاٹ کو چاہے آپ کہانی کہیں یا موضوعِ فکر، زندگی کی ایک قاش کا مرادف سمجھیں یا واقعات کے فریب تسلسل کا، کوائف کی ترتیب کا نام دیں یا خارجی تانے بانے کا، بہر صورت اس میں شبہ نہیں کہ یہی ایک وسیلہ ہے جس کے ذریعہ کرداروں کی شخصیتوں کے تہ در تہ حجابات نظر کے سامنے سے اٹھتے ہیں، یہی ایک کھونٹی ہے، جس کے توسط سے ہماری نظریں شخصیت کے چند نقوش یا گوشوں پر جم جاتی ہیں۔ المیہ اور طربیہ کے کرداروں میں جو فرق ہے، وہ بھی عمل کی نوعیت کے اس اختلاف ہی سے متعین ہوتا ہے، جو ان دونوں قسم کے ڈراموں کی کائنات میں جاری و ساری رہتا ہے۔ ناول میں بھی وہی مقامات توجہ کو جذب کرنے اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے ہیں، جہاں ناول کا پرسکون اور محیط عمل کسی خاص موڑ پر پہنچ کر توانائی اور شہرت کے نقطہ کو چھو لیتا ہے اور پڑھنے والے کے شعور اور ادراک میں حشر سامانی پیدا کر دیتا ہے۔ در اصل کردار خلا میں سانس

نہیں لیتے' اور نہ صرف تصور میں اپنی قوتوں کو شکار کرسکتے ہیں۔ ان کی اچھائی اور برائی قوت اور کمزوری رفعت اور پستی' ان کا جذبۂ مدافعت اور جذبۂ تسلیم و رضا' ان سب کا انحصار اس عمل پر ہوتا ہے، جو المیہ کی بساط پر پھیلا ہوا ہے۔ اس آئینے میں کرداروں کی شخصیتوں کے ہلکے اور گہرے نقوش اجاگر ہوتے" اور پورے ڈرامہ کی فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ آج بھی جبکہ تحلیلِ نفسی کے نظریات اور پروسٹ' جیمس جوائس اور ورجینیا وولف کے عملی اقدامات کی بدولت پلاٹ اور کردار کے مروجہ تصورات یکسر بدل چکے ہیں' کوئی شخص پلاٹ اور موضوع یا وسیع مفہوم میں عمل کے تقدم سے انکار نہیں کرسکتا۔ ڈرامہ میں عموماً اور المیہ میں خصوصاً کشمکش کا عنصر بنیادی ہے۔

ہیگل نے اس کشمکش کی توجیہہ اپنے مخصوص فلسفۂ زندگی کی روشنی میں کی ہے۔ ہیگل عقلِ محض کا پجاری ہے' اور اس لئے وہ اس کشمکش کو بھی جو المیہ کی روحِ رواں ہے' ریاضیاتی قسم کے فارمولوں سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہیگل تقدیر کو عقل پرستی کے تابع کردیتا ہے۔ (Destinyis Rational) اور اس کا خیال ہے کہ المیہ میں نیکی کا تصادم نیکی سے ہوتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کشمکش کا سرچشمہ یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک طرف چند اعلیٰ قدریں ہیں' اور دوسری جانب وہ موانعات ہیں' جو ان قدروں کو شکست دینا چاہتے ہیں' یا واقعاتی اور علیتی کائنات کے درمیان لامتناہی اور ناگزیر پیکار ہے۔ یا کرداروں کی ذہنی اور روحانی زندگی ان قوتوں سے متصادم ہے' جو شر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ بلکہ ہیگل کا نظریہ پرانے شاعرانہ انصاف (Poetic Justice) کے نظریہ ہی کی توسیع ہے۔ ہیگل نے المیہ کے سلسلے میں اپنی تعمیمات کی بنیاد ہی سافیکلیس کے ڈرامے اینٹی گون پر رکھی ہیں۔ اور کریون اور اینٹی گون کے اعمال کو توڑ موڑ کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ہیگل کے اس طریق استدلال میں جو سقم ہے' اسے گوئٹے کی شفاف اور بے خطا بصیرت قبول نہیں کرسکی اور اس نے محسوس کرلیا کہ المیہ کے تصور میں جو ایک ناقابلِ حل اور پُراسرار کیفیت مضمر ہے' اسے ہیگل نے اپنی سیاسی اور فلسفیانہ خیالات کی مدد سے قابل فہم بنانے کی جدوجہد کی ہے۔ اگر ہیگل کے نظریہ سے بجنسہٖ اتفاق کرلیا جائے' تو المیہ کی پوری روح ہی ختم ہوجائے۔ اور بہت سے المیہ کردار اور واقعات بے معنی معلوم

ہونے لگیں۔ ہیگل کے نظریہ کی روشنی میں واقعاتِ کربلا، جنہوں نے لاتعداد انسانوں کے جذبات واحساسات میں تموج پیدا کیا ہے، اپنی اثرانگیزی کھو دیتے ہیں۔

ہیگل کی رائے میں المیہ کرداروں کی کمزوریاں، المیہ کا جواز ہیں۔ یعنی چونکہ ان شخصیتوں میں وہ کمزوریاں بالطبع موجود تھیں اور اب راسخ ہوچکی ہیں، اس لئے ہمیں ان کے انجام پر متعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ علت اور معلول کے ہمہ گیر اصول کی روشنی میں ان کے انجام کا رشتہ اُن کی خامیوں سے جوڑ کر پورے المیہ کو ایک عقلی کل یا ایک عقلیت پر مبنی نظام سمجھ کر تحیر وتاسف کے بغیر قبول کرلینا چاہیئے۔ جس طرح ہیگل کا یہ نظریہ صحیح نہیں، اسی طرح ارسطو کا یہ خیال بھی غورطلب ہے کہ جب تک المیہ کردار میں عظمت، بلندی اور غیرمعمولی خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ ہی کسی کمزوری، خامی اور عجز کی آمیزش نہ ہو، ہم دراصل اس کے المیہ کی قدروقیمت متعین نہیں کرسکتے۔ شیکسپیئر کے المیہ ڈراموں میں بھی ہمیں مخصوص کرداروں کی سیرت کی تعمیر میں شروع ہی سے خرابی کی ایک صورت نظر آتی ہے، اور اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ یہ سیرت ہی ان کی تقدیر کی خالق ہے۔ لیکن اگر اس اصول کو بہ تمام وکمال قبول کرلیا جائے تو بےشمار ناول، بے شمار ڈرامے، اور بیشمار مذہبی اور غیرمذہبی واقعات جنہوں نے انسانوں کے سینوں کو غمکدہ بنایا ہے، باطل قرار دے دئے جائیں گے۔ المیہ کے مؤثر ہونے میں فی الحقیقت جو عنصر بنیادی حیثیت رکھتا ہے، وہ حادثۂ عظیم Catastrophe کا عنصر ہے۔ تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ جب ہم کسی کردار کو کسی آفتِ ناگہانی کا شکار بنتے دیکھتے ہیں، تو اس سے چشم زدن میں ہمارے جذبۂ ہمدردی یا رحم کو تحریک پہنچتی ہے۔ غیرمنفصل ردعمل کے دوران میں ہم نجی ذمہ داری کے اصول کو کلیتہً فراموش کرجاتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ بات قطعی غیراہم ہوتی ہے کہ جس شخص پر یہ بپتا پڑی ہے، وہ اس کا مستحق ہے یا نہیں، اور کس حد تک یہ ابتلا اس کے اپنے اعمال کا پھل ہے، اور کہاں تک بےرحم قوتوں کی سفاکی کا نتیجہ۔ یہ سب امور ہماری توجہ کا مرکز اس وقت بنتے ہیں، جب ہم اپنے تاثرات کی بنیاد پر کوئی فلسفیانہ عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے ہمیں ایک نظم، ایک منطق،

ایک ہم آہنگی، اور تطابق کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بالائی عمارت کی تعمیر میں ہمارے قیاسی تعصبات اکثر راہ پا جاتے ہیں جس کی ایک بیّن مثال میں آگے چل کر دوں گا۔

گو عام تجربہ کسی قدر ارسطو کے نظریہ کی تکذیب کرتا ہے، تاہم یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ارسطو نے المیہ کردار میں غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ ہی کسی خامی، محرومی یا کجی کی موجودگی کو کیوں ضروری قرار دیا۔ بات یہ ہے کہ المیہ کردار کو اگر ہم معصومیت کا مجسم تصوّر کر لیں، تو اس آفتِ عظیم کا جس سے وہ دوچار ہوا ہے، اتنا شدید ردِّ عمل ہمارے اوپر مرتب ہوگا کہ ہم نقطۂ اعتدال سے متجاوز ہو کر اپنے اندر وہ سکون اور ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے جو المیہ کا ایک بڑا مقصد ہے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ تضاد جس کی طرف ارسطو کے ایک شارح نے ہماری توجہ مبذول کرائی ہے، نظر کے سامنے آتا ہے۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ المیہ کا عمل سامعین کے اندر رحم اور خوف کے ان جذبات کو، جو ان کے دل میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اس حد تک برانگیختہ کرتا ہے کہ برانگیختگی ایک خاص نقطہ تک پہنچ کر ان جذبات کی دائگذاشت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اور اس طرح ان جذبات کے دباؤ، گھٹن یا ان کی بندگی سے المیہ دیکھنے والے کو نجات دلا دیتی ہے۔ یہ معاملہ خاصا بحث طلب ہے کہ فاضل جذبات سے کیا مراد ہے؟ واقعی برانگیختگی کی انتہا اور اس کا انجام یہی ہے کہ ہمیں ان جذبات کی اطاعت اور غلامی سے خلاصی حاصل ہو جائے۔ افلاطون کی رائے اس کے قطعی برعکس ہے، اور اسی بنیاد پر وہ المیہ اور شاعری کے خلاف ہے۔ بہرحال جس امر کی طرف ارسطو کے مذکورہ بالا شارح نے اشارہ کیا ہے، وہ یہ ہے کہ رحم اور خوف کو ایک خانے میں رکھنا جیسا کہ ارسطو نے کیا ہے، صحیح نہیں ہے، کیونکہ خالص نفسیاتی نقطۂ نظر سے رحم کا تعلق دوسروں سے، اور خوف کا علاقہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ جب کسی دوسرے کا کسی آفتِ ناگہانی سے سابقہ پڑتا ہے، تو ہمارے دل میں اس کے لئے رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ آفت خود ہم پر پڑنے والی ہوتی ہے۔ تو ہم خوف زدہ ہو کر اسے ٹالنے یا اس سے راہِ

دار اختیار کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ رحم اور خوف میں وہی فرق ہے، جو احساس
اور جذبہ میں ہے۔ احساس میں رحم کی طرح شدت نہیں ہوتی، اور خوف جذبہ کی شدت سے
بھرپور ہوتا ہے۔ اسی طرح احساس کا تعلق غیر خود سے اور جذبہ کا رابطہ شخصیت کی اکائی سے
ہوتا ہے۔ جذبہ میں انانیت ہوتی ہے، احساس میں بے نفسی۔ احساس رحم کی طرح مرکز گریز
اور جذبہ اور خوف مرکز جو ہوتے ہیں۔ احساس کسی اور کیلئے ہوتا ہے، جذبہ اپنے لئے۔ اسی
طرح رحم اور ترس دوسروں کے مصائب سے متحرک ہوتے ہیں، خوف تحفظِ ذاتی کے سلسلہ
میں ابھرتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کو ایک خانے میں رکھنے کی توجیہہ ایک طرح سے البتہ کی جا سکتی ہے
اور وہ یہ کہ چونکہ کسی المیہ کو دیکھتے وقت ہم اس کے کرداروں سے اپنے آپ کو مکمل طور پر ہم
آہنگ کر دیتے ہیں، اس لئے خوف میں جو ذاتی عنصر کی آمیزش ہے، وہ معتدل ہو جاتی ہے،
اور خوف محض ذاتی رہ جانے کی بجائے نیا بنی بن جاتا ہے۔ اسی طرح چونکہ المیہ دیکھنے کے
دوران میں کبھی ذہن کے پس منظر سے یہ خیال چمٹا رہتا ہے کہ افسانہ کی دنیا عمل کی دنیا سے دور
اور مختلف ہے، اس لئے بھی خوف کا جذبہ ہم پر اس انداز سے نہیں ہوتا، جس طرح کہ وہ واقعاتی
زندگی میں طاری ہو سکتا ہے۔ اور اس لئے رحم اور خوف کے جذبات کیفی اعتبار سے متضاد ہونے
کے باوصف ارسطو کے بیان میں ایک ہی خانہ میں جگہ پا گئے ہیں۔

رحم اور خوف کے جذبات کی برانگیختگی اور پایانِ کار ان کی واگذاشت کا مفہوم متعین
کرنے کے سلسلے میں دو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ یعنی اسہال (Purgation)
اور تطہیر و تزکیہ (Purification) ان دونوں اصطلاحات کا سراغ ارسطو کے طبی
نظریے اور توازنِ جذبات کے قانون میں لگایا جا سکتا ہے۔ میری رائے میں مؤخر الذکر
اصطلاح قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ اوّل تو فاضل جذبات سے چھٹکارا حاصل کرنا یا انھیں یکسر
خارج کر دینا نہ المیہ کا مقصد ہو سکتا ہے، اور نہ وسیع معنوں میں آرٹ کا مقصد ہے
زندگی کے پراگندہ اور منتشر اجزا کو قابو میں لانا، تجربہ کی ابتری اور خلفشار میں ترتیب قائم
کرنا، جذبات کا تزکیہ اور تہذیب و توسیع کرنا، اور ان کا عرفان حاصل کرنا۔ یہ چاروں مقاصد

(Purgation) سے حاصل نہیں ہو سکتے، بلکہ جذبات پر ہیئت کو عائد کرنے اور اس طرح ان کا شعور حاصل کر کے انھیں مہذب بنانے سے۔ اچھے آرٹ میں خام، ناپختہ بے لگام جذبات کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ جب خام اور ناپختہ جذبات شخصیت کی آنچ میں تپ کر کندن بن جاتے ہیں، یا جب وافر، شدید اور بے چین جذبات ہیئت کے شکنجے میں کسے جانے کے بعد ایک ہمواری، ایک اعتدال، ایک باقاعدگی اختیار کر لیتے ہیں اور قطع و برید یا نظم و ضبط کے بعد ان میں ایک ٹھہری اور سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے؛ یا جب فن کار ان کی بندگی قبول کرنے کے بجائے ان سے عرفانِ ذات یا عرفانِ حیات کا کام لیتا ہے؛ تب ہی وہ موقر سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ خطابت، نعرہ بازی اور جذباتیت اور آرٹ میں یا بہ الفاظ دیگر پراپیگنڈے اور آرٹ میں حد فاصل قائم کی جاتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ ارسطو کی غایت کی صحیح تفسیر یہی ہے یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ارسطو کے فکری نظام میں جسم اور روح اور مواد اور ہیئت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے خالص طبی نظریہ کے ساتھ ہی تو ادلین جذبات جسم اور روح اور ہیئت اور مواد کے تعلق کو ذہن میں رکھنے اور ان سب تصورات کو باہم تطبیق دینے کے بعد ہی رزم اور خوف کے جذبات کی برانگیختگی اور ان کے انجام پر کوئی رائے قائم کرنی چاہیئے۔

نطشے نے المیہ کی کشمکش کا جواز اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ المیہ کی روح تخلیقی ادہام اور شکست اوہام کے متوازی اور متواتر عمل میں پوشیدہ ہے۔ اپولو کا رویا ہمارے سامنے ایک رزمیہ عظیم اور پرشوکت کائنات کی تعمیر کرتا ہے جسے اپنی انفرادیت میں مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس رویا کے ساتھ ہی (Dionysius) کے نغمہ کا وحشت زدہ اور خود تخریبی وجد بھی شامل ہوتا ہے۔ یہی دونوں مل کر المیہ کو جنم دیتے اور اور اسی میں المیہ کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ پرسطوت دنیا محض خلا میں تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ فرد جسے اپولو نے عرفانِ ذات کے لئے اکسایا تھا، زندگی کی طوفانی موجوں میں اپنے آپ کو کھو کر لذت حاصل کرتا ہے اور اس کے تخیلات کے سارے شیش محل اس تصادم

سے پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ آئی۔ اے رچرڈس نے جس کا فنی نظریہ محرکات کے توازن پر قائم ہے، المیہ کو متضاد اور مخالف خواص اور کوائف کے توافق و تطابق سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ المیہ میں رحم جو قربت کا جذبہ ہے اور خوف جو مراجعت کا جذبہ ہے، پایانِ کار ایک ایسی ہم آہنگی حاصل کر لیتے ہیں، جو ہمارے سکون کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ان دو قسم کے جذبات کے علاوہ المیہ میں اور نہ جانے محرکات اور جذبات کے کتنے گروہ ہوں گے جو متضاد ہونے کے باوجود توازن قبول کر لیتے ہوں گے۔ اس کی رائے میں المیہ سے ہمیں جو آسودگی اور روحانی کیف اور واگذاشت کا احساس حاصل ہوتا ہے، اس کا خاص سبب یہی توازن اور تطابق ہے۔ اس نظریہ پر بھی کم و بیش وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو ہیگل کے نظریہ پر کیا گیا تھا، یعنی یہ کہ دونوں اپنے عام نظریہ کو المیہ پر مسلط کر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ قربت اور مراجعت کے جذبات کی توجیہہ رچرڈس نے جس انداز سے کی ہے، عام تجربہ اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کی یہ عمومی رائے بھی مشتبہ ہے کہ ادب اور آرٹ کا کام صرف محرکات و احساسات میں ایک نوع کا توازن پیدا کرنا ہے۔

فرانسیسی فلسفی روسو کا خیال ہے کہ المیہ دیکھنے سے جو لذت ہمیں حاصل ہوتی ہے، اس کی بنیاد بد باطنی اور کینہ پروری، یا موجودہ نفسیاتی اصطلاح میں ایذا پسندی (Masochism) پر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان حادثاتِ عظیم پر جن سے ہم خود محفوظ و مامون ہیں اور جن کا شکار ہوتے ہوئے ہم دوسروں کو دیکھتے ہیں ہمیں ایک طرح کا اطمینان حاصل ہوتا ہے، اور ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ سرتا سر کلبیت (Cynicism) پر مبنی ہے اس سے زیادہ فلسفیانہ نظریہ شوپنہار کا ہے، جس کے نزدیک المیہ اس لئے پسندیدہ ہے کیونکہ وہ ہمارے اندر زندگی کی قوت ارادی کو کمزور کرتا، ہمارے اندر جذبہ تسلیم و رضا کو فروغ دیتا اور ہم پر زندگی کی حقیر اور بے حقیقتی کو روشن کرتا ہے۔ اس نظریہ پر شوپنہار کے قنوطی فلسفۂ زندگی کی چھاپ لگی ہوئی ہے اور یہ تمام تر موضوعی ہے۔ شوپنہار زندگی کو ایک مستقل اور مسلسل دکھ اور مصیبت کے مترادف جانتا

ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زندگی مسرت کی جستجو سے زیادہ غم سے گریز کرلنے کا نام ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مسرت اپنی جگہ مستقل، قائم بالذات، اور آزاد اکائی نہیں، بلکہ صرف غم کی عدم موجودگی سے عبارت ہے؛ اور اسی لئے نفس کشی کے ذریعے اگر ہم زندگی کی قوتِ ارادی سے چھٹکارا حاصل کرلیں، اور اپنے اندر تسلیم و رضا کا جذبہ پیدا کر سکیں، تو شاید غم اور دکھ کی غلامی سے نجات پا سکیں۔ شوپنہار تفکر کو عمل پر، تسلیم و رضا کو پیکار و مدافعت پر ترجیح دیتا ہے۔

حکیم افلاطون نے ڈرامے کی مذمت اس لئے کی تھی، کیونکہ کرداروں کی نقل کرنے سے ہم اپنی خودی کی نفی کے مرتکب ہوتے ہیں، جو اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ برداشت ہے۔ اقبال کی رائے، جو انھوں نے "ضربِ کلیم" میں ظاہر کی ہے، افلاطون کی رائے سے حیرت انگیز طور پر مماثلت رکھتی ہے ؎

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے ۔۔۔ رہا نہ تو تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات

لیکن اس مسئلہ پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہیئے کہ دراصل المیہ کردار سے ہم آہنگی قائم کرنے کا عمل، جسے (Empathy) کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں، واہمہ (Phantasy) کی دنیا میں ہوتا ہے جب یہ ختم ہوجاتا ہے، تو ہم دوبارہ واقعاتی زندگی سے اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اور غالباً المیہ کردار کے تجربات میں شریک ہو چکنے کے بعد ہم اپنے اندر روزمرہ کی زندگی کے لئے ایک نئی اور پیچیدہ تر آمادگی پانے لگتے ہیں۔ ہمارا انفرادی نفس اپنی کاہلی اور خودپرستی کے خول سے باہر نکل آتا ہے، اور اس میں ایک نیا کس بل، ایک نئی وسعت اور ایک نئی معروضیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے برعکس شوپنہار المیہ کو اس لئے پسند کرتا ہے، کیونکہ اس سے زندگی کی بے حقیقی اور کم مایگی ثابت ہوتی ہے۔ شوپنہار کو دنیا کے عظیم غم کا ایسا ہی گہرا اور شدید احساس تھا، جیسا کہ روسی ناول نگار دستووسکی کو، جس کا قول ہے کہ "صرف مصائب ہی شعور کا سرچشمہ ہیں"۔ قوتِ ارادی سے آزاد ہوجانے کا خیال جو شوپنہار کے یہاں پایا جاتا ہے، وہ ہندو فلسفے سے بہت قریب ہے، جس میں نروان حاصل کرنے کی شرطِ اولین سوز و سازِ زندگی کے طلسم کو توڑنا ہے۔ شوپنہار المیہ کو اس لئے عزیز رکھتا ہے، کیونکہ وہ اسے اپنے فلسفۂ زندگی کی غایت کے اتمام اور جواز کا وسیلہ جانتا ہے۔ اس کے نظریہ میں صداقت

تو سزا وار ہے، مگر مکمل صداقت نہیں، اور المیہ کے متعلق اس کے نتائج تصویر کے صرف ایک ہی رُخ کو پیش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غم زندگی کی بہت بڑی اور ناگزیر حقیقت ہے، اور المیہ کی بنیاد اس غم کے احساس پر ہے، جو انسانی زندگی کا چاروں طرف سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسان بے رحم اور سفاک قوتوں کی ستم ظریفی کا ہدف ہے۔ مگر پھر بھی المیہ کو دیکھ کر زندگی کی بے حقیقتی اور تحقیر کا تاثر قبول کرنا منفی اندازِ فکر کو ظاہر کرتا ہے۔ المیہ کردار کی غلطی اور زوال میں ہم انسانی عظمت کے امکانات کا وضاحت کے ساتھ احساس کرتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اپنے مشہور مضمون (A Free Man's Worship) میں، جسے ٹی ایس ایلیٹ نے بری نثر کی مثال بتایا ہے المیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "انسان چاروں طرف سے مخالف قوتوں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہے، اور قدرت کا ظالم ہاتھ ہمہ وقت اس کی آرزوؤں اور خوابوں کو منتشر اور پراگندہ کرنے پر تلا رہتا ہے۔" تاہم انسانی ارادہ کی بلندی اس کی روح کی عظمت، اس کی ہمت کا استقلال، اس کے حوصلہ کی فراخی، اس کی پامردی، اُس کا اپنے آپ کو قدرت کا مدِ مقابل ثابت کرنا اور شکست اور نا امیدی اور بے چارگی کی حالت میں بھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا جذبہ، یہی وہ تاثرات ہیں۔ جو المیہ سے ہمارے اوپر مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں اس کی دلکشی کا راز ہے، اور یہی المیہ لذت کا سرچشمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ کرداروں کی شکست و ریخت کے باوجود ہم ان کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا گہرا نقش ہمارے دل و دماغ پر باقی رہتا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے "وینس کے سوداگر" کا اختتام اس لئے غیر تشفی بخش اور ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ شائی لاک جو ایک المیہ کردار ہے، بآسانی کار اپنی شکست کو قبول کر لیتا ہے۔ عموماً المیہ کردار میں پندار پایا جاتا ہے، وہ اپنی انا کا ادعا کرتا، اور اسے منوانا چاہتا ہے۔ وہ انسان کی طرف سے اُس کائنات کو جواب پیش کرتا ہے، جو اسے ہر طرف سے کچلنا چاہتی ہے، لیکن جو شخص المیہ کی حزنیہ فضا میں امید کی کرن کو نہیں پاسکتا، اس کا تاثر اور ردِ عمل المیہ کے بارے میں صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

المیہ کا خاص مقصد بیرونی دھچکوں کی مدد سے انسانی نفس کو پیچیدہ اور مضبوط بنانا ہے۔ المیہ انسان

اس لئے تکلیف اٹھاتا ہے، کیونکہ وہ معمول سے بڑھ کر ان تناقضات کا احساس رکھتا ہے، جو کائنات
اور انسان میں پائے جاتے ہیں، اس خلیج کا جو خواہشات اور ان کی تکمیل اور حصول کے درمیان موجود ہے
یا واقعی اور مثالی کائنات کے درمیان موازنہ کا۔ المیہ میں کشمکش ہی نہیں ہوتی، توازن بھی ہوتا ہے
دکھ اور لاپروائی کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس سے ماورا ایک امکانی حل یا خیر کی موجودگی کا احساس
بھی ہوتا ہے دکھ جھیلنا اور مقصد کا اثبات کرنا ٹھوس اور ناقابلِ انکار حقیقت سہی، مگر کسی بنیادی اور عالم گیر قانون
سے وابستگی بھی۔ جو غم کو وجد اور مسرت سے تبدیل کر دے، المیہ کے پورے ماحول میں سرایت
کئے ہوتی ہے۔ دکھ اور برائی کے مظاہر کے خلاف بھلائی کی کائنات کو نمایاں کرنا اور اس طرح تجربہ کے
دو مختلف تاثرات کے درمیان توازن اور مطابقت قائم کرنا دنیا کے تمام بڑے المیہ نگاروں جیسے ایسکائلس
سافکلیس، شیکسپیئر اور ابسن کا وظیفہ رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے المیہ میں ایک زندہ تناؤ پیدا ہوتا ہے جس کے
بغیر اس کا تصور ممکن نہیں۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ المیہ کو بیک وقت قنوطی اور رجائی کہہ سکتے ہیں۔ قنوطی اس
لئے کہ کائنات میں شر لاعلاج معلوم ہوتا ہے، گویا وہ وجود کی ایک لابدی شرط ہو، اور رجائی اس لئے کہ
اس میں توانائی کا عنصر پایا جاتا ہے، اور وہ ایک آفاقی خیر میں ہمارے یقین کو تازہ کر دیتا ہے۔

میں نے شروع میں عمل، کشمکش اور نقطۂ عروج کو المیہ کے لازمی عناصر قرار دیا تھا۔ ان میں تحیر اور
پراسرار کیفیت کا اضافہ ضروری سمجھتا ہوں، جو قدرت کے مبرم اور اٹل قانون کے نفاذ پر انسان کے دل
میں پیدا ہوتی ہے، اور اسے یہ پر استعجاب سوال پوچھنے پر اکساتی ہے کہ کیا اس کی عزیز ترین صلاحیتیں
اور عظیم ترین نصب العین شکست و تخریب ہی کے لئے وجود میں آئے ہیں؟ المیہ میں واقعات اور
کرداروں کے منطقی ارتقاء کے باوجود ایک ناقابلِ فہم عنصر کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے لیکن ان
سب امور سے زیادہ میں جس چیز کو اہمیت دیتا ہوں، وہ اس جذبہ کا ادراک ہے، جو المیہ کردار کو
شکست قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتا، بلکہ اسے موت اور ابدیت کو بھی مقابلہ کے لئے للکارنے
پر اکساتا ہے۔ وہ صرف سینہ کوبی سے مطمئن نہیں ہوتا، اور نہ مصائب کے سامنے انعام اور شفاعت
کے پیش نظر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اس کے دکھ میں تحیر کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں برہمی اور قوت
برداشت ہوتی ہے۔ وہ اضطراب اور تلخی محسوس کرتا ہے۔ اور اپنی روح اور کائنات کو ٹٹول ٹٹول کر

دیکھتا ہے۔ وہ کائنات کے قلب میں ایک ناگہانی، دو غیر متوقع لیکن دراصل قدیم و مسلسل شر کا
مشاہدہ کرتا ہے جس نے تمام اشیاء کو مسموم بنا دیا ہے۔ نہ صرف اس کی انفرادی اور منظم زندگی بلکہ
پورے نفس و آفاق میں کوئی خامی راہ پا گئی ہے، اس لیے وہ اپنی پوری شخصیت کو شر کی بیخ کنی
کے لیے لا کھڑا کرتا ہے۔ ظاہری ناامیدی اور شکست کی تاریکی میں بھی انسانی عزم کی پختگی روشنی کے
چراغ کو بادِ صرصر سے بچانے رکھنے کے لیے پیہم جد و جہد کرتی رہتی ہے۔ کائنات اور تقدیر کی مخالف
قوتیں انسان کے نہاں خانۂ دل میں سلگتی چنگاری کو بار بار بجھانا چاہتی ہیں، لیکن چنگاری بار بار
بھڑک اٹھتی ہے اور یہ شعلۂ لرزاں انسانی خودی کی حیاتِ پائندہ کے احساس کو تازہ کر دیتا ہے۔

المیہ سے جذبۂ تسلیم و رضا نہیں، جذبۂ احتجاج اور جذبۂ مقاومت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اس
سے ایک نئی آمادگی اور قوت، اور جبلی زندگی کے خلیوں (Cells) میں ایک نئی توانائی اور تنظیم پیدا
ہوتی ہے۔ المیہ کرداروں میں آخر آخر میں ایک خوشگوار اور ہمہ جہت تبدیلی نمایاں ہوتی ہے۔ مثلاً ہیملٹ اور
ہرمیتیس میں ایک نئی آمادگی اور خود ضبطی، لیئر اور اوڈی پس میں محبت کی تفہیم اور توازن، اینٹی گون
میں شخصیت کی لچک، نرمی اور انسان دوستی۔ یہ تبدیلیاں جو خیر کے اصول کا اثبات کرتی ہیں
متعدی (Infectious) ہوتی ہیں۔ اور پڑھنے والا بھی ان روحانی تجربات سے سرشار ہو جاتا ہے۔
یہی المیہ کا مثبت پہلو ہے۔

مرزا غالبؔ

حضرت سلامؔ مچھلی شہری

یوم غالب کے موقع پر، مزارِ غالبؔ (درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی) پر ۱۸ فروری ۱۹۶۲ء کو سہ پہر کے وقت پڑھی گئی۔

سلام

ـــــ قطبؔ[1] کی محفلِ تخئیل کی اک ماہ پارہ تھی
جو موجِ رنگ و نکہت، نورِ نغمہ تھی، شرارہ تھی
مگر گھبرا بھی جاتی تھی خود اپنے خوابِ رنگیں سے
ابھی کمسن تھی اور واقف نہ تھی آدابِ تزئیں سے
ـــــ زمانہ گزرا ـــــ اور اس مہ جبیں پر بھی شباب آیا
یہی دن تھے کہ فنِ شاعری میں انقلاب آیا
دیارِ تاج[2] سے اک شاعرِ اعظم ہوا پیدا
سراپا شعلۂ گل، نغمۂ شبنم ہوا پیدا
قطبؔ کی محفلِ تخئیل میں اک روشنی آئی
نگارِ ناز اب آئینے میں لیتی تھی انگڑائی

---

[1] محمد قلی قطب شاہ
[2] اکبرآباد (آگرہ)

چراغ سرد اس کے حسن کے پرتو سے جل اٹھا
وہ عالم تھا کہ خود شاہِ جہاں گویا مچل اٹھا!
— اُدھر شاعر بھی بچپن اور جوانی کی بہاروں میں
خود اپنی عظمتِ افکار کے نازک شراروں میں
نکھر کر دیوتا سا بن گیا تھا شعر و نغمہ کا
مگر اک عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ تھا
بس اک بزمِ قطب، بزم ولی کی ماہ پارہ تھی
جو اُس کی جنتِ افکار کا رنگیں نظارہ تھی
— بہر صورت وہ اب دلی کی محفل کا ستارہ تھا
یہ مانا اپنی ہی پروازِ فکر و فن سے ہارا تھا
مگر خوشبو اسی کی گلفشاں محلوں میں رہتی تھی
اُسی کی لے ظفر کی دُکھ بھری غزلوں میں بہتی تھی
— کہاں ہے گفتگو سے پہلے مہ پارہ جسے میں نے
وہ اب الھڑ نہ تھی، واقف تھی ہر آدابِ تزئین سے
نکل کر محفلِ گل، تنگ آکر شورِ بلبل سے
ضیائے فکر و دانش لے کے شاعر کے تخیل سے
اُبھر سکتی تھی نورِ کہکشاں و ماہ و اختر سے
وہ اب آنکھیں ملا سکتی تھی درجِل اور ہومر سے
— غرض اس نو بہارِ ناز کو اردو زباں کہیے
وطن کی مشترک تہذیب کا روشن نشاں کہیے!
— جو ہر فنکار سے آرائشِ اردو کا طالب تھا
خدائے شعر و نغمہ کی قسم وہ صرف غالب تھا

وہ غالبؔ جس نے اُردو شاعری کو دلکشی بخشی
ضیائے علم و دانش دے کے تازہ زندگی بخشی
وہ غالبؔ حسن کارِ زہرۂ اردو جسے کہئے
گلستانِ ادب میں جانِ رنگ و بو جسے کہئے
وہ جس نے بربطِ ہندی پہ نغماتِ عجم گایا
وہ جو حافظ کو بھی فردوسِ خسرو کے قریں لایا

—— ہزاروں شاعرانِ نکتہ رس دلّی میں رہتے ہیں
بہ فیضِ یادِ غالبؔ ہم بھی یوں اشعار کہتے ہیں —!

اقبال کی ایک نظم پر بحث

مرتبہ: جناب عابد رضا بیدار

اقبال کی یہ مختصر سی فارسی نظم جو جنگ عظیم کے دوران اس کا ایک تاثر ہے زمانہ (کانپور) کے جنوری ۱۹۱۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔

"نصیب ما زجہان است بقدر ہمت ما"

ہیچ می دانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد

ملک و تدبیر و تجارت را با نگلستاں سپرد
جرمنی را چشم حیران و دلِ بیتاب داد

روس را سرمایۂ جمعیتِ ملت ربود
قہر او کوہِ گراں را لرزۂ سیماب داد

تا بر انگیزد نوائے حریت از سازِ دہر
صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے در خوردِ فطرت از جناب او ببرد
بہر ما چیزے بنود خویش را با ما سپرد

(زمانہ جنوری ۱۹۱۹ء)

زمانہ کے اگلے شمارے میں لفٹننٹ کرنل بھولاناتھ (آئی، ایم، ایس) نے اس نظم میں اصلاح کی: "نصیب ما زجہاں شد بقدر ہمت ما"، اس کا عنوان قرار دیا اور اصلاح شدہ نظم اس طرح لکھی:-

صورت آرائے ازل دانی فرنسہ را چہ داد — طبع رنگین و دل شاد و شراب ناب داد

ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستان سپرد — جرمنی را سر گراں داد و دل بیتاب داد

روس را شیرازۂ جمعیتش از ہم گسیخت — نمسہ و بلغاریہ را لرزۂ سیماب داد

اٹلی و یونان را در مہد ناز اتحاد — شانۂ جاپان بزلف چین بہر تاب داد

کردہ پُر ہسپانیہ را جام مے از پرتگال — مزرعۂ ہالینڈ را از چشم قیصر آب داد

ناروے را قوت جانش در دل ماہی نہاد — زمہریر سویڈ را ہم قاقم و سنجاب داد

تا برانگیزد صدائے حریت از ساز دہر — صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

تاجداران را گدا کرد و گدا را تاجدار — اوج و پستی جہاں را گردش دولاب داد

پیش ہر یک بہرۂ از خوان الوانش نہاد

ہند را بہر تماشہ چشم دو پُر آب داد (زمانہ، فروری ۱۹ء)

اس نظم کے ساتھ بھولانا تھ نے اڈیٹر کو ایک خط بھی لکھا جس میں اپنی اصلاحوں کی وضاحت کی۔

جناب اڈیٹر صاحب

جنوری کے زمانہ میں کلام اقبال کے عنوان سے چند فارسی اشعار درج تھے جو میری نظر سے گزرے۔ ڈاکٹر اقبال کی اردو شاعری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، بلکہ باوجود اہل زبان نہ ہونے کے آپ کی شستہ زبان اور جدت خیالات پر ہم اہل پنجاب جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔

بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست اپنے سمند خوش خرام کا جولان اردو کے میدان ہی میں محدود رکھتے۔ فارسی کی زمین سنگلاخ پر آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان پانچ شعروں میں عروض اور محاورہ کی جگہ بہ جگہ سقیم ہے۔ مثلاً

(۱) صورت بند محاورہ نہیں، صورتگر یا صورت آرا کہتے ہیں۔ بند کے ساتھ نقشبند ہوا کرتا ہے۔

(۲) بافرانس سے مراد آپ کی فرانس را کی ہے۔ یہ فرانس کے معنی فرانس را کے ہو سکتے ہیں، با کے معنی ہمراہ یا معہ کے ہوا کرتے ہیں۔

(۳) ایرانی فرانس کو فرنسہ کہتے ہیں فرانس نہیں کہتے اور تقطیع میں ف متحرک پڑتی ہے جو صحیح نہیں۔

(۴) فکر رنگیں نہیں ہوتا، طبع رنگیں محاورہ ہے۔
(۵) دل گرم نہیں ہوتا۔ دل نرم، دل شاد و خورسند، دل البتہ مستعمل ہے۔
(۶) چشم حیراں کی جگہ پر سر گراں یعنی نخوت و تکبر زیادہ موزوں ہے۔
(۷) نوا کی بجا صدا ہونا چاہیئے؛ ساز میں سے صدا نکلتی ہے نہ نوا۔
(۸) امریکہ کی تقطیع میں امریک آتا ہے۔
(۹) میں شاعر نہیں، البتہ شعر پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں، اس لیے جو ذہن میں آیا بے تکلف عرض کیا۔

کرنل بھولا ناتھ کی اصلاحوں میں بیشتر ایسی ہیں جو شعر کو مدرسہ تک لے جانے پر ملتی ہیں لیکن اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ کرنل کا سا نکھرا ہوا شعری ذوق اور زبان فارسی پر ایسا عبور ہر جگہ آسانی سے نہیں مل جاتا۔

کرنل بھولا ناتھ کی اس تحریر کے جواب میں زمانہ کے اس سے اگلے شمارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال میں ان کے ہمکار خواجہ عبدالواحد ندوی نے اڈیٹر کے نام ایک طویل خط لکھا جو مباحثہ "ڈاکٹر اقبال و کرنل بھولا ناتھ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے اہم حصے حسب ذیل ہیں:-

مکرمی اڈیٹر صاحب! آپ کے رسالہ کی فروری نمبر میں لفٹننٹ کرنل بھولا ناتھ کی مراسلت میری نظر سے گزری ...... ڈاکٹر اقبال شہرت کی حد سے گزر کے "ترجمان قوم" کے درجہ تک پہنچ چکے ہیں اس لیے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو ان کے کلام کی حرف گیری ناگوار معلوم ہو لیکن اگر پہلے ان کے کلام کی آزاد تنقید ضروری تھی تو اب بھی از بس ضروری ہے۔ کیونکہ کامل سے کامل استاد بھی لغزش و خطا سے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

...... مگر یہ لغزشیں ان کے ماہتاب کمال کے داغ ہیں۔ چاند میں بھی داغ ہیں مگر ان داغوں کی وجہ سے اس کے جمال جہاں آرا سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی شعر مجسم طبیعت سے غلطیاں ہوتی ہیں اور اردو فارسی دونوں میں ہوتی ہیں۔ مگر ان غلطیوں کی وجہ سے میں کرنل بھولا ناتھ صاحب کے ہم آہنگ ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ "بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست اپنے سمند خوشخرام کا جولان

اردو ہی کے میدان میں محدود رکھتے، فارسی کی زمین سنگلاخ میں آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ طبع اقبال کے سمند خوش خرام نے اپنی خوش خرامی سے دونوں میدانوں کو مشترستان خیال بنادیا ہے .....

اقبال کے پہلے شعر کے مصرعۂ اول پر کرنل بھولاناتھ صاحب نے چند اعتراضات فرمائے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ صورت بند محاورہ نہیں ہے — بند کے ساتھ نقش بند ہوا کرتا ہے" مگر واقعہ یہ ہے کہ نقشبند کی طرح صورت بند بھی محاورہ ہے۔ لغت کی متداول اور مستند کتابوں کی تصریح موجود ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:

منظرے بوس کشیدہ بلند   چشم بند ہزار صورت بند

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بافرانس معنی فرانس را کے صحیح نہیں۔ یہ اعتراض پڑھ کے میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی با کا را کے معنی میں آنا اس قدر مشہور و معروف بات ہے کہ لغت و قواعد کی مشہور مستند بلکہ معمولی ادبی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ یہ مصرع سند اً عرض ہے۔

سحاب دہ زمیغ باکوہ

تیسرا اعتراض لفظ فرانس پر ہے۔ اس اعتراض کے دو جز ہیں۔ جزء اول کا تعلق لفظ سے ہے اور جز دوم کا تعلق وزن سے۔ اعتراض کے جز اول سے تفریس اسمار کی ایک اصولی بحث پیدا ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ۱۹ ویں صدی میں فارسی بولنے والے ممالک پر مغربی تہذیب کا اثر پڑنا شروع ہوا ہندوستان سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے انگلستان اور اس کے زیر اثر رہا مگر علمی حیثیت سے فرانس کا اثر قبول کیا۔ وسط ایشیا علمی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے روس کے زیر اثر رہا اور فرانس کا اثر اگر پڑا بھی تو اس کی وساطت سے۔ اس لئے مغربی ناموں کا تلفظ ہر ملک نے الگ الگ کیا۔ ہندوستان میں چونکہ یہ نام انگریزوں کی وساطت سے آئے تھے اس لئے تلفظ انگریزی کے قاعدہ سے کیا گیا۔ ایران میں یہ نام فرانسیسی زبان سے گئے تھے، اس لئے ان کا تلفظ فرانسیسی تلفظ کے مطابق کیا گیا...

اب لفظ فرانس کو لیجئے۔ انگریزی میں تو اس کا تلفظ فرانس ہی جو بعینہٖ اردو میں قائم ہے۔ فرانسیسی میں اسی کا تلفظ فرانسے اور فران کے بین بین ہوتا ہے جو غیر فرانسیسی کلام و زبان سے بغیر مشق کے مشکل سے

ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ایرانی فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو یہ نہ تعریب زائدہ نہ کوئی مستقل نام بلکہ درحقیقت تلفظ ہے جو درحقیقت انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے اختلاف تلفظ کا نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مغربی نام فارسی زبان میں استعمال کئے جائیں تو ان کو معرب بنا لینا چاہئے یا اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنا چاہئے اور اگر معرب بنایا جائے تو کس قاعدہ سے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کے متعلق کوئی اصول ابھی تک طے نہیں ہوا ہے۔ ایرانی ارباب قلم عام قدرتی طریقہ کے پابند ہیں۔ جس نے جو لفظ جس طرح سنا ہے، اسی طرح استعمال کرتا ہے۔ بمبئی، کلکتہ، حیدرآباد سے جو فارسی اخبارات خود ایران یا ایرانیوں نے نکالے تھے ان میں مغربی ناموں کا تلفظ انگریزی قاعدہ سے ہوتا تھا۔ ترکستان، مثلاً باخچہ سرائے وغیرہ سے جو فارسی اخبارات نکلتے تھے ان میں مغربی ناموں کا تلفظ روسی قاعدہ سے ہوتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی اس عام قدرتی قاعدہ کے پابند ہیں۔ کرنل صاحب اس روش کو قابل اعتراض فرماتے ہیں۔ یہ درحقیقت محاورہ و زبان کی غلطی نہیں بلکہ اختلاف رائے ہے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ کرنل صاحب جس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے خود اسی پر عمل کرتے ہیں۔ ایرانی اگر فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو جرمنی کو المانیہ، اٹلی کو اطالیہ، جاپان کو ژاپون کہتے ہیں۔ مگر کرنل صاحب نے اپنی اصلاح میں ان تمام ناموں کا وہی تلفظ کیا ہے جو ہندوستان میں رائج ہے۔

پہلے شعر کے مصرعہ ثانی کے متعلق کرنل صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ فکر رنگین اور دل گرم محاورہ نہیں کیا عرض کروں، اس وقت کوئی شعر یاد نہیں آتا تاہم کرنل صاحب اتنا تو ضرور تسلیم فرمائیں گے کہ خیال رنگین اور رنگین خیال و نیز گرم دل بمعنی عاشق سوختہ آتا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی فکر رنگین و دل گرم بمعنی سوختہ عشق غلط ہوگا۔ مگر بہتر یہ ہے کہ یہ اعتراض سند کے ملنے تک ملتوی رکھا جائے۔ اس لئے اس وقت سرسری اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

اقبال کے دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں کرنل صاحب چشم حیراں کے بدلے سرگراں زیادہ موزوں خیال کرتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ موزونیت شاعری کے لحاظ سے ہے یا واقعہ کے خیال سے۔ شاعری کے لحاظ سے تو دل بے تاب کے لئے چشم حیراں ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ رہا واقعہ، تو اس کے متعلق وہ حضرات فیصلہ کرسکتے ہیں جو جرمن قوم کے اصلی کیریکٹر سے واقف ہیں۔ لیکن اگر واقعہ کے

لحاظ سے سرگراں زیادہ موزوں ہے جب بھی سرگراں چنداں مناسب نہ ہوگا کیوں کہ سرگراں کے معنی بقول کرنل صاحب متکبر اور مغرور ہوں گے اور آگے داؤ ہے اس لئے سرگرانی ہونا چاہیئے۔

چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ پر اعتراض ہے کہ ساز سے صدا نکلتی ہے نہ کہ نوا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ نوا مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں اور نغمہ کو بھی، موسیقی کے بارہ مقاموں میں سے ایک مقام کا نام بھی ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں :

شد زن مطرب بہ نوا گستری

حضرت نظامی گنجوی فرماتے ہیں :

بر زخمہ چون نے نوا ساز نم

کیا اب بھی "ساز دہر" سے نوائے حریت" کا نکلنا خلاف محاورہ ہے۔

آخر میں چند لفظ ان دونوں نظموں کی عام روح (اسپرٹ) کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اقبال کی نظم پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی انفرادی شخصیت وطن کی اجتماعی شخصیت میں جذب کر دی ہے۔ اقبال، اس وقت اقبال نہیں بلکہ بدنصیب ہندوستانی ہے۔ اس کا دل ہندوستان کا دل ہے اس کی زبان ہندوستان کی زبان ہے۔ اس کا کلام اقبال کے خیالات کی تعبیر نہیں بلکہ ہندوستان کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ غرض وہ اس وقت ہندوستانی کے دل سے محسوس کر رہا ہے اسی کے دماغ سے سوچ رہا ہے اور اسی کی زبان سے بول رہا ہے۔ ———— اس لئے وہ جانتا ہے کہ اس موقع پر وہ واعظ ناصح یا خطیب نہیں بن سکتا، اسے شاعر اور صرف شاعر بننا چاہیئے یعنی الفاظ کے آب و رنگ سے وطن کے جذبات کی تصویر کھینچنا چاہیئے۔

تھوڑی دیر کے لئے چشم ظاہر بیں کو بند کیجیے اور ہندوستان کا دل بن کر تخیل کی نظر سے دیکھنا شروع کیجئے۔ عالم اور کاروبار عالم پیش نظر ہے، فرانس داد عیش و طرب دے رہا ہے، انگلستان تجارت حکومت کا نقارہ بجا رہا ہے اس حالت کو دیکھ کے جرمنی کی نگاہ رشک حیراں اور دل حوصلہ بیتاب ہے۔ اس کا کوہ استبداد زیر و زبر ہو چکا ہے۔ امریکہ سے انسانیت پرستی اور حریت پروری کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ خیال کا مسافر بحیرۂ اٹلانٹک کے دونوں جانب سیر کر کے اپنی طرف لوٹتا ہے ہم یعنی

ہندوستان۔ کون ہندوستان؟ جو کبھی روحانیت کا چشمہ فیض تھا، جو کبھی آفتاب علم کا مطلع انوار تھا! جو کبھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا! جو کبھی عیش و عشرت کا جنت آباد تھا! آج اس کی کیا حالت ہے؟ دل پر ایک چوٹ لگتی ہے حسرت کی آنکھ سے یاس کے اشک خونیں ٹپکنا چاہتے ہیں ایک نہایت نازک موقع، ایک علم النفسی لحظہ، کمال شاعری کی امتحان گاہ، اقبال معمولی شاعر نہیں ورنہ ایک حسرت آمیز شعر کہہ کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا۔ اس کی طبیعت نکتہ رس اور دقیقہ سنج ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک پس ماندہ قوم کے سامنے حسرت و یاس کی تصویر پیش کرنا اس کو موت کا پیغام دینا ہے۔ اس لئے وہ ایک ایسا مضمون تلاش کرتا ہے جو عبرت انگیزی اور خودداری دونوں کی روح سے معمور ہو۔ اسے معلوم ہے کہ ناامیدی کی حالت میں نفس انسانی تسلی آمیز خیال کے لئے تشنہ لب ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی خبر ہے کہ یورپ و امریکہ اگرچہ مادیات میں اوج ترقی پر ہیں لیکن روحانیت میں ان کے یہاں صفر ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان گو دنیاوی حیثیت سے درماندہ و بے نوا ہے لیکن روحانیت و مذہب اس کی زندگی کا عنصر غالب ہے، ان حالات کو پیش نظر رکھ کے وہ ایک مرقع پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں مغرب کی مادی ترقی اور روحانی تنزل اور ہندوستان کا مادی افلاس اور روحانی دولت مندی، پہلو بہ پہلو نظر آئیں۔ وہ یہ خوب جانتا ہے کہ خدا کا نام اس کے ہموطنوں کے لئے کیا کشش رکھتا ہے۔ اس لئے وہ سازِ شاعری کے اسی تار کو چھیڑتا ہے اور ایک عبرت و تسلی آمیز نغمہ اس شعر کی صورت بن کے نکلتا ہو۔

ہر کسے درخورد الخ

کرنل صاحب کی نظم پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ناظم قوم کا ایک دردمند و غمگسار ناصح ہے۔ وہ دنیا کی چہل پہل، ہل چل، جد و جہد اور رونق و گرم بازاری اور اس کے مقابلے میں اپنے عزیز وطن کی بے چینی و بے بسی کو دیکھتا ہے، اس کا دل خون ہوتا ہے اور یہ خون دل شعر بن کے ٹپکنے لگتا ہے۔ وہ درد و غم سے بے چین ہو، اس بے چینی کے عالم میں اقبال کی سبق آموزی اور خودداری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہو۔ وہ اپنے وطن کی پس ماندگی کا ذمہ دار صورت آرائے ازل کو ٹھہراتا اور ایک شکوہ سنج لہجہ میں چیخ اٹھتا ہو: پیش ہر یک بہرہ الخ

اصل یہ ہے کہ کرنل صاحب نے اقبال کے نقطۂ خیال کو نظر انداز فرمادیا۔ چونکہ نقطۂ خیال بدل گیا، اس لئے اصلاح شدہ نظم میں نہ وہ روح رہی جو اصل نظم میں تھی اور نہ وہ اثر و کیف۔

محاکمۂ اقبال و بھولا ناتھ کے متعلق یہ چند سرسری اشارات ہیں۔ اقبال کی نظم میں بلاغت کے جو لطیف و نازک نکتے ہیں وہ تفصیل کے طالب ہیں جو اس مختصر مراسلت کے لئے موزوں نہیں، اس لئے قلم انداز کرتا ہوں۔"

(زمانہ مارچ ۱۹۱۹ء)

کرنل بھولا ناتھ کی تحریر کی یہ اہمیت ہے کہ ابھی یہ کل کی بات ہے کہ کسی زبان کا علم مذہب اور مسلک کی بنا پر نہیں "اہل" یا "نااہل" بلکہ اپنے ذوق اور اس علم یا زبان کی اہمیت کی بنا پر۔ یہ اہم بات ہے یا نہیں کہ اقبال جو ۱۹۱۹ء میں ٹیگور کی طرح بین الاقوامی ادبی میدان میں ہندوستان کی نمائندگی کر رہے تھے اور فارسی کی دو عظیم مثنویاں لکھ چکے تھے جن کا نکلسن نے انگریزی میں ترجمہ بھی کر ڈالا تھا (اسرار خودی)، اور دو تین سال کے اندر اپنا فارسی شاہکار پیام مشرق شائع کرنے والے تھے، اقبال جو اس وقت دنیا کے چند گنے چنے شاعروں میں اپنا مقام بنا چکے ہیں، ان کے کلام پر ایک ایسے مذہب کا ماننے والا اتنی صاف ستھری اور اچھی تنقید کر رہا ہے جس مذہب کے ماننے والے اب فارسی تو کیا اردو کو بھی ایک خاص مذہب سے ملوث کرنے پر مصر ہیں!

ایں چہ بوالعجبی است۔ اور عبدالواجد ندوی کی تحریر کی اہمیت یہ ہے کہ ۱۹۱۹ء میں کس حد تک اقبال کی عظمت کا اعتراف ہو چکا تھا۔

(کرنل بھولا ناتھ قوم کے راجپوت تھے، آبا و اجداد کا وطن اصلی ضلع پرتاب گڑھ تھا، مگر رنجیت سنگھ کے زمانے میں آپ کے دادا پنجاب میں آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ ۱۸۶۶ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۲ء میں لاہور میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں امتیاز کے ساتھ تعلیم سے فراغت حاصل کی اور ۱۸۸۹ء میں ڈاکٹری کی مزید تعلیم کے لئے انگلستان گئے۔ ۱۸۹۳ء میں انڈین میڈیکل سروس میں داخل ہوئے۔)

(اعظمی)

مضمون کی فرمائش کا جواب

جناب "دھرم سروپ"

جنابِ مجیب صاحب،

یوم آزادی کی شام کو آپ نے فرمایا کہ جامعہ کے میگزین کے لئے مضمون لکھوں، آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن مضمون نویسی دماغ والوں کا کام ہے اور قدرت نے میری سرشت میں دل کو دماغ سے زیادہ جگہ دی۔

جہاں والوں کا کیا ہے وہ تو دیوانہ سمجھتے ہیں
مجھے کچھ عقل سے اپنے بھی بیگانہ سمجھتے ہیں

مضمون نویسی کے لئے قابلیت، نکتہ سنجی، تنقیدی نظر اور زبان پر دسترس لازم ہیں۔ میں ان تمام اجزا کو کہاں سے لاؤں کہ آپ کے لائق کوئی مضمون لکھ سکوں، کامیاب کلرکی کر لینا اور بات ہے لیکن کوئی معیاری چیز اردو میں لکھنا اور بات، یہی وجہ تھی کہ میں نے عدیم الفرصتی کا عذر پیش کیا تھا، جس پر آپ نے فرمایا تھا کہ کل پر چھوڑنے سے کب کوئی کام سرانجام ہوتا ہے، آپ کی اس بات پر غور کرنے کا نتیجہ ہے کہ یہ خط آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔

آج تک آپ سے میری ملاقات محض ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے ہوتی رہی ہے۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں آپ سے اپنی شخصیت کے اس پہلو کا تعارف کراؤں جو میری نظر میں افسری سے کہیں زیادہ اہم ہے اور جسے میں نے اب تک اس ڈر سے لوگوں کی نظروں سے چھپائے رکھا کہ کہیں اس کا انکشاف مجھے سرکاری حلقوں میں بدنام نہ کر دے۔ میری مراد اپنی خاموش اور محدود سی ادبی زندگی سے ہے جس کا پس منظر میری غریبی ہے، افسری نہیں۔ میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا، میں نے سفید پوشی کی بے بسی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں شدت سے محسوس بھی کیا ہے، میں

اب بھی دیوانِ امارت میں اپنے آپ کو اجنبی سا پاتا ہوں اور جانتا ہوں کہ جب تک ہماری غریبی کے نیچر میں صحت و تندرستی اور زندہ دلی کی لہر نہیں دوڑ جاتی میرے لئے حصولِ امن و آشتی ناممکن ہے، اپنی ذاتی غریبی سے جہاد کرتے ہوئے میں نے اپنے طبعی میلان کو بہت حد تک قربان کر دیا ایک وقت تھا جب میں اپنی زندگی ادب کے لئے وقف کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً پچیس برس ہوئے جب میری پہلی ادبی کاوش" ادبی دنیا" لاہور میں ایک افسانے کی صورت میں شائع ہوئی لیکن آخر پیٹ کی جیت ہوئی اور میں نے اپنی ساری قوت مقابلے کے امتحان میں لگا کر سرکاری نوکری کر لی۔ ہم سنا کرتے تھے کہ افسری محض مفت خوری ہوتی ہے۔ لیکن میرا تجربہ بالکل مختلف ہی یہاں تو پچھلے پچیس سال سے تن من اس افسری پر نچھاور ہو گئے ہیں۔ آپ ہی بتایئے کہ جس شخص نے اپنی تمام قوتوں کو فائلوں وغیرہ کے لئے وقف کر دیا ہو، وہ ادبی کام کرے تو کیونکر۔ لیکن خدا کا کرم ہے کہ برسوں کی غنودگی کے بعد لکھنے پڑھنے کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا۔

مجھے پچھلی جنگ عظیم میں ہندوستانی فوجوں کے ساتھ لام پر جانا پڑا۔ جنگ کے محاذ پر انسانی حیوانیت پوری عریانی کے ساتھ نمایاں ہو رہی تھی، زندگی بے معنی سی معلوم ہوتی تھی اس وقت سوامی ویویکا نند کے لیکچروں کا مجموعہ میرے ہاتھ لگا۔ اس خدا رسیدہ انسان نے میری روحانی پیاس کو بجھایا اور مجھے ایک مقصد حیات سونپ دیا، خدمتِ خلق کا راستہ اور ساتھ ہی رازِ حیات بھی بتا دیا۔ حقیقتِ عشق اس کے بعد زندگی پر معنی ہو گئی۔

چشمِ ساقی کی ترجمانی سے زندگی بھر گئی معانی سے

اور سر شکرانے میں جھک گیا۔

ہم نے پائی مسرتِ ابدی اپنے ہی سوزِ جاودانی سے
حاصلِ زندگی ہیں وہ آنسو جو گرے فرطِ شادمانی سے

اس کے بعد میں نے اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا، ساتھ ہی ساتھ ہر مناسب طریقے سے کوشش کی کہ میری نوکری کی کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے براہِ راست

لوگوں کی مشکلات دور کرنے میں ہاتھ بٹا سکوں لیکن ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی

مجھے نہ تو کوئی اپنی پسند کا کام ملا اور نہ ہی میری کسی اسکیم پر پوری طرح غور ہوا۔ مثلاً میں یقین سے کہتا ہوں کہ دہلی کی گندی آبادیوں (سلم) میں رہنے والے لوگوں کو سینکڑوں کروڑوں کے بڑے بڑے پلان بنائے بغیر صاف ستھرے مکانوں میں بسایا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کام پر ایک ایسے شخص کو لگایا جائے جو غریبی سے دوچار ہو چکا ہو اور جس کے دل میں درد ہو اور جو اپنے عہدہ کو اپنی ترقی ہی کا ذریعہ نہ سمجھتا ہو، بہرحال اس طرح کا کوئی عملی کام میرے حصے میں نہ آسکا، شروع شروع میں تو مجھے شکایت رہی کہ شاید میرے نام کے پیچھے آئی۔سی۔ایس یا آئی۔اے۔ایس کی دُم نہ ہونے کی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا جا رہا ہے لیکن سوامی دویکانند کے مطالعہ کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ انسان کوئی کام اس وقت تک نہیں کر پاتا جب تک وہ اپنے آپ کو یزدانی مقصد کے موافق نہ بنالے۔ ہماری تمام کوششیں، ہماری سب کاوشیں تب ہی بار آور ہوتی ہیں جب وہ رضائے الٰہی کے مطابق ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ زندگی محض پچاس ساٹھ سال کے وقفہ پر مبنی نہیں ہے، انسانی ارتقا بار بار جنم لے کر ہوتی ہے یہاں تک کہ دوسروں کی بھلائی کے کام بھی ہماری روحانی ارتقا کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں، اگر مجھے آج تک کسی ایسے کام کا موقع نہیں ملا جسے میں کرنا چاہتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ میں ابھی اس کے قابل نہیں ہو پایا اور مجھے اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے، دوسرے میں سمجھتا ہوں کہ سچے معنوں میں تعمیری کام ملازمت میں رہ کر نہیں ہو سکتا۔ سرکاری محکمے بہت سا مفید کام کرتے ہیں، رفاہِ عام پر بھی زور دیا جاتا ہے لیکن یہاں کچھ ایسی مجبوریاں ہیں کہ ملازمین کی اسّی فیصدی سے زیادہ قوت محض کاغذی کارروائیوں میں لگ جاتی ہے۔

ان جملہ ہائے معترضہ کے لئے معافی چاہتا ہوں، میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میدانِ عمل میں براہِ راست گامزن ہونے کا موقع نہ پاکر میرے دل و دماغ کو فائلوں سے فرار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دوسروں کی اسکیموں پر مسلسل تنقید سے دماغ میں ایک قسم کا "نفی پن" آنے کا ڈر ہوتا ہے

اور ہم میں سے بہت سے افسر نوٹ لکھتے لکھتے اپنی قوتِ تخلیق کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور تعمیری کام کے قابل نہیں رہتے۔ اگرچہ اوائل جوانی میں مجھے بھی خودکشی کے خیال نے ستایا تھا لیکن مجھے دماغی اور روحانی خودکشی منظور نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دماغی ہیجان نے ایک قسم کی بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ میں رشوت ستانی کو کم نہ کر سکا، بڑے بڑے لوگوں کو پبلک کا پیسہ ہڑپ کرنے سے نہ روک سکا، چاروں طرف جو چراغ بکف لوٹ مچ رہی تھی اسے بے بس آنکھوں سے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا، عوام کی بہبودی کی سیدھی سادی باتوں کو قانونی، سیاسی، اور مالی پیچ و خم میں الجھنے سے نہ بچا سکا لیکن بطور ردِعمل میرے خیالات چھوٹے چھوٹے افسانوں میں ڈھلنے لگے مجھے اپنی قوم اور ملک کی ترقی کا پورا یقین ہے، محض طنز اور نکتہ چینی میری فطرت نہیں، اِن افسانوں سے کچھ تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا منظور تھا اور کچھ اپنی امیدوں کو زندہ رکھنا، تاکہ تعمیر کے خواب پریشان نہ ہونے پائیں۔ ان "افسانچوں" کی تکنیک بھی روشِ عام سے قدرے مختلف ہے، اِن میں نہ تو پس منظر کو تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نہ انجام کو واضح کیا جاتا ہے۔ ایک جانی بوجھی حقیقت کی جھلک نمودار ہوتی ہے اور جھٹ سے چھپ جاتی ہے اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ جاتی ہے یا یوں کہیے کہ افسانچہ "محض کلائمکس" پر منحصر ہوتا ہے۔ نمونہ کے طور پر اسے دیکھیے۔

"کمار کی حالت اُس ہوا باز کی سی تھی جس کے سارے انجن یکدم فیل ہوگئے ہوں اور جس کا مسافروں سے لدا ہوا جہاز پوری سرعت سے بھیانک موت کے منہ میں جا رہا ہو، اس کا ہاتھ آشا کی نیم برہنہ مرمریں کمر سے ایسے ہٹ گیا جیسے اُس پر فالج گر گیا ہو، اس کا اُبلتا ہوا خون منجمد ہوگیا، اس کی زبان بند ہوگئی، آشا کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی وہ ساڑھی کے سرکتے ہوئے آنچل کو سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو تم ارونا کو جانتی ہو؟" کمار نے بہ مشکل کہا۔

"جانتی تو نہیں لیکن سب کچھ سن چکی ہوں، تم اب بھی اس سندر ناری پر جان دیتے ہو۔ تم نے اُسے گھر سے نہیں نکالا، وہ خود ہی میکے چلی گئی ہے۔ تم نے دوسری شادی کا ناٹک کس مطلب کے لئے رچا ہے وہ بھی جانتی ہوں، کہتے کیوں نہیں مجھے تم سے محبت ہے؟" جھوٹے پیار کا ڈھونگ

رہنے کی بھی ہمت نہیں رہی کیا، جن باتوں سے مجھے دھوکا دے کر بیاہ لائے ہو وہ سب کیا ہوئیں خیر اب تمھاری زبان کیسے کھلے گی، مگر اتنا اور جان لو کہ آج تک تم نے مجھے غلط سمجھا ہے، میری اٹھتی جوانی کی فیشن پرستی کو تم نے بے شرمی اور بے حیائی سے تعبیر کیا ہے۔ میرے کنوارپن کی چنچلتا کو تم نے عشوہ و ادا سمجھا تھا، میری آزادروی سے تم یہ سمجھ بیٹھے کہ میں ایک "چیپ" قسم کی عورت ہوں، تمھاری اس غلط فہمی کی کچھ ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اور یہی میری زندگی کی ٹریجیڈی کا کارن ہے کہ مجھے اب سے وہ راہ اختیار کرنا ہوگی جس پر تم سمجھتے تھے کہ میں گامزن ہوں۔ لیکن تم مجھے بڑے بڑے ٹھیکے حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنا سکو گے کمار، تم نے مجھے بیاہ کر میری پرورش اور حفاظت کا ٹھیکہ اٹھایا تھا، میرے "بزنس میں" تم نے جن پاک جذبات کو ہمیشہ کے لئے کچل دیا ہے وہ چنگاریاں بن کر اٹھیں گے، میرے پیار کی پھوار اب طوفان بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ میرے حسن کی چاندنی بجلی بن کر چمکے گی، اب میں اپنی معصوم آرزوؤں اور امنگوں کے خون سے ہولی کھیلوں گی، آج سے میری سہاگ کی راتیں شروع ہوتی ہیں مگر تم ان میں حصہ دار نہیں ہوگے، میرے تاجر خاوند۔ ٹاٹا۔"

اس طرح میں نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر کئی — افسانے لکھے ان کا موضوع زیادہ تر ایسے واقعات تھے جن سے مجھے اپنی نوکری کے سلسلے میں واسطہ پڑا اور جن کا رخ میں اپنی مرضی کے مطابق نہ بدل سکا۔ ان کہانیوں سے دماغی کوفت تو ضرور کسی قدر کم ہوئی لیکن دل کو اطمینان نصیب نہ ہوا اس کے لئے مجھے اپنے لئے ایک اور شغل نکالنا پڑا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وویکانند کے مطالعہ سے ہی یہ شغل مجھے عطا ہوا، میں نے اردو شاعری (خصوصاً صوفیانہ شاعری) کا برسوں سے ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے تازہ کیا، اور کبھی کبھی اپنی پسند کے اشعار کا آزاد ترجمہ انگریزی زبان میں کرنے لگا۔ اس طرح ایک تو مجھے ان اشعار کے معنی کو سمجھنے میں مدد ملتی اور دوسرے دل و دماغ کو تسکین حاصل ہوتی۔ غالب، اقبال، اصغر، جگر، مجاز، مخمور اور دوسرے شعرا کا کلام خیالاتِ پریشان کی جگہ لے لیتا اور اگر کوئی چیز روح میں جذب ہو جاتی تو انگریزی کا جامہ پہن کر نمودار ہو جاتی، ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا کہ انگریزی سے کوئی اچھی چیز اردو کے قالب میں بھی ڈھل گئی مثلاً ورڈز ورتھ کی مشہور نظم "ٹنٹرن ایبی" کے ایک جزو کا ترجمہ حاضر ہے۔

میری عقل و خرد سو گئی ہے — ورنہ ایسی نہ کچھ بے ہوشی ہے
بند ہے آنکھ، پر دیکھتی ہے — سو گیا جسم، جان جاگتی ہے
رُک گئی ہے مری سانس ایسے — بے خودی میں ہویدا خودی ہے
خون رگوں میں نہیں ہے رواں اب — دل کی دھڑکن میں اک شانتی ہے
کیسی حالت ہے میں کیا کہوں اب — مٹ گئے غم خوشی ہی خوشی ہے
حل ہوئے زندگی کے معمے — زیست معنی سے ایسی بھری ہے
دُور ظلمت ہوئی نور پھیلا — ہر طرف اک نئی روشنی ہے
برکت و رحمتِ حق کی بارش — مجھ گناہ گار پر ہو رہی ہے
بوجھ ہلکا ہوا زندگی کا — ناچتی کھیلتی جا رہی ہے
روح خوشیوں سے لبریز ہو کر — ساری دنیا کا منہ چومتی ہے
آج ہر شے پہ چھائی ہے مستی — اک مسرت میں فطرت لسی ہے
کوہ و دریا میں شاخ و شجر میں — دیکھتا ہوں کہ جان پڑ گئی ہے
ذرے ذرے میں خورشید لرزاں — قطرے قطرے میں دریا روی ہے
انبساط و نشاطِ خودی سے — زیست احساس سے کانپتی ہے

اصلِ توحید ہے یہ نظارہ
اور یہی جانِ رنگِ دوئی ہے

یہ کچھ کم حیرانی کی بات نہ تھی کہ اس طرح کبھی کبھی کچھ شعر موزوں ہونے لگے۔ خیال کیجئے کہ ایک ایسا شخص جسے اردو داں طبقے میں رہ کر اس زبان کے محاورے اور تلفظ سیکھنے کا موقع نہ ملا ہو جو اس لحاظ سے تقریباً ان پڑھ ہو، شعر کہنے لگا اور وہ بھی تعلیم ختم کرنے کے کئی برس بعد۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہر وہ انسان جسے قدرت نے کسی قدر اپنا راز داں بنایا ہو، اپنے لئے ایک فلسفۂ حیات، ایک نظریہ قائم کر لیتا ہے اور اگر حالات موافق ہوں تو یہ فلسفۂ حیات کسی نہ کسی صورت میں مجسم ہو کر ظاہر ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ زندگی میں کئی موقعے ایسے بھی آتے ہیں جب ہمیں اپنے یقین کو

اور بھی مستحکم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ایسے موقعوں پر ایک اندرونی آواز تلقین کرنے کو نکلتی ہے۔ خدا کے لطف و کرم کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ نغمہ بردوش آتی ہے۔ بشرطیکہ ان نغموں کو ذریعۂ عزت نہیں بلکہ حصولِ نشاط کا وسیلہ بنایا جائے، میرے لئے شاعری محض منظوم تخیل کا نام نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ شعر اصل میں ایک غیر مرئی نغمہ ہے جو ہمیشہ روح کی گہرائیوں میں گونجتا رہتا ہے، اس نغمہ کے مانوس سروں کو سننے کی صلاحیت صرف خدا رسیدہ اور خود شناس صوفی ہی میں ہوتی ہے، وہ جب چاہے اسے بہشت گوش کر سکتا ہے لیکن ایسا صوفی عموماً خاموش رہتا ہے یا اس کی زبان کی لحن کی آواز نکلتی ہے اور وہ بھی کبھی کبھی شاعر اگرچہ بیک وقت کچھ ہی سروں کو سن سکتا ہے لیکن یہ اسی کا حصہ ہے کہ وہ ان سروں کو قوس و قزح کی صورت میں مجسم کر دیتا ہے اور وہ لوگ جو براہ راست اس ابدی نغمہ کو سننے سے قاصر ہیں اس کی آوازِ بازگشت سے فیض یاب ہو سکتے ہیں لیکن یہ روحانی نغمگی اس شاعر کو نصیب ہوتی ہے جو رنج و الم میں ڈوب کر بھی نشاط کا تقاضا کرے ظلمات میں گھر کر بھی نور کا متلاشی ہو، گندگی اور سڑن کے ماحول میں بھی رنگ و بو کے خیال سے وابستہ رہے اور بدصورتی اور قباحت کے دائرہ میں بھی مرکزِ حسن سے غافل نہ ہو، جو شیطنت کے طوفان میں یزدانی لَو کو محفوظ رکھے، حیوانیت کے دور میں انسانیت کا علم بردار ہو جھوٹ کے جابرانہ عہد میں سچائی پر جان دے، شور و غل میں نغمۂ ازلی کی لَے کو نہ بھولے، موت سے شکست نہ کھائے اور زندگیِ جاوید کو اپنانے میں کوشاں رہے، ایسا شاعر فکر و عمل کے گنگا جمنی سنگم سے نغموں کی سرسوتی کو نمودار کرتا ہے اور اس پوتر (پاک) تریوینی میں اشنان کر کے زندگی تر و تازہ ہو کر نکلتی ہے۔

تو لیجئے یہ معذرت نامہ ایک مضمون کی صورت اختیار کر ہی گیا اب آپ کو یہ شکایت تو نہیں ہوگی کہ میں نے لکھنے کی کوشش نہیں کی، کچھ کام کی بات کر پایا ہوں کہ نہیں اس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں البتہ اگر آپ اجازت دیں اور زبان اور عروض کی خامیوں کی اصلاح کا ذمہ اپنے سر لیں تو بعض خیالات کو منظوم کر کے بھی پیش کئے دیتا ہوں۔

غرض نہیں مجھے اس سے کہ سروری کیا ہے
میں جانتا ہوں مگر شانِ بندگی کیا ہے

بلندیوں کو جو عرشِ بریں کی چھو نہ سکے
وہ موجِ خاکِ فقیری و عاجزی کیا ہے

خدا ہے جس کے لئے بے قرار وہ سجدہ
جبیں میں جس کی نہ تڑپے وہ آدمی کیا ہے

وصال و ہجر کی جو قید سے نہ ہو آزاد
وہ عشق کیا ہے وہ اندازِ دوستی کیا ہے

خیالِ یار میں اپنے سے جو رہے آگاہ
بھلا وہ عاشقی کیا ہے وہ بیخودی کیا ہے

جو ارتقائے خودی سے خدا تک آ نہ گیا
فرشتہ رہ گیا بن کر جو آدمی کیا ہے

جو بے خودی کو سمو پائے اپنے دامن میں
جو رازِ مرگ نہ پا جائے وہ خودی کیا ہے

جو حسن و عشق کی جزئیات میں رہے محدود
جو اپنا آپ نہ پائے وہ آگہی کیا ہے

جو شورِ زیست کو اپنے میں جذب کر نہ سکے
نہ جس سے نغمے اٹھیں وہ بھی خامشی کیا ہے

نفس نفس میں نہ جس کے بہارِ تازہ ہو
جو رنگ و بو نہ بکھیرے وہ زندگی کیا ہے

جو جگمگا نہ سکے غم کدوں کی ظلمت کو
ستارہ زا بھی اگر ہو تو روشنی کیا ہے

جو آنسوؤں کو نہ شب کے بنا سکے موتی
جو آفتاب نہیں دل کی روشنی کیا ہے
جو صرفِ خدمتِ خلقِ خدا نہ ہو پائے
بسر جو اپنے لئے ہو وہ زندگی کیا ہے
وہ عشق عشق نہیں جس میں غم کا ہو احساس
تری خوشی میں خوشی ہے تو پھر غمی کیا ہے
جو رنگ دیوے تبسّم سے غنچۂ دل کو
مسرتوں سے نہ بھر دے وہ شاعری کیا ہے

یہ ہے "مایۂ خویش" جسے میں نے آپ کے سپرد کر دیا ہے اب مجھے آپ سے فقط اتنی درخواست کرنا ہے کہ اگر آپ اس خط کو یا اس کے کسی جزو کو اپنے میگزین میں جگہ دینے کا فیصلہ کریں تو دھرم سروپ کے نام سے چھپوائیں۔ اس نام سے نہیں جس سے مجھے لوگ سرکاری حلقوں میں جانتے ہیں۔ میرے عہدہ وغیرہ کا حوالہ بھی از راہِ کرم مت دیجئے گا۔ بہرحال اسے واپس کر دیں تو عنایت ہوگی۔

آپ کا

دھرم سروپ

(بقیہ صفحہ ۳۷۶)

کو مطمئن کر دے۔ شمالی ہندوستان کی ترقی کے ساتھ جنوبی ہندوستان کی ترقی بھی ضروری ہے۔ ارسطو نے سیاسی انقلابات کے اسباب کا تجزیہ کرتے وقت اس طرف توجہ دلائی ہے کہ ریاست اور دستور کی پائداری کے لئے ضروری ہے کہ کسی طبقہ یا علاقہ کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس سیاسی دانشمندی کا آج بھی اتنا ہی وزن محسوس ہوتا ہے جتنا خود ارسطو کو محسوس ہوا ہوگا۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے لئے ڈی، ایم، کے، کے مقاصد اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت ایک چیلنج ہے۔ یہ چیلنج وہ کس طرح قبول کرتی ہے اس میں نہرو حکومت کی آزمائش ہے۔

ض، ح، ف،

۱۵ / فروری ۱۹۶۲ء

حالات حاضرہ

عام انتخابات

ہندوستان کے عام انتخابات ختم ہوگئے اور ریاستوں میں وزارت سازی کا کام ہو رہا ہے، اس لئے ابھی جیتی ہوئی سیاسی جماعت یعنی کانگریس کو انتخابات کا تجزیہ کرنے اور نتائج کا جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا ہے۔ اس لحاظ سے دوسری جماعتیں اس پوزیشن میں ہیں کہ وہ نئے انتخابات کی روشنی میں اپنی حیثیت اور موقف کا جائزہ لیں اور اس سے کچھ نتائج نکالیں۔

راجستھان اور مدھیہ پردیش کے علاوہ جہاں کانگریس کو مطلق اکثریت نہیں حاصل ہوئی ہے، باقی اور ریاستوں میں اور لوک سبھا میں کانگرس اکثریت سے کامیاب ہوئی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے عوام کی اکثریت کانگریس کی پالیسی اور پروگرام سے اتفاق کرتی ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ گذشتہ انتخابات کے مقابلہ میں کانگرس کو مجموعی طور پر کم نشستیں ملی ہیں اور اس میں برسر اقتدار پارٹی کے لئے ایک انتباہ ہے، جن سنگھ اور سوتنترا پارٹی کو جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کے پیش نظر بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ووٹ دینے والوں کی ایک غیر متوقع تعداد کا جھکاؤ دائیں بازو کی طرف ہے یعنی سوشلزم اور ترقی پسندی کے منافی ہے۔

جمہوری ریاستوں میں جب انتخابات ہوتے ہیں تو مختلف النوع عناصر اور اثرات کام کرتے ہیں اور ہندوستان ایسی نوزائیدہ جمہوری ملکتوں میں جو مختلف حیثیتوں سے پسماندہ ہیں اور جہاں جمہوری اور دستوری ادارے ابھی نشوونما کی ابتدائی منزلوں میں ہیں، یہ عناصر اور اثرات پیچ در پیچ ہوتے ہیں، پھر بھی حالات کی مجموعی کیفیت امید افزا رہی ہے، یہ ضرور ہے کہ گذشتہ انتخابات کے مقابلہ میں اس بار نشد دکا کیف وکم کچھ زیادہ رہا ہے اور فرقہ پرستی، ذات پات کا تصور اور جاگیردارانہ ذہنیت اور قدامت پسندی نے بھی رائے دینے والوں کو متاثر کیا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت

ہے کہ ایسے حلقوں کی تعداد اچھی خاصی رہی ہے جہاں اصولوں کے لئے انتخابی جنگ لڑی گئی ہے اور ایسے حلقوں میں کانگریس نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے، اس کی روشن اور واضح مثالیں شہر بمبئی کا شمالی حلقہ، امروہہ، بلرام پور اور نئی دہلی کے حلقے تھے، یہ مثالیں ایسی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی جمہوریت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے اور رفتہ رفتہ یہاں کے ووٹ دینے والے پختگی اور رسیدگی کی منزل کی طرف آگے بڑھ رہے ہیں۔

اس بار انتخابات کے موقع پر یہ خیال عام تھا کہ ہندوستان اور چین کے تعلقات میں کشیدگی کے سبب کمیونسٹ پارٹی کی بھاری شکست ہوگی، لیکن نتائج سے ثابت ہوا کہ یہ خیال صحیح نہیں تھا، البتہ مغربی بنگال میں کمیونسٹوں کی امیدوں کے مطابق نتیجہ نہیں نکلا، انتخابات کا ایک غیر متوقع نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ مخالف پارٹیوں کے بڑے بڑے ستون گر گئے، پرجا سوشلسٹ پارٹی جن سنگھ، ہندو مہا سبھا، سوتنترا پارٹی، کمیونسٹ پارٹی کے باحیثیت نیتا کیوں ناکام رہے، یہ وہ معمہ ہے جسے شاید ووٹ دینے والے بھی نہیں سمجھ سکتے، دوسری دلچسپ اور اہم بات یہ ہوئی کہ ریاستوں میں وزیروں کی اچھی خاصی تعداد ووٹ دینے والوں کے معیار پر پوری نہیں اتر سکی، اس کی ایک وجہ تو غالباً ریاستی حکومتوں کی بعض انتظامی خامیاں تھیں لیکن دوسری وجہ جو کانگریس کی تنظیم سے متعلق ہے اور دور رس نتائج کی طرف اشارہ کرتی ہے، کانگریسیوں کا اپنا اندرونی اختلاف ہے جو شخصی مناقشات پر مبنی ہے، ایسی مثالیں کافی ہیں کہ کانگریسیوں نے کانگریسیوں کی مخالفت کی اور دوسری جماعتوں کے امیدواروں کو کامیاب ہونے میں مدد دی، یہ صورت حال بڑی افسوسناک ہے کیونکہ اس وقت کانگریس ہی ایسی سیاسی تنظیم ہے جو ملک میں یکجہتی اور اتحاد قائم رکھ سکتی ہے، قوم نے اسے اقتدار بخش کر کانگریسیوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنی تنظیم مضبوط کریں، اپنی پارٹی کے پروگرام سے متعلق اپنے ایمان کی تجدید کریں اور اسے عملی شکل دینے کے لئے اجتماعی کوشش کریں۔

انتخابات اور مسلمان

اس مرتبہ لوگوں کی نظر اس بات پر بھی تھی کہ مسلمانوں کا کیا رویہ ہوتا ہے، اس لئے کہ مدھیہ پردیش

کے فسادات اور رانچی، علی گڑھ اور یوپی کے مغربی اضلاع کے فرقہ وارانہ ہنگاموں اور کشیدگی کے دوران فرقہ پرستی اس طرح عریاں ہوکر سامنے آگئی تھی کہ مسلمان بہت بد دل ہو گئے تھے، اور ریاستی حکومتوں سے اُن کی شکائتیں بڑھ گئی تھیں، فرقہ پرستی کے اس طوفان میں جمعیتہ العلمائے ہند ایسی قوم پرست جماعت بھی غیر مسلموں اور بعض ذمہ دار حضرات کے نزدیک مشتبہ ہوگئی تھی اور اس کے قومی کردار پر بھی حرف گیری شروع ہوگئی تھی، صورت حال ایسی تھی کہ جمعیتہ کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو اُن کے بعض رفقاء نے مشورہ دیا کہ لوک سبھا کے بجائے راجیہ سبھا میں آنے کی کوشش کریں، مولانا نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا؛ اسے فرقہ پرستی کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے تعبیر کیا اور عقبی دروازے سے پارلیمنٹ میں آنے کی تجویز رد کردی، ان حالات میں یہ بجا تھا کہ مسلمان ووٹروں کا رویہ زیر نظر رہے۔

اس بار ایک خاص بات تو یہ تھی کہ ۱۹۵۷ء کے مقابلہ میں کانگریس نے مسلمانوں کو کسی قدر کم ٹکٹ دئے، دوسری بات یہ تھی کہ مسلمان آزاد امیدواروں کی تعداد زیادہ تھی، بعض مسلمان ریپبلکن پارٹی کے پلیٹ فارم سے امیدوار کی حیثیت سے سامنے آئے اور دو چار کامیاب بھی ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ کانگریس امیدواروں کے مقابلے میں جن سنگھ اور دوسری جماعتوں کی تائید اور مدد سے بعض مسلمان الیکشن لڑے اور مسلم ووٹ تقسیم ہوئے؛ بعض حلقوں میں مسلمانوں نے بھی فرقہ پرستی کا مظاہرہ کیا اور طے کیا کہ وہ مسلمان امیدوار ہی کو ووٹ دیں گے۔ خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو، غرض اس طرح کی خبریں موصول ہوئی ہیں، نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کہاں تک صحیح ہیں، لیکن اگر گزشتہ سال کے فسادات کا کچھ اثر مسلمانوں پر پڑا ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں، سوال یہ ہے کہ کانگریس کو اس بات کا کہاں تک احساس ہے اور خود کانگریس کے اندر کتنے کھدر پوش ایسے ہیں جو تہذیب، ترقی اور صحت مند قومیت کے دشمن ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کو بھی یہ سوچنا ہے کہ اُن کا منفی طریقہ کار خود ان کے لئے کہاں تک مفید ہو سکتا ہے، فرقہ پرستی کے ردعمل کے طور پر اگر اُن میں بھی فرقہ پرستی پیدا ہوئی تو اس میں خود ان کا اور سارے ملک کا نقصان ہے۔ ہندوستان کے آزاد شہری کی حیثیت سے انھیں اس کا اختیار ہے کہ وہ جس

پارٹی میں چاہیں شریک ہوں اور جس امیدوار کو چاہیں ووٹ دیں، ہمارا مشورہ صرف یہ ہے کہ وہ تنگ نظر، رجعت پرست اور تعمیری پروگرام سے عاری کسی سیاسی جماعت کا ساتھ نہ دیں۔ خوب و زشت میں تمیز کریں اور ملک کے صحت مند اور ترقی پسند عناصر کے ساتھ قدم ملاکر چلیں۔

اب انتخابات کے بعد

اسٹیٹسمین کے نمائندہ خصوصی کی رپورٹ ہے کہ ۱۱ر مارچ کو وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے دہلی میں کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ پانچ سال کا زمانہ ہندوستان کے لئے فیصلہ کن ہوگا اور اس مدت میں ہندوستان کے "مقدرات" کا فیصلہ ہوگا۔ رپورٹ میں اس کی تفصیل نہیں ہے کہ ان کے اس اہم بیان کا کیا سیاق و سباق تھا، بہر حال رپورٹ کا بغور مطالعہ کرنے سے چند باتیں ذہن میں ابھرتی ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

۱۔ انتخابات کے نتائج۔

۲۔ کانگریس کے اندرونی اختلافات۔

۳۔ ہندوستان اور چین کا سرحدوں سے متعلق تنازعہ۔

۴۔ پاکستان سے تعلقات

۵۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی اور پنج سالہ منصوبہ۔

۶۔ قومی یک جہتی کا منصوبہ۔

یہاں ہم بین الاقوامی معاملات سے جن سے چین اور پاکستان کا معاملہ بھی وابستہ ہے تفصیلی بحث نہیں کریں گے کیونکہ ان کے بارے میں کسی قسم کی قیاس آرائی قبل از وقت ہوگی۔ لیکن جہاں تک کانگریس کے اندرونی اختلافات، قومی یکجہتی کی ضرورت اور پنج سالہ منصوبہ اور اس طرح کے دوسرے اہم امور کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک و قوم کا مستقبل بڑی حد تک ان ہی سے متعلق ہے۔

کانگریس کے اندرونی اختلافات کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ اختلافات ایک طرف

تو ذاتی مناقشات پر مبنی ہیں تو دوسری طرف ایک خاص لیکن اہم حلقہ میں نظری حیثیت بھی رکھتے ہیں ان ہی اسباب کی بنا پر کانگریس کا تنظیمی ڈھانچہ کمزور ہوتا رہا ہے اور نظم ونسق اور بنیادی پالیسی کو عمل میں لانے کا منصوبہ اُس جوش اور شوق، محنت اور جدوجہد سے محروم رہا ہے جس کا کہ وہ مستحق تھا اور اس سلسلہ میں ریاستی حکومتوں پر زیادہ ذمہ داری آتی ہے، لیکن مرکزی وزرا اور کانگریس کے ہائی کمان کا اندرونی نظری اختلاف بھی کچھ کم ذمہ دار نہیں ہے غالباً اب وہ موقع آگیا ہے کہ سوشلزم کے خلاف جو عناصر ہیں انھیں پنڈت نہرو یہ جتادیں کہ کانگریس میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، پنڈت جی کو اپنی پارٹی کے اندر یہ نظری جنگ تیز کرنی ہوگی، یہ کام اگر پنڈت جی نے ہمت اور حوصلہ کے ساتھ شروع کردیا تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کی اکثریت پنڈت جی کے ساتھ ہوگی، یہ بہت بڑا اور اہم کام ہوگا اور اس لحاظ سے آئندہ پانچ سال کا زمانہ ملک کی تاریخ میں فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہوگا۔ اگر کانگریس کی جیت پارلیمانی طرز جمہوریت اور سوشلزم کی جیت ہے تو پنڈت نہرو کو اس کام کا بیڑا اٹھانا چاہیئے، یہ کام وہی کرسکتے ہیں۔

الغرض، کانگریس آئندہ پانچ سال کی مدت میں اگر اپنی تنظیمی کمزوریوں کو دور نہیں کرتی اگر وہ اپنا تنظیمی ڈھانچہ منفی طریقۂ کار سے یعنی وزارتیں اور عہدے تقسیم کرکے باقی رکھتی ہے اور فکر وعمل کی دنیا میں یکجہتی اور اتحاد سے محروم رہتی ہے تو ملک کو ایک سخت آزمائش کا سامنا ہوسکتا ہے۔ پنج سالہ منصوبے کی کامیابی اور ملک کی تعمیر وترقی کا انحصار جہاں ایک طرف اس بات پر ہے وہاں اس بات پر بھی ہے کہ آئندہ بین الاقوامی صورت حال کیا ہوتی ہے کیونکہ اسلحہ بندی کی اگر کوئی صورت نہ نکلی تو ہر وقت کسی نہ کسی "آتش فشاں" کا خطرہ رہے گا۔ اور اس حالت میں بیرونی امداد کا معاملہ نشیب وفراز کی غیر یقینی کیفیت سے وابستہ ہوجائے گا۔ چین اور پاکستان سے تعلقات کی نوعیت کا بھی ملک کے تعمیر وترقی کے پروگرام پر اثر پڑے گا۔

قومی یک جہتی اور ہم آہنگی

قومی اتحاد اور یک جہتی کا مسئلہ بھی کم اہم نہیں ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ

انتخابات سے کچھ عرصے پہلے ملک کے صائب الرائے اشخاص کی، جن کا تعلق تقریباً ہر سیاسی جماعت سے تھا، ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی اور ملک میں انتشار و اختلافات کے رجحانات نے جو صورت حال پیدا کر دی ہے اس کی نزاکت اور قومی یکجہتی کی اہمیت کو شدت سے محسوس کیا گیا تھا، کچھ طریقہ ہائے کار بھی تجویز کئے گئے تھے، سیاسی جماعتوں سے یہ توقع کی گئی تھی کہ وہ انتخابات کے مواقع پر ایسے نعرے نہیں لگائیں گی اور ایسے ذرائع اختیار نہیں کریں گی جن سے قومی یکجہتی اور جذبۂ باہمی ہم آہنگی کا تصور مجروح ہو اور انتشار و خلفشار کی طرف لے جانے والے عناصر اور رجحانات کو تقویت ملے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انتخابات میں شائع ہونے والے پوسٹروں اور اشتہاروں اور لگائے جانے والے نعروں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیاسی جماعتوں نے وہ توقعات پوری نہیں کیں، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس خاص معاملہ میں آج بھی ہم وہیں ہیں جہاں قومی یکجہتی کی کانفرنس سے پہلے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اس معاملہ کی اہمیت اور صورت حال کی نزاکت کا احساس شدید ہو گیا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ اس بات سے تو کوئی اختلاف نہیں کرتا کہ اتحاد کی ضرورت ہے لیکن قومی اتحاد کا مفہوم زیادہ تر لوگوں کے ذہن میں صاف نہیں ہے اور ہر شخص اپنے تعصبات ذہنی کے ساتھ اپنا الگ مفہوم رکھتا ہے، اس الجھن سے وہ صائب الرائے اشخاص بھی محفوظ نہیں ہیں جو مذکورہ کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ اس لئے سب سے اہم اور اشد ضرورت یہ ہے کہ قومی اتحاد اور ہم آہنگی کے سلسلہ میں ملک کے فعال عناصر میں نظری اتحاد ہو اور پھر خاصے وسائل، تعلیمی و تہذیبی پروگراموں اور انتظامی کمال و خوبی کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے میں اسے ایک تحریک بنا دی جائے، بغیر ان تحریکات کے قومی آہنگی کی نیک خواہش شرمندۂ عمل نہ ہو گی۔

ڈی، ایم، کے،

ہندوستان میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہوگی جنھیں مدراس میں ڈی، ایم، کے، (دراوڑ مونیترا کازگم) کی غیر متوقع کامیابی پر حیرت ہوگی، اخباری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پارٹی کے دو خاص مقاصد ہیں:

۱۔ ڈریویڈین ریاستوں کی آزادی اور اُن کا وفاق۔
۲۔ ایک ایسے سوشلسٹ سماج کا قیام جہاں طبقات اور ذات پات کا کوئی تصوّر نہ ہو۔
فی الحال آندھرا، کیرالا اور میسور میں اس جماعت کو کوئی تائید حاصل نہیں ہی لیکن اس کا پروگرام ہندوستان کی یک جہتی اور اتحاد کے لئے بہت خطرناک ہی، کہا جاتا ہی کہ جہاں تک معاشرتی اصلاحات کا تعلق ہی، ہندوستان میں اس سے زیادہ ترقی پسند جماعت کوئی اور نہیں ہے، لیکن شاید اس میں مبالغہ ہے اس لئے کہ کمیونسٹ آئیڈیالوجی بھی اسی طرح کا سماج چاہتی ہے اور کانگریس بھی نظری حد تک ذات پات کے فرق کو ختم کرنا چاہتی ہے البتہ طبقات کو ختم کر دینے سے متعلق اس وقت اس کا ذہن صاف نہیں ہے، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ کانگرس کا سوشلسٹ سماج غیر طبقاتی نہیں ہوگا۔ سوال یہ ہی کہ مدراس میں ڈی، ایم، کے، مقبول ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتیں کہی جاتی ہیں:

۱۔ اس جماعت کا یہ خیال ہے کہ شمالی ہندوستان اپنی صنعتی پیداواروں کے لئے جنوب کو اپنا بازار بنانا چاہتا ہے اور آج کے ہندوستان میں یہ ممکن نہیں ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ساتھ انصاف ہو سکے۔
۲۔ ہندی زبان ہندوستان کی سرکاری زبان ہے، یہ بات اس کے لئے مایوس کن ہی، اس کو وہ ہندی زبان کے سامراج سے تعبیر کرتی ہی اور کام راج حکومت کو اس سامراج کا ایجنٹ تصور کرتی ہے۔
۳۔ ڈی، ایم، کے، کے تقریباً تمام رہنما تامل اور انگریزی زبان کے بہترین مقرر ہیں۔

مذکورہ بالا باتوں سے علاقائی اور لسانی عصبیت کی بو آتی ہی، ہو سکتا ہی کہ اس عصبیت کی بنیاد ایسے تلخ حقائق پر ہو جنھیں شمالی ہندوستان کے لوگ سننا پسند نہ کریں، لیکن اگر یہ حقائق ہیں تو شمالی ہندوستان کو اپنا رویہ بدلنا ہوگا ورنہ ملک کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی، شمال اور جنوب کے تعلقات کی ایک مستقل تاریخ ہے جو ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی ہے، اُس تاریخ کو معروضی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی اور پھر کوئی ایسا معقول طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہی جو جنوبی ہندوستان

(باقی صفحہ ۳۶۹ پر ملاحظہ ہو)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

اقبال کے آخری دو سال

از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۶۷۹ صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ۔ مجلد قیمت نو روپے
تاریخ طباعت، اپریل ۱۹۶۱ء۔

اس کتاب میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی عمر کے آخری دو برسوں میں یعنی یکم مئی ۳۶ء سے لے کر اپنے یوم وفات یعنی ۲۱ اپریل ۳۸ء تک مسلم لیگ اور قائد اعظم کی مدد اور حمایت میں پوری گرمجوشی اور جرات کے ساتھ کام کیا۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں جلیاں والا باغ کے حادثۂ خونین (۱۹۱۹ء) سے ۱۹۳۵ء تک سیاسی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے میں علامہ مرحوم کے ان سیاسی کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جن سے مسلم لیگ کے مقاصد کو تقویت پہنچی۔ فاضل مصنف کے بیان کے مطابق ۲۸ء کے اواخر میں علامہ اقبال مسٹر جناح سے سخت بیزار تھے۔ اس وقت انھوں نے فرمایا تھا کہ "مسلمانوں کی سیاست میں مسٹر جناح نے جو الجھن پیدا کر دی ہے جب تک وہ اس پر ندامت کا اظہار کر کے آئندہ اس سے کلیتہً مجتنب رہنے کا وعدہ نہ کریں گے مصالحت نہیں ہو سکتی"۔ (صفحہ ۳۰۹) مگر مئی ۳۶ء میں جب مسٹر جناح ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر جاکر ان سے ملے ... تو ڈاکٹر صاحب نے امداد و اعانت کا وعدہ کر لیا"۔ غرض، اس کتاب کے مطابق، اس دن سے آخر عمر تک علامہ اقبال پوری سرگرمی سے مسلم لیگ کا کام کرتے رہے۔

اقبال اور حیدر آباد

از نظر حیدر آبادی

سائز ۱۸×۲۲/۸ حجم ۲۳۲ صفحات کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ مجلد قیمت پانچ روپے تاریخ طباعت اپریل ۱۹۶۱ء۔

اس کتاب میں علامہ اقبال کے حیدر آباد سے غیر معمولی تعلقات کو دکھلایا گیا ہے کہ کس طرح وہاں کے عوام اور خواص نے ان کی، مختلف مواقع پر، پذیرائی کی اور وہاں کے شاعروں اور نثر نگاروں نے کس خلوص اور عقیدت کے ساتھ خراج تحسین پیش کیا، نیز خود شاعر مشرق کی کتنی شدید خواہش اور آرزو تھی کہ وہ حیدرآباد میں مستقل قیام کرتے مگر؛ مصنف نے لکھا ہے کہ" باخبر اور ہوشمند انگریز جس کے ذرائع معلومات بہت وسیع اور پوشیدہ تھے اور جس نے حیدر آباد میں وقار الملک، محسن الملک، ظفر علی خاں، عبدالحلیم شرر اور آخر میں علی امام کو ٹکنے" نہ دیا تھا، وہ حیدر آباد میں اقبال جیسے" خطرہ" کو پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضور نظام سے لے کر ایک عام حیدر آبادی کی خواہش اور تمنا کے باوجود اقبال حیدر آباد میں مستقل قیام نہ کر سکے۔"

اسرار و رموز پر ایک نظر
از پروفیسر محمد عثمان

سائز ۲۲×۱۸ حجم ۸۹ صفحات۔ کاغذ اور کتابت وطباعت عمدہ۔ قیمت مجلد ساڑھے چار روپے

اس کتاب میں شاعر مشرق کی دو مشہور مثنویوں اسرار خودی اور رموز بیخودی پر بسط و تفصیل سے بحث و گفتگو کی گئی ہے اور علامہ اقبال نے ان دونوں مثنویوں میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے متعلق جو فلسفہ بیان کیا ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ" ان عظیم مثنویوں کے مطالعے سے اقبال کے فکر و فن کی خوبیوں کا جو اندازہ مجھے ہوا ہے، اس کو ملک کے عام تعلیم یافتہ طبقے اور بالخصوص کالجوں کے طلبہ و طالبات تک پہنچاؤں اور انھیں اس لطف و فیض میں شریک کروں جو ان منظوم شاہکاروں کی بدولت مجھے حاصل ہوا۔"

INTRODUCTION TO THE THOUGHT OF IQBAL
مترجم: ملا عبدالمجید ڈار

لوس کلاڈ میٹر کی فرانسیسی کتاب کا یہ انگریزی ترجمہ ہے۔ ۵۳ صفحے کی اس مختصر کتاب میں علامہ اقبال کے حالات زندگی اور ان کے کارنامے، ان کے فلسفہ خودی اور ان کے انسان کامل پر روشنی ڈالی گئی ہے اور صالح معاشرے اور مشرق و مغرب کے بارے میں اقبال کے خیالات اختصار کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

اوپر کی تینوں کتابیں اقبال اکیڈمی، کراچی (پاکستان) نے شائع کی ہیں، اور اسی سے خریدی جا سکتی ہیں۔

حدیثِ اقبال   از طیب عثمانی ندوی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۶۰ صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ قیمت مجلد تین روپے تاریخ طباعت ۱۹۶۱ء
ملنے کا پتہ: دارالکتاب، نیا گدام۔ گیا (بہار)

یہ کتاب دراصل متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں سے بیشتر مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں اور چند نئے ہیں۔ ان مضامین میں شاعرِ مشرق کے افکار و خیالات کا تعلیماتِ اسلامی کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے اور خود مصنف کے الفاظ میں اس کتاب کا مدعا یہ ہے کہ اقبال جو کچھ اور جیسا کچھ بھی تھا اس کی صحیح تصویر کلامِ اقبال کے آئینہ میں سامنے آجائے۔"

اقبال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور برابر لکھا جا رہا ہے، لیکن زیرِ تبصرہ کتاب کے مصنف کا خیال ہے کہ "روحِ اقبال" "اقبالِ کامل" اور ان جیسی ایک آدھ کتاب کے علاوہ باقی اکثر ادبیاتِ اقبال "مصور کے موئے قلم کی خیالی تصویر ہیں، حقیقت کم، پرچھائیں زیادہ۔" لیکن یہ ایک ایسا "الزام" ہے جو اقبال کے ہر مضمون نگار اور تنقید نگار پر چسپاں کیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ زیرِ تبصرہ کتاب بھی غالباً اس سے نہ بچ سکے گی۔

بیان اللسان یعنی عربی اردو ڈکشنری   تالیف: مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۸۶۲ صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد دس روپے غیر مجلد نو روپے۔
طبع ششم ۱۹۶۱ء۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ علمیہ۔ قاضی واڑہ۔ میرٹھ (یو۔پی)

عربی سے اردو میں لغت بہت کم ہیں اور جب زیرِ تبصرہ لغت مرتب کیا گیا تھا، تو اس وقت شاید کوئی بھی نہیں تھا، اس لئے فاضل مرتب کی یہ کوشش قابلِ داد ہے۔ ترتیب دیتے وقت جناب قاضی صاحب کے پیشِ نظر جہاں یہ تھا کہ عربی ادب کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے یہ لغت زیادہ سے زیادہ مفید ہو، وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس کی قیمت اتنی ہو کہ غریب طلبہ بھی خرید سکیں۔ اس لئے ضخامت کو مختصر رکھنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔

شکستِ شب   از محسن بھوپالی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۱۲ صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت عمدہ مجلد مع رنگین گرد پوش قیمت دو روپے۔

ناشر: فن کدہ "مامن" ٹھنڈی سڑک۔ حیدر آباد (پاکستان)

محسن بھوپالی ایک نوجوان اور آزادیٔ وطن کے دور کے شاعر ہیں، ان کی شاعری داخلی احساسات و تاثرات سے زیادہ خارجی اثرات اور تقاضوں کی رہین منت ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انھیں پاکستان میں کن حالات سے دوچار ہونا پڑا، مگر ان کے اس مختصر مجموعۂ کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وہاں کے سیاسی حالات اور اپنے ہم وطنوں کی بے مہری و بیوفائی کے بہت شاکی ہیں۔ مثلاً اس مجموعے کا آغاز اس قطعہ سے ہوتا ہے:

تلقین اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج، راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

ایک نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

ظلم آزاد ہے اور جبر پہ تعزیر نہیں
بہرا یاں جو اٹھے کوئی بھی شمشیر نہیں
ہیں تم خوردہ بہت عدل کی زنجیر نہیں
قصرِ انصاف تو ہے کوئی جہانگیر نہیں
پھر بھی کہتے ہو کہ لگی دل کی بجھاؤ تو سہی
نغمۂ حسنِ جہاں تاب سناؤ تو سہی

باغباں کی نگہِ لطف و کرم بدلی ہے
غنچۂ و گل کو تبسم کی سزا ملتی ہے
رہزنی بھیس میں رہبر کے پھرا کرتی ہے
دیکھتے ہو کہ قضا سر پہ کھڑی ہنستی ہے
زندگی نوحہ بلب گریہ کناں پھرتی ہے
اپنے پہلو میں لئے سوزِ نہاں پھرتی ہے

زمانے کی شکایت کے چند شعر پیشِ خدمت ہیں:

اب شناسا بھی ملا کرتے ہیں غیروں کی طرح یہ صلہ ہم کو ملا آپ کے ہو جانے سے

ذیل کے اشعار میں بیشتر مہاجروں کے احساسات و تاثرات کی ترجمانی کی گئی ہے:

بچ کے گرداب سے ڈوبے ہیں قریبِ ساحل کس قدر خام تھا اندازۂ طوفاں اپنا
کس سے کہیئے کہ بہاروں نے ہمیں زخم دیئے کون مانے گا نہ تھا اپنا گلستاں اپنا

شاداب گلستاں کے بھی سائے ہیں گریزاں اک جرم ہوئی میری غریب الوطنی بھی

کوائف جامعہ

ایک تاریخی اور علمی مقالہ

شعبۂ دینیات کے ناظم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی دعوت پر جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ تشریف لائے اور حسب ذیل عنوان پر ایک پرمغز مقالہ پڑھ کر سنایا:

"سلاطین ہند اور علما و مشائخ میں کشمکش اور اس کا اثر تاریخ ہند پر"

جلسے میں شیخ الجامعہ، اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا احمد میاں، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، قاضی سجاد حسین، حکیم عبدالحمید (متولی ہمدرد وقف) اور دیگر معززین شہر نے شرکت کی۔

مقالہ اتنا دلچسپ، طرز تحریر اتنا دلکش اور مباحث اس قدر اہم تھے کہ طویل ہونے کے باوجود حاضرین جلسے نے بڑی توجہ اور شوق سے آخر تک سنا۔ مقالے کے بعد متعدد سوالات کئے گئے اور یہ سلسلہ بھی بڑی دیر تک قائم رہا۔ آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے مقالہ نگار کا شکریہ ادا کیا۔ موصوف نے فرمایا کہ یہ مقالہ بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ سوالات جس کثرت سے کئے گئے، اور بحث و گفتگو میں جس ذوق و شوق سے شرکت کی گئی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مقالے کے مباحث دلچسپ اور اہم تھے۔" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "تاریخ قوموں کا حافظہ ہے۔ حافظہ قوی ہو یا ضعیف ہر حالت میں کام کرتا ہے، لیکن اگر خلاق یا مصلحت اندیش ہو تو اس سے بہت سی مضرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ تاریخ پر اگر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے حافظے نے مصلحت اندیشی سے بھی کام لیا ہے، ایسی صورت میں یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوٹا ہے۔ ہمارے مورخین گذشتہ نسلوں کے کمالات کو نمایاں کر کے دکھلاتے ہیں اور ان کی کوتاہیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ اگر مریض کی ہسٹری طبیب کو بے کم و کاست نہ بتائی جائے

توطبیب علاج نہیں کرسکتا۔ ہماری قوم اخلاقی لحاظ سے مریض ہے اور ہماری عقل اور ضمیر طبیب، سچا مورخ وہی ہے جو طبیب کو مریض کا اگلا پچھلا حال سچ سچ بتا دے۔ خوشی کی بات ہے کہ مقالہ نگار نے مصلحت پرستی سے کام نہیں لیا، بلکہ حق گوئی کا حق ادا کیا ہے۔"

اس مقالے کے دو حصے ہیں، ایک علمائے اسلام سے تعلق رکھتا ہے، دوسرا صوفیائے کرام سے۔ پہلا حصہ معارف میں قسط وار شائع ہوگا اور دوسرے حصے کے اہم مباحث رسالہ جامعہ کی اگلی اشاعت میں شائع ہوں گے۔

اُردو زبان کے آغاز و ارتقاء پر ایک تقریر

پچھلی اشاعت میں ہم اطلاع دے چکے ہیں کہ طلبائے اساتذوں کے مدرسہ کی لٹریری سوسائٹی کے ماتحت ہندوستان کی اہم زبانوں کے ادب پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اردو ادب پر دو تقریروں کا خلاصہ اس سے قبل شائع ہو چکا ہے۔ تیسری تقریر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ریڈر شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی کی تھی، جس کا عنوان تھا "اُردو زبان کا آغاز اور ارتقاء"۔ موصوف کی طویل تقریر کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

"یہ بات بڑی مسرت افزا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ہندی اور اُردو کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں پر بھی تقریروں کا آغاز کیا ہے۔ اس سے جذباتی ہم آہنگی اور قومی یک جہتی کے کام میں مدد ملے گی۔ یوں بھی ملکی اور قومی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کے دوسرے تعلیمی اداروں سے آگے ہے لیکن اس کام میں پہل کرنے کا شرف یقیناً اسے حاصل ہے۔ اس کا ایک فوری خوشگوار اثر یہ ہوا ہے کہ دہلی یونیورسٹی نے بھی جدید ہندوستانی زبانوں پر توسیعی لکچرز کا پروگرام بنایا ہے جو مارچ کے پہلے ہفتے سے شروع کیا جا رہا ہے۔

اردو زبان کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے نارنگ صاحب نے فرمایا اُردو میں ابھی لسانیات کا علم بہت محدود ہے۔ اُردو کی پیدائش سے متعلق سنجیدہ اظہار خیال کا سلسلہ محمد حسین آزاد کی آب حیات سے شروع ہوا تھا، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔ تقریباً نصف صدی تک اس نظریے کی دھوم رہی۔ اس کی تردید بیسویں صدی کی تیسری دہائی

پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھ کر کی اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ اردو زبان پنجابی سے نکلی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس کے دو برس بعد "ہندوستانی لسانیات" میں بھی بڑی حد تک اسی نظریے کی تائید کی۔ اس وقت سے پروفیسر جولیس بلاک، ڈاکٹر مسعود حسین خاں وغیرہ، احتشام حسین اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اس موضوع پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ جولیس بلاک نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہریانی کی اہمیت پر زور دیا تھا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ہریانی اور کھڑی کو اردو کا ماخذ قرار دیا ہے۔ ان اسی برسوں میں اس موضوع پر جو کام ہوا ہے اس سے کچھ گتھیاں تو ضرور سلجھ گئیں ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اردو کی پیدائش کا مسئلہ ابھی پورے طور پر حل نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے محققین اپنے نظریوں کا شکار ہو کے رہ گئے ہیں اور اس پیچیدہ مسئلے پر معروضی نظر نہیں ڈال سکے۔ اگر اردو کے آغاز پر اس کے تاریخی اور سماجی پس منظر کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو صحیح نتائج اخذ کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی۔

موصوف نے کہا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا پہلا باقاعدہ سابقہ گیارہویں صدی عیسوی میں پنجاب میں ہوا اور یہ تقریباً ڈیڑھ صدی تک جاری رہا۔ ہندوستان کی لسانیاتی تاریخ میں یہ زمانہ اپ بھرنشوں کا ہے۔ ڈیڑھ صدی کے طویل عرصے میں مقامی اپ بھرنش پر نووارد زبان کے اثر سے یقیناً نئی ملی جلی زبان بننا شروع ہوگئی ہوگی جس میں محمد عوفی کی روایت کے مطابق لاہور کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان نے بھی اشعار کہے لیکن سرزمین پنجاب میں اختلاط کا یہ عمل زیادہ دیر جاری نہ رہا اور بارہویں صدی کے ربع آخر میں محمد غوری کے حملوں کے بعد پایۂ تخت دہلی قرار پایا۔ اس طرح وہ نا پختہ زبان جو پنجابیت کا اثر لئے ہوئے تھی، دہلی کی بولیوں سے متاثر ہونا شروع ہوئی، لیکن ابھی سو، سوا سو سال ہی گزرے تھے کہ محمد تغلق نے دہلی کی آبادی کو دولت آباد پہنچنے کا حکم دیا۔ اس طرح وہ نئی زبان دہلی کے باشندوں کے ساتھ دکن پہنچی جہاں اس کا ادبی ارتقا شروع ہوا۔ امیر خسرو کا انتقال اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ ان کے وہ "ہندوی" اشعار جو ہم تک پہنچے ہیں، اپنی موجودہ شکل میں مشتبہ سہی لیکن امیر خسرو کے اپنے بیان کے مطابق انھوں نے اس ملی جلی نئی زبان میں کلام کہا تھا۔ بعض محققین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نئی زبان دکن کے زمانۂ قیام

میں نہیں بلکہ دہلی کے زمانے میں پیدا ہوئی ۔ وہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ پنجاب میں اختلاط اشتراک کا عمل ڈیڑھ سو برس جاری رہا جبکہ دہلی میں محمد غوری کے بعد سے امیر خسرو تک تہذیبی سابقے کا زمانہ مشکل سے سوا سو سال کا ہے۔ اگر نئی زبان کی تشکیل کا عمل ڈیڑھ سو برس میں شروع نہیں ہوا تو سوا سو برس میں بھی نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملی جلی زبان کی داغ بیل سرزمین پنجاب میں گیارہویں صدی ہی میں پڑ گئی تھی اور دہلی آنے کے بعد چودھویں صدی کے آغاز میں وہ بول چال کی اس سطح تک پہنچ گئی کہ صوفیا کے علاوہ دوسرے مصنفین بھی اسے منہ لگانے لگے۔ دکن میں بہمنی، قطب شاہی اور عادل شاہیوں کے زمانے میں اس کا ادبی سفر جاری رہا، جبکہ شمالی ہندوستان میں فارسی چھائی ہوئی تھی اور اس کے مقابلے میں سر اٹھانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ نوزائیدہ زبان صوفیا اور بھگتوں کے سہارے عوامی زبان کی حیثیت سے آگے بڑھتی رہی۔ اکبر کے زمانے میں پایۂ تخت آگرہ قرار پایا تو تو اس زبان نے جو اب تک پنجاب میں قدیم پنجابی اور لہندا اور دہلی میں ہریانی اور کھڑی کے اثرات قبول کر چکی تھی، آگرہ جا کر برج بھاشا سے بھی متاثر ہونے لگی ۔ برج اس زمانے میں کرشن بھگتی تحریک کی وجہ سے خاصی مقبول تھی اور اسے ادبی وقار بھی حاصل تھا۔ لیکن شاہجہاں نے جب دوبارہ دہلی کو بسایا تو ایک بار پھر اس زبان کا ارتقا دہلی کی بولیوں کے اثر میں شروع ہوا۔ اب کی کھڑی بولی سب پر غالب آئی اور وہ زبان جس نے اٹھارہویں صدی کے آغاز میں "اردوئے معلیٰ" کا خطاب حاصل کیا اسی کھڑی بولی کی بنیادوں پر قائم ہے۔ غرض اردو زبان کا یہ ارتقائی سفر سات صدیوں تک جاری رہا۔ اردو پنجابی سے نکلی ہے نہ ہریانی سے، وہ نہ برج سے ماخوذ ہے اور نہ صرف کھڑی سے، بلکہ اس نے ان سب بولیوں سے اثر قبول کیا ہے۔ اردو کے قدیم نمونوں میں ان سب کی جھلک ملتی ہے اور اس کی تشکیل میں ان سب نے جو حصہ لیا ہے۔ اس سے انکار کرنا یا کسی ایک کو لے کر دوسری بولیوں کے اثرات کو نظر انداز کرنا صداقت کو ہاتھ سے دینا ہوگا۔ غرض ابتدائی اردو نے پنجابی، لہندا، ہریانی، برج سب سے مدد لی ہے اور اس کا جدید ادبی روپ کھڑی سے تعلق رکھتا ہے۔

مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶

صرف ٹائیٹل دیال پریس دہلی ۶ میں چھپا۔

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ رُوپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶ | بابت ماہ مئی ۱۹۶۲ء | شمارہ ۷

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

غزل کا مستقبل

ڈاکٹر سید عابد حسین

غزل کا مستقبل ایسا بے ڈھب موضوع ہے جس پر قلم اٹھاتے یا زبان کھولتے ڈر لگتا ہے۔ آنے والے زمانے میں ہونی یا ان ہونی چیزوں کے بارے میں کچھ کہنا ایک طرح کی پیش گوئی ہے۔ اور پیش گوئی خاصا جان جوکھم کا کام ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے ۳ فروری کو قیامت کی پیش گوئی کرنے والوں کا جو حشر ہوا وہ آپ نے بھگتا نہیں تو دیکھا ضرور ہوگا۔ مگر ایک بات ہے کسی خاص واقعے کی ایک بندھی ٹکی اور وہ بھی بہت قریب کی تاریخ بتلانے میں جتنا خطرہ ہے اتنا ایک غیر معین مستقبل کی طرف مبہم سا اشارہ کر دینے میں نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہ کیوں نہ کریں کہ غزل کے کچھ دن پہلے گزرے ہوئے ماضی کی روشنی میں اس کے مستقبل کا کچھ اندازہ لگائیں اور پھر اس کے بارے میں اس انداز سے سنبھل سنبھل کر دو چار باتیں کہہ ڈالیں کہ قیامت کا ڈھنڈھورا پیٹنے والوں کی طرح آسانی سے پکڑے نہ جائیں۔

آپ نے دیکھا یا کم سے کم سنا ہوگا کہ اب سے چوتھائی صدی پہلے اردو سنسار میں پچھم کی طرف سے ترقی پسندی کی آندھی بڑے زور شور سے اٹھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان تند و تیز ہواؤں میں شعر و ادب کی پرانی رسمیں اور روایتیں سوکھی پتیوں کی طرح اڑ جائیں گی۔ سب سے زیادہ اندیشہ غزل کی طرف سے تھا۔ اس لئے کہ آندھی کا رخ خاص طور پر اسی طرف تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نازوں کا پالا نرم و نازک پودا ان زبردست جھکڑوں کی تاب کیوں کر لائے گا۔ مگر ہوا کیا؟ شعر و ادب کے بڑے بڑے تنومند درخت مثلاً داستان، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، وغیرہ یا تو جڑ سے اکھڑ گئے یا ان کی جڑیں بری طرح ہل کر رہ گئیں اور غزل کا یہ فتنہ قد پودا طوفان ہوا کے تھپیڑے کے ساتھ مڑتا، جھولتا، جھکتا، لچکتا رہا مگر اکھڑنے کا کیا ذکر ہے ایسا لگتا ہے جیسے کچھ اور زیادہ جم گیا ہے۔ اس پر

ان لوگوں کو جو غزل کی ماہیت سے اور اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں اچنبھا ہو تو ہو ان لوگوں کو کوئی تعجب نہیں ہوا جو یہ جانتے ہیں کہ موسیقی اور مصوری کے سانچے میں ڈھلا ہوا شعر انسانی فطرت کے بنیادی سروں سے ہم آہنگ ہے۔ اس لئے اس پر کبھی زوال نہیں آ سکتا۔

آیئے ذرا ہم بھی سوچیں کہ موسیقی اور مصوری کے سانچے میں ڈھلنے کے کیا معنی ہیں اور انسانی فطرت کے بنیادی سروں سے ہم آہنگ ہونا کسے کہتے ہیں۔ پھر شاید ہمیں اس کی کچھ اٹکل ہو سکے کہ غزل کا جادو آج کی طرح کل بھی سر پر چڑھ کر بولے گا یا نہیں۔

غزل دراصل غنائی شاعری کی جس کا نام یونانیوں نے (LYRIC) لرک رکھا تھا وہ قسم ہے جو پہلے عربی شاعری میں آئی پھر فارسی اور اردو شاعری میں پروان چڑھی۔ مگر اس میں اور دوسری قسموں میں جنھوں نے اور زبانوں میں نشوونما پائی۔ بڑا فرق یہ ہے کہ وہاں گیت سانیٹ بلیڈ وغیرہ میں اصل چیز موسیقی ہے شعر صرف موسیقی کی برقی رو کے لئے تار کا کام دیتا ہے۔ اور غزل میں اصل چیز احساسات وجذبات کی لفظوں میں کھینچی ہوئی تصویر ہے۔ جس کا کیف شراب کی طرح تصور کو سرشار کر دیتا ہے۔ موسیقی محض وہ ظرف ہے جس میں یہ شراب لنڈھائی جاتی ہے۔ غزل اور غنائی شاعری کی دوسری قسموں میں ماہیت اور مزاج کا جو فرق ہے اس کی وجہ سے آہنگ، طرزِ ادا موضوع اور زبان میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ غنائی شاعری کے لئے عام طور پر وزن ایسے اختیار کئے گئے ہیں کہ آواز کی لے بہتی چلی جائے۔ کہیں رکاوٹ نہ پڑے اسے ادا کرنے کے لئے سرگم کے سُر چنے گئے ہیں جن کے ہیر پھیر، اتار چڑھاؤ سے الگ الگ چیزوں کے لئے الگ الگ دُھنیں بنی ہیں جن میں مختلف نغمے گائے جاتے ہیں۔ لفظوں کے انتخاب میں خاص طور پر ان کے صوتی اثر کا خیال رکھا جاتا ہے مفہوم یا تصور کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لفظ جو نغمے کے دھارے میں آب رواں کی طرح بہ سکیں۔ ہر زبان میں کم ہوتے ہیں۔ اس لئے گیت سانیٹ وغیرہ کی زبان بہت محدود ہو کر رہ گئی ہے اور قدرتی طور پر ان کا موضوع بھی بہت محدود ہو گیا ہے۔ صرف چند سیدھی سادی جذباتی کیفیتیں

...ادا کی جاسکتی ہیں۔ اب غزل کی طرف آئیے۔ یہاں چونکہ شعر سے صرف موسیقی کا نہیں بلکہ
صورت آفرینی کا بھی کام لینا ہے یعنی جذبات و معاملات کا جیتا جاگتا مرقع کھینچنا ہے اس لئے
ایسا وزن یا ایسی بحر چاہتا ہے جس میں موسیقی ضرور ہو مگر اتنی نہیں کہ اس کی دھن میں لفظ
...طرح سمجھ میں نہ آئیں اور تصورات کا جو نقش ان سے بنانا ہے وہ سننے والے کے ذہن
کے پردے پر نہ بن سکے۔ غزل گانے کے لئے نہیں بلکہ صحت اور وضاحت سے ہلکے سے
ترنم کے ساتھ پڑھنے کے لئے ہے۔ چنانچہ صدیوں کی محنت اور تلاش کے بعد اس کے لئے
بحریں ڈھونڈھی گئی ہیں۔ جن کا وزن غنائی شاعری کی اور قسموں کے وزن سے الگ ہے
زبان غزل کی بھی محدود ہے لیکن ان کی حدیں دوسری ہیں۔ غزل کے لئے ایسے لفظ چنے
گئے ہیں جو کانوں کو بھی بھلے معلوم ہوں اور آنکھوں کے آگے کسی کیفیت یا حالت کا سماں بھی
باندھ دیں۔ موضوع یہاں بھی محدود ہیں یعنی جذبات کی کیفیتیں اور دل کے معاملات لیکن
غزل کے پاس صرف مغنی کی آواز ہی نہیں بلکہ مصور کا موقلم بھی ہے اس لئے وہ جذبہ و احساس
کی باریکیوں اور نیرنگیوں کو دل کے معاملات کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو بھی دکھا سکتی ہے۔

اگر غزل کا یہ مفہوم آپ کے دل کو لگتا ہے تو پھر شاید آپ کو اس بات کے ماننے میں کوئی
تامل نہ ہو کہ غزل انسانی فطرت کے بنیادی سروں سے ہم آہنگ ہے۔ رسیلی آوازوں اور
خوشنما شکلوں سے لطف اٹھانا انسان کے خمیر میں ہے اس لئے شاعری اور شاعری میں
خاص طور پر غزل جس میں لحن اور تصور، اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ دونوں کا لطف
دوبالا ہو جاتا ہے قدرتی طور پر قلب انسانی کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور اس کا اثر اس سے
زیادہ بھرپور ہوتا ہے جتنا موسیقی اور مصوری کا الگ الگ ہو کر ہوتا ہے۔

اب اس سوال کا جواب کہ غزل کا مستقبل کیا ہے خود بخود مل جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ
جب تک انسانی فطرت کے ساز میں ذوقِ نغمہ اور ذوقِ تصور کو بنیادی سُروں کی حیثیت حاصل ہے
اور جب تک غزل کے سُر بہ یک وقت ان دونوں کے ساتھ میل کھاتے ہیں لوگ ہمیشہ غزل کے
شعروں کو اسی ذوق شوق سے سنتے اور سر دھنتے رہیں گے۔

بار بار پڑھتا، قطب الدین مبارک خلجی سہروردیہ سلسلہ کے ایک بزرگ ضیاء الدین رومی کا مرید تھا، سلطان تغلق
حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر کے پوتے حضرت شیخ علاء الدین کا مرید تھا۔ اس نے حضرت خواجہ نظام الدین
اولیاء کے جنازے کو کاندھا دیا، ان کے روضہ مبارک کی عمارت اسی نے بنوائی۔ حضرت شرف الدین
یحییٰ منیری اور حضرت شیخ رکن الدین ملتانی کی خانقاہیں بھی اسی نے تعمیر کرائیں، سلطان فیروز شاہ
تغلق مشائخ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا تھا، حضرت جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت
اس کے دربار میں تشریف لاتے تو دونوں تخت پر ساتھ بیٹھتے، سلطان سکندر لودی حضرت سماء الدین
کا مرید تھا، بابر حضرت عبد القدوس گنگوہی کے آستانہ پر خود حاضر ہوا تھا، اور حضرت گنگوہی نے
بھی اپنے ایک مکتوب کے ذریعے اس کو نصیحت کی کہ وہ عدل قائم کرے، اوامر و نواہی کی پابندی
کرائے، نماز باجماعت کا پابند رہے، اور علماء کو دوست بنائے، ہمایوں حضرت غوث گوالیاری کے
حلقہ ارادت میں داخل ہو گیا تھا۔ اکبر کو شیخ سلیم چشتی سے جو محبت و عقیدت رہی وہ اس کی
زندگی کا اہم جزو ہے، اور ان ہی کی خاطر اس نے فتح پور سیکری کو تمام شہروں کا سرتاج بنا دیا، اس کو جب
کبھی ملکی اور فوجی کاموں سے فرصت مل جاتی، تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے آستانہ پر حاضر ہوتا
میدان جنگ میں حضرت خواجہ سے حصول برکت کے لئے یا معین کا نعرہ بھی لگاتا، شہزادہ سلیم کی پیدائش
کی خوشی میں ان کے مزار پر حاضری دینے کے لئے آگرہ سے اجمیر تک پا پیادہ گیا، جہانگیر تو حضرت
شیخ سلیم کے سایۂ عاطفت ہی میں پلا، اس لئے بزرگوں، درویشوں حتی کہ سنیاسیوں سے بھی بڑی
عقیدت رکھتا تھا، کچھ دنوں اس کو حضرت مجدد سے اختلاف ضرور رہا، لیکن جب اس کی غلط فہمی
دور ہوئی تو وہ حضرت مجدد کا بہت گرویدہ ہو گیا۔ ایک مشہور روایت ہے کہ وہ کہا کرتا تھا، کہ میرے
پاس ایک دستاویز نجات ہے، اور وہ حضرت مجدد کا ارشاد مبارک ہے، کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے
جنت میں لے جائے گا تو تیرے بغیر نہ جاؤں گا۔ شاہجہاں بچپن ہی میں حضرت مجدد کے حلقہ ارادت
میں داخل ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے سلوک و طریقت کی تعلیم حضرت مجدد کے صاحبزادے حضرت
محمد معصوم سے پائی۔ اور اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ وہ تمام مشائخ سے کس قدر
والہانہ لگاؤ رکھتا تھا، آخری دور میں شاہ عالم کو حضرت شاہ فخر الدین دہلوی سے بڑی عقیدت

رہی، شاہی خاندان کے افراد ان ہی کے حلقۂ ارادت میں تھے، بہادر شاہ ظفر بھی ان ہی کا مرید تھا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے مولانا قطب الدین سے بیعت کی، اور جب ان کا وصال ہوا تو ان سے خورد سال صاحب زادے غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب سے وہی عقیدت قائم رکھی۔

یہ پیری مریدی محض رسمی اور روایتی نہیں رہی۔ التمش، بلبن، محمد تغلق، فیروز شاہ اور نگ زیب کے مذہبی خیالات وجذبات کے نشوونما میں ان بزرگوں کے فیوض وبرکات کا بڑا دخل رہا، اور جب بعض سلاطین علماء کی سخت گیریوں سے گھبرا جاتے تھے، تو صوفیائے کرام کے روحانی دامن میں ان کو پناہ ملتی تھی، وہ ظواہر کی پابندی میں سختی کرنے کے بجائے ان میں، سلام کی اخلاقی اور باطنی ندرت پیدا کرنے کی کوشش کرتے، اس سے شریعت کی گرفت تھوڑی ڈھیلی ضرور ہو جاتی لیکن اسلام کے باطنی مزاج کا استیلاء ان پر قائم رہتا جس سے غیر شعوری طور پر حکومت و سلطنت کو فائدہ پہنچتا۔ التمش جیسے دیندار بادشاہ کے دربار میں مولانا سید نور الدین مبارک غزنوی نے یہ وعظ کہنے میں تامل نہیں کیا کہ بادشاہوں کی زندگی کے جو لوازم ہیں، جس طریقے سے وہ کھاتے ہیں، جو کپڑے پہنتے ہیں، جس طرح وہ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اور سواری کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ وہ تمام چیزیں دین مصطفیٰ کے خلاف ہیں، لیکن حضرت بختیار کاکی اپنے مرید سلطان التمش کو شاہانہ شوکت وحشمت کو ترک کرنے کی تلقین کے بجائے اس کو خدا ترسی، پارسائی، تزکیۂ نفس، غم خواری دین اور خدمت خلق کی تعلیم دیتے رہے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے دربار کی نمائش، اور فرکیخسروی کو علماء رسوم جبابرہ کہتے رہے۔ وہ دربار کی ظاہری نمود ونمائش میں عجمی فرمان رواؤں کی تقلید کرتا تھا، جس کا رنگ مشرکانہ تھا، لیکن وہ اپنے عہد کے اکابر بزرگان دین سے فیوض وبرکات حاصل کرتا رہا، اس کی درباری زندگی خواہ کیسی ہی رہی ہو لیکن اس کو حمیت اسلام اور شعائر اسلام کا بڑا خیال رہا اس لئے اس کے مرنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور دوسرے بزرگ جب بلبن کا نام لیتے تو اس کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ، طاب ثراہ اور انار اللہ برہانہ بھی کہتے، خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنی مجلس میں اس کے دربار کے بعض مشرکانہ رسوم کے باوجود

اس کے مذہبی عقائد کی تعریف کی ہے۔

حضرت سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں، کہ ہندوستان میں شب برات میں جو تقریبات منائی جاتی ہیں، وہ غزنیں، خراساں اور عرب میں دیکھنے میں نہیں آتیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی تعلق مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے عوام سے ہے جو دین سے بے خبر ہیں، اور وہ اس رات کو غیر شرعی چیزوں میں مشغول رہ کر اپنے اعمال کو سیاہ کرتے ہیں، وہ فیروز شاہ تغلق سے بھی ملتے رہے، جس نے ان سے مذہبی اور روحانی فیوض حاصل کئے، لیکن اس کے دربار میں شب برات کی تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی، بے شمار مشعلیں روشن کی جاتیں طبل بجتے، آتشبازی کے طرح طرح کے تماشے ہوتے، مگر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سلطان کی اس شاہانہ تقریب کے ختم کر دینے پر مصر نہیں ہوئے۔

بعض سلاطین اور صوفیہ کرام میں کچھ کش مکش ضرور رہی، لیکن اس کی تاریخ بہت زیادہ طویل نہیں، پہلی مثال سلطان جلال الدین خلجی اور سیدی مولہ کی ملتی ہے، ان کی خانقاہ میں بڑی مقدار میں کھانا پکتا تھا، اور کھانا ایسا ہوتا تھا، کہ اس زمانے کے امرار کو بھی میسر نہ تھا، روزانہ ہزاروں من میدہ خرچ ہوتا تھا، پانچ سو جانور ذبح کئے جاتے تھے، دو تین سو من شکر صرف ہوتی تھی، اور لوگوں کو یہ پتہ نہ چلتا کہ یہ سب کہاں سے آتا ہے، امرار کی آمد ورفت بڑھ گئی تھی، یہاں تک کہ جلال الدین خلجی کو خبر دی گئی کہ یہ خانقاہ سازشوں کا مرکز بن گئی ہے، اس نے اشتعال میں آکر ان کو ہاتھی کے پاؤں سے مسلوا ڈالا، ضیار الدین برنی نے لکھا ہے کہ ایسے حلیم اور بردبار بادشاہ نے ایسا حکم صادر کیا، جس سے درویشی کی عزت جاتی رہی، لیکن جس روز سیدی مولہ کا قتل ہوا، اس روز اتنی زبردست آندھی آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آگئی ہے، جلال الدین خلجی نے اس کے بعد محسوس کیا کہ اس سے ایک غلط کام ہو گیا ہے۔

قطب الدین مبارک خلجی کو برابر اصرار رہا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اس کے دربار میں حاضری دیں، لیکن حضرت خواجہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، سلطان نے ایک دن مقرر بھی کیا، کہ اگر اس روز تک وہ نہ پہنچے تو پھر وہ تشدد سے کام لے گا لیکن اس روز محل کے اندر شورش ہوئی، اور خسرو خاں

کے ہاتھوں سلطان قطب الدین کا قتل ہوگیا۔ سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا تو بعض علما نے اس سے حضرت خواجہ کے خلاف سماع کی ممانعت کا ایک عام شاہی حکم جاری کرا دیا، جس کی بنا پر حضرت خواجہ سے اختلاف پیدا ہوا اور یہ روایت عام طور سے مشہور ہے، کہ جب غیاث الدین تغلق بنگالہ کی مہم سے واپس آرہا تھا تو اس نے محبوب الٰہی کے پاس پیام بھیجا، کہ وہ شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کریں، لیکن انھوں نے کہلا بھیجا کہ

"ہنوز دلّی دور است"

اس کے بعد وہ خیمہ گر جانے سے دب کر ہلاک ہوگیا، تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان محمد تغلق کو حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی اور حضرت فخر الدین زرادی سے اختلاف رہا، اور ان کو ایذائیں پہنچائیں، عام طور سے تذکرہ نگار جب بوریہ نشینوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایسی باتیں تخت نشینوں کے متعلق ضرور قلم بند کر دیتے ہیں، جن سے ان کے خیال میں درویشی کی شان عظمت و جلالت بڑھ جاتی ہے لیکن تنقید و تجزیہ کے بعد ان کے بیانات میں بڑا سقم پیدا ہو جاتا ہے مگر کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جو تذکرہ نویسوں کے ان بیانات سے فائدہ اٹھا کر سلاطین کے کردار کو اس طرح پیش کرنے لگے ہیں، جس سے اس دور کی تاریخ بدنام ہو جاتی ہے اس طرح تذکرہ نویسوں کی غیر ذمہ دارانہ تحریروں سے اس عہد کی تاریخ کو نقصان پہنچا ہے۔

مغلوں کے عہد میں سلاطین اور صوفیہ کے تصادم کی ایک مثال تو حضرت مجدد الف ثانی کی ہے۔ لیکن یہ تصادم تصوف کے محاذ پر نہیں ہوا بلکہ اس کے پیچھے اور محرکات تھیں، اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں حضرت سرمد کی شہادت کا واقعہ ہے، وہ دارا شکوہ کے حامی تھے، اور اورنگ زیب کے مخالف تھے، عریاں رہتے تھے، اور جب اس عہد کے قاضی اور فقیہ شیخ عبد القوی نے ان کی عریانی کی وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ شیطان قوی است، یہ طنز شیخ عبد القوی کو گراں گزرا، پھر جب وہ دربار میں طلب کئے گئے، تو ان سے کلمہ پڑھنے کے لئے کہا گیا، تو صرف لا الٰہ پڑھا، اور جب دوسرا جز پڑھنے کو کہا گیا تو فرمایا ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ شہادت پر نہیں پہنچا ہوں ان کی ایک رباعی سے یہ بھی استدلال کیا گیا، کہ وہ معراج جسمانی کے منکر ہیں، آج تک یہ اتفاق نہ ہو سکا کہ ان میں سے کون سے جرم پر

علماء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیا۔ لیکن جب وہ دربار سے قتل گاہ کی طرف چلے تو تمام شہر ٹوٹ پڑا اور اس قدر ہجوم تھا کہ راستہ چلنا دشوار ہو گیا۔ قلعہ معلیٰ سے جامع مسجد کے پاس لائے گئے۔ راستے میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ بیسیوں رباعیاں کہہ ڈالیں، اور مردانہ وار سر تلوار کے نیچے رکھ کر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور کہا جاتا ہے کہ شہادت کے بعد سر کشتہ سے تین بار لا الٰہ الا اللہ کی بھی صدائیں بلند ہوئیں۔

صوفیا کرام کی باہمی محبت

صوفیا کرام کی زندگی کا ایک بڑا روشن پہلو یہ ہے کہ ان میں باہم کش مکش نہیں رہی اور مختلف خانوادے اپنے مرکز پر بیٹھ کر اپنے فرائض انجام دیتے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے رہے، بلکہ باہمی محبت اور یگانگت کی بعض ایسی مثالیں ہیں، جو دوسروں کے لئے قابلِ تقلید ہیں، مثلاً سہروردیہ سلسلہ کے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی نے ایک موقع پر کسی بات کی معذرت کرتے ہوئے حضرت فریدالدین شکر گنج کو لکھا کہ میان ما و شما عشق بازی است بابا شکر گنج نے اس کا جواب دیا کہ میان ما و شما عشق است بازی نیست۔

علاؤالدین خلجی کے جانشین قطب الدین خلجی کو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے ذاتی مخاصمت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے مخالفت و عناد میں دوسرے مشائخ سے مراسم پیدا کئے، اس سلسلے میں اس نے ملتان کے سہروردیہ خانوادہ کے بزرگ حضرت شیخ رکن الدین سے بھی اپنی گرویدگی اور شیفتگی کا اظہار کیا۔ اور ان کو ملتان سے دہلی آنے کی دعوت دی، جب وہ دہلی تشریف لائے اور سلطان سے ملنے گئے تو اس نے پوچھا کہ دلّی میں سب سے پہلے کس شخص نے آپکا استقبال کیا، گو ان کو حضرت محبوب الٰہی سے سلطان کے عناد کا حال معلوم تھا تاہم انھوں نے جواب دیا کہ اس نے جو اس شہر کا سب سے اچھا آدمی ہے یعنی حضرت نظام الدین اولیاء نے ایک بار حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد منیری نے حضرت سید جلال الدین بخاری جہانیاں جہاں گشت کے پاس کفش بھیجی جس کا مطلب یہ تھا کہ میں آپ کا کفش پا ہوں۔ حضرت جہانیاں جہاں گشت نے اس کے بدلے میں اپنی دستار بھی جس سے مراد یہ تھی، کہ آپ میرے سر تاج ہیں۔

لیکن یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ صوفیہ کرام کے خانوادے جب بڑھتے گئے، تو اکابر صوفیہ کے نہ رہنے کی وجہ سے وہ یکانگت اور مواتست باقی نہیں رہی، چشتیہ سلسلہ میں کئی خانوادے ہو گئے صابریہ، نظامیہ، جمالیہ، پھر سہروردیہ، فردوسیہ، شطاریہ، قادریہ، نقشبندیہ، مجددیہ کی خانقاہیں بھی الگ الگ بنیں، اور یہ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان خانقاہوں میں چشمک نہیں رہی، ان سلسلوں کے پیر اگر خاموش بھی رہتے تو ان کے مُرید اپنے اپنے سلسلہ کی فضیلت بیان کرکے کبھی کبھی پیدا کر دیتے، جس سے عوام میں بھی ایک ذہنی انتشار پیدا ہو جاتا۔

صوفیہ اور علماء

تمام اکابر صوفیہ نے علماء ہی کی طرح تعلیم حاصل کی۔ حضرت بختیار کاکی نے تمام ظاہری علوم کی تعلیم پائی تھی، حضرت بہاؤالدین زکریا سہروردی نے کلام پاک ساتوں قرأتوں کے ساتھ حفظ کیا تھا، اور پندرہ سال تک خراسان اور بخارا میں تحصیل علم کرتے رہے، حضرت فریدالدین گنج شکر نے بھی کلام پاک حفظ کیا، اور فقہ کی کتاب نافع مولانا منہاج الدین ترمذی سے پڑھی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء راہ سلوک کی ابتدائی منزل میں کسی شرعی مسئلہ پر غور و فکر کر رہے تھے کہ ایک مجذوب نے آکر کہا کہ مولانا نظام الدین اعلم بہت بڑا حجاب ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے، لیکن بڑا حجاب کیوں کر ہو سکتا ہے، مجذوب نے کہا جب اس جگہ پہنچو گے تو یہ معلوم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حضرت شیخ نظام الدین اپنے مرشد حضرت گنج شکر کی خدمت میں پہنچے، اور مجذوب کی باتیں کہہ سنائیں، حضرت فریدالدین گنج شکر نے فرمایا کہ حجاب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ظلمانی، دوسرا نورانی، گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب ہیں، جو شخص ان سے توبہ کرے گا۔ اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا، لیکن علم ایک نورانی حجاب ہے، جس کو ہر شخص نہ عبور کر سکتا ہے۔ اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے، جس وقت تک شرعی علوم میں بھی دستگاہ نہیں ہوگی، خدا کی محبت، معرفت اور قربت حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے علم ایک بڑا حجاب ہو گیا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے قدوری، حریری، مشارق الانوار کی باضابطہ تعلیم پائی اور جب ان کی دستار فضیلت باندھی گئی، تو بدایوں کے علماء اور مشائخ دونوں اس تقریب میں شریک تھے۔

ان کا شمار متبحر علماء میں ہوتا رہا، ان کے مریدان کے علمی تبحر سے بھی استفادہ کرتے تھے، اسی لئے ان کی خانقاہ میں رشد و ہدایت کے ساتھ درس و تدریس کا بھی سلسلہ جاری تھا، اکابر صوفیہ کی علمی فضیلت کے معترف سب ہی رہے، مثلاً مولانا قطب الدین کاشانی دہلی آئے، اور حضرت حمید الدین ناگوری کی تصانیف پڑھیں تو اپنے ہمراہی علماء سے کہا کہ اے یارو! جو کچھ ہم نے اور تم نے پڑھا ہے، وہ سب ان تصانیف میں موجود ہے، اور جو کچھ نہیں پڑھا ہے، وہ علم بھی ان کتابوں میں موجود ہے، اسی طرح حضرت شیخ صدر الدین عارف حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، حضرت شرف احمد منیری حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی، حضرت خواجہ گیسو دراز، حضرت بہاؤ الدین نقشبندی، حضرت عبد القدوس گنگوہی اور ان کے دوسرے ہم پایہ مشائخ کا درجہ علوم ظاہری میں جید علماء سے کم نہیں، اور وہ علماء کے صف میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں، لیکن اس حقیقت کے باوجود علماء اور صوفیہ کی تفریق پیدا ہو گئی اور غلط یا صحیح یہ دو علیحدہ گروہ سمجھے گئے۔

صوفیہ کرام اور تبلیغ اسلام

اور جو کام علماء انجام نہ دے سکے، وہ صوفیہ کرام محض روحانی جلووں سے پورا کرتے رہے، اسلام کی روحانی طاقت ان ہی بزرگوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی رہی اور انھوں نے نفس کشی، فقر و فاقہ مجاہدہ، عبادت و ریاضت، حلم و عفو، صبر و تحمل، محبت و مودت، جود و سخا، فیاضی، حقوق ہمسایہ تواضع و انکسار کے وہ اعلیٰ نمونے پیش کئے، کہ وہ لوگ بھی جو مسلمان فاتحین کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر، اسلام سے بدگمان ہو گئے تھے، وہ ان بوریہ نشینوں کے اخلاق کو اسلام کا اخلاق سمجھ کر ان کے ایسے گرویدہ اور فریفتہ ہو گئے، کہ اسلام کی ساری دلآویزی اور رعنائی ان ہی کی ذات میں نظر آنے لگی، اور گو اسلام کی تبلیغ کی باضابطہ کوشش کبھی نہیں کی گئی، لیکن ان بزرگوں کی صحبت کیمیا اثر سے اسلام کا دائرہ خود بخود وسیع ہوتا گیا، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی کوششوں سے بہت سے ہندو مسلمان ہوئے۔ مشہور ہے کہ جب حضرت خواجہ اجمیر سے دہلی جاتے تھے، تو راستہ میں بہت سے ہندو اسلام قبول کرتے، حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی اور بابا فرید الدین گنج شکر کے ہاتھ پر پنجاب

کے بہت سے ہندو اسلام لائے، جواہر فریدیہ کے مصنف نے لکھا ہے، کہ بابا فرید نے سولہ قوموں کو تعلیم و تلقین سے شرف بہ اسلام کیا، بوعلی قلندر پانی پتی نے پانی پت میں تین سو راجپوتوں کو مسلمان کیا حضرت جلال الدین تبریزی نے بنگال میں رہ کر اسلام کو پھیلایا، شیخ جلال الدین نے آسام کے علاقہ سلہٹ میں جاکر تبلیغ کی، کشمیر میں بلبل شاہ اور سید علی ہمدانی کی وجہ سے اسلام پھیلا، خواجہ سید محمد گیسو دراز نے پونہ اور بلگام میں بہت سے لوگوں کو مسلمان بنایا۔

ان بزرگوں نے یہاں کے باشندوں کی تسخیر قلوب کے لئے بہت سی صورتیں اختیار کیں، اور یہ تسخیر قلوب امیر خسرو کی تحریروں میں زیادہ نظر آتی ہے، جن کی نگاہوں میں ہندوستانی پھولوں سے زیادہ دلاویز پھول کہیں اور نہیں ہیں، ہندوستانی عورتوں سے زیادہ کسی اور جگہ کی عورتیں حسین اور وفا شعار نہیں، حتی کہ وہ سنسکرت زبان کو فارسی پر ترجیح دیتے ہیں، اور یہاں کے مذہب کو اسلام کے علاوہ ہر مذہب سے بہتر اور برتر قرار دیتے ہیں، تسخیر قلوب ہی کی خاطر مسلمانوں کے بعض حلقے کبیر پنتھی اور سدا سہاگ جیسے فرقوں کی طرف مائل ہوئے، اور انھوں نے ان کے ذریعہ ہندوؤں سے قریب تر ہونے کی کوشش کی، کشمیر میں تو کچھ مسلمان فقراء ایسے بھی تھے، جو اپنے کو رشی کہتے تھے کچھ صوفیوں نے ہندو رشیوں کے یوگ، ذکر، مراقبہ، حبس دم، دھیان گیان، اور ریاضت کے طریقوں کو بھی اپنایا، اور وحدت الوجود کے مسئلہ میں انھوں نے بہت سے دلائل ویدانت کے فلسفے سے اخذ کئے۔ اسی لئے ایک گروہ ایسا بھی تھا جو تصوف اور ویدانت کو ایک ہی چیز سمجھتا رہا، لیکن علماء ایسے عقائد رکھنے والے گروہوں کو گمراہ سمجھتے رہے۔

(باقی آئندہ)

تعلیم اور فلسفہ کا باہمی تعلّق

ڈاکٹر سلامت اللہ

تعلیم کا منصب دراصل ان عقائد، رجحانات، خیالات، اقدار، وغیرہ کی اشاعت کرتا ہے، جو کسی مخصوص سماج میں کسی خاص دور میں جاری و ساری ہوتے ہیں۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور بے تعلق ہیں یا ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں حقیقتاً یہ سب ایک ہی نظام فکر کی حامل ہوتی ہیں، جسے علمی اصطلاح میں فلسفہ کہا جاتا ہے وسیع معنوں میں دیکھئے تو کوئی بھی فلسفہ کل کائنات کا ایک جامع تصور پیش کرتا ہے اور یہ متعین کرتا ہے کہ کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے۔ یہ تو ہے فلسفے کا مرکزی موضوع۔ مگر اس کے دامن میں چند نظریات ایسے ہیں جنھیں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ مثلاً وہ نظریات جو حقیقت، علم اور اخلاقیات کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان نظریات کی بنا پر ہی انسان کائنات میں اپنے مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے یعنی اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہم معلوم کریں کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے، اس کا علم کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس پر قابو پانے کے لئے کون سے مقاصد پیش نظر ہونے چاہئیں۔

عملی لحاظ سے دیکھئے، تو فلسفے کے دائرے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ بتاتا ہے کہ انسان کی منزل مقصود کیا ہے، اس کی راہ میں کس کس قسم کی رکاوٹیں ہیں اور انھیں کیوں کر دور کیا جا سکتا ہے، انسان کی تگ و دو کا مقصد کیا ہونا چاہیئے، وہ کن بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور وہ چیزیں جو آج اس کی دسترس سے باہر ہیں، کل کس طرح اس کے پنجۂ اختیار میں آ سکتی ہیں۔ غرض فلسفہ مقصدِ حیات کی محض تعبیر ہی نہیں کرتا، بلکہ ان اقدارِ اعلیٰ کا معیار بھی مقرر کرتا ہے جن کی رہنمائی میں انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ لہٰذا فلسفہ فقط غور و فکر اور خیال

کی تضادوں میں پرواز نہیں کرتا بلکہ وہ عمل کا محرک اور رہنما بن جاتا ہے۔ اس طرح فلسفہ عمل کو بصارت عطا
کرتا ہے اور عمل فلسفہ میں بصیرت پیدا کرتا ہے، خیال اور عمل کے غیر فطری تضاد کو مٹاتا ہے اور فکر اور
تجربے کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ اس طرح دیکھئے تو فلسفہ صرف دنیا کے مظاہر کی
تشریح و توجیہ پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اُن میں بقول کارل مارکس انسانی ضروریات کے مطابق مناسب
تبدیلیاں پیدا کرنے کا آلہ بنتا ہے۔ چونکہ تعلیم اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے اس
لئے فلسفہ کے نزدیک تعلیم کی بڑی اہمیت ہے اور تعلیم کے لئے فلسفہ ایک رہبر اور ہادی کی
حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔

یوں تو یہ بات بہت سیدھی سادی معلوم ہوتی ہے کہ فلسفہ کو تعلیم کی رہنمائی کرنی چاہیئے
لیکن ماہرین تعلیم میں اس بارے میں اختلاف رائے ہے۔ جو حضرات تعلیم کو اقدار اعلیٰ کا خادم بنانا
چاہتے ہیں، ان کے نزدیک فلسفہ کی حیثیت مقدم ہے۔ وہ پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ انسانی زندگی
کی تشکیل کیوں کر ہونی چاہیئے اور وہ اس مقصد کے حصول کے لئے تعلیم کو آلۂ کار بنانا چاہتے
ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ فلسفہ دراصل تعلیمی عمل کا نتیجہ ہے نہ کہ سبب پیرو
ہے نہ کہ رہبر۔ وہ فلسفہ کو تعلیم کی جڑ نہیں پھول سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک فلسفۂ تعلیم کی
سی اگر کوئی چیز ہے تو وہ محض ان اصولوں کا مرکب ہے جو تعلیمی عمل سے اخذ کئے گئے ہیں۔ لیکن
حقیقت میں، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، فلسفۂ تعلیم جہاں ایک طرف تعلیمی عمل اور تجربے سے کسب نور
کرتا ہے، وہاں دوسری طرف وہ تعلیمی عمل کو روشنی عطا کرتا ہے۔ فلسفہ تعلیم کے لئے نظریہ مہیا
کرتا ہے، جس کے مطابق تعلیم عمل کے قالب میں ڈھلتی ہے۔ لیکن یہ عمل بجائے خود پرانے نظریئے
میں تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک نئے نظریئے کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح
نظریہ اور عمل مسلسل ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ "نظریئے" کا نکتہ چیں دراصل اس
نظریئے کی تنقید کرتا ہے، جس کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں۔ اسی طرح "جو عمل" پر تنقید کرتا ہے، اس
کے پیش نظر ایسا عمل ہے جس میں غور و فکر کا کوئی دخل نہیں۔ جو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے،
جس کے سامنے کوئی واضح منزل نہیں ہے۔ فلسفہ کا کام ہر منزل متعین کرنا اور عمل کی رہنمائی کے لئے عام اصول

وضع کرنا جہاں تک راستہ اختیار کرنے کا تعلق ہے، اسے تجربے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے۔

اگر تعلیم فلسفہ کے ساتھ مناسب طور پر مربوط ہو جائے، تو وہ اُن خطروں سے خود کو محفوظ رکھ سکے گی، جو اسے عمل کی وادیٔ پُرخار میں پیش آئیں گے۔ فلسفہ ہی تعلیم کو ایک مقصد سے آشنا کرتا ہے اور اس کے لئے ایک سمت مقرر کرتا ہے۔ اگر تعلیم کا مقصد واضح نہ ہو، تو تعلیم ایک رجعت پرست قوت بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر، ہمت، جواں مردی، وفا شعاری، مستقل مزاجی، فرماں برداری وغیرہ اپنی جگہ قابلِ تعریف محاسن ہیں۔ مگر یہی خوبیاں ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں پیدا کر دی جائیں تو متمدن سماج کے لئے عذابِ جان بن جائیں گی۔ اس لئے اس بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعے کس قسم کے فرد کی تخلیق کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں کس نوع کے سماج کی تعمیر کرنی ہے۔ محض تعلیمی طریقوں کو بہتر اور موثر بنانے سے کام نہیں چلے گا۔ تعلیم کے مقاصد پسندیدہ نہ ہوں، تو تدریس کے اچھے سے اچھے طریقے ایسے رجحانات پیدا کر سکتے ہیں، جو ہیئتِ اجتماعی کے حق میں سمِ قاتل ثابت ہوں۔ مثال کے طور پر انگلستان کے "پبلک اسکول" کو لیجیئے۔ اس کا طرۂ امتیاز اس مشہور کہاوت سے ظاہر ہوتا ہے: "واٹرلو کی جنگ دراصل ایٹن اور رگبی کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی"۔ بے شک انگلستان کا پبلک اسکول اپنے موثر تربیتی پروگرام اور سخت ضبط کی بدولت ایسے جانباز اور بہادر فوجی لیڈر اور ہوشیار اور جابر حکمراں پیدا کرنے میں کامیاب ہوا، جنھوں نے برطانوی سامراج کی توسیع اور استحکام کی مہم کی سرغنائی کی، اور جو محکوم ممالک میں اپنی حکمت عملی سے بہت "قابل" ثابت ہوئے۔ لیکن ان کی قابلیت کا راز یہ تھا کہ وہ محکوم قوموں کے ساتھ گھٹیا سے گھٹیا سلوک کو روا رکھنے، کسی قسم کے ظلم و تشدد سے دریغ نہ کرتے اور اپنے محکوموں پر اس قدر خوف و دہشت طاری کرتے کہ وہ بے چارے سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اسکول کسی صالح اور انسانیت پرور فلسفہ کا حامل نہیں ہو سکتا۔ تعلیم کے مقاصد طریقے، نصاب، امتحانات، وغیرہ، غرض پورے تعلیمی عمل میں بالآخر اخلاقیات کے اصول پوشیدہ ہیں۔ لہٰذا ہمیں ایک ایسے فلسفۂ تعلیم کی ضرورت ہے جو ایک بہتر عالمِ انسانی کی تخلیق میں مددگار ثابت ہو سکے۔

فلسفۂ تعلیم واقعی سماجی نظام کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لئے ہر ایک سماج میں ایک مخصوص فلسفۂ تعلیم کارفرما ہوتا ہے۔ مختلف قسم کے سماجوں میں "بہتر دنیا" کے متعلق جو تصورات مادی ہیں، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جُدا جُدا ہیں۔ مثلاً کسی سماج کے نزدیک استقلالِ دائمی سب سے بڑی قدر ہے وہ اپنی موجودہ حالت کو بہرکیف قائم رکھنا چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ دوسرا سماج ایسا ہو سکتا ہے کہ جس میں کوئی بھی قدر قطعی نہیں سمجھی جاتی۔ وہاں قدر کی حیثیت محض اضافی ہے، جس چیز سے اپنا کام بنے، اپنی ضرورت پوری ہو جائے، لیکن "قلب حاصل ہو" وہی نسبت ہے۔ ایک سماج ایسا بھی ہو سکتا ہے، جو تغیر کا قائل تو ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری سمجھتا ہو کہ تغیر کے ذریعے ایسی قدر ہاتھ آنی چاہیئے، جس کی صحت پر بھروسا کیا جا سکے اور جو انسانی زندگی کو سنوارنے اور بھرپور بنانے میں شمع ہدایت کا کام دے سکے۔ اس قسم کے سماج کو صحیح معنوں میں جمہوری سماج کہا جا سکتا ہے۔ یہاں فلسفۂ تعلیم اس بنیادی عقیدے پر مبنی ہو گا کہ "انسان تمام چیزوں کی کسوٹی ہے"۔ انسان کی شخصیت قابل احترام ہے اور انسان میں کمال حاصل کرنے کی بے پایاں صلاحیت موجود ہے، وہ موزوں حالات میں خوب سے خوب تر بننے کی کوشش کر سکتا ہے۔ یہ فلسفۂ تعلیم بچوں اور نوجوانوں کے اس حق کا دعوے دار ہے کہ انہیں وہ تمام وسائل اور سہولتیں میسر ہونی چاہئیں، جن کی بدولت ان کی جسمانی، ذہنی، اخلاقی غرض ہر اعتبار سے مکمل نشوونما ہو سکے اور وہ اپنے سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ کارآمد اور موثر رکن بن سکیں۔

فلسفۂ تعلیم کے نظریات ہمیشہ ان مفروضات پر مبنی ہوتے ہیں جو انسانی فطرت سے متعلق صحیح تسلیم کر لئے گئے ہیں۔ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیئے، اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان میں فطری طور پر کیا کچھ موجود ہے، وہ کیا بن سکتا ہے اور کیا نہیں بن سکتا۔ یا یوں کہیئے کہ فلسفۂ تعلیم اپنے سامنے انسان کی ترقی کے امکانات اور حدود دونوں چیزوں کو رکھتا ہے اور ان دونوں کا تعین ان خصوصیات کی بنا پر کیا جاتا ہے، جو بنیادی طور پر انسانی فطرت

سے منسوب کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ مفروضہ کہ انسانی فطرت زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے اور اس میں کوئی اہم تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ ایک ایسے فلسفۂ تعلیم کی بنیاد بنتا ہے، جو تعلیم کے پُرانے چلن کو برقرار رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔ اس فلسفے کے علم بردار روایت پرست ہیں، ان کا ایمان دائمی اقدار پر قائم ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ اُن قدروں کو ایک باضابطہ نصابِ تعلیم اور پُرانے زمانے کے آزمودہ طریقوں کے ذریعے نسلاً بعد نسلاً منتقل کرتے رہنا چاہیئے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو انسانی فطرت کو تغیر پذیر مانتے ہیں، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں فرد اور سماج کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق تبدیلی ہوتی رہنی چاہیئے اور سیکھنے کے پورے عمل میں سیکھنے والے کی شرکت فعالی طور پر ہونی چاہیئے۔

اسی طرح جب یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ انسانی فطرت میں ایک روح جلوہ گر ہے اور یہ روح مختلف قوتوں کی مالک ہے، جیسے، قوت استدلال، قوت متخیلہ، قوت حافظہ وغیرہ، تو مواد تعلیم الگ الگ خانوں میں اس طرح تقسیم کر دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ذریعے ایک ایک قوت کی جُدا جُدا نشو و نما ہو سکے۔ یا اگر انسانی فطرت کو ایک "صاف تختی" گردانا جائے، تو پھر سیکھنے والے پر انواع و اقسام کا تعلیمی مواد نقش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، چاہے وہ اس کی صلاحیت اور استعداد کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

انسانی فطرت سے متعلق ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ انسان پیدائشی طور پر خودغرض واقع ہوا ہے اور اس حد تک کہ اس کا یہ مرض لاعلاج ہو گیا ہے۔ اس تصور نے کم و بیش قبول عام کی سند حاصل کر لی ہے۔ یہ بہت شرارت آمیز تصور ہے اور تعلیمی میدان نیز دوسرے سماجی میدانوں میں اس تصور کی بڑی خطرناک شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اس بات کی تبلیغ کرتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی اپنی جنت کی فکر کرنی چاہیئے اور اگر دوسرے جہنم کے حوالے ہو جائیں تو اس سے اسے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر نہ صرف افراد کے جارحانہ عمل کی بلکہ بین الاقوامی جنگوں کی بھی تاویل پیش کی جاتی ہے اور بعض اوقات تو اس قسم کے مظاہر کو جائز تک قرار دیا جاتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان فطرتاً خودغرض ہے اور یہ کہ فطرت انسانی بدلی نہیں جا سکتی، تو پھر کام کرنے کا اور کوئی

محرک نہیں رہ جاتا بجز اس کے کہ یا تو کام کرنے کی ترغیب کے لئے انعام کا لالچ دیا جائے یا کام نہ کرنے کی صورت میں سزا کے خوف سے متاثر کیا جائے۔ بظاہر ان میں سے کوئی بھی صورت پسندیدہ نہیں ہے۔ مگر مدرسے کے اندر اور باہر ہر جگہ اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے نتیجے کے طور پر تعاون کی جگہ مقابلے کی اسپرٹ کو فروغ حاصل ہوتا ہے اس سے بچوں اور نوجوانوں کے درمیان رشک وحسد کا ادنیٰ جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ وہ ہے جو اجتماعی زندگی کے سرچشمے کو زہر آلود کر دیتا ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ مدرسہ ان خودغرضانہ رجحانات کو تقویت پہنچاتا ہے جو مقابلے پر مبنی سماج میں جاری و ساری ہیں۔

در اصل اس مفروضے کے لئے کوئی قوی جواز نہیں ہے کہ انسان فطرتاً خودغرض واقع ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عموماً سبھی انسان اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً سب کو غذا، لباس، مکان، رفاقت، محبت، وغیرہ چاہیئے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ انسانی فطرت میں خودغرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے بے شک۔ یہ خواہشات فطری ہیں۔ مگر اس سے بدی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ ان خواہشات کو امداد باہمی کی بنا پر سماجی وسائل کی دانشمندانہ تنظیم اور تقسیم کے ذریعے خودغرضی کو فروغ دیئے بغیر بہ حسن خوبی پورا کیا جا سکتا ہے۔

جس چیز کو فطرت انسانی سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ درحقیقت کوئی جامد اور مستقل شے نہیں ہے۔ وہ اُن حالات کا پھل ہے جن کے تحت انسان رہتا سہتا ہے۔ یہ حالات بہت بڑی حد تک سماجی نظام کے رہینِ منت ہوتے ہیں۔ انسانی فطرت اصل میں سماجی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ لوگ جو اس کلیہ کے حامی ہیں، دو فریقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، اس لئے کہ وہ دو مختلف قسم کے فلسفوں کے پیرو ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ سماج میں افراد کے تعلقات اُن کی اپنی مرضی اور ارادہ کے مطابق قائم ہوتے ہیں اور ان تعلقات کی حیثیت خارجی ہوتی ہے یعنی وہ سماج کے داخلی عوامل سے متاثر نہیں ہوتے اور افراد سماج کی تشکیل میں آزادی اور خودمختاری کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ اس تصور کی رو سے افراد گویا خودمختار "ایٹم" ہیں، جو ایک دوسرے پر آزادی کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں اور نتیجے کے

طور پر ایک مرکب بناتے ہیں، جسے سماج کہا جاتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ سماجی تصور تعلیم میں آزادی عمل کے نظریئے کو جنم دیتا ہے۔ اس فلسفۂ تعلیم کے نزدیک یہ قطعاً جائز نہیں کہ تعلیمی عمل پر کسی قسم کا سماجی ضبط عائد کیا جائے کیونکہ وہ فرد کی آزادانہ نشوونما کو بہرکیف عزیز رکھتا ہے۔ تعلیم میں انفرادیت پرستی کی نظریاتی بنیاد یہی ہے اور جب اس نظریئے کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے، تو یہ خطرناک حد تک اس نظریئے کا مشابہ معلوم ہوتا ہے جس کے مطابق انسان فطری طور پر خودغرض قرار دیا گیا ہے۔

فطرتِ انسانی کی سماجی اساس سے متعلق دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان کی فطرت بالآخر سماج کی ساخت سے متعین ہوتی ہے۔ اس نظریئے کی رو سے سماج کے اندر افراد کے تعلقات داخلی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ہر ایک فرد دوسرے کے ساتھ سماج کے اندرونی عوامل کی بدولت وابستہ ہے اور صرف مشترکہ مقاصد کی بنا پر ہی افراد سے سماج بنتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیئے تو افراد صرف اسی حد تک آزاد ہیں جتنا کہ وہ سماجی کنٹرول کی حقیقت کا صحیح شعور رکھتے ہیں اور جہاں تک وہ سماجی ارتقاء کے قوانین کے مطابق اس کنٹرول میں اجتماعی طور پر تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ جو فلسفۂ تعلیم اس خیال کی ترجمانی کرتا ہے وہ نہ صرف آزادی کے اس تصور کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے جائز اور پسندیدہ قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق بچوں اور نوجوانوں کی انفرادی نشوونما کے لئے تعلیم کا سماجی مقصد بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس لحاظ سے تعلیمی عمل پر سماجی ضبط عائد ہونا چاہیئے۔ اگر ہم اس فلسفہ پر ایمان لائیں، تو پھر ہم اس قنوطیت اور کلبیت کی فضا سے باہر نکل سکیں گے جو یہ تسلیم کر لینے سے پیدا ہوتی ہے کہ انسانی فطرت بدلی نہیں جا سکتی۔

اوپر کی بحث میں اشارہ کیا گیا ہے کہ انسانی فطرت کی تبدیلی ممکن ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت کس حد تک بدلی جا سکتی ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ ایک خاص حد سے آگے اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر اس خیال کو صحیح سمجھ لیا جائے تو پھر سماجی نظام کو از سرِ نو تعمیر کرنے کے امکانات خود بخود محدود ہو جائیں گے۔ دوسرے لوگ جو انسانی فطرت کی تبدیلی اور سماجی نظام کی تعمیر نو سے متعلق زیادہ پُرامید ہیں، انسان کی لامحدود ترقی میں یقین رکھتے ہیں گو کہ روزمرہ کے تجربات اور نفسیاتی جانچ کے نتائج شاہد ہیں کہ افراد کے مابین ان کی ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے نمایاں فرق

جاتا ہے۔ اور ذہنی صلاحیت ہی تمام ترقی کی جڑ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ذہانت یا سیکھنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ جو حضرات ذہانت کو ایک مستقل، مطلق اور ناقابلِ تغیر شے سمجھتے ہیں وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان طبقات کے سماجی اور اقتصادی سلسلۂ مدارج کے لئے جواز پیش کرتے ہیں جن میں ہمارا موجودہ سماج بٹا ہوا ہے کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ جو لوگ غیر معمولی طور پر ذہین ہوتے ہیں وہی سماجی زینے کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچتے ہیں اور کُند ذہن لوگ نیچے کی سیڑھیوں پر رہ جاتے ہیں۔ ان حضرات کے طرزِ فکر میں دو بڑی خامیاں ہیں۔ اول یہ کہ اُن کے نزدیک ذہانت کی نشو و نما میں مواقع کی فراہمی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ دوم یہ کہ وہ سماج میں اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لئے ذہانت کے علاوہ اور تمام چیزوں کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ اس نظریے کی بنا پر ہی "ذہین" طلبہ کے لئے اعلیٰ اور لبرل تعلیم اور کُند ذہن طالب علموں کے لئے ابتدائی اور پیشہ ورانہ تعلیم تجویز کی جاتی ہے۔ گویا ذہن اور جسم دونوں میں کوئی باہمی تعلق نہیں ہے، جیسے ان میں سے ہر ایک کو الگ الگ ترقی دی جا سکتی ہے۔ یہ وہی فلسفہ ہے جو خیال کو عمل سے اور دماغ کو جسم سے جدا کرتا ہے اور اس طرح دونوں کو کمزور بناتا ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ دراصل یہ فلسفہ سماج کو دو حصّوں میں بانٹ دیتا ہے۔ ایک تو وہ، جو صرف دماغ سے کام لیتا ہے، جو صرف سوچتا اور غور و فکر کرتا ہے اور خیال کی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اپنے جسم سے کام لیتا ہے، جو محنت مشقت کرتا ہے اور انسانی زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اپنے لئے بھی اور دوسروں کے لئے بھی جو نقطۂ "خیال" کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔

عملاً ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ مادّی وسائل کے لحاظ سے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ تعلیم کے اچھے سے اچھے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی فطری ذہانت بڑھاتے ہیں۔ اس طرح "ذہانت" اعلیٰ سماجی مرتبہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک بُرا چکر قائم ہو جاتا ہے اور سماج اپنی بے ڈھنگی رفتار پر قائم رہتا ہے۔

ذہانت ایک ایسی خوبی ہے جس کا "سیکھنے" سے گہرا تعلق ہے۔ جب کوئی شخص اپنے ماحول کے ساتھ تعلقات قائم کرتا ہے تو ہر ایک تعلق سے اس کی جذباتی اور ذہنی زندگی پر کچھ اثرات

مرتب ہوتے ہیں ۔ یہ اثرات ایک مدت تک قائم رہتے ہیں اور اس دوران میں جب وہ شخص اپنے ماحول کے ساتھ کوئی نئے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے، تو ان اثرات کی وجہ سے اس کے ردِ عمل میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ عمل میں ذہانت کو پرکھنے کا یہی طریقہ ہے۔ لہذا یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ذہانت کوئی پیدائشی مستقل شے ہے جو ہمیشہ ایک ہی سطح پر قائم رہتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ذہانت ایک سماجی چیز ہے، جو عمل اور ردِ عمل کے ذریعے برابر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ذہانت کا کتنا حصہ موروثی ہے اور کتنا اکتسابی ۔ کتنا حصہ قدرت کا عطیہ ہے اور کتنا ماحول کی دین ہے ۔

ذہانت کے اس تصور کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسلوں اور سماجی طبقوں کی برتری اور کمتری کا انحصار پیدائشی صلاحیتوں کی فراوانی یا کوتاہی پر نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ وہ تاریخی حالات اور تہذیبی مواقع ہیں جو کسی نسل یا طبقے کے حصے میں آتے ہیں ۔ لہٰذا یہ مفروضہ کہ فطرت انسانی کو ایک خاص حد تک ہی بدلا جا سکتا ہے معلمین کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اُن حدود کو عبور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں ۔ دانشمندی اور دیانت داری کا تقاضا ہے کہ اس وقت تک کسی حد بندی کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے، جب تک کہ اس کو پار کرنے کی تمام کوششیں ناکام ثابت نہ ہو جائیں ۔

غزل

حضرت علی جواد زیدی

ہجومِ شوق میں ہم کوئے یار سے گزرے
نسیم جیسے دیارِ بہار سے گزرے

عجیب شرط پہ پایا صبا نے اذنِ خرام
گلوں تک آئے مگر نوکِ خار سے گزرے

رہِ وفا کی فضا میں نہ جانے کیا دیکھا
کہ وہ بھی آئے تو کچھ اشکبار سے گزرے

نہ جانے کانٹوں کے ہونٹوں پہ ہے لہو کس کا
رواں دواں تو ہمیں خارزار سے گزرے

دلوں تک آئے ہیں یادوں کے کارواں لیکن
دلوں کو چھوتے ہوئے نوکِ خار سے گزرے

سکھا گئے مجھے زیدی رموزِ بے باکی
جو حوصلے رہِ زنداں و دار سے گزرے

حالات حاضرہ

شام کی اُلجھنیں

۲۸ مارچ کو شامی فوج نے زمام اختیار ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں لے لی اور اخباروں نے سرخیاں لگائیں کہ "ناصرازم" کی جیت ہوئی، لیکن اس وقت سے لے کر اب تک شام کے سیاسی حالات جن نشیب و فراز سے گزرے ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صورت حال غیر مستحکم ہے، کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی اور محض امکانات سے متعلق قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔

گذشتہ سال ستمبر کے مہینے میں جو فوجی انقلاب ہوا تھا اُس کے پیچھے دائیں بازو کے رجحانات کام کر رہے تھے، اس لئے شامیوں نے متحدہ عرب جمہوریہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا، سوشلزم کی مذمت کی تھی اور ناصری اصلاحات جن کی ضرب جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام پر پڑتی تھی، معطل کر دی گئی تھیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ یہ انقلاب عرب نیشنلزم اور عرب سوشلزم دونوں رجحانات کے منافی تھا، خاصے جو پانچ سرمایہ دار خاندانوں کا جتھا ہے اور جو شام کی قومی دولت کے تقریباً چوتھائی حصے پر قابض ہے، اس انقلاب کا پُرجوش حامی تھا۔ اس انقلاب نے ناصر کی آرزوؤں کا خون کر دیا تھا لیکن انھوں نے اس صدمہ کو صبر و تحمل سے برداشت کیا اور اس کے لئے دنیا سے خراج تحسین وصول کیا، اس کے بعد کئی بار شام نے مصر سے فوجی اور سیاسی معاملات میں تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ناصر نے یہی جواب دیا کہ تعلقات کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو وہ اگر قائم ہو سکتے ہیں تو نظری اتحاد کی بنیادوں پر اور ایسے ہی تعلقات پائدار، مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں، ناصر کا یہ رد یہ حقیقت پسندی پر مبنی ہے (عرب سرمایہ داری اور عرب سوشلزم میں کیسے اتحاد ہو سکتا ہے) اس دوران میں عراق نے اس خلا کو پُر کرنا چاہا اور وہ شام سے زیادہ قریب آگیا، لیکن عراق کی دوستی کی بنیاد عرب نیشنلزم، عرب سوشلزم نہیں تھی بلکہ اس کے پیچھے تجارت، فوجی اور معاشی مصلحتیں تھیں، عراق کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو شام کی دوستی

بے اسے کچھ سیاسی فائدے حاصل ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شام ایک طرف تو معاشی اور تجارتی مصلحتوں کی بنا پر عراق کی طرف جھکا لیکن عراقی سیاست کے تقاضوں کی طرف سے چوکنا بھی رہا۔ اور جب اسرائیل کے مقابلہ کے لئے عراق نے فوجی امداد کی پیش کش کی تو شام نے اُسے خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔

شام اور مصر کا اتحاد اور اس کا اثر شامی تجارت و صنعت پر

میرے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے اور ہمیں کسی وقت اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مجموعی طور پر شام کا معیار زندگی دوسرے عرب ممالک سے بلند رہا ہے۔ شام کی خوشحالی کا راز اس کی تجارت میں ہے جس کا سلسلہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے، صدیوں تک کتنے تجارتی راستے یہاں سے گزرے ہیں اور تجارتی قافلوں نے مشرق و مغرب کا دولت کا ایک حصہ ہمیشہ شامیوں کے لئے شام کی منڈیوں میں چھوڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک ایسا طبقہ رہا ہے جسے شامیوں کی زندگی کے ہر شعبہ پر غلبہ حاصل تھا اور آج بھی ہے۔ محل وقوع کی خصوصیات اور تاریخی عوامل نے اہل شام کو مزاج، ذوق اور افتاد طبع کے اعتبار سے دوسرے عرب ممالک کے باشندوں اور (یہاں خاص طور پر) مصریوں سے بہت مختلف بنا دیا ہے۔ شام کو مصر کی طرف سے ہمیشہ فوجی اور سیاسی غلبہ کا اندیشہ بھی رہا ہے، وہ زراعتی مصر کی سیاسی برتری کو جہاں بڑھتی ہوئی آبادی نے عرصے سے ایک نازک مسئلہ کی صورت اختیار کر رکھی ہے، اپنی سیاسی آزادی اور معاشی خوشحالی کے حق میں مضرت رساں تصوّر کرتا رہا ہے۔

شام نے اپنے اندرونی سیاسی اضطراب سے بچنے کے لئے جب مصر کی طرف اتحاد و دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور مصر نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور متحدہ عرب جمہوریہ قائم ہوئی تو دیکھنے والی نظریں اس اتحاد کا داخلی تضاد دیکھ رہی تھیں، خود بعث پارٹی نے جسے اس اتحاد کا بانی کہہ سکتے ہیں، متوقع اشتراکی انقلاب سے خائف ہو کر یہ قدم اٹھایا تھا، خیال یہ ہے کہ وہ ناصری طرز کی عرب سوشلزم پا ور وہ بھی مصر کی قیادت میں، پورا اعتماد نہیں رکھتی تھی، اس کا اقدام منفی اقدام تھا جس کی پائداری شروع ہی سے مشتبہ تھی۔ بہرحال جب شام اور مصر کا اتحاد عمل میں

آیا تو اس سے شام کی تجارت پر بُرا اثر پڑا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شام کی تجارت کا بہت بڑا حصہ ترکی، عراق اور اردن سے وابستہ تھا، اور ان تینوں ملکوں سے مصر کے تعلقات بہت خراب تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملکوں سے شام کی تجارت تقریباً بند ہوگئی اور شام کے تاجروں، صناعوں اور اُن تمام لوگوں کو جو ان سے وابستہ تھے سخت قسم کی معاشی دشواریوں کا سامنا ہوا، شامی سرمایہ پر کاری ضرب لگی ہیں فوری طور پر عرب اتحاد کے پُرشور نعروں اور پُرجوش مظاہروں نے اس دشواری کو زیادہ محسوس نہیں ہونے دیا، اس اثنا میں مصریوں کی ایک بڑی جماعت شام میں منتقل ہوگئی اور مختلف پیشوں میں شامیوں کے ساتھ مصری بھی نظر آنے لگے، مزاج کے اعتبار سے مصری سہل پسند، تن آسان اور خوش باش ہوتے ہیں، اہل شام اس کی ضد ہیں چنانچہ پہلے ذوق و افتادِ طبع کی سطح پر اور پھر معاشی سطح پر ٹکراؤ محسوس کیا جانے لگا، لیکن دوسری طرف ناصری اصلاحات سے یہ امیدیں تھیں کہ جلد ہی صورت حال سنبھل جائے گی اور زیادہ سے زیادہ شامیوں کو فائدہ پہنچے گا، ناصر نے ایک سیاسی غلطی یہ کی شامی فوج کو مصر بلایا، نہیں اور دوسری طرف شامی کرنسی کو جوں کا توں رہنے دیا، ناصر نے یہ بھی محسوس کیا کہ شام کے عوام چونکہ اس کے ساتھ ہوں گے اس لئے کسی فوجی انقلاب کا خطرہ نہیں، لیکن حمایت اور دوسرے مفاد پرست عناصر کی قوتوں کا انھوں نے غلط اندازہ کیا اور اس حقیقت کو وہ فراموش کر بیٹھے کہ یہ عناصر باہر کے ناصر دشمن عناصر سے گٹھ جوڑ کر کے کسی وقت بھی صورت حال کو بدل دے سکتے ہیں۔

چنانچہ ستمبر ۱۹۶۱ء کا فوجی انقلاب سرمایہ داری نظام کی فتح تھی، اس انقلاب سے ناصر کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے مصری سرمایہ داروں کی طاقت کم کرنے کا پروگرام شروع کیا، ناصری اصلاحات کے نتائج شام میں ابھی بار آور نہیں ہوئے تھے لیکن ایک اندازہ ہوگیا تھا کہ ان اصلاحات سے غریب مزدوروں، کسانوں اور نچلے متوسط طبقہ والوں کو بہت فائدہ ہوگا، ناصر کو یہ امید تھی کہ جب شامی عوام کو اس بات کا احساس ہوگا تو وہ اپنے ملک کی رجعت پرست طاقتوں کے مقابلہ میں منظم ہوجائیں گے، یہ امید آج بھی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ۲۸ مارچ کے فوجی انقلاب سے اس امید کی نشان دہی ہوتی تھی، لیکن اس امید کی بنیاد ابھی کمزور ہے اور عرب سوشلزم کا تصوّر

اہل شام کے ذہنوں میں صاف نہیں ہے، ۲۸ مارچ سے لے کر اب تک جو رجحانات سامنے آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک ان رجحانات میں کوئی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی، یا کوئی ایک رجحان اتنا مقبول نہیں ہو جاتا کہ دوسرے رجحانوں کا زور دب جائے۔ شام میں سیاسی استحکام ممکن نہیں۔ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت شامی فوج میں اور اسی طرح اہل شام میں واضح طور پر تین طرح کے رجحانات کام کر رہے ہیں۔

۱۔ رجعت پرست قوتیں جو تجارت و صنعت میں ریاست کی مداخلت کو ناپسند کرتی ہیں اور مصر سے اتحاد کی، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی ہو، شدید مخالف ہیں۔

۲۔ بائیں بازو کی قوتیں جو مصر سے اتحاد کی خواہاں تو ہیں لیکن کسی متحدہ عرب جمہوریہ میں شام کے ادغام کی مخالف ہیں۔

۳۔ بائیں بازو کی وہ قوتیں جو عرب اتحاد اور عرب سوشلزم کی حامی ہیں اور عرب نیشنلزم کے نام پر مصر سے اس طرح متحد ہونا چاہتی ہیں کہ "من و تو" کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

جن لوگوں نے ۲۸ مارچ سے لے کر ۱۴ اپریل تک کے اخبارات پڑھے ہیں اور جن کی نظر شام کے واقعات پر رہی ہے انھیں معلوم ہوگا کہ ان رجحانات کا تصادم اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ شام میں خانہ جنگی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس بار پہلی مرتبہ یہ بات صاف ہو کر سامنے آگئی کہ شامی فوج میں نظریاتی یکجہتی نہیں، حلب، حمص اور لطاکیہ وغیرہ شہروں میں مصر اور شام کے اتحاد کے حق میں جو مظاہرے ہوئے اور جس طرح شہریوں، پولیس اور فوج کے ایک خاص عنصر کا اتحاد فکر ثابت ہوا اس میں ناصر کی معمولی سی ہمت افزائی یا کسی طرح کی فوجی امداد شام کو خانہ جنگی میں مبتلا کر سکتی تھی لیکن ناصر نے ایک بار پھر تدبر اور سیاسی ہوش مندی کا ثبوت دیا اور شام کے معاملات میں اگرچہ حلب کے "آزاد فوجی افسروں" کی طرف سے امداد طلب کی گئی، کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، کہا جاتا ہے کہ ناصر نے حلب کے اس فوجی عنصر کی جلد بازی اور ناتجربہ کاری کو پسند نہیں کیا، ناصر کو اس کا تجربہ ہے کہ اس کے نوجوان، بے صبر اور جوشیلے حامی ان کے اتنے ہی مخالف ہیں جتنے کہ چالاک رجعت پرست دشمن، بیرونی امداد سے مایوس ہو کر اور دمشق کے ہائی کمان کی طاقت کا اندازہ کر کے حلب والوں نے سمجھوتہ

کرلیا اور حمص میں جاکر اس شرط پر ہتھیار ڈال دئے کہ جلد ہی ملک میں ریفرنڈم کیا جائے کہ اہل شام مصر سے اتحاد چاہتے ہیں یا نہیں، پھر ایک نئے فوجی ہائی کمان کی تشکیل ہوئی اچھے سات فوجی افسر جو ۲۸ مارچ کے انقلاب میں پیش پیش تھے شام چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ جانے پر مجبور ہوئے، نئے ہائی کمان کی پالیسی مبہم اور بعض باتوں میں متضاد ہے اور اب ایک ہفتہ سے اس ریفرنڈم کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا جس کا تصفیہ حمص کی فوجی کانفرنس میں ہوا تھا، نیا ہائی کمان دستور سازی کی باتیں کرتا ہے اور جمہوری نظام کی تشکیل کا یقین دلاتا ہے دوسری طرف مزدوروں اور کسانوں کے مفاد کا نام بھی لیتا ہے اور لوٹ کھسوٹ کرنے والی طاقتوں کو انتباہ دیتا ہے۔ ۱۳ اپریل کی خبر ہے کہ ناظم قدسی جو اس انقلاب سے پہلے صدر تھے، اب پھر صدر بنادئے گئے ہیں لیکن اب تک یہ بات صاف نہیں ہے کہ کیا حقیقی اقتدار و اختیار انھیں سونپا گیا ہے یا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ ابھی سیاسی صورت حال میں استحکام کی صورت نہیں پیدا ہوئی ہے، اس لئے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کل کیا ہوگا اور شام اپنی آزمائشوں سے کس طرح عہدہ برا ہوگا۔

شام اور اسرائیل

پچھلے دنوں شام اور اسرائیل میں زبردست فوجی جھڑپ ہوئی، یہاں تک کہ اسرائیل کو ہوائی طاقت کا استعمال کرنا پڑا، اس معرکے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسرائیل اس بات پر تلا ہوا ہے کہ وہ اپنے سائنٹفک وسائل سے فائدہ اٹھاکر دریائے اردن کے پانی کے ایک معتدبہ حصہ سے اپنے علاقے کے صحرا کو سیراب کرے۔ کیونکہ بغیر اس کے غذائی لحاظ سے وہ خود مکتفی نہیں ہوسکتا، اس کے لئے عرصہ سے وہ ایک اسکیم پر کام کرتا رہا ہے اور لاکھوں روپیہ صرف کرچکا ہے، یہ منصوبہ تقریباً مکمل ہوچکا ہے، اس کی کامیابی و ناکامی اس کے لئے ایک اہم مسئلہ ہے اور دریائے اردن کا پانی اس کے لئے آب حیات سے کم نہیں، طبرس کی جھیل اس دریا کا منبع ہے جو شام کی سرحد سے بھی ملتی ہے اور جہاں پانی کو پمپ آؤٹ کرنے کے لئے اس نے مشینیں نصب کی ہیں، اس کے ٹھیک مقابل میں پہاڑیوں پر شام کی توپیں نصب ہیں، یعنی شام کسی وقت بھی اسرائیل کے اس منبع حیات کو تباہ و برباد کرسکتا ہے، لیکن دوسری طرف اس کے معنی ایک عمومی جنگ کے ہوں گے اور

اگر شام تنہا میدان میں رہتا ہے تو اسرائیل کی فوجی طاقت اتنی ہے کہ اسرائیلی فوجیں آٹھ گھنٹے میں دمشق پہنچ سکتی ہیں۔ عربوں کے نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ان کے لئے اسرائیل کا یہ منصوبہ سیاسی اور معاشی دونوں نقطۂ نظر سے مہلک ہے۔ دریائے اردن کا پانی کم کرنے سے یہ ہوگا کہ اردن کا ایک بہت بڑا علاقہ بنجر ہو جائے گا اور لاکھوں فلاح تباہ ہو جائیں گے، عربوں نے اگر اپنی تباہی خاموشی سے برداشت کرلی تو سیاسی اعتبار سے ان کی حکومتوں کی کمزوری ایک بار پھر عیاں ہو جائے گی دوسری طرف اسرائیل کو معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ سیاسی فتح بھی حاصل ہوگی، الغرض دریائے اردن کے پانی کا مسئلہ عربوں اور اسرائیلیوں دونوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے

عرب اتحاد، عرب نیشنلزم، عربوں کے درمیان ایک ریاست کا وجود جو بیرونی مداخلت اور سیاسی و معاشی استعمار کی ایجنٹ ثابت ہو چکی ہے، جس کا قیام بے شمار عربوں کی موت اور تباہی کا رہین منت ہے، اور جو توسیعی منصوبے رکھتی ہے ــــ ان حقائق کے پیش نظر عرب ریاستیں اپنے باہمی اختلافات کے باوجود اس بات پر آمادہ معلوم ہوتی ہیں کہ اسرائیل کو وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کریں گی، یہی وجہ ہے کہ شام اپنے اردنی بھائیوں کی مدد کے لئے ہر طرح تیار ہے اور شام اور اسرائیل کی جھڑپ کے بعد عراق، مصر، اردن، سعودی عرب ــ یہاں تک کہ عرب لیگ نے اجتماعی طور پر یہ کہہ دیا کہ شام پر اگر اسرائیل کا حملہ ہوا تو یہ حملہ پوری عرب دنیا پر ہوگا۔ لیکن عرب دنیا کہاں تک اس یکجہتی کا عملی ثبوت دے گی، سخن درین است! یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ عرب ملکوں میں، خاص طور سے ان کے حکمراں طبقوں میں باہم دگر جو اختلاف، حسد اور نفرت ہے، وہ عالم آشکارا ہے، دوست اس پر گریہ کناں ہیں اور دشمن خندہ زن، چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۲ء کے "پوسٹ" (امریکہ) میں اس کا خاکہ یوں اڑایا گیا ہے:۔

"ایک بچھو دریائے نیل پار کرنا چاہتا تھا، اس نے مینڈک سے کہا کہ اپنی پیٹھ پر سوار کرکے مجھے اُس پار پہنچا دو، مینڈک راضی نہ ہوا، اس نے کہا "نہیں بھائی، بیچ دھارے میں پہنچ کر تم ڈنک مار دوگے اور میں ڈوب جاؤں گا۔" "تم کتنی غیر منطقی بات کہہ رہے ہو" ــــ بچھو بولا ــــ "اگر میں تمہارے ڈنک مار دوں گا تو کیا خود بھی نہ ڈوب جاؤں گا۔" چنانچہ

مینڈک بیمار ہو گیا اور بچھو اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ آدھی دور پہنچ کر بچھو نے ڈنک مارا۔"
میں نے پہلے ہی کہا تھا" — مینڈک چیخا — "تم نے ہم دونوں کو مار ڈالا، اس میں بھلا
کیا منطق ہو سکتی ہے؟" "یہاں منطق کی کون پروا کرتا ہے؟" ڈوبتے ہوئے بچھو نے
جواب دیا — "یہ مشرق وسطیٰ ہے!"

اسرائیل، فرانس — اور الجزائر

الجزائر اور فرانس میں معاہدہ ہو گیا، اور الجزائر کے مجاہدین سات سال سے آزادی کی جو لڑائی
لڑ رہے تھے وہ بند ہو گئی، اس صدی میں کسی محکوم قوم نے اپنے بدیسی دشمن کے خلاف اتنے طویل
عرصہ تک ایسی شاندار جنگِ آزادی نہیں لڑی ہے کیا عزم اور کتنا یقین رہا ہے الجزائری قوم کو اپنے
مقصد کی سچائی پر اس کی ترجمانی سرفروشانِ الجزائر سے خطاب کرتے ہوئے تاآزش پرتاپ گڑھی نے یوں کی ہے

تمہارا ذوقِ نظر کام کر گیا آخر | لہو کے داغ مہکتے ہوئے گلاب بنے
زمانہ دیکھ رہا ہے کہ الجزائر میں | زمیں کے ذرّے جو ابھرے تو آفتاب بنے

جب جنگ بندی سے متعلق یہ معاہدہ ہوا تو اگرچہ ہم نے دیگال کو سراہا اور اس کی
مصلحت اندیش جرأت کو داد دی، لیکن یہ شبہ بھی تھا کہ نہ معلوم صدر جمہوریہ فرانس نے یہ معاہدہ
الجزائری قوم پرستوں سے کیا ہے یا خفیہ فوجی تنظیم (OAS) سے، لیکن بعد کے واقعات سے
یہ ثابت ہو گیا ہے کہ دیگال کی نیت صاف ہے اور واقعی اُس نے الجزائریوں کے حکومت خود مختاری
کو تسلیم کر کے فرانسیسی قوم کی ترجمانی کی ہے، الجزائر کے بڑے شہروں میں جہاں یورپینوں کی خاصی
تعداد ہے۔ OAS کے ہاتھوں اگرچہ آگ اور خون کا بازار گرم ہے اور ایسی صورت حال پیدا کرنے
کی کوشش کی جا رہی ہے کہ الجزائری مسلمان مشتعل ہوں اور انتقام کی مہم شروع کریں، تاکہ
فرانسیسی فوج کی ہمدردیاں یوروپینوں کے ساتھ ہو جائیں اور الجزائر میں خانہ جنگی شروع ہو جائے
لیکن حیرت ہے قومی تحریک کے اُس ہمہ گیر اثر پر جو اُسے ایک ایک الجزائری مسلمان پر خواہ وہ
نوجوان ہو یا بوڑھا، حاصل ہے اور لائق صد تحسین ہے وہ ڈسپلن جو الجزائر کی پوری قوم میں پائی جاتی
ہے کہ OAS کو آج تک اپنے اس منصوبہ میں کامیابی نہیں حاصل ہو سکی ہے، الجزائر میں جو عارضی

انتظامیہ قائم ہوئی ہے اس کا چیئرمین ایک مسلمان عبدالرحمن فارس ہے، انتظامیہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس مقامی فوج کا کمانڈر ایک مسلمان ہی ہے جس پر استصواب رائے تک الجزائر میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی ذمہ داری ہوگی، الجزائر میں صدر دیگال کا نمائندہ موسیو کرسچین فوشے ایک دیانت دار اور جری شخص ہے، چنانچہ باب الوادی اور اوران میں OAS پر جو کچھ گزری ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دیگال اس خفیہ تنظیم سے نپٹنا چاہتا ہے۔

الجزائر کی آزادی سے یورپ، بحیرۂ روم اور شمالی افریقہ کی سیاست پر جو اثر پڑے گا اس کے آثار ابھی سے ظاہر ہونے لگے ہیں، لیکن عربوں کے نقطۂ نظر سے اس کا جو اثر اسرائیل اور فرانس کی دوستی پر پڑے گا وہ دلچسپ اور لائق توجہ ہے۔ جن لوگوں کی نظر رفتار عالم پر رہتی ہے انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ۱۹۵۴ء سے لے کر اب تک فرانس نے اسرائیلوں کے کاز کو اپنا کاز بنا رکھا تھا، اسرائیل کو تقریباً سارے فوجی اسلحے اور ساز و سامان فرانس ہی فراہم کرتا تھا، ۱۹۵۶ء میں جب اسرائیل نے سینائی کے صحرا میں پیش قدمی کی تو یہ فرانسیسی ہوائی جہاز ہی تھے جو نہر سوئز کی طرف بڑھنے والی فوج کی حفاظت فضا میں کر رہے تھے، اور مصر کے متوقع جوابی حملہ کی صورت میں اسرائیل کی سرحدوں، شہروں اور فوجی اڈوں کے دفاع کے لئے تیار تھے، الغرض عرب دشمنی میں فرانس اسرائیل سے کسی طرح کم نہیں تھا، سبب یہ تھا کہ صدر ناصر نے اپنی استطاعت کے مطابق الجزائری جانبازوں کی امداد کے لئے اپنے آپ کو، پوری مصری قوم کو اور عرب قومیت کی پوری تحریک کو وقف کر رکھا تھا، لیکن اب الجزائر میں جنگ بندی معاہدہ کے بعد فرانس اور عرب ریاستوں میں سمجھوتے اور اشتراک کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں، اس سلسلہ میں یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ پچھلے دنوں طبریہ کی جھیل کے واقعہ سے متعلق شام کی شکایت پر سیکیورٹی کونسل میں جو مباحثہ ہوا اس میں فرانسیسی نمائندے نے بڑی محتاط اور نپی تلی تقریر کی، اس کے علاوہ عربوں کی طرف سے محتاط خیر سگالی کا یہ مظاہرہ ہوا کہ قاہرہ میں جاسوسی کے الزام میں جن فرانسیسی افسروں پر مقدمہ چل رہا تھا وہ رہا کر دیئے گئے، کہا جاتا ہے کہ مصر نے بن بیلا کے کہنے پر یہ اقدام کیا ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود صدر ناصر نے الجزائر میں فرانس کی نئی پالیسی کا خیر مقدم فرانسیسی قیدیوں

کی رہائی سے کیا ہو، بہرحال فرانس اور عرب ریاستوں کی طرف سے اس قسم کے جذبہ کا اظہار اسرائیل کے لئے پریشانی کا سبب بن گیا ہے، عرب ملکوں میں یہ بات کھلم کھلا اور زور دے کر کہی جا رہی ہے کہ فرانس کو اسرائیل سے دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہیئے اور لبنان کو چاہیئے کہ وہ عرب لیگ کے ممبر کی حیثیت سے فرانس سے اپنے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی تعلقات کا فائدہ اٹھائے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت لبنان ہی ایسا ملک ہے جو عربوں اور فرانسیسیوں کو ایک دوسرے سے قریب لا سکتا ہے۔

بنگلہ کے لئے نیا رسم الخط

مارچ کے آخری دنوں میں ایک پریس کانفرنس میں ایک اخبار نویس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا اردو اور بنگلہ کے لئے ایک مشترک رسم الخط اختیار کرنے سے پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد ملے گی، صدر ایوب نے کہا کہ "اگر آپ مجھ سے پوچھیں اور اگر میں مشرقی پاکستان کا باشندہ ہوتا تو کلکتہ کی گرفت اور اس کے تمدنی اثر سے آزادی حاصل کرنے کے لئے میں بنگالی رسم الخط بدل ڈالتا، اس سے مشرقی پاکستان کے باشندوں کو ہندو تمدن اور دوسرے طرز کے دباؤ سے زبردست نفسیاتی آزادی حاصل ہو جائے گی"۔ یہ خبر اور صدر ایوب کا یہ خیال اس لحاظ سے اہم اور دلچسپ ہے کہ ہمارے اپنے دیس میں ہم آہنگی INTEGRATION کے سلسلے میں اسی طرح کی باتیں کہی گئیں اور کہی جا رہی ہیں اور مشترک رسم الخط کی بات تو سرکاری حلقہ کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے بھی پرزور لہجہ میں کہی گئی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس خیال میں بڑی جان ہے، اور یہ فکر اپنے اندر وزن رکھتا ہے نیشنلزم کے تصور کو مشترک رسم الخط سے بڑی تقویت ملتی ہے اور جذباتی ہم آہنگی کا امکان بہت قوی ہو جاتا ہے، کوئی قوم یا کسی قوم کا کوئی طبقہ اگر اپنے ماضی سے جسے وہ اپنی تاریخ کا تاریک دور یا الیاد ور جس پر فخر نہیں کیا جا سکتا اپنا رشتہ توڑنا چاہے تو وہ اپنی زبان کا رسم الخط بدل دے، بہت بڑی حد تک اس کا مقصد پورا ہو جائے گا، جدید ترکی کی نظیر ہمارے سامنے ہے، ترکی کی نئی نسل اپنی تاریخ کے اسلامی دور اور اس کے کارناموں سے بے خبر ہے، اسلامی دنیا کے افکار و خیالات سے بھی وہ بے نیاز ہے، ترکی سے کے

قوم پرستوں نے اپنا رسم الخط بدلا، اور انھیں اس میں زیادہ دشواری نہیں پیش آئی، ایک چھوٹے ملک میں جہاں ایک ہی مذہب کے لوگ رہتے ہوں اور جہاں صرف ایک زبان ہو یہ کام کسی قدر آسان ہوتا ہے لیکن ہندوستان ایسے عظیم ملک میں جہاں مختلف زبانیں ہیں، مختلف مذاہب ہیں، مختلف مذہبی و لسانی اقلیتیں ہیں، یا پاکستان ایسے ملک میں جس کے دونوں حصے ایک دوسرے سے صرف یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے سینکڑوں میل دور ہیں بلکہ لسانی اور تہذیبی مزاج اور افتاد طبع اور تاریخی خصوصیات کے اعتبار سے بھی دور اور بہت دور ہیں، یہ کام بہت دشوار اور انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اندھی قوم پرستی سے مغلوب ہو کر ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ تنوع میں بھی ایک حسن ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اس حسن کی مٹی خراب کی جائے، کیا دنیا میں اس کی مثالیں نہیں ملتیں جہاں تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کو برقرار رکھا گیا ہے اور اس کے باوجود سیاسی اتحاد قائم ہے، اردو والوں کا جو جذباتی تعلق عربی رسم الخط سے ہے اس سے کہیں زیادہ بنگال والوں کو بنگلہ رسم الخط سے ہے، بنگلہ میں ایک پرمغز اور جاندار لٹریچر ہے، بنگال والے بنگلہ کو نہیں چھوڑ سکتے، صدر ایوب کو یاد ہوگا کہ جب ایک مرتبہ پاکستان کی زبان اردو تسلیم کر لی گئی تھی تو ایک لاکھ سے زیادہ آدمی "ناظم الدین حکومت مردہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے اور ناظم الدین کو کراچی جا کر یہ حکم منسوخ کرانا پڑا تھا، سید سلیمان ندوی مرحوم کے ساتھ اس سلسلہ میں جو ناروا سلوک ڈھاکہ میں کیا گیا تھا، وہ بھی صدر موصوف کو یاد رکھنا چاہیئے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے واقعات ہر اس جماعت کو یاد رکھنے چاہئیں جو طاقت کے بل بوتے پر کسی زبان یا اس کے رسم الخط کو بدلنے کا خیال کرے۔

ض، ح، ف

۱۴ را پریل ۱۹۶۲ء

توسیعی پروگرام

مارچ کے شمارے میں اساتذہ کی تربیت سے متعلق دولت مشترکہ کی سرگرمیوں کا اجمالی طور پر جائزہ لیتے ہوئے تیسرے قومی منصوبے کے دوران میں مختلف نوعیت کے اساتذہ کی ضرورت اور فراہمی کے امکانات و اقدامات پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی تھی۔ لیکن اساتذہ کی تربیت کا مسئلہ محض تعداد کا معاملہ نہیں ہے بلکہ استعداد کا سوال بھی ہے مختلف مدارج پر مخصوص علوم وفنون اور حرفوں کے واسطے نئے اساتذہ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ برسرِ کار اساتذہ کی اہلیت اور واقفیت میں اضافہ بھی ضروری ہے۔ علم نہ صرف ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے بلکہ ہر دم رواں دواں بھی ہے۔ اگر اساتذہ کو ایک مرتبہ تربیت دینے کے بعد یہ باب ہمیشہ کے لئے تمت بالخیر کر دیا جائے تو یہ رویّہ نہ صرف کم مائگی پر دلالت کرے گا بلکہ اساتذہ دقیانوس بھی ہو کر رہ جائیں گے۔ انفرادی طور پر ممکن ہے کہ چند ہوشمند وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کرتے رہیں لیکن جماعتی حیثیت سے پوری برادری یقیناً پچھڑ جائے گی۔ اُن کی محدود واقفیت سے اک نغمہ تر یہ صبح گاہی' ہونے کے امکانات بھی معدوم ہو جائیں گے اور ممکن ہے کہ اپنی فرسودگی کی بنا پر گمراہ کن ثابت ہو۔ آزادی کے تقاضوں نے ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں عملِ پیہم کی دعوت دی۔ تعلیم کا منصب سب سے مقدم ٹھیرا۔ ابھی تک اساتذہ کے تربیتی اداروں میں بندھے ٹکے نظام کے ماتحت نئے اساتذہ میانہ روی کے ساتھ ڈھل کر نکل رہے تھے۔ ان کی رفتار سست تھی اور معیار پست۔ اس صورت میں کسی قدر خانہ پری تو ضرور ہو رہی تھی لیکن ایک جمہوری مملکت کے لئے شہری تیار کرنے والوں کا یہ سطحی معیار، پرانی معلومات اور ناعاقبت اندیشانہ کردار کسی طور بھی انھیں اپنے فرائض سے عہدہ برآ کرانے کے لائق نہ تھا۔ اس لئے پہلے قومی منصوبے کے اختتام پر ہی اساتذہ کی تربیت کے توسیعی

پروگرام کی طرف توجہ کی گئی۔ آج توسیعی پروگرام کی اصطلاح کلیتاً غیر مانوس نہیں رہی ہے۔ اس پروگرام کے تحت دوران ملازمت میں اساتذہ کی مزید تربیت کا کام آتا ہے تاکہ اساتذہ اپنے آپ کو اپنے منصب کے لائق رکھ سکیں۔ ان کا علم تازہ رہے۔ وہ تعلیمی دنیا کے نئے رجحانات اور میلانات سے آگاہ رہیں۔ خود بھی جلا پائیں اور نونہالانِ وطن کو بھی روشنی بخشیں۔ اس کام کی ذمہ داری سپرد کرنے کے لئے اساتذہ کے تربیتی اداروں کے علاوہ اور کون موزوں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ ادارے ہی مدارس کے نبض شناس ہوتے ہیں اور انھیں اپنی ذمہ داری نباہنے کے لئے مدرسوں سے لین دین مسلسل طور پر رکھنا پڑتا ہے۔ ادھر ایک عرصے سے یہ تربیتی ادارے بہت کچھ الگ تھلگ رہ کر اپنا رہنے لگے تھے اور اس بنا پر وہ ایک جسدِ بے روح ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں ثانوی تعلیم کے کمیشن نے یہ بات واضح طور پر کہی تھی کہ اساتذہ کی تربیت کا انتظام خواہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو وہ بجائے خود اعلیٰ معیار کے استاد فراہم نہیں کر سکتا۔ اساتذہ کی اہلیت میں صرف اسی وقت اضافہ ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے تجربے کا خود بینی و خود آگاہی کے ساتھ برابر تجزیہ کرتے رہیں۔ اس بنا پر ثانوی مدارس کے کمیشن نے اساتذہ کی تمام و کمال تربیت کی ذمہ داری، تربیتی اداروں کے سر ہی رکھی تھی۔

مرکزی حکومت نے ۱۹۵۵ء میں منتخب تربیتی اداروں میں توسیعی پروگرام کے مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ضروری سامان، مناسب رہنمائی، اور معقول مالی امداد کی فراہمی میں امریکا کے فورڈ فاؤنڈیشن، اور 'ٹیکنیکل کوآپریشن مشن' کی بروقت اعانت سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جا سکا اسی سال توسیعی پروگرام کے تئیس مرکز قائم کئے گئے۔ ان میں سے ایک جامعہ ملیہ اسلامیہ کا استادوں کا مدرسہ بھی تھا۔ دو سال بعد اکتیس مرکز اور بڑھائے گئے۔ مرکزوں کا انتخاب تربیتی اداروں کی اہلیت اور حلقۂ اثر کے پیش نظر کیا گیا تھا۔ انتظامی سہولتوں کی خاطر تمام مرکز پانچ حلقوں میں تقسیم کئے گئے۔ ہمارے ملک میں تین طرح کے تربیتی ادارے قائم ہیں۔ سرکاری، غیر سرکاری اور یونیورسٹی کے تحت۔ موجودہ چون مرکزوں میں تیس سرکاری اور چودہ غیر سرکاری اداروں سے منسلک ہیں۔ اور دس مختلف یونیورسٹیوں کے شعبہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ ہر ایک توسیعی مرکز کا انتظام

اپنے سرپرست ادارے کے سپرد ہے۔ اس اسکیم کے ابتدائی زمانے میں توسیعی پروگرام کے تمام مرکز ثانوی تعلیم کی کل ہند کونسل کے تحت کام کرتے تھے۔ یہ ادارہ تمام مالی امداد فراہم کرتا، تمام مرکزوں کی سرگرمیوں میں وحدتِ کار کی گنجائشیں نکالتا اور عام رہنمائی کے فرائض پورے کرتا۔ اپریل ۱۹۵۹ء میں اس ادارے کی از سرِ نو تشکیل کردی گئی اور اب یہ تمام امورِ ثانوی تعلیم کی ڈائرکٹریٹ آف ایکسٹینشن پروگرام کے تحت آ گئے ہیں۔ یہ ادارہ گزشتہ سال تک مرکزی وزارت تعلیم کے ماتحت تھا۔ اس نئے نظام میں توسیعی پروگرام کے مرکزوں کی تنظیمی ذمہ داروں کو سنبھالنا دشوار تھا۔ لہٰذا متعلقہ اداروں کو ہی براہِ راست انتظامی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ تاہم مالی کفالت اس وقت بھی مرکزی حکومت کے ذمہ رہی۔

امسال یہ ڈائرکیٹ پھر ایک آزاد ادارے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ افسرِ اعلیٰ اپنے یہاں کے شعبہ توسیعی پروگرام کا اعزازی ڈائرکٹر ہوتا ہے۔ وہ تمام کام کی رہنمائی اور نگرانی کا ذمہ دار ہے۔ ہر مرکز میں ایک کوارڈ نیٹر ہوتا ہے جو اس پروگرام کے روحِ رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تمام مشاغل کی تنظیم، ان کی تشکیل اور تعمیل کرتا ہے۔ وہ تربیتی ادارے، مدارس اور محکمہ تعلیم کے مابین اشتراکِ عمل کی راہیں استوار کرتا ہے۔ کوارڈینیٹر کے علاوہ ہر ایک مرکز کا ایک مختصر دفتری عملہ ہوتا ہے۔ ہر ایک مرکز میں کتابوں، توضیحی سامان، اور جیپ یا اسٹیشن ویگن پر مشتمل تقریباً ایک لاکھ روپے کی مالیت کا سامان امریکا کے ٹیکنیکل کوآپریشن مشن، کی اعانت سے وصول ہوا ہے۔ سرپرست ادارے سے اپنے مرکز کو دفتر فراہم کرنے کی توقع کی جاتی ہے اور ریاستی سرکار سے درخواست کی جاتی ہے کہ پانچ ہزار روپے سالانہ کتابوں کے اضافے کے لئے مہیا کرے۔ اب تک تمام اخراجات مرکزی حکومت نے فورڈ فاؤنڈیشن سے حاصل شدہ امداد کی رقم سے پورے کئے ہیں۔ ہر ایک مرکز کے سالانہ اخراجات کے لئے تقریباً بیس ہزار روپے کی رقم فراہم کی جاتی ہے۔

مزید برآں ہر ایک ریاست سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ چھے ہزار روپے سالانہ مختلف مشاغل میں شرکت کرنے والے اساتذہ کے خرچ اور اس سلسلے کے دوسرے مصارف کے

لئے عنایت کرے گی۔ ابتدا میں ہر ایک مرکز کا دائرہ عمل پچاس کے قریب ثانوی مدارس تجویز ہوئے تھے۔ لیکن اسکیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ مرکزوں کا اپنا دامن بھی وسیع ہوتا گیا ہے اور اب بعض ریاستوں میں سب ہی ثانوی مدارس کسی نہ کسی مرکز سے منسلک کر دئے گئے ہیں۔ یوں تیرہ فیصدی سے لے کر چھیانوے فیصدی مدارس تک مختلف ریاستوں میں ان مرکزوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

توسیعی پروگرام میں متنوع مشاغل شامل ہیں۔ مختصر اور طویل عادی نصاب کا انتظام کیا جاتا ہے سیمینار ہوتے ہیں۔ کانفرنس بلائی جاتی ہے۔ کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ ورکشاپ، کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ آپس میں تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ تعلیمی مطالعہ کے لئے حلقے اور کلب قائم کئے جاتے ہیں۔ مشاورتی کمیٹیاں بلائی جاتی ہیں۔ توضیحی سامان کا استعمال سکھایا جاتا ہے اور اس کے ذریعے تدریس کو بہتر اور موثر بنانے کے گُر بتلائے جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر واقفیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے اور تعلیم کے نئے طریقوں اور تجربوں سے روشناس کرانے کے لئے کتب فراہم کی جاتی ہیں، ماہرین فن سے تقاریر کرائی جاتی ہیں اور نمونے کے سبق پڑھا کر دکھائے جاتے ہیں۔ تعلیمی نمائشیں کی جاتی ہیں اور معلوماتی کتابچے شائع کئے جاتے ہیں۔ توسیعی پروگرام کے مرکز اپنے متعلقہ مدارس کی خواہش اور ضرورت کے مطابق اس نوعیت کے کام کیا کرتے ہیں ہر ایک مرکز کی ایک مشاورتی کمیٹی بھی ہوتی ہے جو سرپرست ادارے کے افسر اعلیٰ کے علاوہ ریاست کے محکمہ تعلیم، مدارس اور تربیتی ادارے کے اساتذہ اور دیگر تعلیمی حلقوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مرکزی ڈائرکٹریٹ میں ماہرین فن کا ایک عملہ بھی موجود ہے جو ضرورت کے مطابق مرکزوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ہر سال ڈائرکٹریٹ کی طرف سے سال بھر کے کام کا جائزہ لینے اور نئے نئے مشاغل پر غور کرنے کی غرض سے تمام مرکزوں کے اعزازی ڈائرکٹر اور کوارڈی نیٹر صاحبان کی ایک کانفرنس منعقد کی جاتی ہے۔ امسال یہ کانفرنس مارچ کے تیسرے ہفتے میں دہلی میں بلائی گئی۔ امید ہے کہ اس کانفرنس سے کچھ مفید نتائج برآمد ہوں گے۔

توسیعی پروگرام کے پھیلنے سے یہ اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ تعلیمی حلقے اسے مفید سمجھتے ہیں لیکن اس کی افادیت کے بارے میں ابھی شواہد نہیں ملتے۔ یہ پروگرام اس وقت اپنی شیر خوارگی

کارنامہ طے کر رہا ہے اور اس عہد کی تمام مشکلات سے دوچار ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ ابھی ہمارے اساتذہ یہ نہیں محسوس کرتے کہ یہ ان کا اپنا کام ہے بلکہ اسے توسیعی پروگرام کے مرکزوں کی تقریبات تصور کرتے ہیں۔ ان کی شرکت عموماً با دلِ ناخواستہ اور واجبی ہوا کرتی ہے۔ اس رویہ میں کچھ تو شک وشبہ کو دخل ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ ابھی ہمارے مرکز اپنی افادیت کو پورے طور پر ثابت بھی نہیں کر پائے ہیں۔ ثانوی مدارس کے اساتذہ کی بڑی مایوسیاں اور محرومیاں بھی ان کے اندر آمادگی کا رجحان پیدا ہونے نہیں دیتیں۔ تاوقتیکہ مدارس کے اساتذہ کو توسیعی پروگرام کے مشاغل کی شرکت بدیہی طور پر منفعت کا باعث نہ ہو، ان میں خلوصِ کار پیدا ہونے کی گنجائش موجودہ صورت حال میں بہت کم نظر آتی ہے۔ آج کل پریشان حال مدرس ہر ایک شے پر بابا ہیں تو یہ نظر آتی ہیں رو ٹیاں، کہہ کر ہی نظر ڈالتا ہوا ملتا ہے اور غیر شعوری طور پر ہر چیز کو پرکھنے کا معیار اس کے نزدیک یہی ہو گیا ہے۔ اس بات پر ہمیں استاد سے نہ خفا ہونے کی ضرورت ہے اور نہ مایوس۔ یہ تو حالات کی ستم ظریفی ہے۔ ہمیں مطمئن رہنا چاہیئے کہ ہمارا مستقبل خوش آیند ہے۔ تاہم توسیعی پروگرام کو اگر مقامی ضرورتوں کے پیشِ نظر پوری تن دہی کے ساتھ چلایا جائے تو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ اب تک اس معاملے میں ہم ناتجربہ کار اور نو آموز تھے۔ لہذا ہمارے کام کبھی کبھی محض سطحی بھی رہے۔ نئے کام کے جوش نے کبھی محض نمود ونمائش کی طرف بھی لگا دیا ہم اپنی کارگذاریوں کو چھاپ کر مطمئن ہو گئے اور اپنے کام کی چھاپ ثانوی مدارس کے کاموں پر دیکھنے کی فکر نہ رہی۔ یہ کام وقتی نہیں ہے بلکہ مستقل جد وجہد چاہتا ہے۔ اس میں نہ نمود کی گنجائش ہے اور نہ جمود کی۔ ثانوی مدارس کے مدرسین کے علاوہ اس پروگرام میں جان ڈالنے والے تربیتی اداروں کے اساتذہ ہیں۔ دراصل اس کا دل ودماغ یہی لوگ ہیں۔ اپنی بصیرت سے مدرسین کے ذہن کے چراغ یہی حضرات روشن کر سکتے ہیں۔ ابھی تک کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خدمت ان کے لئے اضافی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ توسیعی پروگرام کے مشاغل بھی تربیتی اداروں کے اساتذہ کے فرائض منصبی میں باضابطہ اور

مستقل طور پر شامل کر دئے جائیں اور یہ سب کارگذاری ان کے نظام الاوقات کا جزو ہو۔ اس طرح ان مشاغل پر خارجی ہونے کا گمان نہ رہے گا اور اساتذہ گراں بار بھی نہ ہونے پائیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ توسیعی پروگرام کے مرکز کو اپنے سرپرست ادارے کے ایک متعلقہ شعبے کی حیثیت سے کام کرنے کے بجائے تربیتی ادارے کا ایک جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر لینی چاہیئے۔ یہ دانہ اپنی ہستی کو مٹا کر ہی گل و گلزار بن سکے گا! پھر کوارڈینیٹر محض رابطہ قائم کرنے والا ایک افسر نہ ہوگا بلکہ تربیتی ادارے میں رفیقوں کا رفیق بن کر رہ سکے گا اس کی حیثیت میں کوئی امتیازی شان نہ رہے گی بلکہ صرف تقسیم کار کا معاملہ رہ جائے گا۔ اس نظریاتی اور تنظیمی تبدیلی کے علاوہ توسیعی پروگرام کا فیض ابتدائی مدارس تک پہنچانے کی بھی شدید ضرورت ہے۔ ابتدائی مدارس کے استاد ہمارے بنیادی معمار ہیں ان کی رہنمائی اور بھی ضروری ہے۔ خوشی کی یہ بات ہے کہ تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے لئے بھی توسیعی پروگرام کی گنجائش ایک دوسرے نہج پر نکالی گئی ہے۔ بہرحال توسیعی پروگرام کا کام اساتذہ کی تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔ اور اس کی توسیع و ترقی سے ہمارے مدارس میں حیاتِ نو کے آغاز کی امید کی جا سکتی ہے۔

"معلم"

تبصرہ وتعارف

آندھی میں چراغ

تبصرہ نگار : جناب ضیاء الحسن فاروقی

مصنف : خواجہ غلام السیدین

ناشر : انڈین اکیڈمی، ۲۹ نریندرا پلیس، نئی دہلی

سن طباعت : ۱۹۶۲ء ۔ قیمت : سات روپے پچاس نئے پیسے

اقبال کا ایک شعر ہے ؎

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دئے ہیں انداز خسروانہ

ایسے مردان حق آگاہ انسانی تاریخ کے ہر اُس موڑ پر انسانیت کی خدمت کرنے کے لئے نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں، جہاں تہذیبیں غروب ہونے لگتی ہیں اور اُن انسانی قدروں کے جو تہذیبوں کی روح ہوتی ہیں، ہٹ جانے کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں، زندگی، حقیقت یہ ہے کہ دیوانے کا ایک خواب ہے جس کی صحیح تعبیر کے خد و خال رفتہ رفتہ زمانے کے خم و پیچ سے ابھر کر سامنے آتے ہیں، انھیں دیوانوں کا عالم جذب ان خوابوں کا حامل ہوتا ہے جن سے انسانیت اور زندگی کی آبرو قائم رہتی ہے، یہ دیوانے دراصل فرزانے ہوتے ہیں، لیکن دنیا انھیں دیوانہ سمجھتی ہے، ان کی عارفانہ باتوں کو مجذوب کی بڑ تصور کرتی ہے، ان کے اعمال صالحہ کو سود و زیاں کے پیمانے سے ناپتی ہے، یہ قدروں کی باتیں کرتے ہیں تو وہ تمسخر کرتے ہیں، الغرض باطل پرستی کی اندھیری رات ہوتی ہے جس میں غیر انسانی قدروں کا طوفان اپنے شباب پر ہوتا ہے، لیکن یہ دیوانے آندھی اور طوفانی رات کی پروا کئے بغیر اپنا چراغ جلاتے رہتے ہیں، ہوا کے رستے میں شمع روشن کرنے کی اس جرأت کو بھٹکی ہوئی دنیا فعل عبث سے تعبیر کرتی ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اگر یہ "جرأت رندانہ" زمانے سے مفقود ہوتی تو مٹی کو لہو دے کر جنتاں

بنے کی روایت اور نوکِ خار سے گل و لالہ کی رنگینی اُبلنے کے واقعات سے ہماری تاریخ محروم رہتی۔

سیدین صاحب نے اسی حقیقت کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے۔ یہ کتاب ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف وقتوں میں مختلف موقعوں کے لئے لکھے گئے تھے، یہ مضامین تین حصوں میں ' ابدی قدریں' 'جستِ اہلِ صفا'، اور 'مستقبل کی پرچھائیاں' کے عنوانات کے تحت تقسیم کر دئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں مہاتما بدھ، پیغمبرِ اسلامؐ، حضرت امام حسینؓ اور گرونانک کے عارفانہ خیالات اور مذہبی تعلیمات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ ان کی بنیادی قدریں ابھر کر سامنے آگئی ہیں، دوسرے حصہ میں اُن افراد کی سیرت کے ممتاز پہلو پیش کئے گئے ہیں جن سے مصنف متاثر ہوا ہے اور جن میں ہندوستان کی بعض نامور ہستیاں، مثلاً مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، ڈاکٹر اقبال، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین، شامل ہیں اور بعض افراد ایسے ہیں جو مصنف کے عزیز اور بزرگ ہیں، تیسرا حصہ ان مضامین پر مشتمل ہے جن میں "ملک کے عام تعلیمی، سیاسی اور تہذیبی مسائل" سے بحث کی گئی ہے ـــــ مسائل جن کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں، لیکن جن کا سایہ مستقبل پر پڑ رہا ہے' ان مضامین میں بھی موضوعِ سخن' وہی اقدار ہیں جو حال' کے طوفان خیز نوں میں ہچکولے کھا رہی ہیں۔ ان اقدار کی حفاظت کا ساز و سامان نہ کیا گیا اور ہم وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے گئے تو اس ملک کی تہذیب و شرافت کا ماتم کرنے والے تو شاید کچھ لوگ مل جائیں لیکن ان کا چراغ جلانے والا شاید ہی کوئی ملے۔

کتاب کی تمہید کا عنوان "آندھی میں چراغ" ہے اور یہی کتاب کا عنوان بھی ہے۔ تمہید سے لے کر آخری مضمون 'تہذیب کی حفاظت' تک چند بنیادی باتیں ہیں جنھیں مصنف نے کبھی تخیل کے سہارے، کبھی تاریخی حقائق کی تائید کے ساتھ، کبھی علمی و تہذیبی مسائل کے ضمن میں اور کبھی افراد کی معنوی شخصیت کے پردہ میں، بار بار بیان کی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ بعض پڑھنے والوں پر یہ تکرار گراں گزرے، خود مصنف کو اس کا احساس ہے؛ چنانچہ کہتے ہیں:

"..... لیکن اس تکرار کی معذرت کیوں کروں؟ یہ میرے بنیادی عقائد ہیں جن پر زور دینا میرا فرض ہے۔ اگر یہ غلط ہیں تو ان کو ایک دفعہ بیان کرنا بھی نقصان دہ ہے۔ اگر صحیح ہیں

تو ان کو مختلف طریقوں سے دل میں بٹھانے کی کوشش قابلِ معافی ہے!"

دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعض سچی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بار بار کہنے کی ہوتی ہیں، اور کہنے والے کو اگر کہنے کا سلیقہ ہو تو مختلف انداز میں ایک ہی بات اس طرح کہی جا سکتی ہے کہ سننے والوں کو وہ ہر بار نئی معلوم ہو، پھر اگر تکرار سچائیوں اور اخلاقی قدروں کے بارے میں ہو تو شرمانے کی بھی ضرورت نہیں، اس لئے کہ ان کا ذکر اس غرض سے نہیں کیا جا رہا ہے کہ کسی سے کچھ مانگنا ہے، بلکہ مقصد کچھ دینا ہے، اسی لئے سخاوت اور فیاضی کی تکرار کا شمار "اعمال صالحہ" میں ہوتا ہے اور مذہبی لوگوں کی اصطلاح میں "یہ تکرار" پیدا کرنے والے کی ایک صفت ہے، اس لئے اسے مرغوب ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ قدریں کیا ہیں جنھیں بار بار دہرانے اور زور دے کر کہتے رہنے کی ضرورت ہے، اور اس وقت دنیا میں اور ہمارے اپنے دیس میں وہ کون سے رجحانات ہیں یا ایسا کون سا طوفان برپا ہے کہ راستہ نہیں دکھائی دیتا اور ان قدروں کا چراغ جلانا وقت کا ایک اہم تقاضا ہے، یہ دونوں سوال اہم ہیں دنیا میں مختلف افکار و خیالات کے لوگ ہیں، مختلف فلسفے ہیں جو انسانی زندگی کی تشکیل پر اثر انداز ہو رہے ہیں، خالص مادی طرزِ فکر بھی ہے جو علم اور سائنس کی بے پناہ طاقتوں کے ساتھ پھیل رہا ہے، اس فکر کے مبلغین کے نزدیک ان سوالوں کا جواب کچھ اور ہوگا، "روحانیت محض" کے پرچارک بھی مل جائیں گے جو ان سوالوں کا جواب اپنے نقطۂ نظر سے دیں گے، اور ایسے لوگ بھی ہیں اور بڑی تعداد میں ہیں جو "مادہ" اور "روح" دونوں کے قائل ہیں اور ان کے متوازن اور خوشگوار امتزاج میں دنیا اور انسان کی فلاح اور نجات دیکھتے ہیں، ان کا جواب دوسروں سے مختلف ہوگا، مثلاً حُسن، خیر اور انصاف چند قدریں ہیں، بعض انھیں "اضافی" کہتے ہیں، بعض ہیں جو "مطلق" گردانتے ہیں، اور اس کا فیصلہ یقیناً دشوار ہے کہ کس کا نقطۂ نظر صحیح ہے، لیکن قدروں کی علمی بحث سے قطع نظر، یہ ایک حقیقت ہے کہ کبھی مبہم اور کبھی واضح طور پر، انسان کو "خوب" سے "خوب تر" کی تلاش کی آرزو رہی ہے، یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی اگر کوئی فرد یا جماعت یہ طے کرلے کہ وہ محنت، ایمان داری، کفایت، انصاف، معاملات میں سچائی، حق پرستی، انسان دوستی اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے دستبردار ہو کر یہ تلاش جاری رکھے گی۔ خالص مادی زندگی کو سنوارنے میں بھی ان باتوں کو برتنے کی ضرورت ہوتی ہے، مذہبی لوگ

اس کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ دنیا اور عاقبت دونوں کو سنوار سکتی ہیں بشرطیکہ دنیاوی کامیابی کا تصور اس قدر تنگ اور کمینہ نہ ہو کہ اس کے لئے انسان کو ہر اچھی چیز، شرافت کا ہر اصول قربان کرنا پڑے۔"

سیدین صاحب مذہبی انسان ہیں، اس لئے وہ روحانی قدروں کی اصطلاح میں باتیں کہتے ہیں، وہ اپنے خیالات کی تائید میں مذہبی مصنفوں اور عارفوں کے اقوال کا حوالہ دیتے ہیں، مثلاً انجیل مقدس کی اس آیت پر ان کا ایمان ہے کہ "کیا فائدہ ہوگا انسان کو اگر وہ ساری دنیا کو حاصل کرے لیکن اپنی روح کی دولت کو کھو بیٹھے" آج یہ سوال دنیا کے ہر اس شخص کو جو سوچتا ہے، پریشان کئے ہوئے ہے، یہاں تک کہ یورپ اور امریکہ میں بھی جہاں مادی ترقی اپنے کمال کو پہنچتی نظر آرہی ہے، لوگوں نے اپنے آپ سے پوچھنا شروع کر دیا ہے کہ اس زمانے میں ہماری تہذیب کیسے محفوظ رہے گی؟ کیا ہماری نئی نسل جس کی پرورش خالص سائنسی ترقی اور مادی خوش حالی کے دامن میں ہو رہی ہے، اس قابل ہوگی کہ ہماری تہذیبی قدروں کی حفاظت کر سکے؟ کیا ہماری آزادیاں اور ترقیاں بجائے خود مقصد حیات ہیں؟ اور حساس دلوں کی یہ بے چینی کچھ آج ہی پر موقوف نہیں، پچھلے سو سال سے صنعتی تہذیب نے انسانی زندگی کو ایک سوالیہ نشان بنا رکھا ہے، سیدین صاحب نے اطالوی مدبر فرانسسکو نٹی کی اس ذہنی کیفیت کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۱۴ء کی جنگ کی وجہ سے اس پر طاری ہوئی تھی اور اس کی بے چین روح اپنی گہرائیوں سے پکار اٹھی تھی: "یورپ کے چراغ ایک ایک کر کے بجھتے جاتے ہیں۔ خدا جانے یہ لمپ دوبارہ ہماری زندگی میں روشن ہوں گے یا نہیں" اقبال کی شاعرانہ بصیرت نے "دیار مغرب کے رہنے والوں" کو ۱۹۰۷ء میں ان کی تہذیب کی کمزوریوں کی طرف متوجہ کیا تھا اور کہا تھا ؎

تمھاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یہاں مقصود مغربی تہذیب کی تنقید نہیں ہے، بلکہ کہنا یہ ہے کہ دنیا کی قدیم تہذیبوں کے سامنے بھی یہی مسائل ابھرے تھے، عہد وسطی کی غالب تہذیب یعنی اسلامی تہذیب کی راہ میں بھی یہ کٹھن منزل آئی تھی، اور آج بھی دنیا کی غالب تہذیب کے سامنے یہی چیلنج ہے تاریخ عالم کی یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ تہذیبیں غروب ہو جاتی ہیں، سوال یہ ہے کہ کیوں ایسا ہوتا ہے؟

لائق مصنف نے اس سوال کا جواب تو نہیں دیا ہے لیکن پوری کتاب کو پڑھنے سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ روح کی دولت جو روحانی قدروں کی شکل میں انفرادی اور جماعتی زندگی کے لئے شہ رگ کا حکم رکھتی ہے، ایک تہذیبی دولت ہے، اس دولت سے محرومی میں جسم و جان دونوں کا زیان ہے۔ اس عقیدہ کی وضاحت مصنف کے ان مضامین سے خوب ہو گئی ہے جن میں انھوں نے ہمارے اپنے ملکی مسائل، رجحانات اور تحریکات سے بحث کی ہے، اختلاف، تعصب، تنگ نظری اور دوسرے تخریبی عوامل کا ذکر کرنے کے بعد کتاب کی تمہید میں انھوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا ہے:

"مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ بعض اعتبار سے ملک نے گذشتہ پندرہ سال میں کافی ترقی کی ہے، زراعت میں، صنعت و حرفت میں، آب پاشی میں، تعلیم اور صحت میں لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ تمام ترقی مجھے سطحی اور کم عیار معلوم ہوتی ہے جب تک اس کی بنیاد سچی اور اخلاقی قدروں پر نہ رکھی جائے! ہماری تہذیب اور مذہب نے، ہمارے ادب اور فلسفے نے، ہمارے شاعروں اور مفکروں نے، ہمارے فقیروں اور صوفیوں نے، ہمارے عوام کی شرافت اور امن پسندی نے صدیوں کی کوشش سے جو چراغ جلائے تھے اور صدیوں تک روشن رکھے تھے، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایک خوفناک آندھی کی جھپٹ میں آ گئے ہوں، جیسے وہ نہ لوگوں کے گھروں میں روشن ہوں نہ ان کے دلوں میں، مجھے ایک معلم کی حیثیت سے قدروں کا یہ گہن تمام دوسری کمزوریوں اور خرابیوں سے زیادہ کھٹکتا ہے اور زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔"

ہماری اپنی اخلاقی خرابیوں کے علاوہ صنعتی تہذیب کا سیلاب بھی ہے جو امنڈ کر آ رہا ہے، یہ سیلاب ٹیگور کے الفاظ میں اس قدر تیز رفتار اور پر جوش ہے کہ ہماری اپنی ندی کے دوسرے دھارے، کنارے اور بند باندھ اس کی زد میں آتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اگر ہم اس کے بہاؤ کے لئے کوئی راستہ بنا سکے تو طوفان سے محفوظ رہیں گے، ورنہ تباہ ہو جائیں گے۔" ٹیگور نے یہ انتباہ بہت پہلے دیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کی زد میں ہیں، طوفان ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور ہم بے بس نظر آتے ہیں، صنعتی تہذیب ہمارے سماج میں، ہمارے ذہنوں میں، ہمارے سوچنے کے طریقوں میں جو تبدیلیاں لا رہی ہے، ان کے نتائج کا ہمیں احساس نہیں، ہم یہ نہیں دیکھ پاتے کہ وہ اخلاقی اصول اور شرافت کی وہ قدریں جو تہذیبوں کی جان ہوتی ہیں، کس طرح

ایک سخت آزمائش سے گذری ہے۔ یہ اصول اس قدر بے تمیم ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ان کے نام لیوا تو ابھی اکثر
ہوا جاتے ہیں لیکن ان کی حفاظت کا حوصلہ رکھنے والے خال خال دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم میں
ایک طبقہ وہ ہے جو اندھی ماضی پرستی کا اس درجہ شکار ہو چکا ہے کہ اُسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا، اُن
صدیوں کا کوئی احترام نہیں، جو مختلف مذاہب اور تہذیبوں کے ایک حسین امتزاج سے ظہور پذیر ہوئی ہیں
اور یہ امتزاج صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ٹیگور نے اپنے خاص انداز میں ایسی ہی مریضانہ ذہنیت کی احیاپرستی کے
خلاف آواز بلند کی تھی اور کہا تھا:

"... کسی ملک کے دریاؤں میں صرف اسی ملک کا پانی نہیں بہتا، برہمپترجو تبت سے نکلتا ہے گنگا
سے جو ہندوستانی دریا ہے، مل جاتا ہے اسی طرح ہندوستان کی اپنی تہذیب میں کئی دوسرے عناصر
بھی شامل ہوتے رہے ہیں مثلاً مسلمانوں کا ایک سلسلہ ہے جو اپنے علوم کا خزانہ اپنے کاندھوں پر اٹھائے
ہوئے، اپنے احساسات وجذبات اور لائق تحسین مذہبی جمہوریت کو ساتھ لے کر باہر سے آتے اور
ہندوستانی تہذیب کے دھارے میں جوش و حرکت پیدا کرتے رہے .... جن لوگوں نے عہد وسطیٰ
کے صوفیوں کی زندگیوں، اُن کی تحریروں اور اُن مذہبی تحریکوں کا مطالعہ کیا ہے، جو مسلم عہد حکومت
میں ابھریں اور پھولی پھلیں، وہ جانتے ہیں کہ ہم پر اس بدیسی دھارے کا کتنا بڑا احسان ہے جو
ہماری زندگی میں رچ بس گیا ہے۔"

اسی طرح ہم میں کچھ لوگ ہیں جو تنگ نظری کی حد تک مادی تہذیب اور نئی روشنی کے شیدائی ہیں، اور
انھیں اپنا ماضی ویران اور سنسان دکھائی دیتا ہے۔ ٹیگور نے ان الفاظ میں ان کی کج بینی کا ذکر کیا ہے:

"... ان کا عقیدہ ہے کہ ماضی دیوالیہ ہے اور اس نے ہمارے لئے کوئی سرمایہ نہیں چھوڑا ہے اس
سے ہمیں صرف زیرباری ملی ہے، یہ لوگ یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ فوج جو آگے بڑھ رہی ہے
پیچھے سے سامانِ جنگ حاصل کر سکتی ہے، اچھا ہوگا اگر انھیں یاد دلایا جائے کہ تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کے
روشن عہد وہی تھے جب قوموں کو اچانک پتہ چلا کہ ماضی کے خزانے میں گراں قدر اقدار اور
افکار و خیالات کا وافر سرمایہ موجود ہے۔"

میں نے ان دو رجحانات کو محض مثال کے طور پر پیش کیا ہے، ورنہ ان کے علاوہ اور رجحانات اور

تحریکات بھی ہیں جن کی نشاندہی مصنف نے بڑی خوش اسلوبی اور فصاحت سے کی ہے، مصنف کو زبان و بیان پر جو قدرت حاصل ہے اُس نے اُن کے درد و داغ اور سوز و آرزو مندی کے نقوش اور ابھارے ہیں، اور دونوں نے مل کر خیالات اور اسلوب بیان میں وہ گرمی پیدا کر دی ہے جس کی آنچ ہر اُس پڑھنے والے کو یقیناً محسوس ہوگی جو سنجیدگی اور دردمندی سے بنیادی مسائل پر غور کرتا ہے اور ان چیلنجوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے جو آج کی بدلی ہوئی فضا میں ہماری اعلیٰ قدروں کو درپیش ہیں۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ حالات کی اندھیاریوں میں امید کی کرن ابھی موجود ہے اور ہمارے ملک میں ابھی کچھ 'درد آشنا' ہیں جو انتشار اور تخریب کی قوتوں کے مقابلے میں تعمیر، اتحاد اور سچائی کی قوتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو ہمت کے ساتھ اپنی بات کہتے ہیں، بہرحال ابھی ہم اس منزل میں نہیں ہیں جہاں مایوسی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے، لیکن متخالف قوتوں میں تصادم ہے اور سخت ہے، مصنف نے ساری بحث کا نچوڑ کتاب کے آخری صفحہ میں ایک سوال کی شکل میں پیش کیا ہے اور یہی مختلف مضامین کو جن میں تسلسل کے ساتھ چند بنیادی قدروں پر زور دیا گیا ہے، کتاب کی شکل میں شائع کرنے کا مقصد بھی ہے، سوال یہ ہے :

دو قوتیں ہیں، ایک عقل، رواداری، انسانیت اور سچی تہذیبی قدروں کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری... تعصب، تنگ نظری، تاریک خیالی اور اندھی ماضی پرستی کی تائید کرتی ہے" ان دونوں قوتوں کی کشاکش واضح ہے، اب ہمارا فیصلہ کیا ہے؟ کیا ہم حیات افروز قوتوں کا ساتھ دیں گے؟ کیا ہم اُن رجحانات کی حمایت کریں گے جو قوموں اور تہذیبوں کو فنا کر دیتے ہیں؟ ہمارا فیصلہ ہماری نئی نسل، ہمارے ملک اور ہماری اس حسین دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہوگا۔

آخر میں یہ لکھنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے ناشر نے غالباً مضمون کے معنوی حسن کا احساس کر لیا تھا، اسی لئے اس نے کتاب کے ظاہری حسن کا ہر طرح خیال رکھا، کتابت اور طباعت دونوں بہت اچھی ہے، لیکن شاید مصنف کو پروف پڑھنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ اتنی زیادہ غلطیاں نہ ہوتیں، مصنف نے مضامین کی نظر ثانی پر غالباً زیادہ وقت نہیں صرف کیا، ورنہ کہیں کہیں بعض فقروں، جملوں اور ترکیب پر ترجمے کا جو گمان ہوتا ہے وہ نہ ہوتا۔

جامعہ میں ہند و پاکستان مشاعرہ

دلی میں ہر سال بہت بڑے پیمانے پر ہند و پاکستان مشاعرہ ہوا کرتا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس مشاعرہ میں شریک ہونے والے شعراء کو جامعہ میں بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ حسب معمول امسال بھی جامعہ میں مشاعرہ منعقد ہوا اور ہند و پاکستان کے مشہور شعراء نے شرکت کی۔

مشاعرہ کی صدارت ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے فرمائی اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض جناب غلام ربانی تاباں صاحب نے انجام دئے۔ صدر جلسہ نے مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معمول ہو گیا ہے ــــ اور یہ معمول بہت مبارک ہے۔ کہ جو شعراء دلی کے عظیم مشاعرہ میں شرکت کے لئے آتے ہیں، وہ جامعہ بھی تشریف لا کر ہم خاک نشینوں کی دعوت کو ازراہ محبت قبول کرتے ہیں۔ اگرچہ دلی کا مشاعرہ بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اور یہاں سننے والے بہت تھوڑے ہوتے ہیں، مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مہمان اتنی ہی خوشی سے یا شاید اس سے زیادہ خوشی سے یہاں اپنا کلام سناتے ہیں، دیوان عام کی شان کچھ اور ہوتی ہے اور دیوانِ خاص کی کچھ اور۔ ہمارے لئے یہ انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے شعراء جو بہت کم اکٹھا ہوتے ہیں، آج یہاں جمع ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے آٹھ ستارے جمع ہو گئے تھے تو دنیا میں قیامت آ گئی تھی۔ آج یہاں تیس ستارے اکٹھا ہیں، اگر قیامت برپا ہو جائے تو تعجب نہیں۔ آپ سب کی طرف سے اور اپنی طرف سے ان مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس زحمت کے لئے جو یہاں آ کر انھوں نے اٹھائی ہے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس مختصر تقریر کے بعد جناب تاباں صاحب نے میزبانی کے فرائض ادا کرتے ہوئے اپنی ذیل کی غزل سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔

یوں تیرے دورِ تغافل میں وفا رہتی ہے	شمع جیسے تہِ داماں میں صبا رہتی ہے
نیند آنکھوں سے ہنسی لب سے خفا رہتی ہے	زندگی عشق میں پابندِ وفا رہتی ہے

دل اگر دل ہے تو وابستۂ غم بھی ہوگا — نکہت گل بھی کہیں گل سے جدا رہتی ہے
نطق نامحرم اسرار جنوں ہے اے دوست — درد بن کر دل شاعر میں نوا رہتی ہے
حسن کی سعی کرم وجہ تسلی نہ ہوئی — ایک بے نام خلش دل میں سدا رہتی ہے
یوں چلو جیسے بیاباں میں ہوا چلتی ہے — یوں رہو جیسے گلستاں میں صبا رہتی ہے

ہائے مصروفیت شوق کا عالم تاباںؔ
ہر نفس کشمکش جرم و سزا رہتی ہے

"تاباںؔ صاحب کی افتتاحی غزل کے بعد مشاعرہ شروع ہوا، جس کی ایک جھلک ذیل میں پیش کی جاتی ہے"

جناب بیکل اتساہی

جھلک نظاروں کی چلمن میں چھوڑ آئے ہیں — نگاہ شوق کو الجھن میں چھوڑ آئے ہیں
اودھ کی شام، بنارس کی صبح کا عالم — کسی حسین کے آنگن میں چھوڑ آئے ہیں
وہ چند اشک جو تھے رازدار غم دل کے — انھیں تمھارے ہی دامن میں چھوڑ آئے ہیں
تمھاری بزم سے اٹھ کر تمھارے دیوانے — کبھی کبھی تمھیں الجھن میں چھوڑ آئے ہیں

جناب شارب ردولوی

خوشی کے ساتھ اٹھے یا کہ سوگوار چلے — تمھاری بزم کو اشکوں سے ہم سنوار چلے
بہت طویل تھی یہ قید عمر لیکن ہم — تری امید کرم پر اسے گزار چلے
تری خوشی کے لئے کل جو مسکرائے تھے — وہ آج تیری ہی محفل سے اشک بار چلے

جناب دلاور فگار

موصوف نے ڈاکٹر اقبال کے شکوہ کی پیروڈی "ٹیچرس کی طرف سے شکوہ" کے عنوان سے پیش کی۔ اس طویل مزاحیہ اور طنزیہ نظم کا ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ہے بجا جذبۂ ایثار میں مشہور ہیں ہم — حق محنت نہ ملے جس کو، وہ مزدور ہیں ہم
فقر و فاقہ کی قسم سرمد و منصور ہیں ہم — ہوگئے پانچ مہینے کہ بدستور ہیں ہم

حاکما! شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر مدح سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

جناب نظر جعفری (پاکستان)

تنکے لا لا کر کسی گوشے میں ہم رکھتے گئے — اس طرح بھی ایک شکل آشیاں بنتی گئی
ہے ہر اک تخریب میں تعمیر کا پہلو نظر — میرا دل مٹتا گیا اور داستاں بنتی گئی

محترمہ ممتاز مرزا

کوئی کلی تو کھل کے ہنسے صحن باغ میں — اے دل! حریفِ گردشِ دوراں کوئی تو ہو
رسوائیاں کہ دار و رسن یا درِ حبیب — ممتاز اپنی زیست کا عنوان کوئی تو ہو

جناب انور صابری

بساطِ کائنات پر قیامتیں ابھر گئیں — جو تیری زلف ناز سے الجھ گئی کوئی شکن
تبسم جبیں ترا کلی کلی کی زندگی — ترا جمال گل بہ گل قدم قدم چمن چمن
تری جبینِ زر فشاں حریف بزم کہکشاں — ترے لبِ لطیف میں سرودِ بادۂ کہن

جناب حبیب جالب (پاکستان)

بگولوں کی صورت یہاں پھر رہے ہیں — نشیمن سر گلستاں چھوڑ آئے
یہ اعجاز ہے حسنِ آوارگی کا — جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے
چلے آئے ان رہ گزاروں سے جالب — مگر ہم وہاں قلب و جاں چھوڑ آئے

جناب اقبال صفی پوری (پاکستان)

کہیں گل کہیں پہ شبنم ہے عجیب وہ نظر بھی — یہی دل کا زخم بھی ہے یہی دل کی چارہ گر بھی
جو ہوئے بھی مجھ سے رخصت تو نہ جا سکے تنہا — گئی ساتھ ساتھ ان کے بڑی دور تک نظر بھی
ٹھہر اے مذاقِ وحشت کہ ابھی ہے دل سلامت — ہے اگر خیال صحرا تو برا نہیں ہے گھر بھی

جناب نشور واحدی

میرا دل نہ تھا الم آشنا کہ تری ادا پہ نظر پڑی — وہ نہ جانے کون سا وقت تھا کہ بنائے خونِ جگر پڑی
ترا کام سیر مدام ہے نہ کہ گلستانوں میں ٹھہرنا — یہ کلی کلی کے فریب میں تو کہاں سی بادِ سحر پڑی
کوئی موجِ بحر سے دور ہے تو جبین بحر پہ کیا شکن — تری جستوں کو ہوا یہ کیا مری لغزشوں پہ نظر پڑی

جو حدودِ صبح میں رک گیا اسے اتفاقِ سفر کہو — میں وہی مسافرِ شام ہوں مرے راستہ میں سحر پڑی
سرِ راہ ان کو بہ یک نظر کبھی دیکھئے تو وہی ادا — وہی بے نیازیِ مہ وشاں وہی زلف تابہ کمر پڑی

حضرت حفیظ جالندھری (پاکستان)

کبھی زمیں پہ کبھی آسماں پہ چھائے جا — اجاڑنے کے لئے بستیاں بسائے جا
خضر کا ساتھ دئے جا قدم بڑھائے جا — فریب کھائے ہوئے کا فریب کھائے جا
تری نظر میں ستارے ہیں اے مرے پیارے — اڑائے جا تہہ افلاک خاک اڑائے جا
اناڑیوں سے تجھے کھیلنا پڑا اے دوست! — سمجھا سمجھا کے نئی چال مات کھائے جا

ہر ملاقات میں اک بات نظر آتی ہے — صورتِ ترکِ ملاقات نظر آتی ہے
یہ عجب مرحلۂ عمر ہے، یارب! کہ مجھے — ہر بری بات، بری بات نظر آتی ہے
چلتے پھرتے ہوئے مُردوں سے ملاقاتیں ہیں — زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے
نظر آتی ہے کسی دوست کی صورت جو کہیں — ایک فہرستِ عنایات نظر آتی ہے

ترے اترے ہوئے چہرے پہ یاروں کو حفیظ
سُرخیِ حرف و حکایات نظر آتی ہے

اس مشاعرہ میں محترمہ شاہ بانو یاد، جناب فرقت کاکوروی، جناب آغا مرزا دہوی، جناب ملک زادہ منظور احمد، جناب مخدوم محی الدین، جناب جگن ناتھ آزاد، جناب شوکت تھانوی، اور حضرت فراق گورکھپوری نے بھی شرکت کی تھی۔ افسوس کہ ان شعرائے کرام کا کلام نوٹ نہیں کیا جا سکا، اس لئے ہم قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ان شعراء سے بھی معذرت خواہ ہیں۔

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

جامعہ کے مہمان

جامعہ کے کام کی شہرت نہ صرف ملک کے دور دراز گوشوں سے لوگوں کو کھینچ لاتی ہے، بلکہ اکثر و بیشتر بیرونی ممالک کے ممتاز اور اہم اشخاص کو بھی اس ویرانے میں آنے پر مجبور کرتی ہے۔ پچھلے ماہ کے مہمانوں میں ڈاکٹر ڈبلیو، سی اسمتھ، پروفیسر رچرڈ ایچ رابنسن اور ایران کے وزیر تعلیم اور دو ماہرین تعلیم قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر اسمتھ ادارۂ علوم اسلامی (میکگل یونیورسٹی مانٹریل کینیڈا) کے ڈائرکٹر اور "موڈرن اسلام ان انڈیا" اور "اسلام ان موڈرن ہسٹری" کے مصنف کی حیثیت سے کافی معروف و مشہور ہیں۔ وہ جب کبھی ہندوستان آتے ہیں، تو اپنی انتہائی مصروفیتوں کے باوجود اساتذہ جامعہ سے ملنے کے لئے ضرور وقت نکالتے ہیں۔ چنانچہ اس مرتبہ مارچ میں تشریف لائے، تو جامعہ میں کافی وقت صرف کیا۔

پروفیسر رابنسن امریکی یونیورسٹی وسکانسن میں ڈیپارٹمنٹ آف انڈین اسٹڈیز کے صدر ہیں اور ہندوستانی فلسفہ ان کا مخصوص مضمون ہے، انھوں نے سنسکرت زبان و ادب کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ موصوف دہلی تشریف لائے تو دو تین گھنٹے جامعہ میں بھی صرف کئے۔ شیخ الجامعہ صاحب کی عدم موجودگی میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا۔ سب سے پہلے موصوف نے مکتبہ جامعہ اور اس کی مطبوعات دیکھیں، اس کے بعد کالج میں اساتذۂ جامعہ کے ساتھ چائے میں شرکت کی اور مختلف علمی مسائل پر گفتگو کی۔

ایران کے وزیر تعلیم اور دوسرے ماہرین تعلیم، وقت کی کمی کی وجہ سے، صرف مدرسہ ابتدائی دیکھ سکے۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، پرنسپل کالج جناب ضیاء الحسن فاروقی اور بچوں کی حکومت (مدرسہ ابتدائی) کے عہدہ داروں نے ان کا خیر مقدم کیا اور جامعہ کی تاریخ اور اس کی تعلیمی خدمات سے روشناس کیا۔

ان بیرونی ممالک کے مہمانوں کے علاوہ بہت سے ملکی مہمان بھی تشریف لائے ۔ ان میں مختلف ریاستوں کے سوشل ایجوکیشن کے افسران قابل ذکر ہیں۔ آج کل دہلی میں نیشنل فنڈا منٹل ایجوکیشن سنٹر کے زیر اہتمام "بالغوں کی خواندگی" پر ایک سیمینار ہو رہا ہے۔ جس میں شرکت کے لئے تقریباً تمام ریاستوں کے افسران تعلیم تشریف لائے ہیں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی دعوت پر یہ حضرات جامعہ تشریف لائے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے ان لوگوں کو مختصراً جامعہ کے حالات بتلائے اور جامعہ نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں خاص طور پر ان کی تفصیلات بتلائیں۔ ان مہمانوں کے اعزاز میں عصرانہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ جس میں ادارہ تعلیم و ترقی اور تعلیمی اداروں کے سربراہوں نے بھی شرکت کی۔ عصرانے کے بعد ان مہمانوں نے ادارۂ تعلیم و ترقی کے کاموں کی نمائش دیکھی۔ (۲۲ اپریل)

الوداعی جلسے میں شیخ الجامعہ کی تقریر

پچھلے ماہ حسب معمول انجمن طلبائے جامعہ کا الوداعی جلسہ منعقد ہوا، جس میں اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے تمام طلباء اور اساتذہ نے شرکت کی۔ شیخ الجامعہ صاحب نے طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے، ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، انجمن طلباء کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کی اور جامعہ کی امتیازی خصوصیات بیان کیں۔ موصوف نے فرمایا کہ "کسی تعلیمی ادارہ کا اندازہ اس کے بجٹ، شاندار عمارتوں یا طلباء کی تعداد سے نہیں کیا جاتا۔ جو چیز دیکھی جاتی ہے، وہ طالب علم ہیں، اگر طالب علم اثر نہ ڈال سکیں اور لوگ ان کو پسند نہ کریں، تو پھر تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوا۔" شیخ الجامعہ صاحب ابھی حال میں یورپ و امریکہ میں چار پانچ ماہ قیام کرکے واپس آئے ہیں۔ موصوف نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "آج کل دنیا میں جہاں کہیں بھی میں گیا، ہر جگہ لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ آج کل نوجوانوں کو دیکھ کر، جو کچھ دنوں میں تہذیب کا کام سنبھالیں گے، کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے، کیا تہذیب قائم رہے گی یا مٹ جائے گی؟ اگر رنگ یہی رہا تو مشکل ہے۔ ہندوستان کی حالت اس سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ تعلیمی ادارے ہوں یا ملک کی علمی فضا، ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں، جہاں تہذیب کا باقی رہنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ میں جامعہ کے نوجوانوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر یہ دولت ہمارے ہاتھ سے نکل گئی، تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔"

تقریر کو ختم کرتے ہوئے شیخ الجامعہ صاحب نے فرمایا کہ "چند دنوں میں آپ کے امتحانات شروع ہونے والے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس امتحان سے بحسن وخوبی گذر جائیں گے، مگر یہ امتحان معمولی ہیں، اصل امتحان وہ ہے جو زندگی میں داخل ہونے کے بعد پیش آئے گا، جس میں آپ اپنے اخلاق، اپنے برتاؤ اور اپنے طور طریقے سے پہچانے جائیں گے۔ اگر آپ اس امتحان میں پورے اترے تو یہی اصل کامیابی ہے۔"

ایک دن کا مدرسہ

جامعہ کی تعلیمی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ سال میں ایک مرتبہ ابتدائی اور ثانوی کے اسکول کا پورے دن کے لئے اسکول کی ذمہ داری طالب علموں کے سپرد کر دی جاتی ہے اور وہ چھوٹی بڑی تمام ذمہ داریاں خود ہی انجام دیتے ہیں۔ اس خاص موقع پر طالب علموں کے ذوق وشوق، جوش وخروش اور ان کے حوصلے دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امسال پچھلے مہینے میں مدارس ابتدائی اور ثانوی میں الگ الگ تاریخوں میں یہ دن منایا گیا۔ مدرسہ ثانوی نے اس موقع پر دہلی کے بہت سے اسکولوں اور سفارتخانوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ چنانچہ اس کو دیکھنے کے لئے بہت سے مہمان تشریف لائے تھے جن میں اچھی خاصی تعداد بیرونی ممالک کے مہمانوں کی تھی۔ ان میں ایران کے کلچرل اتاشی ڈاکٹر تفضلی نے بڑی دلچسپی لی۔ انہیں جامعہ کا یہ طریق کار اس قدر پسند آیا اور بچوں کے انتظام اور احساس ذمہ داری سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس دن کی مفصل رپورٹ ایران کے اخبارات کو بھیجی۔

ع ل ا (۲۷ اپریل)

جامِ صحت

شاید آپ نہیں جانتے، بازاری شربتوں کے مقابلہ میں

شربت نشاط افروز

مصنوعی خوشبو سے پاک ہے یہ شربت تازہ پھلوں
کے رس پھولوں کے جوہر اور قیمتی ادویات سے تیار
کیا جاتا ہے۔ اس لئے سورج کی گرمی، تھکان، لُو
اور پیاس کی شدت کو تسکین بخشنے میں

شربت نشاط افروز کا
ایک گھونٹ حیات کا کام
دیتا ہے

نزدیکی دکاندار سے
طلب کریں



دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

ایجنسیاں:-

(۱) کان پور، ظہیر اینڈ سنس (۲) مرادآباد، یونانی میڈیکل اسٹور چوکھا پل (۳) مبارک پور، اعظم گڑھ محمود الرحمن عبدالوحید (۴) مئوناتھ بھنجن، صدر بازار (۵) بمبئی، دریابادی دواخانہ۔ ۳۹۳ پائیدھونی (۶) لکھنؤ امین آباد۔ اودھ جنرل اسٹور (۷) بستی (یوپی) سید جمیل احمد۔ گاندھی نگر۔

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۶	بابت ماہِ جون ۱۹۶۲ء	شمارہ ۸

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

عبداللطیف اعظمی (مرتب)

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

(۲)

جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن

علماء و صوفیہ کا اختلاف

یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں کے باشندے صوفیہ کرام کے اخلاق اور کرامت سے متاثر ہو کر اسلام کے حلقہ میں جوق جوق داخل ہو رہے تھے۔ تو علماء اور صوفیہ کی کش مکش سے خود مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا یہ پڑھ کر دکھ ہوتا ہے، کہ جب چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں خصوصاً حضرت نظام الدین اولیاء کے فیض سے دہلی کے بدکار اپنی بدکاری سے باز آ رہے تھے بے نمازی، نماز کے پابند ہو گئے تھے، بددیانتی اور بدمعاملگی کو چھوڑ رہے تھے، سود خواری، ذخیرہ اندوزی بند ہو گئی تھی، خواص اور عوام کے دلوں میں گناہ کا خوف غالب ہو گیا تھا، حتیٰ کہ شاہی خاندان کے افراد، فسق و فجور سے پرہیز کرنے لگے، اس وقت بھی علماء کا ایک گروہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کا مخالف تھا، اور ان سے سماع کی حلت و حرمت پر اتنا الجھا کہ ان کو ایک محضر میں حاضر ہو کر اپنے مذہبی عقائد واضح کرنا پڑا، اور اس محضر میں دہلی کے فقہاء نے عداوت اور حسد کا ایسا مظاہرہ کیا، کہ حضرت خواجہ کو کہنا پڑا کہ

یہ شہر جس کے اندر ایسی مغرورانہ بحث ہو کیسے آباد ہو سکتا ہے، عجب نہیں کہ اس کی اینٹ سے اینٹ بج جائے،"

اور یہ واقعہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے بعد خدا جانے کتنی بار دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجتی رہی، ایک مورخ تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ دہلی کی یہ تباہی و بربادی اسی بددعا کا نتیجہ تھی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر علماء اور صوفیہ دونوں مل کر مسلمانوں کے مذہبی اور روحانی جذبات کا صحیح مصرف لیتے رہتے

تو آج نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

وجہ اختلاف

علماء کو صوفیہ کرام سے اختلاف کا بڑا سبب یہ تھا، کہ وہ برابر ڈرتے تھے کہ کہیں طریقت اور حقیقت کے انکار و مسائل میں شریعت گم ہو کر نہ رہ جائے، حالانکہ جتنے اکابر صوفیہ گذرے ہیں، وہ برابر کہتے رہے کہ جس طرح آفتاب سے نور، جوہر سے عرض، اور موصوف سے صفت جدا نہیں ہو سکتی ہے، اسی طرح شریعت حقیقت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی، خود حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی تعلیم یہ رہی، کہ صوری حیثیت سے اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو، جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت سرزد نہ ہوگی، تو وہ دوسرے مقام پر پہنچے گا جس کا نام طریقت ہے اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو معرفت کا درجہ حاصل کرے گا، اور جب اس میں پورا اترے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا اس کے بعد وہ جو کچھ مانگے گا اس کو لے گا، اسی لئے خواجہ صاحب نے شریعت کے تمام ارکان اور جزئیات کی پابندی پر بڑا زور دیا ہے، اور یہی مسلک چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کا رہا۔

سہروردیہ سلسلہ میں حضرت صدر الدین عارف فرمایا کرتے، کہ ایمان کی استقامت کی علامت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور رسول کو محبوب رکھے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام پیغمبروں میں افضل سمجھے اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس کو صحیح اور درست سمجھے، خواہ یہ باتیں عقل میں آئیں یا نہ آئیں اگر نہ آئیں تو بھی ان کو تسلیم کرلیں تاکہ اعتقاد درست رہے، کیونکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم کو جانا اور اس کی کیفیت معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، فردوسیہ سلسلے کے بزرگوں میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری فرمایا کرتے تھے کہ

"باخدا دیوانہ باش و با شریعت ہوشیار"

اور اسی پر دوسرے خانوادوں کے بزرگوں کا بھی عمل رہا، لیکن رفتہ رفتہ صوفیہ میں کچھ گروہ ایسا بھی پیدا ہوگیا، جو کہتا کہ ایمان کی علت معرفت ہے، اگر معرفت ہو اور طاعت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ بندہ سے مواخذہ کرے گا، لیکن اطاعت ہو اور معرفت نہ ہو تو بندہ نجات نہیں پائے گا۔ علماء کی نظروں میں یہ باتیں کھٹکتیں اور گو اکابر صوفیہ خود اس کی تردید کرتے رہتے کہ وہ معرفت پسندیدہ نہیں، جس میں

ں حاصل نہ ہو، ان کے نزدیک معرفت شوق کا نام ہے۔ اور شوق اور محبت کی علامت طاعت ہے، شوق اور
محبت جس قدر زیادہ ہوتی جائے گی، اسی قدر فرمانِ الٰہی کی تعظیم بڑھتی جائے گی

علماء کا بعض ایسے صوفیوں کا مخالف ہونا بھی صحیح تھا، جو اسلامی تصوف کی پیروی کسی حال میں نہ
کرتے تھے، مثلاً فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک صوفی احمد بہاری نامی اپنے مریدوں کو ترک و تجرید کی تعلیم
دیتے اور (نعوذ باللہ) رسول اللہ صلی اللہ کی شان میں گستاخانہ باتیں کیا کرتے تھے، اور پھر اپنے کو خدا سمجھتے۔
فیروز شاہ تغلق نے ان کے پاؤں میں زنجیر ڈلوا کر اپنے سامنے بلوایا اور ان کو قتل کرا دیا۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کو ان کے قتل پر دکھ ہوا گو وہ خود شریعت کے بہت پابند تھے، لیکن
احمد بہاری کی باتوں کو عالمِ دیوانگی پر محمول کیا۔ اور وہ درحقیقت ان کو بزرگ سمجھتے تھے، چنانچہ اپنے ایک
مکتوب میں لکھتے ہیں کہ "جس شہر میں ایسے بزرگوں کا خون بہایا جائے، تعجب ہے اگر وہ آباد رہے" اور مؤرخ
کا خیال ہے کہ تیمور کے ہاتھوں جو دہلی برباد ہوئی تو انہی کا خون رنگ لایا۔

اسی طرح عین الملک ماہرو کے ایک غلام نے صوفی بن کر مریدوں کو تاکید کی کہ جب انا الحق کہوں تو تم
سب بلند آواز سے "تونی تونی" کہو، فیروز شاہ نے علماء کے فتوے پر اس کو قتل کرا دیا۔

علماء ایسے صوفیہ کی بھی برابر گرفت کرتے رہتے جو محض دنیاوی مال و منال اور جاہ و حشمت کی
خاطر اپنے کو صوفی ظاہر کرتے اور اکابر صوفیہ کے جانشین بن کر اپنے مورث اعلیٰ بلکہ خود تصوف کو بدنام کرتے
اور یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ اکابر صوفیہ کے جانشینوں یا ان کے مقبروں کے مجاوروں نے ان کے ملفوظات
کے مجموعوں میں ایسی ایسی باتوں کا اضافہ کر دیا ہے، جو وہ اپنی زندگی میں کسی طرح برداشت کرنے کے لئے
تیار نہیں ہو سکتے تھے،

حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت
خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر ہوا، اور ان
کے قدموں پر سر رکھ کر عرض کیا، میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں حضرت خواجہ اس وقت اپنے حال
میں تھے۔ فرمایا اس شرط پر مرید ہو سکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو "لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ" چونکہ وہ
راسخ العقیدہ تھا، اس لیے اس نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی، اور غریب نواز نے اس کو مرید کر لیا، اور

خلعت خاص سے سرفراز فرمایا اگر ہم اس روایت کو الحاقی سمجھ کر رد کر دیں تو پھر کسی بحث کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔

مریدوں اور معتقدوں کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو گیا تھا جو اس قسم کے ملفوظات کی تاویلیں کرنے میں اپنی ساری لیاقت خرچ کرتا رہا، اور رفتہ رفتہ تصوف ایک ایسا فلسفہ بن گیا کہ توحید، ایمان، نفس کشی، ولایت و کرامت، فنا و بقا، غیبت و حضور، جمع و تفرقہ، حلول روح، معرفت، عشق الہٰی، وصال الہٰی، مشاہدۂ حق وغیرہ جیسے مسائل پر علماء اور صوفیہ کے درمیان مستقل اختلاف پیدا ہو گیا، وحدت الوجود کا مسئلہ تو خاص طور پر ان دونوں میں اختلاف کی خلیج کے وسیع ہونے کا سبب بن گیا، اور اس سلسلہ میں جو مباحث ہوتے علماء ان کو بدعت اور گمراہی قرار دیتے تھے، اور ان پر عقیدہ رکھنے والے کو عالم یا بزرگ سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔

عوام کو ان علمی مباحث سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ صوفیہ کرام کی کرامتوں اور روحانی طاقتوں کو دیکھ کر ان کے گرد پروانہ وار جمع رہتے، اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کو زندہ سمجھتے، اس طرح ان متوفی بزرگوں کی حکومت برابر جاری رہتی، علماء کا ایک گروہ اس قبر پرستی کے ہمیشہ خلاف رہا، لیکن عوام اس مخالفت سے کبھی بھی متاثر نہیں ہوئے، اور صوفیہ کی قبریں ابھی تک نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی زیارت گاہیں بنی ہوئی ہیں، اور ہندو بھی مسلمانوں ہی کی طرح ان سے منتیں اور مرادیں مانگتے ہیں، اور نذریں چڑھاتے ہیں۔

یہ قبر پرستی مذہبی لحاظ سے تو کسی طرح جائز نہیں قرار دی جا سکتی، لیکن ہندوستان کا جو مذہبی ماحول تھا، اس میں اس بدعت کا ایک روشن پہلو حسب ذیل لطیفہ سے ظاہر ہوتا ہے، اکبری عہد میں راجہ مان سنگھ کے دربار میں ایک سید اور ایک برہمن میں مذہبی بحث چھڑ گئی، دونوں اپنے اپنے مذہب کی فضیلت بیان کرتے رہے، لیکن کوئی دوسرے کو قائل نہ کر سکا، آخر میں مان سنگھ پر فیصلہ چھوڑ دیا گیا اس نے کوئی فیصلہ دینے سے یہ کہہ کر گریز کیا، کہ اگر میں مذہب اسلام کو ترجیح دوں تو لوگ بادشاہ وقت کی خوشامد پر محمول کریں گے، اور اگر اس کے برعکس رائے دوں تو تعصب سمجھا جائے گا۔ لیکن جب ان سے اصرار کیا گیا، تو کہا مذہبی حقایق کی بنا پر تو فیصلہ دینا مشکل ہے، لیکن دیکھتا ہوں کہ ہندوؤں

ہیں خواہ کیسے گنواں پنڈت یا دھیانی فقیر ہو مرنے پر جلا دیا گیا، اس کی خاک اڑ گئی، رات کو وہاں کوئی جاتا ہے، تو آسیب کا خطرہ محسوس کرتا ہے، لیکن مسلمانوں کے جس شہر یا قصبہ یا گانوں میں گنند و بزرگ پڑے سوتے ہیں ان کے مزار پر چراغ جلتے ہیں پھول مہکتے ہیں، چڑھاوے چڑھتے ہیں اور لوگ ان کی ذات سے فیض پاتے ہیں۔

اور جب ہندوستان کے مسلمان حکمراں اپنے تخت و تاج کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ فوج کشی میں مشغول تھے، تو خانقاہوں کے یہ بوریا نشیں انسانوں کے قلوب کی تسخیر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ دو متوازی حکومتیں قائم ہوگئیں، ایک تو ان کی تھی، جن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں، اور ایک ان کی جن کے گھروں میں فقر و فاقہ تھا، اور جب یہاں کے باشندے مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اسلام کی تلوار سمجھ کر اس سے آزردہ اور خوف زدہ ہو رہے تھے، تو ان فقر و فاقہ والوں کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کے باطنی مزاج کو دیکھ کر، ان کے دلوں میں اسلام کی سچی عظمت اور شوکت قائم ہو رہی تھی، اور خود مسلمان عوام ان ہی کے نمونے دیکھ کر اپنے اخلاق و کردار سنوار رہے تھے۔ کیونکہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم کا مرکز علماء کا طبقہ، درس و تدریس یا ان کا مسکن نہیں رہا، اور نہ سلاطین کے درباروں میں اس کے جلوے دکھائی دیئے۔ بلکہ مسلمانوں نے ایثار، محبت، خودداری، رواداری، انسان دوستی، توکل اور تحمل جیسے اخلاق حمیدہ کی تعلیم ان صوفیہ کرام کی خانقاہوں میں ہوئی۔

علماء صوفیہ کے آستانے پر

جن علماء نے ان بزرگوں کی مخالفت کی، اس سے ان بزرگوں کی ذات کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا، اور نہ عوام اس سے متاثر ہوئے، البتہ ان کے ذہن میں یہ انتشار ضرور پیدا ہو گیا، کہ علماء اور صوفیہ دو علیحدہ چیزیں ہیں، یہ انتشار اس وقت دور ہو جاتا جب علماء خود صوفیہ کے آستانے پر آ کر جھک جاتے اور اس کی مثالیں بکثرت ہیں، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریب دولت آباد پہنچے، تو وہاں کے ایک عالم مولانا سید زین الدین کو اپنے علم کا بڑا غرور تھا، وہ صوفیہ اور مشائخ سے دور بھاگتے، اور ان کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہ کرتے، لیکن رفتہ رفتہ وہ حضرت برہان الدین غریب کے قائل ہوتے گئے، اور ایک روز ان کی قیام گاہ

پر پہنچے تو جب سامنا ہوا تو دو زانو ہو کر اپنی پیشانی ان کے قدموں پر جھکا دی، حضرت برہان الدین نے فرمایا ہاں مولانا! یہ رسم شریعت میں جائز نہیں۔ مولانا نے کہا جب تک میں اس رسم کو شریعت کے خلاف جانتا تھا نعمت باطنی سے محروم تھا۔

دہلی کے مولانا نصیر الدین قاسم اپنے علم اور تقوی میں بہت مشہور تھے، ان کے استاد مولانا معین الدین عمرانی کو ان پر فخر تھا، لیکن وہ حضرت سید گیسو دراز کے قائل نہ تھے۔ لیکن آخر میں ان سے بیعت ہو گئے مولانا معین الدین عمرانی کو اس کی خبر ہوئی۔ تو مولانا نصیر الدین قاسم کو بلا کر کہا تم تو خود عالم تھے پھر سید محمد کے مرید کیوں ہو گئے، مولانا نصیر الدین نے عرض کیا پہلے عالم تھا، اب حضرت مخدوم کے سامنے مسلمان ہوا ہوں۔

وحدت الوجود کا تنازعہ

حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ بڑے پایہ کے عالم تھے، اور کہا جاتا ہے کہ ان کے نور باطن میں شرارۂ علم زر خالص کی طرح اس لئے چمکا، کہ دونوں سلوک کی آتشیں راہیں طے کر کے اپنی منزل مقصود کو پہنچے، اور دونوں کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ علماء اور صوفیہ کے اختلافات کو کم کر کے ایک دوسرے سے قریب تر کیا، اور پھر دونوں نے خود تصوف کو آب زلال سے دھونے کی کوشش کی اس سلسلہ میں انھوں نے وحدت الوجود کے تنازعہ فیہ مسئلہ میں بڑی وضاحت پیدا کی، اس مسئلہ سے علماء اور صوفیہ میں بڑی تلخیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں وحدت الوجود کی علمی بحث سب سے پہلے حضرت شرف الدین یحیی کے مکتوبات سے شروع ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مجاہدہ اور ریاضت کی کثرت سے سالک ایسا مستغرق ہو جاتا ہے، کہ عالم جو آئینۂ حیرت ہے، اس کو نظر نہیں آتا، ساری ہستیاں اس کی نظر میں گم ہو جاتی ہیں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ اور نہیں دیکھتا، اس پر فنائیت طاری ہوتی ہے اس کو فنا فی التوحید یعنی ہمہ دوست کہتے ہیں، فنا فی التوحید کے بعد بھی ایک مرتبہ ہے جس کا نام الفنا عن الفنا ہے، اس مرتبہ میں سالک کو کمال استغراق میں اپنی فنائیت کی بھی خبر نہیں ہوتی اور وہ خدا کے جلال اور جمال میں کوئی فرق اور تمیز نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ تمیز باقی رہ جاتی ہے تو یہ تفرقہ کی دلیل ہے، عین الجمع اور جمع الجمع کا مقام اسی وقت حاصل ہوتا ہے، جب سالک اپنے کو اور

کل کائنات کو خدا کے دریائے نور میں غرق کر دیتا ہے، اور اس کو خبر نہیں ہوتی ہے، کہ کون اور کیا غرق ہوا
، مقام تفرید میں پہنچ کر سالک کو وحدت الوجود کی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ ایسا محو ہو جاتا
ہے کہ اس کو اسم و رسم وجود و عدم عبارت و اشارت، عرش و فرش اور اثر و خبر سے کوئی واقفیت نہیں
ہوتی، اور اس مقام کے سوا کہیں اور جلوہ گر نہیں ہوتا، یہاں کے سوا اس کا نشان کہیں اور ظاہر نہیں
ہوتا، اس جگہ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری نے بطور انتباہ لکھا ہے، کہ توحید وجودی علم کے درجہ میں
ہو یا شہود کے ابتدائی درجہ سے انتہائی درجہ میں ہو، ہر درجہ میں بندہ بندہ ہے، خدا خدا ہے، اس
لئے انا الحق سبحانی ما اعظم شانی (میں خدا ہوں، میں پاک ہوں اور میری شان کس قدر بڑی ہے)۔
وغیرہ کہنا کلمات کفر ہیں۔

وحدت الوجود کی زیادہ تفصیلی بحث حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کے یہاں ملتی ہے، ان کے
نزدیک ہمہ اوست ہی حقیقت توحید ہے، اور اس کو انھوں نے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور
دوسرے دلائل سے صحیح ثابت کیا ہے، اس دور میں جتنی بحثیں ہوتی رہیں ان میں شریعت کا دامن
کسی حال میں نہیں چھوڑا گیا، مگر آگے چل کر یہ ایک مستقل فتنہ بن گیا، اور کچھ ایسے صوفیہ پیدا ہو گئے،
جو توحید وجودی کے آڑ میں شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کرنے لگے۔ اور ان کے دلائل یہ تھے۔
کہ شریعت حقیقت کا چھلکا ہے، اور حقیقت شریعت کا گودا ہے، اور جب حقیقت حاصل ہو جائے
تو شریعت کی ضرورت باقی نہیں شریعت کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ معرفت حاصل ہو اور جب
معرفت حاصل ہو جائے تو شریعت کی پابندی سے آزادی ہو جاتی ہے، شرعی احکام کی پابندیاں
صرف عوام کے لئے ہیں، خواص امت کو معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر ان کو نماز و روزے کی ضرورت
باقی نہیں رہتی، کیونکہ نماز کی بنیاد تو اس پر ہے کہ آدمی اور خدا دو جداگانہ چیزیں یعنی غیر و غیریت
پر مبنی ہے، اور جب یہ غیریت دور ہو جائے تو پھر نماز کی پابندی بیکار چیز ہے، وہ عذاب
ثواب کے بھی منکر ہو گئے، کیونکہ وہ کہتے کہ وہ وحدت سے نکل کر کثرت میں آئے اور کثرت سے
وحدت میں گم ہو جائیں گے اور پھر ایسے صوفیہ طرح طرح کی بدعتوں میں مبتلا ہونے گئے، مثلاً وہ اپنے
مریدوں کو حکم دیتے کہ وہ ان کو سجدہ کریں، وہ حسین و جمیل صورتوں کی صحبتوں کو زیادہ پسند کرنے لگے۔

اور کہتے کہ حسن و جمال واجب الوجود سے مستعار ہے، اسی لئے حسینوں کی صحبت رسائی حق کی راہ ہے، وہ سادہ رخوں کے رنگ میں اللہ ہی کے ایسا رنگ دیکھتے اور حسینوں کے غمزوں اور عشووں کے ذریعہ مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے۔

ان خام صوفیوں کی کوتاہ بینی سے نہ صرف تصوف بدنام ہوا بلکہ اسلامی شریعت میں بھی گمراہی اور ضلالت پیدا ہونے لگی۔

حضرت مجدد صاحب کے تجدیدی اور اصلاحی کارناموں کی وجہ سے اس گمراہی میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ انھوں نے وحدت الوجود کا ازالہ وحدت شہود کی بحث سے کر دیا، وہ بہت بڑے عالم بھی تھے اور انھوں نے راہ سلوک میں ان تمام منزلوں کو بھی طے کیا تھا، جہاں عام صوفیوں کا طائر خیال بھی نہیں گیا تھا، انھوں نے واضح کیا کہ جس مقام پر جا کر صوفیوں کو وحدت الوجود محسوس ہوتا ہے۔ وہ سلوک کی آخری منزل نہیں، بلکہ درمیانی منزلوں کی واردات ہیں جہاں سالک کو محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہی ہے، اور اس ایک ذات کے سوا کچھ موجود نہیں، لیکن آگے بڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض وحدت شہود ہے، یعنی صرف ایسا نظر آتا ہے وحدت وجود نہیں یعنی واقع میں ایسا نہیں ہے، اس وحدت شہود کے بعد عبدیت کا مقام آتا ہے جہاں پہنچ کر خالق کائنات کی جداگانہ حقیقتیں روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہیں، اسی لئے مقام عبدیت اور ایمان بالغیب حضرت مجدد الف ثانی کے یہاں دونوں ایک ہی ہیں۔ حضرت مجدد نے ان علمی مباحث کو کچھ ایسے مؤثر انداز میں پیش کیا کہ وحدت الوجود کی فتنہ انگیزیاں دب کر رہ گئیں، آگے چل کر حضرت شاہ ولی اللہ نے ان جھگڑوں کو مٹانے کی خاطر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی، کہ اہل وجود اور اہل شہود کے درمیان نزاع لفظی ہے، اور فرق تعبیری ہے، حقیقی اور واقعی نہیں، ان مباحث سے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ وحدت الوجود کا مسئلہ عملی زندگی میں غیر مؤثر ہو گیا۔ اور یہ شاعروں یا بعض صوفیوں کے یہاں ایک روایتی عقیدہ بن کر رہ گیا۔

اورنگ زیب کے زمانے میں حضرت سرمد شہید کے شطحیات پر بھی علماء نے دار و گیر کی، لیکن ان کی شہادت کے سلسلہ میں بعض ایسے اسباب بھی تھے۔ جن کو بحث میں لانا میرے موضوع سے باہر ہے، البتہ عالمگیری دور میں دارا نے توحید وجودی کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرنا شروع کیا، اس نے

لینہ سالہ حسنات العارفین میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ توحید و معرفت کے منازل و مدارج
ی ایک ایسا مقام بھی آتا ہے، جب ایک سالک شریعت، کفر، ایمان، خیر، شر، عبد اور معبود سے
کل بے نیاز ہو جاتا ہے اور بیخودی میں اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں، جو بظاہر مذہب و
بان کے منافی ہوتے ہیں لیکن وہ قابل مواخذہ نہیں، اور وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی زبان سے
شطحیات صادر ہوئیں اور اسی مقام کے وجد و ذوق میں وہ صوم و صلوٰۃ سے مستغنی ہو گیا لیکن راسخ العقیدہ
علماء نے یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ بعض شطحیات ایسی ضرور ہیں جو بعض صوفیائے کرام کی زبانوں
سے غیر اختیاری طور پر نکلیں لیکن وہ خود دارا کی طرح ان کے جواز کے قائل نہ تھے، کیونکہ اسلامی تصوف
ں حال میں شریعت کے دائرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے، اور جب دارا نے مجمع البحرین لکھی
تو علماء کے حلقہ میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی، اس کتاب میں دارا نے اسلام اور ہندو مذہب کو ایک
ہی سمندر کے دو دھارے بتلائے ہیں، اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ
اسلامی تصوف کسی حال میں شریعت کے باہر نہیں اور اس میں اور فلسفۂ ویدانت میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور
فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید کریں حقانیت کی منزل تک پہنچ
سکتے ہیں، اس کتاب پر علماء نے دارا کو مرتد قرار دیا اور آگے چل کر اس کے یہی عقائد اس کے
زوال اور موت کا سبب بنے، دارا کی اس رواداری اور وسیع المشربی کی وجہ سے ایک گروہ
کی رائے ہے، کہ اگر دارا تخت پر بیٹھتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت باقی رہتی۔ ایک
دوسرا گروہ یہ بھی کہتا ہے کہ دارا کی تخت نشینی سے مسلمانوں کی سلطنت تو باقی رہتی لیکن اسلام
ختم ہو گیا ہوتا۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت تو ختم ہو گئی لیکن اسلام
باقی رہ گیا۔

اورنگ زیب حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر رہا، اسی لئے ان کے فرزند ارجمند
حضرت محمد معصوم قدس سرہٗ سے برابر رشد و ہدایت پاتا رہا، پہلے ذکر آچکا ہے، کہ حضرت مجدد کے
زمانے میں اسلامی معاشرت میں بھی گمراہی پیدا ہو گئی تھی، جس کو حضرت زندیقیت سے تعبیر کرتے
تھے، انھوں نے اپنے تجدیدی اور اصلاحی تحریکوں میں سارا زور اس پر دیا کہ ہر مسلمان خواہ بادشاہ ہو

یا ادنیٰ رعایا، عالم ہو یا جاہل، امیر ہو یا غریب، عارف ہو یا سالک اپنے عقائد اور اعمال کو کتاب و سنت کے مطابق صحیح کرے، اور ان ہی علماء اور صوفیہ کا تتبع کیا جائے، جنھوں نے صحابہ کرام اور اسلاف صالحین کے سرچشمہ سے فیض اٹھایا ہے، اور شریعت کی پابندی ہر حال میں ضروری ہے۔ اور جو شخص باطن کو درست کرتا ہے، اور ظاہر کو یوں ہی چھوڑ دیتا ہے، وہ بھی قابل تقلید نہیں اور جو عارف شرعی احکام کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے، وہ جاہل ہیں، احوال باطنی کا احکام شرعیہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے، اگر علوم لدنیہ کی مطابقت صریح علوم شرعیہ سے نہیں، تو ایسے تمام علوم کو حاصل کرنا الحاد اور بے دینی ہے، اورنگ زیب نے اپنے عہد میں ان تعلیمات کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔ گو ایک گروہ یہ بھی کہتا ہے کہ اورنگ زیب کی یہ کوشش بہت زیادہ بارآور نہیں ہوئی۔

صوفیہ کرام اور درباری تعلقات

صوفیہ کا ایک گروہ ایسا بھی تھا، جو حکمراں طبقہ سے میل جول بڑھا کر مخلوق خدا کو فائدہ پہنچانے میں لگا رہا، سہروردیہ سلسلہ کے بزرگوں نے سلاطین کے درباروں تک پہنچنے میں احتراز نہیں کیا، حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے تو شیخ الاسلام کا عہدہ بھی قبول کیا، اور ان کے پوتے حضرت رکن الدین نے تو قطب الدین مبارک خلجی جیسے حکمرانوں کے یہاں بھی جانے میں تامل نہیں کیا اور جب وہ دربار تشریف لے جاتے، تو راستہ میں اپنی سواری تخت رواں کو ٹھہراتے چلتے، تاکہ اہل ضرورت اپنی درخواستیں سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ان کی سواری پر ڈال دیں، بعض ضرورت مندوں کی معروضات زبانی بھی سنتے تھے، اور جب دربار پہنچتے تو ان درخواستوں کو سلطان کی خدمت میں پیش کرتے، اور ان پر احکام صادر کراتے اس طرح شاہی قربت سے خلق اللہ کو بڑا فائدہ پہنچتا رہتا۔

صوفیہ کا ایک گروہ ایسا بھی ضرور تھا، جو بادشاہت اور امارت سے بہت دور رہتا تھا کیونکہ وہ فقیری کی شان اپنی گمنامی اور بے نشانی میں سمجھتے تھے، سلاطین اور امراء کے تعلقات سے راحت پسندی اور سیم پروری کا خطرہ محسوس کرتے تھے، ان کا قول تھا کہ اغنیا کی صحبت فقراء

کے لئے سم قاتل ہے، وہ سلاطین اور امراء کے نذرانے بھی قبول نہیں کرتے، بلکہ بادشاہوں کی
دولت کو بھی دنیاوی نجاست تصور کرتے رہے، ایک بار حضرت رکن الدین دہلی سے واپسی میں
اک پٹن میں ٹھہرے اور حضرت بابا گنج شکر کے پوتے اور اس خانقاہ کے سجادہ نشین سے ملاقات
کے وقت معانقہ کیا، تو آخر الذکر نے غسل فرمایا کہ ان میں بھی نجاست لگ گئی ہے، حضرت
رکن الدین نے ان کے غسل فرمانے پر ان کی احتیاط کو سراہا، اور اپنی ذات سے ندامت کا
اظہار کیا۔

صوفیہ کرام کی شان استغنا

لیکن کچھ صوفیہ ایسے بھی گزرے ہیں جن کا تعلق اگر شاہی دربار سے ہوجاتا، تو اس سے
کوئی مالی فائدہ اٹھانے سے پرہیز کرتے، اور سلطان ایلتمش حضرت بختیار کاکی کا مرید تھا،
اس نے اپنے وزیر کے معرفت کچھ گاؤں کا فرمان لے کر ان کی خدمت میں بھیجا، خواجہ صاحب
نے لینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ ہمارے خواجگان نے کسی سے گاؤں قبول کیا ہوتا تو ہم بھی
قبول کر لیتے، اگر ہم گاؤں لے لیں تو قیامت کے روز اپنے خواجگان کو کیا منہ دکھائیں گے۔
سلطان ناصر الدین محمود نے حضرت فرید الدین گنج شکر کی خدمت میں اپنے وزیر الغ خاں کو چار گاؤں
کا فرمان اور ایک کثیر رقم بطور ہدیہ دے کر بھیجا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا، کہ ان کو دو، جن کو
ضرورت ہو، اسی طرح ایک بار ان کی خدمت میں والی اجودھن نے کچھ گاؤں اور نقد رقم پیش
کرنے کی کوشش کی، تو فرمایا کہ اگر میں یہ گاؤں اور رقم لے لوں تو مجھے لوگ درویش نہ کہیں گے
مال دار کہیں گے، اور درویش ولیہ دار میرا لقب ہوجائے گا، اور اگر اصرار کر کے سلاطین اور امراء
کچھ نذرانے اکابر صوفیہ کو پیش کرتے، تو وہ ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے مساکین اور
غربا میں تقسیم کر دیتے۔"

سلطان محمد تغلق نے حضرت شیخ قطب الدین منور کے پاس شہزادہ فیروز اور ضیاء الدین
برنی کو ایک لاکھ تنکہ دے کر ان کے پاس بھیجا، شیخ نے اتنی بڑی رقم دیکھ کر فرمایا: یہ درویش ایک
لاکھ تنکہ لے کر کیا کرے گا، شہزادہ فیروز اور مولانا ضیاء الدین سلطان کے پاس واپس گئے،

سلطان نے پچاس ہزار تنکے دے کر ہر دونوں کو بھیجا، شیخ نے ان کو قبول نہیں کیا، اور بالآخر دو ہزار تنکے بھیجے گئے، لیکن ان کو بھی قبول نہیں کیا۔ اور فرمایا درویش کے لئے دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے، لیکن بہت اصرار کیا، تو دو ہزار کی رقم لے لی، کچھ تو اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار کے لئے محفوظ رکھی، اور بقیہ فقراء میں تقسیم کردی۔

اسی طرح محمد تغلق نے حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے اخراجات کے لئے پرگنہ جاگیر کا فرمان جاری کیا، اور اپنے مقطع کو حکم دیا، کہ اگر وہ قبول نہ کریں، تو زبردستی دیا جائے، شاہی مقطع کی جان بخشی کی خاطر یہ جاگیر قبول کرلی، لیکن فیروز شاہ تغلق کے عہد میں دہلی جا کر یہ فرمان واپس کردیا، کہ یہ میرے کام کا نہیں، فیروز شاہ تغلق نے حصول برکت کے خاطر کچھ خدمت کرنی چاہی اور ایک بڑی رقم پیش کی۔ اس کو قبول تو فرمالیا، لیکن شاہی دربار سے نکلتے ہی فقراء اور مساکین میں تقسیم کردیا، اور درویشانہ استغنا کے ساتھ خالی ہاتھوں وطن کی طرف مراجعت کی۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا مطبخ ہمیشہ گرم رہتا، کئی ہزار فقراء اور مساکین ان کے مطبخ میں روزانہ کھانا کھاتے، اس لئے ان کے یہاں بہ کثرت نذرانے آتے، لیکن دن کو جو چیزیں خانقاہ میں آتیں شام تک تقسیم کردی جاتیں، خانقاہ میں دنیاوی ساز و سامان جمع ہو جاتے تو ان کو دیکھ کر ان پر گریہ طاری ہو جاتا، اور اگر کسی وقت کوئی قیمتی چیز بطور تحفہ آجاتی تو اور بھی زیادہ آہ و بکا کرتے، اور ہدایت دیتے کہ اس کو جلد از جلد تقسیم کردیا جائے، اور جب سارا مال تقسیم ہو کر محتاجوں کو پہنچ جاتا تو ان کو اطمینان ہوتا، ہر جمعہ کے دن تجرید فرماتے، تمام حجروں اور انبار خانوں کو یہاں تک خالی کراتے، کہ جھاڑو دیدی جائے، اس کے بعد جامع مسجد تشریف لے جاتے، اور اطمینان سے نماز ادا فرماتے۔ وہ بادشاہوں اور شہزادوں سے تحفے اور ہدیے قبول نہیں کرتے، اگر کوئی پیش کرتا تو ایک آہ سرد کھینچ کر فرماتے آہ! یہ لوگ درویشی کو غارت کرتے ہیں۔

درویشی کی غارت گری

آگے چل کر ان بزرگوں کی شان استغنا ان کے تمام سجادہ نشینوں اور ان کی اولادوں میں باقی نہیں رہی، اور انھوں نے مال دار اور دولت دار بن کر درویشی کو غارت کیا، اور ان کو اپنا تنخواہ خوان

کر کے سلاطین اور امراء ناجائز فائدے اٹھاتے رہے۔

دارا شکوہ کے پیر ملا جیو اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے، کہ جس طرح میں دارا کے حال کی طرف متوجہ رہتا ہوں، تم بھی رہا کرو، اگر تم اس کی طرف متوجہ نہ ہوگے تو خرابات بھرجاؤگے وہ اپنے مریدوں کو دارا شکوہ ہی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

آخری دور میں حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی، حضرت شاہ فخرالدین دہلوی جیسے بزرگوں نے صوفیہ کرام کی عظمت، استغناء اور توکل کی شان کو برقرار رکھنے کی کوشش ضرور کی، لیکن دنیادار صوفیہ کی بدعات، روایات، غیر شرعی حرکات کی ایسی بہتات ہوئی، کہ نہ صرف وہ بدنام ہوئے بلکہ تصوف پر بھی نکتہ چینی ہونے لگی۔ اور خود حضرت شاہ ولی اللہ کو یہ کہنا پڑا کہ اگر یہود کی حالت دیکھنا چاہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو اور اگر راہبوں کا نقشہ دیکھنا چاہتے ہو تو آج کل کے مشائخ کے سامنے بیٹھ کر کھینچ سکتے ہو، اور ان ہی دنیادار صوفیہ کی وجہ سے خانقاہوں کی اہمیت بھی جاتی رہی، اور جہاں علم، معرفت، تقویٰ، دین داری، اخلاص استغناء، توکل، حقوق العباد، حقوق اللہ اور تہذیب نفس کی بہترین تعلیمات حاصل ہوا کرتی تھیں، وہاں بدعات، عملیات اور تعویذ اور گنڈے کے سوا کچھ بھی نہیں رہا مسلمان بزرگوں کی قبروں پر جاکر جانور چڑھاتے اور ان کی قربانی کرتے۔ مدار صاحب اور سید سالار کی قبروں کی زیارت کو فریضۂ حج کے برابر سمجھتے اور بزرگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بناتے، عورتیں پیروں کے نام پر درے رکھتیں، اور اس کو اپنی حاجت براری کا ذریعہ سمجھتیں، بعض علماء ان مرکزوں کو غیر اسلامی شعار کا اڈہ سمجھ کر تصوف کے بھی مخالف ہو گئے۔

نتائج

خانقاہوں کی مرکزیت اور اہمیت ختم ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی روحانی، اور اخلاقی زندگی بھی کھوکھلی ہوتی گئی، اور وہ اپنے عہد حکومت میں برابر ذہنی بحران میں مبتلا رہے، ان کا دماغ حکمراں طبقہ کی طرف رہا، کیونکہ ان ہی کے ذریعہ ان کو دنیا ملتی تھی، لیکن جن کے ذریعہ ان کو دین ملتا، وہ حکمراں طبقہ کو ایک نجس اور پلید جنس سمجھتے رہے، اور پھر جہاں ان کی روح کی جلا ہوتی،

وہ ان دونوں کو اپنے سے بالکل علیحدہ پاتا۔ اس سے مسلمان ایک ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے، وہ کبھی اپنے جان و مال کے نگہبان، کبھی اپنے ایمان کے پاسبان اور کبھی اپنی روح کے محافظ کو تاکتے، اور زبان حال سے ان تینوں میں ہم آہنگی اور باہمی ربط کے خواہاں ہوتے، لیکن کوئی تحریک اور قوت ایسی پیدا نہیں ہوئی، جو ان میں یگانگت پیدا کر دیتی۔ اسی لئے مسلمان کبھی بادشاہ کے ساتھ ہو جاتے۔ کبھی علماء کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے اور کبھی صوفیہ کرام کا دامن تھامتے، اور اس ذہنی بحران کی وجہ سے قوم میں اجتماعی اتحاد اور ملی یکانگت پیدا نہ ہو سکی، اور وہ نہ صرف درباروں بلکہ علماء کے حلقوں اور خانقاہوں کے اندر بھی علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم ہو کر اپنی جماعتی، اور قومی زندگی کو کھلی بناتے رہے، وہ برسر اقتدار اس وقت تک رہے، جب تک ان کے حکمرانوں کی قوت برقرار رہی، اور جب یہ قوت کمزور ہو گئی تو انھوں نے خود محسوس کیا، کہ ان کے قوائے عمل شل ہو کر رہ گئے ہیں اور ان میں وہ کردار اور بلند اخلاق، عادات اور وہ فکر و عمل باقی نہیں، جس سے وہ اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکیں۔

شیخ محمّد عبدہ

(جناب ضیاء الحسن فاروقی)

تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں شیخ محمد عبدہ کی زبان پر یہ اشعار تھے:

ولست اُبالی ان یقال محمدٌ — اُبَلَّ اُو اکتظت علیہ المآتمُ

ولکن دینًا قد اُردت صلاحہٗ — اُحاذر ان تقضی علیہ العمائمُ

یعنی شیخ مرحوم کو نہ تو اپنی صحت یابی کی فکر تھی اور نہ اس کی کہ مرنے کے بعد لوگ اُن کے ماتم کرتے ہیں یا نہیں، فکر تھی تو صرف یہ کہ دین کی اصلاح اور ترقی کے لیے انھوں نے جو جد و جہد کی تھی، اس کا انجام کیا ہوگا اور دستار اور جبے والی قوم اس کے بارے میں کیا فتویٰ دے گی، دوسرے لفظوں میں یہ کہ انھیں نئی روشنی والوں کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا، اندیشہ تھا تو جبہ و دستار کی طرف سے جس نے ہمیشہ اپنے ہی مصلحوں کی کاوشوں کو اپنی تنگ نظری کا ہدف بنایا ہے۔

شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ء — ۱۹۰۵ء) کا جب انتقال ہوا تو ساری اسلامی دنیا نے اُن کا سوگ منایا، یہ سوگ اور [illegible] کا ماتم —— اس کا اندازہ آج بھی ہم رشید رضا کی کتاب تاریخ الاستاذ الامام (الجزء الثالث) سے کر سکتے ہیں۔ جو مختلف ملکوں کے جرائد و رسائل کے مقالات اور علماء و فضلاء کے بیانات پر مشتمل ہے، سوال یہ ہے کہ دیارِ مصر کے اس مفتی کی شخصیت اور کارناموں میں کون سی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے اس کی موت کو عالَم کی موت تصور کیا گیا اور اس کی وفات کو مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ اسلام کا ایک حادثہ قرار دیا گیا۔

مشہور مسیحی صحافی اور مصنف جرجی زیدان نے مشاہیر الشرق (الجزء الاول) میں لکھا ہے کہ شیخ مرحوم کے والد کاشتکار تھے اور ان کے دوسرے بیٹے کاشتکاری کے پیشے میں لگے ہوئے تھے، لیکن انھوں نے محمد میں ذہانت اور ذکاوت کے آثار دیکھے اس لئے انھیں گاؤں کے مکتب میں بھیج دیا جہاں انھوں نے کلام مجید

حفظ کیا، اس کے بعد وہ ۱۸۶۲ء میں طنطا آئے اور الجامع الاحمدی میں داخل ہو گئے، یہاں ان کا قیام
تین سال رہا، طنطا میں انھیں ذہنی آسودگی نہیں میسر آئی اور انھوں نے تعلیم ہی کو خیرباد کہنے کا ارادہ کرلیا۔
لیکن اس روحانی اور ذہنی اضطراب کی منزل میں ان کے چچا نے ان کا ہاتھ پکڑا، انھیں حصولِ تعلیم پر مائل
کیا اور تصوف کی راہ دکھائی۔ اسی سال وہ ازہر آئے، قیامِ ازہر کے زمانے میں تصوف سے ان کا شغف
بہت بڑھ گیا، ان کا زیادہ وقت ریاضت اور مراقبہ میں گزرتا یہاں تک کہ ترکِ دنیا کی منزل سے آگے،
اس موقع پر ایک بار پھر ان کے چچا نے ان کو سنبھالا دیا اور ترکِ علائق سے انھیں باز رکھا۔ بہرحال ازہر
کو جب انھوں نے چھوڑا تو بے اطمینانی کی حالت میں، غالباً وہ ازہر کے شیوخ سے بہت کم استفادہ
کرسکے: اس کی وجہ یہ تھی کہ شیخ جامعہ ازہر کے طریقۂ تعلیم کی خرابیوں سے نالاں تھے، انھوں نے ازہر سے
اپنے تہی داماں اٹھنے کا بڑا سبب "فسادِ طریقۃ التعلیم" ہی کو بتایا ہے۔

اس کے بعد وہ خود اپنے طریقے سے مطالعہ کرتے رہے، اس سے انھیں لذتِ علم کی دولت میسر
آئی، ان کے علم کو گہرائی اور ان کے فکر کو گیرائی نصیب ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے ۱۸۷۱ء میں مصر کی سرزمین
پر جمال الدین افغانی نے قدم رکھا، یہ ایک بڑا واقعہ تھا، افغانی کی شخصیت میں وہ جاذبیت تھی جو بجھی
روحوں کو پروانہ وار اپنی طرف کھینچ لیتی تھی، چنانچہ محمد عبدہ بھی مصری نوجوانوں کی ایک جماعت کے ساتھ
ان کے حلقہ میں بیٹھنے لگے، محمد عبدہ نے اپنی جودتِ طبع کی بدولت افغانی کے درس میں ایک نئی
محسوس کی کہ یہ عجمی "فیلسوف" روایتی علم کو ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے، یورپ کے ان علمی کارنامہ
کی قدر کرتا ہے جو ترجموں کے ذریعہ ان تک پہنچے ہیں، نوجوانوں کو ان کے مطالعہ کا شوق دلاتا ہے
وہ عہدِ جدید میں مسلمانوں کے مسائل کی نوعیت کو سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔
الغرض افغانی کے حلقہ میں انھیں امید کی کرن نظر آئی اور انھوں نے ادب، حکمت اور مذاہب کو نئی روشنی
میں دیکھنا شروع کیا۔ افغانی نے بھی ان کی صلاحیتوں کو پرکھ لیا اور دونوں ایک دوسرے کے بہت
قریب آگئے، افغانی نے جب مصر چھوڑا تو اپنے حلقہ والوں سے کہا: "میں جا رہا ہوں لیکن اپنے پیچھے
شیخ محمد عبدہ کو چھوڑے جا رہا ہوں، وہ تنہا مصر کے لئے کافی ہیں۔"

کہا جاتا ہے کہ افغانی اس عہدِ جدید میں عربی صحافت کے بانی اپنے شاگردوں کو تصنیف و تالیف

اور صحافت کی طرف متوجہ کیا اور خاص طور سے مقصدی صحافت کے اسرار و رموز ان پر واضح کیے، اسی کا اثر تھا کہ افغانی کے رخصت ہونے کے بعد محمد عبدہ نے بھی صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ ۱۸۷۹ء میں دار العلوم میں استاد کی حیثیت سے مقرر کیے گئے، لیکن جلد ہی وہ وہاں سے الگ ہو گئے، اور اپنے وطن واپس چلے گئے، ۱۸۸۰ء میں جب مصر میں لبرل وزارت کی تشکیل ہوئی تو وہ قاہرہ بلائے گئے اور سرکاری گزٹ وقائع مصریہ کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے، محمد عبدہ نے اس کے ذریعہ لبرل خیالات کی اشاعت کی۔

۱۸۸۱ء میں اعرابی پاشا کی مشہور بغاوت ہوئی، محمد عبدہ اس کے حق میں نہیں تھے، لیکن انقلاب کی ناکامی کے نتیجہ میں انھیں بھی ماخوذ ہونا پڑا، اس کی وجہ غالباً ان کے لبرل خیالات اور افغانی سے ان کے تعلقات تھے، بہرحال ۱۸۸۲ء میں وہ جلا وطن کر دیے گئے۔ وطن سے نکل کر وہ پہلے بیروت اور وہاں سے سید جمال الدین کی طلبی پر پیرس چلے گئے۔ "پیرس پہنچ کر انھوں نے بمعیت سید جمال الدین مشہور عربی اخبار العروۃ الوثقیٰ نکالا جس کے ابھی صرف چودہ ہی پرچے نکلے تھے کہ تمام یورپ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی، انگلستان نے ہندوستان اور مصر میں اس کی اشاعت روک دی، فرانس نے الجزائر اور تیونس میں قدغن کی، اور قیصر یزد (ترکی) گو ابتدا میں خوش ہوا لیکن پھر اس کی صدائے اصلاح و حریت سے ڈر کر ممنوع الاشاعت قرار دیا۔ پانچ سال کے بعد محمد عبدہ مصر واپس آئے اور اپنی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کا سلسلہ شروع کر دیا۔"

مفتی مرحوم کی اس بہت ہی مختصر سوانح میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس میں انقلاب کی گھن گرج سنائی دے، یا افغانی جیسی "آتش زن" شخصیت کی چنگاریاں نظر آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ استاد اور شاگرد کی شخصیتوں کا یہی فرق تھا، افغانی انقلابی تھے، محمد عبدہ مصلح تھے، افغانی اپنی جد و جہد کا ثمرہ بہت جلد چاہتے تھے، محمد عبدہ تعمیر و اصلاح کی تخم ریزی کر کے نتائج کا انتظار کر سکتے تھے، افغانی میدانِ سیاست کے مرد تھے، محمد عبدہ کا خیال تھا کہ پہلے ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنا چاہیے، ذہنی بیداری ہی پائدار سیاسی انقلاب کا ہراول بن سکتی ہے۔

انیسویں صدی میں مغربی استعمار کے دباؤ کے تحت اسلامی دنیا میں اصلاح و تغیر کی جو تحریکیں

پیدا ہوئیں سب کی بنیاد ایک اور سب کا مقصد ایک تھا" یعنی مسلمانوں کے اندر اُن تمام وسائل ارتقاء ذہنی و مادی کو پیدا کرنا جن کی وجہ سے وہ دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی عزت حاصل کریں"[۵۱]

مولانا آزاد نے ان تحریکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:[۵۲]

(۱) سیاسی تحریکیں ـــــ یعنی سیاسی تبدیلی کی صورتیں پیدا کی جائیں، مسلم حکومتوں کے باہمی نزاعات دور کئے جائیں اور اسلام کے سیاسی اقتدار کا کوئی مضبوط مرکز قائم ہو۔ ان تحریکوں کے سلسلہ میں امیر نظام (ایران)، مدحت پاشا اور اُس کے ہم مسلک رفقار کا نام آتا ہے" ان سب کے بعد سید جمال الدین اسد آبادی کا ظہور ہوا جس نے اس طریق اصلاح کو اپنے پیشرؤں سے بھی زیادہ قوی اور سریع العمل بنا دینا چاہا"

(۲) "الاصلاح الافرنجی" کی تحریکیں ـــــ اصلاح افرنجی کی اصطلاح محمد عبدہ کی وضع کی ہوئی ہے۔ ان تحریکوں کی بنیاد مغربی تمدن کی تحصیل واتباع پر رہی ہے۔ غالب تہذیب کی تقلید کی راہ بڑی آسان ہے، اس میں کسی کاوش فکر و اجتہاد کا بار گراں نہیں اٹھانا پڑتا، تہذیب حاضر کو اخذ وحصول کا سرچشمہ بنایا جائے اور باقی دوسری چیزیں جو تقلید کی اس راہ میں حائل ہوں متروک و مردود قرار دی جائیں" شیخ بیرم التونسی صاحب الافادۃ و الاعتبار اسی اصول کا داعی تھا" ابراہیم پاشا، سید ضمیر الدین پاشا اور علی پاشا مبارک وغیرہ اسی طرز کے لوگ تھے، اور ہندوستان میں سرسید احمد خاں کی تحریک کا مزاج بھی یہی تھا۔

(۳) دینی اصلاح کی تحریکیں ـــــ مجموعی طور پر ان تحریکوں کی اساس ان امور پر تھی کہ مسلمانوں کو اسلام کی صحیح تعلیم دی جائے اور تمام طبقات امت کا جہل دینی دور ہو، اور یہ کام انجام نہیں پا سکتا جب تک علماء کی اصلاح نہ ہو اور ان کا ذہنی جمود و تعطل نہ ٹوٹے علماء نئے علوم اور نئی زبانوں کو سیکھیں اور علوم دینیہ و عربیہ کی تعلیم و طرز تعلیم کی اصلاح و تہذیب و تسہیل کی جائے"[۵۳]

---

[۵۱] مولانا ابوالکلام آزاد، الہلال، جلد ۴، نمبر ۴، ۲۸ جنوری ۱۹۱۴ء۔ [۵۲] ایضاً۔ [۵۳] ایضاً۔

مرحوم شیخ محمد عبدہ اس تحریک اصلاح کے ایک بہت بڑے داعی تھے۔ لیکن اس موقع پر یہ کہنا بیجا
نہ کہ مولانا آزاد جیسا نکتہ رس اور باریک بیں عالم بھی مفتی محمد عبدہ کی تحریروں سے یہ نتیجہ نہیں نکال
سکا کہ مفتی مرحوم کی دینی اصلاح کا جذبہ صرف اس لئے نہیں تھا کہ نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق کوئی
اسلامی علم الکلام پیش کیا جائے، بلکہ دینی اصلاح ایک ذریعہ تھا جس کے سہارے انیسویں صدی کا
یہ ریفارمر مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کرنا چاہتا تھا، مولانا کی تحریروں سے محمد عبدہ کے اصلاحی رجحان
[illegible] دینی اصلاح کا مفہوم یہی رہا ہو کہ مذہبی
اصلاح کا کام بھی ہو جائے گا، لیکن خالص علمی سطح پر دونوں اصطلاحوں کا مفہوم مختلف ہے، پھر ذریعہ
کے مقابلہ میں مقصد کم اہم نہیں ہوتا اس لئے 'مقصد' کو بھی زیادہ واضح کرکے اور زیادہ زور دے کر
پیش کرنا چاہیئے، افسوس ہے کہ عبدہ کے کم و بیش سارے عرب سوانح نگاروں نے بھی یہی بتلانے کی کوشش
کی ہے کہ ان کی زندگی کا خاص مقصد مذہبی اصلاح تھا، غالباً عثمان امین پہلے شخص ہیں جنھوں نے
اس غلطی کی گرفت کی ہے اور کہا ہے کہ مفتی مرحوم کی اصلاحی تحریک کا یہ ایک پہلو تھا اور اہم پہلو تھا لیکن
یہی ساری تحریک نہیں تھی،

شروع ہی سے محمد عبدہ کے سامنے مسلم سوسائٹی کا اخلاقی مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ تھا،
ان کی تحریروں میں، خاص طور سے العروۃ الوثقیٰ کے مقالوں میں حب الوطنی، آزادی اور قربانی و جانفشانی
کی قدروں کی اہمیت اور افادیت تکرار کے ساتھ سامنے آتی ہے، وہ اپنے سماج کے افراد
میں ان قدروں کو جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں، مفتی اعظم کی حیثیت سے انھوں نے اجتہاد کی اہمیت
اور اجتہاد کی ضرورت کو بہت زور دے کر بیان کیا، اور اس بات کو واضح طور پر پیش کیا کہ آزادی
کے ساتھ تفکر و تدبر کا حق مہذب انسان کا بنیادی حق ہے، انھوں نے جرأت کے ساتھ اس کا
بھی اعلان کیا اور بار بار کیا کہ علماء کی علمی کاوشیں بے سود ہیں اگر اُن سے عمل کی تحریک نہیں ہوتی
اور وہ اعمال و اخلاق سے بے تعلق رہتی ہیں۔[1]

---

[1] THE MUSLIM WORLD اپریل ۱۹۴۶ء، صفحہ ۱۵۳۔

بہر حال، اگر ہم مفتی مرحوم کی اصلاحی تحریک کا مجموعی طور سے جائزہ لیں اور اس کا خلاصہ بیان کریں تو اس سے بہتر نہیں بیان کر سکتے جو انھوں نے خود العروۃ الوثقیٰ کے پانچویں نمبر کے مقالہ افتتاحیہ کے آخر میں کہا ہے اور جسے مولانا آزاد نے اپنی زبان میں یوں لکھا ہے:

"یعنی اگر ہم قرآن کریم کا تدبر و تفکر کے ساتھ مطالعہ کریں اور پھر اُن تمام حوادث و انقلاب پر نظر ڈالیں جن کی وجہ سے آج تمام عالم اسلامی مبتلائے مصائب و آلام ہے تو ہم پر واضح ہو جائے گا کہ یہ سب کچھ نتیجہ صرف اس امر کا ہے کہ خدا کے حکموں سے ہم نے روگردانی کی، ہدایت قرآنی کی راہ سے ہٹ گئے، اور صراط مستقیم کو چھوڑ کر تابع ہوائے نفس و خطوات الشیطان ہو گئے، اور قرآن کہتا ہے کہ خدا کسی قوم کو کوئی نعمت دے کر پھر واپس نہیں لیتا جب تک کہ وہ خود اپنی صلاحیت کو ضائع نہ کر دے۔

پس علماء راسخین پر کہ فی الحقیقت جسم ملت کے لئے روح اور امت مرحومہ کے قدرتی پیشوا ہیں، فرض ہے کہ سب سے پہلے بیدار ہوں اور غافلوں کو بیدار کریں ..... اگر انھوں نے قوم کو بیدار نہ کیا اور اس کی گذری ہوئی حالت تک نہ لوٹایا جو عصر نبوت اور صحابہ کرام کے وقت تھی، اور نیز تمام بدعات و زوائد اور اعمال سیئہ خلاف قرآن و سنت کی ظلمت سے مسلمانوں کو باہر نہ نکالا، تو یہ یقینی ہے کہ وہ وقت آخر اس قوم کے لئے بھی آنے والا ہے جو امم ماضیہ پر آچکا ہے۔"[۵]

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مفتی مرحوم کے اصلاحی پروگرام کے دو بنیادی اصول تھے (۱) کتاب و سنت کی پابندی اور (۲) علما کی بیداری اور شریعت کی اصلی و حقیقی تعلیم کی دعوت اور اشاعت، اُن کی تحریروں اور ان کی تمام سرگرمیوں میں اساسی طور پر یہی اصول کارفرما ہے۔ ازہر سے وہ مایوس تھے، سیکولر تعلیم سے بھی وہ کوئی امید نہیں رکھتے، ان کا یقین یہ تھا کہ اگر علماء کی اصلاح ہو جائے اور اُن کی ایک فعّال اور بااثر جماعت بن جائے تو مسلمانوں کی اصلاح

---

۵ مولانا آزاد، الہلال، جلد ۴، نمبر ۴، ۱۱ر فروری ۱۹۱۴ء

سکتا ہے اور وہ اس عہدِ جدید میں ایک باوقار ملت کی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں۔

اعرابی کی بغاوت کے بعد جب وہ بیروت میں جلا وطنی کی زندگی گذار رہے تھے تو انھوں نے جیاد تعلیم علوم دینیہ اسلامیہ کی ایک مبسوط اور مفصل اسکیم لکھی اور "لائحۃ الاصلاح والتعلیم الدینی" کے نام سے بذریعہ شیخ الاسلام سلطان عبدالحمید کے حضور میں پیش کی۔[۱] مقصود یہ تھا کہ قسطنطنیہ میں سلطان کی سرپرستی میں ایک جامعہ سلامیہ قائم ہو جس میں نئے طرز کا نصاب پڑھایا جائے، اور اس طرح رفتہ رفتہ بالغ النظر علماء کی ایک جماعت تیار ہو جائے، لیکن عبدالحمید کا عقیدہ یہ تھا کہ اصلاح و تجدید کی کوئی اسکیم خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو اس کے استبداد کے لیے مہلک ہوگی، اس لئے اس نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی، اس کے بعد ازہر کی اصلاح کرنا چاہی مگر وہاں سے بھی انھیں استعفا دینا پڑا، پھر مدرسۃ دارالعلوم کا کام شروع کیا مگر اس سے بھی جو مقصود تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ بہرحال وہ تمام عمر اس کوشش میں سرگرداں رہے کہ مذہبی تعلیم کی اصلاح و تجدید ہو اور ایسے صالح علماء اور انجینئر تیار کئے جائیں جو دین کی اساس پر نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کا کام کرتے رہیں۔

اعلیٰ مذہبی تعلیم کی اصلاح کے علاوہ مفتی محمد عبدہ نے مذہبی اصلاح و تجدید کی بھی کوشش کی اور یہ صاف طور سے اس مقصد سے کی کہ اس میں اور صرف اسی میں مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کے امکانات انھیں نظر آتے تھے، کتاب و سنت کی حقیقی تعلیم پر مُضر صوفیانہ تصورات اور صدیوں کے تباہ کن اثرات کے جو پردے پڑے ہوئے تھے، مفتی مرحوم ان کو ہٹا کر اسلامی تعلیمات کے صحیح خدوخال نمایاں کرنا چاہتے تھے، رسالۃ التوحید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "عقل" کے دشمن نہیں تھے، توحید اور نبوت کے مباحث کو وہ عقلیت سے ماورا نہیں تصور کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ ان کو خالص عقل کے سہارے ثابت کیا جا سکتا ہے، ان کی نظر میں اسلام کی یہی وہ خصوصیت ہے جو دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی، ان کا خیال تھا کہ عہد وسطیٰ میں اسلامی تھیالوجی کا جو ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تھا وہ پورے طور پر

---

[۱] مولانا آزاد، الہلال، جلد ۴، نمبر ۴، ۱۱ فروری ۱۹۱۴ء

قرآنی نہیں تھا، مسلم فلسفیوں پر جو ہیلینی اثرات تھے، ان کی تہذیب وہ توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ نہیں کر سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان کے قابو میں نہیں رہے۔ امام غزالی نے ان کی گرفت کی لیکن وہ بھی توازن کھو بیٹھے اور امام مرحوم کے پیروؤں نے تو اور بھی غیر متوازن ہونے کا ثبوت دیا، اسلامی تھیالوجی کو اس بات سے بھی نقصان پہنچا کہ اسلام کی سیاسی توسیع اور غیر عجمی قوموں میں اسلام کی اشاعت بڑی تیزی کے ساتھ ہوئی، اور اس سرعت کا مقابلہ تھیالوجی کی ترتیب و تدوین کی تدریجی ترقی نہیں کر سکی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا، یعنی مختلف النوع افکار و خیالات عقائد و اعمال، رسم و رواج اور عرف و عادات کا کوئی ایسا متوازن سسٹم نہیں بن سکا، جس کی اساس مطلق قرآنی ہوتی، اور یہی وجہ ہے کہ عہد جدید میں عہد وسطیٰ کے پورے کلامی نظام پر نظر ثانی اور جدید تصورات کی روشنی میں اسلامی عقائد کی تشریح کی ضرورت ہے، یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک آرتھوڈوکس تھیالوجی پر عمل جراحی نہ کیا جائے اور اس سے گذر کر قرآن و سنت کی اصل تعلیم کو نہ سمجھا جائے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ مفتی محمد عبدہ عہد وسطیٰ کی تاریخ اور اس کے کارناموں سے منکر تھے، وہ انہیں تسلیم کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ تنقیدی نقطۂ نظر کی تبلیغ کرتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ تاریخی تنقید سے کام لے کر اور آرتھوڈوکس تھیالوجی کی تنگنائیوں سے نکل کر علماء کو "موڈرن ازم" کی کھلی فضا میں آنا چاہیے، ہندوستان میں شبلی نے سرسید مکتب خیال کے ردعمل کے طور پر اس میدان میں ٹھوکر کھائی اور تجدید کے بجائے یہ کوشش کی کہ آرتھوڈوکسی کو کسی قدر وسیع الخیال بنایا جائے، انجام یہ ہوا کہ وہ تمام عمر روایت کے چکر سے نہیں نکل سکے اور جدیدیت سے بیزار رہے، برخلاف اس کے مفتی محمد عبدہ نے روایتی تھیالوجی کی اصطلاحوں سے کام تو لیا لیکن اس لئے کہ "جدیدیت" کے لئے فضا ہموار کریں، اور یہی ان کا نمایاں کام ہے یہ بات وہ جرأت کے ساتھ اس لئے کہہ سکے کہ وہ "تقدیم العقل علی الظاہر الشرع" کے اصول پر ایمان رکھتے تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ دین کی اساس تفکر و تدبر ہے اور تفکر و تدبر بغیر عقل کے ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اندھی تقلید کے سخت مخالف، پیر پرستی کے سخت دشمن اور اوہام و مضر روایات کے باغی تھے، اور یہی سبب ہے کہ وہ "مغربی تہذیب" کی اچھی قدروں کو اپنانے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔

دیا جب رنج بُتوں نے ......

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

بُت تراشی اور بُت پرستی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ شعور کی بیداری کے ساتھ یہ کاروبار شروع ہوتا ہے اور حالات کے مطابق اس میں گرمئ بازار آتی ہے۔ ہر کس و ناکس بقدرِ ظرف اپنے اصنام تخلیق کرتا ہے اور خود ہی اپنی مخلوق کا پجاری بن بیٹھتا ہے بس۔ یہی متاعِ سوز و سازِ زندگی ہے اور یہی وہ دو سِرے ہیں جن کے درمیان ساری داستانِ حیات بنتی اور بگڑتی ہے۔ انسان اپنے حقیقی بُت، مٹی یا پتھر سے نہیں بناتا۔ وہ کسی دھات کے بھی نہیں ہوتے۔ در اصل وہ کسی مادی پیکر کے رہینِ منت ہوتے ہی نہیں۔ انھیں واقعات و حادثات کے چاک پر رکھ کر کردار کے ردِ عمل سے بنایا جاتا ہے۔ ان کا خمیر فکر و نظر ہے۔ انھیں آپ آرزو کہیے یا خواہش، حسرت بتلائیے یا تمنا امید سمجھے یا ارمان۔ یہ سب وہی خود ساختہ بُت ہیں جن کی پرستش میں عمرِ عزیز بِتایا کرتی ہے۔ ان سب کا مسکن خلوت کدۂ دل ہے جہاں ان سب کو سجایا جاتا ہے۔ ان میں بھی حفظِ مراتب ہوتا ہے۔ اور یہ بھی وقتی یا مستقل، معیّن اور غیر معیّن ہوا کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص اپنے اپنے بُت سینے سے لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ اُن سے مطلب براری بھی نہیں ہوتی تاہم لوحِ دل سے اپنے بنائے ہوئے نقوش مٹانے کا یارا نہیں ہوتا۔ جب کبھی حقائق کی چٹان پر گر کر کوئی بُت پاش پاش ہو جاتا ہے تب بھی اس کو بالکل جُدا کرنے میں وقار مانع آتا ہے۔ کبھی کسی حذف ریزے کو دل میں رکھ لیا جاتا ہے، کبھی ضد کر کے از سرِ نو اس جیسے کئی اور صنم تیار کر لئے جاتے ہیں۔ اور کبھی کسی دوسرے قبیلے کے بُت کو مسند نشین بنا لیا جاتا ہے۔

در اصل یہ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کا معاملہ ہے۔ اس طرح جب کبھی آرزوؤں کی بساط قطعی طور پر درہم برہم ہو جاتی ہے اور حقائق سے آنکھ ملانے کی جرأت باقی نہیں رہتی تو

احساسِ محرومی و ناکامی کو قابلِ قبول بنانے کے لئے ہمارا ذہنِ رسا بہت سی دھوکے کی ٹٹیاں اپنے آگے کھڑی کر لیا کرتا ہے تاکہ شکست فاش کا گمان دل سے محو ہو جائے۔ اس ملمع سازی کے عمل سے خامیوں کے چہرے پر وقتی طور پر نقاب پڑ جاتی ہے اور اعتراف کی آزمائش سے بچ نکلنے کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ ان خود فریبیوں کی ایک شکل تلافی کی کوشش میں بھی نکل آتی ہے۔ اس صورت میں کسی خصوصیت پر بے جا زور دے کر اُسے طرۂ امتیاز بنا لیا جاتا ہے تاکہ دوسرے کمزور پہلوؤں پر نظر نہ پڑے اور ایک کمی کا دوسری زیادتی سے تدارک ہو سکے۔ آپ نے لکیر کے فقیر دیکھے ہوں گے جو بس ایک ہی ڈگر پر چلتے ہیں ان کا یہی یک طرفہ جھکاؤ اور طبیعت کی یک رنگی شدت اختیار کر جائے تو انھیں خبطی بنا دیتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ دیوانہ لاکھ بکار خویش ہوشیار ہو، وہ بہر حال دیوانہ ہے۔ تلافی کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اسی ایک کمی کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو تج دیا جائے اور وہ ایک نقطہ ہی مرکزِ حیات بن کر رہ جائے۔ جان جائے، آن نہ جائے والا معاملہ ہو، اس غیر معمولی جوش میں کبھی نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ تلافی کے بجائے اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس تگ و دو سے اصل مقصد پھر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ذہنی توازن قائم نہیں ہو پاتا اور شخصیت کی ترازو کا پلہ کسی نہ کسی طرف جھکا ہی رہتا ہے۔ تلافی کے ان دو نمایاں طریقوں کی مختلف اور متعدد صورتیں ہوا کرتی ہیں۔ بچپن میں اس کیفیت کے مظاہرے بڑے کھلے دل سے کیے جاتے ہیں۔ بچوں کا دند پکار، مار پیٹ، چھیڑ چھاڑ سب اپنے وجود کو تسلیم کرنے کے مختلف ڈھنگ ہوا کرتے ہیں۔ جب ان پر بھی بڑوں کی گرفت ہونے لگتی ہے تو شرارت پر کمر باندھ لی جاتی ہے۔ ذرا سمجھ آئی تو باقاعدہ جھوٹ بولنے لگے، اٹھائی گیرا پن پیدا ہو گیا۔ بد تمیزی کرنے لگے۔ گستاخ ہو گئے۔ نوجوانی کی امنگ آتے آتے اظہارِ جنسی پر اتر آئے۔ طبیعت میں شہدہ پن داخل ہو گیا۔ اور ایسے ہی دوسرے کرتوت جنھیں طفلانہ حرکتوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، اختیار کر لئے جاتے ہیں۔ ایک نحیف الجثہ لڑکا، فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتا ہے دوسرا کھلاڑی لڑکا، کتابوں کی تحقیر کیا کرتا ہے۔ ایک محنتی اور ذہین طالب علم، میدانی کھیلوں میں اپنی عدم شرکت کو فخریہ بیان کرتا ہے۔ یہ سب کس لئے؟ دراصل یہ وہی ہیں جنھیں اپنی کسی کوتاہی کا بڑا قلق ہے اور صورتِ حال کی طرف ایک صحتمندانہ نظریہ رکھنے کے بجائے کچھ اس طرح تاؤ کھا گئے

ہیں کہ کسی اور طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں۔ وہ ایک ہی میدان میں اپنی کارگزاری کا ایسا سکہ جمانا چاہتے ہیں کہ دوسری تمام کمزوریوں کا تدارک ہو جائے۔ بڑوں کے مسائل بھی بڑے ہوتے ہیں تحصیل علم، فکر معیشت، غم روزگار، اس چندروزہ زیست میں سب ہی تقاضے سہنے پڑتے ہیں۔ مزید برآں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روز بروز زمین سخت اور آسمان دور ہوتا جاتا ہے، اور نوبت یہ آجاتی ہے کہ شوق کا سارا کاروبار لٹ کر رہ جاتا ہے اور امید کا سب کھیل بگڑ جاتا ہے ایسی صورت میں حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت باقی نہیں رہتی اور بہت سے مردان کار بھی خود کو کھلونوں سے بہلانے لگتے ہیں بے کیف زندگی میں کچھ حرارت پیدا کرنے کے لئے بے سود مشاغل کا سہارا ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔ یہ مشغلے ہی زندگی کے اصل کام کا جواز بن جاتے ہیں۔ نئی نئی دلچسپیاں پیدا کرلی جاتی ہیں، گپ شپ، تاش، شطرنج اور ایسی ہی دوسری تضییع اوقات کی ترکیبیں نکال لی جاتی ہیں۔ یہ سب گھڑی دو گھڑی کی ہلکی پھلکی تفریحیں چوبیس گھنٹے کا کام بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہی دفتر بے معنی غرقِ مۓ ناب اولیٰ کا نعرہ لگا کر زندگی کے بکھیڑوں سے کترا کر نکل جانے کی یہی صورت، سکون کا باعث بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ یوں تو تاریخ عالم میں ایسی بھی داستانیں نکل آئیں گی جو تلافی کی وہ خوشگوار مثالیں ہیں جن سے گلزار ہستی میں نکھار آیا۔ لیکن اسی احساس کی بدولت لباسِ انسانیت کے پرزے اڑانے والے بھی پیدا ہوئے۔ لیکن یہ تو وہ لوگ ہیں جو ایک دھن میں لگ کر رہ گئے۔ اگر راہ نیک تھی تو سماج کو فائدہ بھی پہنچا، اگر بے راہ روی تھی تو نقصان ہوا۔ لیکن وہ راہ، صرف ایک ہی رہی۔ ان کی اپنی شخصیت ہر اک شے میں کسی شے کی کمی باقی رہی اور بالآخر کسی حصار میں اپنے آپ کو ایسا مقید کر ڈالا کہ دنیا و مافیہا کی کوئی خبر ہی نہ رہی۔ یہ سب اپنے خبط میں مبتلا تھے۔ ترقی کی تو مجنوں اور دیوانہ ہو گئے۔ لیکن ایسے لوگ بکثرت ہیں جو محض فروعات میں اپنے آپ کو الجھا کر اپنی بے عملی کا تدارک کیا کرتے ہیں۔ یہ محض کاغذی پھولوں سے اپنے آپ کو تسلی دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا کھوکھلا پن تیزی سے بڑھتا رہتا ہے اور یہ فریب کھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ محض ظاہری لیپ پوت پر زندگی کی عمارت کھڑی رکھتے ہیں۔ عجیب عجیب مضحک اور مضحکہ خیز طور طریقوں سے اپنے آپ کو توجہ کا مستحق بناتے ہیں

اپنی ظاہری شکل وصورت میں کچھ ایسے سرخاب کے پَر لگا کر نمودار ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ ان پہ نظر پڑے۔ اس طرح روپ سے نہ سہی بہروپ سے ہی تھوڑی سی شانِ امتیاز کا خود کو حقدار بنا لیا جاتا ہے۔ اور دلِ ناصبور کو تھپ تھپانے کا موقع مل جاتا ہے۔ لباس کی انوکھی وضع قطع، مانگ پٹی کلیے جا اہتمام، ناز نخرے کا التزام جیسے تمام ہتھکنڈے عموماً احساسِ کمتری کے غماز ہوتے ہیں۔ معمولی معمولی چیزوں کا غیر معمولی انتظام، ذرا ذرا سی بات پر حد درجہ توجہ، بس ایسے ہی ڈھکوسلے ہیں جن کی اوٹ میں حقائق کی چمک دمک سے اپنی آنکھوں کو خیرہ ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ کوئی اپنی نااہلی کی خلش کو چھپانے کی غرض سے اپنے ماتحتوں پر حفظ ماتقدم کے تحت ہر وقت گرم رہتا ہے، کوئی اپنا سارا رعب داب اپنے متعلقین پر ہی دکھا کر ماحول میں اپنی بے اثری کی کمی پوری کر ڈالتا ہے۔ کوئی ناک چڑھا، تنک مزاج یا مرزا پھویا ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی کے ظرف کی تنگی اسے اترانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ذرا سی خوبی بھی انوکھی کا ئیا ہو کر رہ جاتی ہے۔ طبیعت کا چھچھورا پن معمولی معمولی حرکات سے ٹپکنے لگتا ہے۔ کسی کے پاس لے دے کر بس گز بھر کی ایک زبان رہ جاتی ہے۔ ہر ایک پر اسی کی مار لگاتا ہے۔ کسی کے چوٹ لگے یا نہ لگے انھیں محض چونکا دینے سے مزا آجاتا ہے۔ یہ محض طنز کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ انھیں کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن سمجھتے ہیں کہ بڑا تیر مارا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کارواں گزرتا چلا جاتا ہے اور یہ ضلع جگت، پھبتی، طعن و تشنیع، اعتراض و تنقیص کے آلات سے مسلح اپنے ہوائی فیر کرتے رہتے ہیں۔ اصل نقصان صرف ان کا ہوتا ہے، کسی دوسرے پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ لہٰذا بجائے کھسیانی بلی کی طرح ہر وقت کھمبا نوچتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ذرا نظر دوڑائیے تو آپ کے آس پاس ہی کوئی نہ کوئی ایسی مریضانہ شخصیت دکھائی دے جائے گی۔ ہمارے ایک شناسا ہیں جن کا سارا زورِ طبیعت محض زبان کی غلطیاں پکڑنے اور تلفظ کی اصلاح کرنے کے کارِ خیر میں صرف ہوا کرتا ہے، ذرا کسی نے زبان کھولی، اور انھوں نے زبان پکڑ لی۔ بولنے والے کو اپنی زبان بگڑنے کا احساس نہیں ہوتا لیکن ان حضرت کا چہرہ ضرور بگڑ جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اب انھوں نے اس کا ٹیٹوا دبایا۔ مختلف طریقے سے پیچ و تاب کھایا کرتے ہیں اور جب تک اپنا

ذہن انجام دے نہیں لیتے انھیں چین نصیب نہیں ہوتا۔ یہ سلوک تو محض آدابِ محفل کے خیال سے روا رکھتے ہیں ورنہ براہِ راست ایک ہی حملے میں سیدھے گردن پر سوار نظر آتے ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ "کوئی بچہ بھی شامت اعمال سے داد فریاد دے کر حاضر ہو گیا ہے تو آپ کی توجہ اولاً اس کی ناہموار گفتگو کی طرف مرکوز ہوتی ہے اور اس کے بعد نفسِ مضمون پر توجہ فرماتے ہیں لیکن ان کی اس نکتہ چینی کا انجام یہ ہے کہ موصوف نے ورثے میں جو زبان پائی تھی، اسی پر آج تک تکیہ ہے مگر جن کی حرف گیری فرماتے رہے ہیں ان میں سے اکثر بحرِ معنی کے جوہر شناس بن چکے ہیں۔ اپنی پستی اور دوسرے کی بلندی دیکھ کر طبیعت اور کڑھتی ہے اور وہ پھر اپنا عمل مزید شدومد سے شروع کر دیتے ہیں۔ اب جس قدر "زیادہ اصلاح فرماتے ہیں، ستم ظریف احباب اتنی ہی کشادہ دلی سے قہقہہ لگاتے ہیں۔ ان کی جان جلتی ہے، لوگوں کو مزہ آتا ہے۔ کل تک جو عمل طرۂ امتیاز بن کر قدرے سکون پہنچایا کرتا تھا، اب جنون کے حدود میں داخل ہوتا جا رہا ہے۔ جس پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!

اس طرح اصل ٹانگوں کے بجائے بیساکھیوں پر چلنے والا اپنے متاع کا عشرِ عشیر بھی بمشکل حاصل کر پاتا ہے۔ اس کی خلش خود فریبیوں کے طفیل کم نہیں ہوا کرتی بلکہ جن بنیادی جذبے کی آسودگی کے لئے یہ جتن کئے جاتے ہیں، اسی بنیادی جذبے کو اس کے طرزِ عمل سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ وہ احساسِ کمتری سے بچنا چاہتا ہے لیکن اس کے اوچھے وار اسے اور زیادہ ذلیل و خوار کرتے ہیں۔ اگر آلامِ روزگار کو آسان بنانے کے لئے، ہر غم، غمِ جاناں، بنایا جاتا ہے تو زندگی کا توازن بگڑتا ہے۔ اگر محض ایک ہنگامے پر گھر کی رونق کو موقوف سمجھ کر 'نغمۂ شادی' کی تلافی 'نوحۂ غم' سے کرنے کی فکر کی جاتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ بات تو بس شاعری ہے۔ جس طرح ٹوپی کی کمی، جوتوں پر اضافہ کر کے پوری نہیں کی جا سکتی، اسی طرح ایک بنیادی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں، یہ مناسب ہے کہ سر کو ایک قسم کی ٹوپی نہ ملے تو دوسری قسم کی ٹوپی سے ڈھک لیا جائے۔ یعنی نعم البدل تلاش کر لیا جائے۔ ایسی صورت میں کوئی نقصان نہیں ہوتا اور شخصیت کا توازن قائم رہتا ہے۔

پہلے تلافی کے عمل کی واحد وجہ احساسِ کمتری کو سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نئی تحقیقات نے واضح

کر دیا ہے کہ صرف احساس کمتری اس قسم کی حفاظتی تدابیر کی طرف رجوع نہیں کیا کرتا کیونکہ بہت سے احساس کمتری کے شکار ایسی کسی کوشش میں مشغول نظر نہیں آتے۔ اس کے برخلاف بہت سے اچھے خاصے بھلے مانس اس طرف جھک پڑتے ہیں۔ اس بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ عزّت بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے'۔ ہم اپنے آپ کو اپنے ماحول کے طرزِ عمل سے بہت کچھ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اپنے بازار میں جو کچھ ہماری قیمت لگتی ہے، اس سے ہم متاثر ہوتے ہیں۔ کبھی لوگ ہمیں مغالطے میں ڈال دیتے ہیں اور کبھی ہم خود ہنس کی چال دیکھ کر اپنی چال بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اپنا ٹھیک ٹھیک طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا۔ اور یہی زندگی کا المیہ ہے۔ ہماری توقعات اگر ہمارے حالات سے میل نہیں کھاتیں تو پھر عبرت سرائے دل میں آوازِ 'دور باش' ہو کر ہی رہنا پڑتا ہے۔ حسرت نے کیا خوب کہا ہے:

غمِ آرزو کا حسرت سببِ اور کیا بتاؤں مری ہمتوں کی پستی، مرے شوق کی بلندی

لہذا ضرورت یہ ہے کہ حالات کا جائزہ لیا جائے اور اپنی صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر اپنی زندگی کا لائحۂ عمل تیار کیا جائے اور 'موجِ حوادث سے' ہنستے کھیلتے گذر جانے کی عادت ڈالی جائے۔ یاد رکھئے کہ شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں گرتے ہیں۔ اس لئے نہ شکست میں ذلت ہے اور نہ کسی ایک ناکامی میں زندگی کی محرومی کا رزارِ حیات میں بہت سے مورچے لگتے ہیں جب فتح نصیب ہوتی ہے تو ان میں ناکام اور کامیاب سب ہی معرکے شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے نظریے کی استواری ہماری حقیقت پسندی میں مضمر ہے۔ اگر دل کے صنم کدے میں خیالی پرستان بس گیا تو ان بتوں کا ہٹانا دشوار ہے اور وصال کا سوال نہیں اٹھتا۔ اب اگر ان بتوں سے آخر وقت میں منہ موڑ کر تلافی کی بھی کوئی صورت نکال بھی لی تاہم آسودگی محال ہے۔ اس وقت اس حقیقت کا انکشاف اور سوہان روح بن جائے گا:

خدا کی بے نیازی ہائے مومن ہم ایمان لائے تھے نازِ بتاں پر

کامن ویلتھ اور ہندوستان

جناب شاہ عبدالقیوم

سیاست کے میدان میں انگریز قوم کی فراست ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ کامن ویلتھ کی تشکیل دراصل اس قوم کی سیاسی سوجھ بوجھ، مصلحت آمیزی، دور اندیشی اور حکمت عملی کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ وہ تمام قومیں جو آزاد ہونے سے پہلے کسی نہ کسی صورت میں حکومت برطانیہ کے زیر اقتدار تھیں اور جن سے انگریزوں کے سیاسی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات تھے اور جہاں انگلینڈ کے کارخانوں کے لئے خام اشیاء کے خزانے اور تیار شدہ مال کی منڈیاں تھیں، انگریزوں نے سوچا کہ وہ آزادی پانے کے بعد برطانیہ سے اس طرح قطع تعلق نہ کرلیں کہ ساری تجارتی سہولتیں ختم ہوجائیں، تمام سیاسی رشتے ٹوٹ جائیں اور قوم جو کل تک حکمران تھیں آج بالکل بے دست وپا ہوکر رہ جائے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کامن ویلتھ کی بنا رکھی گئی۔

ہندوستان کی آزادی سے پہلے یورپ افریقہ اور ایشیا کی جو بھی قومیں اس ادارے کی ممبر تھیں وہ اگرچہ اپنے داخلی معاملات اور خارجہ پالیسی کی تشکیل و تعمیل میں مکمل آزاد تھیں اور کوئی ممبر کسی کے ماتحت نہیں تھا، لیکن پھر بھی انفرادی حیثیت سے ہر ممبر تاج شاہی کا فرمانبردار تھا۔ اس انجمن کے ہر ممبر کے لئے برطانوی انداز کی پارلیمانی جمہوریت کا قیام لازمی تھا جس میں گورنر جنرل کا تقرر تاج برطانیہ کی منظوری سے ہوتا تھا، اور ہر ممبر ملک میں ایک دوسرے کے سفیر ہائی کمشنر کہلاتے تھے، لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد اس انجمن کے ڈھانچے، دستور اور روایات میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آزاد ہندوستان اس انجمن کا رکن تو بننا چاہتا تھا لیکن تاج برطانیہ کی رسمی پابندی کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ بلکہ ایک مکمل آزاد اور خودمختار جمہوریت قائم کرنا چاہتا تھا جس میں حکومت کا سربراہ گورنر جنرل کی بجائے عوام کا منتخب صدر ہو، جس میں

حکومت اپنے دستور اور روایات کی روشنی و ہدایت میں اپنے فرائض انجام دے نہ کہ برطانوی دستور کا پابند ہو۔

ان اہم تبدیلیوں کے بغیر ہندوستان اس انجمن کی ممبری کو کبھی گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ ہندوستان اور انگریز قوم کا ایک عرصۂ دراز تک حاکم و محکوم کا تعلق رہا ہے، اور سیاسی لحاظ سے یہ تعلق کبھی خوشگوار نہیں رہا۔ دورِ غلامی کی کشمکش کی وجہ سے برطانیہ سے کوئی ایسا رشتہ قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔ جس میں مساوی حیثیت نہ ہو۔ اس کے علاوہ دیگر ممبرانِ دولتِ مشترکہ مثلاً نیوزی لینڈ، کینیڈا اور آسٹریلیا وغیرہ کی طرح ہندوستان اور انگلستان میں کوئی تہذیبی، نسلی سماجی یا نظریاتی ہم آہنگی اور یکسانیت بھی نہیں تھی کہ جس کی بنا پر حکومتِ انگلستان سے وابستگی کسی اعزاز یا خوشی کا باعث ہوتی۔ اس کے برخلاف ۴۸ء، ۱۹۴۷ء تک اس میں بھی شبہ تھا کہ ہندوستان 'کامن ویلتھ' میں کسی قسم کی دلچسپی لے گا۔ ملک کی تمام سیاسی پارٹیاں جن کے دل سے برطانوی حکومت کے مظالم کی یاد محو نہیں ہوئی تھی۔ دولتِ مشترکہ سے الحاق کی سخت مخالف تھیں۔ خود کانگریس کے اہم رہنما مخالف تھے، دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے بھی اس رشتہ کو مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن آزادی ملنے کے کچھ ہی عرصے کے بعد کانگریس کے صف اول کے رہنما اور قوم کے دیگر بہی خواہوں نے ان فوائد پر غور کیا کہ جو اس نو آزاد اور تقسیم شدہ قوم کو برطانیہ اور دوسرے ترقی یافتہ یورپی ممالک سے اس انجمن کے ذریعہ تعلق قائم رکھنے میں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ جے پور کے اجلاس میں کانگریس نے کامن ویلتھ کا ممبر بننے کی قرارداد منظور کی۔ اس موقع پر اور اس کے بعد کتنی ہی بار مختلف موقعوں پر پنڈت جی نے قوم کے سامنے ان فوائد اور تجارتی و سیاسی سہولتوں کا تذکرہ کیا ہے جو اس ملک کو کامن ویلتھ میں شریک رہنے سے حاصل ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ ان فوائد کا ایک سرسری جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

(۱) ہندوستان ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے اس انجمن میں خود اپنی مرضی سے شامل ہوا ہے، کسی کے دباؤ یا اثر سے مجبور ہو کر نہیں، اور آزاد ہے کہ

جب چاہے اپنی مرضی اور مصلحت کے پیش نظر اس سے ناطہ توڑ لے، کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان اپنے منشا کے خلاف اس ادارے کا ممبر رہے۔

(۲) اس انجمن کے سب ممبر مساوی حیثیت رکھتے ہیں، کسی ملک کی مادی ترقی معاشی خوشحالی اور تہذیبی و معاشرتی آسودگی کسی دوسرے پر فوقیت یا تفضیلت نہیں رکھتی۔ سیاسی اعتبار سے اس انجمن کے سب ممبر ایک حیثیت رکھتے ہیں اور ایک حسنِ سلوک و رواداری کے مستحق ہیں۔

(۳) ممبر ملکوں نے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے اور ترقی کے منصوبوں میں تعاون کرنے کا "دامے، درمے، سخنے" وعدہ کیا ہے۔ لیکن ایفا کا دار و مدار ہر ملک کی اپنی خواہش اور استطاعت پر منحصر ہے۔

(۴) اس قسم کے تعاون سے ہماری اندرونی اور بیرونی پالیسی کی آزادی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کتنے ملک ہیں جو اس انجمن کے ممبر ہونے کے ناطے ہماری بہتری، ترقی اور خوشحالی کے خواہاں ہیں، اور ہمارے پنج سالہ منصوبوں کی تکمیل میں ہماری مدد کر رہے ہیں، اور اس طرح وہ کام جو برسوں میں پورا ہوتا، اب مہینوں، ور دنوں میں پورا ہو رہا ہے۔ ترقی اور خوشحالی کے کتنے خواب خود ہماری زندگی میں شرمندۂ تعبیر ہو رہے ہیں۔

(۵) شاہ (ملکہ) انگلستان اس انجمن کے ممبر ممالک کے درمیان دوستی اور یگانگت کی محض علامت ہیں۔ ہماری آزادی پر ان کی شخصیت یا رسمی سرداری کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہماری سیاسی پالیسی، زندگی کے طور طریقے اور دوسرے نظریات پر اس رشتہ سے کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

(۶) ہمارا اپنا دستور ہے، اپنے قانون ہیں۔ ہم آزاد ہیں کہ ان قوانین کو جب چاہیں ختم کر دیں یا بدل کر نئے وضع کر لیں، کامن ویلتھ کی شرکت اس آزادی میں کوئی رخنہ نہیں ڈالتی۔ ہماری اپنی پارلیمنٹ ہے جو اپنے بنائے ہوئے قوانین کے لئے برطانوی پارلیمنٹ کی منظوری کی محتاج نہیں بلکہ خود ہمارے منتخب صدر جمہوریہ

کے دستخطوں سے عمل میں آتے ہیں۔ شاہ انگلستان کی مہر کے منتظر نہیں رہتے۔

(۷) اس انجمن میں شامل رہنے سے ہم پر کوئی ایسی پابندی بھی نہیں آتی کہ ہماری بیرونی پالیسی یا دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ وہی رویہ ہو جو برطانیہ یا کسی دوسرے ممبر کا ہو۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ممبر ملک دوسرے ممبر ملک کے ہر سیاسی اقدام کو ہمیشہ سراہے؛ اختلاف تو ایک زندہ اور خوددار قوم کی نشانی ہے کتنے موقعے ایسے آئے ہیں کہ جب ہندوستان نے حکومتِ برطانیہ کی سامراج پسندی اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کی ہے، ۱۹۵۶ء میں نہر سوئز پر انگلستان کے حملے کی مذمت اس امر کی ایک مثال ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ ممبران کے آپسی جھگڑے صرف اسی انجمن کے ذریعہ طے ہوں گے۔ یہاں کے علاوہ بھی کسی دوسری انجمن یا ادارے جیسے یو این او میں دو ممبر ممالک کے ذاتی اختلافات یا سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے مثلاً ہندو پاک کے درمیان کشمیر کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش ہے۔

(۸) کامن ویلتھ میں شرکت کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستان جن باتوں کو اصولی طور پر امن و انسانیت کے خلاف سمجھتا ہے۔ ان کے خلاف اپنی جدوجہد چھوڑ دے ہم آج بھی نسلی امتیاز اور سامراجیت کے مخالف ہیں۔ بلکہ اس انجمن کے ذریعہ ہم نے اپنی اس تحریک میں کامیابی کا پتہ پایا ہے۔

ہندوستان کے وزیر اعظم آج بھی انگلستان کے دارالخلافہ میں افریقہ کے کالے باشندوں پر گوروں کے مظالم اور امتیازات کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کر سکتے ہیں، اور مجبور کر سکتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کی حکومت اپنی اس پالیسی کو خیرباد کہے یا اس انجمن کی رکنیت سے دستبردار ہو۔

(۹) کامن ویلتھ کا ممبر ہوتے ہوئے بھی ہندوستان نے فوجی گٹھ جوڑ اور معاہدوں کی مخالفت کی ہے، جبکہ برطانیہ اور دیگر ممبر ممالک اس قسم کے متعدد معاہدوں میں شریک ہیں مثلاً

ٹو، سیٹو، بغداد پیکٹ وغیرہ۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان عالمی مسائل میں اپنی آزاد رائے رکھتا ہے اور اس کے اظہار پر بھی پوری قدرت حاصل ہے۔

(۱۰) یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ کی گرماگرمی ہندوستان کے دولت مشترکہ کے تعلق پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اگرچہ اس انجمن کے سب ہی ممبر مغربی بلاک سے اپنی تقدیریں وابستہ کر چکے ہیں، لیکن ہندوستان آج بھی غیر جانب دار اور امن پسند ہے۔ ہم برطانیہ کے بھی دوست ہیں، اور روس کی ترقی اور خوش حالی کو بھی بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں، امریکہ بھی ہمارا ہمدرد ہے اور روس بھی ہمارا بہی خواہ ہے۔

(۱۱) ہندوستان اس انجمن میں شامل ہوا تو محض اپنے فائدوں کے پیش نظر۔ اس انجمن کے تعلق سے ہم کو دوسروں سے اور دوسروں کو ہم سے تجارتی اور ثقافتی فوائد اور سہولتیں حاصل ہیں۔ اور یہ صحیح ہے کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں جہاں ضرورتیں کثیر اور ذرائع محدود ہیں کوئی بھی ملک دوسروں سے تعلق قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہندوستان دوسروں سے کتنی چیزیں لیتا ہے، غلہ، مشین، کپڑا، ادویات، دھاتیں اور روزانہ زندگی کی کتنی ضروریات ہیں جو ہم ابھی تک دوسروں سے لیتے ہیں، اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا، دنیا کا کوئی بھی ملک اپنی تمام ضروریات بذاتِ خود پوری نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے تجارتی لین دین کسی انجمن کے ذریعہ آسان ہو جاتے ہیں۔

(۱۲) ۱۶ رمئی ۱۹۴۹ء کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے دولت مشترکہ میں ہندوستان کی شمولیت کی ہمنوائی میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے کہا تھا، میری خواہش ہے کہ دنیا دیکھے کہ ہندوستان اس قوم سے بھی خوشگوار تعلقات رکھ سکتا ہے جس سے وہ ماضی میں اپنے جائز حقوق کے لئے جنگ آزما رہا ہے۔ نیشنلزم کے تصور کو محدود کرنے سے عالمی مسائل کبھی حل نہیں ہو سکتے۔ اور محض اس بنا پر کہ ہم کل تک انگریز کے ساتھ دست و گریباں رہے ہیں۔ دولت مشترکہ میں شامل ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔"

" اور بالفرض اگر اس انجمن کی رکنیت سے ہیں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے تو اس سے علیحدہ رہنے میں ہمارا نقصان یقینی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کو نہ صرف اس انجمن ہی میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، بلکہ اس کے ذریعہ ہندوستان نے سیاست عالم میں اپنے لئے ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ آج بین الاقوامی مسائل میں ہندوستان کی رائے اور رویہ کو جو نمایاں حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس میں اس انجمن کی آواز اور تعاون کا بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں جنگ کوریا نے خوفناک شکل اختیار کر لی تھی اور ہر گھڑی تیسری عالمی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا۔ روس اور امریکہ ایک طرح کھل کر میدان میں آ گئے تھے، اس وقت اس انجمن کے دیگر ممالک کے ساتھ ہندوستان نے جنگ بندی کی انتھک کوشش کی اور کامیابی کے نتیجہ میں دنیا کی نظروں میں ایک ممتاز امن پسند قوم کا درجہ پایا۔ اسی طرح انڈوچائنا کے مسئلہ میں ہندوستان کی مشترکہ کوششوں سے ایک دیرینہ قضیے کا تصفیہ ہو سکا۔

اس انجمن کے ذریعے ہندوستان نے دنیا کی سیاست میں ایک وقار اور عزت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ کولمبو پلان اور دیگر کامن ویلتھ ممالک سے انفرادی طور پر ہمیں کس قدر مالی، صنعتی اور اخلاقی مدد مل رہی ہے۔ اس سے کم ہی لوگ واقف ہیں، اس انجمن کے ممبر ممالک کا ایک دوسرے کی ترقی اور خوشحالی کے منصوبوں میں تعاون کا وعدہ اور آپس میں جنگ کرنے اور اپنے ذاتی مسائل کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کے اقرار نے ایک کو دوسرے سے بے حد قریب کر دیا ہے، اس انجمن سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ جذبات کی تسلی چاہے ہو جائے لیکن نقصانات کا اندازہ مشکل سے کیا جا سکے گا۔

"دو کنارے"

جناب شمیم نوید علی گڑھی

دُور کچھ دُور اس ندی کے پار
پھوس کی جھونپڑی میں اک سادھو
کیسا دھونی رمائے بیٹھا ہے
بے نیازِ مآلِ راحت و غم
اپنی دُنیا سجائے بیٹھا ہے

اور اک میں کہ اس کنارے پر
اپنے دل میں ہزار داغ لئے
غم کی تاریکیوں سے اُلجھا ہوں
یاس و امید کے چراغ لئے

اور کبھی میں اداس نظروں سے
تکنے لگتا ہوں ان نظاروں کو
کاش یہ فرق عیش و غم نہ رہے
ایک جا کر دوں دو کناروں کو

یا پھر اک میرا جھونپڑا بھی وہیں
ہوتا سادھو کی جھونپڑی کے پاس
میرے بھی گرد رقص کرتی خوشی
اور زمانے کے غم نہ آتے پاس
دُور کچھ دُور اس ندی کے پار

تعلیمی مسائل

امتحانات

"کوئی پانچ سوال کیجیئے۔ سب کے نشان برابر ہیں" ان دو مختصر جملوں میں لاکھوں طالب علموں کے لیئے آزمائش کی ایک بھیانک داستان پوشیدہ رہتی ہے۔ کم ازکم سال کے دو مہینے فرسودہ اور بارہا آموختہ دوہرانے ہی گذرتے ہیں تاکہ کسی طور پر کامیابی کے لیئے تینتیس فیصدی نشان حاصل کرسکیں تاہم اس عرق ریزی کے باوجود بیشتر امیدواروں کے لیئے امتحان کا نتیجہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہی ہوا کرتا ہے۔ اگرچہ ہماری تعلیم کا میدان دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے برابر وسیع نہیں ہوا ہے تاہم ہم اپنی تعداد کے لحاظ سے غیر معمولی ہیں۔ مدرسے کے اپنے نجی امتحانات سے درگذر ہمارا اترپردیش بورڈ کا ہائی اسکول سرٹیفکیٹ امتحان اپنے اعداد و شمار کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ ہر سال کئی لاکھ طالب علم اس امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ اتنے بڑے امتحان نے تعلیمی سے زیادہ تنظیمی مسائل پیدا کر دئے ہیں۔ امتحان کے شرکا بے عنوانیاں ہی نہیں برتتے بلکہ فوجداری پر بھی آمادہ رہتے ہیں۔ اب صرف چھپے چوری نقل ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ منظم طور پر کامیابی کے "دوسرے ذرائع" بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ امتحانات کے زمانے میں صرف اساتذہ کی مشغولیت میں ہی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ امن دامان کے محافظوں کی مشغولیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے امتحانات اپنی چھوٹی چھوٹی دشواریاں رکھتے ہیں۔ مدرسے کے اپنے اندرونی امتحانات کے کچھ اور مسائل ہیں۔ لیکن ایک بات طے ہے۔ خواہ کسی چھوٹی جماعت کا معاملہ ہو یا کسی مستند امتحان کی بات، سارا معاملہ قسمت کا کھیل ہوکر رہ گیا ہے! امتحانات کے پرچے، نصاب کی پورے طور پر عکاسی نہیں کرتے۔ اس لئے طلبہ تحصیل علم کے بجائے ہتکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ اولاً اہم اور غیر اہم حصوں میں ابواب کی تقسیم ہوتی ہے پھر مخصوص اور محدود تیاری کی جاتی ہے اور "تیر ورنہ تکا" کے مصداق شرکتِ امتحان کی

ذہنیت آتی ہے ۔ اس میں مضمون نگاری اور عبارت آرائی کی عملداری ہے ۔ اور آخر میں ممتحن کے
ہاتھ ساری بات رہ جاتی ہے ۔ اور حالات ایسے ہیں کہ وہ اپنی نیک نفسی کے باوجود سب کو ایک
نظر سے نہیں دیکھ پاتا ۔ شخصی معتقدات کے علاوہ بہ یک وقت کام کا بار عموماً اس قدر ہوتا ہے
کہ دیانت داری سے فرائض کی ادائیگی واقعی دشوار ہو جاتی ہے ۔ عملی امتحان کا معاملہ اور
زیادہ غیر تسلی بخش ہے ۔ خواہ سائنس یا کسی مضمون کا کوئی عملی امتحان ہو یا کسی حرفے کا ، باہر
سے آنے والے ممتحن کو لبا اوقات خانہ پوری کی فکر ہوتی ہے اور استاذہ کو مہمان نوازی کی ۔
اگر دونوں اپنی اپنی کوششوں میں کامیاب رہیں تو دونوں خوش رہتے ہیں اور طلبہ کا بس
اللہ نگہبان رہ جاتا ہے ۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ذہانت کی جانچ کے طور طریقوں کی طرف خصوصی توجہ
دی گئی اور ماہرین نفسیات نے جانچ کے پرچوں کو ایسی شکل دے دی جن میں مروجہ امتحان
کے پرچوں کی بیشتر خامیاں جاتی رہیں ۔ اس اصلاح سے تعلیم نے پورا فائدہ اٹھایا مگر اس طرح
تمام مسائل پھر بھی حل نہ ہو سکے ۔ چھوٹی جماعتوں میں تو مختصر سوالات اور مختصر جوابات سے
کام چل سکتا تھا لیکن جہاں پر ندرت فکر ، مدلل اور مسلسل عبارت اور تحقیق و تنقید کی بات آجاتی
ہے وہاں پرچے میں مسلسل مضمون لکھنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار باقی نہیں رہتا ۔ لہٰذا تعلیمی میدان
میں کام کرنے والوں کا مسئلہ بدستور قائم رہا ۔ اور سب سے خراب بات یہ ہوئی کہ ہم نے امتحان
کی غرض و غایت پر غور کرنا ہی چھوڑ دیا ۔ ہمارے سامنے صرف طلبہ کے چھانٹنے کی بات رہ گئی تھی
کسی طور پر ایک معیار مقرر کیا اور اٹکل پچو کچھ کو ناکام گردانا اور کچھ کو کامیاب قرار دیا لیکن
آزادی کے بعد بجا طور پر ہماری نظر اپنے مقاصد کی طرف گئی اور اب سب سے اہم سوال یہی ہے
کہ ہم کیونکر اپنے طلبہ کو حقیقی تعلیم دیں ۔ ہمیں شخصیتوں کی تربیت کرنی ہے ۔ صرف اسناد تقسیم
کرنا نہیں ہے اور اسی نظریے کے تحت امتحان اور اس کے طریقہ کار کو بھی بدلنا ہے ۔ امتحان کے
طور طریقوں میں رد و بدل کر کے ہی طلبہ میں حصول تعلیم کے مناسب رجحانات پیدا کیے جا سکتے
ہیں ۔ اور اسی بنا پر درس و تدریس کے قاعدوں میں انقلاب آسکتا ہے ۔ ہمیں اس بات کی پوری

طور پر سعی کرنی ہے کہ ہمارے طلبہ صالح روایات کے حامل ہو جائیں۔ ان کا مذاق سدھرے اور ان کے نظریات میں استواری آئے۔ وہ محض کتاب کا کیڑا بن کر نہ رہ جائیں بلکہ کام کے آدمی بن سکیں یہ کام ظاہر ہے کہ صرف ایک سالانہ امتحان سے انجام نہیں پا سکتا۔ اس سلسلے میں استاد کی نگاہ التفات متواتر درکار ہے۔ اس لئے بہت سے ماہرین تعلیم نے، طلبہ کے سال بھر کے کام کو مقدم ٹھہرایا۔ پچھلے دس سال میں مختلف اداروں نے اپنی اندرونی جانچ کو مختلف عنوان سے کچھ نہ کچھ جگہ ضروری ہے اور طلبہ کے دوران سال کی کارگذاری کو کسی قدر مدنظر رکھا ہے۔ جامعہ میں یہ کام ایک مدت سے ہو رہا ہے۔ اب تو بعض مضامین میں سالانہ امتحان کی وقعت سال بھر کے کام کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی رہ گئی ہے۔ لیکن اس صورت میں اساتذہ پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اپنا کام نہ صرف پابندی اوقات سے کرانا ہے بلکہ اسے ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھنا بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کام میں بڑی احتیاط درکار ہے۔ اور شکی طبیعتوں کو اطمینان بھی دلانا ہے۔ چند سال ہوئے کہ بڑے جوش و خروش سے ریاست پنجاب میں اس کام کا آغاز ہوا لیکن بدعنوانیوں کا کچھ ایسا بازار گرم ہوا اور اس قدر خلفشار بڑھا کہ مجبوراً اس مستحسن اقدام کو بہت کچھ روکنا پڑا۔ تاہم ان دشواریوں کے باوجود اس طرف خصوصی توجہ درکار ہے اور ضرورت یہ ہے کہ ریکارڈ رکھنے کے طریقوں کی درستی کی جائے، استاد متعلقہ کی جانچ کو ایک ضابطہ دیا جائے اور ایسے طریقے برتے جائیں جن سے جائزہ معقول بن سکے اور شخصی تعصبات و معتقدات کا عمل دخل بڑی حد تک ختم ہو جائے۔ تاکہ سالانہ امتحان کا بھوت ہمیشہ کے لئے طلبہ کے سروں سے دور ہو جائے۔ وہ کتابوں کو چھوڑ کر ان کی غیر ذمہ دارانہ اور گمراہ کن تلخیصوں کو حفظ کرنے کے چکر میں نہ پڑیں۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے ناجائز ذرائع کو استعمال نہ کریں۔ ناکامی کے خوف اور رسوائی کے ڈر سے جان نہ دیں۔ اور نہ انھیں دوران سال میں خالی الذہن رہ کر تضیع اوقات کرنے کا موقع ملے۔ تاکہ ہمارے مدرسے صحیح معنی میں کام کے مدرسے کہلا سکیں۔

لیکن یہ تو طریقہ کار کا معاملہ رہا، اصل بات تو یہ تھی کہ ہم اپنے مقاصد کے تحت تعلیم دین

نہیں کے پیشِ نظر جانچ کریں۔ یہ ہمارا بنیادی سوال ہے۔ تین سال ہوتے آئے اُس
نے کو پرزور طریقے سے شکاگو یونیورسٹی کے عالم ڈاکٹر بلوم نے ہمارے اساتذہ کی مختلف
جلسوں میں پیش کیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ مناسب سوالات کے ذریعے طلبہ کی ان صلاحیتوں
کو بخوبی جانچا جا سکتا ہے۔ جو ان کی اندر پیدا ہونی چاہئیں۔ اسی طرح امتحان کا صحیح فائدہ اٹھایا
جا سکتا ہے اور امتحان کے زاویے کو بدلنے سے تعلیم کے طریقوں اور حصولِ تعلیم کی عادتوں
میں لازمی طور پر خوشگوار تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اُن کی اس تحریک کا کسی قدر اثر ضرور
ہوا۔ اور ثانوی تعلیم کی منزل پر توسیعی پروگرام کے تحت کچھ کام بھی کیا گیا۔ کہیں کہیں
اساتذہ کے تربیتی اداروں میں بھی کچھ چرچا ہوا۔ لیکن ابھی تک اس معاملے میں ہمارے
مدرسوں کی فضا قطعی متاثر نہیں ہوئی ہے۔ گذشتہ اپریل میں چند ماہرانِ تعلیم کو توسیعی
پروگرام کے مرکزی ڈائرکٹریٹ کے تحت امتحانات کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے
لئے دعوت دی گئی تھی۔ امید ہے کہ اس کے کچھ خوشگوار نتائج جلد برآمد ہوں گے۔

"معلم"

حالات حاضرہ

• جمہوریۂ ہند کے نئے پاسباں ــــ علم اور خدمت کو اعزاز

اس ماہ میں ہندوستان میں بہت بڑی بات ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ ملک کے عظیم فلسفی اور مفکر ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر جمہوریہ اور مشہور و معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین نائب صدر جمہوریہ منتخب ہوئے ہیں۔ بظاہر اس واقعہ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ دو جلیل القدر عہدوں پر دو عظیم المرتبہ شخصیتوں کا انتخاب ہوا ہے لیکن اگر اس پر پوری طرح غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ اس کی ایک اہمیت تو وہ ہے جس کا ہمارے محبوب وزیر اعظم نے اپنی کسی تقریر میں ذکر کیا تھا کہ اتنی بڑی تبدیلی کا اتنی خاموشی اور خوش اسلوبی سے ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ قوم میں جمہوریت اور اس کی شاندار روایات کی جڑیں بہت گہری اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ بہت سے ملکوں میں ایسے مواقع پر ہنگامے ہوتے ہیں اور اس کے نتائج قوم و ملک کے لئے بہت ہی ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ دونوں عہدہ دار اگرچہ عملی سیاست سے ہمیشہ بے تعلق رہے ہیں، مگر ان کی علمی اور تعلیمی خدمات کی بنا پر ریاست نے انھیں اپنا سربراہ منتخب کرنے میں فخر محسوس کیا۔ گویا خاموش اور بے لوث خدمت ہنگامہ خیز سیاست پر غالب آئی اور تعلیم گاہ کے بوریہ نشیں، اقتدار اعلیٰ کی مسند پر جوڑ توڑ ساز باز اور سعی و کوشش سے نہیں، محض اپنی شرافت، نیکی، خلوص، دیانتداری اور خدمت کی بنا پر بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کا انتخاب پھر بھی زیادہ حیرت انگیز نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ بین اقوامی شہرت کے مالک ہیں اور ایک طویل عرصے سے اہم عہدوں پر فائز رہے ہیں اور شروع سے جب آزاد ہندوستان کا دستور نافذ ہوا ہے، وہ نائب صدر جمہوریہ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اس لئے

صدرِ جمہوریہ کے عہدے کے لئے ان سے زیادہ کون مستحق ہو سکتا تھا، مگر تعجب ذاکر صاحب کے انتخاب پر ہے۔ وہ شروع سے گمنام زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ انھیں کئی مرتبہ بلند ترین عہدے پیش کئے گئے لیکن انھوں نے بلند مراتب پر بظاہر معمولی مگر ٹھوس خدمت کو ترجیح دی۔ ان کے اسی خلوص اور جذبۂ ایثار کا نتیجہ ہے کہ ان کی خدمت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور

ہر کہ خدمت کرد آں مخدوم شد

ذاکر صاحب کا انتخاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سے اس اہم مقام کی نشان دہی ہوتی ہے، جو ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کو حاصل ہے، نیز قومی یکجہتی کے لئے ایک اچھا شگون ہے اور اس کی طرف ایک اہم اور قابلِ مبارکباد اقدام۔

"نقش نشاں پھٹنے کو ہے — لاؤس عالمی کش مکش کا شکار

ادھر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے صدارت کی ذمہ داری سنبھالتے وقت اعلان کیا کہ "ہمیں قومی سلامتی کو عالمی سلامتی سے بلند نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ایسی خود مختار ریاست کا تصور جو مختارِ مطلق ہو اب وقت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ تمام قومی جذبات اور امنگوں کے پیچھے ایسی مشترک قدریں ہیں، جو تمام بنی نوع انسان کا سرمایہ ہیں۔ اگر اخلاقی قدریں ہمارے اعمال کے لئے مشعلِ راہ ہوں تو خواہ وہ قومی ہوں یا بین اقوامی مستقبل خطرے سے پر بھی ہو سکتا ہے۔" دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا میں ایسی کارروائیاں ہو رہی تھیں، جن سے امنِ عالم کے لئے دن بدن خطرہ بڑھ رہا تھا اور اب وہاں ایسی نازک صورت پیدا ہو گئی ہے کہ کسی وقت بھی سرد جنگ گرم جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ سیام اور لاؤس میں بارود کے ذخیرے جمع ہیں، آس پاس چنگاریاں بھی جو بارود کے ان ذخیروں تک پہنچ جائیں۔

ہمیشہ کی طرح امریکا اور روس اس کش مکش کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال رہے ہیں۔ مغربی طاقتوں کا کہنا ہے کہ لاؤس کی کمیونسٹ فوجیں معاہدہ کے خلاف آگے بڑھ رہی ہیں اور انھوں نے کئی جگہوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان میں "نام تھا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے "نام تھا" اگرچہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، مگر فوجی لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے۔



دوسری طرف روس کو شکایت ہے کہ امریکا نے سیام میں اپنی بری بحری اور فضائی فوجیں بھیج کر اپنی طاقت کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ بے جا اور نامناسب ہے اس نے یہ بھی دھمکی دی ہے کہ اگر امریکا نے لاؤس کے معاملہ میں ذرا بھی مداخلت کی تو لاؤس دوسرا کوریا ہوگا اور امریکا کو یہ سودا بڑا مہنگا پڑے گا۔

تادم تحریر کی اطلاعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کمیونسٹ دستے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور برطانیہ نے بھی اپنی فوجیں بھیجنا شروع کر دی ہیں سیٹو کے دوسرے ممبر ممالک بھی اس کی تقلید کریں گے۔ ان تمام وحشت ناک خبروں کے ساتھ ایک خبر یہ بھی ہے کہ خروشچوف نے وعدہ کیا ہے کہ وہ لاؤس میں غیر جانبدار مشترکہ حکومت کے قیام کے لئے پوری کوشش کریں گے۔ اگر دل سے یہ کوشش کی گئی تو امید ہے کہ یہ آئی بلا ٹل جائے۔

مغربی ایریان میں انڈونیشیا کی پیش قدمی

انڈونیشیا نے طویل گفت و شنید سے مایوس ہو کر مغربی ایریان کی آزادی کے لئے فوجی اقدامات شروع کر دئے ہیں اب تک اس کی فوجیں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ ہالینڈ نے بھی جوابی کارروائی شروع کر دی ہے۔ مصالحت کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ انجمن اقوام متحدہ کے قائم مقام جنرل سیکریٹری یوتھانٹ نے دونوں سے پُرامن رہنے اور گفت و شنید سے معاملے کرنے کی اپیل کی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ابتدائی گفتگو کے لئے دونوں ایک دوسرے کی شرط کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں انڈونیشیا اس شرط پر گفت و شنید کے لئے تیار ہے کہ مغربی ایریان کی آزادی کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ ہالینڈ اس شرط کو کسی صورت میں بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، وہ صرف اس شرط پر دوبارہ گفتگو کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے کہ امریکی ثالث مسٹر بنکر کی تجاویز کو گفت و شنید کے لئے

بنا... ان لیا جائے۔ ان حالات میں بھی اگر جارحانہ کارروائیاں روکی جاسکیں تو یہ معجزہ سے کم نہ ہوگا۔

غضب ہے باسی کڑھی میں ابال آیا ہے — مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں

ایسے وقت میں جب سرد جنگ پورے شباب پر ہو، تو بہ نہ ٹوٹے اور عہد و پیمان کا حافظ باقی ہے، کسی اور کے لئے تو جائز ہو سکتا ہے، مگر ایک سیاہ ن کے لئے یہی وقت اپنی مردانگی دکھلانے کا ہے۔ چنانچہ پاکستان نے موقع و محل سے فائدہ اٹھانے کے لئے سیکورٹی کونسل میں کشمیر کا مسئلہ بڑے زور شور سے اٹھایا ہے۔ موجودہ حالات سے پاکستان کو کیا کیا توقعات رہی ہوں، اس کا صحیح علم تو اسی کو ہوگا، مگر ابھی تک ہندوستان کی ڈپلومیسی پوری طرح کامیاب ہے۔

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

آج کل پاکستان میں نئے دستور کی حمایت بلکہ مدح و منقبت میں بڑھ بڑھ کر قصیدے کہے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں مختلف اخبارات ورسائل میں نظم و نثر میں جو کچھ شائع ہوا ہے، ان کے مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

صدر محمد ایوب خاں نے نیا آئین پیش کر کے قائد اعظم کی توقعات کو پورا کر دکھایا — شاہد احمد دہلوی

یہ ہماری تاریخ ملت میں ایک ایسا مہتم بالشان واقعہ اور ملی فکر و تدبر کا ایسا قابل فخر کارنامہ ہے، جس پر ہم سب انتہائی مسرت و شادمانی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے — رفیق خاور

یہ دستور جمہوریت کی طرف ایک جچا تلا قدم ہے۔ ایسی جمہوریت جو قابل عمل ہو اور قوم کی خواہشات مقتضیات اور عملی ضروریات کا مظہر ہے۔ دستور صاف صاف طور پر بتلاتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اسی رب العالمین اور احکم الحاکمین کے دست قدرت میں ہے جو روئے زمین اور اس نوزائیدہ سلطنت خداداد کا مالک ہے۔

(سید الطاف علی بریلوی (مدیر "العلم")

صرف آئین ہی خالص علمی اور دینی بنیادوں پر نہیں بنایا گیا بلکہ اس آئین کے تحت آئندہ تشکیل پانے والے تمام قوانین بھی علمی اور دینی بنیادوں پر تشکیل پائیں گے ... دستور کی اسلامی روح کی ایک اہم دلیل یہ ہے کہ صدر مملکت کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ مسلمان ہو — (مفتی انتظام اللہ شہابی)

پاکستان کے مشہور ادیب ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ایک مضمون میں آیات اور احادیث کے

ذریعہ ثابت کیا ہے کہ یہ دستور اسلامی تعلیمات کے بالکل مطابق ہے۔ مضمون کے آخر میں لکھتے ہیں کہ پاکستانی دستور کی اہم بنیادی دفعات کا جو جائزہ سطور بالا میں لیا گیا ہے، اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ان دفعات کی اسلامی بنیاد کیا ہے۔ کونسی دفعہ یا شق اسلام کے کس اصول، قرآن کے کس نص اور رسول اور اس کے اصحاب کے کس عمل پر مبنی ہے اور اسلام میں اس کی حیثیت کیا ہے ... یہ تفصیلاً اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں اس لئے اسلامی

نظر تھی جس کی منتظر وہ گلعذار آگیا
سکوتِ بزم توڑنے وہ نغمہ یار آگیا
لئے ہوئے لبوں پہ مژدۂ قرار آگیا

وہ زر نگار آگیا، وہ نو بہار آگیا

جلو میں زندگی لئے شعور و آگہی لئے
پیام صبح نو لئے نوید روشنی لئے
سکون دل لئے وہ جانِ انتظار آگیا

وہ زر نگار آگیا، وہ نو بہار آگیا

(محسن بھوپالی)

ایک شاعر نے دستور کی اشاعت سے قبل ہی فرما دیا :

آئینِ وطن اگرچہ ہے نادیدہ
پھر بھی جمہور اس کے ہیں گرویدہ
روزوں میں ملے تو لوگ ہوں اور بھی خوش
ان کے لئے پھر تو ہو گیا دو عیدا (اے۔ ڈی۔ اظہر)

ان اقتباسات سے جو صورت حال سامنے آتی ہے حقیقت اس سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ پرانے سیاست داں اس دستور کے سخت مخالف ہیں، اگر ان کا بس چلا تو وہ قومی اسمبلی کے ذریعہ سیاسی جماعتوں کو زندہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کو مساوی نمائندگی حاصل ہے اور وہاں کے بیشتر نمائندے اس نعرے کے ساتھ منتخب ہوئے ہیں کہ اس دستور کو بدلنا ہے۔ وہاں کی مذہبی جماعتوں میں جماعت اسلامی سب سے بااثر جماعت ہے، اور وہ اسے اسلامی دستور تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ۸ جون کو قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا ہے۔ شاید اس وقت جذبات و خیالات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہیں)

غالب (ابتدائی دور) از ڈاکٹر خورشید الاسلام

سائز ۲۲×۱۸/۸ - حجم ۲۸۴ صفحات - کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ - مجلد مع گرد پوش
قیمت: چھ روپے - تاریخ طباعت ۱۹۶۰ء - ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ -

جناب خورشید الاسلام صاحب ایک خوش فکر شاعر ہیں اور تنقید کا ستھرا ذوق رکھتے ہیں پیش نظر کتاب کا تعلق صرف تنقید سے نہیں تحقیق سے بھی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مؤلف نے ان دونوں کا حق ادا کیا ہے - آج کل تحقیق و تفتیش کا بڑا چرچا ہے، مگر ہمارے ایک دوست، جو خود بھی ماشاء اللہ ایک اچھے ریسرچ اسکالر ہیں، موجودہ ریسرچ کو "گورکنی" سے تعبیر کرتے ہیں - ان کے اس طنز اور مزاح میں بڑی حد تک حقیقت ہے، مگر اس کتاب میں جو تحقیق پیش کی گئی ہے، وہ تخلیق کے ہم پلہ ہے -

غالب پر آج کل بہت کافی کام ہو رہا ہے، مگر ان میں بہت سا "گورکنی" سے زیادہ نہیں، لیکن زیر تبصرہ کتاب واقعی غالبیات میں ایک مفید اضافہ ہے - مؤلف نے اس کتاب کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ "غالب کی ابتدائی شاعری میں جو اثرات کام کر رہے ہیں، ان کا ایک جائزہ لیا جائے اور ہر اس شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے، جس کا براہ راست اثر غالب کی ابتدائی شاعری پر پڑا ہے"۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے - پہلے میں غالب کے خاندان اور ان کے عہد پر لکھا گیا ہے، دوسرے میں ان شعراء سے بحث کی گئی ہے - جن کے اسالیب کا غالب کی ابتدائی شاعری پر اثر

پڑا ہے۔ تیسرے میں تمثیل نگاری۔ خیال بندی اور مناسبات لفظی پر گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھے میں خود غالب کے کارنامے پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں دو ضمیمے دیئے گئے ہیں۔ پہلے میں ان شعراء کا منتخب کلام دیا گیا ہے، جن کا کسی نہ کسی نہج سے غالب نے اثر قبول کیا ہے، دوسرا ضمیمہ "ان الفاظ اور ان تلازمات پر مشتمل ہے، جو غالب کی ابتدائی شاعری میں بار بار وقیع انداز سے استعمال ہوئے ہیں"۔ مولف کے الفاظ میں "یہ ایک گونہ دیدہ سوزی کا کام تھا"۔ فاضل مولف کے اس خیال سے بھی غالباً اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ "یہ ان دوستوں اور نوجوانوں کے لئے شاید زیادہ مفید ثابت ہو جو نفسیات اور ادب دونوں کے طالب علم ہیں۔ ممکن ہے کہ اس ضمیمہ کی بنیاد پر غالب کے ذہنی عمل کا مطالعہ کیا جاسکے"۔

شاد کی کہانی شاد کی زبانی

مرتبہ: پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

سائز ۲۲×۱۸ حجم ۲۸۱، قیمت غیر مجلد پانچ روپے۔ تاریخ طباعت ۱۹۶۱ء

ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

یہ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم کی خود نوشت سوانح حیات ہے، جسے مرحوم نے کسی مصلحت کی بنا پر اپنے شاگرد رشید پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کی طرف سے لکھا تھا۔ یہ سوانح حیات ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ لکھی گئی ہے اور حضرت شاد کا انتقال ۸ جنوری ۲۷ء میں ہوا ہے۔ مگر ۱۹۶۱ء تک اس کو شائع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ بالآخر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی توجہ اور عنایت سے اس کی اشاعت کا انتظام ہوا۔ مرتب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے "اکثر منتشر اجزا کو بدقت نظر دست خاص سے نقل کیا ہے"۔

اس کتاب سے حضرت شاد کے صرف حالاتِ زندگی پر ہی روشنی نہیں پڑتی، بلکہ ان کے علمی کارناموں اور شاعرانہ خصوصیات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ خود شاعر نے بصیغۂ غائب اپنی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں اور بہت سے شعروں کی توضیح و تشریح کی ہے۔ اپنی غزلوں کی خصوصیات کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ان دنوں ہندوستان میں غزل سراؤں کے مختلف مذاق ہیں۔ کوئی غالب مرحوم کے

اندازِ غزل سرائی کو پسند کرکے اسی طرز پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ بہتیرے جوان طبیعت مرزا داغ کی غزلوں پر مٹے ہوئے ہیں، لیکن سید صاحب[1] کی غزل سرائی کا انداز جداگانہ ہے ان کی غزلوں میں فلسفۂ الٰہیات اور اخلاقی مضامین استعاروں کا پہلو لئے ہوئے نہایت سلیس و شستہ بندشوں کے ساتھ رہتے ہیں، تاکہ شعروں کے معنی ظاہر کے کچھ بینے میں عامیوں تک کو دقت و مشکل نہ ہو۔ اور گو کہ اس میں معنی بلند ہوں، مگر کوئی نہ کوئی محاورہ یا لفظ یا ترکیب بندش ایسی بھی ہو کہ خاص خاص لوگوں کے علاوہ عام فہم والا بھی اس سے متلذذ ہو۔" (صفحہ ۱۰۴)

ہر خود نوشت سوانح حیات دلچسپ اور اہم ہوتی ہے، مگر زیرِ تبصرہ کتاب چونکہ دوسرے شخص کی طرف سے لکھی گئی ہے، اس لئے سوانح نگار نے اپنے متعلق ذرا کھل کر لکھا ہے۔ اس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت اور اس کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط : مترجمہ و مرتبہ : ڈاکٹر خلیق انجم

سائز $\frac{20\times30}{16}$، حجم ۲۷۲، مجلد قیمت چار روپے۔ تاریخ طباعت جنوری ۱۹۶۲ء

ناشر: مکتبہ برہان اردو بازار۔ دہلی

مرزا مظہر جانِ جاناں اٹھارہویں صدی عیسوی کے سلسلۂ نقشبندیہ کے مشہور صوفیوں میں سے ہیں۔ جناب خلیق انجم صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے موصوف کے فارسی خطوط کو جمع کرکے انھیں اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ خطوط کئی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ جو لوگ مرزا مظہر جانِ جاناں کی شخصیت اور ان کے خیالات و افکار کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لئے ان خطوط کا مطالعہ تو ناگزیر ہے ہی، لیکن اس کے علاوہ اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں کہ ان سے تصوف کے اہم مسائل پر روشنی پڑتی ہے اور اُس عہد کے مذہبی

---

[1] حضرت شاد عام طور پر سید صاحب کے نام سے مشہور تھے اس لئے اس کتاب میں ان کے اصل نام کی بجائے سید صاحب ہی لکھا ہے۔

خیالات وتصورات کو سمجھنے کے لئے ان سے قابل قدر مدد ملے گی۔

فاضل مرتب ومترجم نے ان خطوط کی زبان اور اسلوب کے بارے میں لکھا ہے کہ "مرزا صاحب نے فارسی مکتوب نگاری میں بھی سادہ گوئی کی بنا رکھی اور اس کی اصلاح کی۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جو اصلاحیں کی تھیں اور جس سادگی اور بے تکلفی کی طرح ڈالی تھی، اس کی ابتدا ستر اسی سال قبل مرزا صاحب نے ہی کی تھی۔" (صفحہ ۴۲، ۴۳)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔ "ایسی فارسی نثر کے نمونے پیش کئے، جن میں سادگی، صفائی، سلاست و فصاحت، بے تکلفی، بے ساختگی، شیرینی اور روزمرہ کا لطف تھا۔" بڑا اچھا ہوتا اگر یہ سادگی اور سلاست اردو ترجمہ میں بھی ہوتی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بعض علمی مباحث کو آسان اور عام فہم زبان میں پیش کرنا مشکل ہوتا ہے، مگر ذیل کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کسی ایسے شخص کی تحریر ہے، جس کی پوری زندگی کسی عربی مدرسہ کی چہار دیواری کے اندر گذری ہو۔

"صوفیہ لفظِ وجود کا اطلاق تین معنوں پر کرتے ہیں۔ ایک وجود بہ معنی کون (ہونا) اور حصول (حاصل ہونا)، جو کہ ایک امر انتزاعی اور معقولِ ثانوی ہے۔ دوسرے وجود بسیط جو پہلے معنی کے انتزاع کے تعبیر کرنے والا ہے اور صادر اول ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جو انتزاعِ معنی اول کے منشا، اور ظاہر وجود کا، دونوں وجود ذات باری تعالیٰ سے متاخر ہیں اور ذات ان دونوں وجود سے مصدر آثار نہیں ہو سکتی۔ تیسرا وجود وہ ہے جو اول الاوائل اور مبدا المبادی ہے ......" (صفحہ ۴۷)

اس طرح کی مشکل اور الجھی ہوئی زبان ہر جگہ نہیں ہے، صرف وہاں ہے، جہاں علمی خصوصاً متصوفانہ مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ ویسے کتاب دلچسپ، مفید اور قابلِ مطالعہ ہے۔

ترتیل القرآن مؤلفہ: خدیجہ بنت سیدنا طاہر سیف الدین طع

اس مختصر رسالہ میں قرآن حکیم کو صحت اور صحیح مخرج کے ساتھ پڑھنے کے طریقے بتلائے

گئے ہیں۔ یہ کتاب چھوٹے طالب علموں کے لئے بڑی مفید ہے۔ اس لئے ان مدارس
...ہاں مذہبی تعلیم دی جاتی ہے، اس کو درس میں شامل کرنا چاہیئے۔ یہ کتاب گجراتی زبان
...میں شائع ہوئی ہے، جس پر ہم رسالہ جامعہ میں دسمبر ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں تبصرہ
...کر چکے ہیں۔

ملنے کا پتہ: الادارۃ الثقافیۃ العلمیہ۔ معرفت دار البرکۃ۔ فیضی بلڈنگ، فرسٹ فلور
نظام اسٹریٹ، گلی ۲، بمبئی ۳

...ب اور تہذیب   از فرحت اللہ انصاری

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۹۲ مجلد۔ تاریخ طباعت درج نہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ فروری
...ہے۔ قیمت: تین روپے۔ ملنے کا پتہ: آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی ۶

مختلف قسم کے پندرہ مضامین کا یہ مجموعہ ہے۔ یہ مضامین عموماً مختصر، دلچسپ اور شگفتہ ہیں۔ پروفیسر
...احتشام حسین صاحب کا تعارف بھی شامل ہے۔ موصوف نے ان مضامین کے بارے میں لکھا ہے کہ "ان پندرہ
مضامین میں چند مضامین شخصیتوں سے متعلق ہیں، چند ہماری مشترکہ تہذیب کے متعلق کچھ ادبی ہیں اور
کچھ انشائی انداز میں تحریر کئے ہوئے ہلکے پھلکے مضامین لیکن جب پڑھنے والا ان تمام مضامین کو ختم
کرے گا تو اسے محسوس ہوگا کہ فرحت اللہ انصاری نے اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر اسے اپنی قومی
تہذیب کی اعلیٰ ترین قدروں اور صحت مند جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی جھلک دکھائی ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرتے وقت ان پر نظر ثانی نہیں کی گئی ہے۔
حالانکہ اس کی سخت ضرورت تھی۔ "ہندوستان کا جائزہ" ۱۵ اگست ۴۷ء کا لکھا ہے۔ ۶۲ء میں ہندوستان
کے حالات اور اس کے مسائل بالکل بدل گئے ہیں، ضرورت تھی کہ اس مضمون کو از سر نو لکھ کر شامل کیا
جاتا۔ ایک طنزیہ خاکہ ـــ انجمن مصنفین اردو" اگر اس میں شامل نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ یہ لکھنؤ
کے ایک غیر معروف رسالہ یا اخبار "مادر وطن" میں شائع ہوا تھا۔ بس یہ اسی کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔
ان معمولی خامیوں سے قطع نظر کتاب پر لطف اور قابلِ مطالعہ ہے۔

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جامعہ میں

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، نائب صدر جمہوریہ منتخب ہونے کے بعد، ۱۰ مئی کو دہلی تشریف لائے۔ مستقل قیام گاہ کے انتظام تک راشٹرپتی بھون میں قیام کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ عید کے موقع پر دہلی میں تھے۔ جامعہ برادری کو بڑی خوشی ہوئی کہ موصوف نے نماز عید اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ جامعہ میں ادا کی اور بعد نماز اساتذہ اور کارکنوں کے ساتھ عید پارٹی میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے نائب صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے دہلی آنے پر ملک کے ہر خطے اور ہر طبقے کے لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا ہے۔ رہے ہم اہل جامعہ تو ہماری خوشی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ہم نے تو پچھلے چودہ برس اس آسرے پر گذارے ہیں۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور\
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

ان کی تشریف آوری کے وقت جامعہ میں گرمیوں کی چھٹی ہو گئی تھی، اس لئے باضابطہ خیر مقدم کی تقریب وسط جولائی تک ملتوی رکھی گئی، لیکن انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ (کورٹ) کے جلسہ منعقدہ ۱۰ مئی ۶۲ء میں جناب اکبر علی خاں صاحب کی تجویز اور کئی حضرات کی تائید سے متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا گیا:

"انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ جلسہ خدائے تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور اپنے بھائی اور بزرگ ذاکر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے کہ جمہوریۂ ہند کی پارلیمنٹ نے، جو ہمارے ملک کی رائے عامہ کی امین اور وکیل ہے، موصوف کو نائب صدر جمہوریہ کے منصب جلیل کے لئے چن کر اپنے حسن انتخاب کا ثبوت دیا ہے۔"

شیخ الجامعہ صاحب مغربی جرمنی میں

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے ۲۱ مئی کو ... مشورہ کے لئے مغربی جرمنی تشریف لے گئے ہیں۔ اس کانفرنس کا موضوع اور اس کے انعقاد کا پس منظر حسب ذیل ہے :

ہندوستان کی طرف سے ۱۹۵۴ء میں یونسکو جنرل کانفرنس میں ایک تجویز پیش ہوئی تھی کہ مشرقی اور مغربی تہذیب کی وضاحت اور ان میں مفاہمت کی مختلف صورتوں پر غور کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ... یہ بھی پیش ہوئی کہ مختلف ملکوں کی تاریخ کی درسی کتابوں میں، خاص طور پر ان ملکوں کی، جن کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہی ہیں، ایسی ترمیمیں کی جائیں کہ ان میں عداوت کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ جرمنی کے شہر برنس وک میں ایک ادارہ قائم ہوا ہے جو انٹرنیشنال گکس بک انسٹی ٹیوٹ کہلاتا ہے اور جس کے ذمے یہ کام ہے کہ جرمنی اور باقی تمام دنیا کے اہم ملکوں کے ماہرین تاریخ سے مشورہ کرکے تاریخ کی ... کتابوں میں مناسب ترمیم کرے۔ جرمنی اور فرانس، نیز جرمنی اور جاپان کے ماہروں نے ایسی ... کرلی ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، جس میں ہندوستان کے ایک نمائندے سے مشورہ کرکے جرمنی کی درسی کتابوں کے لئے ہندوستان کے متعلق مواد فراہم کیا گیا۔ اسی تحریک کے سلسلے میں انگلستان سے مختلف ناشروں نے تاریخ کی کتابیں ہندوستان کے نیشنل کمیشن کو اس غرض سے بھیجیں کہ وہ ہندوستانی عالموں سے مشورہ کرکے بتائے کہ ان میں کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو تاریخی اعتبار سے صحیح نہ ہو، یا جسے بیان کرنے میں آج کل کے بدلے ہوئے حالات کا پورا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔ یہ بین الاقوامی کانفرنس، جس کی شرکت کے لئے پروفیسر محمد مجیب صاحب کو مدعو کیا گیا ہے، تاریخ کی درسی کتابوں پر نظر ثانی کی تحریک سے تعلق رکھتی ہے اور ۱۴ مئی سے ۲۳ مئی تک مغربی جرمنی کے ایک شہر گوسلار میں منعقد ہو رہی ہے۔

حضرت اثر لکھنوی جامعہ میں

جن ادیبوں کو حکومت ہند کی طرف سے امسال خطابات ملے ہیں، ان میں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی بھی ہیں۔ ان خطاب یافتہ معززین کو تمغۂ عطا کرنے کے لئے ۲۹ اپریل کو راشٹرپتی بھون

میں ایک **مخصوص** تقریب بنائی گئی۔ اس میں شرکت کے لئے حضرت اثر دہلی تشریف لائے، تو جناب ابوالکاظم قیصر زیدی صاحب کی دعوت پر جامعہ بھی تشریف لائے اور ایک مخصوص اور مختصر صحبت میں اپنا کلام سنایا۔ ایک غزل کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ ہوں :

چلا آتا ہے اک مستِ شباب آہستہ آہستہ
دعائیں ہو رہی ہیں مستجاب آہستہ آہستہ

حیا کشتہ ہوں میں اٹھے نقاب آہستہ آہستہ
سکوں سے ہم بغل ہو اضطراب آہستہ آہستہ

شراب ناب دے لیکن ذرا رک رک کے جھک جھک کے
نگاہ مست کر مست و خراب آہستہ آہستہ

خود اپنے حسن کا پردا ہے نورِ سرمدی تیرا
بنے جس طرح مہر اپنی نقاب آہستہ آہستہ

تسلّی کی یہ باتیں ہیں کہ تڑپانے کی باتیں ہیں
خموشی پھر تبسم پھر خطاب آہستہ آہستہ

بحمد اللہ شوخی سے ہوا شیر و شکر آخر
گھلا موجِ تبسم میں حجاب آہستہ آہستہ

شبابِ حسن کی گرمی میں ہے رنگِ حیا شامل
گلِ عارض سے کھنچتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

محبت راہ کرتی ہے یوں ہی محبوب کے دل میں
کہ جیسے نشہ کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

کھلی جو آنکھ، افق پر اک ستارا جھلملاتا تھا
میں سمجھا تھا کہ جائے گا شباب آہستہ آہستہ

اثر اس طرح میں مصرع ولی کا تو سنا ہوگا
"خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ"

حضرت اثر کو عام طور پر صرف غزل گو شاعر سمجھا جاتا ہے، اور اس میں شبہ نہیں تغزل ہی آپ کی شاعری کی جان ہے، مگر آپ نے نظمیں بھی کہی ہیں اور یہ نظمیں بھی آپ کی غزل کی طرح سادگی و پرکاری کی حامل ہیں۔ موصوف کئی سال تک کشمیر میں رہ چکے ہیں، اس لئے آپ کی بیشتر نظمیں کشمیر کے مناظر پر ہیں اور بقول خود حضرت اثر ان کے ذاتی مشاہدے اور تاثر پر مبنی ہیں۔ آپ نے جو نظمیں سنائیں، ان میں سے "جہلم" کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

جہلم کے دم صبح وہ دلچسپ نظارے
بلّور بہا جاتا ہے کرنوں کے سہارے

ادیل کی طرح سطح پہ رنگوں کا جھلکنا
یا آڑے آنچل کی حسینوں کے اشارے

کھیتی کا وہ جھک جھک کے ہر اک موج سے کہنا
چھاتی سے لگا لوں اگر آ جاؤ کنارے

وہ پیچ وخم ساحل وامواج کا عالم　　آئینے میں گیسو کوئی معشوق سنوارے
موجوں کو شرابور کئے دیتی ہیں موجیں　　قطرے ہیں کہ چھوٹی ہوئی افشاں کے ستارے
نالہ ہو کہ نغمہ ہو مزا دے کے رہے گا　　جب سینے میں دم رکنے لگے شوق کے مارے
کشمیر ترے نام پہ کچھ نغمے لٹا کر
سنتے ہیں آثر اپنے وطن آج سدھارے

یہ محفل چونکہ مختصر اور بے تکلف احباب کی تھی، اس لئے حضرت آثر اپنا کلام سنانے کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی باتیں بھی کرتے جاتے تھے، جابجا اشعار کی تشریح بھی کرتے اور رفع و محل بھی بتلاتے اور کبھی کبھی تنقید بھی کرتے۔ اس نظم کا جب یہ مصرع سنایا کہ

"جب سینے میں دم رکنے لگے شوق کے مارے"

فرمایا کہ میں نے "دم رکنے لگے" کہا ہے، کوئی اور "دم گھٹنے لگے" بھی کہہ سکتا ہے۔

محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ کا سفر زیارت

ابھی حال میں محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ تہران اور عراق کے مقدس مقامات کی زیارت کر کے واپس آئی ہیں۔ موصوفہ رسالہ جامعہ کے لئے اپنے سفر کے حالات لکھ رہی ہیں، جو امید ہے پراز معلومات ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہوں گے۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

Regd. No. D - 768 June, 1962

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھے روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷	بابت ماہ جولائی ۱۹۶۲ء	شمارہ ۱

فہرست مضامین

رسالہ جامعہ کے جدید دور کی پہلی جلد (یعنی ۵۴ ویں) نومبر ۱۹۶۰ء سے اکتوبر ۱۹۶۱ء تک بارہ مہینوں پر مشتمل تھی۔ کچھ خریداروں اور مضمون نگاروں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ ایک جلد صرف چھ ماہ کی ہونی چاہیئے، اور جنوری سے جون اور جولائی سے دسمبر تک کے مہینوں پر مشتمل ہو۔ ان کی اس خواہش کے مطابق ۴۶ ویں جلد **جون** ۱۹۶۲ء پر ختم کر دی گئی ہے اور اب جولائی سے ۴۷ ویں جلد شروع کی جا رہی ہے۔

اگر قارئین جامعہ چاہتے ہوں کہ ہر جلد کی فہرست مضامین بھی الگ سے شائع کی جائے تو براہِ کرم مطلع فرمائیں کہ فہرست مضمون وار شائع کی جائے یا صفحات کے لحاظ سے؟

(مرتب)

بین اقوامی مفاہمت اور نصاب کی کتابیں

پروفیسر محمد مجیب

۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہوئی تو جرمنی کے استادوں کو سوچنا پڑا کہ وہ تاریخ کیسے پڑھائیں گے۔ جو کتابیں موجود تھیں وہ ہٹلر کے دور کی تھیں، اور کسی کو اس کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ برباد شدہ بستیوں اور بھوکی تباہ حال آبادی کے بچوں کے ہاتھ میں ایسی کتابیں دے جن کا مقصد غرور اور عظمت کا احساس پیدا کرنا تھا۔ مغربی جرمنی پر انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکیوں کا قبضہ تھا، اور ایسی کسی حکومت کی تشکیل نہیں ہوئی تھی جو تعلیم کی ذمہ داری لیتی اور اس کی رہنمائی کرتی۔ جرمنی کے استادوں نے اپنی انجمنوں کے ذریعہ درسی کتابوں پر نظر ثانی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا اور برنس وک میں ایک بین اقوامی درسی کتابوں کے ادارہ کی بنیاد رکھی جس کے ڈائرکٹر پروفیسر اکرٹ ہیں۔ اسی شہر میں میری مسز فوبکس سے ملاقات ہوئی جو اب برنس وک کی میئر ہیں اور اُس زمانے میں ضلع کی وزیر تعلیم تھیں۔ انھوں نے کہا کہ اکرٹ کو میں نے یہاں بلایا تھا۔ اس وقت بچارہ دُبلا پتلا اپنے فوجی یونیفارم پر شرمندہ تھا۔ اب دیکھو کیسا خوش ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے پروفیسر اکرٹ کے دونوں گالوں پر بوسہ دیا اور انھیں گلے سے لگا لیا۔ مسز فوبکس خود ستر برس کی ہیں اور ان کی محنت، خیر خواہی اور کارپردازی مثال مانی جاتی ہے۔ انھیں اور پروفیسر اکرٹ کو جو کامیابی ہوئی ہے اسے دیکھتے ہوئے خوشی کا یہ اظہار بجا تھا۔ جرمنی میں بہت جلد ایسی تاریخ اور جغرافیہ کی درسی کتابیں تیار ہو گئیں جو تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے قابل اطمینان ہیں۔

۱۹۵۴ء میں یونسکو نے پروفیسر ہمایوں کبیر کی تحریک پر دنیا کی قوموں کے درمیان مفاہمت اور مختلف تہذیبوں کی قدروں سے واقفیت پیدا کرنا اپنا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے کئی پہلو ہیں، مگر شاید سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ساری دنیا میں تاریخ، جغرافیہ اور ادب کی درسی کتابوں میں ایسا مواد شامل کیا جائے جو مختلف تہذیبوں کی قدر شناسی کا جذبہ پیدا کرے۔ اس سلسلے میں پہلی بین اقوامی کانفرنس

مئی ۱۹۵۶ء پیرس میں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں نمائندوں کا انتخاب کس طرح ہوا تھا، بہر حال ہندوستان کی وزارت تعلیم کا یہ منشا نہیں تھا کہ درسی کتابوں کی نظرثانی میں کسی با مقصد طریقہ سے شرکت کی جائے، مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی اور مجھے صرف یہ محسوس ہوا کہ یونسکو میں یا کہیں اور کوئی قدردان مجھے اس کا موقع دینا چاہتا ہے کہ میں پیرس کی سیر کر لوں۔ کانفرنس کی بحثیں بہت دلچسپ تھیں، اور مجھ سے کہا گیا کہ مغربی ملکوں کی درسی کتابوں میں شامل کرنے کے لئے میں تاریخ ہند کے عنوانات کی ایک فہرست تیار کروں۔ یہ یونسکو کے "کاغذ" نمبر ای۔ ڈی ۱۴ پیرس، ۸ نومبر ۱۹۵۶ء میں ضمیمہ کے طور پر شامل ہے۔ اس کانفرنس کے دو سال بعد ٹوکیو میں ایک کانفرنس ہوئی، جس میں ہندوستان کے نمائندے ایس۔ ایس بھنڈارکر صاحب، بمبئی کے ڈائرکٹر تعلیمات تھے، اور پھر دو سال بعد نیوزی لینڈ کے شہر ولنگٹن میں جہاں سی۔ ایس بھنڈاری صاحب ڈائرکٹر، ادارہ تحقیق نفسیاتی، الہ آباد نے ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اپریل ۱۹۶۲ء میں میرے پاس جرمنی میں ہندوستانی سفارت خانہ کے ڈائرکٹر بھٹا چاریہ صاحب کا خط آیا کہ جرمنی میں کئی لوگ پوچھ رہے ہیں کہ آپ کب آ رہے ہیں۔ میں نے انھیں لکھا کہ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے جرمنی سے کسی نے بلایا ہے اور بلایا ہے تو کیوں، اور ساتھ ہی ڈاکٹر اکرٹ کو لکھا کہ میرے پاس سفارت خانہ سے ایک خط آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے جرمنی آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اگر انھیں معلوم ہو کہ کیا ماجرا ہے تو مجھے بتا دیں۔ اس کے بعد میرے پاس جرمنی کے یونسکو کمیشن کا باضابطہ دعوت نامہ آیا، اور وزارت تعلیم نے بھی اس کا اقبال کیا کہ ایسا دعوت نامہ آیا ہے اور کانفرنس میں شرکت کے لئے میرا ہی انتخاب کیا گیا ہے۔ غالباً پالیسی کا تسلسل مد نظر نہیں تھا اس لئے جرمنی کے یونسکو کمیشن کی خواہش کہ مجھے بھیجا جائے پوری کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۳ مئی کی شام کو شہر گوسلار، جہاں کانفرنس ہونے والی تھی، پہنچ گیا۔

پہلا دن خیریت سے گذر گیا۔ کچھ رسمی تقریریں ہوئیں شام کو دعوت ہوئی۔ دوسرے دن ڈاکٹر اکرٹ نے مجھ سے کہا کہ کانفرنس کی صدارت آپ کو کرنی ہوگی۔ میں نے بہت کہا کہ میں اس کام کے لئے بالکل موزوں نہیں ہوں، مگر وہ بھی مجبور تھے۔ ڈیلی گیٹس میں چیکوسلواکیہ، ہنگری اور

گ سلاویہ کے نمائندے تھے، لیکن یہ بے ضرر رہتے ہیں یا سیاسی عداوتوں کو بالائے طاق رکھنے پر تیار ہو جاتے ہیں اگر انھیں روس کی رہنمائی حاصل نہ ہو۔ کانفرنس میں پروفیسر زرویچ نشکی روس کی نمائندگی کے لئے آنے والے تھے۔ امریکی نمائندوں کے ہوتے ہوئے انھیں صدر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اور ان کی موجودگی نے اس عہدے کے لئے امریکی نمائندوں کو اور ان کے ساتھ مغربی یورپ کے دوسرے نمائندوں کو خارج از بحث کر دیا۔ چنانچہ مجھے صدر، اور امریکہ کے مسٹر ہارنس مورن، چکوسلواکیہ کے مسٹر چ اور جرمنی کے پروفیسر اکرٹ نائب صدر مقرر ہوئے۔ کانفرنس نے اپنے کام کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا، ہر ایک پر غور کرنے اور اس کے متعلق رپورٹ دینے کے لئے گروپ بن گئے اور ان کے الگ صدر اور رپورٹر مقرر ہو گئے۔

کانفرنس میں جرمنی، انگلستان اور امریکہ کے بعض پبلشرز تھے، اور ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھانے کے لئے طے ہوا کہ پہلا گروپ درسی کتابوں کی تیاری اور چھپائی اور اس میں بین اقوامی تعاون کے امکانات پر غور کرے۔ تیسرے گروپ کے سپرد پیرس، ٹوکیو اور ولنگٹن کی کانفرنس کی سفارشات پر نظر ثانی اور ان کی تکمیل کرنا تھا، بین اقوامی مفاہمت کو یونسکو، مختلف قوموں کے نیشنل کمیشنوں، نظام تعلیم، نصاب تعلیم اور درسی کتابوں کے ذریعہ ترقی دینے کے جملہ مسائل دوسرے گروپ کے ذمے ڈالے گئے۔

پروفیسر زرویچ نشکی کا اور میرا تیسرے گروپ میں ساتھ ہوا۔ وہ ماسکو کے ایک ٹیچرز کالج کے پروفیسر ہیں، جرمن، انگریزی اور فرانسیسی روانی کے ساتھ نہیں تو بہت اعتماد کے ساتھ بول سکتے ہیں، مطلب کے موافق اور مطلب کے خلاف بات کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور میں نے ان کو کسی موقع پر اس اندیشے کی وجہ سے ہچکچاتے یا تکلف کرتے نہیں دیکھا کہ وہ اپنا مافی الضمیر صحیح انگریزی یا جرمن میں بیان نہ کر سکیں گے۔ وہ اپنے ساتھ مشرقی جرمنی کی چھپی ہوئی چند کتابیں لائے تھے جن میں مغربی جرمنی کی درسی کتابوں کا جائزہ لے کر دکھایا گیا تھا کہ ان کے ذریعہ بچوں میں ایسی ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے جو بین اقوامی امن اور اتحاد کے منافی ہے۔ انھوں نے اپنی پہلی تقریر میں جغرافیہ کی ایک کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا۔ اس کے جواب میں پروفیسر اکرٹ نے کہا کہ کسی کتاب کے ایک دو جملوں کو متن سے الگ کر کے پوری کتاب کو

اور ایک کتاب کے کسی نقص کی بنا پر تمام درسی کتابوں کو قابل اعتراض ٹھہرانا صحیح نہیں ہے، اور اس کا یقین دلا کر کہ جرمنی میں درسی کتابوں کو عداوت کے جذبے سے پاک کرنے کی مخلصانہ کوشش کی جا رہی ہے درخواست کی کہ کتابوں پر اعتراض کرنے کا سلسلہ نہ شروع کیا جائے۔ اس طرح یہ بات آگے نہیں بڑھی، تین چار دن بعد ایک عام جلسے میں پروفیسر ورچ نشکی نے ایک امریکی کتاب پر ایسا ہی اعتراض کیا۔ اس وقت تک ان سے بے تکلفی نہیں تو خاصی واقفیت ہو گئی تھی، اور خود میں نے بحیثیت صدر کے اس پر اظہار افسوس کیا کہ وہ ایک قابلِ اعتراض کتاب کو ایک ملک کی تمام کتابوں پر اعتراض کرنے کے لئے دلیل بنا رہے ہیں۔ ان دو مثالوں کے علاوہ پروفیسر ورچ نشکی کی تقریروں اور انداز گفتگو میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کسی کو شکایت ہو۔ میں نے صدر کی حیثیت سے انھیں رائے دینے کا پورا موقع دیا، اور اگر مجموعی طور پر شاید وہی سب سے زیادہ رائے دیتے رہے، ان کی بات ہمیشہ معقول ہوتی تھی۔ اس کا اعتراف سب نے کیا، اور رفتہ رفتہ بدگمانی بڑی حد تک دور ہو گئی۔

کانفرنس میں جاپان کے ایک نمائندے پروفیسر کرساوا تھے۔ وہ کئی سال سے جاپانی زبان میں اصول اور فن اور تاریخ تعلیم پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مختلف ملکوں کی درسی کتابوں کا موازنہ کیا، اور جو نتیجے نکلے تھے ان کے متعلق ایک نوٹ کانفرنس میں غور کرنے کے لئے پیش کیا۔ یہ نوٹ ان کی ایک جاپانی کتاب کے خلاصہ کا ترجمہ تھا۔ وہ خود انگریزی بہت کم جانتے ہیں، ترجمے کی زبان بہت ناقص تھی، اور نوٹ میں جو نظریے اور کلیے پیش کئے گئے تھے وہ تعلیم اور تہذیب (اور سیاست) کے اعتبار سے بہت اہم تھے۔ مثلاً انھوں نے روس کی درسی کتابوں کا مطالعہ کر کے نتیجہ نکالا تھا کہ درسی تعلیم کا مقصد صنعتی کار پردازی ہے، اور متحدہ ریاستوں کی درسی کتابوں کو دیکھ کر یہ رائے قائم کی تھی کہ وہاں تعلیم کا مقصد مہذب انسان پیدا کرنا ہے۔ بحث کے سلسلے میں انھوں نے کمیونسٹ اور آزاد ملکوں کا ذکر بھی کیا تھا۔ کانفرنس کے منتظموں کو ان سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے نوٹ کو کانفرنس کے کاغذات میں شامل کر دیا، اور ایجنڈے میں پروفیسر کرساوا کی تقریر کے لئے دو گھنٹے مخصوص کر دئے۔ پروفیسر کرساوا جاپانی کے علاوہ کوئی زبان جانتے نہیں، انھیں کتابیں بھی بہت کم مل سکیں اور انھوں نے درسی کتابوں کے موازنے کے بارے میں اپنے نوٹ میں جو کچھ لکھا تھا اسی سے صاف ظاہر تھا کہ ان کا کام بہت

نا نقرہے کانفرنس کے سامنے اسے پیش نہ کرنا چاہیے۔ کانفرنس کے منتظموں کو شاید پروفیسر ...زس
آ... اس لئے کہ انھوں نے تن تنہا ایک بہت بڑے کام کو انجام دینے کی کوشش کی تھی، اور انھوں
... نوٹ کو پڑھے بغیر گشت کرادیا۔ پروفیسر کرساوا نے تقریر سے پہلے ہال میں بہت سے چارٹ
لگادئے تھے، تقریر کے ساتھ انھوں نے لینٹرن سلائڈ بھی دکھلائے (بیشتر پہلے الٹے اور پھر
سیدھے) اور کانفرنس کے تمام اراکین کو احساس ہوا کہ ان کا وقت بیکار ضائع کیا گیا ہے۔ اسی
وجہ سے بیشتر چاہتے تھے کہ معاملے کو یہیں پر ختم کردیا جائے، لیکن پروفیسر نزوچ نشکی نے
... کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا، اور انھوں نے اصرار کیا کہ نوٹ پر بحث ہو۔ چونکہ مطالبہ
... تھا، مجھے ان کا ساتھ دینا پڑا، اور بحث کا وقت دوسرے دن سہ پہر کو رکھا گیا۔ اس
سے پہلے پروفیسر اکرٹ اور یونسکو کے نمائندوں نے پروفیسر کرساوا کا نوٹ اچھی طرح پڑھا
دوسری طرف پروفیسر نزوچ نشکی نے یونسکو کے ایک نمائندے کو اس کا قائل کردیا کہ نوٹ
میں کئی باتیں اس درجہ قابلِ اعتراض ہیں کہ اسے کانفرنس کے رکارڈ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔
پروفیسر اکرٹ کے سمجھانے سے پروفیسر کرساوا اس پر راضی ہوگئے کہ اپنا نوٹ تصحیح کے لئے اراکین
کانفرنس سے واپس طلب کرلیں۔ بحث تو مقررہ وقت پر ہوئی اگر خاتمہ اس پر ہوا کہ اعتراضات
سننے کے بعد پروفیسر کرساوا نے درخواست کی کہ ان کا نوٹ انھیں واپس کردیا جائے۔

کانفرنسوں کی آخری نشستیں عموماً اضطراری ہوا کرتی ہیں۔ ہماری کانفرنس نے جو گروپ
مقرر کئے تھے انھوں نے اپنے موضوعوں پر سیر حاصل بحثیں کیں اور رپورٹیں تیار کیں۔ یہ علم
جلسوں میں پیش ہوئیں، اور منظور بھی کرلی گئیں۔ پھر انھیں کی بنا پر سفارشات مرتب کی گئیں۔
رپورٹوں میں جو بات تفصیل سے کہی گئی تھی وہ جب سفارشات میں مختصر اور قطعی صورت میں نظر آئی
تو بعض لوگوں کو محسوس ہوا کہ سفارش میں جو بیان کیا گیا ہے وہ رپورٹ میں تھا ہی نہیں یا دوسری
شکل میں تھا، بعض نے رپورٹ کی منظوری کو سفارشات کی منظوری کے برابر نہیں مانا، سفارشات
اتنی جلدی میں مرتب کی گئی تھیں کہ ان کی زبان گنجلک اور اکثر مبہم تھی، اور ان کو وہ ترتیب دی
ہی نہیں جا سکتی تھی جو سفارشوں کو معمولاً دی جاتی ہے۔ پیرس سے جو خاتون انگریزی سے فرانسیسی

میں ترجمہ کرنے کے لئے بلائی گئی تھیں انھوں نے بعض جگہ انگریزی کا مطلب نہیں سمجھا اور اس کی وجہ
سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ سفارشوں کی تعداد بھی بہت تھی، کانفرنس کے آخری دن، ۲۳ مئی
کی سہ پہر کو جب سفارشیں سامنے آئیں اور ان کی تعداد اور عبارت کی خامیوں کا اندازہ ہوا تو
سب کو خیال ہوا کہ انھیں مرتب شکل دے کر منظور کرنے کا کام اتنے تھوڑے وقت میں نہ ہو سکے گا۔
کانفرنس کے منتظموں کی رائے تھی کہ چونکہ تجویزیں سب رپورٹ کی شکل میں منظور ہو چکی ہیں اس لئے
سفارشوں کو مجموعی اور اصولی طور پر منظور کر کے انھیں مرتب کرنے کی ذمہ داری جرمن نیشنل کمیشن
اور یونسکو کے سپرد کر دی جائے۔ پروفیسر زرویچ نٹسکی نے اس رائے کی بہت سختی سے مخالفت کی۔
بعض ممبروں نے زچ ہو کر کہا کہ سفارشوں کی ضرورت ہی نہیں ہے، کانفرنس کی تجویزیں
سب رپورٹوں میں موجود ہیں، انھیں کو شائع کر دینا کافی ہوگا۔ یہ خیال بھی پسند نہیں کیا گیا۔
آخر میں یہ طے ہوا کہ ایک ایک سفارش پر غور کر کے اسے منظور کیا جائے، اور جرمن نیشنل کمیشن
اور یونسکو سے صرف ایسی ترمیم کرنے کو کہا جائے جو سفارشوں کو رائج قاعدوں کے مطابق ترتیب
دینے کے لئے ضروری ہو۔ اس طریقۂ کار کو منظور کرنے کے بعد سفارشوں پر بحث شروع ہوئی۔
دوسری سفارش پر گاڑی رک گئی۔ اتفاق سے چائے کا وقت ہو چکا تھا، اس لئے چائے پینے
اور ذہنی فضا کو بہتر کرنے کے لئے جلسہ ملتوی کیا گیا۔ لیکن کھانے کے وقت تک کوئی ساٹھ
سفارشوں میں سے صرف سات آٹھ منظور ہو سکی تھیں۔ کھانے کے لئے جلسہ ملتوی ہوا تو مجھ سے
ایک امریکی نمائندے نے کہا کہ جلسے میں میں یہ تجویز دوبارہ پیش کرنے والا ہوں کہ کانفرنس کی
رپورٹ میں سفارشیں نہ رکھی جائیں۔ میں نے جواب دیا کہ ایسا ہرگز نہ کیجئے، بلکہ ممبروں سے کہیئے
کہ جس سفارش کے متعلق کوئی بڑا اصولی اختلاف نہ ہو اسے بغیر بحث کے منظور کر لیں۔ جلسہ شروع
ہونے سے پہلے جرمن نیشنل کمیشن کے سکریٹری نے مجھ سے کہا کہ ممبروں کو مطلع کیجئے کہ مترجم کا
جہاز ۱۱ بجے رات کو جاتا ہے، اسے دو مرتبہ روکا جا چکا ہے، اب نہیں روکا جا سکے گا، اس لئے
بحث مختصر کی جائے۔ میں نے کہا مجھے امید ہے کسی تنبیہہ کے بغیر ہمارا کام ہو جائے گا۔ جب جلسہ
شروع ہوا اور میں نے کسی سفارش کی عبارت پڑھ کر سنا دی اور پوچھا کہ کیا یہ منظور ہے تو ہر طرف سے

منظور" منظور" کی صدائیں آنے لگیں پروفیسر روغ مشکی پر اس فضا کا اثر نہیں ہوا، ایک موقع پر مجھے درخواست
کرنی پڑی کہ میری خاطر اپنا اعتراض واپس لے لیجئے، مگر کام میں رکاوٹ ڈالنا ان کا منشا بالکل نہیں تھا،
اور دوسرے ممبران کے ہر معقول اعتراض کو فوراً مان بھی لیتے تھے، اس لئے ایک گھنٹے کے اندر تمام
سفارشیں منظور ہو گئیں۔

کانفرنس نے سفارشوں کی ترتیب کے بارے میں طے کیا کہ یونسکو نیشنل کمشنوں، قومی حکومتوں
درسی کتابوں کے ناشروں، مختلف مضامین کے استادوں سے جو سفارشیں کی گئی ہوں انھیں الگ الگ
لکھا جائے، اور باقی "عام سفارشوں" کے تحت رکھی جائیں۔ یونسکو سے جو سفارشیں کی گئیں ان میں
سے میرے نزدیک خاص طور پر تین قابل توجہ ہیں۔ ایک سفارش یہ ہے کہ چونکہ درسی کتابوں کو بدلنا
یا ان میں ترمیم کرنا لمبا اور مشکل کام ہے، اس لئے استادوں کی معلومات میں اضافہ کرنے اور ان کے
درس کو بین اقوامی مفاہمت اور مختلف تہذیبوں کی قدر شناسی کے لئے مفید بنانے کی خاطر کتابیں
کتابچے تیار کئے جائیں۔ دوسری سفارش یہ ہے کہ یونسکو کو براہ راست استادوں کی انجمنوں سے
تعلقات پیدا کرنا اور انھیں مطلع کرنا چاہیئے کہ یونسکو سے ان کو کس کس طرح کی مدد مل سکتی ہے۔ تیسری
سفارش یہ ہے کہ یونسکو کو استادوں کی ترتیب کے نصابوں میں زیادہ وسعت پیدا کرنے کی تدبیریں
اختیار کرنا چاہیئے، تاکہ استاد اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر درسی کتابوں کی کمیاں پوری کر سکیں۔

ملکوں کے اندر یونسکو کے تعلیمی اور تہذیبی مقاصد حاصل کرنے کے لئے جو قومی کمیشن ہیں ان سے
کئی سفارشیں کی گئی ہیں۔ انھیں ابتدائی اور ثانوی مدرسوں کی درسی کتابوں کو بہتر بنانے کے لئے
کمیٹیاں مقرر کرنی چاہئیں جن میں درسی کتابوں کے ناشروں کے نمائندے بھی ہوں۔ انھیں یہ معلوم
کرنا چاہیئے کہ ملک کے اندر کون سے ادارے اور جماعتیں ہیں جو تہذیبی مفاہمت کے منصوبے
کو ترقی دے سکتے ہیں، انھیں اس کی کوشش کرنا چاہیئے کہ درسی کتابوں کی چھپائی اور اشاعت
سے پہلے ہی ان کی جانچ کر لی جائے، انھیں درسی کتابوں کے ناشروں اور استادوں کی انجمنوں کے
تعاون کی صورتیں نکالنی چاہئیں، تہذیبی مفاہمت کے سلسلے میں جو بھی مختلف کام ہو رہے ہیں
ان کے درمیان ربط پیدا کرنا چاہیئے، اور یونسکو سے جو مواد حاصل ہو اسے اپنے ملک والوں کے لئے

کارآمد بنانے کی تدبیریں کرنا چاہیئے۔ قومی حکومتوں سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ نیشنل کمیشن کے لیے ضروری وسائل، خاص طور سے مالی وسائل فراہم کرتی رہیں، اور اگر ضرورت ہو تو نصاب کی کتابوں سے سیاسی اور فوجی تاریخ سے ایسی باتیں خارج کرنے میں جو تعصب اور عداوت پیدا کرتی ہیں، نصاب اور درسی کتابیں مرتب کرنے والی جماعتوں اور ایجنسیوں کی مدد کریں۔

تعلیم کا دارومدار استاد پر ہوتا ہے، اس لئے استادوں کی انجمنوں سے سفارش کی گئی ہے کہ وہ بھی اس پر غور کریں کہ تہذیبی مفاہمت کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے کیا تدبیریں کی جا سکتی ہیں، اور انھوں نے تاریخ، جغرافیہ اور ادب کا شوق بڑھانے کے لئے جو سوسائیٹیاں یا کلب بنائے ہوں ان کے پروگرام میں دنیا کے ان حصوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا شامل کریں جن پر ابھی تک کم توجہ کی گئی ہے یا جنھیں نظرانداز کیا گیا ہے۔ استادوں سے اس کی بھی سفارش کی گئی کہ وہ نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے مطالعے کے قابل کتابوں کی فہرستیں بنائیں، اور بری کتابوں کو پڑھنے کی ممانعت کرنے کے بجائے اچھی کتابیں پڑھنے کی ترغیب دلائیں۔

کانفرنس کی سب سے نمایاں خصوصیت ممبروں کا خلوص تھا۔ عام طور پر بین اقوامی مجلسوں میں ہر ملک کے لوگ اپنی قومی زندگی اور اپنی حکومت کے رویے کی حتی الامکان تعریف کرتے ہیں اور کسی خامی کو ظاہر کرنا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ گو سلارکی کانفرنس میں سیاسی بحثیں نہیں ہوئیں اور کام کے سلسلے میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں انھیں بے تکلفی سے بیان کیا۔ متحدہ ریاستوں میں بعض چھوٹی اور بیشتر مقامی مگر خاصی طاقت ور پارٹیاں یونسکو کے بہت خلاف ہیں، اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ استادوں کو یونسکو کے بارے میں تعلیم دینے کی سزا میں برطرف کر دیا گیا۔ دوسرے گروپ کی تجویزوں میں ایسی دباؤ ڈالنے والی جماعتوں کا ذکر تھا۔ چونکہ کسی ملک کا نام نہیں دیا گیا تھا، صرف "بعض" ملکوں کے حوالے سے بات کہی گئی تھی، میں نے کہا کہ کمیونسٹ اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ بیجا دباؤ ڈالنے والی جماعتوں سے مراد جمہوری ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیاں ہیں، اور انھیں اس پر اعتراض ہوگا، تب یہ راز کھلا کہ تجویز ایک امریکی ممبر کی تحریک پر رپورٹ میں شامل کی گئی تھی، اور امریکی ممبر نے مجھے یقین دلایا کہ اس سے مراد ان کے اپنے ملک کی رجعت پسند پارٹیاں ہیں،

رانسٹ ہرگز نہیں ہیں۔ آج کل وہ لوگ جو دل سے بین اقوامی مفاہمت کے خواہش مند ہیں اپنے ملکوں
کے سیاسی نظام سے نہیں تو حکومتوں کے طریق کار سے بیزار ہیں۔ حالات میں تبدیلی کرنا ان کے بس میں
نہیں ہے، اور شکایت کرنے سے دشواریاں بڑھتی ہیں۔ اس لئے وہ صرف اپنے کام سے جو لگاؤ ہو
اسے ظاہر کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کے ساتھ صبر پر متفق ہونے کی تلقین کر سکتے ہیں۔

عنفوانِ شباب کے مسائل

ڈاکٹر سلامت اللہ

کہتے ہیں کہ فرد کی زندگی کی کسی اور منزل پر اتنے پیچیدہ مسائل نمودار نہیں ہوتے جیسے کہ عنفوانِ شباب کی منزل پر۔ والدین اور اساتذہ دونوں اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں خاص قسم کی دشواریاں محسوس کرتے ہیں۔ مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس منزل پر کوئی غیر معمولی تبدیلی یکدم رونما ہو جاتی ہے۔ نشوونما کا عمل ایک مسلسل اور اٹوٹ عمل ہے۔ اس کی مختلف منزلوں کے درمیان کوئی بیّن حدِ فاصل نہیں ہے کہ ایک منزل یہاں ختم ہوئی اور دوسری وہاں شروع ہوئی۔ ہر ایک منزل دوسری میں رفتہ رفتہ ضم ہو جاتی ہے۔ مگر ہر ایک منزل دوسری سے اپنی خصوصیات کی بنا پر ممیز کی جا سکتی ہے۔ اور یہ خصوصیات مخصوص مسائل کا پیش خیمہ بنتی ہیں۔ ان مسئلوں کا جاننا اور سلجھانا ان لوگوں کے لئے بہر حال ضروری ہے جن کے ذمے بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا کام ہے۔ اس اہم کام کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کے ذمے ہوتا ہے۔ یوں تو نشوونما کی ہر منزل کے مسئلے اساتذہ کی توجہ کے مستحق ہیں، لیکن عنفوانِ شباب کے مسائل اس کے خاص غور و فکر کے محتاج ہیں۔ اس بات کی اہمیت اس لئے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس منزل کے بعض مسائل ایسے ہیں کہ جن کا حل کرنا تو دور کی بات ہے ان کا ذکر کرنا تک ہماری موجودہ تہذیب میں شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

عنفوانِ شباب زندگی کا وہ عبوری دور ہے، جو بچپن اور بلوغ کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس وقت فرد کو نہ تو بچہ ہی کہا جا سکتا ہے اور نہ بالغ ہی۔ اگرچہ ابھی اس میں بالغ کی سی پختگی نہیں ہوتی۔ تاہم اب اس کے ساتھ بچے جیسا سلوک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اسے بالغ کی طرح ذمہ دار اور خود مختار قرار دیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر زندگی کی اس منزل کو ایک مخصوص عمر کے ساتھ وابستہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دور تیرہ اور انیس سال کے درمیانی وقفے یعنی سات سال پر مشتمل ہے۔ مگر ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ اس منزل کی حد بندی اس طرح نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے نزدیک اس کا تعلق محض جسمانی

سے نہیں، بلکہ کسی قوم کے سماجی حالات سے بھی ہے۔ اگر ایک سماج میں فرد کو بالغ کی ذمہ داریاں دیر سے سپرد کی جاتی ہیں تو وہاں عنفوان شباب کا دور دیر تک قائم رہتا ہے مثلاً امریکہ میں اب تقریباً پچیس سال کی عمر تک فرد پر خاندانی ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں اور وہ اس زندگی کی تیاری کے لئے مختلف قسم کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس لئے وہاں عنفوانِ شباب کی منزل چوبیس پچیس سال کی عمر تک جاری رہتی ہے۔ ہمارے سماجی نظام میں بلوغیت کی ذمہ داریاں بہت کم عمری میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ہمارے یہاں ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد جو بچے ثانوی مدرسے میں داخل ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر اپنے عنفوانِ شباب کا دور وہیں ختم کرتے ہیں۔ اس لئے اس دور کی امتیازی خصوصیات اور مسائل کا علم ثانوی مدرسے کے استادوں کے لئے ازبس ضروری ہے۔

اس منزل میں فرد طرح طرح کی تبدیلیوں سے دوچار ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ گویا ایک نئے جسم اور ایک نئے ذہن کا جنم ہوتا ہے۔ وہ تمام تبدیلیاں جو اس وقت اس کے جسم، ذہن اور اخلاقی تصورات میں پیدا ہوتی ہیں، انواع و اقسام کی پیچیدگیوں اور الجھنوں کا سبب بنتی ہیں۔

جسمانی اعتبار سے دیکھیئے تو اس دور میں قد، وزن، شکل و صورت، آواز اور جسم کی اندرونی بناوٹ میں نمایاں تغیرات نظر آتے ہیں۔ جب عالم شباب کی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں تو نشوونما کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے، بعض کا قد تو ایک ایک سال کے اندر چھ چھ انچ تک بڑھ جاتا ہے اور بعض کے وزن میں بیس بیس تیس تیس پونڈ تک اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس غیر معمولی تبدیلی سے نہ صرف نوجوان مختلف قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ اس کے والدین کو بھی طرح طرح کے مسائل پیش آتے ہیں۔ اس زمانہ میں تیزی سے بڑھتے ہوئے جسم کے لئے مزید غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور بھوک بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مگر اکثر والدین اور بڑوں کی ناسمجھی کی وجہ سے نوجوان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ کوئی اس کی بھوک کو جوعِ بقر سے تعبیر کرتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ لڑکا کیا ہے اژدہا ہے کہ کھاتا ہی چلا جاتا ہے اس کا جہنم بھرتا ہی نہیں۔ اس قسم کے غیر ہمدردانہ رویے سے نہ صرف وہ جسمانی تسکین سے محروم رہتا ہے بلکہ وہ ایک پریشان کن ذہنی کشمکش میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ جو والدین کے سامنے آتا ہے وہ ہے لباس سے متعلق جوتا خریدتے ہی چھوٹا ہو جاتا ہے آستینیں مسلسل چھوٹی ہوتی رہتی ہیں۔ کُرتے اور پائجامے بہت جلد اونچے ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں خصوصاً غریب والدین کو بڑی دشواری محسوس ہوتی ہے۔ کہاں تک نئے جوتے خریدے جائیں اور نئے کپڑے سلوائے جائیں۔ لہٰذا اس زمانے میں ذرا ڈھیلی ڈھالی چیزیں مہیا کرنی چاہئیں۔ جن میں تیزی سے بڑھتے ہوئے جسم کے لئے کسی قدر گنجائش موجود ہو۔

قد اور وزن میں غیر معمولی اضافے کے علاوہ اس دور میں شکل وصورت میں بھی خاص تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کی ظاہری شباہت بالغوں کی سی ہو جاتی ہے۔ کندھے چوڑے ہو جاتے ہیں، بازوؤں کے پٹھے ابھر آتے ہیں اور جبڑوں کی ہڈیاں خاص طور پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ عام طور پر جسم چھریرا ہو جاتا ہے، اعضائے تناسل سن بلوغ کی جسامت اختیار کر لیتے ہیں۔ آغاز شباب کے وقت ان اعضاء کی نشوونما کی رفتار نمایاں طور پر تیز ہوتی ہے۔

بچپن کی پیاری، میٹھی، اور سریلی آواز، بھونڈی اور بھدی ہو جاتی ہے۔ نوجوان اپنی آواز کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر بے سود۔ یہ بات ان کے لئے تشویش کا سبب بن جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بات چیت کرتے ہوئے جھینپتے ہیں۔ اگر انھیں اس وقت ہمدردانہ لہجے میں بتا دیا جائے کہ ان کی آواز خود بخود کچھ عرصہ بعد ٹھیک ہو جائے گی تو ان کی بے جا پریشانی دور ہو سکتی ہے۔

نوجوانوں میں ان کی غیر معمولی جسمانی نشوونما سے جو جذباتی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ ان کے لئے مُضر ہے بعض نوجوانوں کو ایک خوف سا محسوس ہوتا ہے اور وہ کچھ کھنچے کھنچے اور کچھ مرجھائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شکل وصورت کی تبدیلی پر ایک بے تُکا پن سا محسوس کرتے ہیں، یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ جامعہ کے مدرسۂ ابتدائی کی جماعت ششم میں ایک لڑکا تھا، اس کا قد گرمی کی تعطیلات میں کئی انچ بڑھ گیا، تعطیلات کے بعد جب اس کی جماعت کے تمام بچے قد کے لحاظ سے ایک قطار میں کھڑے کئے گئے، تو اسے پہلے نمبر پر کھڑا ہونا پڑا، حالانکہ اس سے پہلے وہ تیسرے نمبر پر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ اس موقع پر اس کے چہرے سے حجاب اور پریشانی کے آثار نمایاں

...وہ اپنی گردن نیچے کئے ہوئے تھا اور اپنی پنڈلیوں کو سکوڑنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے ... ہنس رہے تھے، اس سے وہ اور بھی زیادہ خفیف ہو رہا تھا۔

اس منزل پر نوجوان کو جس چیز سے سب سے زیادہ فکر و تشویش محسوس ہوتی ہے وہ ہے ... کے جنسی عمل کی پختگی کا ظہور۔ جب کسی لڑکے کو پہلی بار احتلام کا تجربہ ہوتا ہے تو اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر اسے اس نئے جسمانی عمل کی وجہ نہیں معلوم ہوتی یا غلط وجہ معلوم ہوتی ہے تو وہ اس کی فکر میں گھلنے لگتا ہے۔ اوسط درجے کے لڑکوں میں یہ واقعہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رونما ہوتا رہتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ انھیں اس عمر میں پہلے سے آگاہ کریں کہ اس قسم کا واقعہ ایک فطری عمل ہے، نہ یہ کوئی بری بات ہے اور نہ اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے سماج میں بدقسمتی سے زیادہ تر نوجوان، اس معاملہ میں بالکل بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ وہ اس سے بہت حیران و پریشان ہوتے ہیں اور آسانی سے کسی مکار عطائی کے جال میں پھنس جاتے ہیں جو اس فطری عمل کو کسی بیماری سے تعبیر کر کے انھیں اور زیادہ ڈرا دیتا ہے اور علاج کے بہانے لوٹتا ہے۔ ہندوستانی اخباروں کے اشتہارات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس شرمناک اور دیدہ دلیرانہ لوٹ کھسوٹ کی شہادت دیتے ہیں۔ ہمارے شہروں اور قصبوں کی دیواریں تک اس قسم کے اشتہاروں سے پاک نہیں ہیں۔ یہ تو ہوا لڑکے سے متعلق۔ اسی طرح اس لڑکی کے حال پر غور کیجئے جسے پہلے سے حیض کے متعلق کوئی معلومات نہ بہم نہیں پہنچائی گئی ہے۔ جب اسے سب سے پہلے اس عمل کا تجربہ ہوتا ہے تو وہ شدید خوف، ذہنی پریشانی اور ناپسندیدہ جذبات کا شکار بن جاتی ہے۔ بعض اوقات لڑکیاں اس جذباتی اور ذہنی الجھن میں مہینے گزار دیتی ہیں اور ان بیچاریوں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ نوجوانوں کو اس قسم کے جسمانی عوامل سے باخبر کرنے کی اشد ضرورت ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس بارے میں غلط معلومات بہم پہنچانا یا غلط طریقے سے تعلیم دینا اتنا ہی برا ہے، جیسا کہ اس سے قطعاً ناواقف رکھنا۔ جو لوگ نوجوانوں کو اس قسم کی معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں انھیں خود اس موضوع کا سائنٹفک علم حاصل کرنا چاہیئے، نیز انھیں یہ بھی جاننا

چاہیئے کہ اس سے نوجوانوں کو روشناس کرنے کا پسندیدہ اور موثر طریقہ کیا ہے۔

جسمانی نشو ونما کی طرح اس منزل میں ذہنی نشو ونما کی وجہ سے بھی بعض مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عمر کا وہ زمانہ ہے جب کہ عقل کے پودے میں پھول لگتے ہیں۔ یعنی اس زمانے میں غور وفکر کی صلاحیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے فرد آزادی اور کاوش سے کسی مسئلے پر غور وخوض نہیں کر سکتا تھا۔ اب تک اس کی بیشتر دلچسپیاں ٹھوس اور مقرون اشیا (کھیل کود وغیرہ) تک محدود تھیں۔ مگر اب مجرد تصورات بھی اس کی دلچسپی کا مرکز بنتے ہیں۔ اس میں رفتہ رفتہ تعمیم (GENERALIZATION) کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ دیئے ہوئے واقعات سے نتیجہ نکال سکے اصول وقواعد وضع کر سکے۔ اس کے ذہنی مشاغل اب زیادہ سنجیدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ اب اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے لگتا ہے: "میں کیا بنوں گا؟" "میں کیا کروں گا؟" اس دور میں آزاد خیالی اور خود اعتمادی کی صفات پروان چڑھتی ہیں۔ لیکن اس میں کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس سے پہلے اس کی تعلیم وتربیت کس نہج پر ہوئی ہے۔ اگر والدین نے اسے محض ایک کھلونا سمجھ کر پالا پوسا ہے تو اس میں آزاد خیالی اور خود اعتمادی بہ مشکل پیدا ہو سکے گی۔ اس کے برعکس اگر والدین نے تعلیم وتربیت میں اس کی انفرادیت کا لحاظ رکھا ہے، تو ان خوبیوں کے پیدا ہونے کی قوی امید ہے۔ اوسط ذہنی استعداد کا بچہ جس کی عمر سات سال ہو چکی ہے اور وہ اب تک خود اپنے کپڑے نہیں پہن سکتا، اس کی ماں یا بہن اُسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتی ہے وہ رات کو اکیلا نہیں سو سکتا۔ ایسا بچہ دراصل اپاہج بنایا جا رہا ہے۔ اُسے ایک ایسے مرض میں مبتلا کیا جا رہا ہے جو اسے گھر سے کہیں دور جانے سے روکے گا۔ گویا وہ اپنے گھر کے اندر ہمیشہ کے لئے مقید ہو کر رہ جائے گا۔ ایسے بچے میں بعد ازاں آزاد خیالی اور خود اعتمادی کے اوصاف پیدا کرنا بہت مشکل ہو گا۔ وہ ہمیشہ اپنے بڑوں کا دست نگر رہے گا۔ دراصل والدین کے سامنے یہ ایک نازک مرحلہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت میں کیا رویہ اختیار کریں۔ معقول رویہ تو یہ ہوگا کہ نوجوان کو نہ تو اچانک بے نکیل کے اونٹ کی طرح آزاد چھوڑ دیا جائے اور نہ ہی ہمیشہ کے لئے طوطے کی طرح پنجرے میں بند کر کے رکھا جائے۔ ہمارے نوجوانوں میں خود اعتمادی کے فقدان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین

اور خصوصاً ماؤں کا میلان طبع انھیں اپنے بچوں کو نجی ملکیت سمجھنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور انھیں اس خیال سے بڑی تکلیف ہوتی ہے کہ ایک دن ان کی اولاد ان کی توجہ اور سرپرستی سے بالکل بے نیاز ہو جائے گی۔

زندگی کی اس منزل پر یہ مسئلہ بھی سامنے آتا ہے کہ نوجوان بالآخر اپنی روزی کمانے کا کون سا طریقہ اختیار کرے گا۔ مدرسے کا فرض ہے کہ اس معاملے میں اس کی مناسب رہنمائی کرے۔ ہوائی قلعے بنانے سے آخر میں جو مایوسی اور صدمہ ہوتا ہے، اس سے جہاں تک ہو سکے نوجوان کو بچانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں اُسے اور اس کے والدین کو چند بنیادی باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔

۱۔ مختلف پیشوں کے لئے مختلف قسم کی ذہنی صلاحیت اور عملی تیاری درکار ہوتی ہے۔

۲۔ سماجی زندگی کی تنظیم میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ ہر قسم کی ذہنی صلاحیت کی ضرورت ہے۔

۳۔ نہ تو آبائی پیشے کو زبردستی نوجوانوں کے گلے باندھا جا سکتا ہے اور نہ ہی فقط والدین اور اپنی خواہش کی بنا پر کسی مخصوص پیشے کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

حال میں مغربی ملکوں میں ثانوی مدرسے کے طلبہ کی پیشہ ورانہ رہنمائی کے میدان میں بہت بڑی ترقی ہوئی ہے۔ وہاں تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جن نوجوانوں نے وہ پیشے اختیار کئے جن کا مشورہ مختلف قسم کی جانچوں کی بنا پر انھیں دیا گیا تھا وہ اپنے پیشے میں ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوئے جو اس قسم کے مشورے سے محروم رہے تھے۔ اس مقصد کی خاطر ثانوی مدرسے میں مختلف قابلیتوں اور رجحانوں کے لحاظ سے طلبہ کے لئے مختلف قسم کے نصابوں کا التزام کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم یا اس کے والدین کسی ایسے پیشے کے آرزومند ہوتے ہیں جس کے لئے ایک خاص قسم کی ذہنی استعداد کی ضرورت ہے اور وہ اتفاق سے اس طالب علم میں موجود نہیں ہے تو مدرسہ اُسے اس بات سے آگاہ کر دیتا ہے اور کسی دوسرے مناسب پیشے کی سفارش کرتا ہے۔ اور وہ طالب علم نصاب انتخاب کرنے یا پیشہ اختیار کرنے میں غلط قدم اٹھانے سے بچ جاتا ہے اور اُسے بعد کی ناکامیوں کے تلخ تجربے سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ اب ہمارے ملک میں بھی ایسی ہی ایک کوشش کثیر المقاصد مدارس (MULTIPURPOSE SCHOOL) کے تحت شروع کی گئی ہے۔ مگر ابھی ہمارے ہاں ایسے بہت کم ادارے ہیں اور جو ہیں بھی بوجوہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ اس صورت حال میں دولت، منصب اور نام و نمود باپ کا کندہ تن

اور ناکارہ بیٹا تعلیم اور پیشہ کے معاملے میں ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ باپ کو اس وقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ بیٹا دھن دولت اور شہرت کے لحاظ سے اس سے زیادہ یا کم ازکم اس کے برابر مرتبہ حاصل نہیں کرلیتا۔ اس لئے وہ اپنے بیٹے کو اپنی سماجی حیثیت کے مطابق اچھے سے اچھے تعلیمی اداروں میں داخل کراتا ہے اور اس کے نزدیک اچھا ادارہ وہی ہے جہاں اخراجات زیادہ ہوں اور جہاں صرف ان ہی لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں، جو اپنی سماجی حیثیت کے اعتبار سے کم ازکم اس کے ہم پلہ ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد پر ولایتی سند کا ٹھپہ لگوانے کے لئے ہزاروں روپیہ ضائع کر دیتا ہے۔ اسی طرح ہمارے دیس میں اس لڑکے کا مسئلہ بھی خاصا پیچیدہ ہے جو کسی گمنام اور نادار باپ کا بیٹا ہے، لیکن جسے قدرت نے اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں بخشی ہیں۔ اس بے چارے کو ترقی کرنے کے خاطر خواہ مواقع میسر نہیں ہوتے۔ اور یہ کلی بغیر کھلے مرجھا جاتی ہے۔ غور سے دیکھئے تو نہ صرف یہ اس کا ذاتی نقصان ہے بلکہ یہ ایک قومی خسارہ بھی ہے۔ اس کی خداداد صلاحیتیں بروئے کار نہیں آتیں، تو قوم بھی اس کی ذات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس قومی خسارے کو روکنے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کرنی چاہیئے۔ خوشی کی بات ہے کہ ابھی حال میں حکومت ہند نے ایسے ہونہار طلبہ کی تعلیم کے لئے معقول امداد کی فراہمی کا اعلان کیا ہے۔ مدرسے کا فرض ہے کہ طلباء کی صلاحیتوں اور کوتاہیاں مناسب طریقوں سے معلوم کرے اور والدین کو برابر باخبر رکھے، تاکہ وہ اپنی اولاد سے دور از کار امیدیں وابستہ کرنے سے باز رہیں۔ اور وہ خود اور ان کی اولاد دونوں اس مایوسی اور خفت سے بچ سکیں جو ناقابل حصول مقاصد میں ناکامی کی صورت میں ہوتی ہے۔

عام طور پر ایک ناتجربہ کار نوجوان پیشہ ورانہ زندگی میں داخل ہونے کے لئے کوئی دروازہ ڈھونڈتا ہے۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمام اچھی آسامیاں پہلے سے پُر ہیں یا اس کی دسترس سے باہر ہیں اور اُس کی کہیں بھی کھپت نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی بھی کام نہیں ملے گا اور وہ مایوسی اور خوف وہراس کے عالم میں دن کاٹتا ہے۔ اور اس صورت حال میں جو کام بھی سب سے پہلے اس کے ہاتھ آجاتا ہے اسے بطور پیشہ اختیار کرلیتا ہے چاہے اُس کے لئے اس کی طبیعت موزوں ہو یا نہ ہو، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کو اُن آسامیوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں جن

کی ملک میں زیادہ مانگ ہے۔ ہر آزاد ملک میں جہاں کی حکومت عوام کی فلاح وبہبود کا خیال رکھتی ہے۔ اس قسم کے اعداد وشمار سرکاری طور پر باقاعدہ شائع کئے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے ملک میں اس وقت اس کی بڑی کمی ہے۔ یہاں صرف چند ہی بڑے شہروں میں اس قسم کا انتظام ہے جہاں (EMPLOYMENT EXCHANGE) دفاتر کے ذریعے ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ پھر بھی اس وحشت کو کسی حد تک کم کیا جا سکتا ہے جو خالی جگہوں کی کمی کے خیال سے نوجوانوں پر طاری رہتی ہے۔ اس بارے میں طلبہ کے زاویۂ نگاہ کو بدلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ انھیں یہ سمجھانا پڑے گا کہ ان آسامیوں کے بارے میں پریشان نہ ہوں، جن پر تجربہ کار لوگ فائز ہیں بلکہ ان آسامیوں کے متعلق سوچیں جو کہ اُن جیسے ناتجربہ کار لوگوں کے لئے خالی ہیں۔ اس طرح ان کی کامیابی کے امکانات بڑھ جائیں گے اور ان کی پریشانی بڑی حد تک دور ہو جائے گی۔

عنفوانِ شباب کی منزل میں بعض اہم سماجی اور اخلاقی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ جنسی قوت کا ظہور ہے۔ ہر ایک مہذب جماعت میں جنسی جبلت کو عموماً ایک شیطانی اور ناپاک قوت سمجھا جاتا ہے۔ والدین اور اساتذہ سبھی اس فطری رجحان کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ اکثر پسندیدہ نہیں ہوتا۔ نوجوان کی فطرت میں یہ چیز داخل ہے کہ اگر اُسے کسی کام سے زبردستی منع کیا جائے تو وہ بغاوت کرتا ہے اور اس کام کو کھلم کھلا یا چھپے چوری کرنے میں اسے فتح وکامرانی کا احساس ہوتا ہے۔ جس عشق کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں حائل ہوں وہ اس کے لئے زیادہ تسکین اور کشش کا باعث ہوتا ہے۔ متوازن نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو جنسِ مخالف کے ہم عمر افراد سے ملنے جلنے کا موقع دیا جائے۔ اس معاملے میں والدین اور بڑے بوڑھوں کا رویہ ہمدردانہ اور دانشمندانہ ہونا چاہیئے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں جب نوجوان لڑکے لڑکیاں سماجی زندگی میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، تو اکثر بڑے بوڑھے ان کے میل ملاپ کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے اور بہت جلد دو خاندانوں کی ناک کٹنے والی ہے لیکن یہ رویہ مناسب نہیں ہے۔ والدین کو اس معاملے میں نہ تو اتنی بے نیازی برتنی چاہیئے کہ ان کے لڑکے لڑکیاں جو چاہیں کریں اور نہ ہی انھیں اس قدر شکی ہونا چاہیئے کہ ہر وقت ان کی نگرانی مجرموں کی

طرح کرتے ہیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے ایک بھی طریقہ مفید ثابت نہیں ہوگا جنسی معاملات میں بھی والدین کو اسی قسم کی دلچسپی ہونی چاہیئے، جیسی کہ وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت، اس کے مستقبل اور دوسرے مسائل میں رکھتے ہیں علم نفسیات کے نزدیک مخالف جنسوں کے افراد کی باہمی دلچسپی اور محبت کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ وہ مسائل زیادہ مشکل ہیں جن کا تعلق غیر فطری جنسی مظاہر سے ہے مثلاً امرد پرستی، جلق وغیرہ۔ اور بدقسمتی سے ہمارے ملک میں اس قسم کے شواہد اکثر ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے تعلیمی نقطۂ نظر سے یقینی یہ دانشمندانہ اقدام ہوگا کہ نوجوانوں کو جنسیات سے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائی جائے۔ مثلاً علم الاعضا کے سلسلے میں انہیں افزائش نسل کے عمل اور ضبط نفس کی ضرورت سے آگاہ کیا جائے کہ یہ جسمانی صحت، نفسیاتی توازن اور اقتصادی خوش حالی کا ضامن ہے صحیح طریقہ اختیار کیا جائے تو امید ہے کہ اوسط درجے کے ذہین نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ضبطِ نفس کی ترغیب ہوگی۔ قانونی شادی کے علاوہ اور کسی دوسری قسم کے جنسی تعلقات سے جن امراض خبیثہ میں مبتلا ہونے کا احتمال ہے ان سے بھی نوجوانوں کو باخبر کر دینا چاہیئے۔

ضبط نفس کے حاصل کرنے کی بعض تدابیر بہت موثر ثابت ہوئی ہیں کسی محرک کے زور کو ختم کرنے کا نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ توجہ کو دوسری دلچسپیوں کی طرف موڑ دیا جائے۔ ثانوی مدرسے میں ورزش اور کھیل کا اہتمام اس مقصد کے حصول میں معاونت کرتا ہے۔ اس قسم کے مشاغل نہ صرف جسمانی نشو و نما کے لئے مفید ہیں بلکہ ان کی بدولت نوجوان کو جنسی باتوں پر سوچنے اور جسمانی لذتوں کو حاصل کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ مشہور ہے کہ خالی ذہن شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ کوئی پسندیدہ مصروفیت نہ ہو تو کسی گھٹیا کام میں پھنسنے کا بہت امکان ہوتا ہے۔

عنفوانِ شباب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس منزل میں فرد خیر و شر کے بنیادی مسائل پر غور و فکر کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس رجحان کو مذہب و اخلاقیات میں دلچسپی سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ سماجی اثرات کا نتیجہ ہے۔ چونکہ نوجوان میں غور و فکر کی صلاحیت رونما ہوتی ہے اس لئے وہ ان بنیادی تصورات کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے جو سماج میں عقیدہ کے طور پر جاری ساری ہوتے ہیں۔ نوجوان پر دو بے پناہ قوتوں کا انکشاف ہوتا ہے جو بظاہر متضاد ہیں۔ ایک قوت تو اسے اپنی روح میں پوشیدہ معلوم ہوتی ہے اور دوسری قدرت میں۔ اسے اپنی روحانی قوت پر

[illegible] آغاز ہوتا ہے کہ وہ خود کو ہر چیز کا اہل سمجھنے لگتا ہے، لیکن دوسری طرف جب اسے قدرت کی بے پناہ قوت کا ادراک ہوتا ہے، تو اسے اپنی بے چارگی اور بے مائگی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ یہی مذہبی شعور کی بنیاد ہے۔ کبھی کبھی نوجوانوں کا مذہبی جذبہ دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے بعض اوقات وہ اسی محرک کی وجہ سے بہت متفکر اور گم سم سے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ وہ گھنٹوں مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں غرق رہتے ہیں۔ بعض اوقات وہ تنہائی میں آنسو بہاکر دل کو ہلکا کرتے ہیں اور کبھی خود کو جسمانی اذیتیں پہنچا کر تزکیۂ نفس کی سبیل نکالتے ہیں۔ لہذا نوجوانوں کو تنہائی میں خالی وقت گزارنے کا کم سے کم موقع دینا چاہیئے اور جہاں تک ممکن ہو انھیں کسی عملی کام میں مصروف رکھنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔

بچپن کے زمانے میں بچہ سماجی قوانین کی پابندی بلا سمجھے بوجھے کیا کرتا ہے۔ مگر نوجوانی میں سماجی شعور آجاتا ہے اور وہ سمجھ بوجھ کر سماج کی معین کی ہوئی کسوٹی پر اپنی ذات کو پرکھنے اور پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں قربانی اور ایثار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے وہ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ لہذا جماعت اور مدرسے کے نظم ونسق میں نوجوانوں کو شرکت کرنے اور سماجی خدمات انجام دینے کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ اسکاؤٹنگ اور دیگر اجتماعی منصوبے بھی اس نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوں گے۔

نوجوان اپنے کردار کا محاسبہ خود کرتا ہے۔ وہ سوچتا رہتا ہے کہ کہیں اس کے قول و فعل میں کوئی چیز قابل اعتراض تو نہیں ہے۔ اسے اپنی شخصیت کے ہر پہلو کی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے کبھی کبھی وہ اپنی شکل وصورت کے بناؤ سنوار میں گھنٹوں صرف کر دیتا ہے آئینے میں اپنے چہرے کو اکثر دیکھتا رہتا ہے۔ اپنے بازوؤں اور پاؤں کو جھکاتا، موڑتا رہتا ہے۔ اس بات کو بہت محسوس کرتا ہے کہ لوگ اسے کس طرح مخاطب کرتے ہیں، کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات سے متعلق مختلف قسم کی قیاس آرائیاں کرتا رہتا ہے۔ اس وقت یہ بہت ضروری ہے کہ والدین اور اساتذہ اس کی ان باتوں کو ہمدردی کے ساتھ دیکھیں اور سمجھیں۔

اس دور میں فرد اپنی شخصیت کا کم وبیش ایک صاف نقشہ بنا لیتا ہے۔ وہ ان خوبیوں کو

اپنانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نصب العین کے حصول کے لئے لازمی ہیں۔ اس لئے نوجوان کے سامنے خاص طور پر اچھے کردار کے نمونے پیش کرنے چاہئیں، مثلاً عظیم تاریخی شخصیتیں، زمانۂ حال کے بڑے آدمی اور گرد و نواح کے مقبول اشخاص وغیرہ۔ مگر یہاں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کہیں نوجوان کسی عظیم شخصیت کو بُت بنا کر پوجنے نہ لگے بلکہ رفتہ رفتہ اسے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اخلاقی اصولوں کی روشنی میں دوسروں کو اور اپنی ذات کو پرکھ سکے اور اپنی اصلاح خود کر سکے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کی ذات کسی شخص واحد کا چربہ نہ ہو، بلکہ اس کی شخصیت مختلف اشخاص کی خوبیوں سے عبارت ہو، مثلاً وہ اپنی شخصیت کی تعمیر میں کسی شخص کی ہمت و جواں مردی، کسی کی دیانت داری، خلوص اور نیک نیتی اور کسی کی حُبِ وطن یا انسان دوستی کو نمونہ سمجھ کر اپنائے۔ مدرسہ سیرت سازی کے عمل میں ڈرامے سے بھی مدد لے سکتا ہے۔ نوجوان اداکار جب اسٹیج پر آتا ہے تو وہ اپنے رول کی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بہرکیف سامنے رکھنی چاہیئے کہ اس لڑکے یا لڑکی کو کسی بدمعاش (VILLAIN) کا پارٹ بھول کر بھی نہ دیا جائے جو فطری طور پر بُری باتوں کی طرف مائل نظر آتا ہو۔ اسی طرح اچھی فلموں سے بھی شخصیت کی تعمیر میں مدد لی جا سکتی ہے مگر یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ موثر فرد کا اپنا قریبی ماحول ہے جس میں وہ رات دن رہتا سہتا ہے۔ اس کے والدین، خاندان کے لوگ اور اساتذہ، اس کے ساتھی اور دوست، نیز گرد و نواح کے اشخاص یہ سبھی اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے ماحول کو اچھے سے اچھا بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

نوجوان کی تلون مزاجی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اور اس بنا پر اسے اکثر بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں دراصل وہ کلیتہً موردِ الزام نہیں ہے۔ اس میں ہماری تہذیب کا بھی ہاتھ ہے بعض جبلتیں اور میلانات جو اس عمر میں بڑی شد و مد سے اُبھرتے ہیں، انہیں تہذیب معیوب قرار دیتی ہے۔ نوجوان جسمانی اعتبار سے ایسے بہت سے کام کرنے کا اہل ہو جاتا ہے جن کے لئے موجودہ سماج مواقع فراہم نہیں کرتا اس لئے اُسے بہت عرصے تک بچے کی سی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ بالغ بھی شاید موجودہ صورت حال سے مطمئن نہیں ہے، لیکن وہ اپنی سمجھ بوجھ کی بدولت کسی نہ کسی

طرح حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلیتا ہے ظاہر ہے، یہ نوجوان کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ بیچارہ
اپنے حالات پر قابو نہیں پا سکتا۔ اور جب اسے ناکامی ہوتی ہے، تو وہ ایک ہیبت ناک
جذباتی کشمکش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس لئے نوجوان کو یہ احساس دلانا مفید ہوگا کہ انسان
کی ہر ایک آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اُسے صرف ان خواہشات پر اکتفا کرنا چاہیئے جو
اس کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔

نوجوان کو ذہنی اور جذباتی کشمکش سے جو تکلیف ہوتی ہے، اس کے احساس کی شدت
اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ میں ہی ایک بدنصیب ہوں جسے اس پریشان کن
تجربے سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ لہٰذا اسے اس بات کا احساس دلانا چاہیئے کہ یہ مسائل عالمگیر ہیں،
اور کم و بیش سبھی نوجوانوں کو ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور سبھی اسی طرح تکلیف اٹھاتے
ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے وسیع تحمل اور گہری ہمدردی درکار ہے۔ نوجوان کو اس طرح
مسلح کرنا چاہیئے کہ وہ خود اپنی جنگ کامیابی سے لڑ سکے اور مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے تعلیم و تربیت
کا یہی فریضہ ہے۔

مکاتیب شبلی

بنام مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی

جناب ابوعلی اعظمی

مولانا شبلی گوناگوں حیثیتوں کے مالک تھے، اور اسی اعتبار سے ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع تھا جس میں ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی کے ممتاز افراد شامل تھے، ان میں سے ہر ایک سے ان کے تعلق کی نوعیت مختلف تھی، اور ان سے خط وکتابت کا سلسلہ قائم تھا۔ انہی میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے، جن سے پہلی مرتبہ ملاقات بمبئی میں ہوئی۔ اور اس پہلی ہی ملاقات میں دونوں بزرگ ایک دوسرے کی شخصیت سے بیحد متاثر ہوئے۔ اور اسی ملاقات و تاثر نے رفتہ رفتہ دوستی، یگانگت اور اخلاص و محبت کی صورت اختیار کر لی، جو مولانا شبلی کی زندگی تک قائم رہی، آج کی صحبت میں انہی کے نام مولانا شبلی کے چند خطوط پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں،

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

ان دونوں بزرگوں میں مراسلت و مکاتیب کا سلسلہ مولانا ابوالکلام کے ندوہ کے زمانۂ قیام ہی میں شروع ہو گیا تھا، وہ ندوہ کے نائب ایڈیٹر تھے، اس کے لئے اداریہ لکھنے، لوگوں سے مضامین حاصل کرنے، اور پھر ان کے جمع و ترتیب کی خدمت انہی سے متعلق تھی جسے وہ مولانا شبلی کی نگرانی میں نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، اس درمیان میں مولانا شبلی کو کسی ضرورت سے بھوپال جانا پڑا جہاں ان کا قیام خلاف توقع کچھ طویل ہو گیا، اس لئے خاص مضامین اور دوسرے امور کے متعلق خط لکھ کر ان سے استفسار کرنا ضروری تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام نے ان کو کئی خط لکھے، اور مولانا نے

...کے جواب دئے، ایک خط میں تو کسی مضمون کے متعلق جو یہاں الندوہ کے فائل میں موجود تھا
...بت ہے، دوسرے میں اپنے کسی نئے مضمون کی ڈاک سے بھیجنے کی اطلاع اور صحت کے ساتھ
کاتب سے لکھوانے کی تاکید کی ہے، مولانا آزاد الندوہ کی سب ایڈیٹری کے فرائض کچھ اس طرح
ادا کرتے تھے، کہ مولانا کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، اور برابر اس کے لئے تاکید کرتے رہتے تھے۔
کلہریاں گئے، تو وہاں بھی اس کا خیال رہا، اور الندوہ کے وقت پر شائع ہونے کی ان کو تاکید
لکھی، مولانا آزاد اور اڈیٹروں کی طرح روزانہ کام کرنے کے عادی نہیں تھے، جس سے لوگوں کو
تنبہ رہتا تھا کہ الندوہ وقت پر شائع ہوسکے گا یا نہیں، لیکن جونہی اشاعت کا وقت قریب
آتا، وہ مستعد ہوجاتے اور پرچہ مرتب کرکے پریس کے حوالہ کردیتے، اور وہ وقت پر چھپ کر
شائع ہوجاتا۔

چندہی ماہ کے قیام کے بعد مولانا ابوالکلام ندوہ سے امرتسر چلے گئے، جہاں ان کا قیام مولانا سید سلیمان ندوی صاحب حیات شبلی کی روایت کے مطابق دو سال رہا، اسی دوران میں انھوں نے اپنے بھائی مولانا ابوالنصر غلام یسین آہ کی معیت میں مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، ابھی وہ بغداد ہی میں تھے کہ یکایک ان کے بھائی بیمار پڑ گئے، اور مرض نے شدت اختیار کرلی، اور وہ اسی حالت میں تنہا بمبئی واپس آگئے، جہاں کچھ دنوں کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، مولانا ابوالکلام عراق، شام وموصل اور شمالی ایران کی سیاحت سے واپس آئے، تو اس کے دو ہی ایک سال کے بعد ان کے والد بھی وفات پاگئے، رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابوالکلام کو امرتسر سے بلوا کر اپنا جانشین بنایا اور وہ اپنے والد کی جگہ ہدایت وارشاد خلق میں مصروف ہوئے، اور اسی سلسلے میں بمبئی میں جہاں ان کے والد کے ہزارہا مرید تھے۔ پہلے قیام کیا۔ پھر کلکتہ میں مستقل سکونت اختیار کرلی، جو بعد میں ان کی ہر قسم کی سیاسی وقومی، ملی وادبی وصحافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ مولانا شبلی سے خط وکتابت کا سلسلہ درحقیقت یہیں سے شروع ہوتا ہے جو مولانا کی وفات نومبر ۱۹۱۴ء تک رہا، آخری وہ تار تھا جو مولانا شبلی نے اپنی وفات سے تین دن پہلے ۱۵ نومبر ۱۴ء کو کلکتہ کے پتہ سے ان کو بھیجا تھا، یہ تار ان تمام تاروں سے لمبا تھا، جو

بیماری کے آخری دنوں میں مختلف لوگوں کو دیئے تھے، ان کو سیرۃ کی تکمیل کے متعلق مشورہ کرنے کے لئے اعظم گڑھ بلایا گیا تھا، لیکن ان میں سے کوئی بھی وقت پر نہیں پہنچ سکا، اور مولانا ابوالکلام کو تو وہ تار ہی نہیں ملا، اور وہ نہ آسکے، اور مولانا شبلی یہ حسرت اپنے ساتھ لے گئے۔

دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا سید سلیمان نے مولانا شبلی کے خطوط کے جمع و ترتیب کا ارادہ کیا تو مولانا ابوالکلام کو بھی اس کے متعلق لکھا، انھوں نے جواب میں لکھا کہ

"مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے مکاتیب مشکل ہے کہ مل سکیں کچھ ملے تو پرائیویٹ معاملات یا ندوہ کے متعلق ہیں، اور ان کی اشاعت غیر ضروری"۔

بہرحال سید صاحب کے اصرار سے مولانا شبلی کے تمام خطوط جو ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے انھوں نے سید صاحب کے حوالے کر دئے، اور وہ مکاتیب شبلی جلد اول کے پہلے اڈیشن میں آگئے، ان میں سے جو بعد کو دستیاب ہوئے وہ دوسرے اڈیشن کے اوراق کی زینت بنے، ان سب کو ملا کر خطوط کی تعداد ۳۳ ہو جاتی ہے۔ یہ خطوط زیادہ تر علمی ہیں، مولانا نے ان میں یا تو علمی مشاغل کا تذکرہ کیا ہے یا کوئی نئی یا پرانی کتاب کہیں سے ہاتھ آگئی ہے، تو اس کی اطلاع ان کو دی ہے اور اس مسرت میں، ان کو بھی شریک کرنا چاہا ہے۔

شروع کے چند خطوط تو بالکل کاروباری ہیں، یعنی نوعمر مدیرِ الندوہ کو بعض زیر ترتیب مضامین کے متعلق ہدایات ہیں، بقیہ تمام تر علمی و ادبی ہیں، جن کے بار بار پڑھنے سے بھی ذوق کو تسکین نہیں ہوتی۔ پھر ان میں غایت محبت و تعلق کی بنا پر اور زیادہ کیف پیدا ہو گیا ہے۔ کاش کہ وہ سب خطوط محفوظ ہوتے اور مکاتیب شبلی کی ایک جلد تنہا انہی کے نام کے خطوط پر مشتمل ہوتی، اور ہم اس سے اپنے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے۔

مولانا شبلی علم و دانش، فضل و کمال، شہرت و عزت اور عظمت و جلال کی جس معراج پر تھے، اس سے یہ توقع کرنا، کہ انھوں نے بھی ان نوجوان دوست کے عقیدت ناموں کو محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا ہوگا، ذرا مشکل ہے، لیکن مولانا شبلی کے نام ان کے ایک آدھ خط حسنِ اتفاق سے جو مل گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ عقیدت و محبت و نیازمندی کے ان نذرانوں کی حفاظت کا اہتمام

ہ ور کیا گیا تھا، لیکن امتداد زمانہ سے وہ محفوظ نہیں رہے، اور ضائع ہوگئے، ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ
ب اور غبار خاطر انہی خصوصیات و امتیازات کے ساتھ جن کا وہ حامل ہے، تیار نہ ہو جاتا، اور اردو
کی صنفِ خطوط نگاری کے ذخیرہ میں ایک اور بیش قیمت چیز کا اضافہ نہ ہو جاتا۔

مولانا شبلی کے خط و کتابت کا دائرہ بہت وسیع تھا، اس میں سرسید اور محسن الملک سے لے کر منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی مولف حیات النذیر، مولوی حامد حسین قادری بچھرایونی مولف داستان اردو تک سبھی شامل تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت مختلف تھی، لیکن وہ جتنا کھل کر مولانا ابوالکلام کو خط لکھتے تھے، کسی کو بھی نہیں لکھتے تھے، ان سے کوئی پردہ نہیں تھا، سب کچھ ان پر ظاہر کر دیتے تھے، ان کے احباب و اعزا و تلامذہ کے وسیع حلقہ میں یہ اختصاص کسی کو بھی حاصل نہیں تھا، اور یہ اتنا در پردہ تھا کہ اگر یہ خطوط منظر عام پہ نہ آتے تو کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ مولانا شبلی اپنے ان اولوالعزم نوجوان دوست سے اس درجہ اخلاص رکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اپنے سب سے زیادہ مخلص، ہمراز و ہم داستان و لائق صد اعتماد دوست مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے بھی اس کا پردہ رکھا، اور ان کو خبر نہیں ہونے دی بمکاتیب شبلی میں مولانا شروانی کے نام ۱۰۸ خطوط ہیں، لیکن کسی خط میں بھولے سے بھی مولانا ابوالکلام کا ذکر کسی تقریب سے نہیں آیا ہے۔

منشی افتخار عالم صاحب حیات النذیر لکھ کر فارغ ہوئے تو یکایک ان کو خیال پیدا ہوا کہ لگے ہاتھوں حیات شبلی بھی کیوں نہ لکھ ڈالیں، جس کا مولانا شبلی ان کو قطعاً اہل نہیں سمجھتے تھے۔ منشی افتخار عالم نے اس کے متعلق ان کو لکھا، تو انھیں بڑا تعجب ہوا، مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:

> "ہاں اور سنی! افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے، لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوائیے۔ بھئی بتا تو نہ دوگے، ایسے لوگ لاکھ

لکھیں تو کس کو خوشی ہو گی"

بعد میں یہی خدمت مولانا شبلی کے حسب توقع، تمام مکروہات دنیوی سے فارغ ہونے کے بعد ان کے عزیز ترین شاگرد مولانا سیلمان ندوی نے انجام دی، اور حق یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا، اس میں مولانا ابو الکلام سے مولانا شبلی کے تعلقات کا ذکر بڑی تفصیل سے آیا ہے۔

بمبئی کے قریب جنجرہ نام کی ایک ریاست تھی، جہاں کے ایک انتہائی ترقی یافتہ مسلم خاندان کی علم دوست و علم پرور خواتین سے جن میں عطیہ فیضی بیگم علم الکمال کے لحاظ سے بہت ممتاز تھیں، ان کے بڑے مخلصانہ اور مشفقانہ تعلقات تھے وہ مولانا کی بڑی قدرداں اور ان کے مذاق ادب کی دلدادہ تھیں ان سے خط و کتابت کا بھی سلسلہ قائم تھا، لیکن عام طور سے لوگ اس کو جانتے نہیں تھے، ایک مرتبہ تو مولانا شروانی کو لکھتے لکھتے رہ گئے، لیکن مولانا ابوالکلام کو اس کا علم تھا۔

انہی خواتین کی دعوت پر مولانا ایک مرتبہ جنجرہ بھی تشریف لے گئے تھے۔ ان کی مہمانداری اور وہاں کی آب و ہوا کی لطافت سے مولانا بیحد متاثر ہوئے۔ اور اپنے تاثرات کا اظہار ایک غزل میں کیا، جس کے دو شعر مولانا ابو الکلام کو بھی لکھ بھیجے۔

ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے ۔۔۔ تہاں فکر مے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف، یہ سبزہ، یہ منظر، یہ بہارستاں ۔۔۔ عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہو گی

پوری غزل یہ ہے، جس کو مولانا شبلی نے جنجرہ سے رخصت ہوتے وقت اپنے ہاتھوں سے لکھ کر عطیہ کو دی تھی،

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی ۔۔۔ خیال روزہ و فکر وضو ہو گی تو کیوں ہو گی
جو دو دن بھی بسر کرے گا اس قصر معلیٰ میں ۔۔۔ اسے خلد بریں کی آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے ۔۔۔ یہاں فکر مے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہو گی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو ۔۔۔ کسی شے کی جو دل میں آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی
کہاں یہ لطف، یہ منظر، یہ سبزہ، یہ بہارستاں ۔۔۔ عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہو گی

عطیہ کے شوہر مسٹر رحمین فیضی نے جو بمبئی کے ایک مشہور آرٹسٹ ہیں مولانا کی ایک تصویر بنائی۔ مولانا ابوالکلام کو اس کا علم ہوا، تو اس کو دیکھنے کی خواہش کی تو مولانا ان کو لکھتے ہیں۔

"ہاں عطیہ فیضی کے یہودی شوہر نے جو آرٹسٹ ہے، میری تصویر ہاتھ سے کھینچی ہے، ابھی پوری تیار نہیں ہو چکی میں اس کا فوٹو لے کر آپ کو بھیجوں گا، نائب سفیر ٹرکی جو نہایت خوب صورت شخص ہے اس نے خواہش کی کہ اس کے ساتھ تصویر کھنچواؤں، چنانچہ ایک انگریزی کارخانہ میں فوٹو لیا گیا، توفیق آفندی بھی اسی گروپ میں ہے۔"

اس فوٹو کی ایک کاپی مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی مانگی تھی، تو ان کو لکھتے ہیں:

"فوٹو کی ایک ہی کاپی میرے پاس ہے اور اس پر سفیر ٹرکی کے دستخط ہیں کہ اس نے یہ فوٹو مجھ کو دیا ہے۔"

اول الذکر تصویر مسٹر رحمین فیضی کے کمال مصوری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، وہ فرانس کی نمائش منعقدہ ۱۹۱۳ء میں آرٹ گلری کی بھی زینت بن چکی ہے۔ اس کی وہاں بے انتہا قدر کی گئی، اور نہایت معقول قیمت لگی، لیکن عطیہ بیگم نے اس کا فروخت کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں کیا وہ اب تک جنجرہ کے ایوان رفعت کی زینت ہے۔

مولانا شبلی کو ترکوں سے بڑا قلبی لگاؤ تھا، ان کو اسلامی جاہ وجلال کا حامل سمجھتے تھے اور ان کی بڑی قدر کرتے تھے، ٹرکی حکومت کے نائب سفیر متعینہ ہندوستان نے جو ان کا مرتبہ شناس تھا، ان کے ساتھ تصویر کھنچوانے کی خواہش کی تو بطیب خاطر راضی ہو گئے، اس سے مولانا کے غیر معمولی تعلقات تھے، مولانا سید سلیمان کو لکھتے ہیں:

"وہ اگرچہ اردو، فارسی، عربی کوئی زبان نہیں جانتا تاہم اس سے ملنے کو جی چاہتا ہے جب وہ نہیں آتا تو خود ملنے کو جاتا ہوں، اس نے خواہش کی کہ میں اپنا فوٹو اس کے ساتھ کھنچواؤں، میں نے منظور کیا، مجھ کو تصویر سے دلچسپی نہیں۔ لیکن ایسا انکار بھی نہیں۔"

یہ تصویر مولانا کو اتنی پسند تھی کہ اپنی دستی تصویر کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی کرنا انھوں نے ضروری سمجھا۔

مولانا شبلی کو مسلم لیگ کی سیاست سے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اس کی بنیاد نواب وقار الملک وغیرہ کے ہاتھوں ڈھاکہ میں رکھی گئی، تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا شبلی ہی نے کی اور زندگی کے آخر تک وہ اپنی اسی پالیسی پر قائم رہے، اور اس کے خلاف تیز و تند نظمیں لکھتے رہے، جو کتنا فرضی ناموں سے الہلال، زمیندار، مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہ میں بڑے آب و تاب سے چھپتی رہیں، اور لوگ بڑے مزے لے لے کر ان کو پڑھتے رہے، کھل کر تو کبھی سامنے آتے نہیں، لیکن درپردہ تعریض و طنز کا کوئی دقیقہ انھوں نے اٹھا نہیں رکھا، ۱۹۱۰ء میں اس کے بڑے سرگرم و فعال سکریٹری مولوی عزیز مرزا صاحب تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کی شاخیں ایک ایک شہر میں قائم ہوں تاکہ اس کی آواز گورنمنٹ میں اور زیادہ موثر ہو جائے، اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک مرتبہ مسلم لیگ کے متعلق ایک پمفلٹ شائع کیا، جس میں مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ کی ضرورت کو بڑے پر زور دلائل سے ثابت کیا تھا، جس کی داد اور تو اور خود وقت کے وائسرائے نے بھی دی، مولانا شبلی تو ان مواقع کی تلاش میں رہتے تھے، ان کو معلوم ہوا تو مولانا ابوالکلام کو فوراً لکھا کہ

> "مولوی عزیز مرزا صاحب کو مبارک باد لکھیئے ان کے پمفلٹ متعلق مسلم لیگ کی داد جناب وائسرائے بہادر نے دی، اور اس کا اعلان تار کے ذریعہ سے اخبارات میں ہوا، ان کو شکایت تھی کہ لوگ مسلم لیگ قائم نہیں کرتے اب کس کو انکار ہوگا۔"
>
> (۲۸ ستمبر ۱۹۱۰ء)

دیکھئے ان چند جملوں میں کتنا زہر بھرا ہوا ہے،

مولانا ابوالکلام عنفوان شباب ہی میں اپنی جادو بیانی اور سحر نگاری کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے تھے۔ ان کا ہفتہ وار الہلال اپنی نوعیت کا ہندوستان میں تنہا اخبار تھا جو ملک کے گوشہ گوشہ میں جاتا تھا، اور بڑے ذوق و شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا، اس طرح سے سارا ہندوستان ان کی طرف متوجہ اور ان کی زیارت کا مشتاق و آرزومند ہو گیا تھا، جہاں جاتے تھے ان کا شاہانہ استقبال ہوتا تھا، مولانا شبلی ایک مرتبہ نواب عماد الملک کی دعوت پر حیدرآباد گئے

نو مضون نے وہاں دیکھا کہ ہر شخص مولانا ابوالکلام کا نادیدہ پرستار، ان کی زیارت کا آرزومند، ان کی تقریر سننے کا مشتاق ہے، مولانا وہیں سے ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں۔

"آپ کا تمام حیدرآباد مشتاق ہے، لیکن یہاں کوئی شخص حدود ریاست کے اندر کوئی آزادانہ تقریر نہیں کرسکتا، ایسی حالتوں میں لوگ یہ کرتے ہیں کہ رزیڈنسی کے حدود میں جلسے کرتے ہیں، جو بالکل شہر سے متصل ہے اور ریاست کے تمام شائقین شریک ہوتے ہیں۔

مفصل انتظامات دریافت اور استصواب کے بعد لکھوں گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل حیدرآباد سے کہیں زیادہ خود مولف ہی اس وقت مولانا ابوالکلام کی تقریر سننے کا اشتیاق رکھتے تھے، اور اس کے لئے اپنے خاص اہتمام میں جلسہ کرنا چاہتے تھے اب نہیں کہا جاسکتا کہ مولانا شبلی کا یہ شوق پورا ہوا یا نہیں لیکن جہاں تک ہماری یادداشت کام کرتی ہے، مولانا ابوالکلام نظام کے عہد اقتدار تک کبھی حیدرآباد نہیں گئے۔ ان کو نظام حیدرآباد کی علم دوستی، علماء نوازی، ہنر پروری، اور علم وفن کی راہ میں ان کی بے پناہ اور عدیم المثال فیاضی و دریا دلی کے باوجود ان سے کبھی عقیدت نہیں پیدا ہوئی، نہ ساری عمر ان کے ابر کرم کو جس سے سارا ہندوستان سیراب ہوتا تھا، انھوں نے فیضیاب ہونے کا ننگ گوارا کیا۔

ارباب کمال کی خود ان کے اپنے وطن میں عموماً قدر نہیں ہوئی۔ لیکن مولانا شبلی اس سے مستثنیٰ تھے، وہ جب اپنے لمبے لمبے سفروں سے واپس آتے تھے، تو سارے شہر میں دھوم مچ جاتی تھی، اور ہر شخص جان جاتا تھا، کہ مولانا شبلی آگئے ہیں، اور پھر یہ چہار طرف سے مشتاقان دیدار جوق در جوق زیارت و ملاقات کے لئے پہنچ جاتے تھے، جب تک ان کا قیام وطن میں رہتا، ان کا فیض جاری رہتا، اور لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان سے استفادہ کرتے رہتے، ہمارے شہر کے مشہور نعت گو شاعر علامہ اقبال سہیل کو وطن کے اسی دوران قیام میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا، اور انھوں نے مولانا سے عربی ادب ومحاضرات کی بعض اونچی کتابیں مثلاً حماسہ ابی تمام اور الکتاب والتبیین وغیرہ پڑھی تھیں، اس کا ذکر مولانا سہیل کی نامکمل سیرت شبلی

میں بھی ہے۔ اور اسی کو مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بھی نقل کر دیا ہے۔

مولانا شبلی اپنے غیر معمولی علمی اور ادبی کمالات کی شہرت کی بنا پر ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی بیگانہ نہیں تھے، جہاں جاتے تھے، ان کی آمد کا شور ہو جاتا تھا، اور ان کی زیارت کے لئے لوگ امنڈ پڑتے تھے، لکھنؤ، الہ آباد، کلکتہ، اور بمبئی کو تو مختلف وجوہ سے وطن ثانی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی، جہاں ان کا قیام کبھی کبھی ہفتوں نہیں مہینوں ہو جاتا تھا، اس لئے ان شہروں کا ایک ایک بچہ ان کو جان گیا تھا، لیکن ان شہروں کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی جاتے تھے، تو ان کا بڑا شاندار خیر مقدم ہوتا تھا، اور وہاں کے عوام و خواص ان کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتے تھے، ایک مرتبہ دورہ کے سلسلے میں بانکی پور پٹنہ گئے، تو ان کو لینے کے لئے ایک کثیر مجمع اسٹیشن پر اکٹھا تھا، اور باوجود مولانا کے انکار و اعراض کے جوش عقیدت میں آدھے راستہ سے ان کو جلوس کے ساتھ فرودگاہ تک لے گیا جس کا مولانا شبلی پر بڑا اثر تھا، مولانا ابو الکلام کو لکھتے ہیں:

> "صبح کو بانکی پور پہنچا۔ غایت کثرت سے مجمع تھا، عمائد شہر اور تمام طلبہ کالج موجود تھے، نہایت سخت اصرار کے ساتھ طلبہ نے گاڑی کھینچی اور فرودگاہ تک لائے۔ میرے اصرار کا اتنا اثر تھا کہ آدھی راہ کے بعد یہ مشغلہ شروع ہوا، ورنہ وہ تو اسٹیشن ہی سے کاندوں میں گھسیٹنا چاہتے تھے، یہ تو نہیں کہتا کہ رعونت پسند نفس کو بھی بری نہیں آئی ہوگی، لیکن واقعتاً ہنسی آتی تھی، کہ عجب خوش اعتقاد بلکہ ضعیف الاعتقاد ہیں۔"

لیکن مولانا شبلی نے وہیں سے اپنا دورہ ملتوی کر دیا، اور لکھنؤ روانہ ہو گئے، لکھتے ہیں:

> "دورہ کرتا ہوں تو لکھنؤ میں سالانہ جلسہ کے متعلق جو کام چھڑے ہیں، ابتر ہو جائیں گے۔"

ندوہ ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا، اور اس کے ضروری کاموں پر اپنی ذاتی دلچسپیوں کو بھی بے تکلف قربان کر دیتے تھے، اور اس پر فخر کرتے تھے۔ مولانا شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں، لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا، لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے، خیر اس پر فخر کرتا ہوں، کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔" (۷۲)

ایک اور خط میں انہی کو لکھتے ہیں:

"عین اس وقت کہ چمن زار بمبئی کے گلگشت نے عالم طلسم میں پہنچا دیا تھا، بھاولپور کے عہدہ داروں کا خط پہنچا، کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں، اور اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل اسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شداد نے بہشت عدن کو خیرباد کہا تھا، بہرحال پھر اسی خرابہ (ندوہ) میں آگیا۔" (۷۱)

مولانا شبلی کے پاس فارسی کے نوادر کتب کا بڑا اچھا ذخیرہ تھا، جس کو وہ بہت محبوب رکھتے تھے، ان میں ایک مشائخ چشت کے حالات میں جہاں آرا بیگم کی تصنیف مونس الارواح کا ایک نادر بیش قیمت قلمی نسخہ بھی تھا، جو شاہجہاں کے دربار کے خاص کاتب رشید الدین وطواط کے ہاتھ کا دبیز زرافشاں کاغذ پر نہایت خوشخط لکھا ہوا ہے، اب وہ کتب خانہ دار المصنفین کی زینت ہے۔ اس کا خط اتنا پاکیزہ روشن اور دیدہ زیب ہے، کہ بس دیکھتے رہ جایئے، چار سو برس گزر جانے کے بعد بھی اس میں اتنی تڑپ ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کاتب ابھی ابھی لکھ کر اس سے فارغ ہوا ہے، پیرس میں آل ورلڈ نمائش کے موقع پر یہ گرانقدر قلمی کتاب بھی نمائش میں رکھنے کے لئے طلب کی گئی۔ اور وہ ۱۵ ہزار کے بیمہ پر پیرس بھیجی گئی، لیکن مولانا کو پھر بھی خطرہ تھا، کہ کہیں ضائع نہ ہو جائے،

مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:

"میری کتاب جہاں آرا بیگم کی تصنیف، ولایت کی نمائش میں طلب ہوئی ہے، میں نے لکھ دیا ہے کہ ضرور واپس ملے۔"

ان کو اس قسم کے نوادر کے دیکھنے کی بھی بڑی تمنا رہتی تھی، اسی طرح کی ایک آل انڈیا نمائش ۱۹۱۲ء میں ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے سابق دار السلطنت الہ آباد میں بھی ہوئی تھی، اس میں بھی قلمی نوادرات و مخطوطات کی نمائش کا ایک شعبہ تھا، جس میں جابجا سے نہایت نادر اور بیش قیمت قلمی کتابیں نمائش کے لئے منگوائی گئی تھیں، ان میں دیوان فیضی کا ایک نادر نسخہ بھی کہیں سے آکر نمائش کی زینت بننے والا تھا، مولانا کو اس کی اطلاع ملی، تو ان کے لئے نمائش دیکھنے کی ایک اور وجہ ترغیب پیدا ہوگئی، مولانا ابوالکلام کو لکھتے ہیں:

"الہ آباد کی نمائش میں ایک اور اضافہ ہوا، یعنی نوادرات میں ایک دیوان فیضی بھی ہوگا، اور وہ دسمبر کے اوائل تک پہنچ جائے گا"

اب وہ الہ آباد کی مشہور پبلک لائبریری کی زینت ہے،

مولانا شبلی کے زمانۂ حیات میں تین بڑے اہم واقعات پیش آئے، اور انہی نے درحقیقت مسلمانوں کو بیدار کر دیا، ان میں سے دو جن سے مسلمان بیحد متاثر تھے، ایک غزوۂ طرابلس ہے اور دوسرا جنگ بلقان ہے۔ ان دونوں میں جن لوگوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی، اور ترکوں کی حمایت اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ان میں پیدا کر دیا، ان میں دو بزرگ بہت ممتاز تھے، ایک مولانا شبلی اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی ترکوں کی حمایت میں پرجوش نظمیں لکھتے تھے جو فرضی ناموں سے الہلال کلکتہ، زمیندار لاہور۔ اور مسلم گزٹ لکھنؤ میں چھپتی تھیں، اور مولانا ابوالکلام اپنے اخبار الہلال میں نہایت پرزور اور ولولہ انگیز مضامین لکھتے تھے ان کو پڑھ پڑھ کر مسلمان اتنا جوش میں بھر گئے۔ کہ وہ اپنا سب کچھ ترکوں پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوگئے، ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ترکوں کی امداد کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے جو طبی مشن گیا تھا، وہ بھی درحقیقت ان کے اسی جوش و خروش کا مظہر تھا، اور وہ جب اپنے فرائض ادا کر کے بمبئی کے ساحل پر اترا ہے تو اس کے استقبال کے لئے مولانا شبلی بمبئی میں موجود تھے، اور ممبران وفد کے بخیر و عافیت واپس آنے پر ان کو پرزور مبارکباد دی، اور ایک قصیدۂ تہنیت بھی پیش کیا، جو ان کے بے پناہ جذبۂ ملی و جوش دینی کا پورا آئینہ دار ہے، آج بھی اس کے پڑھنے سے اس وقت کا نقشہ

آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے -

تیسرا مچھلی بازار کان پور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ ہے، جب یہ حادثۂ خونین پیش آیا ہے مولانا اپنے مستقر لکھنؤ سے بہت دور بمبئی میں تھے، اخبارات کے ذریعہ اس ہنگامہ کی خبریں ان تک پہنچیں، تو تڑپ گئے، اور اس اثر کے ماتحت انھوں نے پے در پے متعدد نظمیں لکھیں، جو اس واقعہ کے کئی برس بعد تک ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھیں، اور اب بھی ہیں، وہ اس قدر موثر، پرجوش اور ولولہ انگیز تھیں، کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی کے جس ہفتہ وہ الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمیندار لاہور میں چھپتیں، ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے رجز کا کام دیتیں، اور وہ انگریزوں کے خلاف انتہائی جذبۂ انتقام اور جوش و خروش سے لبریز ہو جاتے، ان نظموں میں اب بھی وہی جوش و خروش کا طوفان ہے، جن کو پڑھ کر آج بھی انگریزوں کے خلاف خون کھول جاتا ہے، ایک نظم میں کانپور سے دوری، اور اس سعادت سے اپنی محرومی پر نہایت دلدوز الفاظ میں اظہار افسوس کیا ہے، فرماتے ہیں،

شہیدان وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

واقعہ کانپور کا ان پر جو اثر تھا، اس کا اندازہ ان دو قطعوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی
اگرچہ صدمۂ بلقان سے جگر شق ہے
بچا رکھے ہیں، مگر میں نے چند قطرۂ خون
کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عرب کی قوم
کیوں گھٹ رہی ہے آج عدد میں ظہور میں
سن لو وہ گنج ہائے گرانمایہ دفن ہیں
کچھ بلقان کی خاک میں کچھ کانپور میں

لیکن اس واقعہ کو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ملی مسئلہ بنانے میں جس کے قلم و زبان کو سب سے زیادہ دخل ہے، وہ مولانا ابوالکلام آزاد تھے، انھوں نے اپنے اخبار الہلال میں اس کی حمایت میں مسلسل پرجوش مقالات لکھے اس طرح سے ایک کی پراثر اور ولولہ انگیز نظموں نے

اور دوسرے کے آتش فشاں جوش انگیز مقالات نے سارے مسلمانوں کو جوش سے بھر دیا اور وہ مسجد کی حرمت اور تقدیس کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے کے لئے تیار ہو گئے، مختصراً اصل واقعہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کی دسویں تاریخ تھی، کہ مسلمانان کانپور نے مولانا آزاد سبحانی مدرس اعلیٰ مدرسہ کانپور کی سرکردگی میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا، انھوں نے ایسی پرجوش تقریر کی، کہ سارا مجمع جوش سے لبریز ہو گیا، اور جلسہ کے ختم ہونے کے بعد اسی جوش و خروش کی حالت میں اس نے مسجد کا رُخ کیا، اور مسجد کے منہدم حصہ پر اینٹیں چننی شروع کر دیں اس وقت سکھ فوج کا پہرہ پڑ رہا تھا۔ مسٹر ٹیلر کمشنر کانپور نے موقع پر پہنچ کر، ان نہتے مسلمانوں پر جو مسجد کی تعمیر میں معروف تھے، فوج کو حملہ کا حکم دے دیا، اور انھوں نے نہایت بے رحمی و بے دردی سے نہ صرف ان پر گولیاں برسائیں، بلکہ قریب پہنچ کر ان کے جسموں کو برچھوں اور نیزوں سے چھلنی کر دیا، جس کے نتیجہ میں بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے، جن میں ننھے ننھے معصوم بچے بھی شامل تھے، شہداء کا صحیح اندازہ تو نہ ہو سکا، لیکن خود گورنمنٹ کی رپورٹ کے مطابق ان کی تعداد تیس سے کم نہ تھی، اس سے سارے ہندوستان میں ایک قیامت مچ گئی، جس سے حکومت بھی متاثر ہوئی۔ اس زمانہ میں وائسرائے کی کونسل کے ایک ممبر سر علی امام مرحوم تھے انھوں نے مولانا محمد علی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو مصالحت کا پیام دیا، اور صلح کی بات چیت شروع ہو گئی، لیکن اس سلسلہ میں حکومت اور مسلمانوں کے نقطہائے نظر میں بڑا شدید اختلاف تھا، مسلمانوں کا مطالبہ تھا، کہ مسٹر ٹیلر ڈپٹی کمشنر کو سزا دی جائے، مسجد جیسی تھی ویسی ہی پھر بنوا دی جائے، قیدیوں کو قید و بند سے رہا کر دیا جائے، اور جو لوگ شہید ہو گئے ہیں ان کا خون بہا ادا کیا جائے لیکن مصالحت کی گفتگو کا آغاز اس طرح ہوا، کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، ملزموں پر سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا، مظلوموں کی مالی مدد کی جائے گی لیکن مسجد کا جو حصہ منہدم کر دیا گیا ہے، اس کے پھر بنوانے پر مسلمانوں کی طرف سے اصرار نہ کیا جائے گا۔ مولانا نے اس پر ایک طنزیہ قطعہ لکھا اس کا ایک ایک شعر مسلمانوں کے اس وقت کے جذبات کا آئینہ دار تھا۔ اس کے بعض شعر یہ ہیں:

جزو مسجد کو اگر آپ سمجھتے ہیں حقیر
آپ کے ذہن میں اسلام کی تصویر نہیں
آپ کہتے ہیں، وضو خانہ تھا مسجد تو نہ تھی
یہ عجب مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں
آپ اس بحث کی تکلیف نہ فرمائیں کہ آپ
حامل فقہ نہیں واقف تفسیر نہیں

بالآخر مصالحت کی گفتگو کامیاب ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند خود کانپور آئے، حکومت کی طرف سے سر علی امام نے نمائندگی کی، اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے، اور دونوں کے اتفاق رائے سے معاملہ اس طرح طے ہوا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا، مقدمے واپس لے لئے جائیں گے، اور مسجد کا منہدم حصہ اس طرح تعمیر کیا جائے گا کہ اوپر چھت ہوگی، جس سے وضو خانہ کا کام لیا جائے گا، اور نیچے سے آمد و رفت کے لئے سڑک یا راستہ بنا دیا جائے گا اس فیصلہ کو سب نے منظور کیا، اور وائسرائے بہادر نے اپنی طرف سے اس کا اعلان کیا جس کا احرار اور وفاداران حکومت دونوں نے شکریہ ادا کیا، مولانا نے بھی وائسرائے کو خطاب کر کے حسب ذیل قطعہ کہہ کر اپنی شکر گذاری کا فرض ادا کیا، جس کے بعض اشعار یہ ہیں:

اے ہمایوں گہر و افسر اورنگ شہی
وہ کیا تو نے جو آئین جہاں بانی ہے
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست
یہ حقیقت میں ظفر مندیٔ سلطانی ہے
تیرے لطف و کرم عام نے دیدی یہ ندا
کوئی مجرم ہے، نہ قیدی ہے، نہ زندانی ہے
تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا
بازوؤں میں یہ ترے زور جہاں بانی ہے
گرچہ مدح امراء میں نے نہیں کی ہے کبھی
شکر احسان مگر فطرت انسانی ہے

مولانا ابوالکلام کو جو گروہِ احرار کے سرخیل تھے، اور جنھوں نے اپنے اخبار الہلال کے ذریعہ اس مسئلہ کو مسلمانوں کا آل انڈیا مسئلہ بنا دیا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں :

"برادرم کانپور کا معاملہ جس طرح فیصل ہوگیا، اب سردست اس سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ مولانا شبلی کی قومی و ملی زندگی کا سب سے آخری مگر سب سے زیادہ جاں گداز حادثہ تھا، جس سے ان کے قلب و دماغ نے بیحد اثر لیا، اور اپنی پراثر نظموں سے انھوں نے سارے ہندوستان میں ایک قیامت برپا کردی، اگر وائسرائے کی مداخلت سے بتعجیل تمام مصالحت نہ ہوجاتی تو مسلمانوں کا جوش آگے بڑھ کر معلوم نہیں کیا رُخ اختیار کرتا، اور اس بیخودی و سرشاری اور شدت جذبات میں وہ کیا کچھ نہ کرڈالتے۔ ابھی بلقان کا شور محشر بپا تھا، اور مسلمانوں کے دل برطانوی وزارت خارجہ کی سیاسی روش پر سخت مشتعل ہی تھے، کہ صوبہ متحدہ کے گورنر سرجمیس مسٹن اور ان کے ماتحت حکام کانپور کی غلط اندیشیوں اور غلط کاریوں، اور غلط کوشیوں نے مسجد کانپور کی صورت میں ان کے اضطراب و اشتعال کا ایک نیا سامان پیدا کردیا، اور وہ غم و غصہ سے اور زیادہ بریز ہوگئے، گورنمنٹ نے اس جوش کے دبانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن وہ باوجود قاہری وسلطانی وجباری کے بھی کامیاب نہ ہوسکی، اور اسے مسلمانوں کے سامنے جھکنا پڑا۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ برطانوی حکومت کا اقبال نصف النہار پر تھا۔ اور اس کے حدود فرمانروائی مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں بڑھتے چلے جارہے تھے اس کے طنطنۂ جبروت سے ایشیا اور سارا یورپ کانپتا تھا، اس حادثۂ خونیں کے ٹھیک ایک برس کے بعد مسلمانوں کی ملی زندگی کا یہ رجز خوان ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا، لیکن اس کی رجز یہ نظموں نے انگریزوں کی سیاست کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت و حقارت کا جو شدید ترین جذبہ پیدا کردیا تھا، وہی درحقیقت ہندوستان کی تحریک آزادی کا نقطۂ آغاز ہے، جس کے بعد یہ جذبہ بڑھتا گیا، اس لحاظ سے مولانا شبلی ہندوستان کی تحریک آزادی کے اولین محرک ہیں جن کو ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

دُنیا کی ایک بڑی طاقت۔امریکہ

جناب ایم۔اے حفیظ

آج دنیا میں دو بڑی طاقتیں ایک دوسرے کی حریف ہیں۔ دو ہم پلہ ملک۔ دو وسیع تہذیبیں دو متضاد تحریکیں جن میں ایک کیمونزم اور دوسری جمہوریت کی علمبردار ہے۔ ایک روس ہے تو دوسرا امریکہ! ان میں نہ صرف نظریاتی اعتبار سے رسہ کشی ہے بلکہ خلائی ترقیاتی پروگرام میں بھی، دونوں ایک دوسرے سے گوے سبقت لے جانے میں منہمک ہیں اس تصادم وٹکر پر دنیا کی تمام نگاہیں مرکوز ہیں۔ کیونکہ عالم کا امن وشانتی یا تیسری جنگ کے ہونے یا نہ ہونے کے امکانات زیادہ تر ان ہی دونوں ملکوں کے اقدام پر منحصر ہیں۔ علاوہ ازیں سائنس کی ترقی میں دونوں ملک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ہم قدم ہیں ان قوتوں میں جس تہذیب کے تانے بانے جنم لے رہے ہیں۔ وہ ہمیں تاریخ کے پچھلے اوراق الٹنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

امریکہ جس کو نئی دنیا بھی کہا جاتا ہے، اتفاقی طور پر سیاحوں کو معلوم ہوا۔ یوں تو ۹۸۵ء میں ہی اسکنڈے نیویا کے باشندے ہی بحر منجمد شمالی سے گزر کر گرین لینڈ پہنچے تھے، اور اس وسیع جزیرے سے گزر کر ان کے جہاز آگے بڑھے تھے اور ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ تقریباً ایک ہزار عیسوی میں موجودہ ریاست ہائے متحدہ میں انھوں نے قدم رکھا۔ لیکن ان کا کوئی نقش پا نہیں ملتا اور نہ انھوں نے اپنے حالاتِ سفر کو کسی مستند شکل میں ترتیب دیا تھا۔ کمال تو یہ ہے کہ اطالوی باشندہ کرسٹوفر کولمبس جب ۱۴۹۲ء میں اسپین کے بادشاہ، فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا کی اجازت سے تجارت کے لئے نیا راستہ دریافت کرنے نکلا تو اُسے بھی یہ معلوم تھا کہ اس کے راستہ میں ایک بڑا براعظم حائل ہے اسی لئے اس نے ویسٹ انڈیز کو ایسٹ انڈیز سمجھا۔ لیکن کولمبس نے امریکہ کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں چھوڑی ہیں۔ امریکہ نام

پلنے اور براعظم کا منظر عام پر آنے کا سہرہ تو امریگو دیسپاسی کے سرہے جو ایک اطالوی باشندہ تھا اور جس نے اپنی سیاحت کے بعد سفر کے حالات کو اس تفصیل سے لکھا کہ دنیا کے نقشے میں جب امریکہ کی سمائی ہونے لگی تو امریگو کے لکھے ہوئے معلومات کا مرہون منت ہونا پڑا۔

امریکہ کی دریافت کے بعد جب انگریز، فرانسیسی، اسپینی اور دوسرے باشندے اس نئی سرزمین میں داخل ہونے لگے تو ان کے احساسات میں شدت تھی اور وہ مختلف امیدوں قوتوں کے ماتحت اپنی اپنی قوم کے لئے مواقع تلاش کر رہے تھے۔ امریکہ میں ایک طرف سرسبز و شاداب درخت جھنڈ کے جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف صاف و شفاف پانی کے دریا تھے۔ براعظم کے مغرب میں شمال سے جنوب تک پہاڑوں کے سلسلے الگ کھڑے تھے۔ جن کے دامن میں سونے اور چاندی کی کانیں آنے والوں کا انتظار کر رہی تھیں جب سیاح آہستہ آہستہ آباد ہونے لگے تو سونے اور چاندی کی کشش نے لوگوں کے حوصلوں کو بڑھاوا دیا اور وہ گروہ کے گروہ سونا جمع کرنے کے شوق میں دیوانہ وار آنے لگے۔ گویا قدرت نے آنے والوں کے لئے ان کانوں کا منہ کھول دیا تھا اور پھر اس مالا مال سرزمین پر بسنے والے جنگلی اور اصلی باشندے خوفزدہ ہو کر الگ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ دلیسیوں نے حتی المقدور آنے والوں کا مقابلہ کیا لیکن مختلف قوتوں کے زیر اثر آخر کار انھیں لڑبھڑ کر مغرب کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ امریکہ میں آج اصلی باشندے خال خال ملتے ہیں۔ ان کی اپنی زندگی محدود اور بے بس ہے۔ ان کا تمدن اور ان کی تہذیب کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یعنی آج کا امریکہ جس کا ہر لحاظ سے بول بالا ہے ان اصلی باشندوں کو بھلا چکا ہے لیکن امریکہ کی سرزمین انھیں کیسے بھلا سکے گی۔ کیونکہ ان دیسی باشندوں نے پردیسیوں کی روک تھام میں اپنی پوری توانائیاں صرف کر دی تھیں جس کی کہانی طویل اور درد انگیز ہے۔

امریکہ جب دریافت ہوا تو مختلف ممالک کی ہوس ملک گیری نے انھیں مختلف داؤ پیچ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ انگلستان کی ملکۂ الزبتھ اول کے دور میں انگریز بحری قزاق ہسپانوی جہازوں پر چھاپے مارتے تھے۔ تاجروں سے سونا چھین لیتے تھے۔ سمندری لڑائی

رہتے تھے اور طوفان سے مقابلہ کرتے تھے۔ اسی طرح نیو فاؤنڈ لینڈ اور کینیڈا پر قبضہ کیا۔ فرانس نے انگلستان کے خلاف برسوں امریکیوں کا ساتھ محض اس امید پر دیا کہ انھیں بھی کچھ علاقے مل جائیں پھر ۱۷۵۸ء میں برطانیہ کو ولیم پٹ جیسا قابل جنرل مل گیا تو اس نے فرانسیسیوں کو شکست دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکن جن کی قوت اب تک منتشر تھی آپس میں متحد ہونے لگے اور انھوں نے اپنے مشترک مفاد کے لئے فوج کی از سر نو تنظیم کی۔ آخر کار امریکی انقلاب رونما ہوا۔

انگریزوں کا مقصد پوری طور پر تجارتی مفاد حاصل کرنا اور ساتھ ہی ساتھ مختلف مقامات پر قبضہ کرنا تھا لیکن وہ تجارت کے مدنظر ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے حتیٰ کہ ایک مرتبہ امریکیوں نے اپنی پوری قوت جمع کر کے انگریزوں کی بھیجی ہوئی چائے کے جہازوں کو سمندر میں غرق کر دیا تھا جس پر انگلستان سے بڑا احتجاج ہوا۔ اس طرح امریکہ ایک صدی تک مختلف قوموں کا آماجگاہ بنا رہا۔ سونے چاندی کی کانوں اور تمباکو کی پیداوار نے بہت سے ملکوں میں ہلچل مچا دی۔ ہر قوم کی یہ دلی تمنا تھی کہ پرانی دنیا کے جھگڑوں سے بچ کر نئی دنیا میں آباد ہو جائیں اور پھولیں پھلیں۔ شاید بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج کا انسان، دنیا کی سرزمین کی الجھنوں سے گھبرا کر چاند اور مریخ پر کمند ڈال رہا ہے۔ امریکہ میں جب مختلف قوموں کی ریس ہونے لگی تو فاصلے کی دوری اور ناساز گار حالات کی ٹیڑھی ترچھی رفتار نے بہتوں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ آخر کار جب امریکی انقلاب رونما ہوا تو اس وقت ملک میں تیرہ نو آبادیاں الگ الگ حکومت کر رہی تھیں۔ یہ سب کے سب انگریز تھے۔ برطانوی حکام ایک مرکزی حکومت چاہتے تھے اور امریکن ایک متحدہ حکومت کے خواہاں تھے جو اگرچہ برطانیہ کی وفادار ہو، لیکن وہ اپنے معاملات میں بالکلیہ آزاد رہے۔ اس کشمکش میں اہل برطانیہ نے مختلف قسم کے تجارتی ٹیکس امریکیوں پر عائد کئے۔ دونوں طرف کی فوجوں میں مگر مگر ٹکر ہوئی۔ جب برطانیہ نے بھرپور اپنی طاقت کا استعمال کیا تو امریکیوں نے برطانوی مال کا بائیکاٹ کر کے اور مختلف دباؤ و اثرات کو کام میں لا کر آخر کار اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔

مکمل آزادی کا سب سے پرجوش حامی تھامس پین تھا جو ۱۷۷۴ء میں فلیڈلفیا میں آباد ہوا تھا۔ یہ بڑے پایہ کا مصنف تھا جس نے اپنی تحریروں سے رائے عامہ کو اپنی طرف کر لیا۔ آخر کار

۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو مکمل آزادی کا منشور شائع کر دیا گیا۔ امریکہ کی تاریخ میں یہی دن آزادی کا جنم دن سمجھا جاتا ہے۔ اس مجموعہ قوانین میں صاف الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ نوآباد اپنے مادر وطن (انگلستان) سے کیوں قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ کے سیاسی موقف کی بھی وضاحت کر دی گئی تھی۔ گویا جمہوریت کا یہ پہلا قدم تھا۔ حسن اتفاق سے امریکہ کو ایسے مخلص لیڈر ملے کہ واقعی اس کی اپنی ایک نئی دنیا مستحکم و مضبوط بن گئی۔ یہ قائدین واشنگٹن، جیفرسن، تھامس اور ابراہام لنکن وغیرہ تھے جنھوں نے عوام کے دلوں میں قومیت کا احساس پیدا کیا اور ان کو بہتری کے راستے پر لگا دیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نیا، جو آج دنیا میں ایک متحدہ نمایاں طاقت ہے۔ اس کی طرف دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں جو امن اور جنگ کے بارے میں تصفیہ کرنے میں دستِ راست کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں چوٹی کے اہل علم فن جمع ہیں، جن کے اطراف مختلف ممالک سے پروانوں کی طرح تشنگانِ علم کے پیاسے جمع ہوتے ہیں جہاں کی عمارتیں نہایت شاندار اور جہاں کی لائبریریاں وسیع تر ہیں۔ جہاں ہزاروں قسم کے میگزین اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ سائنس میں مختلف موضوعات پر وسیع پیمانے پر تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ جہاں کے فیشن کی نقل کی جاتی ہے۔ جہاں "ہالی وڈ" جیسا فلمی ادارہ ہے۔ جس میں صحت، تعلیم، سماج اور تحقیق سے متعلق پکچر زبنتے اور ملک ملک میں پھیلائے جاتے ہیں، جہاں مختلف بیماریوں کے علاج پر ریسرچ ہوتی ہے اور اکثر کارآمد نتائج دنیا کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ جہاں کی تصویر کشی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اور جہاں مختلف موضوعات پر سینکڑوں سائل صبح و شام شائع ہوتے ہیں۔ جہاں ڈالر یعنی سونے کا سکہ چلتا ہے جہاں اخبارات کے سنڈے ایڈیشن ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جہاں جمہوریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بہار پر ہے۔

امریکہ کی تاریخ میں دور جدید کی ابتدا، جنگ عظیم کے بعد سے ہوتی ہے کیونکہ اس لڑائی کے دوران پہلی بار امریکہ کھل کر میدان میں آیا اور اُسے اپنی سیاسی اہمیت اور دولت کی فراوانی کا احساس ہوا، آج دنیا کے تمام اہم ملکوں سے اس کے تجارتی اور ثقافتی

تعلقات ہیں جغرافیائی اور تاریخی صورت حال نے امریکہ کو اس کا موقع دیا ہے کہ اس کی صنعت وتجارت میں اضافہ ہو۔ امریکہ کا اقتدار اتنا بڑھ چکا ہے کہ وہ یورپ اور ایشیا کے اکثر ملکوں کا قائد بن گیا ہے اس میں بھی شک نہیں ہے کہ امریکہ کی زیادہ تر آبادی خوش حال ہے۔ وہاں کا کاشتکار فارغ البال ہے۔ عوام اپنی خوشحالی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے پروپیگنڈہ اور اشتہار بازی کا کوئی حربہ نہیں چھوڑتے۔ امریکہ اپنے ملک کی تہذیب کو دلکش بنانے اور اس کی بھرپور نمائش کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہاں فطرت کی فیاضی اور انسان کی محنت بارآور ہے لیکن چونکہ امریکہ ابھی کم عمر ہے، اس لئے اس کی تہذیب کی جڑیں بہت گہری نہیں ہیں۔

ٹیلی وژن

ادھر چند سال کے اندر اندر کئی ممالک میں ٹیلی وژن سے تعلیم کا کام باقاعدہ طور پر لیا جانے لگا ہے اور روز بروز اس کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس وقت امریکہ، انگلستان، فرانس روس، اٹلی اور جاپان میں بہت سے طلبہ اس جدید ذریعے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ابتدائی مدارس سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے اداروں تک سب ہی جگہ ٹیلی وژن کے فیض سے بہرہ اندوز ہونے کی سعی کی جا رہی ہے اور تعلیمی کارکنوں نے اسے تعلیم کا ایک مفید اور دلچسپ ذریعہ تسلیم کیا ہے اپنے حلقۂ اثر کے اعتبار سے اس معاملے میں امریکہ کو فوقیت حاصل ہے۔ وہاں اس طرف اب تک دوسرے ممالک کے مقابلے میں سب سے زیادہ توجہ دی گئی ہے اور درجے کی تعلیم میں اس کا عمل دخل کافی بڑھا دیا گیا ہے۔ ٹیلی وژن کے استاد کو باقاعدہ تربیت بھی دی جاتی ہے اور ایک عام استاد کے مقابلے میں اُسے اور کئی سہولتیں حاصل ہیں۔ وہ دن بھر میں صرف ایک یا دو سبق پڑھاتا ہے۔ اُسے ٹیلی وژن پر پیش ہونے سے قبل اپنے سبق کو دیکھنے کا موقع بھی ملتا ہے! اور سبق کی تیاری میں آرٹسٹ اور فلم لائبریرین کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے تاکہ توضیحی سامان کا انتخاب اور استعمال بحسن وخوبی کیا جاسکے۔ وہاں مالی اور فنی وسائل کی فراوانی ہے اور نئے نئے تجربے کرنے کی لگن۔ تاہم مدرسے کے اندر ٹیلی وژن سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور مختلف دشواریاں پیش آئی ہیں۔ اولاً خلوص نیت کے باوجود مدرسے کے نظام اوقات کے ساتھ ٹیلی وژن کا پروگرام ہم آہنگ نہیں کیا جاسکا۔ آپ جانتے ہیں کہ تعلیمی کام کی رفتار کارخانوں کے کام کی رفتار کی طرح ہر جگہ پابندئ اوقات کے ساتھ یکساں طور پر برقرار نہیں رکھی جاسکتی۔ ہر مدرسے اور جماعت کے اپنے انفرادی مسائل ہوتے ہیں۔ خواہ ایک ہی نہج پر کام کیوں نہ کیا جائے، ایک ہی وقت پر ایک سے نتائج حاصل نہیں ہوسکتے۔ اس بنا پر ٹیلی وژن کے پیش کردہ پروگرام سے تمام مدرسے یکساں فائدہ نہیں اٹھا سکے۔

اور اس کی افادیت بعض اوقات نغمۂ بے ہنگام ہونے کی وجہ سے مجروح ہوجاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ٹیلی وژن کے بندھے ٹکے پروگرام نے نصاب میں ردّ و بدل بھی دشوار کردیا ہے۔ اور استاد کی جودتِ طبع تہہ داماں رہنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ اب جائز حدود کے اندر بھی موقع کی مناسبت اور جماعت کی ضرورت کے پیشِ نظر تدریس کے کام میں تبدیلی کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اساتذہ کو مجبوراً ٹیلی وژن کے ذریعے پیش کئے جانے والے مقررہ مرکزی پروگرام کے تحت اپنے اسباق اور عنوانات کو دن، تاریخ اور گھنٹے کی پابندی کے التزام کے ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ پروگرام یکطرفہ عامل ہوا کرتا ہے اور ہمیشہ طلبہ کی سابقہ معلومات سے ہم آہنگ نہیں ہوتا اس لئے اس کا اثر اتنا گہرا نہیں ہوتا جیسا کہ استاد اور ہمیشہ طلبہ کی جماعت کے باہمی لین دین سے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ٹیلی وژن ایک بے فیض ذریعہ تعلیم ہے اور اس کا استعمال ہمارے تعلیمی اداروں کے لئے فضول ہے۔ ٹیلی وژن بلاشبہ دورِ حاضر کی ایک نعمت ہے اور اس ایجاد سے نئے ذہنوں کی جلا کا کام ضرور لینا چاہیئے۔ تعلیم کے میدان میں توضیحی سامان کا ایک خاص مقام ہے۔ اس کی بدولت طلبہ کا نہ صرف ذوق و شوق ابھرتا ہے اور ان کے اندر آمادگیٔ کار پیدا ہوتی ہے بلکہ مسائل کی پیچیدگیاں بھی دور ہوتی ہیں۔ اور دقیق نکات کی وضاحت میں آسانی پیدا ہوجاتی ہے۔ اس معاملے میں ٹیلی وژن کا درجہ اب تک کی تمام توضیحات سے بلند ہے۔ اپنے استعمال کے تنوع کے اعتبار سے ٹیلی وژن کا پروگرام ایک تعلیمی فلم کے مقابلے میں زیادہ "جاندار" کہلانے کا مستحق ہے۔ تعلیمی فلم کی تیاری کے لئے زیادہ مدت اور دولت درکار ہے اور پھر بھی وہ "جامد" ہوکر رہ جاتا ہے۔ لیکن ٹیلی وژن کا پروگرام اپنے اندر کم و بیش وہی لچک اور تڑپ رکھتا ہے جو ایک استاد کے درس میں ہوتی ہے۔ اس صورت میں طلبہ کو ایک استاد مجازی مل جاتا ہے۔ اور مدرسے کے اساتذہ کو اپنا معیار قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ان کے سامنے اچھے اسباق کے نمونے آجاتے ہیں جن کو پیشِ نظر رکھ کر آئندہ اپنے کام کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ ٹیلی وژن کے ذریعے ان حالات کو پیش کیا جاسکتا ہے جو جماعت کی محدود فضا میں ایک عام استاد کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ مثلاً طلبہ کو دلیس پردلیس کی تہذیب اور رسم و رواج سے آشنا ہونے کا موقع حاصل ہوجاتا ہے۔ وہ اہم شخصیات سے متعارف

ہو جاتے ہیں اور وہ نادر اشیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح مشکل نکات اور خطرناک تجربات سے بھی طلبہ کو کماحقہ آگاہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک عام مدرسے کے وسائل اور ایک عام استاد کے دائرہ عمل کی حدود متعین ہوا کرتی ہیں لیکن ٹیلی وژن کے پروگرام کی مدد سے تدریس کے معیار کو بہت کچھ بلند کیا جاسکتا ہے۔ ٹیلی وژن پروگرام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اسے ایک استاد کی تدریس کی مدت کے مقابلے میں نسبتاً کم وقت میں مکمل کیا جاسکتا ہے۔

ٹیلی وژن کی اس فیض رسانی کے باوجود یہ تو کوئی بھی نہیں چاہتا کہ استاد کی جگہ ٹیلی وژن سیٹ کو دے دی جائے اور مدرسے کی تعلیم کا سارا وقت اس طرح مرکزی پروگرام پیش کرکے ختم کردیا جایا کرے۔ مگر ٹیلی وژن کے پروگرام کو تعلیم کے کام میں ایک بڑے موثر محرک کی حیثیت سے استعمال کیا جاسکتا ہے اس طرح طلبہ کا وقت صرف کرکے ان کے جماعتی کام میں توانائی پیدا کی جاسکتی ہے اور استاد جماعت کے کام کو آسان اور وقیع بنایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اچھے اساتذہ کے فیض کو عام بنانے کی صورت نکل آتی ہے۔ امریکہ میں بڑے پیمانے پر اس کام کو سنہ ۱۹۵۰ء میں شروع کیا گیا اور اسے بہر طور فروغ دیا جارہا ہے تاہم کشت زار علم کو اس ابر کرم سے کسی حد تک ہی فائدہ پہنچ سکا ہے۔ اور ٹیلی وژن کے استعمال نے اساتذہ کے لئے مختلف عملی دشواریاں اور اصولی مسائل پیدا کردئے ہیں۔ ہمارے دیس میں دوسرے پنج سالہ قومی منصوبے کے آخر میں صرف دہلی کے لئے تجرباتی طور پر ٹیلی وژن کا انتظام کیا گیا اور منتخب ثانوی مدارس کے لئے اس کے ذریعے تعلیمی پروگرام کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ آئندہ تیسرے منصوبے کے اختتام پر چالیس لاکھ روپے کی لاگت سے بمبئی میں ٹیلی وژن کا اہتمام کرنے کا خیال ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک دیس کے موجودہ اقتصادی حالات کے پیش نظر اس قسم کی فروعات کی طرف قطعی توجہ نہیں کرنی چاہیئے اور قومی کاموں میں ہمیشہ ضرورت اور اہمیت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ انھیں ٹیلی وژن کی افادیت سے انکار نہیں ہے لیکن ان کے نزدیک اس سے زیادہ اہم اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کو نظر انداز کرنے کے بعد اس طرف توجہ کرنے سے ہم حقیقت پسندی سے بہت کچھ دور ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کے مخصوص میدان میں یہ اعتراض کچھ زیادہ درست اور بجا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ہماری تعلیم کے

اس کے بعد شناسائی کے مراحل طے کرنے کا حوصلہ کرنا چاہیئے۔

اس اصولی اعتراض سے قطع نظر دہلی میں تعلیمی ٹیلی وزن کے شروع کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیا گیا ہے اور بڑی حد تک اس کا آغاز غیر منظم طور پر ہوا ہے اس باب میں پہلی ضرورت یہ تھی کہ دہلی میں اساتذہ کی تربیت کرنے والے اداروں کو اس نئے توضیحی سامان سے مستفید کیا جاتا اور اس کے ذریعے نئے اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جاتا۔ اس کے ساتھ ساتھ دہلی کے اساتذہ کو ان نمونے کے اسباق کو دیکھنے کے مواقع فراہم کئے جاتے۔ کہیں یہ کام براہِ راست ثانوی مدارس کی منزل پر شروع کیا گیا اور اس غرض سے صرف چند اساتذہ کو وقتی ضرورت کے تحت کچھ معلومات بہم پہنچائی جا سکی ہیں۔ جب کہ امریکہ میں ٹیلی وزن کی برکت بلا زحمت اساتذہ اور طلبہ کو میسر نہیں آ سکتی۔ اور اس کی بہت سی خامیاں محسوس ہو رہی ہیں، ہمارا کام تو ابھی محض ابتدائی منزل میں ہے۔ اس سے بے جا توقعات سے قائم نہیں کرنی چاہیں تاہم موجودہ وسائل سے پورے طور پر ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے اور دہلی کے برسرِ روزگار اساتذہ اور تربیت پانے والے اساتذہ کو اس سے پورے طور پر استفادہ حاصل کرانے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

"معلّم"

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مولانا محمد علی ـــ بحیثیت تاریخ ساز

مرتبہ: محمد سرور

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۴۷۰ صفحات ـ مجلّد ـ قیمت آٹھ روپے ـ تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۶۲ء

ناشر: سندھ ساگر اکادمی ـ انارکلی، چوک مینار ـ لاہور ۲ (پاکستان)

مرتب کتاب، پروفیسر محمد سرور صاحب نے لکھا ہے کہ "برصغیر پاک و ہند کی اسلامی سیاست کو اس صدی میں سب سے زیادہ تین شخصیتوں نے متاثر کیا ہے ـ ایک قائدِ اعظم محمد علی جناح، دوسری شخصیت رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور تیسری مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی"۔ ان تینوں شخصیتوں پر موصوف الگ الگ کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے مولانا محمد علی مرحوم پر اس لئے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک مرحوم "مسلمانانِ برِ صغیر کی سب سے بڑی عوامی یعنی عوام مسلمانوں کی ہمہ جہتی زندگی کی نمائندہ و ترجمان شخصیت تھی"۔ کتاب کی ترتیب میں سب سے زیادہ مدد مولانا محمد علی مرحوم کے مضامین اور خطوط کے ان مجموعوں سے لی گئی ہے جو کافی مدت ہوئی خود سرور صاحب نے مرتب کئے تھے، اس کے علاوہ مولانا مرحوم کی ایک نامکمل کتاب سے ان کی آپ بیتی کے حصے انتخاب کر کے شامل کئے گئے ہیں۔ فاضل مرتب اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جس میں خود ان کے الفاظ میں "مولانا کی سیاسی زندگی اور اس دور میں مرحوم و مغفور کا جو اہم اور تاریخی کردار رہا ہے، اس پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جائے گی اور ان کی عظیم شخصیت کے پس منظر میں اس سارے دور کا جائزہ لیا جائے گا"۔

ہم نے پوری کتاب کو بڑی دلچسپی اور غور سے پڑھا ہے۔ واقعی اس سے مولانا مرحوم کے حالات اور ان کے ذہن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس دور کے سیاسی خلفشار کی ایک جھلک

بھی سامنے آتی ہے اور اُن اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے، جن کی بنا پر مولانا محمد علی جیسا مخلص اور دل ودماغ کا آدمی اپنی زندگی میں بڑی حد تک ناکام رہا ہے۔ خدا کرے کہ فاضل مرتب دوسری موعودہ کتابیں جلد مرتب کر کے شائع کر سکیں تاکہ اس دور کی، جو برصغیر کی تاریخ آزادی کا اہم ترین دور ہے، مکمل تصویر سامنے آسکے۔

سخن مختصر

از معین احسن جذبی

سائز ۱۸×۲۲/۸، حجم ۵۴ صفحات، طباعت خوبصورت ٹائپ میں کاغذ عمدہ، مجلد، قیمت دو روپے
تاریخ اشاعت، ۱۹۶۰ء ناشر، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔

جذبی صاحب ان چند نوجوان شعراء میں سے ہیں، جو پیشے کے طور پر شاعری نہیں کرتے، بلکہ اسی وقت کہتے ہیں جب وارداتِ قلب سے مجبور ہوتے ہیں۔ اس لئے کم کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں وہ صحیح معنی میں ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں ۳۱ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ جن میں بعض کافی طویل ہیں۔ باقی "سخن مختصر" کہی جا سکتی ہیں۔ جذبی ترقی پسند شاعر ہیں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں متعدد جگہ اس کا اظہار ملتا ہے، مگر "میٹھے" قسم کے ہیں، اس لئے اظہار میں انتہا پسندی نہیں ملے گی۔ مثال کے طور پر "نیا سورج" پیش کی جا سکتی ہے، جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے متعلق ہے جسے ترقی پسند شعراء نے ہندوستان کی آزادی کو آزادی تسلیم نہیں کیا تھا، مگر جذبی کہتے ہیں۔

بڑے ناز سے آج اُبھرا ہے سورج
ہمالہ کے اونچے کلس جگمگائے
پہاڑوں کے چشموں کو سونا بنایا
نئے بل، نئے زور ان کو سکھائے

لباسِ زری آبشاروں نے پایا
نشیبی زمینوں پہ چھینٹے اڑائے
گھنے اونچے اونچے درختوں کا منظر
یہ ہیں آج سب آبِ زر میں نہائے

اور جب ۔ حرف شکایت زبانِ قلم پر لاتے ہیں تو اس سے ہمدردی اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ملک کی بھلائی کے لئے کہہ رہا ہے، نہ کہ محض اعتراض کی خاطر یا کسی مخصوص پالیسی کے تحت ۔ مثلاً :

مگر ان درختوں کے سائے میں اے دل
ہزاروں برس کے یہ ٹھٹھرے سے پودے
ہزاروں برس کے یہ سمٹے سے پودے
یہ ہیں آج بھی سرد، بے حال، بے دم
یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو جھکائے

اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں :

ارے او نئی شان کے میرے سورج
تری آب میں اور بھی تاب آئے

اسی طرح ایک مسلسل غزل میں یوں شکایت کی گئی ہے :

آج بھی جسم اسی طرح فگار و مجروح
آج بھی قلب اسی طرح تپاں ملتے ہیں
آج بھی دل ہیں کہ ہو حشر کا دھوکا جن پر
آج بھی لب ہیں کہ سرگرمِ فغاں ملتے ہیں

مگر اس غزل کا مطلع اور آخری شعر ملاحظہ ہو :

دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
اس اندھیرے میں اجالے کے سماں ملتے ہیں
یوں گوارا ہے یہ خونبار اُفق کا منظر
اس کے پرتو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں

اس مجموعے میں ایک نظم وطن کی تقسیم پر بھی ہے اس موضوع پر بہت سے شعراء نے نظمیں کہی ہیں مگر جذبی کے یہاں جو سوز وگداز اور دردمندی ہے، وہ کسی اور کے یہاں مشکل ہی سے ملے گی۔ شروع کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کیا یہی انقلاب ہے؟ قلب اِدھر جگر اُدھر — نالۂ بے قرار اِدھر، شورشِ چشمِ تر اُدھر
اف رے سیاستِ چمن، ننگ کرو سے سوءِ ظن — کور ہے نرگسِ وطن، نور اِدھر نظر اُدھر
ایک تبسمِ فرنگ، مرد وافق لہو ترنگ — نعش بدوش و نالہ رنگ، شام اِدھر سحر اُدھر

اس مجموعہ کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی کہ نہ کوئی تمہید ہے، نہ کوئی پیش لفظ اور نہ کوئی مقدمہ حتیٰ کہ شاعر کے پچھلے یا آئندہ مجموعہ کلام کا کوئی اشتہار بھی نہیں۔ اس سے تبصرہ نگار کی مشکل تو ضرور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ وہ ان ہی کا سہارا لے کر لکھنے کا عادی ہے، لیکن یہ روایت اگر رائج ہو جائے تو لوگ نثری قصیدہ کے مطالعہ سے محفوظ ہو جائیں گے۔

اُردو کی تعلیم کے لسانیاتی پہلو

از ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

سائز ۲۲×۱۸، حجم ۷۴ صفحات، کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ۔ غیر مجلد
قیمت: ڈیڑھ روپے۔ تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۶۱ء ناشر آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل دہلی ۶

جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبان کی طرح اُردو کی اعلیٰ تعلیم کا کوئی سائنٹفک طریقہ رائج نہیں ہے اور نہ ابھی تک اس طرف کوئی خاص توجہ کی جا رہی ہے۔ مکتبی تعلیم کے قدیم طریقے کے ختم ہونے اور عربی و فارسی کے زوال کے بعد اردو زبان و ادب کا معیار برابر گرتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ سیاسی حالات کے پیش نظر بیرونی ممالک میں اردو کی تعلیم کی طرف توجہ دی جا رہی ہے، اس لئے اردو کے لسانی مسائل کو سائنٹفک طریقوں سے حل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ وقت کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زیر تبصرہ کتاب لکھی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اپنے مباحث کے اعتبار سے یہ مختصر کتاب بہت مفید ہے۔

اس کتاب کے مخاطب غالباً اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے جب بھی اس کو انگریزی زبان کی "غلامی" سے آزاد رکھا گیا ہوتا تو اچھا تھا۔ سوا سات سطروں کا ایک اقتباس صرف انگریزی میں نقل کیا گیا ہے۔ ترجمہ دینے میں کیا قباحت تھی، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی طرح انگریزی اور اردو کی گنگا جمنی بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ ایسے چند فقرے ملاحظہ ہوں :

اُسے LOW FRONT مصوتہ کہیں گے۔ اس طرح پیدا ہونے والی زبان کو MID FRONT مصوتہ کہتے ہیں۔ ایسی آواز کو HIGH FRONT مصوتہ کہیں گے۔ (صفحہ ۱)

بعض اصلاحات کے ترجمے بھی قابلِ غور ہیں۔ مثلاً UNDERSTANDING کا ترجمہ افہام کے بجائے، میرے خیال میں، ادراک زیادہ بہتر ہے۔ چونکہ مولف کی رہنما کتابیں انگریزی میں تھیں، اس لئے کہیں کہیں عبارت میں ترجمہ پن پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً

"طالب علم استعمالِ زبان کی دوسری سطح پر پہنچتا ہے یعنی الفاظ اور افعال کا صحیح استعمال خود کار (AUTOMATIC) ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۴۳)

دیمک کی کہانی از : عبدالبصیر خاں

سائز ۳۰ × ۲۰ / ۱۶ حجم ۱۴۳ صفحات۔ غیر مجلد۔ قیمت دو روپے۔ تاریخ اشاعت ۱۹۶۰ء
ناشر : انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

اردو میں مختلف قسم کے حیوانوں، ان کے رہن سہن اور ان کے فائدے اور نقصانات کے بارے میں بہت کم کتابیں ہیں اور کیڑے مکوڑوں پر تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے پیش نظر کتاب چھاپ کر ایک مفید خدمت کی ہے۔ اس میں دیمک کے متعلق مکمل معلومات دی گئی ہیں۔ اس کے فائدے اس کے نقصانات اور ان سے بچنے کے طریقے بھی بتلائے گئے ہیں غرضکہ بہت مفید کتاب ہے۔ زبان اگر اور آسان ہوتی تو اچھا تھا۔ کتاب میں دیمک کے متعلق چند تصویریں بھی شامل ہیں۔

ع ل ا

کوائف جامعہ

جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ مل گیا

جامعہ کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو اس اطلاع سے یقیناً بڑی خوشی ہوگی کہ حکومت ہند نے جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ اور بی اے اور بی ایڈ کی ڈگریاں دینے کا اختیار دے دیا ہے۔ یوں تو آزادی کے بعد ہی حکومت ہند نے ملازمت کے لئے جامعہ کی ڈگریوں کو دوسری یونیورسٹی کی ڈگریوں کے مساوی تسلیم کر لیا تھا اور بعض یونیورسٹیوں نے بھی انھیں متعلقہ پوسٹ گریجویٹ کلاسوں میں داخلے کے لئے منظور کر لیا تھا، لیکن اس سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ایک تو حکومت ہند کی یہ منظوری مستقل نہیں تھی۔ ایک معینہ مدت کے بعد منظوری کی توسیع کی جاتی تھی دوسرے، مرکزی حکومت کی ایسی ملازمتیں بہت کم ہیں، جو ہمارے فارغ التحصیل طلبہ کو ان کی تعلیمی استعداد کے مطابق حاصل ہو سکیں۔ دراصل ضرورت اس بات کی تھی کہ جامعہ کی قانونی حیثیت تعلیمی اعتبار سے معیّن کی جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب جامعہ کی حیثیت مقرر ہو گئی ہے۔ اس اعلانیہ کے بعد اب اسے یو۔جی سی ایکٹ (۱۹۵۶ء) کی دفعہ ۳ کے مطابق یونیورسٹی کا درجہ مل گیا ہے۔ ارباب جامعہ ایک طویل عرصے سے کوشش کر رہے تھے کہ جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کا ایک آزاد ادارہ مان کر اس کو یونیورسٹی کی ڈگریاں دینے کا حق دے دیا جائے۔ بفضلہٖ ان کی یہ آرزو پوری ہوئی اور ان کی کوششیں بر آئیں۔

صبحِ ظفر از مشرق امید بر آمد
اصحاب غرض را شب سودا بسر آمد

انشاء اللہ اب جامعہ اپنے کام کو بہتر طور پر منظم کر سکے گی اور اس میں وسعت بھی پیدا کر سکے گی۔

طالب علموں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوگا اور معیار تعلیم بھی بلند کیا جاسکے گا۔

اس خوشی کے موقع پر اس کا ذکر نامناسب نہ ہوگا کہ جامعہ مخصوص حالات میں قائم ہوئی تھی۔ اس نے آزاد تعلیم کا نعرہ بلند کیا تھا اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی قومی تعلیم کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کی راہ میں کٹھن سے کٹھن مرحلے آئے، مگر اس نے اپنی امتیازی خصوصیات کی ہمیشہ حفاظت کی اب ملک کے حالات یکسر بدل گئے ہیں اتنی بڑی تبدیلی آئی ہے کہ جامعہ کے قیام اور اس کے مقاصد طے کرتے وقت اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا مگر اس کے باوجود جامعہ کے لوگ اپنے اندر اس کا حوصلہ رکھتے ہیں کہ اس کی بنیادی خصوصیات کو باقی رکھنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کو اس مژدۂ جانفزا کی خبر ملی تو انھوں نے قائم مقام شیخ الجامعہ ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب اور اساتذہ و کارکنان جامعہ کو مبارک باد دیتے ہوئے لکھا کہ

"اس کامیابی کے ساتھ بڑی ذمہ داریاں، بڑی مشکلیں اور بڑے خطرے ہیں، جو ہمارا بڑا کڑا امتحان لیں گے۔ خدا ہمیں اس امتحان میں پورا اترنے کی توفیق دے"۔

شیخ الجامعہ صاحب کی مصروفیات

شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی خواہش پر قومی یکجہتی کونسل کی رکنیت قبول فرمائی اور ۲ و ۳ جون کو اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو اس کی کارروائیوں میں شرکت کی۔ اس موقع پر مجیب صاحب اس مخصوص کمیٹی کے ممبر بھی منتخب کرلئے گئے ہیں جو فرقہ واریت کی تعریف کے لئے بنائی گئی ہے۔

۱۷ جون کو ایک علمی کام میں شرکت کے لئے موصوف دوبارہ مغربی جرمنی تشریف لے گئے ہیں۔ انشاءاللہ جولائی کے پہلے ہفتہ میں واپس آجائیں گے۔

تابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی مطبوعہ: یونین پریس دہلی ٹائیٹل: دیال پرنٹنگ پریس دہلی



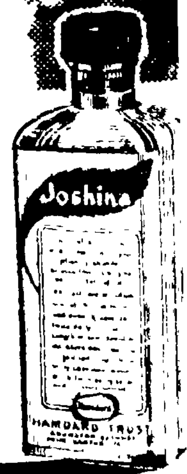
اپنے بچے کو
زکام کے ساتھ
ت سونے دیجئے

سونے سے پہلے

جوشینا

لائیے۔ یہ آپ کے بچے کو فوراً تسکین
پہنچائے گا۔ اور زکام کی تکلیف اور
بےچینی کو دور کرے گا۔





تمام رات جوشینا سانس کی نالیوں کو صاف رکھے گا
بند ناک کو کھولے گا۔ اور آپ کے بچے کو زکام کی بےچینی
سے بچا کر راحت بھری نیند سونے میں معاون ثابت ہوگا۔



دہلی - کانپور - پٹنہ

جامِعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھے روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷ | بابت ماہ اگست ۱۹۶۲ء | شمارہ ۲

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

فراق کا شعور غم

جناب سید عالم خوندمیری

فراق اردو شاعری کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں اور اردو زبان کی یہ ایک خوش بختی ہے کہ اسے میر، غالب اور اقبال کے بعد فراق جیسا شاعر ملا۔ فراق صرف میر اور غالب کا تسلسل نہیں ہیں۔ بلکہ واقعی ارتقاء کی ایک کڑی ہیں صرف فراق کی شاعری کے گہرے مطالعہ سے ہی یہ جاننا ممکن ہے کہ ہماری شاعری میں کن عناصر کی اور کونسے اجزا کی کمی تھی جس کی فراق نے تکمیل کی۔ اردو شاعری کی تاریخ کے اسٹیج پر جب فراق نمودار ہوئے ہیں اردو شاعری کا دامن میر اور غالب کے آفاقی نغموں سے بھرا ہوا تھا اور اقبال اس شاعری کو عالمی شاعری کا ایک پائیدار جزو بنانے میں مصروف تھے۔ اتنے دیو قامت فن کاروں کا مقابلہ تو بڑی بات ہی آنکھ سے آنکھ ملانا ایک بڑا کارنامہ تھا اور اس کارنامے کے لئے بڑی ہمت اور طاقت کی ضرورت تھی۔ فراق نے اس مہم کو انجام دیا اور ان عظیم فن کاروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی۔ فراق نے بہت کچھ لکھا ہے اور میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ان کا ہر شعر ایک الہام ہے اور کس شاعر کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی شاعری میں واقعی "الہامی" عنصر اس حد تک نمایاں ہے کہ اس کو غیر الہامی عنصر سے آسانی کے ساتھ علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری کے تمام لمحات تخلیقی نہیں ہیں بلکہ میں یہاں تک ماننے کے لئے تیار ہوں کہ واقعی تخلیقی لمحات بہت زیادہ نہیں لیکن ان کی شاعری کا ایک سرسری مطالعہ بھی ایک صاحب ذوق کو اس بات کے ماننے پر آمادہ کر دیتا ہے کہ اتنے پرخلوص اور حقیقی لمحات بہت کم فنکاروں کو نصیب ہوتے ہیں۔ وہ وجدان کے عروجی لمحے کو چھو لیتے ہیں اور پھر ان کی شاعری اس لمحے کی ترجمان بن جاتی ہے۔ انھیں اپنی اس معراج کا شعور ہے

اور اس لئے وہ اس بات کا اعلان کر سکتے ہیں کہ :

ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں　　　چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جان بہار! تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ　　　سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

یہ جان بہار صرف ایک شخصی وجود نہیں ہے بلکہ کائناتی حسن کی ایک جھلک ہے۔ ایک ایسی جھلک جس میں جلال اور جمال دونوں پنہاں ہیں۔ فراق کے وجدان نے حسن کائنات یا کائناتی حسن کی ایسی کئی جھلکیاں دیکھیں لیکن ان کا وجدان اتنا بھرپور اور اتنا مکمل ہے کہ ان پر "جذب" کی سی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ اس "لمحہ" میں گم نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ کو دریافت کر لیتے ہیں اگر وجدان کا یہ لمحہ ان پر طاری ہو جاتا اور وہ اس کیفیت میں گم ہو جاتے تو پھر ان کی شاعری میں وہ انسانی اور آفاقی عنصر باقی نہ رہتا جو ان کی شاعری کی امتیازی کیفیت ہے۔ انھیں سنگیت کی سرحدوں تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی لیکن اس منزل پر بھی انھوں نے اپنے شخصی وجود کو اور اپنی انفرادیت کو باقی رکھا۔ اپنے شخصی وجود اور اپنی انفرادیت کو اس منزل پر کھو دینا آسان ہے لیکن باقی رکھنا صرف ایک عظیم فنکار ہی کا حصہ ہے۔ وہ اپنی ہستی کے قطرے میں "دجلہ" کو یا یوں کہئے "گنگا" کو دیکھ لیتے ہیں لیکن اس قطرے کی انفرادیت کو باقی رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اس قطرے کا کمال یہ ہے کہ اس میں حقیقت کی تصویر نظر آئی اور قطرے کو دریا میں فنا کر دینا قطرے کی عشرت کا سامان نہیں بلکہ قطرے کی موت ہے۔ ان کے نغموں میں اس اندیشے کی دھڑک بار بار سنائی دیتی ہے کہ کہیں یہ قطرہ "غرق دریا" نہ ہو جائے۔ اس لئے غالب کی طرح وہ بھی وصل میں "شب ہجراں" کی تمنا محسوس کرتے ہیں۔ ایک خود آگاہ اور عارف ذات وجود ہی اس تمنائی لمحہ میں ہجر کی "لذت" کو یاد کر سکتا ہے۔ "انا" کی معراج یہ ہے کہ اسے "وصل" کا یہ لمحہ نصیب ہو لیکن اگر یہ لمحہ ٹھہر جائے اور یہ ساعت منجمد ہو جائے تو پھر یہی معراج "انا" کی موت بن جاتی ہے۔ اس لئے فراق وصل کی ساعتوں کی تمنا کرتے ہوئے کم نظر آتے ہیں اور فراق کی گھڑیاں انھیں زیادہ محبوب ہیں۔ غالب کی شاعری کا یہ رجحان فراق کی شاعری میں پوری طرح ابھر آتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ

فراق، غالب کی صدائے باز گشت نظر نہیں آتے بلکہ غالب کی شاعری کے اس لمحے کا نقطۂ عروج نظر آنے لگتے ہیں۔ غالب نے وصل کی ساعتوں میں جب ہجر کی تمنا محسوس کی تو ان کا رویہ ایک حد تک انفعالی تھا اور شاید اس لئے انھوں نے کہا "آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے" لیکن فراق کا رویہ انفعالی نہیں بلکہ ان کے ہجر کے لمحات ان کی حیات عشق کا ایک بڑا انمول سرمایہ بن جاتے ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم — جو تیرے ہجر میں گذری وہ رات رات ہوئی

یا

شب فراق میں اٹھے حجاب یاس وامید — تمام عمر میں بس ایک ہی تو رات ہوئی

ہجر کی اس عظمت کا اور فراق کے لمحات کی اس سعادت کا ذکر ہمیں صرف فراق کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں ہجر کی یہ عظمت صرف ان کا انداز بیان نہیں ہے بلکہ حیات وکائنات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے یہ مطالعہ صرف عقل کی رہبری میں نہیں کیا بلکہ وجدان کی مدد سے یہ منزلیں طے کیں۔ فراق اپنے فلسفہ حیات میں نری عقل کو زندگی کی رہنمائی کے لئے کافی تصور نہیں کرتے بلکہ ادراک حسن کو وجدان کی ایک دین تصور کرتے ہیں۔ عقل صرف منزل تک پہنچا سکتی ہے لیکن منزل کے حسن کا ادراک اس کے بس کی بات نہیں۔ عقل کشتی حیات کو ساحل تک بامراد لے آسکتی ہے لیکن ساحل کے حسن کا شعور حاصل کرے، یہ اس کا منصب نہیں۔

محفل میں پہنچ کے حسن محفل بھی تو دیکھ — منزل پہ پہنچ کے حسن منزل بھی تو دیکھ
تو پار گئی ہے بحر ہستی اے عقل — ساحل پہ پہنچ کے حسن ساحل بھی تو دیکھ

حسن محفل، حسن منزل اور حسن ساحل کا ادراک ایک بڑی ہمت کا طلبگار ہوتا ہے۔ یہ شعور کو منزلوں سے مالامال نہیں کرتا بلکہ غم کی اتھاہ حقیقتوں سے روشناس کرتا ہے۔ اس ادراک سے حاصل ہونے والا غم نہ غم ذات ہے اور نہ غم جاناں غم دوراں

ہے اور نہ غم زمانہ بلکہ کائیناتی غم کائیناتی حسن کے ادراک کا حاصل ہے۔ حسن کے اس ادراک پر ہستی اگر حسن کی آگ میں جھلس کر رہ جاتی تو پھر غم کا مداوا ہو جاتا اور انسان غم ہستی سے نجات حاصل کر لیتا لیکن حسن کا یہ وجدان شعور ہستی کے حدود کو بڑھا دیتا ہے اور ماورائیت (TRANSCENDENCE) کے اس لمحے میں ہستی کے حدود منکشف ہو جاتے ہیں۔ یہ انکشاف مسرتوں کے دروازے وا نہیں کرتا بلکہ غم کے امکانات کو روشن کر دیتا ہے۔ فراق کی ایک غزل میں یہ راز عیاں ہوتا ہے اور ان کی زبان الہامی نظر آنے لگتی ہیں۔ "انا" کی محدودیت اور تمنا کی لامحدودیت کی یہ تصویریں دیکھئے:

میں دید کی حسرت بھی ہیں کیف تماشا بھی	کس شان سے پنہاں ہوں کس رخ سے نمایاں ہوں
تکمیل کے ہاتھوں بھی میں ہو نہ سکا پورا	کس شوخ کا پیماں ہوں کس دل کا پشیماں ہوں
بھولا ہوا افسانہ ٹوٹا ہوا پیمانہ،	میں ہی غم جنت ہوں میں ہی دل انساں ہوں
منہ موڑ کے ہستی سے ٹھکرا کے عدم کو بھی	کیا جانئے اب کس سے میں دست و گریباں ہوں
وہ درد ہوں کم ہو کر جو اور بھی بڑھ جائے	میں یعنی فراق اپنی صبح شب ہجراں ہوں

اس کائنات میں انسان کی زندگی کا یہ استبعاد (PARADOX) ہی انسانی زندگی کے عنصری غم کا سرچشمہ ہے۔ انسان ازل سے منزل کا جویا رہا ہے لیکن سعی و جستجو کی کوئی منزل انسان کے لیے آخری منزل نہ بن سکی۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے منزل تک پہنچنے کی امید انسانی قلب کو مسرتوں سے مالا مال کرتی رہی لیکن ہر منزل پر انسان نے یہ محسوس کیا کہ یہ ایک مرحلہ ہے منزل آخر نہیں۔ فراق کو انسان کی اس حزن آمیز جستجو کے راز کا عرفان حاصل ہے اور ان کے وجدان نے انسانی تاریخ کے اس المئے تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ فراق محسوس کرتے ہیں کہ شاید منزل کی ہر جستجو کا محرک انسان کا یہ جذبہ رہا ہو کہ اس بظاہر بے مقصد زندگی میں ایک مقصد کی تخلیق کی جائے لیکن کوئی منزل اس جذبہ رائگاں کو جس کا نام انسانی زندگی ہے معنی و مفہوم کا حامل نہیں بنا سکتی۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد بھی جب انسان اپنی جستجو و سعی پر ایک نظر واپسیں ڈالتا ہے تو

یہ محسوس کرتا ہے :

مہ ونیں گرد کے مانند اڑی جاتی ہیں ‏ وہی انداز جہان گزراں ہے، کہ جو تھا

یہ المناک احساس "تاریخ کی جہنم" کی بھرپور سیر سے ہی حاصل ہو سکتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ فراق نے اس جہنم کی سیر نہیں کی۔ فطرت کا حسن بھی اس "سیر" میں ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور منزل جاناں پہ پہنچ کر شاعر رمز آشنا کی آنکھ بھر آتی ہے۔

فضا تبسم صبح بہار تھی لیکن ‏ پہنچ کے منزل جاناں پہ آنکھ بھر آئی

اس عرفان کے بعد خزاں اور بہار کا فرق مٹ جاتا ہے اور حقیقت کے چہرے سے اعتبارات کے نقاب اٹھ جاتے ہیں۔ عرفان کے ایک ایسے ہی موڑ پر فراق قدیم ہندوستانی عارف کے ہم زبان نظر آنے لگتے ہیں :

"یہ خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ ‏ وہی خار وخس وہی رنگ و بو"

فراق نے تاریخ انسانی کی اس لاحاصل جستجو کے عرفان کے کرب کو مٹانے کے لئے تاریخی ارتقا کے بے جان لیکن عقلی فلسفے کو اپنانے کی بھی کوشش کی اور "سیاہ روس" کے برلن تک فاصلہ طے کرنے کا انتظار بھی کیا لیکن ایک ایسے لمحے میں بھی عرفان کا ازلی اور ابدی غم ان کا پیچھا کرنے لگتا ہے اور وہ حسن کے ادراک میں محو ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کی تبدیلی کے جاں فزا ادراک سے کہیں زیادہ کائنات کا حسن ان کے لئے سہارا اور ذریعہ نجات بن جاتا ہے اور کائنات انھیں اپنے آپ میں ڈوبتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وقت اور انسان کی یہ آنکھ مچولی تاریخ کے حزنیہ کا راز ہے اور اس لئے فراق خود انسانی شخصیت کو انسانی سفر کی منزل قرار دیتے ہیں۔

فراق تو ہی مسافر ہے اور تو ہی منزل بھی ‏ کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

اجتماعی عمل حسن کا نام تاریخ ہے اور انفرادی عمل حسن کا نام محبت ہے، انسانی عمل کے صرف دو پہلو ہیں اور دونوں کا مقصد زندگی کے المئے کے بنیادی احساس کو دور کرنا ہے۔ تاریخ انسانی اجتماع کی ناکامی کی داستان ہے تو محبت انفرادی زندگی

کی ناکامی کا ایک دردناک واقعہ۔ ہم تاریخ کے کارناموں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ انفرادی حیثیت سے ناکام انسان تاریخی حیثیت سے ایک کامران وجود ہے لیکن تاریخ کا ہر پچھلا دور گہری نظر سے دیکھیئے تو "عصری دور" نظر آنے لگتا ہے۔ انسان ناکامی اور کامیابی کی دو حدوں کے درمیان رقص کرتا ہے اور کسی کنارے پر اسے قرار نہیں۔ انسانی محبت بھی ہجر اور وصل کی ان دو انتہاؤں کے درمیان جھولتی رہتی ہے اور کسی انتہا پر وہ رک جائے یہ اس کی قسمت نہیں۔ وصل کا لمحہ محبت کے ادراک کا لمحہ نہیں اور اس لیے حیات عشق میں ہجر اور فراق کے لمحات وصل کے لمحات سے کہیں زیادہ قیمتی بن جاتے ہیں۔ محبت کی منزل مقصود یقیناً فردیت کی موت ہے لیکن دو افراد کا ربط اصل میں دو باشعور ہستیوں کا ربط ہے اور دو ذی شعور ہستیوں کا ربط بنیادی طور پر رفاقت کا ربط نہیں ہوتا بلکہ ایک تصادم سے پیدا ہونے والا ربط ہوتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ کہنا آسان ہے کہ اپنے ہمسائے سے اس طرح محبت کرو جیسے کہ تم اپنے آپ سے کر سکتے ہو لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ انسان اپنے ہمسائے سے اسی طرح محبت کرے جیسا کہ وہ اپنے آپ سے کرتا ہے۔ کیا انسانی شخصیتیں کسی ایک نقطہ پر اس طرح مل سکتی ہیں کہ ایک شخص دوسری شخصیت میں پوری طرح ضم ہو جائے جسے شاعری کی زبان میں "وصل" کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی زندگی میں المیہ کا عنصر پوری طرح ختم ہو جائے اور ایک لمحہ پوری زندگی بن جائے، خلوت کی گھڑی گزرنے ہی نہ پائے اور اگر خلوت کی گھڑی پائدار بھی ہو جائے اور اس لمحۂ وقت کی رفتار رک بھی جائے تو کیا شخصیتوں کے تصادم کا احساس ختم ہو جائے گا۔ اور واقعی دو شخصیتیں ایک وجود بن جائیں گی۔ بیدلؔ کا شاعرانہ عرفان اس امکان کی نفی کرتا ہے۔

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ وقت رنج خمار ما   چہ قیامتے کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما

وصل کے ان طرب آگیں لمحوں میں ہی تنہائی کی غمناک حقیقت منکشف ہوتی ہے اور انسان محبت ہی کے تجربہ میں اپنی بنیادی تنہائی کے تجربہ کا مکمل عرفان حاصل کرتا ہے کیونکہ اس تنہائی کے اندوہ کیں احساس اور آنسوؤں کی اس وادی "میں جسے دنیا کہتے ہیں اپنے وجود کی کم مائگی کو دور کرنے کے لئے اس نے محبت کی آغوش میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ بڑے سے بڑے معنی آفریں اجتماع میں

جلا وطنی کا احساس ایک حساس ذہن کا تعاقب کرتا رہتا ہے اور اس جلا وطنی کے احساس پر قابو پانے کے لیے یا اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے دو روحیں اور دو جسم ایک دوسرے کی رفاقت تلاش کرتے ہیں لیکن اس تلاش کا انجام فراقؔ کی زبان میں

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی　　　اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

محبت تنہائی کے احساس کی معراج بن جاتی ہے۔ "سازِ محبت" جو آغاز میں "نغمۂ جنت" نظر آتا تھا۔ "سوزِ محبت" میں بدل جاتا ہے اور "سوزِ محبت" "نارِ جہنم" میں۔ "غیر" کو اپنانے کی آرزو نے محبت کا روپ دھارا تھا اور اب عشق کے تجربے میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ "تھا حسن و عشق کے بھی درمیاں کوئی"۔ اس "غیر" کو سفرِ حیات سے خارج کرنا آسان نہیں کیونکہ "ہر انا کے لئے دوسرا وجود غیر" ہے۔ محبت ایک دوسرے کو فتح کرنے کی ایک کوشش کا نام ہے لیکن کوئی "انا" "مفتوح" بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس لئے محبت کی تقدیر میں ناکامی ہے۔ فراقؔ محبت کی اس "تقدیر" سے واقف ہیں اور اس لئے ان کے غم میں شکست کے احساس کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ انھیں محبت کی ناکامی موت کی دعا کرنے پر بہت کم اکساتی ہے کیونکہ موت ایک بے معنی رشتہ کو اور بھی بے معنی بنا دیتی ہے۔ موت کی آرزو وہ کرتے ہیں جو آغاز میں محبت کی کامیابی کے منتظر رہتے ہیں اور ناکامی ایک بلائے ناگہانی کے طور پر ان کا سامنا کرتی ہے۔ ایسے میں ان کا غم گریہ و ماتم میں بدل جاتا ہے اور اب وہ بجائے محبوب کے "قضا" کا انتظار کرنے لگتے ہیں فراقؔ اور فانیؔ کے غم میں یہی بنیادی فرق ہے۔ فراقؔ فانیؔ کی طرح معصوم نہیں ہیں اس لئے وہ غمزدہ نہیں ہیں۔ فانیؔ کی شاعری جہاں ایک غمزدہ انسان کی تصویر ہے جسے اچانک غم آ لیا' وہیں فراقؔ کی شاعری ایسے غم کی تصویر ہے جو شاعر کے لئے کوئی انوکھی بات نہیں۔ فانیؔ نے غم کو ایک ناگوار حقیقت کے طور پر قبول کیا اور اس کو گوارا بنانے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانیؔ نے محبت سے بڑی امیدیں باندھ رکھی تھیں اور وہ سب ناکام ہوئیں۔ ان کے غم میں مایوسی ہے اور فراقؔ کے غم میں مایوسی کی جھلک نظر نہیں آتی وہ امید اور مایوسی دونوں سے بلند ہو جاتے ہیں کیونکہ محبت ان کے نزدیک بنیادی طور پر مہمل ہے اور پھر بھی نہ کی جائے'

یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔

سوچیں تو عجب نکتہ ہے حسن و محبت بھی　　　　چپ رہیئے تو سب واضح کچھ کہیئے تو مہمل ہے

محبت میں کامیابی اور ناکامی فراق کے لئے بے معنی الفاظ ہیں محبت کی کامیابی یہ ہے کہ زندگی میں کامیابی کا "فسون" پیدا کرے۔

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے　　　　تری نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایہ

یہ محبت کی تہذیب آموزی ہے "آنسوؤں کی اس وادی" میں مسکراہٹوں کے سامان فراہم کرنا خود وہ مسکراہٹیں کتنی ہی عارضی کیوں نہ ہوں محبت کی بڑی فتح ہے۔ یہ موت پر زندگی کی اور یاس پر امید کی فتح ہے۔ فراق محبت کے اس جان نواز منصب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اس لئے ان کی محبت، کم از کم ان کی شاعری میں بہت کم جسمانی یا مادی سطح پر نظر آتی ہے۔ ان کی محبت کا یہی عنصر انھیں مومن اور حسرت سے ممتاز کرتا ہے وہ مومن سے زیادہ غالب کے قریب نظر آتے ہیں۔ غالب نے ہر رنگ میں بہار کا اثبات کرنے کی کوشش کی اور فراق بھی قریب قریب اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔

کسی کا کون ہوا یوں تو عمر بھر پھر بھی　　　　یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

شاید یہ "اثباتِ فریب" فراق نے ہندی فلسفے سے حاصل کیا ورنہ وہ اس بلندی پر نہ پہنچ سکتے تھے۔ اس "اثبات فریب" کا نتیجہ ہے کہ دنیا انھیں رہنے کے قابل جگہ نظر آتی ہے۔ وہ ایک بے حس رجائیت پسند کی طرح جس کا والٹیر نے کانڈیڈ میں مذاق اڑایا ہے، دنیا کو بہترین دنیا نہیں کہتے۔ دنیا اپنی تمام ناتمامی کے باوجود اور زندگی اپنی ناکامی کے باوصف انھیں عزیز ہے کیونکہ یہ ناتمامی اور یہ ناکامی سعی اور جستجو کے لئے مواقع سے کم نہیں۔

رنج و راحت وصل و فرقت ہوش و وحشت کیا نہیں
کون کہتا ہے کہ رہنے کی جگہ دنیا نہیں

زندگی کی جدلیاتی ماہیت ——— کا یہی عرفان ہے جو انھیں ہر بار اس کائنات کو اور اس زندگی کو ایک نئے رنگ میں دیکھنے پر اکساتا ہے اور "رہگذر یار" انھیں ہمیشہ نئی نظر آتی ہے

کیونکہ انسانی تمنا ہی تو ہے جو اس "بوڑھی دنیا" کو ہمیشہ جوان دیکھنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے — نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

فراق کا شعورِ غم زندگی کی اس جدلیاتی ماہیت کے عرفان کا آفریدہ ہے اور اس لئے ان کی شاعری خودکشی پر نہیں اکساتی اور نہ موت کو حسین بنا کر پیش کرتی ہے، بلکہ ناکامی کے لمحات کو بھی حسین پیکر عطا کر دیتی ہے۔ زندگی ایک جذبۂ رائیگاں سہی لیکن موت اس کا حل نہیں کیونکہ موت اس کو اور بے مقصد بنا دیتی ہے۔ محبت کی قسمت میں ناکامی سہی لیکن اس محبت کے چند لمحات حیات کو مقصد عطا کرتے ہیں اور انسان سے بے نیاز کائنات انسان کو اپنے آپ سے قریب کر لیتی ہے۔ زندگی کی منزل عشق کی منزل بن جاتی ہے۔ اور عشق مادی و جسمانی سطح سے بلند ہو کر ایک کائناتی حقیقت بن جاتا ہے۔

جو منزلیں ہیں تو بس رہروانِ عشق کی ہیں
وہ سانس اکھڑی ہوئی پاؤں ڈگمگائے ہوئے

وہی ہے رونقِ ہستی وہی ہیں جانِ نشاط
اداس بیٹھے ہیں جو تیری لو لگائے ہوئے

فراق تو ہی مسافر ہے اور تو ہی منزل بھی
کدھر چلا ہے محبت کی چوٹ کھائے ہوئے

ہندوستان عربوں کی نظر میں

پروفیسر عبد الغفور

تیسری صدی ہجری میں آپ ایک عالم کے حجرے کا تصور کیجئے۔ بصرہ کی بین اقوامی بندرگاہ میں جہاں ہندوستانی بنیا اور سندھی منیم عرب جہاز رانوں کی بھیڑ میں چلا جارہا ہو اور ملیا تو منہ جات ہندوستان کے اصلی فولاد کی تلوار لگائے کھڑا ہوا خزانے کی حفاظت کر رہا ہے۔

آپ کو دکھائی دے گا کہ قلمی کتابوں کے ایک بڑے ڈھیر سے پٹا پڑا ہے، ان کے بیچ میں کتابوں کی اس وسیع دنیا میں کھویا ہوا ایک پستہ قد، نحیف الجثہ، ضعیف آدمی اس تیزی سے کچھ لکھ رہا ہے گویا وہ چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ یہ شخص دنیا جہان سے بے خبر اپنے کام میں اتنے انہماک اور یکسوئی سے لگا ہوا ہے کہ اس کے ارد گرد کتابوں کا جو بڑا انبار لگا ہوا ہے اگر وہ اس کے اوپر گر پڑے تو وہ اس کے اندر دب کر مر جائے اور اس کو مطلق خبر نہ ہو۔ چنانچہ ایک دن ان کتابوں نے اس کو اپنے آغوش میں ہمیشہ کے لئے سلا ہی لیا۔

یہ بڈھا آدمی جاحظؔ ہے جس کی آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی ہیں اور ایک کتاب "کالی اور گوری نسلوں کی بحث" کے نام سے لکھ رہا ہے۔

شعوبیت کی مہیب لہروں نے ساری اسلامی دنیا میں ایک ہلچل سی مچا رکھی ہے، اور شعوبیہ تحریک نے پوری ملت اسلامیہ کو "عرب" اور "غیر عرب" دو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ عرب نعرہ لگاتے ہیں کہ ہم اور سب قوموں سے افضل و برتر اور خدا کے محبوب بندے ہیں۔ اور عجمی کہتے ہیں کہ برتری ایک فرد کو دوسرے فرد پر تو ہو سکتی ہے لیکن ایک قوم کو دوسری قوم پر نہیں ہو سکتی، اس کا معیار تو صرف دین داری اور نیکی ہے۔

یہ زبردست مظاہرہ نظم میں بھی ہوتا تھا اور نثر میں بھی، ہر فریق اپنی بیجا تعریف اور حریف کی

حمایت کرتا، یہ مرض اس قدر پھیلا کہ اچھے سے اچھے اور شریف سے شریف لوگوں کو بھی لگ گیا۔
ان حالات میں جاحظ بڑی شان و شوکت سے اپنی بے پناہ علمیت و ہمہ گیر اور غیر معمولی شخصیت، دل آویز اور دلکش طرز تحریر کے ساتھ اٹھا اور اس نے غیر عرب قوموں کی تعریف کا ڈنکا بجایا۔

جاحظ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو چند پیسوں کی خاطر کسی کی وکالت کرتے ہیں۔ اس نے مناظرہ کی گرما گرمی کے زمانے میں بھی ایک تبحر عالم کی شان کو برقرار رکھا۔ اس نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ کالی نسلوں کی صلاحیتوں کا ایک بے لاگ اندازہ ہے اور دونوں قوموں کا تقابلی مطالعہ۔

جاحظ جب کالی قوموں کے مخالفوں کو قائل کرنے کے لئے اور بہت سی دلیلیں ختم کر چکتا ہے تو آخر میں وہ ایک روشن مثال پیش کر کے ان کو خاموش کر دیتا ہے۔ وہ بڑے اعتماد سے پوچھتا ہے کہ "کیا ہندوستانیوں کو بھی جو کالے ہیں تم حقیر سمجھتے ہو؟ وہ ہندوستانی جنہوں نے سب سے پہلے بنی نوع انسان کو علم و معرفت کا سبق پڑھایا، جنہوں نے غور و فکر کے راستے کھولے اور سب سے پہلے سائنس کی تحقیق کی؟"

اس نے ہندوستانیوں اور ان کے کارناموں کو گوری قوموں کے مقابلہ میں بطور سند پیش کیا ہے اور اپنی دلیل میں وزن اور پختگی پیدا کی ہے، اس نے سب سے پہلے تمام اقوام کا ایک گہرا جائزہ لیا ہے، اس کے بعد ہندوستانیوں کی علمی، تہذیبی اور تمدنی خدمات کو بہت خوبی سے ایک جگہ جمع کیا ہے وہ کہتا ہے: "علم نجوم اور ریاضی کو ایجاد کرنے کا شرف ہندوستانیوں کو حاصل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دواؤں کے ایجاد کرنے اور فن طب کے اسرار کا پتہ چلانے میں بھی ساری دنیا سے سبقت لے گئے ہیں، ان کو ایسی دوائیں معلوم ہیں جو بہت خطرناک امراض میں مفید اور تیر بہدف ثابت ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں ایک زمانہ سے ایک مخصوص ہندوستانی رسم خط رائج ہے، انھوں نے اپنے مخصوص فنون مثلاً سنگ تراشی، بت گری، اور تعمیرات کو انتہائے کمال تک پہنچا دیا ہے اسی طرح جیسے کھیل کے ایجاد کرنے کا سہرہ ہندوستانیوں ہی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ ان کو

کو دوسرے ورزشی اور تفریحی کھیلوں کے ایجاد کرنے کا بھی فخر حاصل ہے جن سے ذہن، دماغ اور جسم کی اچھی تربیت ہوتی ہے وہ عمدہ قسم کی تلوار بناتے اور تیغ زنی کے سب داؤں جانتے ہیں وہ لوگ ایسے منتر بھی جانتے ہیں۔ جن سے زہر اور جسمانی درد اور تکلیف رفع ہو جاتی ہے"

جاحظ نے ہندوستانی موسیقی کی بھی بڑی تعریف کی ہے "ان کی موسیقی بہت دلکش ہے، ان کے یہاں ایک ساز ہوتا ہے جو ایک زخمہ کے ذریعے بجایا جاتا ہے۔ یہ زخمہ اس باجے کے تار پر وہی کام کرتا ہے جو مضراب بربط میں کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ جھانجھ بھی استعمال کرتے ہیں"

"ہندوستانیوں کے یہاں ناچنے اور تال سُر پر حرکت کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ ان کو لونڈی لونڈیوں کی قیمت لگانے کا بھی بڑا ملکہ ہے، وہ جادو کرنا جانتے ہیں اور بخورات جلانے کے طریقوں سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان کے یہاں ایک ایسا عام رسم الخط ہے جو مختلف زبانوں میں استعمال ہو سکتا ہے اس کے علاوہ ملک میں دوسرے بہت سے رسم الخط رائج ہیں۔ ان کا سرمایہ شعر و شاعری بھی بہت وافر اور قیمتی ہے۔ ان کا طرز خطاب مکمل اور مؤثر ہے، وہ علم و ادب اور فلسفہ کے مالک ہیں"

"کلیلہ و دمنہ" جیسی شہرہ آفاق کتاب ہم نے ہندوستانیوں ہی سے حاصل کی۔ ہندوستانی بہت دانش مند اور بہادر لوگ ہیں۔ قدرت نے جو خوبیاں ان کو عطا کی ہیں اور جو عظیم الشان کارنامے انھوں نے کر دکھائے ہیں۔ ان سے چینی محروم ہیں"

"ان کی عادتیں اور سبھاؤ بھی بہت دلکش ہیں:-

مثال کے طور پر ان کے یہاں مسواک کرنے، دانتوں کی صفائی، بالوں کے سنوارنے اور خضاب کے استعمال کرنے کے بہت خوشنما طریقے رائج ہیں، ان میں حسن و زیبائی و نرمی، سلامت روی اعتدال پسندی اور خوشبو ہوتی ہے، ان کی عورتیں ساری دنیا میں نمونے کی عورتیں سمجھی جاتی ہیں"

"عود جو بادشاہوں کے لئے ایک موزوں تحفہ ہے ہندوستان ہی سے آتا ہے۔ غور و فکر اور گیان دھیان کے طریقے سب سے پہلے انھیں لوگوں نے ایجاد کئے۔ ایسے تمام منتر اور جادو جن کے عمل سے زہر کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان ہی سے سارے عالم میں پھیلے، علم ہئیت کا سب سے پہلے ہندوستانیوں ہی

نے انکشاف کیا اور پھر پوری دنیا کو سکھایا؟

سعید قرطبہ کا رہنے والا تھا اور اس نے اقوام عالم کی تہذیب و تمدن پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں اس نے دنیا کی تہذیب و تمدن بنانے اور اس کے سنوارنے میں ہندوستانیوں کا جو حصہ ہے اس کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور ان کے کارناموں کو بہت سراہا ہے۔

اسپین کے اس عالم نے دنیا کی سب مختلف قوموں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ قومیں جنھوں نے علم و معرفت اور فنون کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اور دوسری وہ جن کا علوم و فنون غور و فکر کی فلسفہ کی تحقیق و کاوش میں کوئی نمایاں حصہ نہیں۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کو مذکورہ قسموں میں سے پہلی قسم میں شمار کیا ہے، اور علم و فن کی تحقیق اور کھوج لگانے میں دنیا کی سب قوموں سے افضل و برتر مانا ہے۔

سعید کے خیال میں ہندوستانیوں کی ذہنی برتری اور دماغی تفوق، علوم و فنون کی گراں بہا خدمت کے انجام دینے اور دنیائے علم و معرفت اور گیان دھیان میں بیش بہا کارنامے پیش کرنے میں ملک کی مخصوص جغرافیائی حالت کا بہت دخل ہے۔ ہندوستان کی جائے وقوع ایسی سرزمین پر ہے جہاں نہ بہت سخت گرمی ہوتی ہے۔ نہ بہت سخت سردی۔ جن ممالک میں سردی بہت سخت ہوتی ہے وہاں کے باشندوں کے ذہنی قویٰ سرد، جسم موٹے اور بھدے، دماغ کند اور نازک خیالی اور دقیقہ سنجی ناپید ہوتی ہے۔ اسی طرح گرم ممالک میں بسنے والی قوموں میں غصہ، شعلہ مزاجی اور طبیعت میں جھگڑالوپن ہوتا ہے۔

لیکن ہندوستانیوں کا شمار خدا کی ان محبوب اور منتخب قوموں میں ہے جنھوں نے اپنے آپ کو علم و وجدان، فلسفہ و سائنس کی تحقیق و تفتیش اور اس کو ترقی دینے میں وقف کر دیا۔ چینیوں کو صنعت و حرفت اور آرٹ میں امتیاز حاصل ہے، اسی طرح ترک بہادری اور شجاعت میں مشہور ہیں۔ لیکن یہ سب گھٹیا قسم کے کام اور کم درجہ کے ہنر ہیں۔ اس قسم کے کام تو جانور بھی انسانوں سے اچھے کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس کی روشن مثال مکڑی کا جالا اور

یئے کا گھونسلا ہے جس کا مقابلہ چینی دستکاری نہیں کرسکتی، اسی طرح تیر کی بہادری اور اس کی طاقت سے ترکوں کی چال بازی اور بہادری کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ لیکن اس قوم کا حریف اور مدمقابل کون ہوسکتا ہے جس نے سب سے اعلیٰ اور برتر علوم یعنی سائنس و حکمت کی بنیاد رکھی اور ساری دنیا میں اس کو پھیلایا۔

پچھلے لوگوں کو اعتراف ہے کہ ہندوستان عقل و دانش، اعتدال پسندی اور حق و صداقت کا سرچشمہ ہے، اور یہاں کے باشندے ثابت قدم، مستقل مزاج، عقل مند اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔ اور اپنے عظیم الشان کارناموں کی وجہ سے دنیا کی سب قوموں میں مشہور ہیں۔

گو رنگت کے اعتبار سے یہ لوگ کالے ہوتے ہیں۔ لیکن خدا نے ان کو کالی قوموں کے عیبوں سے پاک رکھا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسری گوری اور کالی قوموں کے مقابلہ میں ان کو بلندی اور برتری عطا کی ہے۔

اس مصنف کے خیال میں جغرافیائی حالت اور ستاروں کی گردش ہندوستانیوں کے لئے کچھ ایسی سازگار رہی ہے کہ ان میں بہت سی عجیب اور عظیم الشان صلاحیتیں پیدا ہوگئیں ہیں۔ اس کے نزدیک ہندوستانیوں کی طبیعت پر زحل اور عطارد کا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ سیارہ زحل نے ان کے ذہن میں ذکاوت و تیزی، علم و معرفت میں گہرائی، اور دماغی صلاحیتوں میں پاکیزگی و شائستگی پیدا کی ہے۔ اور عطارد نے ان کو وضاحت فکر عطا کی ہے۔

اس کے علاوہ ان مصنفوں نے بھی جن کا میلان عربوں کی برتری اور فوقیت ثابت کرنے کی طرف رہا ہے، ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مسعودی نے حبشیوں کی دس خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے حبشیوں کی خوب خبر لی ہے۔ اور اپنی تائید میں مشہور حکیم یعقوب بن اسحاق کندی کا خیال پیش کیا ہے کہ کس طرح گرد و پیش کے ماحول اور آسمانی سیاروں کے برے اثرات حبشیوں پر پڑے ہیں، اسی سلسلے میں اس نے ایک مشہور عالم کا حوالہ دیا ہے کہ حبشی کے ہاتھ کے ذبح کئے ہوئے جانور کے گوشت کو بالکل نہیں چھوتے تھے۔ اسی طرح اسلام کے مشہور خلیفہ الراضی باللہ کی عادت لکھی ہے کہ وہ ایسے دسترخوان

کہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاتا تھا جس کو کسی سیاہ رنگ کے غلام نے لگایا ہوا۔

کالی قوموں کے خلاف اس نفرت اور حقارت کے اظہار کے باوجود مسعودی یہ کہتا ہے کہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن چمکتی دکھائی دیتی ہے اور وہ ہندوستان کی تہذیب وتمدن ہے۔

اس کے الفاظ ہیں کہ "کالی نسل کے لوگوں میں ہندوستانی فہم وفراست، صنعت وحرفت ضابطہ وقانون۔ فلسفہ وحکمت اور سلامت طبع کے اعتبار سے بالکل مختلف اور سب سے ممتاز ہیں۔"

ہند کی برتری کا اعتراف صرف گوری قوموں کے مقابلہ میں ہی نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور سب قوموں کے مقابلہ میں بھی کیا گیا ہے۔

ہند اور چین دونوں ایک عرصہ سے قدامت کے طلسمی کہر میں لپٹے رہے ہیں، اور دونوں بندرگاہیں جہاں تجارت کا بازار گرم تھا، عرب سوداگروں اور سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہیں، یہ سیاح اور تاجر چین کے آباد شہروں کو اور ان کی صناعی اور ہنرمندی کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے علوم وفنون نے ان کو زیادہ متحیر کیا۔

مذکورہ بالا دونوں ملک مشرق میں عرب تاجروں کے تجارتی مرکز تھے۔ اس لئے عرب سیاحوں کو دونوں قوموں کے تقابلی مطالعہ کا خوب موقع ملا۔

"ہندوستان کو اس کا فخر اور امتیاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس علم وحکمت کا انکشاف کیا، عرب سیاحوں نے چینیوں کے حوالے سے یہ بات بیان کی ہے کہ ان کا مذہب اور سائنس ہندوستانیوں سے ماخوذ ہے۔"

"چینیوں کے یہاں علوم طبیعی کا وجود نہیں ہے، ان کا مذہب اور ان کے اکثر قوانین ہندوستانیوں سے لئے گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مورتی پوجا انھیں ہندوستانیوں نے سکھائی۔ اور ہندوستانی قوم بڑی مذہبی قوم ہے۔"

عرب سیاحوں کے خیال میں ہندوستانی دوا وعلاج اور علم ہئیت میں بہت ترقی یافتہ تھے۔

ہندوستان کے مقابلہ میں چینیوں کا علم نامکمل اور ابتدائی حالت میں تھا۔

علم طب اور فلسفہ کا ہندوستانیوں میں بہت رواج تھا۔ چینیوں کو تھوڑا بہت خارجی علاج کا گر معلوم تھا لیکن وہ صرف گرم لوہے سے داغنے تک محدود تھا، علم ہیئت سے بھی وہ تھوڑے بہت واقف تھے لیکن اس فن میں ہندوستانی ان سے بہت آگے تھے۔

" ہندوستانی جسمانی صفائی اور حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی میں بہت مشہور اور اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے سب قوموں میں ممتاز تھے" ہندوستانی کھانے سے پہلے صرف ہاتھ منہ دھونے پر بس نہیں کرتے بلکہ پورے جسم کا غسل کیا کرتے ہیں۔ وہ چینیوں کی طرح صرف کاغذ سے پونچھ لینا کافی نہیں سمجھتے ہیں۔

بزرگ بن شہریار کو یہ بات سن کر بہت تعجب ہوا کہ ہندوستانی صفائی کے معاملہ میں اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ تالاب میں نہاتے وقت صرف اس وجہ سے اس کے اندر کلی نہیں کرتے کہ تالاب کا پانی کلی سے ناپاک ہو جائے گا۔

دوسری قومیں ہندوستان کو ہمیشہ سے نوادر اور قیمتی اشیاء کا خزانہ، عجوبہ روزگار اور پراسرار ملک سمجھتی رہی ہیں۔ بزرگ بن شہریار جس نے اس ملک کے حالات لکھے ہیں، اپنی کتاب کو اس طرح شروع کرتا ہے۔

" خدا نے روئے زمین پر دس عجائبات پیدا کئے ہیں، جن میں سے نو مشرق کے حصے میں آئے ہیں، اور ایک بقیہ دنیا کے حصے میں مشرق کو جو عجائبات ملے ہیں ان میں سے آٹھ صرف ہند اور چین کے حصے میں آ گئے۔

بزرگ بن شہریار کے استعجاب میں انسانیت کے ساتھ ایک تاجر کی وسیع اور گہری دلچسپی بھی تھی۔ لیکن ان مغربی سرمایہ داروں کی دلچسپی نہیں جو روپیہ پیسہ کی پوجا کرتے ہیں اور جن کی فطرت میں افادیت اس قدر رچی بسی ہوئی ہے کہ اگر وہ میلو کے وینس کے مجسمہ کو بھی دیکھیں تو یہ سوچیں گے۔ آیا اس کے بازو میں اتنی طاقت ہے کہ اس سے موسل کا کام لیا جا سکے۔

اسلام کے روائتی لٹریچر میں ہندوستانیوں نے اتنی اہم حیثیت حاصل کرلی تھی کہ اس کے

متعلق اس قسم کے عجیب وغریب خیالات بعد میں بھی خلط نمایاں رہے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ
خود آں حضرت صلعم نے اپنے اقوال میں ہند کا بار بار ذکر کیا ہے ان کے بعد ان کے خلفاء
نے بھی اسے یاد رکھا، اور جو لوگ ان کے جانشین ہوئے وہ بھی اس بھولے ہوئے گلنے کے
سپ کے بند کو مزے لے لے کر الاپا کرتے تھے۔

عرب حقیقت پسند تھے انھوں نے ہندوستان کے متعلق جو عجیب وغریب خیالات قائم
کئے تھے وہ محض واہمہ پر مبنی نہ تھے بلکہ انھوں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پرکھا تھا
ہندوستان کی یہ خصوصیت تھی کہ یہاں جس خیال اور مقصد کے لوگ مثلاً تاجر، سائنس داں،
جغرافیہ داں، اور مذہبی طلبا آئے ان سب کو اپنے مفید مطلب اور اپنے موضوع سے متعلق مختلف
قسم کے مواد مل جاتے اور وہ اپنا اطمینان کر لیتے، چنانچہ جغرافیہ دانوں اور ابن حوقل جیسے
نقشہ نویسوں کے لئے ہندوستان کی ارضی ساخت، اس کے دربار، اور یہاں کے پہاڑوں
کی بناوٹ کا مطالبہ خاصا دلچسپ اور معلومات افزا تھا۔ اور بغداد کے مسعودی جیسے فلسفی
اور مورخ کے لئے جو علم کی تلاش میں نہائی صدی تک سفر کرتا رہا، ہندوستان فلسفہ و
حکمت اور غور وفکر کا سرچشمہ، اور انسانی تہذیب وتمدن اور کلچر کے دائمی اصولوں کا
گہوارہ تھا۔
(ترجمہ)

غزل

جناب غلام ربانی تاباں

تمام عمر کٹی ایک بے نوا کی طرح
چمن میں خاک اڑاتے پھرے صبا کی طرح

چراغ حسرتِ پابوس کا جلائے ہوئے
تمہاری راہ میں ہم بھی ہیں نقشِ پا کی طرح

دلوں کا درد کبھی لب پہ آ ہی جاتا ہے
کسی پکار کی صورت کسی صدا کی طرح

نشانِ راہ نہ پایا تو دشتِ غربت میں
ہم اپنی راہ بناتے چلے ہوا کی طرح

غمِ شکست نے ہر ہر قدم پہ ساتھ دیا
کسی رفیق کسی دردِ آشنا کی طرح

الٰہی غم کی ہوائیں کسی کے دامن تک
پہنچ نہ پائیں مرے دستِ نارسا کی طرح

خوشی کا نام تو اکثر سنا کئے تاباں
مگر وجود نہ پایا کہیں ہما کی طرح

قدیم اُردو صحافت کا جائزہ

مرتبہ : عابد رضا بیدار

(۱)

ظفر علی خاں کے دکن ریویو کے جنوری۔فروری ۱۹۰۷ء کے شمارے میں فرضی نام سے میسر محفوظ علی کا ایک مضمون نکلا تھا " اردو ماہواری رسائل پر ایک نظر " خاصا طویل مضمون ہے اور رسالے کے اکتیس صفحوں میں آیا ہے - ۱۹۰۷ء سے پہلے کے جاری ہونے والے رسالوں پر ایک اہم دستاویز ہے (یہ مضمون پاکستان کی انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ " مضامین محفوظ علی " میں بھی شامل ہے) مضمون نگار نے رسالوں کو موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کر دیا ہے - چند رسالوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کے نام اور ان کے بارے میں ضروری معلومات اس طرح ہیں :

رسالے جن کا موضوع **مذہب یا مذہبی مناظرہ ہے :**

(۱) ضیاء الاسلام ، ایڈیٹر محمد فضل حسین بسمل ، مراد آباد -

" اس پرچے کے مقاصد ، اسلام کی برکات اور خوبیوں کا اظہار ، دیگر مذاہب پر اس کی فضیلت ثابت کرنا ، سائنس اور فلسفہ کے حملوں سے اسلام کو بچانا ، اور الزامات کے گرد و غبار کو اسلام کے منور چہرے سے بدلائل عقلی و نقلی نہایت متانت سے دور کرنا - مشاہیر اسلام کی سوانح عمریاں اور نتیجہ خیز قصص ، علمی ، تاریخی ، تمدنی ، معاشرتی اور صنعت و حرفت کے متعلق نتیجہ خیز مضامین ، اسلامی معلومات و خبریں وغیرہ ضروری نوٹس "

(۲) انوار الاسلام ، سیالکوٹ ، مہینے میں دو بار -

" اس نے اپنا مقصد مخالفین اسلام کے اعتراض کا رد قرار دیا ہے "

(۳) تجلی لاہور: "پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کے رسالہ ترقی کا مذہبی حصہ ہے"

پالٹکس:

(۴) بھارت ماتا، لاہور۔ (پہلا نمبر: جنوری ۱۹۰۷ء)

سوشل اصلاح

۵) ٹمپرنس گائیڈ، امرت سر

مختلف قوموں اور جماعتوں کے پرچے

(۶) قریشی میگزین، امرت سر (نمبر۶ جنوری ۱۹۰۷ء)

(۷) کشمیری میگزین، لاہور، ایڈیٹر محمدالدین فوق

(۸) کشمیر درپن، الہ آباد۔ ایڈیٹر پنڈت تیج بہادر سپرو۔

(۹) دیش ہتکاری، میرٹھ۔

(۱۰) ہمدرد قوم، میرٹھ۔

(۱۱) اصلاح، کھجوہ (ضلع سہارن پور)

(۱۲) شیعہ، بازار بنڈی (ضلع سہارن)

علم و حکمت

(۱۳) الندوہ، لکھنؤ (۱۴) المشرق، ڈھاکہ (۱۵) الکمال، جے پور (۱۶) الرفیق، رنگون (۱۷) الاخلاق، آگرہ (۱۸) ترقی، لاہور (پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، ۵ سال سے جاری) (۱۹) خاتون، علی گڑھ (۲۰) آفتاب، جھالرا پاٹن (۲۱) نشتر، لاہور (۲۲) ید بیضا، سکندر آباد (ضلع بلند شہر) (۲۳) دبدبۂ آصفی، حیدرآباد (۲۴) صحیفہ، حیدرآباد (۲۵) سائنس و تعلیم، لاہور (۲۶) رہنمائے تعلیم، لاہور (۲۷) منروا، امرت سر۔ ایڈیٹر غلام قادر فرخ، (۲۸) دلچسپ، امرت سر (۲۹) حکمت، لاہور (ابھی حال ہی میں نکلا ہے) (۳۰) دارالشفا، الہ آباد (عرصے سے نکل رہا ہے)

(۲)

دکن ریویو ہی کے ۱۹۰۸ء کے فروری۔ مارچ نمبر میں اس عرصے میں جن مزید ماہناموں کا اضافہ ہوا تھا ان کا ریویو نکلا۔ یعنی یہ پرچے ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء کے آغاز میں نکلے :۔

(۱) شمس بنگالہ، کلکتہ۔ ایڈیٹر بدرالزماں (۲) زبان، دہلی۔ ایڈیٹر مائل دہلوی (پہلا نمبر جنوری ۱۹۰۸ء تصویر حسن نظامی۔ (۳) مرقع قادیانی، امرت سر۔ ایڈیٹر ثناءاللہ امرت سری۔ (۴) الشیا۔ ایڈیٹر حکیم فیروز الدین امرتسری (پانچ نمبر نکل چکے ہیں) (۵) المجدد، لاہور۔ ایڈیٹر تاج الدین احمد مجددی نقشبندی (پہلا نمبر جنوری ۱۹۰۸ء) (۶) آزاد، لاہور۔ ایڈیٹر شبن سہائے آزاد۔

(۳)

'زاویہ نشین'، کے قلم سے زمانہ اکتوبر، نومبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں ایک طویل مضمون کے متعلقہ اقتباسات :۔

"۔۔۔۔ یورپ اور امریکہ میں بہت سے اخبار ہیں جن کی روزانہ اشاعت بیس بیس لاکھ ہے ہندوستان میں کسی ایک روزنامہ اخبار کی اشاعت بیس ہزار نہیں ہے۔ اردو کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کے بیشتر حصہ میں بولی جاتی ہے۔ لیکن اُردو اخبارات میں روزنامہ اخبارات تو درکنار ہفتہ وار اخباروں میں بھی "ہندوستان" لاہور کے سوا کوئی اخبار پندرہ ہزار سے زیادہ اشاعت کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ سوال ہو سکتا ہے کہ اردو اخبار کی اس پست حالت کا ذمہ دار کون ہے؟ ۔۔۔۔۔ اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اردو دان سوسائٹی نے ابھی اتنی ترقی ہی نہیں کی کہ اس کو اخبارات کی ضرورت محسوس ہو اور اہل دماغ اس فن کی طرف اپنا خیال مائل کریں۔"

فن اخبار نویسی کا تکملہ صرف ایک باقاعدہ تعلیم اور تربیت سے ممکن ہے لیکن ہندوستان میں اخبار نویسی گداگری کا ایک آلہ ہے جس سے لوگ صرف اپنا پیٹ پالنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ اردو اخبارات کی موجودہ پست حالت کے ذمہ دار وہ انگریزی داں حضرات بھی ہیں جو اردو زبان

کو کچھ سمجھتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ اردو زبان کی کتابیں یا اخبار پڑھنا انگریزی نہ جاننے کی دلیل ہے۔

بنگال میں اس وقت صدہا انگریزی اور بنگلہ زبان کے اخبار نکلتے ہیں لیکن جو اثر اور اشاعت بنگلہ زبان کے اخباروں کی ہے وہ انگریزی زبان کے اخباروں کی نہیں ہے۔ بنگال میں ہائی کورٹ کے جج اور کونسل کے ممبر بھی دو بنگلہ اخبار ضرور خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہاں اکثر انگریزی خواں حضرات کو جن کی دوسری زبان اردو ہے اردو سے ایک طرح کی چڑھ ہے اور اس کا مطالعہ کفر سمجھتے ہیں جب وہ اردو اخبارات کے مطالعہ میں اپنی کسر شان سمجھتے ہیں تو ان کو اس میں مضمون لکھنے کی کیونکر ترغیب ہو سکتی ہے۔ جب قوم کے وہ افراد جن کی دماغی قابلیت سے قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اردو زبان سے اس درجہ متنفر ہوں تو ان چند اردو اخبارات کے ایڈیٹر بھی تن تنہا کیا کر سکتے ہیں۔ جو ملک سے اخبار بینی کی بدمذاقی دور کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں.... لیکن اس موقع پر شکر گزاری کے ساتھ یہ امر بھی بیان کرنے کے قابل ہے کہ لاہور کے مخزن، کان پور کے زمانہ علی گڑھ کے اردوئے معلیٰ اور چند دوسرے ماہوار رسالوں نے اردو کی جانب انگریزی تعلیم یافتوں کی توجہ اور عملی ہمدردی حاصل کرنے میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی ہے....

اردو اخبارات کی پست حالت کا سبب وہ ذلیل رقابت بھی ہے جو ان میں شدت سے پائی جاتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت اخبار انڈیا کے مقدمہ سے مل سکتا ہے جس کے سلسلہ میں ہندوستان لاہور کا ایڈیٹر اس لئے پھنس گیا کہ بعض ناکام رقیبوں نے محض اس کی ترقی روکنے کے لئے صحیح یا غلط طور سے مخبری کی کہ اخبار انڈیا کا وہ پرچہ جس میں باغیانہ مضامین چھپے تھے ہندوستان پریس میں طبع ہوا تھا.....

ہندوستان میں اردو زبان کے روزانہ اخبار اودھ اخبار، اخبار عام اور پیسہ اخبار ہیں ان میں اودھ اخبار سب سے پرانا ہے۔ سابق کی بہ نسبت اس کی پالیسی نہایت آزاد ہے لیکن اب بھی اس میں اینگلو انڈین اخبارات کے تراجم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا پہلو دکھانے کے لئے دیسی زبان کے اخبارات کی رائیں بھی ترجمہ ہو کر شائع کی جاتی ہیں۔ اردو

روزانہ اخباروں میں شاید اودھ اخبار ہی ایک ایسا اخبار ہے جو فی الاصل اخبار کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اخبار کا جو مقصد ہے وہ اس سے ایک حد تک حاصل ہوتا ہے۔ اس میں اس امر کا انتظام ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے واقعات بالالتزام شائع کئے جاتے ہیں بلکہ ممالک غیر کے حالات و واقعات بھی بہت شرح و بسط کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔ جو اور اردو اخبارات میں نہیں ہوتے ہیں ..... اودھ اخبار میں ہندوستان کی کونسلوں کی تقریروں کا پورا پورا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ اور اخبارات میں یہ انتظام نہیں ہے ..... عموماً اودھ اخبار کے اڈیٹوریل مضامین حتیٰ کہ تراجم بھی اس قدر صاف اور سلجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں معلوم ہوتی ..... کیا بلحاظ مضامین اور کیا بلحاظ حجم اودھ اخبار اردو زبان کے اور اخباروں میں سر برآوردہ ہے۔

اودھ اخبار میں ایک خاص خوبی جس کا اور اخبار ابھی تک انتظام نہیں کر سکے" یہ ہے کہ اس میں ان بیش قیمت مضامین کے ترجمے بھی چھپتے رہتے ہیں جو ہندوستان کے ماہوار انگریزی رسائل میں نامی اہل ہند کے قلم سے شائع ہوتے ہیں۔ اس سلسلے نے اردو انشاء پردازوں کی تحریروں میں ایک نئی رُوح پھونک دی ہے .....

اخبار عام لاہور سے نکلتا ہے، علاوہ اس کے کہ اس کا حجم بہت چھوٹا ہے، زبان بھی شستہ نہیں ہے لیکن حجم و زبان کو قطع نظر کر کے مضامین پر غور کیا جائے تو ان میں سے اکثر بنگالی اخباروں کے چربے اور نقلیں ہوتی ہیں ...... اب تک اس کی پالیسی کسی قدر آزاد تھی لیکن جب سے گورنمنٹ نے اخباروں کے ساتھ سخت گیرانہ پالیسی برتنی شروع کی ہے، اخبار عام بھی اینگلو انڈین اخباروں سے اپنا سُر ملانے لگا ہے ......

تیسرا روزانہ اخبار پیسہ اخبار ہے۔ اس کو جاری ہوئے صرف چند سال ہوئے! اس کا غرور اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنے ناظرین کو ہمہ دانی سکھلانے کا دعویٰ کرتا ہے.....

اخبار عام جس طرح زیادہ تر بنگالی اخبارات کا تتبع کرتا ہے اسی طرح پیسہ اخبار، اینگلو انڈین اخبارات سے الہام حاصل کرتا ہے۔ اس کی پالیسی کا سمجھنا دشوار امر ہے۔ کبھی وہ سدیشی کی

طرفداری کرتا ہے، کبھی اس کے خلاف لکھا کرتا ہے۔ ایک جگہ وہ محترم بزرگ، دادا بھائی نوروجی کا مداح ہے، دوسری جگہ لکھتا ہے کہ کانگریسی مسلمانوں کے دشمن ہیں، طرہ یہ کہ خود ایڈیٹر پیسہ اخبار کانگرسی بیان کئے جاتے ہیں ....

پیسہ اخبار کے مضامین پر رائے زنی بیکار ہے۔ مجھے ان میں کوئی جدت نہیں معلوم ہوئی۔ اس اخبار کا ایک بڑا حصہ مذہبی مباحثوں کے لئے وقف ہے لیکن پیسہ اخبار کا مذاق سلیم ظاہر کرنے کے لئے وہ شعر کافی ہے جو اس نے اپنی کسی پیشین گوئی راست آنے پر لکھا تھا اور وہ یہ تھا:

نصیحت گوش کن جاناں کہ زجاں دوست تر دارند
جوانان سعادت مند پند پیر دانا را

پیسہ اخبار کی خصوصیات میں ایک روزانہ کارٹون ہے جو وہ عموماً ہندی پنچ یا ولائتی تصویر دار رسالوں سے لیتا ہے۔ یہ انتظام اور اخباروں میں نہیں ہے .... وہ باموقع تصویریں اور اہلِ تصویر کے حالات پہلے سے جمع رکھتا ہے ..... پیسہ اخبار میں علاوہ ایڈیٹوریل کے ایک عنوان ہے مضمون خاص، سمجھ میں نہیں آیا کہ ایڈیٹوریل میں اور مضمون خاص میں کیا فرق ہے لیکن اس عنوان کے ذیل میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان میں مراسلات حتیٰ کہ منقولات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مضمون خاص کے ذیل میں بہت سے مضامین کیوں چھاپتا ہے۔

ہفتہ وار اخباروں میں کئی قسم کے اخبار ہیں مگر زیادہ تر وہ ہیں جن میں پالٹکس تمدن مذہب اور سب چیزیں ملی جلی ہیں۔ لیکن بعض اخبار اپنے آپ کو قومی اخباروں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اگرچہ لفظ قومی کا اطلاق نہایت وسیع ہے مگر اس قسم کے اخباروں میں حد درجہ کا متعصب پایا جاتا ہے۔ ان کا زیادہ تر مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں نفاق ہو اور ان کے خریدار جوش مذہب میں آکر ان کی جیب بھریں ....

اگرچہ آریہ اخبار نے اپنے صفحات مسلمانوں کے متبرک صحائف کی تردید کے لئے وقف کر دیئے ہیں لیکن شاذ و نادر کوئی اخبار کسی پولیٹیکل بنا پر اپنے حریف کو زک پہنچانے کی کوشش کرنا پسند

کرتاہے ..... بعض اخبارات ہندوستان کے لئے آزادی کے خواہاں نہیں ہیں لیکن مصر میں قومیت پھیلانے کے خیال کے طرفدار ہیں۔ انھیں مصطفے کامل پاشا کے خیالات سے ہمدردی ہے لیکن وہ مسٹر گوکھلے کو ناپسند کرتے ہیں جو ہندوستانیوں کے لئے آزادی چاہتے ہیں۔ اس طرح حال میں شیعہ اور سنیوں کے بعض فریقی اخبار شائع ہونے لگے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ کر اپنے اپنے خریداروں کا حلقہ وسیع کریں۔

یہ سب باتیں اخبارات کی پستی اور اردو جاننے والوں کی بدمذاقی کی علامتیں ہیں۔

ہفتہ وار اخباروں میں چند اخبار قابل ذکر ہیں۔ سب سے پہلے ہندوستانی نے ایک قلیل قیمت میں مفید پولیٹیکل آگاہی کا ایک معقول ذخیرہ بہم پہنچانے کا بندوبست کیا۔ ہندوستانی میں زیادہ تر ایڈووکیٹ کے ترجمے ہوتے ہیں لیکن دونوں کا ایڈیٹر ایک ہے۔ ہندوستان بنگالی اخباروں کے ڈھنگ پر چلتا ہے مگر اس کی ایک خاص پالیسی ہے جس کو وہ بہت خوبی سے نباہتا ہے ہندوستان، لاہور کی اشاعت سے اس کا ہر دلعزیز ہونا ثابت ہوتا ہے...

زاویہ نشین

زمانہ اکتوبر و نومبر ۱۹۰۷ء

یہ دو مضمون ہیں پہلے کے مصنف نیر تھ رام ہیں، مشہور ناول نگار تیرتھ رام فیروزپوری اور دوسرے پر اڈیٹر، ادیب کا نام درج ہے۔ اتفاق سے جس پرچہ میں یہ مضمون چھپا اسی سے اڈیٹر حسین عظیم آبادی کا نام آنے لگا۔ لیکن چونکہ پیارے لال شاکر، جو اس سے پہلے اسے ترتیب دیتے رہے تھے اس کے مالک بھی تھے اس لئے قیاس ہے کہ یہ مضمون بھی شاکر ہی کا ہوگا۔

(۴)

" .... پہلا روزنامہ انگریزی اخبار جو ہندوستان میں شائع ہوا وہ "ہرکورہ" (ہرکارہ) تھا جو ۲۷ر اپریل ۱۸۰۹ء کو ..... چھپنا شروع ہوا اور جس کا مقام اشاعت کلکتہ تھا یکم جنوری ۱۸۳۴ء کے بعد اُسے انڈین ڈیلی نیوز میں ملا دیا گیا ..... یکم اکتوبر ۱۸۳۴ء کو اس میں انڈیا گزٹ اور بنگال کوریر کو (بھی) ملادیا گیا .....

ذیل کی فہرست سے ان اخبارات کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے جو ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے شائع ہوتے تھے۔

نام صوبجات	انگریزی اخبارات کی تعداد	ورنیکلر اخبارات کی تعداد	انگریزی اور ورنیکلر (دونوں زبانوں میں)
بمبئی	۳۵	۶۲	۲۱
مدراس	۳۶	۲۳	۲۵
بنگال	۳۵	۵۹	۵
صوبہ مغربی و شمالی	۹	۵۹	۵
پنجاب	۱۰	۳۰	۱
اودھ	۴	۷	۸
صوبجات متوسط	۳	۴	۲
برہما	۱۴	۵	۰
سندھ	۹	۳	۱
راجپوتانہ	۰	۲	۴
میزان	۱۵۵	۲۵۴	۷۲

ہندوستان میں آج کل اخبارات کی جو حالت ہے وہ اخبار سرمۂ روزگار بابتہ ۲۴ فروری ۱۹۱۰ء کے اقتباس ذیل سے معلوم ہو سکتی ہے:

"تمام ہندوستان میں ۲۵۷۱، چھاپہ خانے ہیں جن میں ہر قسم کی کتابیں چھپتی ہیں۔ گزشتہ دس سال کے اندر ۲۵ فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اخباروں کی تعداد ۷۳۵ ہے ان میں بھی تقریباً دس فیصدی اضافہ ہوا ہے۔ ۱۰۶۲ رسالے شائع ہوتے ہیں.... بمبئی میں سب سے زیادہ اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے بمبئی کے بعد دوسرا نمبر

پنجاب کا ہے"

یہ اعداد اخبار مذکور نے غالباً کسی معتبر انگریزی رپورٹ سے حاصل کئے ہوں گے اور اگر ایسا ہے تو یقیناً ان کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی اخبارات اور رسالوں نے کیا بلحاظ عمدگی مضامین اور کیا بلحاظ تعداد اشاعت بہت ترقی کر لی ہے۔ لیکن اگر ورنیکلر اخبارات بھی کوشش کریں تو اپنی حالت میں بہت کچھ اصلاح کر سکتے ہیں۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ سارے ہندوستان میں اردو زبان کے، جسے اکثر اس ملک کی لنگوا فرینکا کہا جاتا ہے، صرف ۶ روزانہ اخبار ہیں۔۔۔۔ ان ۶ اخباروں میں سے ۲ لاہور ایک لکھنؤ، ۲ بمبئی اور ایک حیدرآباد (دکن) سے نکلتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے ہندی میں جو اردو کی برابری کا دعویٰ رکھتی ہے۔ ایک بھی روزانہ اخبار موجود نہیں۔ گو اب سنا گیا ہے کہ صوبجات متحدہ کے ایک اخبار کو، جس کا نام عمداً درج نہیں کیا گیا، روزانہ کرنے کی تجویز ہو رہی ہے، ورنیکلر میں اگر کسی زبان کے عمدہ روزانہ پرچے نکل رہے ہیں تو وہ گجراتی ہے۔ اور گو کچھ عرصہ پہلے بنگالی کے چند روزنامہ اخبار نکلا کرتے تھے لیکن اب غالباً ہت بادی کے علاوہ اور کوئی معتبر پرچہ روزانہ نہیں چھپتا۔ مرہٹی زبان میں چند پرچے روزانہ نکلتے ہیں لیکن وہ ابھی عرصہ دراز میں بمبئی سماچار، جام جمشید اور سانجھ ورتمان ایسے گجراتی روزانہ اخباروں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ پنجاب کی تازہ ایڈمنسٹریشن رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل اس صوبے میں جس قدر اخبارات شائع ہوتے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۵۲ ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

انگریزی (۳۸) انگریزی فارسی اردو (۱) اردو (۱۸۲) اردو ہندی (۱) ہندی (۱۱) اردو گورمکھی (۱) گورمکھی (۱۸) اور ۱۹۰۸ء - ۱۹۰۹ء میں تین نئے انگریزی اور ۱۵ ورنیکلر اخبارات جاری ہوئے۔۔۔۔"

ادیب، ستمبر ۱۹۱۰ء ص ۱۲۰ تا ص ۱۲۶

"اخبار نویسی کی ابتدا"

(۵)

"..... اب سے پیشتر جس کو تقریباً پندرہ سال ہوئے ادیب کا ہمنام ایک رسالہ فیروز آباد سے شائع ہوا تھا جس کے کل بارہ پرچے نکلے تھے اور دوسرے سال بند ہو گیا (اس نام کے دو رسالے جاری ہوئے تھے ..... ایک تو حیدر آباد سے نکلتا تھا اور دوسرا غالباً ۱۸۹۸ء میں فیروز آباد سے جاری ہوا تھا جس کے اڈیٹر سید اکبر علی صاحب تھے ...... یوں تو ۱۸۸۷ء میں پہلے پہل رسالہ دل گداز مولانا عبدالحلیم شرر نے نکالا تھا اس لئے اولیت کا فخر ممدوح کو ہے. اور ادھر ریویو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ لیکن ہندوستان میں موجودہ طرز کے رسائل کا پیشرو ادیب ہی تھا۔ اس سے پہلے چند گلدستے بھی نکلتے تھے جن میں فقط شاعروں کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اس مذاق کا قدیم ترین رسالہ پیام یار ہے۔ سید اکبر علی صاحب کے رسالہ کی دیکھا دیکھی گلدستوں میں بھی نثر کے مضامین بطور ضمیمہ شائع ہونے لگے۔ ۱۹۰۱ء میں بالکل ادیب کے طرز پر لاہور سے مخزن جاری کیا گیا اور مشہور اہل قلم کی نگاہیں جو ادیب کو ڈھونڈھ رہی تھیں، یک بیک مخزن کی طرف اٹھ گئیں۔ رفتہ رفتہ ملک میں رسالوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی، پھر تو بیسیوں رسالے نکل پڑے۔ دکن ریویو، اردوئے معلی، العزیز، عالمگیر کمال دہلی، الحکم، فصیح الملک، صحیفہ، زمانہ، زبان، ادیب الاطفال، الناظر، المشرق، الشمس، کشمیری میگزین، تنویر المشرق، صلائے عام، یار شاطر، علی گڑھ منتھلی، خلاصہ عصمت، خاتون، الحجاب، معارف وغیرہ) حسن اتفاق سے اس کی پہلی اشاعت میں چوٹی کا مضمون عنوان بالا کا جزو اول تھا، یعنی اخبار کے معنی کیا ہیں۔ جہاں تک ہمیں خیال ہے اس بحث کا اصلی ماخذ زیادہ تر انسائیکلو پیڈیا کا وہ مضمون تھا جو نیوز پیپر کے تحت میں ہے .....

ہندوستان میں مطابع اس وقت قائم ہوئے جب کمپنی کی یہاں حکومت تھی۔ اس زمانہ میں ایک آدھ اخبار بھی نکلتا تھا لیکن اس کی کوئی ایسی وقعت نہ تھی۔

عہد لارڈ ولسلی سے کچھ پیشتر کلکتہ سے آٹھ یا اٹھ اخبارات نکلتے تھے۔ ان میں کر

کلکتہ گزٹ جو حقیقت میں بنگال گورنمنٹ کا اخبار تھا اب تک جاری ہے اگرچہ صورت و غرض میں تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ اخبار ہرکارو اور انڈین گزٹ دونوں کو ایک کر کے انڈین ڈیلی نیوز نام رکھ دیا گیا۔ جو اس وقت ہندوستان کے ممتاز اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بقیہ پانچ جو معدوم ہوگئے ان کے نام یہ تھے۔ دی کلکتہ کوریر، دی بنگال جرنل، دی ایشیاٹک مرر، دی ورلڈ، دی ٹیلیگراف۔ لارڈ ولسلی پہلے گورنر جنرل تھے جنہوں نے ۱۷۹۹ء میں قانونِ مطابع جاری کیا جس کا ایک دفعہ یہ تھا کہ باغی و سرکش اڈیٹر جلاوطن کر کے یورپ بھیج دئے جائیں گے۔ اسی زمانہ میں اس پر عمل بھی کیا گیا۔

۱۸۱۸ء میں مارکوئس آف ہیسٹنگز نے قانون مطابع کو منسوخ کر دیا اور اخبارات پھر جاری ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء میں ان کی تعداد گیارہ تک پہنچ گئی یعنی چھ یورپین اور پانچ دیسی اخبارات تھے ان میں سے تین روزانہ، ایک ہفتہ میں دوبار، اور دو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد سر چارلس مٹکاف کا زمانہ آیا۔ یہ بڑے علم دوست اور علم نواز حاکم تھے۔ چنانچہ کلکتہ کی امپیریل لائبریری (سابق مٹکاف ہال) ان ہی کی یادگار ہے......

آزادیٔ مطابع کا وہ مشہور قانون جس کا مسودہ مکالے جیسے مدبر زمانہ نے تیار کیا تھا خود چارلس مٹکاف نے ۱۸۳۵ء میں بحیثیت گورنر جنرل نافذ کر دیا..... ملک میں اس کے مفید نتائج نمایاں ہونے لگے۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء کی وہ بدنصیب گھڑی آ پہنچی اور جان و مال کی تباہی کے ساتھ علم و فن کی ترقی بھی ایک حد تک رک گئی۔ اسی سال لارڈ کیننگ نے قانون مطابع پھر جاری کر دیا جس سے اخبارات ایک حد تک پابند ہو گئے.....

۱۸۵۳ء میں جب زبان اردو، پر گارسن ڈی تاسی اپنی سالانہ تقریر کرنے لگا تو اس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں ۲۷، اخبارات جو قسم قسم کے ہیں اس وقت بزبان اردو شائع ہوتے ہیں اور ان کے مفصل حالات بھی بیان کئے تھے، پھر ۱۸۶۰ء میں دوبارہ اسی نے بیان کیا کہ اس تعداد میں ۱۷، اخبارات کا اور اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ ان کی اشاعت و ادبی مراتب نسبتاً کم ہیں۔ اس پر بھی ان میں سے ایک کی اشاعت چار ہزار پرچوں تک پہنچ گئی ہے۔"

.....۱۸۵۸ء میں اودھ اخبار شائع ہوا۔ جو اس وقت تک جاری ہے۔ ۱۸۶۶ء سے آخر تک سرسید کے مضامین، جو اخلاقی، تمدنی اور ملکی انشاپردازی کے بہترین نمونے ہیں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۸۷۶ء میں اودھ پنچ شائع ہونے لگا۔ ... پھر ۱۸۷۷ء میں ہندی کا قدیم تر اخبار بھارت متر نکلا جو اب تک جاری ہے، سرسید مرحوم نے ... رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جو غالباً سب سے پہلا رسالہ ہے۔ دوسرا اخبار اردو گائیڈ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ ... (اس کا) پایہ بھی کچھ کم نہیں۔ سرسید کی سلامت روی کی داد دینے والا، ان کی حمایت کرنے والا، اور ناصح مشفق کی طرح ان کی غلط روی سے ان کو متنبہ کر دینے والا انکا ہی معاصر تھا جس کے خلوص کا شکریہ خود سرسید نے جابجا ادا کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق رفتہ رفتہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل کر دیا گیا۔ رہا اردو گائیڈ، وہ اخبار دارالسلطنت کلکتہ کے ہاتھوں بکا..... ہم نہیں کہہ سکتے کہ انھیں دو اخبارات نے اخبار کا حق ادا کیا لیکن یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ اس زمانہ کی روش کے مطابق ان دونوں نے ملک و قوم کی ضرورتوں کا کچھ پرا اندازہ نہ کیا تھا

ان دونوں کے بعد ہندوستان میں اور زبانوں کے علاوہ اردو اخبارات کی بھی کثرت ہوگئی۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے اخبارات کی تعداد ۳۷۳ تھی جن میں ہر زبان کے اخبار شامل تھے .....“

(اخبار اور اخبار نگاری؛ از اڈیٹر” ادیب
ادیب، جنوری ۱۹۰۳ء صـ۴۳، صـ۴۵)

مہاوت

جناب ہنسراج رہبر

"دوسرے جو چاہیں کریں، میرے گھر کا یہ دستور نہیں ہے اور سن رکھو، میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔" بہل نے فیصلہ کن انداز میں کہا، اور عینک چڑھا کر خود لکھنا شروع کر دیا۔

لکشمی خاموش بیٹھی پتی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ بہل نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ خط لکھنے میں مصروف تھا اسے مکمل کر کے پتہ لکھا:۔ بمقام لدھیانہ ڈاک خانہ خاص ضلع خاص محلہ بیری والان میں پہنچ کر عزیز دیودت بہل کو ملے۔"

دیودت اس کا بڑا لڑکا تھا جو پہلی بیوی سے پیدا ہوا تھا، لدھیانہ میں اس کا ہوزری کا کاروبار تھا اور وہ اپنے کنبے کے ساتھ مدت سے وہیں رہتا تھا۔ خط وکتابت یا شادی غمی میں شرکت کے علاوہ بہل کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی بھی تھی وہ بھی اپنے گھربار اور بچوں میں خوش تھی۔ بہن بھائی میں کافی میل جول اور محبت تھی۔ ان کا رہن سہن باپ سے مختلف تھا۔

لکشمی دوسرے بیاہ کی بیوی تھی اور وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ یہ بچے بھی اب بچے نہیں تھے سب سے چھوٹی لڑکی ارملا نے چار سال ہوئے میٹرک پاس کیا تھا۔ منجھلی کی شادی ہو چکی تھی۔ ان دونوں سے بڑا دیو برت نام کا لڑکا تھا جس کی عمر اس وقت چھبیس ستائیس سال تھی۔ وہ ایک بسکٹ فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سو پونے دو سو تنخواہ ملتی تھی۔ سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینے پوری پوری تنخواہ باپ یا ماں کو لا کر تھما دیتا تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے کبھی چار پیسے کا پان بھی خرید کر نہیں کھایا۔ کبھی گھنٹہ، دو گھنٹے دیر سے آنا ہوتا تو گھر والوں کو

پہلے سے مطلع کرجاتا۔ اس کا باپ روپ چند بہل کنبے کا بزرگ اور سرپرست تھا۔ اسے ملازمت سے ریٹائر ہوئے چھ سات سال ہو چکے تھے مگر گھر میں اس کی حکمرانی تھی۔ شوہر جو بتاتا کرتا تھا لکشمی اسے قسمت کے لکھے کی طرح بے چوں چرا قبول کر لیتی تھی۔ شوہر اس کی کوئی بات لمنے نہ ملنے ضد، بحث یا تکرار کرنا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ آج وہ خاموش ضرور تھی مگر اس کی آنکھوں میں التجا تھی ــــ ایک ایسی التجا جسے ہم کسی بیکس کا اصرار بھی کہہ سکتے ہیں۔

بہل عینک صرف لکھنے پڑھنے وقت استعمال کرتا تھا اس لئے خط لکھنے کے بعد اس نے عینک اتار دی اور اسے خول میں بند کرکے حسب عادت سرہانے کے نیچے رکھ لیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ لکشمی اس کا فیصلہ سن کر بھی وہیں بیٹھی ہے وہ اٹھ کر گئی کیوں نہیں؟ وہ چند منٹ بیوی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا:۔

"یاد ہے، پچھلے سال جب محلے کی عورتیں گڑھ مکھیشور نہانے جارہی تھیں تو تم نے انھیں جواب دیا تھا کہ جب تک وہ ساتھ نہ ہوں میں نے آج تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اب بھی ان کے بغیر کہیں نہ جاؤں گی۔" بہل فخر سے مسکرایا لیکن بیوی کی آنکھوں میں جو التجا تھی اس نے ایک کربناک سوال کی صورت اختیار کر لی۔ اس لئے بہل نے مزید کہا: "تم میری عادت کو جانتی ہو۔ میرے مزاج کو سمجھتی ہو پھر بھی یہ امید کرتی ہو کہ میں جوان جہان لڑکی سے نوکری کراؤں گا"

"سوچ لو، کوئی ہرج تو ہے نہیں۔" بیوی نے کہا اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

بہل اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ لکشمی نے اپنی بات گو نہایت آہستہ سے کہی تھی مگر اس کے الفاظ کمرے میں گونج رہے تھے۔ بہل انھیں گونجتے ہوئے سن رہا تھا اور اس کے دل و دماغ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ لکشمی نے زندگی میں پہلی بار اصرار کیا تھا اور بہل اپنے آپ کو پہلی بار عاجز محسوس کر رہا تھا جیسے نوکری کی طرح گھر کی حکمرانی بھی اس کی گرفت سے نکل چکی ہو، دنیا میں اس کی کچھ بھی قدر و منزلت نہ رہی ہو۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا اور وہ جھلاکر بولا:۔

"ہرج کیوں نہیں؟ میں جو کہتا ہوں ہرج ہے، ہرج ہے، بہت ہرج ہے۔"

لیکن اس کی حالت اس مسافر جیسی تھی جو گاڑی نکل جانے سے جھلا اٹھا ہو اور پلیٹ فارم پر کھڑا دل کی جھوٹی تسلی کے لئے کہہ رہا ہو "کوئی ہرج نہیں، میں کل چلا جاؤں گا" بہل کو یہی تردید بالکل بے معنی معلوم ہو رہی تھی اور لکشمی کے الفاظ پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ فضا میں گونج رہے تھے اور گذشتہ دو تین سال کے واقعات سے ان کی تصدیق ہوتی تھی۔

مسئلہ تھا اُرملا کی شادی کا۔ بہل اپنی اس بیٹی کی شادی بھی اس طرح کر دینا چاہتا تھا جس طرح پہلی دو شادیاں کی تھیں۔ ویسے وہ دور اندیش تھا چنانچہ اس مقصد کے لئے پہلے ہی سے پانچ ہزار روپیہ فکسڈ ڈیپازٹ میں جمع کرا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ہزار دو ہزار اور بھی خرچ کرنے کو تیار تھا۔ مگر پچھلے دو تین سال کی دوڑ دھوپ نے ثابت کر دیا تھا کہ اتنے روپے میں اچھا بر ملنا ممکن نہیں ہے۔ جہاں بھی بات چلی وہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کچھ لوگ تو ایسے تھے جن سے برسوں پرانی جان پہچان تھی اور جن پر روپ چند بہل کو پورا بھروسہ تھا۔ مثلاً ایک صاحب ہیرا نند تھے انھوں نے اس تجویز پر بڑے تپاک سے کہا: "بھائی صاحب، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کی بیٹی میری بیٹی اور میرا لڑکا آپ کا عزیز ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں عورتوں سے صلاح مشورہ ضروری ہے۔ اس لئے بات پکی کرنے سے پہلے میں آپ کی بھابی سے پوچھ لینا ضروری سمجھتا ہوں یا پھر یوں کیجئے پرسوں شام کو غریب خانہ پر تشریف لے آیئے۔ میں بھی ہوں گا آپ کی بھابی بھی ہوں گی اور چائے پیتے وقت بات یوں چلایئے جیسے مجھ میں آپ میں اس سلسلہ کی کوئی گفتگو ہوئی ہی نہ ہو۔ آپ مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے اپنی بھابی سے کہیئے۔ ان کا رخ دیکھ کر میں بھی حامی بھر دوں گا۔"

بہل گیا، بات چیت چلی اور آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیوی کا تو محض بہانہ ہے دراصل ہیرا نند خود یہ رشتہ قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ بیٹے کے بیاہ سے انھوں نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ انہیں وہ پورا نہیں کر سکتا۔

"دیکھو، یہ حالت ہے۔" بہل نے گھر لوٹ کر بیوی سے شکایت کی: "کوئی کسی کا کیا

اعتبار کرے لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔"

"دنیا میں سب ہی طرح کے لوگ بستے ہیں گھبراؤ نہیں۔ لڑکا مل جائے گا۔ پہلے بھی تو شادیاں کی ہیں۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں"۔ بیوی نے تسلی دی۔

"کھانے کے وقت پانچوں برابر ہو جاتی ہیں۔" بہل طنزاً مسکرایا۔

کوشش اس کے بعد بھی جاری رہی لیکن بات نہیں بنی کبھی لڑکے میں نقص ہوتا اور کبھی لڑکے والے اعتراض کرتے کہ لڑکی کے نین نقش تو اچھے ہیں لیکن رنگ سانولا ہے اور کوئی کہتا کہ تعلیم تھوڑی ہے۔

آخر دیودت نے اپنی جان پہچان کا ایک لڑکا بتایا جس کا نام ہربنس تھا اور وہ بنک میں ملازم تھا۔ صحت اچھی تھی اور عمر بھی مناسب تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنی مرضی سے بیاہ کر سکتا تھا اور اسے جہیز دہیز کا بھی کوئی لالچ نہیں تھا۔

بہل اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ ہربنس کو گھر پر بلایا بیوی نے دیکھا، لڑکی نے دیکھا اور لڑکا سب کو پسند آیا۔ جہاں وہ روپ رنگ اور ڈیل ڈول میں موزوں تھا وہاں بات چیت بھی سمجھداری اور سلیقے سے کرتا تھا۔

جب اس کے سامنے بیاہ کی تجویز رکھی گئی تو اس نے نہایت حلیمی سے کہا: "میں نے دیودت کے پاس کام کیا ہے ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ آپ ان کے بزرگ ہیں تو میرے بھی بزرگ ہیں۔ میں آپ کی بات ٹال نہیں سکتا۔ مگر مجھے جو تنخواہ ملتی ہے ماں باپ کا گزارہ بھی اسی پر ہے۔ اس کے علاوہ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے اسے پڑھانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔ ان حالات میں میں اور کوئی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار نہیں ہوں۔" "تو کیا بیاہ نہیں کرو گے؟" بہل نے ہنس کر کہا۔

"ایسا تو خیر کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا: "سال دو سال انتظار ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جہاں دو ڈھائی سو میں کماتا ہوں سو ڈیڑھ سو لڑکی بھی کمائے ورنہ آپ جانتے ہیں مہنگائی کے اس زمانہ میں گرہستی چلانا آسان نہیں ہے۔"

بہل کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسے بے حد افسوس ہوا لیکن جواب کیا دے۔ حقیقت کو منطق سے کیسے جھٹلائے؟

"آپ میرے بزرگ ہیں۔ میرا آپ کو کوئی صلاح دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔" ہرنس نے پھر کہا۔ "لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کو ٹیچرز ٹریننگ سکول میں داخل کرا دیں۔ آپ نے بیاہ کے لئے جو روپیہ رکھ چھوڑا ہے اس میں سے خرچ کریں۔ بعد میں آپ کو بر کا ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ اور اس میں خود لڑکی کی بھلائی ہے۔"

ہرنس کی صاف گوئی نے بہل سے زیادہ لکشمی کو متاثر کیا اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ اختیار اور دانشمندی کا زعم مرد میں ضد اور ہٹ دھرمی پیدا کرتا ہے اس کے برعکس عورت اپنے جائز حقوق سے بھی محروم ہے وہ زندگی کو جنم دیتی ہے اس کی نشوونما کے لئے ہر طرح کا ایثار کرتی ہے اور ارتقا پذیر قدروں کو غیر شعوری طور پر ہی مرد کی بہ نسبت جلد قبول کر لیتی ہے۔ چنانچہ جب ہرنس چلا گیا تو لکشمی بولی:۔

"بات تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں چوپڑہ جی کی مثال لے لو۔ ان کی پشپا ہماری ارملا سے سال ڈیڑھ سال چھوٹی ہے اس کے لئے وہ کتنے فکرمند تھے پر جب سے ٹائپ سیکھ لیا ہے اور دفتر جانے لگی ہے ماں باپ بھی خوش ہیں اور لڑکی بھی خوش ہے اب انھیں بیاہ کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔"

جولا وا بہل کے اندر کھول رہا تھا بیوی کی بات سن کر باہر نکل پڑا اور وہ چلایا:۔

"دوسرے جو چاہیں کریں مگر میرے گھر کا یہ دستور نہیں ہے ....."

اس کے بعد اسے رات بھر چین نہیں آیا۔۔ وہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا۔ دمے کا مرض جو کچھ دنوں سے دب گیا تھا یکایک پھر عود کر آیا۔ دوا پی۔ بیوی نے روئی سے چھاتی پر سینک کیا۔ تب کہیں آدھی پچھلی رات آنکھ لگی۔

صبح جب ٹہلنے نکلا تب بھی پریشان تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"بہل آج کچھ اداس معلوم ہوتے ہو"۔ سیر کے ساتھی بیتر ٹھ رام سونی نے پوچھا: "اداس ہی نہیں بہت پریشان ہوں" بہل نے جواب دیا۔

"کیوں، بات کیا ہے؟"

سونی اس کا ہم عمر تھا اور اس کے ساتھ ہی ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا۔ دونوں ایک ساتھ سیر کو جاتے تھے اور آپس میں دکھ سکھ کی باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ بہل نے اپنی بپتا بیان کرتے ہوئے کہا:۔

"میں اس لڑکی کے مارے جتنا پریشان ہوں اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر دیکھو، شادی تم نے بھی کی تھی اور میری بھی دو شادیاں ہوئیں۔ ہم لوگ تو صرف یہی دیکھتے تھے کہ لڑکی شکل صورت سے اچھی اور گھر کے کام کاج میں سگھڑ ہو مگر آج کل کے لڑکوں کو تو پر نکل آئے ہیں اور بالکل ہوا میں اڑتے ہیں۔" اس کا دم اکھڑ گیا لیکن کھانسنے کے بعد پھر بولا: "دیکھتے دیکھتے زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے یہ رواج چلا کہ لڑکیوں کو پڑھایا جائے۔ چلو، مان لیا خط پتر لکھنے اور کتاب جانچنے کے لئے تھوڑی بہت پڑھائی بھی ضروری ہے۔ مگر اب تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عورتیں نہ صرف پڑھیں بلکہ مردوں کے برابر نوکری بھی کریں۔ بتاؤ تو یہ کہاں کی سمجھ ہے۔ کیا عورت کے کرنے کو گھر میں کام تھوڑا ہوتا ہے؟"

"لیکن دوست، ہماری تمہاری سمجھ تو اب پرانی ہو گئی۔ ہمیں اب کون پوچھتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں میں اپنے ہی گھر کی بات کہتا ہوں۔ پچھلے سال پرکاش کی شادی ہوئی۔ بہو بی۔ اے بی ٹی ہے۔ تمہیں سوچو کہ جو لڑکی بی اے بی ٹی ہے وہ گھر میں کیسے بیٹھے گی۔ لڑکوں کی بھی یہ رائے تھی کہ وہ نوکری کرے۔ میں نے کچھ دخل نہیں دیا۔ اپنے من میں سوچ لیا اچھا بھئی ٹھیک ہے۔"

"لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سب چاہتے ہیں کہ میاں بھی کمائے اور بیوی بھی کمائے۔"

"اور زمانہ جدھر چلے ادھر چلنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی نہ چلے تو وہ اڑیل ٹٹو کہلاتا ہے۔"

بہل نے چونک کر سونی کے منہ کی طرف دیکھا وہ سنجیدہ اور گمبھیر تھا اس نے یونہی قاعدے کی ایک بات کہی تھی مگر اڑیل ٹٹو ٭ میں طنز کا جو ڈنک تھا وہ اس کے گھاؤ میں کھُبھ گیا اور وہ درد کو سینے سے چھپا کر چپ ہو رہا۔

"دبلے آدمی دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور ہے لیکن دوست، زمانہ اس سے بھی زیادہ زبردست ہے۔" سونی نے سلسلہ جاری رکھا جس طرح ربڑ کی سیٹی والی گیند کا سوراخ پھٹ کر پھیل جاتا ہے اس کی بائیں باچھ قدرے پھیلی ہوئی تھی جس سے بات کچھ بکھر جاتی تھی اور سونی بولتے ہوئے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیتا تھا۔ اب بھی اس نے نہایت معصومیت سے کہا: "سنو بہل، ہم نے تو جو کچھ دیکھا سنا اور پڑھا ہے اس سے بس ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔"

"کیا؟" بہل چلتے چلتے رک گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ سونی جس صداقت کا انکشاف کرنا چاہتا ہے اسے سننے کے لئے پیڑ پودے اور پرندے بھی ہمہ تن گوش ہیں۔

"ہاتھی کو مہاوت ہانکتا ہے اور آدمی کو وقت....."

سونی نے جواب دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔ جو کہیں دور روح کی گہرائیوں سے آ رہی تھی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں لڑکی کو داخل کرا دوں؟"

"کوئی ہرج نہیں۔" سونی نے آہستہ سے جواب دیا۔

اور وہ دونوں اپنی آخری منزل نہر کے پل پر بیٹھے تھے موسم نہایت خوشگوار تھا۔

اعلیٰ تعلیم اور جامعہ

انگریزوں کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب اور معاشرت ہماری زندگی پر اثر انداز ہونے لگی سب سے پہلے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز نے مسلمان شریف زادوں کو ذمہ دارانہ اور اعلیٰ منصب کے لئے تیار کرنے کی غرض سے کلکتہ مدرسہ قائم کیا اور چند ہی سال کے بعد اُسی غرض سے بنارس میں باحیثیت ہندوؤں کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ کھولا گیا۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنک کے دور میں میکالے کی وہ مشہور تجویز منظور ہوئی جس کی بدولت مشرق کے علم و فضل کا ٹمٹماتا ہوا چراغ محفل سے قطعی طور پر ہٹا دیا گیا اور انگریزی ادب و فن کی ترویج و ترقی کو حکومتِ وقت نے ایک اہم مقصد قرار دیا۔ یہ سہارا پاتے ہی انگریز پادری اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کی اشاعت کا کام پوری تن دہی سے کرنے لگے۔ انھوں نے جگہ جگہ مدرسے اور کالج کھولے اور مغرب کے جدید علوم اور انگریزی زبان کو ہندوستانی عوام کے پاس بڑے خلوص اور جذبے کے ساتھ پھیلانے لگے۔ ۱۸۵۴ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کے نام سر چارلس وڈ کا ایک اہم مراسلہ آیا۔ اس مراسلے کی رُو سے نصابِ تعلیم بنایا گیا۔ مقصد کی اس وضاحت کے بعد کلکتہ کے اندر ۱۸۵۷ء میں پہلی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں بنیں۔ یہ یونیورسٹیاں، لندن یونیورسٹی کے نمونے پر تشکیل کی گئی تھیں اور ان کا کام دراصل امتحان لینا اور اس بنا پر اسناد تقسیم کرنا تھا۔ ان کی ذمہ داری براہِ راست تعلیم و تربیت نہیں تھی۔ ۱۸۸۲ء میں پہلا اعلیٰ تعلیم کا کمیشن مقرر ہوا۔ اس وقت تک پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹیاں وجود میں آچکی تھیں۔ اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ ۱۹۰۲ء میں دوسرا کمیشن مقرر ہوا۔ جس نے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں نظم و نسق کو بہتر بنانے پر زور دیا اور جس کی سفارش کی بنا پر ۱۹۰۴ء کے یونیورسٹی

ایکٹ کی تشکیل ہوئی۔ ۱۹۱۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن مقرر ہوا اور اس کے بعد ملک کے اندر مختلف یونیورسٹیوں کی داغ بیل پڑی۔ ان یونیورسٹیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کی غرض سے ۱۹۲۵ء میں انٹر یونیورسٹی بورڈ قائم ہوا۔ اس طرح جدید مغربی علوم کی اعلیٰ تعلیم کا نظام ہمارے دیس میں مستحکم ہو گیا۔

میدان علم میں بدیسی حکومت کی اس مصلحت آمیز عنایت سے قطع نظر، تحریک آزادی کے ابتدائی دور میں اعلیٰ تعلیم کے کئی ادارے قائم ہوئے جنھوں نے جذبۂ حریت کی بیداری اور خدمتِ وطن کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اگرچہ ان سب کو طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور بعض ان کی تاب نہ لا کر ختم ہو گئے، پھر بھی ان میں سے چند اپنے آپ کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ ان منتخب اداروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دشوابھارتی دشو ودیالیہ گروکل کانگڑی اور جادو پور کا انجینیرنگ کالج شامل ہیں۔ یہ سب ادارے یا تو براہ راست تحریک آزادی کی دین تھے یا بالواسطہ اس سے متاثر تھے۔ آزادی سے قبل یہ قومی ادارے اپنے کارکنوں کی جاں نثاری اور عوام کی فیاضی کے بدولت اپنے فرائض کو حکومتِ وقت کی بے نیازی اور بعض اوقات اس کے عتاب کے باوجود کسی طور پر پورا کرتے رہے۔ حصول آزادی کے بعد یہ سب ادارے قومی حکومت سے کسی نہ کسی عنوان سے مالی امداد پانے لگے۔

دوسری عالم گیر جنگ کے دوران حکومت ہند نے ملک کی تعلیم کا جائزہ لیا اور اس کی آئندہ ترقی کا ایک خاکہ تیار کیا۔ اس رپورٹ میں جو سارجنٹ رپورٹ کے نام سے مشہور ہو چکی ہے، اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی کے قیام کی سفارش کی گئی اور یونیورسٹی کی پہلی ڈگری کے لئے سہ سالہ سندی نصاب تجویز کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ تعلیم کی توسیع کا ایک واضح خاکہ سامنے رکھا گیا۔ اس کے بعد دوسرا اہم قدم دسمبر ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے قیام کی شکل میں اٹھایا گیا۔ اس کمیشن کی سفارش پر ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، وجود میں آیا اور پارلمینٹ کے ایک

ایکٹ کے ذریعے ۱۹۵۶ء میں اُسے ایک خود مختار ادارہ قرار دے دیا گیا۔ اب اعلیٰ تعلیم سے متعلق بیشتر امور اسی ادارے کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ یہی ادارہ اعلیٰ تعلیم کے معیار کا محافظ ہے یہی مالی امداد بہم پہنچاتا ہے اور یہی مختلف اداروں میں اپنے دلیس کی روایات و ضروریات کے پیش نظر وحدتِ کار اور اشتراکِ عمل کی راہیں استوار کرتا ہے۔ ادھر چند سال کے اندر اس ادارے کی بدولت اعلیٰ تعلیم کے میدان میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ اس توسیع کا کچھ یوں اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں پورے ملک میں صرف ستائیس یونیورسٹیاں تھیں۔ ۱۹۵۶ء میں پانچ یونیورسٹیوں کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی تعداد بڑھ کر اکسٹھ ہوگئی۔ اب تیسرے قومی منصوبے کے دوران میں تقریباً بارہ نئی یونیورسٹیاں اور قائم کی جائیں گی اور ہر سال اسی کے لگ بھگ نئے کالج کھلا کریں گے۔ اب ثانوی منزل کے بعد کی تعلیم علوم و فنون کے کالجوں، مخصوص پیشوں کے لئے تیار کرنے والے کالجوں، کسی خاص نوعیت کی تعلیم دینے والے اداروں اور تحقیقی اداروں کے ذمے ہے۔ ان تمام درسگاہوں کے نصاب، امتحان اور سند دینے کے کام کی ذمہ داری یونیورسٹیوں کے سر ہے۔ یہ یونی ورسٹیاں تین طرح کی ہیں۔ کچھ صرف امتحان لیتی اور سند دیتی ہیں، خود براہِ راست تعلیم کا انتظام نہیں کرتیں۔ کچھ اپنے ایک مخصوص اور محدود دائرے میں صرف تعلیم کا انتظام کرتی ہیں اور کچھ دونوں فرائض انجام دیا کرتی ہیں۔ ان باضابطہ قائم شدہ یونیورسٹیوں کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے چند ادارے اور بھی ہیں۔ یہ بیشتر تحقیقی کام کے ادارے ہیں اور اپنے معیار کے مطابق یونیورسٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں انٹر یونیورسٹی بورڈ نے "سائنٹفک ریسرچ" کے کئی اداروں کو اعلیٰ درجے کی تحقیق کرنے والا ادارہ تسلیم کر لیا ہے۔ ان میں سے چند تعلیم کا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ قومی ادارے ہیں جن کی اسناد کو حکومت نے ملازمت کے لئے تو ایک یونیورسٹی کی سند کے مساوی قرار دے دیا ہے لیکن انھیں دستوری طور پر یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ چند دن پہلے تک اسی فہرست میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بھی شمار تھا لیکن یہ خوشخبری اب آپ سن ہی چکے ہیں کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی سفارش پر مرکزی سرکار نے جامعہ کو اپنی اسناد

تسلیم کرنے کا استحقاق عطا کر دیا ہے اور جامعہ باضابطہ طور پر یونیورسٹیوں کی صف میں شامل ہو گئی ہے۔

جامعہ کے سفرِ حیات کی اب چوتھی منزل کا آغاز ہو رہا ہے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو مہاتما گاندھی، علی برادران اور دیگر محبانِ وطن کے ایما پر چند اساتذہ اور طلبا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے علیحدہ ہوئے اور انھوں نے ایک قومی ادارے کی بنا ڈالی ۱۸۷۵ء میں سر سید احمد خاں نے وقت کے تقاضوں کو پہچان کر مسلمانوں کی تعلیم کے لئے اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ قائم کیا تھا تاکہ حکومتِ وقت کی عنایت سے مسلمان محروم نہ رہ جائیں اور اس کی اعانت میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ اس کالج نے ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ اس عظیم درسگاہ کے بطن سے ایک ایسا ادارہ پیدا ہوا جس کا مقصد قوم پرور اور حریت پسند مسلمان بنانا قرار پایا، اور یہ ادارہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کہلایا۔ شروع کے پانچ سال جامعہ ملیہ نے علی گڑھ ہی میں جوں توں گزار دئے۔ ۱۹۲۵ء میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی زیرِ سرپرستی جامعہ، دہلی منتقل ہو گئی۔ یہاں پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری کے زیرِ سایہ اس درس گاہ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس منزل پر چند استاد اور طلبہ ہی اس کا اثاثہ تھے۔ استادوں نے بیس سال تک بے لوث خدمت کا حلف اُٹھایا اور قلندرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ مالی وسائل کی تنگی بلکہ فقدان کے باوجود یہ مجاہد میدانِ عمل میں اپنا دائرہ عمل برابر وسیع کرتے رہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں نے ایک معیاری شکل اختیار کر لی جس کی بدولت اعلیٰ تعلیم کی بنیاد استوار کی جا سکتی تھی۔ جامعہ کالج، اگرچہ وسعت کے لحاظ سے بہت چھوٹا تھا لیکن اپنے اساتذہ کے علم و فضل اور تصانیف کے اعتبار سے ایک قابلِ تقلید نمونہ ٹھیرا۔ عام روش سے ہٹ کر تعلیم بالغان، کی طرف بھی جامعہ متوجہ ہوئی۔ اس نے سارے دیس کو تعلیمِ بالغان کے صحیح تصوّر سے روشناس کرنے کا افتخار حاصل کیا۔ ملک کو سماجی تعلیم کی منزل پر لانے میں جامعہ کے ادارہ تعلیمِ ترقی نے قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ جامعہ نے بچوں اور

انھوں نے ادب کی اشاعت کو اپنے تعلیمی پروگرام میں خاص جگہ دی اس کام کو تعلیم کا ایک نہایت ہی اہم اور اولین جزو سمجھ کر ملک کی رہنمائی کی۔ ان منظم کارگذاریوں کے ساتھ ساتھ کچھ نہ کچھ تحقیق کا کام بھی برابر ہوتا رہا۔ ۱۹۳۸ء میں بنیادی تعلیم کے اصول کے مطابق اساتذہ تیار کرنے کی غرض سے جامعہ نے استادوں کا مدرسہ، قائم کیا، جس کی مالی امداد کئی سال تک ہندوستانی تعلیمی سنگھ کرتا رہا۔ حصول آزادی کے ساتھ جامعہ کا دوسرا دور ختم ہوا۔ اس دور کے اختتام پر جس تنگ نظری، درندگی اور جہالت کا اظہار ملک بھر میں ہوا، جامعہ کی فضا اس سے قطعی پاک رہی۔ اس موقع پر جامعہ نے اپنے کردار سے ان صفات کا ثبوت پیش کیا جو اعلیٰ تعلیم کی اقدار کہلاتی ہیں۔ قومی حکومت کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ کارکنانِ جامعہ کو جاہ کندن اور آب برآوردن کی تگ ودو سے نجات حاصل ہوئی لیکن جامعہ کو اب بھی باضابطہ طور پر ایک یونیورسٹی کا منصب حاصل نہ تھا۔ ۱۹۴۸ء کے یونیورسٹی کمیشن نے اگرچہ جامعہ کو ایک دیہی یونیورسٹی بنانے کی سفارش کی تھی مگر اس پر بوجوہ عمل نہ کیا جا سکا۔ اور اس وجہ سے اعلیٰ تعلیم کی توسیع کا کام خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ جامعہ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اس زمانے میں آرٹ کی تعلیم دینے والے اساتذہ کی تربیت کے لئے انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جو آج بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مزید برآں بنیادی تعلیم کے میدان میں تحقیقی کام شروع کیا اور ادارہ دیہی معاشیات نے اس باب میں عملی تحقیق کی داغ بیل ڈالی۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں بھی تصنیف و تالیف کے علاوہ چند تحقیقی منصوبے مکمل کئے گئے۔

اس طرح جامعہ اپنے مقصد اور اپنے دائرہ عمل کے اعتبار سے ایک حد تک اعلیٰ تعلیم کے منصب کو پورا کرتی رہی ہے اگرچہ اس کے وسائل نہایت محدود تھے۔ جامعہ نے ایک طرف مخصوص کردار کو برقرار رکھنے کی پرخلوص کوشش کی ہے اور دوسری طرف تقاضائے وقت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔ بدیسی سامراج کے عہد میں سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر تعلیم کو متعینہ حدود کے اندر رکھا گیا۔ لیکن جامعہ اس دورِ استبداد میں بھی آزادی

قادِ عمل کی علمبرداری رہی۔ اس نے اپنے کام میں تنوع پیدا کیا اور تعلیم کے نئے میدانوں میں پیش قدمی کو اپنا شعار بنایا۔ جامعہ کی یہ چالیس سالہ زندگی قومی یک جہتی اور اخوت و محبت کی ایک خوشگوار داستان ہے۔ یہاں پر حصولِ علم کے ساتھ تہذیب کی شمع بھی روشن رہی ہے۔ افراد کو شخصیت کے احترام کا درس ملا ہے۔ شخصی آزادی کی حمایت بھی سکھائی گئی ہے۔ اور قومی فرائض کی ادائیگی کی ترغیب بھی دی گئی ہے آج جبکہ جامعہ کو باضابطہ طور پر ایک یونیورسٹی کا منصب عطا ہوگیا ہے، اس کے سفر کی تیسری منزل ختم ہوتی ہے۔ اب انشاء اللہ جامعہ اپنے فرائض کو بخوبی پورا کرسکے گی اور اس کا دائرہ عمل روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا۔ اس وقت اس کے سامنے ہی کٹھن منزل آ گئی ہے جبکہ آئینِ نو سے ڈرنے اور طرزِ کہن پر اڑنے کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے مگر اس کی اپنی روایات یہ یقین دلاتی ہیں کہ اگلا قدم صحیح اٹھے گا۔ جامعہ اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکے گی۔ اس کی ذات اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں محض تعداد کا اضافہ بن کر نہ رہ جائے گی بلکہ تعلیمی معیار کی برتری کی ضامن بھی ہوگی اس کی غور و فکر کی آزادی برقرار رہے گی اور وہ تعلیم کے میدان میں برابر نئی راہیں تلاش کرتی رہے گی کیونکہ یہی اجتہاد و تنوع، آزادیٔ خیال اور وسعتِ قلب و نظر، قومی ذہن کے بیدار ہونے کی علامت ہیں اور یہی وہ صفات ہیں جنھیں اعلیٰ تعلیم کی روح قرار دیا گیا ہے۔

"معلّم"

حالات حاضرہ

غیر ملکی امداد ـــــ افسانہ اور حقیقت

جناب ظفر پیامی

پچھلے دنوں پارلیمنٹ میں اخباروں میں اور لیڈروں کی عام بات چیت میں ایک خوف کا خاص طور پر چرچا رہا۔ وہ یہ ہے کہ اگر غیر ملکی امداد نہیں نہ ملی تو ہمارے تعمیری پروگرام ٹھپ ہوکر رہ جائیں گے۔ غیر ملکی امداد کی اس اہمیت کے پیش نظر مطالبہ ہو رہا ہے کہ خارجہ پالیسی کا تعین کرتے وقت اہل کرم کے مزاج کا لحاظ رکھ لینا چاہیئے۔ غیر ملکی امداد کا یہ ایک ایسا طلسم ہے جس میں صرف مغرب نواز عناصر ہی گرفتار نہیں ہیں، ان کے مخالفوں کا بھی کہنا ہے کہ اگر غیر ملکی مدد نہیں نہ ملی تو آگے بڑھنے کے بجائے ہم صدیوں پرے جا پڑیں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سلسلے میں وہ امریکہ کی نہیں بلکہ روس کی سابقہ کارگزاریوں کو فخر کے ساتھ پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مغربی بلاک کے بجائے اگر مشرقی بلاک کے سامنے ہم جھولی پھیلائیں تو زیادہ اچھا رہے گا۔ حزب مخالف کی اکثر پارٹیوں نے بھی حکومت پر نکتہ چینی کرتے وقت اس بات کو خاص طور پر اہمیت دینا چاہی ہے کہ جو بھی ترقی ہو رہی ہے وہ غیروں کے دادو دہش کی مرہونِ منت ہے۔

افسوس یہ ہے کہ حکومت کے اکثر ارکان (وزیر اعظم کے سوا) نے بھی اس نکتہ چینی کا صحیح ڈھنگ سے جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ مثلاً وزیر خزانہ نے اکثر اسی پر زور دیا ہے کہ غیر ملکی امداد ضروری بھی ہے اور بے ضرر بھی۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی ہوتی رہی ہے کہ دنیا کا کوئی ملک آج تک غیر ملکی مدد کے بغیر ترقی نہیں کر سکا۔ مثلاً اگر روس کو انقلاب کے شروع کے برسوں میں امریکی سرمایہ داروں کا تعاون حاصل نہ ہوتا (جو یورپین ملکوں کی تجارت کی راہ میں زیادہ سے زیادہ رکاوٹیں پیدا کرنا چاہتے تھے) تو شاید سوویت یونین کی صنعتی صورت کافی حد تک مختلف

ی ہوتی۔ اس پر بھی شبہ نہیں کہ ہندوستان ایسے ملک کے لئے یہ مدد اور بھی ضروری ہے۔ ہم انتظار نہیں کر سکتے کہ برطانیہ کی طرح تین صدیاں اپنے صنعتی انقلاب کی تکمیل میں صرف کر دیں صدیوں کا کام اگر برسوں میں کرنا ہے تو باہر کی مدد کا سہارا لینا ہی پڑے گا۔

حکومت کی جانب سے اسی لئے باہر سے ملنے والی ہر مدد کو ایک بہت بڑا کارنامہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی ہماری تعمیری ترقی کے لئے کچھ دینے پر رضامندی ظاہر کرتا ہے تو اسے اُن لوگوں کا بہت بڑی کارگذاری کا نام دیا جاتا ہے جنھوں نے اس ملک کو یہ عنایت کرنے کی ترغیب دی تھی۔

یوں ایک عام خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری تعمیری ترقی اور غیر ملکی امداد لازم و ملزوم ہیں یہ خیال نہ صرف واقعاتی طور پر قطعاً غلط ہے بلکہ ہمارے ملک کے ان کروڑوں انسانوں کیساتھ ناانصافی کے مترادف ہے جنھوں نے اسے ملک کی تعمیر کے لئے کسی بھی قسم کی قربانی سے کبھی گریز نہیں کیا۔ حقایق پر نظر ڈالئے تو احساس ہوگا کہ ہندوستان کو ملنے والی امداد کو نہ تو بہت زیادہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر ہماری قومی ترقی کا دار و مدار سمجھنا چاہیئے۔

منصوبہ بندی کی شکل میں ہماری قومی تعمیر کا کام پہلے پانچ سالہ پلان کی صورت میں ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا۔ اس پلان کا سب سے بڑا نشانہ یہ تھا کہ ملک میں زرعی پیداوار بڑھے اور صنعتی ترقی کے کاموں کو شروع کرنے کے لئے ایک بنیاد بنے۔ یہ پلان کس حد تک کامیاب ہوا، اس سے فی الحال بحث نہیں ہے۔ لیکن یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس پر کل ملاکر ۱۹۶۰ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ اس میں سے ۱۷۷۲ کروڑ روپے ملک کے اندر سے فراہم کئے گئے۔ غیر ملکوں سے آنے والی امداد کی کل رقم ۱۸۸ کروڑ روپے تھی۔ گویا کل خرچ میں غیر ملکی مدد کا تناسب ۱۰ فیصدی سے بھی کم رہا۔

اس کے پانچ برسوں بعد دوسرا پلان شروع ہوا۔ اس کا اہم ترین نشانہ یہ تھا کہ ملک میں بنیادی صنعتوں کی بنیاد رکھ دی جائے۔ ہمارے ملک کے حالات میں یہ بات ایک صنعتی انقلاب سے کم نہ تھی۔ اس لئے تمام بڑے منصوبوں کے لئے ہم باہر سے مال خریدنے پر مجبور تھے۔ اس کے باوجود

اس پلان میں بھی غیر ملکی امداد کو کوئی بنیادی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ ہم نے کل ملاکر ۴۶۰۰ کروڑ روپے خرچ کیے۔ ان میں سے ۳۵۱۰ کروڑ روپے کی رقم قومی ذرائع ہی سے حاصل کی گئی۔ غیر ملکی امداد میں اس بار وہ اخراجات بھی شامل تھے جو امریکہ سے "مفت" اناج منگوانے کی زد میں آئے لیکن اس کے باوجود ان پانچ برسوں میں مغرب اور مشرق کے سب ہی ذرائع سے ملاکر ہم نے صرف ۱۰۹۰ کروڑ روپے ہی حاصل کئے۔ ان میں سے ۷۰ فیصدی سے زیادہ رقمیں قرضوں کی صورت میں حاصل کی گئیں جن پر ہمارا ملک اتنا ہی سود دیتا ہے جتنا کہ عالمی بازار میں کوئی بھی ساہوکار کسی بڑی رقم پر دے گا۔ اسی میں وہ اخراجات بھی شامل تھے جو ماہرین کی تنخواہ اور صلاح کاروں کے الاؤنس وغیرہ کی صورت میں ہمارے نام ڈال دیئے گئے۔ ان سب کے باوجود دوسرے پلان میں غیر ملکی مدد کا تناسب ۲۴ فیصدی سے بڑھ نہیں سکا۔

اب تیسرے پلان کی طرف آیئے۔ آج کل عام چرچا ہے کہ غیر ملکی مدد ہی پر اگلے تین برسوں میں مکمل ہونے والے منصوبوں کی کامیابی کا دار و مدار ہوگا۔ اس سلسلے میں بنیادی طور پر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں دِقت غیر ملکی مدد کی نہیں ہے بلکہ غیر ملکی سکّے کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ سب ہی غیر ملکی مدد غیر ملکی سکّے ہی کی صورت میں ہو۔ مثلاً روس اور دوسرے کمیونسٹ ملک تمام کاروبار اور صنعتی تعاون ہندوستانی روپے ہی سے کرتے ہیں۔ دوسری جانب یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ غیر ملکی سکّے کی تمام ضرورتیں امداد اور قرضوں ہی سے پوری کی جائیں۔ کافی حصہ ہماری اپنی اشیائے برآمد سے پورا ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ بھی ایک الگ موضوع ہے جس پر پھر کبھی بحث ہوگی۔ ہاں تو جہاں تک تیسرے پلان کا تعلق ہے اس پر موجودہ تخمینوں کے مطابق کل ملاکر ۱۲۰۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ خرچ آئے گا۔ اس میں سے غیر ملکی امداد کا زیادہ سے زیادہ ۲۲۰۰ کروڑ روپے رکھا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رقم بھی پہلی نظر میں کافی زیادہ معلوم ہوگی۔ لیکن یہ بھی نہ بھولئے کہ ہماری تعمیری کوششوں میں مشکل سے کل خرچ کے پانچویں حصے کے برابر ہوگی۔ اس میں سے ہمیں اصل میں صرف ۱۹۰۰ کروڑ کے لگ بھگ رقم ہی حاصل ہوگی۔ بقیہ رقم پرانے قرضوں کے سود، غیر ملکوں میں مقیم متعلقہ غیر ملکی عملے کی تنخواہوں اور دوسرے متفرق

اخراجات میں پہلے ہی کٹ جائے گی۔

ان تمام رقموں کو "امداد" سمجھنا ہی غلطی ہوگی۔ ان کا ۸۰ فیصدی حصہ قرضوں کی صورت میں دیا جاتا ہے اس پر ہم باقاعدہ سود بھی ادا کرتے ہیں۔ یہ سود عالمی شرح سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوتا۔ گویا بنیادی طور پر ہم مدد نہیں لے رہے بلکہ صرف "سرمایہ" خرید رہے ہیں جس کی ادائیگی ہم دھیرے دھیرے کریں گے۔ یہ رقم ان چیزوں کی خرید کے لئے ضروری ہے جو ہمارے ملک میں ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا اگر دس بیس کروڑ روپے کی کمی بھی ہمیں محسوس ہوتی ہو تو اس کی وجہ سے کافی دقتیں پڑ سکتی ہیں۔ لیکن پھر بھی صورتِ حال اس قدر خراب نہیں ہے جتنی کہ بعض بڑے اخبار اور بعض سیاسی عناصر چند مخصوص مصلحتوں کی بنا پر دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

غیر ملکی امداد کبھی بھی کسی یکمشت رقم کی صورت میں حوالے نہیں کی جاتی۔ اکثر اس کا دستور یہ ہوتا ہے کہ خاص خاص پروجیکٹوں کے لئے ہر خرچ کا باقاعدہ تخمینہ بنا کر مہیا کی جاتی ہے۔ مثلاً تیسرے پلان میں غیر ملکی امداد کا زیادہ تر حصہ لوہے فولاد، کوئلے، تیل، بجلی، آبپاشی اور مشین سازی کے منصوبوں کو بڑھاوا دینے کے لئے استعمال ہوگا۔ اس میں سے جو منصوبے قومی ملکیت میں ہیں (تقریباً ۶۶ فیصدی)، ان کے لئے جتنی مدد درکار ہے اس کا تقریباً تین چوتھائی حصہ طے ہو چکا ہے یہ رقم یا تو ہمیں مل چکی ہے اور یا اگلے برسوں میں مل جائے گی۔ اس میں تقریباً آدھا حصہ غیر ملکی امداد کا تقریباً ۲۰ فیصدی حصہ اس مدد کا بھی شامل ہے جو سوویت بلاک کی جانب سے ہمیں ملے گی۔

اس کے علاوہ پرائیوٹ ملکیت کے منصوبوں کے لئے بھی جس غیر ملکی مدد کی ضرورت ہوگی اس کا ۵۴ فیصدی حصہ طے ہو چکا ہے۔ ان حالات میں پریشانی یا گھبراہٹ کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، سوائے اس کے کہ اس سے خواہ مخواہ سیاسی یا نظریاتی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

غیر ملکی سکے کا معاملہ کچھ الجھا ہوا ضرور ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اب تک پونڈ اسٹرلنگ ہی کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ رکھا تھا۔ اس علاقے میں ہماری چیزوں کی مانگ گھٹنے اور ان کی چیزوں کے بھاؤ بڑھنے سے ہماری راہ میں مشکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس سال ہماری ضروریات بھی ایسی تھیں جو اگلے برسوں کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے اندازہ ہے کہ

اس سال کل ملا کر ہمیں ۵ ارب روپے کے غیر ملکی سکے کی قرض اور امداد کی شکل میں ضرورت ہوگی۔ اس میں سے ۳ ارب کے بارے میں کوئی جھگڑا ہی نہیں۔ بقیہ رقم کے بارے میں صورت یہ ہے کہ امریکہ تقریباً ایک ارب روپے کی رقم مزید دینے کو تیار ہے بشرطیکہ دوسرے مغربی ملک بھی اتنی ہی رقم مہیا کر دیں۔ یہ ملک یہ رقم دیتے ہیں یا نہیں اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کیا جا سکتا ہو سکتا ہے وہ یہاں پر اپنی سیاسی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے کچھ حیل و حجت کریں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کی تعمیری جنگ دولت مند ملکوں کے بنکوں اور سرکاری خزانوں کے سہارے نہیں لڑی جا رہی۔ اس کی کامیابی کا دارومدار ان کی داد و دہش پر نہیں بلکہ اس بات پر ہوگا کہ ہم اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونے کے لئے کس حد تک محنت اور قربانی کے راستے پر کس حد تک جانے کے لئے تیار ہیں۔

یہ سمجھنا بھی بہت بڑی غلطی ہوگی کہ غیر ملکی امداد "امداد دہندگان" کی بڑی قربانی کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جہاں پسماندہ ملکوں میں سیاسی آزادی آئی ہے وہاں آگے بڑھے ہوئے ملکوں اور پچھڑے ملکوں کے درمیان اقتصادی فاصلے اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ یوں یہ خیال غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ غیر ملکی امداد اور پچھڑے ملکوں کی صنعتی ترقی کی بدولت دنیا میں اقتصادی مساوات کے راستے کھل جائیں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ ملک اپنے عوام کا پیٹ کاٹ کر ہمیں مدد دے رہے ہیں تاکہ حاتم طائی کی روایتیں تازہ ہو سکیں انھیں اصل حقائق کا پتہ ہی نہیں۔

مثلاً جنگ کے فوراً بعد امریکہ میں فی کس سالانہ آمدنی ایک ہزار ڈالر (ایک ڈالر = چار روپے ۸۰ نئے پیسے) تھی۔ اب ڈھائی ہزار ڈالر ہے۔ گویا پندرہ برسوں میں ڈھائی گنا اضافہ ہوا۔ اس کے مقابلے میں افریقی ایشیائی پسماندہ ملکوں میں پندرہ سال پہلے فی کس اوسط آمدنی ایک سو ڈالر سالانہ تھی۔ اب تک وہ مشکل سے ڈیڑھ سو ڈالر ہو پائی ہے۔ گویا صرف ۵۰ فیصدی اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں اضافے کا یہ تناسب تقریباً دگنا ہے۔ لیکن یہاں پر پہلے ہی آمدنی دنیا بھر میں سب سے کم تھی۔ (تمام حسابات ۱۹۴۶ کی قیمتوں کے مطابق ہیں)

جنگ کے خاتمے کے بعد دنیا کی کل تجارت میں پسماندہ ملکوں کا حصہ ۳۸ فی صدی تھا۔ ۱۹۵۷ء میں وہ ۳۱ فی صدی رہ گیا۔ پچھلے برس کے خاتمے تک عالمی تجارت میں افریشیائی ملکوں کا حصہ ۲۹ فیصدی بھی نہ رہا۔

اس فرق کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان ملکوں نے اپنے مشینی مال کی قیمتیں تو بڑھا دیں لیکن ہم سے خریدے جانے والے کچے مال کے بھاؤ گھٹا دیئے۔ جہاں ۱۹۴۶ء کے مقابلے میں مشینی مال کی قیمتوں میں ۳۳½ فیصدی اضافہ ہوا وہاں کچے مال کی قیمتوں میں ۱۱ فیصدی کمی ہو گئی۔ قیمتوں کے اس ہیر پھیر کا نتیجہ یہی تھا کہ ۱۹۵۶ - ۵۹ء کے برسوں میں صرف ایشیا ہی کے سات ملکوں ہندوستان، پاکستان، لنکا، برما، انڈونیشیا، افغانستان، نیپال) کو کل ملا کر ہر سال بارہ ارب روپیہ سالانہ کا نقصان ہوتا رہا۔ ظاہر ہے کہ اس میں بڑا حصہ ہندوستان کا ہوگا۔

اب اس پر طرہ یہ کہ ترقی یافتہ ملکوں نے آپس میں گروہ بندیاں کر لی ہیں۔ گویا وہ ہمیں اپنے منہ مانگے داموں پر مال بیچنا اور ہم سے کچا مال من مانی قیمتوں پر خریدنا چاہتے ہیں۔ یورپ کی مشترکہ منڈی میں برطانیہ کی شمولیت سے ہماری تجارت کو اسی لئے نقصان پہنچے گا کہ اب تک ہماری تجارت برطانوی ضروریات ہی کے مطابق تھی۔ اب یکایک ہمارے مال پر پابندیاں لگنے کی وجہ سے ہماری غیر ملکی آمدنی کم ہو جائے گی۔ اس سے غیر ملکی امداد کے لئے ہماری ضروریات اور بڑھ جائیں گی۔ ان حالات میں اگر ترقی یافتہ ممالک کچھ حد تک ہماری مشکلیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسے کوئی بہت بڑا احسان نہیں کہا جا سکتا۔ اگر واقعی ہمارے ملکوں کو دی گئی مدد ان کے لئے تکلیف دہ ہوتی تو انہیں پہلے کی نسبت کچھ کم امیر اور ہمیں کچھ کم غریب ہونا چاہیئے تھا۔ اب صورت یہ ہے کہ ہماری غربت تو کچھ حد تک کم ضرور ہوئی ہے لیکن وہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ امیر ہو گئے ہیں۔ سخاوت کی عالمی تاریخ میں اتنی بڑی شعبدہ بازی کی کوئی اور مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

مکاتیب سر سید احمد خاں — مرتبہ مشتاق حسین

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۴۰۴ صفحات۔ مجلد، قیمت ساڑھے چھ روپے تاریخ طباعت: اکتوبر ۶۰ئہ
ناشر: فرینڈس بک ہاؤس۔ سول لائن۔ مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ۔

۱۹۵۶ء کی بات ہے میں دو سال کے لئے مسلم یونیورسٹی گیا، تو مشتاق حسین صاحب (اڈمنسٹرل اسسٹنٹ یونیورسٹی لائبریری) سے ملاقات ہوئی، پھر اکثر ہوتی رہی۔ ان ملاقاتوں میں معلوم ہوا کہ وہ سر سید مرحوم کے خطوط جمع کر رہے ہیں۔ جب ان سے تفصیلات معلوم ہوئیں اور ان کی جانفشانی اور دیدہ ریزی دیکھی تو کام کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ چند برسوں کے بعد مکاتیب سر سید پر "ہماری زبان" میں ان کے چند مضامین پڑھے تو ان کی اہلیت اور وسعتِ معلومات کا اعتراف کرنا پڑا مگر ان کے ذوق و شوق اور ان کی تحقیق و تفتیش کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب کتاب شائع ہو کر سامنے آئی۔

اس کتاب سے قبل سر سید مرحوم کے خطوط کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل مشتاق صاحب کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:-

"سب سے پہلا مجموعہ وحید الدین سلیم کا مرتب کردہ ہے، جو سر سید کے لٹریری اسسٹنٹ تھے۔ یہ مجموعہ حالی پریس پانی پت سے تقریباً ساٹھ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اب اس اشاعت کے نسخے نایاب ہیں۔ دوسرا مجموعہ راس مسعود مرحوم نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں مرحوم نے وحید الدین سلیم کے مجموعے کے تمام خطوط جو تعداد میں پچپن تھے، شامل کر لئے (سوائے ان خطوط

کے جن میں مکتوب الیہ کا نام نہیں تھا) تیسرا مجموعہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے جو جون ۱۹۵۹ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا ہے۔ شیخ صاحب کے مجموعہ میں کل ۳۴۶ خط ہیں، جن میں سے ۲۴۶ خط راس مسعود والے مجموعے کے ہیں، کچھ خطوط وہ جو رسالہ معارف پانی پت کے بغیر مکتوب الیہم کے نام کے بالاقساط شائع ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ شیخ صاحب نے ان اقتباسات اور حوالوں کو بھی مستقل خط قرار دیا ہے جو مولانا حالی نے حیات جاوید میں دیئے ہیں"۔

مشتاق صاحب کے اس مجموعہ کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ ۱۱ خطوط پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک خط بھی مذکورہ بالا تینوں مجموعوں میں نہیں ہے، دوسرے حصے میں وہ خطوط ہیں جو شیخ صاحب کے مجموعے میں بھی ہیں۔ ان کی تعداد ۴۴ ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب" امید ہے کہ اس زمانے میں جب ہماری تعلیم اور تہذیب ایک بحرانی دور سے گزر رہی ہے، ہمارے عہد جدید کے معلم اول کے خیالات اور جذبات جو ان خطوط کے ذریعے ہم تک پہنچ رہے ہیں، ہمارے ذہن کو روشنی، دل کو حوصلہ اور دست و بازو کو وہ قوت بخشیں گے، جس سے ہم آج کے نازک اور اہم مسائل کو سمجھ سکیں اور حل کر سکیں"۔

برگِ سبز ● از بانو طاہرہ سعید (بی۔ اے)

سائز $\frac{20\times30}{16}$، حجم ۱۶۸ صفحات۔ قیمت دو روپے۔ تاریخ اشاعت: جنوری ۱۹۶۲ء
ناشر: مکتبۂ سعدی، ۱۳۴، نیو بلڈنگس۔ اعظم آباد۔ حیدرآباد دکن ۲۰

اس مجموعۂ کلام کی شاعرہ صاحبہ کا ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے: "بانو طاہرہ سعید صاحبہ کو حیدرآباد کے چمنستانِ ادب میں گلِ صد برگ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر ادیبانہ دسترس کی حیثیت رکھتی ہیں اور ایک باغ و بہار شخصیت کی مالک ہیں۔ چونکہ نظر ثانی (اس کا املا اسی طرح کتاب میں چھپا ہے) شاعر

پیدا ہوئی ہیں، اس لئے اپنے مزاج کی رنگینی اور طبیعت کی شگفتگی کے باعث ہر محفل میں محبوب اور مقبول رہا کرتی ہیں.... ایرانی نژاد ہیں.... ایک عرصے تک وہ ایران میں تہران ریڈیو میں شعبۂ اردو کی نگراں کار اور اناونسر بھی رہ چکی ہیں۔" پروفیسر ہارون خاں شروانی نے موصوفہ کی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "جیسا اس انتخاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، شاعرہ کو جنگل، کوہسار پہاڑ، دریا اور فطرت کے دوسرے گوناگوں کرشموں اور مظاہروں سے دلی شغف ہے اور ان کا رجحان غزل کی بجائے نظم کی طرف زیادہ ہے۔ اس رجحان کے باعث ان کی بہت سی غزلوں میں بھی نظم کا پرتو نظر آتا ہے۔" اس تعارف کے بعد اب موصوفہ کے کلام کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

دشمنی بس ہو چکی اب پیار کی باتیں کریں
کاش قومیں یوں نہ گیر و دار کی باتیں کریں

جس کے دامن میں بہار بے خزاں ہو جاگزیں
آؤ اک ایسے نئے گلزار کی باتیں کریں

پھول، شبنم، کہکشاں، مہتاب کیا عنواں ہیں کم
بدمذاقی ہے اگر تلوار کی باتیں کریں

طاہرہ ہرگز نہ ہوگی ختم اس کی داستاں
حشر تک بھی گر جمال یار کی باتیں کریں

ایک دوسری غزل کے چند شعر سنئے:۔

ہاں اے جنوں نواز ہوائے بہار کیا
میری طرح سے تو بھی غزلخواں ہے آج کل

پھر وضع احتیاط سے اکتا گیا ہے دل
دست جنوں میں اپنا گریباں ہے آج کل

پھر آرہی ہے آہ اسی بے وفا کی یاد
پھر لذت تصور جاناں ہے آج کل

پھر اس کی آرزو ہے دل چاک چاک میں
سینے میں آہ پھر وہی طوفاں ہے آج کل

ایک نظم بھی ملاحظہ ہو۔ اس کا عنوان ہے "اندھیرا":

کتنا گمبھیر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے یہاں
داغ دل سے بھی اجالا نہیں ہونے پاتا
شعلۂ آہ بھی دیتا نہیں لو ہلکی سی
زندگی جلتی ہے مشعل نہیں جلتی کوئی

آنسو پگھلی ہوئی آتش کی طرح بہتے ہیں
ایسی آتش کہ نہیں جس میں ذرا سی بھی دمک
پر تپش ایسی کہ دوزخ بھی جھلس کر رہ جائے
کیسا اندھیر ہے، ویرانی ہے، اندھیارا ہے
رات ہی رات ہے راتوں مگر حُسن نہیں
کوئی تارا نہیں، جگنوں نہیں مہتاب نہیں
اس جزرہ میں مرا گھر ہے بسبہ بختی ہے
اور اطراف جزیرے کے ہے کالا ساگر
ڈوب جاتے ہیں سفینے جہاں امیدوں کے
کتنا گھمبیر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے یہاں

موجِ نسیم
از اختر مسلمی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۱۱۲ صفحات، کتابت وطباعت عمدہ۔ مجلّد، قیمت: ڈھائی روپے
تاریخ طباعت: ۱۹۶۱ء (لیکن ۶۲ء میں شائع ہوئی ہی) جناب شاعر سے "پھولپور ضلع اعظم گڑھ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔
اعظم گڑھ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے ایک چھوٹا سا ضلع ہے، مگر علم وادب کی خدمت کے لحاظ سے بہت سے صوبوں پر بھاری ہے۔ اختر مسلمی صاحب اسی ضلع کے ایک ہونہار شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے، مگر ان کے کلام کی سلاست، روانی، سادگی اور خیالات وجذبات کی شرافت اور پاکیزگی کو دیکھ کر یقین ہے کہ ان کا مستقبل شاندار ہوگا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

ہے ذوقِ غم سلامت کہ اب آرزو ہے اختر
کوئی بجلیاں گرائے میں بناؤں آشیانہ

جلا کے دل میں تری شمع آرزو اے دوست!
ہر اک چراغِ تمنّا بجھا دیا میں نے

ہائے رے ان کی نگاہِ خشمگیں
آرزوؤں کو پسینہ آگیا

اختر اب آپ کر چکے دیر وحرم میں جستجو
منزلِ عشق کا نشاں دار ورسن سے پوچھئے

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائٹل: دیال پریس دہلی

Regd. No. D - 768 August 1962

The Monthly JAMIA

P. O Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ



جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷	بابت ماہ ستمبر ۱۹۶۲ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اِک شمع رہ گئی تھی ....

ایک تقریر

جناب ضیاء الحسن فاروقی

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

۲ اگست کو نمبر ا کیننگ لین (نئی دہلی) میں نہ معلوم کیوں اس وقت یہ شعر میری زبان پر بے اختیار آگیا جب ہندوستان کی ایک مقتدر ہستی جس کے ہاتھوں میں اس وقت زمام اختیار ہے اپنے ایک ساتھی اور جنگ آزادی کے بہادر سپاہی کے جنازہ کے سامنے خاموش کھڑے ہو کر عقیدت کے پھول پیش کر رہی تھی، آپ جانتے ہیں کہ اس سے میری مراد کیا ہے اور میں نے کس کی 'بے زبانی' کی طرف اشارہ کیا ہے ——— اس کی بے زبانی جو گفتار ہی کا غازی نہیں بلکہ کردار کا غازی بھی تھا، اور جس کی شخصیت پر مجاہد ملت کا خطاب اسی طرح زیب دیتا تھا جس طرح مولانا حسین احمد مدنی، اور مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں پر شیخ الاسلام اور امام الہند کا۔

حضرات! مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن کا انتقال ہو گیا یعنی وہ شمع خاموش ہو گئی جس کی روشنی میں ہمارا درماندہ کارواں اب دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا، وہ انسانی سہارا جاتا رہا جو حالات کی اندھیاریوں میں امید کی کرن بن کر چمکتا تھا، لوگوں کی مصیبتوں کو سن کر تڑپ جلنے والا ایک دل تھا جو ٹھہر گیا، آزادی اور انڈیا کی ایک آواز تھی جو ڈوب گئی، فکر و عمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہو گیا۔

مولانا مرحوم کا جنازہ کیننگ لین سے قوم اپنے کاندھوں پر اٹھا کر فیروز شاہ کوٹلہ

کے بڑے میدان میں لائی اور پھر اُسے مہندیوں کے احاطے میں محصور اُس شہر خموشاں میں سپرد
خاک کردیا جہاں شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خانوادہ اور سلسلہ کے لوگ ابدی نیند سو رہے ہیں

پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہزاروں انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو ملت کے اس مجاہد رہنما کو دل کی تمام سوگواریوں کے
ساتھ رخصت کرنے آیا تھا، اور اس ہجوم میں میری نظر تصور یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مولانا
مرحوم کے جنازہ کے ساتھ دو سو سال کی تاریخ بھی تھی جو اسے نئی دہلی سے مہندیوں کے
احاطہ تک رخصت کرنے آئی تھی، یہ اس لئے کہ مولانا اس عہد میں اسی سلسلہ کی ایک
کڑی تھے جو شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات سے شروع ہوتا ہے اور جس کا دامن
ان گنت انقلابی سیاسی، تعلیمی اور مذہبی تحریکوں پر پھیلا اور پھیلا ہوا ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن سیوہارہ (ضلع بجنور) میں پائی اور اس کے بعد وہ
دنیائے اسلام کی مشہور درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا
زمانہ تھا اور اگرچہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی انقلابی تحریک ناکام ہو چکی تھی لیکن دارالعلوم
دیوبند کی فضا اس کی گرمی سے معمور تھی، اس فضا کا مولانا کے حساس دل و دماغ پر
گہرا اثر پڑا، اور ان میں آزادی اور اس کی برکتوں کا شعور پوری طرح جاگ اٹھا، یہاں
تک کہ جب ۱۹۲۰ء کی تحریکیں شروع ہوئیں تو مولانا عہد شباب کے پورے جوش و خروش
کے ساتھ ان میں شامل ہو گئے اور قید و بند کی منزل سے گذرے، قید فرنگ سے آزاد
ہوئے تو پہلے انھوں نے دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کی اور پھر وہیں ایک بوریئے پر
بیٹھ کر درس دینے لگے، لیکن اس زمانے میں بھی وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلکر، کانگرس، خلافت
اور جمعیۃ العلماء ہند کے تحت مختلف تحریکوں میں حصہ لیتے رہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر
کے پندرہ سال درس و تدریس میں، پانچ سال قید فرنگ میں اور باقی حصہ ملک و ملت
کی خدمت میں گذرا۔

مولانا کی شخصیت کا کمال یہ رہا ہے کہ اس میں دین و دنیا، مذہب اور عقل، یعنی

دوسرے لفظوں میں جام شریعت، اور سندان عشق، کا ایک ایسا خوشگوار امتزاج پیدا ہوگیا تھا جو اس زمانہ میں خال خال اشخاص کے یہاں ملتا ہے، انھوں نے ایک طرف علماء دیوبند کی پُروقار مجاہدانہ روایات کے ساتھ، گاندھی جی اور جواہرلال نہرو کے دوش بدوش میں کر آزادی کی لڑائی لڑی تھی، آزادی کے بعد پنڈت نہرو کا ایک بازو بن کر، سیکولرزم کی بنیادوں پر نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں لگے ہوئے تھے، سیکولرزم کے حامی تھے اور اس کا جرأت کے ساتھ پرچار کرتے تھے، دوسری طرف وہ جمعیۃ العلماء جیسی مذہبی جماعت کے ناظم اعلیٰ ہی نہیں بلکہ روح رواں تھے، مکاتب، مدارس اور دینی تعلیم کے پروگراموں کو چلاتے تھے، مسجدوں، خانقاہوں اور قبرستانوں کو واگذار کرتے تھے اور ان سے متعلق اوقاف کو بچانے میں رات دن مصروف رہتے تھے، ایک طرف وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے تعلیمی اداروں میں جہاں دنیوی تعلیم دی جاتی ہے، اپنی شخصیت کا سایہ ڈالتے رہتے تھے تو دوسری طرف دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ایک بہت ہی اہم رکن تھے، اس طرح وہ بیک وقت مختلف النوع مذہبی وسیاسی، تعلیمی و ثقافتی، لسانی، تصنیفی انجمنوں اور اداروں کے فعال رکن تھے اور ہر جگہ قائد کی حیثیت رکھتے تھے، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد خاص طور سے ملک وملت کی تاریخ پر ان کی شخصیت ان کی ان تھک جد وجہد، اُن کی ذہانت، ان کی معاملہ فہمی اور ان کی گہری اور اثر آفریں انسانیت کی چھاپ ہے، اس تاریخ کا مطالعہ ان کی شخصیت کے مطالعہ کے بغیر نامکمل رہے گا۔

مولانا کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی جرأت اور بے خوفی تھی، حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہم سب مذہبی انسان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن حق یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا سب سے ڈرتے ہیں، اُس زمانہ میں جب کہ بڑے بڑے قومی رہنما گوشہ نشین ہوگئے تھے اور اپنی کمزوریوں پر حالات کی ناساعدت یا مصلحت کا پردہ ڈال کر مطمئن ہو بیٹھے تھے،

ایک آواز بھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں گونجتی تھی، ایک عشق تھا جو بے خطر تغیرات و انقلابات کی آگ میں کود پڑا تھا، ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے پیچیدہ اور نازک زمانے میں ایک شخص تھا جو بہادری سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندوستانی ہے، ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تھے اور اس کے غیر مسلم ساتھیوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص بھی فسادات کی نذر نہ ہو جائے، یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں پناہ گزیں ہو کر بیٹھ جائے تو معلوم ہے کہ اس شخص نے کیا جواب دیا تھا، اس نے کہا تھا کہ جس وطن کی آزادی کے لئے میں نے جد و جہد کی تھی، اسی وطن میں آج میں شرنارتھی بن کر رہوں، یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچائے جاؤں گا وہ کس مصیبت کی ہوگی آپ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں، یہ موقع جان دینے کا ہے یا جان بچانے کا۔

لیکن مولانا میں محض جرأت و بے خوفی ہی نہیں تھی، آپ کو آج بھی خود جمعیۃ العلماء میں بہت سے نڈر سپاہی اور رضا کار مل جائیں گے۔ مولانا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جرأت کے ساتھ ساتھ ہوش و سلیقہ بھی رکھتے تھے، بات کتنی ہی سچی ہو اور کتنی ہی بیباکی سے کیوں نہ کہی جائے، اگر کہنے کا سلیقہ نہیں تو بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے، مولانا کو بات کہنے کا سلیقہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات کہتے تھے تو وہ سُنی جاتی تھی اور اس کا اثر ہوتا تھا۔ مولانا ایک بڑے خطیب تھے اور ان کی خطابت میں بلا کی صلابت تھی، اس صلابت اور اس کی سحر آفرینی کا سرچشمہ ان کی حق پرستی اور قوت ایمانی تھی، وہ وہی بات کہتے تھے جسے وہ حق سمجھتے تھے اور جس کی سچائی پر اُن کا ضمیر مطمئن ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات اپنے خاص اسلوب میں، اپنی پوری شان خطابت سے کہتے تھے تو سننے والوں کے ذہن کی گرہیں کھل جاتی تھیں، کتنے دل ہوتے تھے جو تڑپ اٹھتے تھے اور کتنے ضمیر ہوتے تھے جو بیدار ہو جاتے تھے۔

ابھی بہت دن نہیں ہوئے اور وہ معرکہ ہم سب کو یاد ہے جو اس برصغیر میں مسلم لیگ کے دو قومی نظریے اور مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں گرم ہوا تھا، آپ جانتے

ہیں کہ مسلمانوں کو لفظِ اسلام سے کتنا گہرا جذباتی تعلق ہے، یہ نظریہ اور یہ مطالبہ اس طرح
پیش کیا گیا تھا کہ گویا اس وقت سارا اسلام یہی تھا۔ مولانا نے اپنے بزرگوں کی رہنمائی
میں یہ چیلنج قبول کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اس کی نفی کی، مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ ایسے
لوگوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے اور ان کی تذلیل واہانت اسلام کی خدمت تصور کرتے
تھے، اپنے ہی ہم مذہبوں کے خلاف اس طرح ڈٹ جانا کوئی آسان کام نہیں، بڑا مجاہدہ
ہے یہ، ایمان کی بڑی آزمائش ہے اس میں، مولانا ہندوستان کی تقسیم کو تو نہیں روک
سکے لیکن انھوں نے حق شناسی اور بے باکی کی ایک مثال قائم کردی، تقسیم کے بعد
جو صورت حال سامنے آئی اس نے دو قومی نظریئے کا کھوکھلا پن ثابت کردیا، جس
چیز کو مسلمان عین ایمان سمجھ بیٹھے تھے محسوس ہوا کہ وہ باطل تھی، جنھیں وہ اپنی کشتی
کا ناخدا سمجھتے تھے، معلوم ہوا کہ وہ انھیں منجدھار میں چھوڑ کر دوسرے کنارے پر پہنچ
گئے، جس زمین پر انھوں نے اپنے خوابوں کے محل تعمیر کئے تھے، وہ زمین کھسکتی ہوئی
محسوس ہوئی، یہ صورت حال ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو کہیں کا نہیں رکھا، کروڑوں
انسانوں کے اس ملک میں اُن کی حالت اُن جلی ہوئی لکڑیوں کی مانند ہوگئی جنھیں
قافلے صحرا میں جلا کر چھوڑ جاتے ہیں، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، ان کا روحانی اضطراب
اور ذہنی انتشار انتہا کو پہنچ گیا اور بے اعتمادی اور خوف کی وہ فضا پیدا ہوگئی جس
کی مثال مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں ملتی، ایسے نازک وقت میں
حفظ الرحمٰن مسلمانوں کی کشتی کے نگہبان بن گئے، مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں بیٹھ کر،
ملک کے کونے کونے میں جا کر، پارلیمنٹ میں غرض ہر جگہ پہنچ کر ایسے ایسے حوصلہ بخش بیانات
دئے اور ایسی ایسی ولولہ انگیز تقریریں کیں کہ مسلمانوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ ایک بار
پھر پیدا ہوگیا۔

مولانا کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور
قنوطیت اور احساسِ کمتری کے سخت دشمن تھے، عثمان فارقلیط صاحب نے صحیح کہا ہے کہ

مولانا کا ایمان تھا کہ اسلام اور عزت نفس لازم ملزوم ہیں، کسی امت کا تباہ ہوجانا اتنا افسوسناک نہیں جتنا کہ اس کا احساس کمتری میں مبتلا ہونا، عزت نفس کی موت احساس کمتری کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے حضرت مولانا کو احساس کمتری کے نام سے چڑ تھی، آپ جہاں جاتے اس خطرناک جذبہ کی سختی کے ساتھ مذمت کرتے، مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں لوگوں کا ہجوم رہتا اور آپ برابر گفتگو کرتے رہتے اور انداز بیان ایسا اختیار کرتے گویا احساس کمتری کو چیلنج کررہے ہوں۔ اگر ایڈیٹر الجمعیۃ کے قلم سے کسی اداریہ میں احساس کمتری کی جھلک نظر آجاتی تو آپ اس پر سخت تنبیہہ کرتے اور فرماتے کہ ہماری زندگی تو اس جذبہ کے خلاف جہاد کرنے میں گزری ہے، اگر جمعیۃ العلماء کا ترجمان بھی یہ جذبہ پیدا کرنے لگے تو مسلمانوں کو اس دلدل سے نکالنے کے لئے کون آئے گا اور پوری امت کا انجام کیا ہوگا؟

مولانا نے یہ وطیرہ کبھی نہیں اختیار کیا کہ حکومت وقت کی خوشنودی کے لئے اور اپنی سیکولرزم کے دکھاوے کے لئے یہ کہیں کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا نہیں ہے اور ان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، انھوں نے کھلے بندوں بار بار اس بات کو کہا کہ مسلمانوں کے سامنے بڑی مشکلات ہیں، پچھلے سال کے مسلم کنونشن میں انھوں نے مسلمان نمایندوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی شکایات کا ایک دفتر تیار کیا۔ مسلم کنونشن جن حالات میں ہوا وہ ہم کو معلوم ہے، کس طرح مختلف حلقوں سے اس کے انعقاد کی مخالفت ہوئی، طنز و تشنیع کا ایک محاذ تھا جو مختلف جماعتوں نے اس کے خلاف قائم کر لیا تھا اور غالباً حکومت بھی اس کو مناسب نہیں سمجھتی تھی، لیکن مولانا نے کسی کی پروا نہیں کی، کنونشن ہوا اور جس مقصد کے لئے منعقد ہوا تھا وہ مقصد مولانا نے پورا کرکے دکھایا۔

مولانا مسلمانوں کی مشکلات بیان کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ اس بات کو پرزور طریقے سے کہتے تھے کہ ان مشکلات کو ہم ہی حل کرسکتے ہیں، کوئی دوسرا ملک یا دوسری جماعت انھیں نہیں حل کرسکتی، ہاں دوسرے ہماری پریشانیوں میں اضافہ کرسکتے ہیں، جب وہ یہ کہتے تھے تو لامحالہ ان کے سامنے پاکستان کا رویہ ہوتا تھا۔ اس طرح مولانا نے بے جا تملق کی فضا کو صاف کیا اور ان کی حق پرستی نے زمانہ ساز اور اقتدار کے بھوکے مسلم رہنماؤں کو رسوا کیا۔ انھوں نے حکومت پر سخت سے سخت تنقید کی اور اس طرح مسلمانوں اور باہر والوں پر واضح کیا کہ ہندوستان میں جمہوریت

اور اظہار خیال کی آزادی ہے۔ مولانا ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرزم کی آبرو بن گئے تھے۔
مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی یہ خصوصیت نئی تعلیم والوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ مہیا کرتی ہے کہ اب تک اس قوم کی کوئی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے تو انھیں لوگوں نے دی ہے جنھوں نے مکتبوں اور مدرسوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر تحصیل علم کیا تھا، مولانا ایک غریب اور گمنام خاندان کے چشم و چراغ تھے، تعلیم بھی انھوں نے پرانے طرز کی پائی لیکن کام وہ کر گئے جو کالج اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والوں سے نہ ہو سکا۔ کیا اسے ہم مکتب کی کرامت کہہ سکتے ہیں؟ بلاشبہ یہ فیضانِ نظر تھا۔
حضرت مجاہد ملت صرف مسلمانوں ہی کے لیڈر نہیں تھے، درحقیقت وہ ملک کے ایک بڑے رہنما تھے، وہ قومی مسائل میں پوری دلچسپی لیتے تھے، ان کے پاس غیر مسلم حضرات بھی اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور خواہ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں، مطمئن ہو کر جاتے تھے، وہ مسلمانوں کے مسائل کو خاص طور سے پیش کرتے تھے مگر محض اس خیال سے نہیں کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ مسلمانوں کے مسائل کے حل میں ملک اور قوم کی نیک نامی ہے، جمہوریت کی کامیابی ہے، سیکولرزم کی جیت ہے، یقیناً وہ ایک سچے محب وطن تھے۔
مولانا کی طبیعت میں فقیروں کی سی سادگی اور بوریہ نشین بزرگوں جیسا انکسار اور وقار تھا، وہ ایک ایسے درویش تھے جس کی خانقاہ میں کوئی دربان نہیں ہوتا، دہلی میں جمعیۃ کا دفتر اس درویش کی خانقاہ تھی جس کے دروازے موافق اور مخالف، امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم، مقیم اور مسافر سب پر ہر وقت کھلے رہتے تھے، لوگ دور دور سے آتے، ایک گوشے میں اپنا سامان رکھتے اور پوچھتے مولانا حفظ الرحمٰن کہاں ہیں؟ مولانا موجود ہوتے تو سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ جاتے، بس اپنی بات کہنے اور اگر جی چاہے تو اس خانقاہ میں قیام کرنے کے لئے اتنا کافی تھا، مولانا موجود نہ ہوتے تو لوگ کئی کئی دن ان کا انتظار کرتے اور دفتر میں قیام کرتے، مولانا ہر طرح کے لوگوں سے ایک ہی طرح ملتے اور سب کے مسائل کو کمال توجہ سے سنتے اور اُن کے حل کی تدبیریں سوچتے اور بتلاتے اور

جتنا ہو سکتا اتنا کرنے کے لئے خوشی سے تیار رہتے ——— مولانا نے اپنی امنگوں کو قوم کی امنگوں سے، اپنی ضرورتوں کو قوم کی ضرورتوں سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ان کی انفرادی زندگی جماعتی زندگی اور جماعتی زندگی ان کی انفرادی زندگی بن گئی تھی درویش صفت عوامی رہنما کی یہی شان ہوتی ہے اور یہی شان باقی و قائم رہتی ہے۔

آج مولانا ہم میں نہیں رہے، لیکن وہی دارالعلوم دیوبند ہے، وہی جامعہ ملیہ ہے، وہی مسلم یونیورسٹی ہے، وہی ندوۃ العلماء ہے، وہی زمین اور وہی آسمان ہے، آفتاب اسی طرح چمکے گا اور چاند اپنی چاندنی سے فضا کو اسی طرح منور کرے گا ——— دیکھنا یہ ہے کہ اب اس آب و گِل سے پھر کسی حفظ الرحمٰن کی تخلیق ہوتی ہے یا نہیں!

جرمنی کا ایک اور سفر

پروفیسر محمد مجیب

اگر کسی کو ایک با اثر دینی عالم قرار دیکر جرمنی جانے اور وہاں کے حالات سے متاثر ہونے کی دعوت دیں تو اسے کیا کرنا چاہیئے؟ جرمنی سفارت خانے سے مجھ تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ جرمن حکومت کا شعبہ اطلاعات مجھے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی عالموں کے نمائندے کی حیثیت سے دو ہفتہ کے لئے جرمنی بلانا چاہتا ہے تو میں نے سچ بولنے کی کوشش کی، اور یقین دلانا چاہا کہ میں دینی عالم نہیں ہوں، مگر اب حال یہ ہے کہ جو شخص مذہب کا ذرا بھی احترام سے ذکر کرتا ہے وہ مذہبی سمجھا جاتا ہے اور اگر وہ پڑھا لکھا بھی ہو تو خود بخود دینی عالم بن جاتا ہے مجھے جرمن سفارتخانے جانے کے بعد بہت جلد معلوم ہو گیا کہ سچ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں، دعوت قبول کر لینا چاہیئے مگر دینی عالم نہ ہونے پر اصرار کرتے رہنا چاہیئے۔

اس میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ طہران سے آغا عباس مہاجرانی ہوائی جہاز پر سوار ہوئے اور بیروت میں انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ بھی جرمن حکومت کی دعوت پر جرمنی جا رہے ہیں؟ انکار کیسے کرتا۔ مہاجرانی صاحب مجتہدوں کے لباس میں تھے، مگر انھیں سفر کی سب شرطیں منظور تھیں۔ مزاج میں شوخی بھی تھی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کس ادارہ سے تعلق رکھتے ہیں تو جواب دیا کہ ہمدان میں پیدا ہوا،

بے شک ایں ترک پری چہرہ کہ من می بینم
عاقبت فتنۂ شہر ہمداں خواہد بود

اور اب طہران میں رہتا ہوں،

شہر طہراں گر بسوزد از حرارت دور نیست
چونکہ از ہر کوچہ آتش صد آفتاب آید بروں

استنبول کے ہوائی اڈے پر مہاجرانی صاحب کی دو ترک دوستوں سے ملاقات ہوئی انھوں نے میرا بھی تعارف کرایا۔ ترکوں میں سے ایک جنرل سعدالدین بیقرن، انقرہ یونیورسٹی کے استاد اسلامیات تھے، دوسرے حفظ الرحمٰن اُدے مِن، شعبہ تعلیمات کے پروفیسر دونوں یورپی لباس میں تھے، وضع قطع بھی یورپی تھی۔ جنرل بیقرن ۳۵ برس فوج میں رہ چکے تھے۔ دردانیال میں مصطفیٰ کمال کے ماتحت لڑے تھے، مگر ملازمت کے دوران میں رات کو دینی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے تھے۔ اب میں کیسے کہتا کہ میں دینی علوم سے بالکل ناواقف ہوں، غلط فہمی میں نمائندہ بنا دیا گیا ہوں۔ میونخ کے ہوٹل میں پہنچنے کے بعد دو قبائیں اور نظر آئیں، ایک مفتی عبدالو غوشہ کی، جو دمشق کی مسجد کے امام تھے، اور دوسری احمد شمیل کی، جو جدہ سے آئے تھے وہ ایک ادارہ کے صدر ہیں جس کا نام "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" ہے۔ شکل صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی زبان کو امر بالمعروف سے اور آنکھوں کو نہی عن المنکر سے کوئی نسبت نہیں۔ مہمانوں میں دمشق کی یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے صدر محمد مبارک صاحب بھی تھے۔ یہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لائے تھے جن کا لباس یورپی مگر شرعی تھا، یعنی ان کے سر پر ہر وقت ایک رومال بندھا رہتا تھا اور موزے عام فیشن کے خلاف موٹے اور گہرے رنگ کے تھے۔ ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ مدت سے مردوں کی صحبت میں خاموش اور ساکت بیٹھنے کی مشق کرتی رہی ہیں۔ مبارک صاحب نے پہلی شام سے ہی "علماء" کی نمائندگی اپنے ذمہ لے لی، مگر مفتی عبدالو غوشہ برابر مقابلہ کرتے رہے اور کبھی کبھی اپنی وجاہت اور قبا کی وجہ سے بازی بھی لے گئے۔ ہماری جماعت میں سب سے زیادہ خاموش انڈونیشیا کے نمائندے پروفیسر مسدد تھے۔ پورے سفر میں انھوں نے کسی عورت کی طرف نظر نہیں اٹھائی، اپنی بیوی اور پندرہ بچوں کو یاد کرتے رہے۔ مراکش کی فیض یونیورسٹی سے داؤد صاحب آئے تھے، جن کے علم اور ذوق کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لبنان کے ایک نمائندے جرمن سفارتخانہ کے ملازم، دوسرے مریض تھے۔

مسلمان عالموں کو جرمنی بلانے اور وہاں کے حالات سے مطلع کرنے کے دو مقصد تھے،

ایک سیاسی اور دوسرا مذہبی۔ سیاسی مقصد کمیونسٹوں کی زیادتیوں اور خاص طور پر برلن شہر کو دیوار بنا کر دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کارروائی کے خلاف ذہنی اور اخلاقی احتجاج میں شریک کرنا تھا۔ مذہبی مقصد یہ تھا کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو غلط فہمیاں اور اختلافات چلے آرہے ہیں ان کو دور کیا جائے۔ سیاسی مقصد سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی، بلکہ دو چار دفعہ میں نے ایسی باتیں بھی کہہ دیں جن سے معلوم ہو گیا کہ میں عداوت کا جذبہ پیدا کرنے کے خلاف ہوں، اس لئے کمیونسٹوں پر خواہ مخواہ اعتراض کرنے میں شریک نہیں ہو سکتا۔ دینی مسائل پر گفتگو جب بھی ہوئی بہت دلچسپ ہوئی۔

مجھے رفتہ رفتہ اندازہ ہوا کہ جب محکمۂ اطلاعات میں مسلمان عالموں کو دعوت دینے کی تجویز پر غور کیا گیا تو لوگوں کو اس کا اندیشہ تھا کہ مسلمان عالم یا تو آئیں گے نہیں یا آئے تو بات بات پر جھگڑا کریں گے۔ مگر ہوا اس کے برعکس۔ مصر اور پاکستان کے سوا ہر ملک سے لوگ آئے، اور ان کے درمیان کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا عیسائی پادریوں کو البتہ مسلمانوں سے مذہبی مسائل پر گفتگو کرنے میں تامل تھا، اور رومن کیتھولک سے زیادہ پروٹسٹنٹ پادریوں کو۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ رومن کیتھولک لوگ عقائد کے معاملے میں متحد اور متفق ہیں، پاپائے روم نے اب سے بیاسی برس پہلے جدید علوم اور مذہبی عقیدوں کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی تحریک کو رد کر دیا تھا اور علوم کی ترقی نے یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ پاپا کا یہ حکم غلط تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقوں کے عالم حالات سے متاثر ہوتے رہے، اور اب وہ سوچتے ہیں کہ مذہب اور سماجی ماحول کے درمیان مطابقت کی کوشش کس شکل میں اور کہاں تک کی جائے۔ ان کے پیرو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی مقام پر ٹھہرتے نہیں ہیں اور انھیں اس سے بے چینی ہوتی ہے۔ پروٹسٹنٹ پادریوں کو مسلمان عالموں سے ملاقات کرنے میں کوئی تکلف نہیں تھا، مگر اس کا بہت ڈر تھا کہ بعد کو ان پر بیجا آزاد خیالی کا الزام لگایا جائے گا۔

مسلمان عالم مذہبی بحث نہ چاہتے تھے نہ اس کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔ وہ اس پر خوش ہوئے رہے کہ اکثر جرمن مقرروں نے، جن میں سیاسی اور مذہبی لوگ دونوں شامل تھے، مسلمانوں کی چھ سات سو برس پہلے کی علمی خدمات کی تعریف کی۔

لیکن اب سوال تاریخ کو صحیح طور پر پیش کرنے کا نہیں ہے، اب اصل مسئلہ مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کے درمیان ایسی مفاہمت پیدا کرنا ہے جس سے دنیا کے تمام ملکوں میں عام زندگی کو دین اور دینداری سے متاثر کیا جا سکے، اور نئے آلات جنگ اور سماجی رجحانات نے ہلاکت کے جو امکان پیدا کئے ہیں ان کا تدارک کیا جا سکے۔ چین اور جاپان کے بدھ متی اس بات پر خوش معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے مذہب میں عقائد کی کوئی شرط اور پابندی نہیں ہے، وہ صرف آداب زندگی کا مجموعہ ہے۔ ہندو اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے دھرم میں انسان کے ذہن کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا ہے اور عقائد کے معاملے میں جو رواداری ہندوؤں میں پائی جاتی ہے کسی مذہب کے ماننے والوں میں نہیں ملتی۔ مسلمان اور عیسائی دیندار اسی کو سمجھتے ہیں جس کے عقیدے صحیح ہوں۔ ان کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلافات ہیں جو کبھی بالکل محسوس نہ ہوں تو کبھی بہت شدید بھی ہو جاتے ہیں، لیکن مسلمانوں میں تصوف اور عیسائیوں میں معاشی انقلابات نے انسان کے ذہن کو جس طرح آزاد کیا ہے اس کی مثال اور مذہبوں میں نہیں ملتی لیکن جب مذہب کا ذکر آتا ہے تو مسلمانوں کا خیال فوراً شریعت کی طرف جاتا ہے اور عیسائی کا اس کلیسا کی طرف جس کا وہ پیرو ہے یا ان کلیساؤں کی طرف جن کا وہ مخالف ہے دنیا میں کہیں بھی جب بھلے آدمی ساتھ بیٹھتے ہیں تو بہت آسانی سے اس پر متفق ہو جاتے ہیں کہ سب ہی حق پر ہیں اور سب اچھی زندگی کی تعلیم دیتے ہیں، اس لئے کہ بھلے آدمیوں کا تعصب برتنا اور اختلافات پر زور دینا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دنیا کے ہر ملک میں تعصب کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں یا دینی اور اخلاقی اصولوں کی ایسی نمایاں بے قدری ہے جس کے ہوتے ہوئے رواداری کا ذکر کرنا مضحک سا معلوم ہوتا ہے۔ علم پر بھروسا کرنے والے کہتے ہیں کہ انسان کا سلامتی کے لئے عقیدے اور مذہب میں دوبارہ گرفتار ہو جانا ہرگز ضروری

مفید نہیں ہے، تندرستی، خوشی اور خوشحالی کا جو سامان سائنس اور آزاد تجارت نے پیدا کر دیا ہے
ہر ایک لحاظ سے اس نظریے کی تائید کرتا ہے، اور خود انسانی ذہن کو اس درجہ متاثر کر چکا ہے
کہ مذہب کو اہمیت دینا زبردستی کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دنیا مذہب کو نہیں چھوڑنا
چاہتی یا مذہب دنیا کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ہانوور میں میری پروفیسر ایکرٹ سے ملاقات
ہوئی، جو میری درخواست پر مسلمان عالموں سے ملنے کے لیے بلائے گئے تھے، اور انھوں
نے بھی اس تجویز کو بہت پسند کیا کہ جرمنی میں عیسائی اور مسلمان علمائے دین کی ایک کانفرنس
کی جائے جو دینی تعلیم کی نئی تشکیل کے مسئلے پر غور کرے۔ وہ بہت با اثر آدمی ہیں اور غالباً
اس کانفرنس کا سال ڈیڑھ سال کے اندر انتظام کر لیں گے۔ مونسٹر کی یونیورسٹی میں پروفیسر
شیدر سے ملاقات ہوئی۔ یہ قریب اسی برس کے ہیں، صورت شکل نورانی ہے، اور اب یونیورسٹی
کے اعزازی پروفیسر ہیں۔ میں نے ہندوستان میں ان کا نبوت پر ایک مضمون پڑھا تھا
ان کا نام سنتے ہی میں ان کے پاس گیا۔ اپنا تعارف کرایا اور ان کے مضمون کی تعریف کی
وہ سچے عالم ہیں، اور اپنا شوق یہ سوچے بغیر پورا کرتے رہتے ہیں کہ کوئی ان کے مضامین
اور کتابیں پڑھتا ہے یا نہیں۔ پھر بھی میری زبان سے اپنی تعریف سن کر خوش ہوئے اور
کہا کہ میرا موضوع ایسا ہے جس سے شاذ و نادر کسی کو دلچسپی ہوتی ہے۔ میں نے ان کے
اور مضامین اور کتابیں پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو انھوں نے کہا کہ اچھا، آج شام کو مجھے
آپ لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے کو بلایا گیا ہے، میں نے جو چیزیں لکھی ہیں ان کی فہرست
لیتا آؤں گا۔ شام کو آتے ہی انھوں نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں ایک لمبی، ٹائپ کی
ہوئی فہرست رکھی تھی، جو انھوں نے خود میری خاطر ٹائپ کی تھی۔ میں نے پوچھا کہ اگر میں
آپ کے کسی مضمون کا اردو میں ترجمہ کرنا چاہوں تو آپ کے نزدیک کون سا مناسب ہو گا
اس پر انھوں نے مضمون کا عنوان بتایا، اور یہ بھی کہا کہ مضمون الگ سے چھپ چکا
ہے، میں ایک نسخہ آپ کو بھیج دوں گا (یہ غالباً ہوائی ڈاک سے بھیجا گیا اور مجھ سے پہلے
ہندوستان پہنچ گیا)۔ نبوت پر عربی، فارسی، ترکی اور کئی یورپی زبانوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے

لیکن چونکہ اس کا حدیث اور فقہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، ہمارے علماء اسے نظر انداز کرتے رہے ہیں مجھے اس کا علم قشیری کے رسالے کے ترجمے سے ہوا۔ قشیری کے رسالہ کو بھی بہت کم لوگ پڑھتے ہیں، جب فتوت کے بارے میں پوچھنا شروع کیا تو حیرت کی نگاہ کے سوا کبھی کوئی جواب نہ ملا۔

فتوت پر پروفیسر تشنر کے مضمون کا ترجمہ انشاء اللہ رسالہ جامعہ میں جلد شائع ہوگا۔ یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مذہب کی طرح فتوت بھی انسانی زندگی کا ایک بہت پرانا مظہر ہے، اور اس کی خصوصیت مقرر اخلاقی اصولوں پر عمل کرنے کے لئے جماعتیں بنانا ہے۔ مسلمانوں کے علم اخلاقیات کو دو اصطلاحیں جاہلیت کے دور سے ورثے میں ملیں، مروت اور فتوت۔ جاہلیت کے دور میں ان کا مطلب کچھ اور تھا، بعد کو کچھ اور ہو گیا۔ مروت میں بعد کو ایسے اوصاف شامل سمجھے گئے جن کا تعلق افراد سے تھا، جیسے کہ بہادری اور مہمان نوازی اور فتوت سے ایسے اوصاف مراد تھے جو ہوتے تو شخصی ہیں مگر ان کا نمایاں اثر جماعتی زندگی پر پڑتا ہے، جیسے کہ فیاضی، انصاف پسندی اور غیروں کے ساتھ ہمدردی۔ مروت اور فتوت کا فرق ویسا ہی ہے جیسا کہ شیخ نظام الدین اولیاء نے طاعت لازم اور طاعت متعدی میں کیا تھا۔ طاعت لازم وہ ہے جس کا فائدہ صرف طاعت کرنے والے کو پہنچتا ہے، اور اس کے لئے خلوص بنیادی شرط ہے، طاعت متعدی وہ ہے جس کا فائدہ دوسروں کو پہنچتا ہے اور اس کی شکلیں بے شمار ہیں۔ شیخ نظام الدین اولیاء یہ بھی فرماتے کہ طاعت متعدی کے بغیر طاعت لازم بے سود ہوتی ہے تو وہ اپنے خیال کی تکمیل کر دیتے مگر ان کے زمانے کے لئے قابل قبول نہ ہوتی۔ ہمارے زمانے کے لئے خود طاعت ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ متعدی نہ ہو۔ اب حکومتوں کو اور قوموں کو مطلب اس سے ہے کہ شہری کتنے اچھے اور مفید کام کرتا ہے، اس سے مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا مذہب کیا ہے اور خلوت گاہ راز میں اس پر کیا کیفیتیں گذرتی ہیں۔ یہ رویہ صحیح نہیں ہے، طاعت متعدی ہو تب بھی اس کا طاعت ہونا ضروری ہے، انسان کا مفید کام کرنا کافی نہیں ہے، اس کی پشت پر خدمت کا

کوئی تصور ہونا چاہیئے جو اس کے دل میں اعتماد پیدا کرے اور اس کی نیت کو صاف کرتا ہو۔

تصوف آج کل ایک بالکل نئی اصطلاح معلوم ہوتی ہے، پہلے بھی کم لوگ اس سے واقف تھے۔ تصوف، مسٹی سزم، کا قرونِ وسطیٰ میں بہت چرچا تھا، اب وہ یورپ میں بدنام ہے اور ہندوستان میں اس کی حیثیت باسی کھلونے کی سی ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اسے یا تو اوہام پرستی کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے یا ایسی روحانیت کی مثال جس میں مافوق الفطری عنصر غالب ہو۔ زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ان بزرگوں کا جنھیں صوفی یا سنت کہا جا سکتا تھا اس انداز سے احترام کیا کہ گویا وہ انسانوں کی ایک الگ قسم ہیں اور کسی معمولی انسان کے لئے ان کا جیسا ہونا ممکن نہیں۔ خود صوفی تصوف کے مفہوم کو واضح نہیں کر سکے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ طریقت کوئی ایک طریقہ یا راستہ نہیں ہے، بلکہ ان بے شمار راستوں اور طریقوں کا مجموعی نام ہے جن پر چل کر انسان نفس اور نفس پرستی کے قید احاطے سے نکل سکتا ہے۔ رسمی مذہب اور تصوف کے درمیان ہمیشہ جھگڑا اس وجہ سے رہا ہے کہ رسمی مذہب (اپنے بنیادی اصولوں کے خلاف) اس احاطے کی دیوار کو جو انسانی طبیعت اور تخیل کو قید رکھتی ہے توڑنے کے بجائے اور مضبوط کرتا رہتا ہے۔ دراصل تصوف عقیدوں اور مسلکوں کی شکل رفتہ رفتہ اختیار کرتا ہے، اس کی ابتدا ایسی کیفیتوں سے ہوتی ہے جو تقریباً ہر شخص پر گزرتی ہیں، ان کا کوئی معلوم سبب نہیں ہوتا اور اصل تصوف کی علامت صرف اس بنا پر قرار دیا جا سکتا ہے کہ ان سے متاثر ہو کر آدمی کسی شخص یا مقصد کو اپنی خواہش یا مفاد یا اپنی ذاتی سلامتی پر ترجیح دیتا ہے۔ اسی وجہ سے تصوف کی کتابوں میں اتنی کثرت سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ شیخ نے مریدی کے امیدوار سے سوال کئے جن سے معلوم ہو کہ وہ شیخ کو کس حد تک اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔ لیکن چونکہ مذہب رسمی ہونے پر بھی تمام اعلیٰ قدروں کا حامل رہا اس لئے ہر مذہبی جماعت کا تصوف اس کے خاص مذہب کے رنگ میں رنگا رہا، اور اب جہاں کہیں اور جس طرح سے بھی رسمی مذہبیت یا مذہب کی مخالفت ہوتی ہے، تصوف اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ رومن کیتھلک کلیسا اس کی مثال ہے کہ مذہب کو بدلے بغیر قائم اور مستحکم رکھا جا سکتا ہے، باقی لوگ مذہب میں

صرف تصوّت اور تصوف کے دروازوں سے داخل ہو سکتے ہیں۔

اس مرتبہ جرمنی میں ایک ایسے صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو بڑی امیدیں لے کر ہندوستان آئے اور بہت مایوس واپس گئے تھے۔ بڑی کوفت اس بات سے ہوئی کہ یہی ہمارے سفر کے انتظامات کے ذمہ دار بھی تھے۔ انھیں پہلی مایوسی اس وجہ سے ہوئی کہ رہنے کو جگہ بہت گراں اور بہت خراب ملی، دوسری مایوسی دہلی کی "بستیاں" اور دہلی اور بمبئی میں بے گھر لوگوں کو سڑک پر سوتے دیکھ کر ہوئی، تیسری بمبئی کی ایک سڑک پر سے گذر کر ہوئی جس کے دونوں طرف قحبہ خانے تھے جن کا دن دہاڑے کاروبار جاری تھا۔ جو یہ سب دیکھ چکا ہو اس کے سامنے اس الزام کا کیا جواب دیا جاتا کہ ہندوستانیوں کے دل انسانی ہمدردی سے خالی ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی غرض اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے اور محتاجوں، مسکینوں اور مظلوموں کی خبر لینے والا کوئی نہیں، خصوصاً جب الزام لگانے والے صاحب ایسے ملک کے شہری تھے جہاں تقریباً تین کروڑ رفوجیوں کے لئے مکان اور روزگار کا بڑی خوبی سے انتظام کیا جا چکا تھا۔ میں نے پہلے اس امید میں سوالات کئے کہ شاید الزام کا جواب دینے کی صورت نکلے، مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔ پھر بھی اتنا تو معلوم ہو گیا کہ تاج محل نے ہندوستان کی آبرو رکھ لی تھی، اور اس کے نظارہ نے ملک کی بہت سی خامیوں پر پردہ ڈال دیا۔

تاج محل کے سلسلے میں کسی کارخانہ کا ذکر کرنا بے موقع سا معلوم ہوتا ہے، لیکن کارخانے میں بھی حسن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دولفس برگ میں جرمنی کی مشہور موٹر کار فوکس واگن کا کارخانہ ہے جہاں ہر چھ سکنڈ میں ایک کار تیار ہو جاتی ہے۔ تیاری کا دارومدار کام کی ایک خاص روانی پر ہے جسے مشین اور آدمی مل کر قائم رکھتے ہیں۔ کار کا انجن ہانوور کے ایک کارخانے میں تیار ہوتا ہے، دولفس برگ میں کام کا سلسلہ لوہے کی چادروں سے شروع ہوتا ہے جو مشینوں میں کٹتی اور مڑتی ہیں اور مشینوں ہی کے ذریعے اس طرح جوڑی جاتی ہیں کہ کار کے بوڈی کی شکل بن جاتی ہے۔ مشینیں ہی اس بوڈی کو رنگتی اور چمکاتی ہیں۔ ایک دوسرا سلسلہ پہیوں کی تیاری کا ہوتا ہے، اور پھر بوڈی اس پر جما دیا جاتا ہے۔ اسی دوران میں مزدور اس میں تار لگاتے

ہیں متفرق حصوں کو جوڑتے ہیں۔ آخر میں ایک طرف سے بوڈی آتی ہے، دوسری طرف سے انجن گویا جسم میں جان ڈالی جاتی ہے، پھر پہیے لگا دیئے جاتے ہیں، اور آخر میں ایک مزدور تیار موٹر کو چلا کر الگ لے جاتا ہے۔ کوئی اس جگہ کھڑا ہو تو ایک منٹ میں دس موٹر تیار اور کیل کانٹے سے درست ہوتے دیکھ سکتا ہے۔ کارخانے میں شور ہوتا ہے، مگر کہیں ایک تنکا بھی پڑا ہوا نہیں دکھائی دیتا مزدور البتہ چار پانچ سال سے زیادہ کام نہیں کر سکتا، اس لئے کہ ہر مزدور کے سپرد زیادہ سے زیادہ کام کا اتنا حصہ ہوتا ہے جتنا وہ آدھے منٹ میں کر سکتا ہے اور ایک ہی کام کو مسلسل آٹھ گھنٹے کرتے رہنا ایسا بار ہے جسے انسان کی طبیعت بہت عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی فن کے کارنامے میں حسن ترتیب سے اور روانی کی ایک خاص کیفیت سے پیدا ہوتا ہے جو فن کار کی طبیعت اور تخیل سے نکل کر بیجان رنگ یا مسالے یا پتھر میں ایک روح سی پھونک دیتی ہے۔ فن کار کی شخصیت محنت سے فروغ پاتی ہے، چاہے محنت ناکام بھی ہو۔ صنعتی مزدور کو چاہے محنت کم کرنی پڑتی ہو اور کامیابی یقینی ہو مگر وقت کے ساتھ اس کی شخصیت گھلتی اور گھٹتی رہتی ہے۔

ہمارے سفر کی آخری منزل شہر بون، جرمنی کا عارضی دارالسلطنت تھا۔ یہاں جرمنی کے صدر سے ملاقات ہوئی، جو تصویروں میں بہت اچھے لگتے ہیں اور پروفیسر مس شِمل سے، جو پاکستان اور ہندوستان میں رہ چکی ہیں اور اپنی زبان کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، ترکی، فارسی، عربی اردو اور سندھی جانتی ہیں۔ انھوں نے جاوید نامہ کا جرمن میں ترجمہ کیا ہے اور اس کے علاوہ ایشیائی شاعری کے کئی جرمن مجموعوں کے لئے فارسی اور اردو سے ترجمے کئے ہیں۔ آج کل وہ سندھ کے شاہ عبداللطیف کے کلام کو جمع کر رہی ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ اسے جرمن میں ترجمہ کر کے شائع کریں۔ فن کے کارناموں اور صنعتی کارخانوں کے ساتھ جرمنی کی یونیورسٹیوں کا ذکر بھی لازم آجاتا ہے جہاں خاصی تیز رفتاری سے علمی کام تکمیل کو پہنچتے رہتے ہیں۔ صنعت میں ہم جرمنی کے معیار تک نہ معلوم کتنے عرصے میں پہنچ پائیں، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں وہ جوش اور شوق پیدا نہ ہو جائے جو جرمن تعلیم گاہوں میں نظر آتا ہے۔

غزل

ڈاکٹر معین احسن جذبی

ہر جورِ ناروا کے مقابل رہے ہیں ہم
وجہِ شکستِ شیوۂ قاتل رہے ہیں ہم

ہر آئینہ رہا ہے حریفِ غرورِ سنگ
ہر تیر کے لئے صفتِ دل رہے ہیں ہم

ظلمت فگن رہا کوئی ہر آسمان پر
ہر آسمان پر مہِ کامل رہے ہیں ہم

اے آسمان خاک نشینوں سے مت اُلجھ
اے آسمان تیرے مقابل رہے ہیں ہم

جب بڑھ گئے تلاطم و طوفان بن گئے
یوں دیکھنے کو موجۂ ساحل رہے ہیں ہم

جب جل اُٹھے تو بخش دیا اک جہاں کو نُور
یوں تو چراغِ کشتۂ محفل رہے ہیں ہم

ہم گمرہانِ شوق کا عالم نہ پوچھئے
منزل سے دُور بھی سرِ منزل رہے ہیں ہم

ہم کو سمجھ نہ پاؤ گے اے ناقدانِ فن
روزِ ازل سے عقدۂ مشکل رہے ہیں ہم

فردوسی کا شاہنامہ اور داستانِ بیژن و منیژہ

جناب آفتاب اختر ایم اے

شاہنامۂ فردوسی ایک مبسوط اور طویل رزمیہ نظم ہے جو ایران قدیم کی تاریخ پر مبنی ہے۔ اس میں خونریز لڑائیاں۔ رزم کی شعلہ انگیزیاں۔ بہادروں کی رجز خوانیاں۔ ایرانیوں کی کامرانیاں۔ بزم کی گل افشانیاں عشق و عاشقی کی دلچسپیاں۔ بادشاہوں کی زور آزمائیاں اور رزم میں استعمال کئے جانے والے اسلحہ کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ لیکن رزم و بزم کی اس ہم آہنگی اور امتزاج کے باوجود جو شخص بھی اس میں سے کسی داستان کو منتخب کرتا ہے تو وہ رزمیہ ہی ہوتی ہے۔ آرنلڈ کو بھی جب شاہنامہ میں سے کسی داستان کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا تو وہ بھی اتفاق سے لڑائی سے بھرپور ایک رزمیہ داستان "سہراب و رستم" ہی نکلی۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک فردوسی کے اس مخصوص رزمیہ رنگ سے علیحدہ ہوکر کسی نے بھی اس کی کسی دوسری داستان کو مدح و ثنا کے لئے منتخب نہیں کیا۔ حالانکہ فردوسی نے اسی شاہنامہ میں ایک ایسی رومانی داستان بھی شامل کردی ہے جو داستان "زال و رودابہ" اور "سہراب و دخت آفرید" کے رومانی قصوں سے بھی زیادہ مکمل اور عشق و عاشقی کی دلچسپ واردات سے زیادہ بھرپور ہے۔ میری مراد داستان "بیژن و منیژہ" سے ہے جس میں عشق و عاشقی زیادہ اور رزم کم ہے۔ یہ داستان فردوسی کو ایک بزم نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اس کو عشق کی صلح روایات کا پرستار بنا کر پیش کرتی ہے۔ ہمارے دلوں میں اس کی قدر و منزلت یہ دیکھ کر اور زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ وہ صرف ایک بہترین رزم نگار ہی نہیں بلکہ عمدہ بزم نگار اور قابل تعریف عشقیہ داستان کا مصنف بھی تھا۔ فردوسی نے اس میں کردار نگاری۔ جذبات نگاری، منظر نگاری، مکالمات نگاری اور فنی نیرنگیوں

کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔

محمود شیرانی نے اپنی کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کے مقالۂ اول میں اس داستان پر بہت مکمل کر بحث کی ہے۔ انھوں نے اپنا سارا زورِ بیان اور اپنی ساری قوتِ استدلال اس کی اہمیت جتانے پر صرف کردی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ داستان ہی شاہنامہ کی اصل محرّک ہے۔ اور فردوسی نے سب سے پہلے اسے ہی نظم کیا تھا۔ اور فردوسی نے شاہنامہ کی نظم کا پختہ ارادہ کرنے سے چند سال قبل ہی اسے نظم کرنا شروع کر دیا تھا اور اسے شائع بھی کرا چکا تھا۔ شیرانی کا خیال ہے کہ داستان بیژن کی عام مقبولیت اور شہرت ہی تمام شاہنامہ کی تصنیف کی اصلی اور قدیمی محرک ہے۔ شیرانی کا یہ بھی خیال ہے کہ داستان بیژن محض تفریحاً فردوسی نے اپنی بیوی کی خاطر سے نظم کر دی تھی۔ جب یہ شائع ہو کر عوام و خواص میں کافی مقبول ہوگئی تو دوستوں کی تحسین اور سخن فہموں کے اصرار نے اسے شاہنامہ جیسی طویل نظم کی تصنیف پر آمادہ کر دیا۔

فردوسی اختصار پسند ہے اس لئے وہ قصہ یا کسی چیز کو بلا وجہ طول نہیں دیتا وہ "سہراب و رستم" کی داستان کو صرف اس طرح شروع کرتا ہے۔

کنوں رزم سہراب و رستم شنو ‌ ‌ ‌ ‌ دگر ہا شنیدستی ایں ہم شنو

فردوسی کی اسی اختصار پسندی کی طرف محمود شیرانی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے: "فردوسی اختصار پسندی کے لئے مشہور ہے اور یہ اس کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ شعراء متاخرین کی طرح اپنے مضمون کو طوالت دینا پسند نہیں کرتا" (فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۱۱) لیکن جب وہ داستان بیژن و منیژہ لکھنے بیٹھتا ہے تو ایک بے حد طویل تمہید نظم کرتا ہی اور بقول شیرانی بعض موقعوں پر بلا ضرورت چادر سے باہر پاؤں پھیلاتا ہے تمہید میں فردوسی نے رات کا جو طویل منظر پیش کیا ہے اسے دیکھ کر جامی اور نظامی کے طرز ادا کا شبہ ہوتا ہے۔ فردوسی اپنی عادت کے برخلاف تمہید کا آغاز یوں کرتا ہے کہ رات بے حد تاریک تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس کی نیند غائب تھی ایسی

بے چینی کی حالت میں وہ اپنی شریک حیات کو چراغ لانے کے لئے بلاتا ہے۔ جب وہ وجہ دریافت کرتی ہے تو فردوسی اسے یہ جواب دیتا ہے کہ روشنی کردتا کہ بزم جمے۔ فردوسی کی شریک حیات چراغ تو لاتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ قدیم ایران کی ایک تاریخ بھی لے آتی ہے اور اس وعدہ پر سناتی ہے کہ وہ جیسا سُنے گا ہو بہو نظم بھی کردے گا۔ اس طویل تمہید کے بعد فردوسی اصل داستان شروع کرتا ہے۔

ظاہر ہے یہ تمہید بے حد طویل ہے اور صرف ایک رات کے منظر کو نظم کرنے میں اس نے عام روش سے ہٹ کر جزئیات نگاری سے کام لیا ہے۔ بے حد تشبیہوں اور استعاروں سے کام لے کر اس کو رنگین اور بلیغ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شیرانی اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ "یہ داستان چوں کہ اس کی پہلی کوشش کا نتیجہ تھی اس لئے جہاں تک ہو سکا شاعر نے اپنے پہلے نمونے کو نہایت رنگینی اور رونق کے ساتھ پیش کیا ہے"

(فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۱۶)

شیرانی کی اس رائے سے اتفاق کرنا ہی چاہیئے کیونکہ ہر فنکار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی تخلیق کو ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ کرکے ناظرین کے سامنے پیش کرے تاکہ وہ اپنی پہلی ہی کوشش سے مشہور ہو جائے۔

شاہنامہ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی عام طور سے کسی داستان کو نظم کرنے کے اسباب بیان کرنے کا عادی نہیں ہے۔ پھر بھی اس کا ماخذ یا راوی اکثر بیان کر دیتا ہے لیکن فردوسی اس داستان کی نظم کے اسباب کو بالتفصیل تمہید میں بیان کر دیتا ہے۔ فردوسی نے اس کے تاریخی ماخذ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے تاکہ پڑھنے والے اس داستان کو جھوٹ یا لغو نہ سمجھیں۔ شاید فردوسی نے اس پہلو سے بھی اس کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔

پہلے داستان نویسی اور مثنویوں کے لکھنے کا یہ قاعدہ تھا کہ اس میں سب سے پہلے حمد لکھی جاتی تھی تاکہ خدا کے تعلق کی برکت اور اس کے ذکر سے مصنف کی تصنیف کو کامیابی

حاصل ہو۔ فردوسی نے بھی اس داستان کی تمہید سے پہلے حمد کے اشعار لکھے ہیں۔ داستان کی یہ خوبی بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اُس نے اس داستان کو علیحدہ لکھا تھا۔ چوں کہ یہ داستان علیحدہ لکھی گئی تھی اس لئے شاہنامہ سے قبل ہی ضبط تحریر میں آئی ہوگی کیوں کہ شاہنامہ لکھتے وقت آخر اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اسی طرح کی کوئی اور داستان علیحدہ سے لکھتا۔

محمود شیرانی "داستان بیژن و منیژہ" کو اولیت دینے کے لئے یہ بھی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ: "فردوسی کا سکہ بحیثیت رزم نگار ہمارے قلوب پر شاہنامہ کی وجہ سے جما ہوا ہے اس صنف سخن میں شاہنامہ کے سوا کوئی اور تصنیف اس کی طرف منسوب بھی نہیں کی جاتی۔ پھر وہ کیا مخفی وجوہ تھے جن کی بنا پر شاہنامہ کی نظم کا مستقل ارادہ کرنے سے ایک عرصہ بیشتر اس کے معاصرین میں فردوسی کی رزمیہ شاعری کی شہرت قائم ہو چکی تھی جس کی صدائے بازگشت ہم دیباچہ میں دیکھتے ہیں۔ جہاں فردوسی کا ایک دوست اس کے ارادے کو مستقل اور عزم کو مستحکم کرنے کی غرض سے کہتا ہے"۔ (فردوسی پر چار مقالے صفحہ ۸)

اس داستان کے طول اور جزئیات نگاری سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ داستان شاہنامہ سے پہلے کی تخلیق ہے۔ یہ اُس وقت لکھی گئی تھی جب وہ اپنے لئے کوئی مخصوص راہ ہموار نہ کر سکا تھا۔ اس وقت اُس کے طرز میں انفرادیت بھی نہ آپائی تھی۔ بلکہ وہ مختلف قسم کے تجربات کر رہا تھا۔ تاکہ کسی خاص طرز کو اپنے لئے مقرر کر سکے۔

"داستان بیژن و منیژہ" کو فردوسی نے اس وقت نظم کیا تھا جب شاہنامہ کی طرح کوئی مسلسل اور طویل نظم لکھنے کا خیال بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس نے ایران قدیم کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب سنا جس میں شجاعت و مردانگی کی رنگینیں اور عشق و عاشقی کی امنگیں افراط سے موجود تھیں۔ یہ دیکھ کر فردوسی کے ذہن میں اُس وقت صرف اسی مختصر داستان کو نظم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس نے داستان کو ہر طرح سے مکمل کرنے کی کوشش کی جس میں یقیناً فردوسی کو بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس نے اس مختصر رومانی داستان میں تمام

دلچسپیوں اور خوبیوں کو سمونے کی کوشش کی ہے۔

اگر اس داستان کو شاہنامہ سے علیحدہ کر کے پڑھا جائے تب بھی اس کی انفرادیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اور یہ ہر طرح سے ایک مکمل رومانی مثنوی نظر آتی ہے۔ اپنی جگہ پر اس کی خود جداگانہ حیثیت ہے۔ اس کی اہمیت فردوسی کی شاعری کے کارخانے میں تیار کیے ہوئے مال کے اس نمونہ کی سی ہے جو کمرۂ نمائش میں گاہکوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے سجایا جاتا ہے۔

منیژہ اور بیژن کی محبت کی ایک جھلک

منیژہ شہنشاہ کی نور نظر ہے لیکن جب افراسیاب نے اس کے مطلوب بیژن کو کنوئیں میں قید کر دیا تو اس نے بیژن کے لئے سب کچھ چھوڑا۔ دن بھر گلی کوچوں میں پھر کر روٹی کے ٹکڑے مانگ لاتی تھی اور کنوئیں میں جا کر ڈال آتی تھی۔ (چند اشعار کے ترجمے ملاحظہ ہوں)۔

جب منیژہ کو خبر پہنچی تو   آنسوؤں سے اس کا چہرہ چھپ گیا
تمام خزانہ لٹا دیا
صرف ایک چادر اوڑھ کر آئی   دونوں پاؤں ننگے تھے اور سر کھلا تھا
جنگل میں چلاتی پھرتی تھی   جب ایک دن اور ایک رات گذر گیا
تو چیختی ہوئی کنوئیں کے پاس آئی   اور ایک طرف راستہ بنایا
جب سورج نکلتا تھا تو   در در روٹی مانگتی تھی

روٹیاں لا کر بیژن کو دیتی تھی اور روتی تھی اور اس بدبختی کے ساتھ بسر کرتی تھی:

میں افراسیاب کی بیٹی ہوں   آفتاب نے میرا جسم کھلا ہوا نہیں دیکھا
اب خون آلود آنکھوں کے   ساتھ در در پھرتی ہوں
کم بخت بیژن کے لئے   میں نے تاج و تخت کھو دیا

(شعر العجم حصہ چہارم ص ۳۱۸-۳۱۵)

"کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے"

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

بھول چوک ہم سب سے ہوتی رہتی ہے۔ روزانہ کی زندگی میں نہ معلوم کتنی ایسی لغزشیں سرزد ہوا کرتی ہیں جنہیں ہم محض "اتفاقیہ امر" کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ "ارے! معاف فرمائیے، میں یہ کہنا چاہتا تھا۔" "نہیں نہیں! یہ نہیں یہ" یا کوئی اور ایسا ہی جملہ کہا اور آگے بڑھ گئے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لکھنا کچھ چاہتے ہیں اور لکھ کچھ اور جاتے ہیں۔ کبھی اصل لفظ یا جملہ ہی چھوٹ جاتا ہے۔ کسی موقع پر انکار کی جگہ اقرار اور اقرار کی جگہ انکار موجود ہوتا ہے۔ کبھی کسی مخصوص نام میں تصرف ہو جاتا ہے یا قطعی دوسرا نام تحریر ہو جاتا ہے۔ اب اگر نظر ثانی کرتے وقت گرفت ہو گئی تو کچھ اس طرح اصلاح کر لی جاتی ہے جیسے یہ کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ اور اگر کسی دوسرے نے اس عبارت کو دیکھ کر ٹوک دیا تب بھی معصومیت کے ساتھ کچھ یہی نکلتا ہے کہ "بھول گیا" "غلطی ہو گئی"۔ بس اتنا کہا اور بری الذمہ ہو گئے۔ اس سے زائد معنویت نہ خود کو نظر آتی ہے اور نہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا کچھ اور معنی پہنائے۔ اتفاق کی بات تھی۔ اور اتفاقات ہوتے ہی رہتے ہیں! چیزوں کی ترتیب و تنظیم میں بھی حافظے کی یہ اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ اسے کوئی بوکھلاہٹ کا نتیجہ گردانے یا ہم اپنی جلد بازی کو صورتِ جواز بتائیں یا نیک نیتی میں اپنے تفکرات کو اپنے بھٹکنے کا ذمہ دار قرار دیں۔ بات صرف اتنی ہی رہتی ہے کہ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

فرائڈ کے نظریات کی ترویج و اشاعت سے قبل یہ اتفاقات کی دنیا، محض حادثات کی دنیا سمجھی جاتی تھی۔ اور ہمارا "عمل جوڑ فعل"، ایک الگ تھلگ بے تعلق عمل تصور کیا جاتا تھا۔ "اتفاقیہ امر" سے مراد ہی یہ ہوتی ہے کہ اس کے وقوع پذیر ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر نفسی عمل کی اپنی ضرورت اور اپنی مصلحت ہوا کرتی ہے۔ اس کی

غرض وغایت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے اور خواہ وہ دوسروں کے نزدیک بھی بے معنی اور بے ربط ہو لیکن دراصل وہ حقائق کا مظہر ہوا کرتا ہے۔ اس کے اظہار کے اسباب ہوتے ہیں اور اس کی اپنی منطق ہوا کرتی ہے۔ ہماری چھوٹی سی چھوٹی فروگذاشت بھی ہمارے مافی الضمیر کی نشاندہی کیا کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے الجھے ہوئے مبہم فقرے، ایک لحاظ سے ہماری معقول و مربوط عبارت سے کہیں زیادہ معنویت رکھتے ہیں۔ ان سے کہنے والے کی ذہنی کیفیت کا علم ہوتا ہے اور اس کے مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ 'گستاخ دستیاں' بہرحال 'ہجوم شوق' سے مجبور ہو کر ہی ہوا کرتی ہیں اور 'ماجرائے دل' بیتابیاں ہی آشکار اکرتی ہیں۔ لہٰذا اضطراری کیفیت اپنے اضطرار کے باوجود ہماری طبیعت کا رُخ بڑی دیانت داری کے ساتھ بتاتی ہے۔ زبان پر بےخودی میں، اگر کسی کا نام آ ہی جاتا ہے، تو یہ سراغ رسانی بہرحال افشائے رازِ حقیقت ہے۔

یہ تمام 'اتفاقات' خواہ حسین ہوں یا عجیب، خفیف الحرکاتی کا اظہار کریں یا شائستگی کا۔ معقول ٹھہریں یا نامعقول، اپنی مصلحت اندیشیوں کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ وہ سب ہماری طبیعت کا تقاضا ہوا کرتے ہیں۔ ہمارا ذہن، اپنا ایک لائحۂ عمل تیار کیا کرتا ہے اور ہمارے تمام فعل اسی خاکے کے مطابق تکمیل پاتے ہیں۔ ہماری شخصیت میں پائیداری اور استقامت اسی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمارا کردار ہے۔ زندگی کے نقوش اسی کردار کے آئینے میں ابھرتے، اور مٹتے رہتے ہیں۔ اور جب کبھی کسی غلط جنبشِ قلم کا گمان گزرتا ہے جو مطابقت رکھتی ہوئی نہیں معلوم ہوتی تو ذرا گہری نظر ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کی گنجائش کا اندازہ لگانے کے لئے شعور کی منزل سے نیچے اُترنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہم لاکھ کہیں کہ 'یہ خطا جان کر نہیں ہوئی' یہ مجبوری' ہماری اپنی ہے، کسی دوسرے کی نہیں۔ ہم اپنے آپ سے مجبور ہو کر بھی اگر کچھ کرتے ہیں تب بھی وہی سب کچھ کرتے ہیں جو دراصل ہم ہیں۔ سماج کے جن ضابطوں کو ہماری طبیعت قبول نہیں کر پاتی وہ ہمارے سامنے سے ہٹ ضرور جاتے ہیں لیکن مٹ نہیں جاتے۔ ہماری خواہشاتِ غیر مطمئنہ نیست و نابود نہیں ہوا کرتیں بلکہ دبک جایا کرتی ہیں۔ ہمارے غیر آسودہ جذبات

ناپید نہیں ہوتے بلکہ اپنے سینے پر حقائق کا سنگِ گراں رکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور یہی سب ہمارے تحت الشعور کا مواد بنتے ہیں۔ ان سب کو اپنے اظہار کے لئے موقعوں کی تلاش رہتی ہے۔ شعور کی گرفت زرا ڈھیلی دیکھی اور یہ نمودار ہوئے۔ ہم سوچتے ہیں کہ بے خیالی میں کچھ کا کچھ کر جاتے ہیں یا جب ہم اپنے حال میں نہیں ہوتے تو غیر ذمہ دارانہ رویہ ایک قدرتی امر ہے۔ اور یہ دھیان نہیں دیتے کہ کسی کے ہاتھ موقع لگنے کی بات تو ہوئی ہے۔ جو کچھ ہم شعوری طور پر قبول کرتے ہیں اور ہماری طبیعت قبول نہیں کرتی، وہ ہماری اندرونی کشاکش کا سبب ہوا کرتا ہے اور ہمارے تحت الشعور میں محفوظ رہتا ہے۔ شعور کی بیداری میں تحت الشعور کے اثرات کو ظاہر ہونے کا موقع نصیب نہیں ہوتا۔ پھر بھی چال بازی اور دھوکا دھڑی سے ہمارے تحت الشعور کے یہ نفس باز نہیں رہتے۔ شعور کی آنکھ زرا جھپکی، اور دھڑام سے کود ے ہم جسے اتفاق کہتے ہیں یا بے خودی کا نتیجہ بتاتے ہیں، وہ دراصل ہمارے تحت الشعور کا ایک شبخون ہوتا ہے۔ اب اگر شعور کی نگرانی کڑی ہے اور تحت الشعور کو زرا بھی چال بازی کا موقع نہیں ملتا تو بھر بھیس بدل بدل کر اپنا کام چلانے کی ترکیب نکالی جاتی ہے۔ اگر پورے طور پر اپنا عمل دخل نہیں کر ملتا تو علامتی عمل سے ہی قدرے اشک شوئی کر لی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارے تحت الشعور کی جلوہ نمائی مختلف انداز سے ہوا کرتی ہے۔ کبھی اس کے اثرات، خیالات کا طلسم بن کر رونما ہوتے ہیں، کبھی ان سے خوابوں کی دنیا آباد ہوتی ہے، کبھی مزاج کی بدمزگی اور پراگندگی میں ان کا اظہار ہوتا ہے، کبھی خوف و ہراس کی شکل بن کر سامنے آتے ہیں اور کبھی کسی اور اضطرابی کیفیت میں اپنا زور دکھاتے ہیں۔ مثلاً ہم نے کسی کو دکھ پہنچایا اور اس کے ساتھ احساسِ ندامت وابستہ ہو گیا۔ ہم اس تلخ واقعے کو فراموش کرنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن اس شخص کی صورت ناگوار لگنے لگی۔ ہمارا اپنا احساسِ ندامت، چولا بدل کر منافرت کی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ اس طرح ہم نے اس کے سر الزام تھوپ دیا جو ہمیں ناپسند تھا۔ اس صورت حال کے برخلاف فرض کیجیے کہ کسی نے ہمیں رنج دیا، ہم نے اسے برداشت کر لیا اور فراموش بھی کر دیا۔ لیکن اب نئے ملاقاتیوں پر اعتبار نہیں آتا۔ غالباً یہ سابقہ تجربے کا ردِ عمل ہو۔ ہم کسی سے متعارف ہونے سے قبل ہی تہیہ کئے

بیٹھے ہیں کہ وہ آدمی خراب ہے۔ ہماری مایوسیاں اور نامرادیاں، ہماری ناآسودہ آرزوئیں اور تمنائیں ہمارے وہ تمام سخن ہائے گفتنی، جو خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے ہیں، اور ہمارے وہ فطری رجحانات اور قدرتی میلانات جو تہذیب و شائستگی کی قیود میں جکڑے ہوئے ہیں سب ہی ہمارے تحت الشعور کا سرمایہ ہیں۔ اور ان ہی کی حیثیت اور اہمیت کے مطابق ہمارا ردِ عمل ہوتا ہے۔

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی!

بہت سے آزار ہم خود مول لیتے ہیں اور شعور کو فریب دینے کی نیت سے بعنوانِ دیگر انھیں انجام دینے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً "امتحان کا بخار" تیاری امتحان کی زحمت اور ناکامی کی ذلت دونوں سے بچ کر نکل جانے کا یہی موثر حل ہے جو تحت الشعور کی بدولت حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کوٹ پر سگرٹ گر جاتی ہے اور پہننے کے قابل نہیں رہتا کیونکہ پہنتے پہنتے اس سے طبیعت اکتا گئی تھی اور اتنا بوسیدہ نہیں ہوا تھا کہ اس کی علیحدگی مناسب حال خیال کی جاتی۔ یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے بے اختیارانہ طور پر سرزد ہونے والے اعمال، ہمارے مخصوص مطمح نظر اور منفرد طرزِ فکر کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ہم نے جو خود بینی و خود نگری کا نقاب اپنے اوپر ڈال رکھا ہے، وہ ہماری گھبراہٹ، بیخبری یا بے اختیاری میں ہٹ جاتا ہے اور حقیقی روپ کی جھلک دکھائی دیے جاتی ہے۔ ہماری معمولی حرکات و سکنات، ہمارے کردار کی بڑی نمایاں جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعرا نے "حسنِ برہم" کے بڑے گُن گائے ہیں۔ وہ حُسن جو تکلّف سے عاری ہوتا ہے، اس کی کیفیت ضرور کچھ اور ہوتی ہے۔ اور اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ:

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ

ہماری شخصیت میں اندرونی کشاکش اور بیرونی حقائق کے ردِ عمل سے ایک ناقابلِ تشریح جوہر نمایاں ہوتا ہے جو اس کو انفرادیت بخشتا ہے۔ یہ انفرادیت سادہ بھی ہو سکتی ہے اور پیچیدہ بھی۔ اصل بات اپنی اصلیت کا اقبال اور زندگی سے اس کا ارتباط ہے۔ یہ انفرادیت اپنی داخلی کیفیات کے احساس و ادراک کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان داخلی کیفیات کا تعلق محض روحانی دنیا سے نہیں ہے۔ یہ کیفیات ہر لمحہ ہمارے ہر ایک فعل میں جاری اور ساری ہیں۔

رسالہ خدنگ نظر

جناب وبریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

لکھنؤ سے "خدنگ نظر" نامی ایک ماہوار رسالہ نکلتا تھا۔ اردو کے صف اول کے شاعر اور ادیب منشی نوبت رائے نظر لکھنوی مرحوم اس کے ایڈیٹر تھے آپ مظہر لکھنوی کے محبوب ترین شاگرد تھے۔ محمد سجادت مرزا نے بغیر کسی تحقیق کے آپ کو میکش تھانوی کا شاگرد لکھ دیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ خدنگ نظر" کا سب سے پہلا شمارہ ماہ ستمبر ۱۸۹۶ء میں نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ کی یادگاری سال گرہ کے موقع پر شائع ہوا تھا اس خاص شمارہ کی ایک کاپی میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ "خدنگ نظر" کے مطبع کا نام بھی نظام کے نام پر آصفی پریس تھا۔ یہ مطبع نوازگنج میں نظر مرحوم کے دولت کدہ پر واقع تھا۔ رشید حسن خاں اقبال ددماسحر ہنگامی رفیق مارہروی رئیس مینائی عشرت لکھنوی مولانا حسرت موہانی ڈاکٹر رام بابو سکسینہ وغیرہ نے "خدنگ نظر" کے طبع ہونے کی تاریخ ۱۸۹۷ء لکھی ہے جو میرے خیال میں بالکل غلط ہے منشی نوبت رائے نظر اپنے خود نوشت حالات میں خدنگ نظر" کے متعلق لکھتے ہیں۔

۱۸۹۶ء سے راقم کی ادبی زندگی کا دور شروع ہوا جو اب تک کم وبیش جاری ہے اس سال کے اواخر میں راقم نے لکھنؤ سے "خدنگ نظر" جاری کیا جو آٹھ سال تک شائع ہوتا رہا۔ یہ اردو زبان کا بہترین رسالہ تصور کیا جاتا تھا۔ نفاست اور ادبی خصوصیات کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا۔ بہر نوع سخت مالی مشکلات اور خانگی معاملات کی وجہ سے ۱۹۰۴ء میں "خدنگ نظر" کی اشاعت موقوف ہوگئی لیکن اس کی شہرت اب تک قائم ہے۔"

"خدنگ نظر" کے سرورق پر مارچ ۱۸۹۷ء تک یہ شعر تحریر ہوتا رہا۔

مانوس ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ ۔۔۔ بہلائیں دل کو سیر "خدنگ نظر" سے آپ

مارچ، ۹۹ء سے یہ شعر دیا جانے لگا۔

نکلا ہے بن سنور کے "خدنگ نظر" نظر
یاں دل دھڑک رہا ہے کسی کی نظر نہ ہو

رسالہ کی عمر کے بارے میں سب ہی تذکرہ نگاروں نے یہ غلطی کی ہے کہ یہ رسالہ، سال بعد مالی مشکلات کے باعث بند کر دیا گیا۔ نظر اپنے خود نوشت حالات میں یوں رقم طراز ہیں:

"راقم نے خدنگ نظر، جاری کیا جو آٹھ سال تک شائع ہوتا رہا۔"

میں نے اس رسالہ کی آٹھوں سال کی جلدیں دیکھی ہیں اردو کا کوئی قدیم اور مشہور گلدستہ خواہ وہ پیام یار ہو یا جلوۂ داغ یا جلوہ یار یا جلوۂ عاشق "نظر مرحوم کے رسالے کی ادبی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتا۔ رسالہ ادیب"ماہ جون ۱۹۱۰ء میں حضرت نظر رقم طراز ہیں:

"خدنگ نظر" نے اپنی زندگی میں اردو رسالوں کو دو مفید تحفے دیئے تھے ایک عمدہ لکھائی چھپائی دوسرا نثر و نظم کا مستقل الحاق جو اس سے پیشتر مفقود تھے۔"

بالمکند گپتا نے اپنے اخبار بھارت متر" میں اردو اخباروں پر ایک مقالہ ہندی زبان میں لکھا تھا اردو کے چند ادیبوں نے آپ سے فرمائش کی کہ آپ اس مقالہ کو اردو میں لکھ دیجئے رسالہ زمانہ" میں آپ کا یہ مقالہ دس شماروں میں شائع ہوا آخری حصہ جنوری ۱۹۰۵ء میں ختم ہوا۔ خدنگ نظر کے سلسلے میں بالمکند ایڈیٹر بھارت متر لکھتے ہیں:

لکھنؤ ہی سے خدنگ نظر" نامی ایک ماہوار رسالہ نکلتا تھا۔ اس کو آٹھواں سال چلتا ہے مالی حالت عمدہ نہ ہونے سے اس کا جولائی کا نمبر اب تک نہیں نکلا ہے، گذشتہ برس بھی کسی رئیس کی فیاضی نے اسے دوبارہ جان بخشی تھی اس کے ایک حصہ میں نظم ایک میں نثر اور ایک میں ناول ہوتا ہے نثر میں اچھی اردو کے نمونے ہوتے ہیں اور نظم بھی زبان کے لحاظ سے عمدہ ہوتی ہے۔"

رسالہ "خدنگ نظر" کے کچھ ضوابط ملاحظہ فرمایئے جو نظر مرحوم نے ماہ ستمبر ۱۸۹۶ء کے شمارے میں دیئے ہیں۔

(۱) "خدنگ نظر" مع اپنے ضمیمے کے ہر انگریزی مہینے کی شروع تاریخوں میں شائع ہوتا ہے۔
(۲) اس کی عام قیمت دو روپے سالانہ مع محصول ڈاک مگر پیشگی امرائے عظام سے پانچ روپے سالانہ تعلقہ داروں و والیان ملک کی بلند حوصلگی پر منحصر ہے جو حضرات پانچ روپے سالانہ سے زائد عنایت کریں گے ان کا نام نامی مربیان گلدستہ کی مد میں تحریر ہوا کرے گا جو عالی ہمت اصحاب دس روپے عنایت فرمائیں گے ان کا اسم گرامی ایک خاص جدول میں مع شکریہ شائع کیا جائیگا۔
(۳) نمونے کا پرچہ بغیر تین آنے وصول ہوئے کسی صاحب کی خدمت میں نہ پہنچ سکے گا۔
(۴) کلام خریدار اور غیر خریدار سب کا ایک ہی لحاظ سے انتخاب کیا جائے گا۔
(۵) انتخاب اشعار ایک خاص کمیٹی منصفانہ طور سے کرے گی۔
(۶) تخلص شعرا بہ لحاظ حروف تہجی مندرج ہوں گے۔

پہلا شمارہ ستمبر ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا اس میں منشی نوبت رائے نظر ملاحظہ طلب کے عنوان سے یوں رقم طراز ہیں:

حضرات ناظرین! کیا یہ ممکن نہیں کہ "خدنگ نظر" سے آنکھ لڑتے ہی آپ کی من چلی طبیعتیں آپ کے ہاتھوں کو اپنا اپنا دل سنبھال لینے کی غیر اختیاری تکلیف دے دیں۔ کیا "خدنگ نظر" کا مجموعی بیانیہ پن بادی النظر میں اُس چلتے ہوئے جادو کی طرح (جو رات رات بھر جگایا گیا ہو) آپ کے جدت پسند اور منصف مزاج دلوں پر اپنا پورا پورا اثر دکھلانے کی قابلیت نہیں رکھتا کیا آپ کی مشتاق نگاہیں آپ کے بسیط خیالات کو لئے ہوئے "خدنگ نظر" کے ایک ایک صفحے پر اول سے آخر تک اسی طرح بالاتصال دوڑ جانے کی کوشش نہ کریں گی، جس طرح عنفوان شباب میں کسی نو عمر آدمی کی رگوں میں تازگی بخشی خون کا دورہ ہوا کرتا ہے۔ کیا "خدنگ نظر" کا ظاہری انداز کسی چلبلے اور شوخ چشم معشوق کی بے چین اداؤں اور فتنہ انگیز نگاہوں کی طرح آپ کے چوٹ کھائے ہوئے دل چھین لینے کو کافی نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کچھ ممکن ہے مگر "خدنگ نظر" کو اپنے ظاہری تعلقات دکھا کر عاقل فریبی اور چھپی چھپی خود غرضی مد نظر نہیں بلکہ اس کا اصلی مقصود صرف اپنا وہی حسن معنوی دکھانا پایا جاتا ہے

جس میں وہ بے حد جانکاہی اور کمال عرق ریزی کے ساتھ اپنے ہم عصروں میں کامیاب ہوا ہے۔ "خدنگ نظر" ان تازہ شوخ رنگ پھولوں کو چمنستان سخن کی لہلہاتی ہوئی کیاریوں سے چن چن کر خدا جانے کن کن حوصلوں اور کون کون سی تمناؤں کے ساتھ اپنے ہر ورق کے دامن امید میں لئے ہوئے آیا ہے۔ اس ہونہار گلدستہ کو ملک کے مربیانہ برتاؤ کی قریب قریب اسی قدر ضرورت ہے جس قدر ایک بار آور درخت کے پودے کو کسی چشمۂ فیض سے متصل پانی پہنچنے کی احتیاج ہوا کرتی ہے۔ اس کی دلی آرزو ایک ہرے بھرے کھیت کی ان پھوٹتی ہوئی کونپلوں سے مشابہ ہیں جو اپنے دست تمنا کو ابر کرم کے وسیع دامن تک پہنچا دینے کی دھن میں سیدھا آسمان کی طرف بڑھائے چلی جاتی ہیں۔ اگر اس گلدستہ کو ملک کی قدر دان نگاہوں نے کسی قدر غور کے ساتھ ملاحظہ کیا تو اس کی ترقیاں قابل دید ہوں گی امید کی جاتی ہے کہ "خدنگ نظر" اپنے کارنمایاں کے صلے میں ملک کی عام مقبولیت کا سارٹیفکٹ اور خاص خاص توجہ کی سند حاصل کریگا"

رسالہ "خدنگ نظر" کے ذریعہ نظر مرحوم نے اردو ادب کی آٹھ سال تک بڑی گرانقدر ادبی اور قومی خدمات انجام دیں۔ لکھنؤ اسکول کے ممتاز اساتذۂ سخن صفی، محشر، عزیز، ثاقب، چکبست، پنڈت بشن نرائن اور آبر وغیرہ نے اس گلدستے کے لئے معرکۃ الآرا طرحوں میں غزلیں لکھ کر "خدنگ نظر" کو سارے ہندوستان میں مشہور اور مقبول کر دیا۔ حق بات تو یہ ہے کہ "خدنگ نظر" نے لکھنؤ اسکول کی پوری پوری نمائندگی کی اور وہاں کی بدنام شاعری میں، جو لوگوں کی نظر میں کھٹکتی تھی، ایک نیا رنگ پیدا کر دیا جس کی نمائندگی غزل میں عزیز اور نظر کا کلام کرتا ہے۔ نادر کاکوری کی مشہور نظمیں بھی "خدنگ نظر" میں شائع ہوئیں۔ عبد الحلیم شرر بھی جب تک "خدنگ نظر" نکلتا رہا اس کے لئے مضامین لکھتے رہے۔ خدنگ نظر میں جب حصہ نثر کا اضافہ کیا گیا تو اس کے حصہ نثر کی ادارت مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کو سپرد کی گئی۔ "خدنگ نظر" میں مولانا کا ایک مقالہ، "اکسیر کی تاریخ" پر شائع ہوا تھا جب یہ مقالہ مولانا شبلی کی نظر سے گزرا تو وہ مولانا سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا آزاد نظر مرحوم کا بہت احترام کرتے تھے۔ نظر کی وفات پر ان کا ایک مضمون بھی شائع ہوا تھا مولانا آزاد کی تمنا تھی کہ نظر مرحوم کی غزلیات کا مجموعہ یا حضرت جگر بریلوی

کی شاہکار کتاب یادگار نظر شائع ہو جائے تو نظر کا نام ادبی دنیا میں مٹنے سے بچ جائے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے لئے "یادگار نظر" کا مسودہ مطبع انوار احمدی الہ آباد والوں سے خریدا اور اب "یادگار نظر" کو انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ شائع کر رہی ہے۔ "خدنگ نظر" کی بابت نظر مرحوم رسالہ ادیب الہ آباد بابت ماہ جون ۱۹۱۱ء کے ایڈیٹوریل میں رقم طراز ہیں:

"شیخ صاحب (سر عبدالقادر) ہمارے قدیم کرم فرما ہیں اور وہ "ادیب" کے علاوہ ہماری ادبی کوششوں کو "خدنگ نظر" کے مضمون پر بھی دیکھ چکے ہیں، چنانچہ ممدوح نے ادیب پر ریویو کرتے ہوئے مرحوم "خدنگ نظر" کو بھی یاد فرمایا ہے اور اسے ایک پرلطف گلدستہ کا خطاب دیا ہے۔ درحقیقت وہ ایک گلدستہ تھا لیکن عام گلدستوں کی طرح اس میں محض ہم طرح غزلیات ہی نہ ہوتی تھیں بلکہ اس کے پہلے ہی نمبر میں جو ستمبر ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا تھا ایک قصیدہ، چند قطعات اور ایک نثر مضمون بھی شامل تھا عرصہ تک اس قسم کی ناکام کوششوں کے بعد جنوری ۱۹۰۰ء سے اس کے ساتھ نثر مضامین کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا تھا جن میں بیشتر مضامین ملک کے مشہور ادیب مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کے جادو نگار قلم سے ہوتے تھے۔ اکثر نیچرل رنگ کی نظمیں بھی چھپتی تھیں جن کا زیادہ حصہ منشی نادر علی صاحب نادر کے زور تخیل کا نتیجہ ہوتا تھا۔"

منشی اقبال ورما سحر ہنگامی مرحوم نے نظر مرحوم پر ایک مقالہ رسالہ زمانہ جنوری ۱۹۲۴ء میں لکھا تھا "خدنگ نظر" کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:

"سب سے پہلا علمی کام جن کو نظر آنجہانی نے ایک مستقل صورت میں شائقین علم وادب کے سامنے پیش کیا جو "خدنگ نظر" نامی ماہوار رسالہ تھا۔ یہ رسالہ ستمبر ۱۸۹۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ کئی سال ہوئے کہ مجھے اتفاق سے اس پرچہ کی چند پرانی کاپیاں مل گئی تھیں لیکن میری غفلت سے تھوڑے ہی دنوں بعد ضائع بھی ہو گئیں۔ یہ رسالہ دراصل اردو غزلیات کا ایک ماہانہ گلدستہ تھا اس وقت ملک میں اس قسم کے گلدستے نکلنے

کا رواج عام تھا مگر "خدنگ نظر" میں بعد کو کچھ نثر کے مضامین بھی چھپنے لگے تھے۔ جناب آغا مظہر مرحوم نے بھی اس رسالہ کو کامیاب بنانے میں خاص مدد دی تھی غزلیات کی فراہمی کے لئے انھوں نے شاعروں کے انعقاد کا کافی بند و بست کیا تھا۔ غرض پوری کوشش کی گئی تھی کہ شعرائے وقت کا کلام زیادہ سے زیادہ دستیاب ہو سکے اور "خدنگ نظر" ایک چوٹی کا رسالہ ہو۔ وقت کے لحاظ سے پرچہ واقعی شاندار تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی وہ چند سال سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ نظر مرحوم کو اس کے بند ہو جانے کا رنج تمام عمر رہا۔"

خواجہ مقبول احمد نے (الہ آباد یونیورسٹی) اردو ادب کے آزاد نمبر میں ابو الکلام کی صحافت کے عنوان سے جو مقالہ سپرد قلم کیا ہے اس میں لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں بعض ایسے رسالے نکلتے تھے جن میں مصرع طرح پر کہی ہوئی غزلوں کے مجموعے چھاپے جاتے تھے وہ گلدستہ کے نام سے مشہور ہوتے تھے "پیام یار" اور "خدنگ نظر" اس زمانے کے مشہور گلدستوں میں تھے۔"

منشی نوبت رائے نظر کی زیادہ تر غزلیں "خدنگ نظر" "ادیب" "زمانہ" اور "مخزن" میں شائع ہوئیں۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے:

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی ۔۔۔ اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی

جب اس نے نقاب اپنی سر بزم الٹ دی ۔۔۔ پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا
جس بحر میں ڈوبی دل مایوس کی کشتی ۔۔۔ اس میں کبھی اٹھتے ہوئے طوفاں نہیں دیکھا

نزع میں دیکھا جواں کو اپنے پاس آتے ہوئے ۔۔۔ اٹھ گئے اک بار دونوں ہاتھ تھراتے ہوئے

کوئی مجھ سا مستحق رحم و غمخواری نہیں ۔۔۔ سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

مری زباں سے تو سنتا نہیں خدا میری | تمھیں بلاؤ کہ آئے کہیں قضا میری

یاد دل ہے سراپا تیرا نقش کف پا ہے | غل ہے کہ اک آئینہ سر راہ پڑا ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی | زندہ ہوں اب کہ مردہ یہ بھی خبر نہیں ہے

یاس و ناکامی سے جس قلب مضطر ہو گیا | اب تیرا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

قفس سے چھوٹ کے ہوا باغ باغ دل کیا | بہار دے گیا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

گردش دہر بھی اک گردش پیمانہ ہے | ذرے ذرے میں تیرا جلوۂ مستانہ ہے

نظر صاحب کو ابتدائے زندگی ہی سے علم و ادب سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ یہ دلچسپی آخر عمر تک اس طرح قائم رکھی کہ زندگی بھر انھوں نے کوئی اور شغلہ اختیار ہی نہیں کیا ——— فطرت سے انھوں نے علم ادب کے لئے نہایت موزوں طبیعت پائی تھی۔ قدرت نے انھیں نہایت شستہ و سلیم ذوق سخن عطا کیا تھا۔ ان کا معیار خیال بہت اونچا، ان کا مطمح نظر بلند اور رفیع تھا۔ ان کی پسند مشکل ہوتی تھی، خیالات وسیع اور نظر غائر اور نکتہ رس رکھتے تھے۔ ہر اعتبار سے آپ کا کلام اردو کے بہترین شعراء کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ ان کی زبان صاف اور پاکیزہ، ان کی بندشیں چست اور طرز بیان ہمیشہ بے عیب ہوتا تھا۔ ان کا درجہ دور جدید کے تنقید نگاروں میں بہت اونچا تھا۔

(زمانہ۔ مئی سنہ ۲۳ء)

حالات حاضرہ

صدر جمہوریۂ ہند کا پیغام

اس سال یوم آزادی کے موقع پر صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے قوم کو جو پیغام دیا وہ ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ پچھلے پندرہ برس میں بلاشبہ ہم نے ترقی کی ہے اور ہماری معاشی حالت قدرے بہتر ہوئی ہے، صنعت، زرعی پیداوار، دیہی ترقی اور تعلیم کے میدان میں ہم نے جمہوری طریقہ کار اختیار کر کے نمایاں طور پر قدم آگے بڑھایا ہے۔ لیکن تہذیبی اور اخلاقی قدروں کے پیمانے سے اگر ہم ملک کی حالت کا جائزہ لیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ اس بات کا احساس ہر صاحب فہم ہندوستانی کو ہے اور ہمارے صدر نے اسی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ ہندوستانی سماج کو اگر کوئی چیز انتشار سے بچا سکتی ہے تو وہ جمہوریت ہے۔ اگر ہم اس کے اصولوں کو اپنائیں اور جمہوری طریقہ ہائے کار پر عمل پیرا ہیں تو ہم انتشار پیدا کرنے والے رجعت پرست اور سماج دشمن رجحانات سے کبھی اور کسی صورت میں سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ ہندوستان نام ہے اس کے کروڑوں انسانوں کا، ان کی ترقی، ان میں احترام انسانیت کے جذبہ کو پیدا کرنا، ان کو اخلاقی اور روحانی قدروں کے ایک سلسلہ میں منسلک کرنا —— یہی ہندوستان کی حقیقی ترقی ہے، اس محاذ پر ناکامی کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہر محاذ پر ناکام رہے، ہماری مادی ترقیاں بے مقصد اور بے جان ثابت ہوں گی، اگر ہم نے جمہوریت اور انسانیت کے معیاروں کو نہیں اپنایا اور تنگ نظر عناصر کے ہاتھوں میں اپنی رہنمائی کا کام سونپ دیا۔

آئے دن ملک میں جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور گذشتہ انتخابات کے موقع پر ملک میں انتشار پیدا کرنے والے رجحانات جس طرح ابھر کر سامنے آئے ہیں، اس کے پیش نظر اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی کہ قومی یکجہتی کی ایک تحریک ملک گیر پیمانے پر چلائی جائے

اور قوم پر یہ واضح کیا جائے کہ بامقصد ترقی پذیر سماج کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ ملک کا اتحاد برقرار رہے، جمہوری اصولوں کو عقیدے کے طور پر اپنایا جائے اور انسانی قدروں کے احترام کا عام چرچا ہو، بے شک یہ کام بہت ضروری ہے، لیکن افسوس ہے کہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی سے متعلق عام طور پر ذہن صاف نہیں ہے، اس ذہنی پراگندگی کا سایہ ہماری قومی زندگی پر بھی پڑ تاہے، نتیجہ یہ ہے کہ قومی یکجہتی کی تحریک ابھی تک علمی اور نظری بحث و مباحثے کی منزل سے آگے نہیں بڑھی ہے۔

صدر جمہوریۂ ہند نے یہ بھی کہا کہ جمہوریت ہمیں جدیدیت کی طرف لے جائے گی، آج بیسویں صدی میں ہمارا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا اگر ہم ایک گزرے ہوئے عہد کے اداروں کو سینے سے لگائے رہے، آج یہی ہمارے انتشار کا بڑا سبب ہے، ہمیں ہندوستانی تہذیب کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے سماجی اور تہذیبی اداروں کی نئی تنظیم کرنا ہے، ہمارا یہی اقدام پائدار، مثبت اور صحت مند ہوگا۔ کسی باہری خطرہ سے محض وقتی طور پر متحد ہو جانا پائدار اور ترقی پذیر سماج کی تعمیر کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔

شمالی سرحدوں کی طرف سے خطرہ

اس وقت جبکہ ہم ملک کی تعمیر و ترقی کے منصوبے کو عمل میں لانے کی جدوجہد کر رہے ہیں، چین کے جارحانہ رویے نے ہماری توجہ دفاعی مسائل کی طرف مرکوز کر دی ہے، اور اگرچہ اس وقت چین سے جنگ کے خطرہ نہیں ہے لیکن حالات بہت گمبھیر ہیں، ۱۵ اگست کو پنڈت نہرو نے کہا کہ ہمیں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے اس لئے کہ کچھ لوگ ہیں جو ہماری طرف کینہ پرور اور دشمن کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔" اس مہینے پارلیمنٹ میں جو مباحثہ ہوا اس کی روشنی میں بھی یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لداخ کے علاقہ میں چین کی جارحانہ کارروائیوں کے سبب تناؤ بہت بڑھ گیا ہے اور مختلف طریقوں سے چین کے ارباب حل و عقد پر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ کشمکش کی فضا ایسی زہریلی ہو گئی ہے کہ کوئی واقعہ جنگ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، اور جنگ صرف چین اور ہندوستان ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا

کے لئے تباہ کن ہوگی۔ پارلیمنٹ میں حزب مخالف کے بعض رہنماؤں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ جب تک چین مُسلّمہ بین الاقوامی سرحدوں کے پیچھے نہ ہٹ جائے چین سے گفتگو نہ کی جائے، ان لوگوں کا خیال یہ بھی تھا اور خاص طور سے سوشلسٹ پارٹی کے لوگوں نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اب ہمیں غیر جانبداری کی پالیسی کو ترک کر دینا چاہیئے ورنہ ہم اپنی آزادی کو نہیں بچا سکیں گے۔
لیکن پنڈت نہرو نے یہ مطالبہ کیا کہ حکومت ہند کو اس معاملہ میں پوری آزادی دینا چاہیئے انھوں نے کہا کہ چین کے معاملہ میں جو کچھ کیا جائے گا۔

اس سے پارلیمنٹ کو باخبر رکھا جائے گا اور کوئی ایسی صورت حال نہیں قبول کی جائے گی جس سے جو ملک کی آبرو اور وقار پر حرف آتا ہو، لیکن میری حکومت کو اتنی آزادی ہونا چاہیے کہ اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے طے کرے، پنڈت نہرو نے کہا گفتگو کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ سیاسی اصطلاح میں جسے گفت وشنید (NEGOTIATIONS) کہا جاتا ہے وہ اور چیز ہے اور اس کے آداب مختلف ہوتے ہیں، لیکن گفت وشنید سے پہلے چین کے ذمہ داروں سے گفتگو کرنا اور ان پر ہندوستان کے موقف کو واضح کر دینے میں فائدہ ہو سکتا ہے کہ تناؤ کی فضا ہلکی ہو اور معاملات کے طے کرنے میں آسانی ہو۔ پنڈت جی نے جس وقار اور اعتماد کے ساتھ یہ باتیں کہی ہیں، اور ان پر خود ملک کو جیسا بھروسہ ہے اس کے پیش نظر یہ امید کی جا سکتی ہے کہ حکومت ہند چین سے کوئی ایسا معاملہ نہیں کرے گی جو ایک آزاد قوم کے وقار کے شایانِ شان نہ ہو۔

ہندوستان نے غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کر کے دنیا کی آزاد قوموں میں ایک باوقار جگہ پیدا کی ہے، اعصابی جنگ کے تباہ کن اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا ہے۔ اور پسماندہ ملکوں کے کاز کو جرات اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھایا ہے، اس لئے جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اب ہمیں اس پالیسی کو ترک کر دینا چاہیئے وہ درحقیقت ملک کو ایک ایسی صورت حال سے دوچار کرنا چاہتے ہیں جہاں اس کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوگی اور اکثر ناانصافی اور جبر کا ساتھ دینا ہوگا، عام طور پر یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ملک میں ایک ایسا سماج چاہتے

ہیں جس میں مفاد پرستوں اور سرمایہ داروں کو پوری آزادی ہو اور سماجی انصاف ایک بے معنی چیز ہو کر رہ جائے، بلاشبہ ایسے لوگوں کے مشورے ملک کے لئے مجموعی طور پر مضرت رساں ہوں گے، یہی وہ لوگ ہیں جو رجعت پرست عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے ملک میں انتشار کی فضا پیدا کر رہے ہیں۔

پاکستان کا رویہ

ڈپلومیسی کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں، چین اور پاکستان کے موجودہ تعلقات کے بارے میں جو خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہندوستان دشمنی کے جذبے نے ان دونوں "متضاد مزاج" والے ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے، حالانکہ دونوں ملک اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی راہیں مختلف ہیں پھر بھی ڈپلومیسی کا تقاضا ہے کہ ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لئے وقتاً فوقتاً ایسی خبریں آتی رہیں جن سے معلوم ہو کہ چین اور ہندوستان کی دوستی بڑھ رہی ہے اس وقت پاکستان کی آرزو ہے کہ چین اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جائے تو وہ کسی طرح کشمیر کے مسئلہ کی آڑ لے کر ہندوستان سے انتقام لے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مشرقی پاکستان میں مغربی بنگال کی سرحد سے متصل، پاکستانی فوج خندقیں کھودنے کے کام تیزی سے کر رہی ہے۔ یہ بھی فضا کو گرم رکھنے کا طریقہ ہے، غالباً پاکستان کو یہ امید ہے کہ چین اور ہندوستان کے مابین جنگ کی صورت میں کشمیر پر قبضہ کرنے کا امکان بہت بڑھ جائے گا، پاکستان کا یہ رویہ آگ سے کھیلنے کے مرادف ہے جس کا انجام بہت خوفناک ہو سکتا ہے۔

"راکٹ سازی" کا مقابلہ

اس وقت متحدہ عرب جمہوریہ اور اسرائیل میں راکٹ بنانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ درحقیقت اسلحہ بندی کی دوڑ میں آگے نکل جانے کا مقابلہ ہے۔ دونوں ملکوں میں راکٹ اڑائے جا چکے ہیں، مصر کا دعویٰ ہے کہ یہ اس کے اپنے سائنس دانوں کا کارنامہ ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مصر ایٹمی اسلحہ سازی کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ دوسری طرف اسرائیل سچ مچ ایٹمی اسلحوں کی تیاری میں مصروف ہے اور اس نے ڈمونا میں ایک کارخانہ بھی قائم کیا ہے، اس سلسلہ میں اسرائیل کیا کر رہا ہے اور اپنے اس منصوبے پر کتنا صرف کر رہا ہے، یہ بات اسرائیلی پارلیمنٹ کو بھی نہیں بتائی گئی ہے۔

راکٹ بغیر ایٹمی اسلحہ بندی کے بے کار ہیں، اسرائیل کے شہر تل ابیب اور بیت المقدس وغیرہ پھیلے ہوئے شہر ہیں اور جب تک مصری راکٹ بازوں کا نشانہ بالکل صحیح نہ ہو، اسرائیلی شہروں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچ سکتا، برخلاف اس کے اسرائیل کا راکٹ مصر کے شہر قاہرہ اور اسکندریہ کو جو بہت گنجان اور سمٹی ہوئی آبادیاں ہیں، کافی نقصان پہنچا سکتے ہیں، خاص طور سے اس صورت میں جب اسرائیل ایٹمی طاقت بننے کے لئے دن رات کوشاں ہے۔

لیکن فوجی زاویۂ نگاہ سے قطع نظر سیاسی سطح پر اس کے اثرات زیادہ اور فوری نظر آتے ہیں۔ اِدھر کئی سال سے اسرائیل کی آبادی کا خاصا حصہ اس صورت حال سے بیزار اور ہراساں ہے کہ عرب ممالک اسرائیل سے کسی قسم کے سمجھوتے کے لئے تیار نہیں ہوتے، ایک جنگ کی کیفیت ہے جو طاری ہے، انھیں یقین ہے کہ عرب کسی طرح یہودیوں کی اس ریاست کو برداشت نہیں کریں گے اور موقع ملتے ہی اسے ختم کر ڈالیں گے۔ یہ صورت اتنی غیر یقینی اور پریشان کن ہے کہ اسرائیل کی بوڑھی نسل اپنی نئی نسل کے مستقبل کی طرف سے لرزاں اور ترساں ہے، ان کے سامنے یہ سوال ہے کہ وہ کس کے لئے اسرائیل کی تعمیر میں اپنی توانائی اور دولت کھپائیں؟ نئی نسل کے غیر یقینی مستقبل کے لئے اتنی بھاری قربانی کی معقولیت پر اب انھیں شبہ ہونے لگا ہے۔ باہر کے سرمایہ دار اور مہاجن جو اسرائیل کے کمزور معاشی نظام کو چلا رہے ہیں، وہ بھی سوچ رہے ہیں کہ ایسے ملک میں اپنا سرمایہ لگانے سے کیا فائدہ؟ مصر کی راکٹ سازی کا واقعہ ان کو اور خوف زدہ کر دے گا۔ مزید براں، باہر سے آکر اسرائیل میں آباد ہونے والے یہودیوں کی تعداد پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔

عرب ملکوں کا اختلاف

شام نے متحدہ عرب جمہوریہ پر الزام لگایا ہے کہ وہ جمہوریۂ شام کی ساورنٹی اور علاقائی سالمیت کا احترام نہیں کرتی "۔ شام کی اس شکایت کو رسمی طور پر سننے کے لئے اس مہینے کے تیسرے ہفتہ میں لبنان میں عرب لیگ کا اجلاس ہوگا۔ اس اجلاس میں شام اپنی شکایات کو ایک میمورنڈم کی شکل میں پیش کرے گا۔ خیال ہے کہ اس میمورنڈم کے اہم نکات حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے ریڈیو اور اخبارات نے بڑے پیمانے پر شام کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم شروع کر رکھی ہے، مقصد یہ ہے کہ شام کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے، اور مصر سے اس کا الحاق ہو جائے۔

۲۔ بیروت میں متحدہ عرب جمہوریہ کا سفارت خانہ شام میں اپنے ایجنٹ بھیجتا رہتا ہے، جو بموں کے دھماکے سے خوف کی ایک فضا پیدا کرتے ہیں اور دمشق کی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

۳۔ صدر ناصر نے خود اپنی ۲۳ جولائی کی تقریر میں شام کو متحدہ عرب جمہوریہ کا شمالی علاقہ قرار دیا اور اس طرح وہ اپنی سابقہ پالیسی سے پھر گئے کہ شام کا معاملہ اہلِ شام ہی کو طے کرنا ہے۔

۴۔ کرنل عبدالحمید سراج نے جو ناصر کے آدمی ہیں، لبنان میں ایک SHADOW CABINET بنائی ہے اور وہ اس کی تیاری کر رہے ہیں کہ شام میں داخل ہو کر اپنی حکومت قائم کر لیں۔

ان الزامات کا جواب متحدہ عرب جمہوریہ کے پاس تیار ہے۔ قاہرہ والوں کا کہنا ہے کہ شام نے خود پروپیگنڈے کی سرد جنگ کا آغاز کیا ہے۔ لبنان کے وزیر داخلہ کمال جمبلات نے اعلان کیا ہے کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ لبنان میں ناصر دوست عناصر شام کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں۔ شام کو صدر ناصر نے شمالی علاقہ ضرور کہا مگر وہ محض نظری اعتبار سے، یعنی یہ کہ ایک عرب قوم ہے اور اہلِ شام اس قوم کے وطن کے شمالی حصہ میں آباد ہیں۔

صورت حال یہ ہے کہ عرب لیگ کے جلسہ میں ایک عرب قوم دوسری عرب قوم کے خلاف الزامات لگائے گی اور اس طرح عرب قومیت کے تصور کا کھوکھلا پن ثابت کرے گی، اس موقع پر سعودی عرب اور اُردن، شام کی تائید کریں گے، کیوں کہ آج کل متحدہ عرب جمہوریہ سے ان کے تعلقات خراب ہیں، عراق، جو شام کی حمایت میں ہوتا، غالباً اس جلسہ میں شریک نہیں ہوگا کیوں کہ وہ عرب لیگ سے اس لئے ناراض ہے کہ کویت کو اس کی رکنیت کیسے ملی، باقی دوسری عرب ریاستیں اس کی کوشش کریں گی کہ گھر کا یہ جھگڑا دب جائے اور معاملہ درہم برہم ہو جائے۔

تعلیمی مسائل

"یوتھ ہوسٹل"

جرمنی کے ایک نیک دل اُستاد رچرڈ شرمن نے ۱۹۰۹ء میں یوتھ ہوسٹلز ایسوسی ایشن" قائم کی۔ وہ بڑے شہروں میں بسنے والے بچوں کی زندگی کو خوشگوار بنانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچوں کو مناظرِ قدرت سے لگاؤ پیدا کرنے کے لئے گھومنے پھرنے کی ترغیب دینی چاہیئے۔ لیکن خاص طور پر محدود وسائل رکھنے والے نوجوانوں کی طرف ان کا دھیان تھا تاکہ سیر و تفریح کے بہانے سے انہیں اپنے دیس سے بخوبی روشناس ہونے کا موقع مل سکے۔ اور دورانِ سفر میں قیام کے لئے مناسب جگہ میسّر آسکے۔ سب سے پہلے انھوں نے جرمنی میں الٹینا مقام پر اپنے مدرسے میں "یوتھ ہوسٹل" قائم کیا۔ تعلیمی سیر کے دوران میں ان کے مدرسے کے طلبہ نے بڑی زحمتیں اٹھائی تھیں اور قیام کے لئے کہیں معقول انتظام نہ ہوسکا تھا۔ اس صورتِ حال سے متاثر ہوکر انھوں نے مختلف مقامات سے آنے والے طلبہ کے ٹھہرنے کا بندوبست اپنے مدرسے میں کیا۔ اور دوسروں کو اس طرف توجہ دلائی۔ اُن کی یہ اسکیم کافی مقبول ہوئی اور رفتہ رفتہ اس میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ ابتدا میں یہ اسکیم محض مدرسے کے بچّوں تک محدود تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد نوجوانوں کو بھی اس پروگرام میں شامل کر لیا گیا۔

تقریباً دو سال گزرے کہ رچرڈ شرمن ۸۷ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے لیکن ان کی زندگی ہی میں یوتھ ہوسٹل تحریک نے بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی اور دنیا کے بہت سے ممالک میں یوتھ ہوسٹل قائم ہوگئے۔ اب ان کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ یوتھ ہوسٹل تحریک، ساکنانِ عالم میں ربطِ باہمی پیدا کرنے کا ایک نہایت ہی دلچسپ اور موثر ذریعہ ہے۔ اس طرح آپس میں مفاہمت پیدا ہوتی ہے اور رواداری بڑھتی ہے۔ نوجوانوں کے ذہنوں میں وسعت اور دلوں میں کشادگی آتی ہے جو

انجمیں انسانیت کا علم بردار بناتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ تحریک، جرمنی کے علاوہ سوئٹزرلینڈ، بلجیم اور ہالینڈ۔ فرانس اور انگلستان میں پھیلی۔ اور سنہ ۱۹۳۲ء میں اس کی بین الاقوامی انجمن قائم ہوئی جس کی رکنیت ہر ایک ملک کی انجمن کو حاصل تھی۔ ایسے چند اصولوں پر سب کو کاربند ہونے کے لئے کہا گیا جن کی بنا پر سیاحوں کو بیرونی ممالک میں سہولت حاصل ہو سکے۔ ہر ایک ملک کی انجمن نے ایک دوسرے کی رکنیت کا کارڈ تسلیم کیا اور سب کارڈ یکساں طرز پر تیار ہوئے۔ اس انجمن میں سب سے زیادہ قابلِ فخر اور نمایاں بات یہ رکھی گئی کہ اس کی رکنیت بلا اختلاف رنگ و نسل اور قوم و ملک سب کے لئے صلائے عام رہی۔ اس وقت سے بلا وقت ہر ایک ملک کی انجمن اپنے مزاج کے مطابق ترقی کر رہی ہے اور اس کی کارگذاریوں میں وہاں کی تہذیب و معاشرت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

'یوتھ ہوسٹل' کو ایک باقاعدہ 'اقامت گاہ' یا باضابطہ 'آسائش گاہ' نہیں سمجھنا چاہیئے انہیں ایک ایسی جائے قیام تصور کیا جا سکتا ہے جہاں صرف چند پیسوں میں دو تین دن تک مقیم رہا جا سکتا ہے۔ ان کا مقصد گھوم پھر کر دیس دیکھنے والوں اور دیس بدیس کے سیاحوں کو معمولی سہولتیں فراہم کرنا ہے۔ یہ عیش و آرام کی سہولتیں فراہم نہیں کرتے۔ انہیں تعلیمی سیر کے حصولِ مقاصد کا ایک معقول ذریعہ سمجھنا چاہیئے۔ ایشیائی ممالک میں سب سے پہلے سنہ ۱۹۴۹ء میں ہمارے ملک میں 'یوتھ ہوسٹل کی تحریک' کا آغاز ہوا۔ گذشتہ دس بارہ سال میں اس انجمن نے 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کو مقبول بنانے میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ اس وقت تقریباً ۱۴۰ ہوسٹل موجود ہیں۔ اور مختلف ریاستوں نے متعدد ڈاک بنگلوں اور دوسری سرکاری قیام گاہوں میں یوتھ ہوسٹل انجمن کے ممبران کو 'رین بسیرے' کی اجازت صرف آٹھ آنے یومیہ پر عنایت کر رکھی ہے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں ہمارا ملک باضابطہ طور پر بین الاقوامی انجمن کا مستقل رکن قرار دے دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ملک کی انجمن کی تین روپے سالانہ فیس رکنیت ادا کرنے کے بعد آپ دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلے ہوئے تین ہزار 'یوتھ ہوسٹلوں' میں قیام کر سکتے ہیں اور اس طرح دور دراز ممالک میں بسنے والوں سے 'قلمی دوستی' پیدا کی جا سکتی ہے۔ اپنے دیس سے واقفیت حاصل کرنے کی آسان صورت ہاتھ آجاتی ہے اور نوجوانوں کے کردار کی تربیت ہوتی ہے۔ ان میں ضبط پیدا ہوتا ہے اور ذمہ داری کا احساس بڑھتا ہے۔

باقاعدگی کے ساتھ صحرا نوردی کرنے سے نہ صرف جسم کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ذہنی اور جذباتی آسودگی بھی حاصل ہوتی ہے۔ تفریح اور ورزش کی نیت سے دور دور تک پیدل سفر کرنے سے صرف جہاں گردی ہی نہیں ہوا کرتی بلکہ وسعت نظر بھی پیدا ہوتی ہے اور عظمت وطن کا احساس بھی بیدار ہوتا ہے۔ "یوتھ ہوسٹل تحریک" کو ہر قسم کے امتیازات سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ معتقدات و خیالات اور دولت و مرتبہ کا لحاظ کئے بغیر پندرہ سال سے زائد عمر کا ہر ایک فرد "یوتھ ہوسٹل انجمن" کا رکن بن سکتا ہے۔ یہاں پر کسی قسم کے سیاسی معتقدات کے اظہار اور تلقین کی اجازت بھی نہیں دی جاتی ہے۔ قومی ہم آہنگی اور جذباتی یگانگت پیدا کرنے کا یہ ایک بہت ہی اچھا ذریعہ ہے۔ اس کی بدولت مختلف علاقوں اور ریاستوں کے بسنے والے ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور یکجہتی کے جذبے کو توانائی بخش سکتے ہیں۔ ہمارے دیس کے سنوارنے میں دستِ قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے اور تاریخ کے ہر دور میں یہاں کے رہنے والوں نے اپنے ذوقِ نظر اور قوتِ بازو سے پورے خلوصِ نیت کے ساتھ اس کو چار چاند لگائے ہیں۔ اس انجمن سے وابستگی ان سب سے لطف اندوز ہونے اور اپنی چشمِ بصیرت کو وا کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ربط باہمی بڑھتا ہے اور اشتراک و تعاون کی تعلیم ملتی ہے۔

یوتھ ہوسٹل انجمن کا رکن انفرادی طور پر بھی بنایا جا سکتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔ ہر ایک ادارہ اپنے دار الاقامے میں یوتھ ہوسٹل کے اراکین کے لئے مستقل طور پر کسی مخصوص زمانے میں کچھ نہ کچھ جگہ قیام کے لئے ضرور مہیا کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ دیگر سہولتیں کیا کیا میسر آسکتی ہیں۔ اسی لحاظ سے سیاح آتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چند راحت فضا اور تاریخی مقامات پر مستقل عمارتیں بھی مہیا کی گئی ہیں۔ ہر ایک سیاح یوتھ ہوسٹل پہنچتے ہی وہاں کے اتالیق کی خدمت میں اپنی رکنیت کا کارڈ پیش کرتا ہے اور اس ہوسٹل کے قواعد و ضوابط کی پوری طرح پابندی کرتا ہے۔ دورانِ قیام میں اسے ہوسٹل کے تہذیبی اور تفریحی مشاغل میں شرکت کا موقع حاصل ہوتا ہے اور وہ وہاں کے معمولات میں حصہ لے سکتا ہے۔ روانگی کے وقت

رکنیت کا کارڈ واپس کیا جاتا ہے جو اس کے مہذبانہ طرزِ عمل کا ثبوت ہوتا ہے۔ اب ضرورت یہ ہے کہ ملک کے بیشتر تفریحی اور تہذیبی مرکزوں کے قریب 'یوتھ ہوسٹل' قائم کئے جائیں اور بڑے بڑے سب ہی تعلیمی ادارے 'یوتھ ہوسٹل انجمن' کی رکنیت اپنی تعلیمی اور اخلاقی ذمہ داری تصور کریں۔ عموماً تعلیمی ادارے اپنی غیر نصابی دلچسپیوں میں تعلیمی سیر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن اس کی صورت اکثر و بیشتر ایک سالانہ رسم کی سی ہوگئی ہے۔ اگر اس تعلیمی سیر کے پروگرام میں 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کی رُوح پھونک دی جائے اور بڑی بڑی تعطیلات کو اس ڈھنگ سے "بھارت درشن" میں صرف کرایا جائے تو بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ دوسرے قومی پنجسالہ منصوبے میں دس لاکھ روپیہ 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کے فروغ کے لئے رکھا گیا تھا اور تیسرے منصوبے میں یہ رقم بارہ لاکھ تجویز کی گئی ہے۔ اب حکومت ہند کی طرف سے ایک مرکزی کمیٹی نامزد کی گئی ہے جو 'یوتھ ہوسٹل تحریک' کو نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مناسب جگہ دینے کے لئے تجاویز مرتب کرے گی اور حکومت کو اس کی ترقی کے سلسلے میں مختلف مشورے دے گی۔

ہماری "یوتھ ہوسٹل انجمن" کے نشان پر "چرن دے مدھو وِندت" درج ہے یعنی "گھومنے سے شہد حاصل ہوتا ہے"۔ یہ مقولہ ہمیں انجمن کے مقصد کی طرف توجہ دلاتا ہے اور 'سفر وسیلہ ظفر' کے قول کی یاد تازہ کرتا ہے۔ سچ ہے۔ سیر میں خیر!

'معلّم'

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

بابائے اُردو مولوی عبدالحق مرتبہ: عبداللطیف اعظمی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۳۲۰ صفحات، کتابت و طباعت عمدہ۔ مجلد مع گرد پوش

قیمت ساڑھے چار روپے۔ تاریخ اشاعت: جولائی ۱۹۶۲ء

ناشر: ادارۂ فروغ اردو۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ۔

۱۶ اگست ۶۲ء کو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی وفات کو ایک سال ہو گیا ہے۔ اس عرصے میں بابائے اردو پر کس قدر لکھا گیا ہے، اس کے بارے میں ایک پاکستانی ادیب جناب حمایت علی شاعر لکھتے ہیں: "باباکے بعد کتنے رسائل نے ان کے کارناموں کا جائزہ لیا، کتنے ادیبوں نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا؟ —— مجھے یاد ہے کہ کراچی اور حیدر آباد کے دو تین ماہناموں اور لاہور کے ادب لطیف کے علاوہ کسی رسالے کے ایڈیٹر نے یہ زحمت گوارا نہ کی کہ کوئی مبسوط نمبر شائع کرتا۔ کراچی اور لاہور کے مذکورہ رسائل نے بھی صرف چند صفحات مخصوص کئے اور بس! —— اس کے برعکس ہندوستان کے رسالوں نے بڑے ضخیم نمبر شائع کئے —— ہندوستان، جہاں اردو ختم ہو رہی ہے" (نئی قدریں۔ حیدر آباد دوباک۔ اگست ۶۲ء)

ہندوستان ہی کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں سے سب سے پہلے بابائے اُردو پر ایک جامع اور مبسوط کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مرحوم کی شخصیت، ان کے علمی کارناموں اور انجمن ترقی اردو کی ابتدا سے اب تک کی تاریخ پر ہندوستان و پاکستان کے مشہور اصحاب قلم کے مضامین اور مرحوم کے منتخب خطوط شامل ہیں۔ بابائے اردو کی زندگی میں اور ان کی وفات

کے بعد ان کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ہیں، ان میں سے شاید ہی کوئی اچھا مضمون اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔

اس کتاب میں جن لوگوں کے مضامین شامل ہیں، ان میں ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، جناب اسلوب احمد انصاری، جناب خواجہ حمید الدین شاہد اور جناب نصیر الدین ہاشمی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ادیب (عبدالسلام نمبر)   مرتبہ : کبیر احمد جائسی

جناب کبیر احمد جائسی صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ انھیں بجا طور پر شکایت ہے کہ مولانائے مرحوم کی وہ قدر و عزت نہیں ہوئی، جس کے وہ مستحق تھے لیکن، جیسا کہ خود جائسی صاحب نے لکھا ہے، اس کی بڑی وجہ مولانا کی خلوت پسندی ہے۔ جائسی صاحب کو مولانائے مرحوم سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، اس لئے ان کے احوال و کوائف اور خیالات معتقدات سے انھیں براہِ راست واقفیت حاصل ہے اور بقول خود وہ مولانا کی تحریروں کے اداشناس ہیں، اس لئے اپنی کم عمری کے باوجود وہ مرحوم کے بارے میں لکھنے کے اہل اور مستحق ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس طویل مقالے میں اپنی اہلیت اور واقفیت کا پورا ثبوت دیا ہے اور مولانائے مرحوم کی خصوصیات اور کارناموں کو پوری طرح اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مقالہ مولانائے مرحوم کی شخصیت اور علمی کارناموں کا محض ایک سرسری جائزہ ہے۔ اگر موصوف چاہتے ہیں کہ مولانائے مرحوم کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے آئے، جو ان کی خلوت پسندی اور مخصوص مزاجی کیفیت کی وجہ سے سامنے نہ آسکی، تو اس کے لئے ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہوگی۔

جائسی صاحب کے اس خیال سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ مولانا کی مطبوعہ کتابوں سے ان کے مذہبی افکار و خیالات کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا اور موصوف نے مرحوم کے جس مسودہ کو ان کے مجتہدانہ خیالات کا واحد ماخذ قرار دیا ہے وہ جب تک مکمل طور پر شائع ہو کر سامنے نہ آجائے، محض اقتباسات کی بنا پر کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

بہر حال کبیر احمد جائسی صاحب نے یہ مقالہ لکھ کر ایک ضروری اور مفید کام انجام دیا ہے۔ مگر اسے محض آغاز سمجھنا چاہیئے۔

"ادیب" کا یہ خاص نمبر جامعہ اُردو۔ علی گڑھ سے خریدا جا سکتا ہے۔ ایک پرچہ کی قیمت پچاس نئے پیسے ہے اور سالانہ چندہ سات روپے۔ مدیر جناب ابن فرید صاحب ہیں۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کی معلوماتی کتابیں

ادارۂ تعلیم و ترقی کا ایک شعبہ تصنیف و تالیف ہے، جو ایک طویل عرصہ سے ان پڑھ اور نوخواندہ بالغوں کے لئے کتابیں تیار کرتا اور شائع کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے اُردو ہندی میں بہت مفید اور ضروری کتابیں شائع کی ہیں۔ اب اس نے "اپنی دنیا" کے نام سے ایک معلوماتی سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کی حسب ذیل کتابیں ابھی حال میں شائع ہوئی ہیں:-

(۱) برف کا گھر: از محمد حسین حسان

(۲) موسم کے بارے میں سو سوالات اور ان کے جوابات: از محمد امین

(۳) برف کے تیرتے پہاڑ: از مجیب احمد خاں

حسین حسان صاحب بچوں کے مشہور رسالہ "پیام تعلیم" کے ایک طویل عرصے تک اڈیٹر رہ چکے ہیں اور بچوں کے لئے متعدد کتابیں لکھی ہیں، اس لئے موصوف کو آسان زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے، طرز تحریر بھی بچوں کی مناسبت اور ان کے مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی کتابیں نوعمر بچے اور نوخواندہ بالغ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ محمد امین صاحب کا خاص مضمون جغرافیہ ہے۔ اس لئے "موسم کے بارے میں سو سوالات اور ان کے جوابات" بڑی مفید اور پر از معلومات کتاب ہے۔ "برف کے تیرتے پہاڑ" پندرہ صفحے کا ایک کتابچہ ہے۔ اس میں زمین کی پیدائش کا مختصر حال بیان کرنے کے بعد آئس برگ (برف کے تودے) کے متعلق تفصیل سے بتلایا گیا ہے۔

ان تین کتابوں میں سے دو بلاک کے ذریعہ چھپی ہیں، لیتھو کی طباعت بھی بہت اچھی ہے حسب ضرورت ان میں بلاک کی تصویریں بھی ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ سے خریدی جا سکتی ہیں۔

جامعہ میں صحبت شعر و سخن

یوم آزادی کے سلسلے میں ۱۴ اگست کی رات میں ریڈیو پر کل ہند مشاعرہ ہوا تھا۔ اُن دنوں جامعہ میں چھٹیاں تھیں، اس لئے کوئی بڑا مشاعرہ تو منعقد نہیں کیا جا سکا، مگر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور غلام ربانی تاباں صاحب کی دعوت پر ۱۵ اگست کو چند شعراء جامعہ تشریف لائے اور اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ فرمایا۔ ذیل میں وہ غزلیں پیش کی جاتی ہیں، جو اس مختصر صحبت میں سنائی گئی تھیں۔

محترمہ ممتاز مرزا

اے محوِ انتظار سحر کی دُعا نہ مانگ
کچھ اور درد مانگ خدا سے دوا نہ مانگ

شاہد ہے میرے جرم کی پیاری کائنات
مجھ سے ثبوتِ جرمِ وفائے وفا نہ مانگ

بے آسرے گزار بھی دے اپنی زندگی!
مہر و وفا کا ذکر ہی کیا ہے جفا نہ مانگ

تیرے شعور غم پہ طلب کا ہے انحصار
کیسے بتاؤں عشق میں کیا مانگ کیا نہ مانگ

ہونا پڑے نہ حشر میں قاتل کو شرمسار
ممتاز جو ہوا سو ہوا، خوں بہا نہ مانگ

ڈاکٹر وحید اختر

تم گئے ساتھ اجالوں کا بھی چھوٹا ٹھیرا
روز و شب اپنا مقدر ہی اندھیرا ٹھیرا

کوئی الزام نسیمِ سحری پر نہ گیا
پھول ہنسنے پہ خطاوار اکیلا ٹھیرا

موتیاں رہ گئیں، بولے اڑی آوارہ صبا
قافلہ موجِ بہاراں کا بس اتنا ٹھیرا

روز نظروں سے گذرتے ہیں ہزاروں چہرے — سامنے دل کے مگر اک یہی چہرا ٹھیرا
وقت بھی سعیِ مداوائے الم نہ کر سکا — جب سے تم بچھڑے ہو خود وقت ہی ٹھیرا ٹھیرا
گنگنائیں گے غزل آج وحید اختر کی
نام لینا بھی جو در پردہ تمہارا ٹھیرا

جناب شاذ تمکنت

حیات راس نہ آئے اجل بہانہ کرے — ترے بغیر بھی جینا پڑے، خدا نہ کرے
میں روز مرتا ہوں اس انتظار کے صدقے — بُرا نہ مان اگر زندگی وفا نہ کرے
ہم ایک ہو گئے دو دن میں کس طرح اللہ — یہی دعا ہے کوئی تیسرا جُدا نہ کرے
میں اپنی روشنیٔ طبع سے لرزتا ہوں — مرا جنوں مجھے منزل سے آشنا نہ کرے
منایا جشنِ شبِ غم کہ ایک دن نو کٹا — جو تجھ سے چھوٹ کے جیتا ہے وہ کیا نہ کرے
میں کیا بتاؤں کہ قربت کا فاصلہ کیا ہے
کہ جیسے گھر تو بنائے کوئی رہا نہ کرے

جناب اختر سعید

اک کرن مہر کی ظلمات پہ بھاری ہو گی — رات ان کی ہے مگر صبح ہماری ہو گی
اسی نسبت سے سحر نکھری ہوئی آئے گی — جس قدر رات یہ بیمار پہ بھاری ہو گی
یہ جو ملتی ہے ترے غم سے غمِ دہر کی شکل — دل نے تصویر سے تصویر اُتاری ہو گی
اس طرف بھی کوئی خوشبو سے مہکتا جھونکا — اے صبا تو نے تو وہ زلف سنواری ہو گی
ہم صفیرانِ چمن مل کے پکاریں تو ذرا — یہیں خوابیدہ کہیں یادِ بہاری ہو گی
بوئے گل آتی ہے مٹی سے چمن کی جب تک
ہم پہ وحشت نہ خزاں کی کبھی طاری ہو گی

جناب نشور واحدی

اُن سرمگیں آنکھوں میں آنسو ہیں مژگاں ہے — کچھ دُور اندھیرا ہے کچھ دور چراغاں ہے
اس غم کا نگہباں ہوں جو دل سے نہیں جاتا — کانٹا ہی سہی لیکن مانوسِ گلستاں ہے
اے گردِ رہِ دانش، تو تیز قدم ہو جا — میں نکہتِ گلشن ہوں میرا سفر آساں ہے

دولت کی وہی مستی ذہنوں کی وہی پستی
وہ دَور غلامی تھا یہ دَور غلاماں ہے

جناب میکش اکبرآبادی

جام لا جام کہ عالم گزراں ہے ساقی — بادہ دے بادہ کہ غم دل پہ گراں ہے ساقی
کیا غمِ زیست کہ جز وہم و گماں کچھ بھی نہیں — کیا غمِ حشر کہ یاں ہے سو وہاں ہے ساقی
جمع ہے سارا زمانہ ترے مے خانے میں — جسے انساں کہیں ہم وہ کہاں ہے ساقی
پی کے جب گرنے لگوں میں تو ذرا دھیان رہے — سر مرا خوگرِ آغوشِ بتاں ہے ساقی
کل سنوں گا غمِ فردا ابھی جو فرصت ہوگی — لا مرا ساغرِ امروز کہاں ہے ساقی
کوئی غم غیرِ غمِ بادہ نہیں مجھ کو ملال — یہ غمِ سود و زیاں دل کا زیاں ہے ساقی

ترے میکش کو نہیں خواہشِ عیشِ دو جہاں
بادہ خود مایۂ عیشِ دو جہاں ہے ساقی

کوائف جامعہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات پر تعزیتی جلسہ

۲ر اگست کی صبح کو یکایک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات کی اندوہناک اطلاع ملی تو فوراً جامعہ کے تمام اداروں میں تعطیل کردی گئی اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اسی وقت مرحوم کے جائے قیام پر تعزیت کے لئے تشریف لے گئے اور اس کے بعد ہی جامعہ کے دوسرے اساتذہ اور کارکنوں نے بھی وہاں جاکر خراج عقیدت پیش کیا۔

چند دنوں کے بعد انجمن اساتذہ کے اہتمام اور شیخ الجامعہ صاحب کی صدارت میں جامعہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں ضیاء الحسن فاروقی صاحب، پرنسپل کالج نے مولانائے مرحوم پر ایک مضمون پڑھا، جسے ہم اسی شمارے میں شائع کررہے ہیں اور مولانا قاضی زین العابدین صاحب، استاد اسلامیات نے ایک تقریر کی، جس میں مرحوم کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ آخر میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں مرحوم کی امتیازی خصوصیات کو بیان کیا اور حسب ذیل ریزولیوشن پڑھ کر سنایا، جو بالاتفاق منظور ہوا:

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استادوں، کارکنوں اور طالب علموں کا یہ جلسہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی بے وقت موت پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔

مولانائے مرحوم مختلف فضائل وکمالاتِ علمی وعملی کا ایک گلدستہ صد رنگ دیو تھے جس کی خوشبو سے سارے ہندوستان کی فضا معطر تھی، مولانا ایک متبحر عالم، ایک نکتہ رس

مصنف، ایک شعلہ بیان خطیب اور ایک سرفروش مجاہد تھے۔ مولانا کی وفات سے ایک طرف تعلیمی و علمی ادارے سوگوار ہیں، تو دوسری طرف سیاسی جماعتیں اور انجمنیں، نیز ہندوستان کی تمام قومیں اس رنج و غم میں شریک ہیں۔

مولانا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی انجمن (کورٹ)، مجلس منتظمہ، اور مجلس تعلیمی کے رکن تھے، جس کی وجہ سے مرحوم کی صائب رایوں اور گراں قدر مشوروں سے بڑی مدد ملتی تھی۔ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے، جو بہ مشکل پُر ہو سکے گا۔ ہماری دعا ہے کہ مولانائے مرحوم کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے اور مرحوم کی روح کو اپنی آغوشِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا کرے"

"ہندوستانی مسلمان۔ آج اور کل"

ہم رسالہ جامعہ کی کسی اشاعت میں اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، گاندھی سمارک ندھی کی خواہش اور درخواست پر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر مذکورہ بالا عنوان سے ایک کتاب لکھنے کی تیاری کر رہے ہیں موصوف نے اب اس کتاب کا مقدمہ لکھ لیا ہے، جس میں کتاب کے موضوع اور اس کے پس منظر سے بحث کی ہے اور مسلمانوں کے موجودہ مسائل کی تفصیل سے وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کا جو خاکہ تیار کیا ہے، اس کے مطابق اس کے تین حصے ہوں گے،

حصہ اول، کل کی پرچھائیاں۔ حصہ دوم، آج کا دھندلکا

حصہ سوم، کل کیا؟ اندھیرا یا روشنی؟

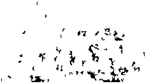
پہلے حصہ میں مسئلے کے تاریخی پس منظر سے، دوسرے میں اصل مسئلے سے اور تیسرے میں اس کے حل سے بحث کی جائے گی۔

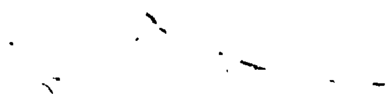
ڈاکٹر صاحب نے ۲۵ اگست کو مجوزہ کتاب کا مقدمہ، جامعہ کالج کے حلقۂ مطالعہ میں پڑھ کر سنایا، جسے حاضرینِ جلسہ نے بڑی دلچسپی اور ذوق سے سنا اور آخر میں متعدد حضرات نے مختلف قسم کے سوالات کئے، جن کے ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے جواب دئے جلسے میں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین صاحب نے بھی شرکت کی۔

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی   مطبوعہ: یونین پریس دہلی   ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی







جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۲ء | شمارہ ۴

فہرست مضامین

مجلسِ ادارت

پروفیسر محمد مجیب　　ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ　　ضیاء الحسن فاروقی

عبداللطیف اعظمی (مرتّب)

خط وکتابت کا پتہ
رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

جگر "آتشِ گل" کی روشنی میں

جناب راجندر ناتھ شیدا

(۲)

پچھلے سال ماہ اکتوبر کے "جامعہ" میں میرا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں میں نے "آتشِ گل" پر ایک نظر ڈال کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ جگر کی اپنی ایک شاعرانہ انفرادیت ہے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اصغر کی شخصیت اور فن نے جگر کی شاعری کو متاثر کیا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے یہی کہا تھا کہ نہ صرف جگر کی شاعری کے صوفیانہ عناصر سے اصغر کے اثرات نمایاں ہیں بلکہ ان کی خالص عشقیہ شاعری بھی، جس کے باعث انھیں اردو غزل کی تاریخ میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے، ایک حد تک اصغر کے طریقۂ فکر سے متاثر ہے۔ یہی نہیں بلکہ جگر کے دورِ آخر کے ان اشعار پر بھی جن میں ہم عصر سماجی حالات اور مسائل پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ایک معنی میں اصغر کا اثر ہے۔ اس طرح کہ اصغر کی صحبت میں جگر کے جو ذہنی رجحانات پختہ ہو گئے تھے جگر نے انھیں کے زاویہ سے اپنے سماجی ماحول پر نظر ڈالی۔

جس مقالے کا ذکر میں نے کیا ہے اس میں میرے پیشِ نظر جگر کی شاعری کے محض صوفیانہ عناصر تھے اس میں اگر کہیں حُسن و عشق سے متعلق جگر کے تصورات کا ذکر آیا ہے تو یا تو عمومی حیثیت سے یا اس لئے کہ تصوف میں جنسی عشق ایک عالم گیر نظریۂ عشق کی ضمنی چیز ہے۔ لہٰذا عشق سے متعلق عام تصورات کا اطلاق جنسی عشق پر بھی ہو سکتا ہے۔

بہرکیف اب میں جگر کی شاعری کے ان دو اہم عناصر یعنی حسن وعشق اور ہم عصر سماجی حالات و مسائل کے بارے میں شاعر کے محسوسات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بحث کو زیادہ پھیلانا مقصود نہیں میں چاہتا صرف یہ ہوں کہ ان عناصر کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈال کر ان کے واقعی عوامل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

جگر کی شاعری کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کے مزاج کو سمجھا جائے۔ اور مزاج کو سمجھنے کے لئے ان حالات پر ایک نظر ڈالنا ہوگی جنہوں نے جگر کے مزاج کو مخصوص صورت عطا کی۔ بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ جگر کے شعور نے خانگی، سماجی، علمی، تعلیمی غرض ہر اعتبار سے ایک ایسی فضا میں آنکھ کھولی اور بلوغ حاصل کیا جس میں زندگی کی قدیم قدروں کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جگر کا بچپن اور عنفوانِ شباب فارغ البالی میں بسر نہیں ہوا اور نہ انھیں مروجہ اعلیٰ تعلیم اور جدید علوم وفنون سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ لیکن اس فضا میں تہذیب نفس کی سہولتیں ضرور موجود تھیں۔ اس نے جگر کو خودداری سکھائی محنت اور تحمل کا درس دیا اور ان کے دل میں انسانی درد اور محبت کے شریفانہ جذبات پیدا کئے۔ جگر کو شاعری اور تصوف کا ذوق بھی اسی فضا سے ملا۔

اسی فضا میں جگر کو زندگی اور شعور کی قدیم وجدید قدروں کے درمیان شدید کشمکش ملی اور اصغر گونڈوی ملے۔ اصغر گونڈوی کی شخصیت نے جگر کو بے حد متاثر کیا۔ انھوں نے شاہ عبدالغنی سے جگر کا رشتہ ارادت قائم کر دیا اور جگر کے ذہن میں تصوف کے بکھرے ہوئے خیالات کو منضبط کرکے مستحکم کر دیا۔ اصغر ہی کی صحبت میں جگر کا ذوق حسن پرستی خاص سانچوں میں ڈھلا۔ حُسن وعشق کے رسمی تصورات میں کئی باتیں جو اصغر کے منافی تھیں جگر کو بھی معیوب نظر آنے لگیں اور کچھ باتیں جن پر اصغر اصرار کرتے تھے جگر نے اپنالیں۔ اس اخذ وترک کے بعد اصغر اور جگر کی شاعری میں بہت باتیں مشترک ہوگئیں اور آخر تک مشترک رہیں۔ ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں کیوں کہ اصغر کے ایسے رجحانات کا

ذکر میں پچھلے مقالے میں کر آیا ہوں اور جگر کے عشقیہ تصورات پر آئندہ سطروں میں نظر ڈالی جائے گی۔

مختصر یہ کہ ان تمام حالات کا جگر کے ذہن پر مجموعی اثر یہ پڑا کہ اگر ایک طرف ان کی نظر میں زندگی کی قدیم قدریں راسخ ہوگئیں تو دوسری طرف ان کو جوں کا توں قبول نہیں کر لیا بلکہ انتخاب سے کام لیا اور اُن میں حُسن بھی پیدا کیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں جگر کو زندگی، سماج اور فن کی قدیم قدریں بہت عزیز ہیں وہ خود ان کے حامل ہی نہیں بلکہ ان کے خلاف یورشوں کی مدافعت بھی کرتے ہیں، وہیں وہ ہر روایتی قدر کو بغیر سوچے سمجھے قبول بھی نہیں کر لیتے۔ روایات کو اپناتے وقت ان کا ذہن ان روایات کے کھرے کھوٹے کو جانچ پرکھ کر بھی دیکھتا ہے اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے ان کے کھوٹ کو نکال کر قبول کرتا ہے۔ جگر کی طبیعت کے جو میلانات اصغر کی تربیت سے اُجاگر ہوئے ہیں، ان میں زیادہ قابلِ ذکر یہ ہیں۔ اصغر کی طرح جگر کی نظر بھی اپنے ماحول سے رنگین ستارے توڑ کر اپنے تخیل کو جگمگانا چاہتی ہے۔ وہ ارد گرد کے بھیانک سایوں سے بچ کر نکلنا چاہتی ہے اور اگر بچ نہیں پاتی تو ان سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ وہ لطافت سے محبت اور کثافت سے پرہیز کرتی ہے۔ کثافت کی نشان دہی تو وہ کر سکتی ہے لیکن وہ اس کی جڑوں تک پہنچ کر اس کے تفصیلی مشاہدے اور مطالعے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ وہ زندگی سے صرف لذّت حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ زندگی کی کثافت کو اپنے تصوّر کی لطافت سے مٹا دے۔ حُسن و عشق کے کیف و سرور میں کھو جانا اور تخیّل کی رنگینی ہی سے کسب نور کرتے رہنا اس کے لئے کافی ہے۔ فانی کی نظر اگر زندگی کے محض منفی پہلو پر پڑتی تھی تو اصغر اور جگر کی نظر اس کے مثبت پہلو ہی پر مرکوز رہنا چاہتی ہے۔ بعد کے زمانے میں جگر زندگی کے تاریک رخ کو کیوں دیکھنے لگے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

جگر کی حُسن و عشق سے متعلق شاعری میں کسی نہ کسی صورت سے یہ تمام رجحانات

جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اتنا البتہ صحیح ہے کہ جگر کی دلچسپی کا خاص مرکز حسن وعشق تھا اور اصغر کی دلچسپی کا روحانیات۔ نیز یہ کہ عشقیہ معاملات میں جتنا باریک اور لطیف مشاہدہ جگر کی شاعری میں ملتا ہے اصغر کی شاعری میں نہیں ملتا۔ جگر کے حسن وعشق سے متعلق تصورات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عام طور پر ان تصورات کا بنیادی نقطۂ نظر تو وہی اصغر کا سا رہتا ہے لیکن تفصیلات کے اعتبار سے یہ جگر کی اپنی منفرد طبیعت کا عکس ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جگر کی نگاہ اپنے ماحول میں ہر طرف حسن کی جویا رہتی ہے۔ ان کا دل حسن وعشق کی لطافت ونزاکت اور رنگ وآہنگ سے نور وسرور حاصل کرکے لذت اندوز ہوتا ہے۔ جگر کی شاعری میں محبوبہ کا جو تصور ملتا ہے اُسے غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ وہ غزل کے روایتی محبوب کے تصور سے بہت مختلف بھی ہے اور معمولی زندگی سے بہت قریب اور صحت مند بھی۔ جگر کی نظر، اس میں شک نہیں کہ عورت کے محض شباب اور حُسن وجمال پر پڑتی ہے اور وہ گاہے گاہے اس کے جسمانی حُسن کو بھی خراج تحسین ادا کرتے ہیں لیکن زیادہ تر ان کی نظر عورت میں حسن باطنی تلاش کرتی ہے۔ جگر کی محبوبہ سنگ مرمر کی ایک گھڑی گھڑائی مورتی نہیں ہے۔ نہ وہ مغرور، فریب کار، بے مہر اور ستم شعار ہے۔ وہ ایک سادہ فطرت، حیادار جوان عورت ہے جس کے سینے میں دل ہے اور دل میں محبت کی خلش۔ اس کے دل میں محبت کی آگ مرد سے کم روشن نہیں ہے مگر وہ مرد کی طرح اظہار جذبات میں بے باک نہیں ہو سکتی۔ ایسا کرنے میں اس کی نسوانی فطرت مانع آتی ہے۔ پھر بھی اس کی محبت کا اظہار اس کی دزدیدہ نگاہی، اس کی شوخی وشرارت، اس کی برہمی، اس کی بظاہر بے نیازی اس کی پشیمانی اور پُرنم آنکھوں سے ہوتا رہتا ہے۔ یہ سب عورت کی عشقیہ زندگی کے معمولی واقعات ہیں۔ ان سے اس کی زندگی کی حرارت کا اظہار ہوتا ہے طبیعت کی کسی کج روی کا اظہار نہیں ہوتا۔

اسی طرح جگر کا تصورِ عشق بھی محض روایتی نہیں۔ وہ بعید از قیاس تخیل کی قلابازیوں کا نہیں عام عشقیہ واردات و کیفیات کا مجموعہ ہے۔ شاعر کا مطمحِ نظر لطیف دل "متبسم نگاہ،" اور "لطیف سی خاموش آہ" ہے۔ اس کے دل میں محبت کی کسک اور چبھن تو ہے مگر ایسی نہیں کہ وہ چیخنے چلانے لگے اور گریہ و زاری اور آہ و فغاں پر آمادہ نظر آئے۔ خودداری، شرافتِ نفس اور وضعداری اس کے اظہارِ جذبات کے لئے حدیں متعین کرتی ہیں۔ وہ محبت جیسے پاکیزہ جذبے کو ایک سوقیانہ حرکت بنانے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ محبت میں ضبط و تحمل سے کام لینا ضروری ہے۔ وہ نہ محبت کو عذاب محض سمجھتا ہے اور نہ فرقت کا ماتم کرتا نظر آتا ہے۔ محبوب کی بے توجہی اور اغیار کی منافقت کا گلہ شکوہ کیے رہنا بھی اس کی عادت نہیں۔ وہ تو محبوب سے صرف عرض تمنا کرنے، اسے بلانے، بہلانے، منانے اور اس کی گوناگوں اداؤں کی تحسین و توصیف پر اکتفا کرتا ہے۔ جلوت میں اس کے موقعے میسر آئیں تو جلوت میں ورنہ اس کے لئے خلوت بھی جلوت سے کم نہیں۔ وہ خلوت میں بھی تصور کی رنگین دنیا بسا کر راز و نیاز کی باتیں کر سکتا ہے۔ خلوتِ غم کو بزمِ طرب بنا سکتا ہے۔

میں نے کہا تھا کہ جگر ناسازگار حالات سے سمجھوتہ کر کے ان سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ گلشن پرست ہیں انھیں گل ہی عزیز نہیں ہے بلکہ وہ کانٹوں سے بھی نباہ کرنا جانتے ہیں۔ ان کے مزاج کی یہ خصوصیت ان کے عشقیہ جذبات کو بھی متاثر کرتی اور انھیں مصالحت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

میں اور ترے ہجرِ مسلسل کی شکایت تیرا ہی تو عالم ہے تری یاد کا عالم
وہ ہزار دشمنِ جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

جگر کی محبت کی عام مٹھاس اور مصالحت کا یہ ذہنی رجحان ان کے اشعار کو ایک عجب طرح کا سکون اور طمانیت عطا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی عشقیہ شاعری کا

آہنگ بلند نہیں۔ اس میں جذبات کی گرمی ہے اُبال نہیں۔ وہ جوئے نغمہ ریز کی طرح آگے کو بڑھتی ہے ایک تند وسیلاب کی طرح نہیں بڑھتی۔

اور پھر یہ بھی ہے کہ جگر نے محبت کے وقار کو برقرار رکھا۔ انھوں نے غزل گو شعرا کی روایت کے بموجب حسن کے دربار میں دریوزہ گری نہیں کی۔ ان کی نظر میں محبت ایک ایسا کھیل ہے جسے دو برابر کے کھلاڑی کھیلتے ہیں کاروبار عشق میں محبوب بھی برابر کا شریک ہوتا ہے پھر نیاز وناز کا فرق کیوں؟ عاشق کے لئے خوددار ہونا بھی ضروری ہے۔ تب ہی وہ صحیح معنوں میں حسن کے لئے کشش کا باعث بن سکتا ہے۔ غرور حُسن کو توڑ سکتا ہے۔

خود جس میں آرزوئے شکست غرور ہے — ایسی بھی آج ایک نظر دیکھتا ہوں میں

ان معنوی خصوصیات کے علاوہ جگر کی عشقیہ شاعری میں کشش ہیت کے متعدد محاسن کے باعث بھی پیدا ہوتی ہے جن کی طرف یہاں چند اشارے کرنا ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جگر کو غزل کے فن اور تکنیک پر بڑا عبور حاصل ہے وہ جذبات کے اتار چڑھاؤ کو مصرعوں میں سمونا جانتے ہیں۔ انھیں آتا ہے کہ کونسی بات سیدھے سادے طریقے سے کہے جانے کی ہے اور کس میں لطیف اشارے کنایے یا تشبیہہ واستعارے سے پیدا ہوگا۔ پھر ان کی نظر حُسن وعشق سے متعلق نفسیاتی حقائق تک پہنچنے میں مہارت رکھتی ہے جس سے انھیں کسی منظر یا ذہنی کیفیت کے ضروری خطوط ابھارنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ باقی تصویر میں قاری کا ذہن خود رنگ آمیزی کر کے لذت حاصل کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ان اشعار کو لے سکتے ہیں۔

توجہ بے نہایت اور نظر کم — خوشا یہ التفاتِ حُسن برہم

چہرے تک آستین وہ لاکر چلے گئے — کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

وہ ان کی بے رخی وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی — بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

پہلے تو غم پہ وہ جھنجلا کے رہ گئے   پھر کچھ سمجھ کے سوچ کے شرما کے رہ گئے

یہی قوت مشاہدہ ان میں نئی نئی ترکیبیں اختراع کرنے اور تشبیہیں اور استعارے ایجاد کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے جن کے سہارے وہ اپنے ذہنی مفہوم کو بحسن وخوبی ادا کر سکتے ہیں "کتنا حسین گناہ کئے جا رہا ہوں میں" نادیدہ اک نگاہ" کئے جا رہا ہوں میں خود جس میں آرزوئے شکست غرور ہے۔ یہ شرمگیں نگاہ" "انکار مضمحل" تیرے بغیر زندگی کب سے ہے" شام بے سحر" یہ سب اسی قوت مشاہدہ کا نتیجہ ہیں۔ جگر کے یہاں الفاظ کی تکرار و تواتر جیسے نغمہ زا نفس نفس جلوہ ترا نظر نظر" "ہم شعر و نغمہ ہم رنگ و نکہت" "نظر نظر تبسم اگرچہ بے پردا" "نفس نفس متوجہ اگرچہ بیگانہ" بڑا ترنم پیدا کرتا ہے۔ یہ کام وہ مترنم بحروں کے انتخاب سے بھی لیتے ہیں۔

سماجی حالات پر جگر کے رد عمل کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں سب سے پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ جگر نے اپنی شاعری میں ان حالات پر اظہار خیال دور آخر میں کرنا شروع کیا۔ جب جگر کی مقبولیت عالم شباب پر تھی جب انھیں مشاعروں میں سننے کے لئے لوگ بے چین رہتے تھے۔ اس وقت بھی ملک میں شدید قسم کی سیاسی اور سماجی کشمکش موجود تھی۔ اس وقت بھی اردو کے بے شمار شاعر ان امور میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور مشاعروں میں ان پر نظمیں پڑھتے تھے۔ لیکن جگر پر ان تمام باتوں کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا۔ وہ برابر عشقیہ شاعری کی تخلیق میں محو رہے۔ یہ "وقتی" باتیں ان کی نظر میں اتنی اہم نہ تھیں کہ شاعری جیسے لطیف فن کو ان سے آلودہ کیا جائے۔ حسن کے کرشمے اور عشق کے راز و نیاز ہی ان کے لئے سب کچھ تھے اور انہی کو وہ اپنی شاعری کا موضوع بنانا پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے یہی رہے کہ دنیا بھر کے سماجی مسائل کا واحد حل "محبت" ہے۔

لیکن جب کچھ ادبی حلقوں کی طرف سے ان کی شاعری پر انسانوں کے دکھ درد سے بے نیاز رہنے کا برابر الزام لگایا جاتا رہا اور ان حلقوں نے اردو ادب میں اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کر لیا، ان کی بات کو وقعت کی نظر سے دیکھا جانے لگا تو جگر نے بھی سماجی واقعات و حالات

پرتو یہ کرنا شروع کی۔ تب ان کی شاعری میں یہ رجحان ابھرا۔ چناں چہ ان کی بعد کی غزلوں میں کہیں کہیں اور کچھ مسلسل غزلوں میں جنہیں "آتش گل" میں منظومات کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے ہم عصر حالات پر جگر کے تاثرات ملتے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ جگر کی اس نوع کی شاعری کے محرکات تمام تر خارجی ہیں۔ روحانی قوتوں پر ایمان رکھنے والا شخص بھی اپنے اردگرد بسنے اور رہنے والے انسانوں کے دکھ درد سے تڑپ سکتا ہے۔ ان کے لئے سرگرم عمل بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن وہ سماجی مسائل کو دیکھتا ہے اسی عقیدے کی روشنی میں اور اس میں ان مسائل کا حل بھی تلاش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر کسی طرح انسان ایک دوسرے سے محبت کرنے لگیں، دوسروں کے لئے اپنی ذاتی راحت و مسرت کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جائیں، حرص و ہوا اور نوچ کھسوٹ کو خیرباد کہہ دیں۔ سادہ زندگی بسر کریں، اپنی ضروریات کو کم کر کے صبر و قناعت سے کام لیں تو پورے سماج کی زندگی پُرسکون اور مطمئن بن سکتی ہے۔ زندگی کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ ایسے سماج میں بھوک ہوس اور منافقت کی عمل داری ختم ہو جائے گی اور ہر شخص حسن و عشق کے کیف آور راز و نیاز سے صحیح معنوں میں لذت اندوز ہو سکے گا۔

یہ طریقہ فکر عملی زندگی میں ایک خوش آیند خواب اور متبرک خواہش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کیوں کہ اس میں ان موانعات کو قرار واقعی اہمیت نہیں دی جاتی جو ایسی مثالی دنیا کے آباد ہونے میں لامحالہ حائل ہوتے ہیں۔ طرح طرح کے سماجی حقائق اور نفسیاتی پیچیدگیوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سماج میں ہلکی سی جنبش پیدا کرنے کے لئے بھی ہزار طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ان میں سے ہر دشواری پر قابو پانے کے لئے اس سے متعلق حقائق کا علم نہایت ضروری ہے۔ صحیح علم حاصل نہ ہونے کی وجہ سے جو شخص صرف خواب دیکھتا ہے کسی نہ کسی وقت اس کے خواب کا ٹوٹنا ناگزیر ہے۔

غرض یہ کہ زندگی کے ڈھلتے ہوئے زمانے میں جگر کا سماجی مسائل کی طرف رجوع کرنا ان

کی طبیعت کا خاصہ نہیں تھا وہ ایک طرح کا شکست خواب تھا۔ وہ دراصل ردعمل تھا ایک فطرتاً نیک شخص کی نیک خواہشات کے پورا نہ ہونے کا۔ اس لئے جگر کی اس طرح کی شاعری میں نیک خواہش کا جو زیریں دھارا بہتا محسوس ہوتا ہے اس کی تو قدر ہم کر سکتے ہیں۔ واقعات سے جگر نے جو اثر قبول کیا اس میں بھی ایک حد تک انھیں حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان مسائل کا جو حل وہ پیش کرتے ہیں یا ان کے جو اسباب وہ بتاتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ بہت سطحی سی باتیں ہیں اس لئے زیادہ قابل اعتنا نہیں۔

جگر نے جن واقعات پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ قحط بنگال، فرقہ وارانہ فسادات اور گاندھی جی کی شہادت وغیرہ ہیں۔ انھوں نے شدت سے محسوس کیا ہے کہ انسان نے اپنی انسانیت کھو دی ہے۔ انسان میں انسان کے لئے محبت باقی نہیں رہی اس میں خود غرضی، شقاوت، ناانصافی اور ریاکاری آگئی ہے۔ جگر کے خیال کے اس صورت حال کی زیادہ ذمہ داری سیاسیات پر عائد ہوتی ہے جسے وہ سراسر فریب سمجھتے ہیں اس میں شر کو خیر کے زرق برق لباس میں مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ جگر کا کہنا ہے کہ اہل سیاست کے انسانی خدمت کے دعوے اور مساوات و جمہوریت کے نعرے فریب محض ہیں۔ انھیں یہ بھی شکایت ہے کہ اہل قوم نے آزادی اور نئے نظام سے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، وہ غلط ثابت ہوئیں۔ آج بھی غریبوں سے اظہار ہمدردی کیا جاتا ہے مگر درپردہ حمایت سرمایہ داری کی ہوتی ہے۔ اہل سیاست کے ساتھ ہی جگر صحافیوں سے بھی بدظن ہیں جن کے قلم سے بقول ان کے زہر آلود تحریریں نکل کر فضا کو مکدر کرتی ہیں۔ ان کے اس تلخ احساس کا اندازہ ان شعروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

ناز جن خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگر اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی کہ انساں عالم انسانیت پہ بار ہو جائے

جگر جس طرح اہل سیاست و صحافت کے شاکی ہیں اسی طرح وہ عقل کے فروغ اور دورِ جدید

کی ترقی سے بھی نالاں ہیں۔ وہ عقل کے فروغ کو روحانیت کا دشمن قرار دے کر دورِ حاضر کی ساری اخلاقی اور سماجی کج رویوں کو اسی مفروضہ عقلیت کے سر تھوپ دیتے ہیں اس طرح انھیں انسان کا ماضی تابناک اور حال تاریک دکھائی دیتا ہے۔

شرحِ تفصیل سے بیگانہ گندہ جادۂ دِقّت　　عقل بڑھتی ہے مگر دل کا زیاں ہوتا ہے
جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے　　گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

یہ کہنا تو درست ہو سکتا ہے کہ شعور مدنیت کی بیداری کے آغاز سے اب تک انسان کوئی ایسا سماجی نظام یا ضابطہ اخلاق مرتب اور منتقل نہ کر سکا جو اس کے سماجی مسائل کو حل کر کے اُسے اطمینان اور سکون کی زندگی فراہم کر سکتا مگر یہ کہنا کہ انسان کی تمام کوششیں ہی ایک حرف غلط کا حکم رکھتی ہیں یا ان کی عقل تخریب کے لئے ہی استعمال ہوتی رہی ہے حقیقت سے بعید ہے۔ سچ یہ ہے کہ کوئی مثالی یا واقعی تشفی بخش نظام مرتب کرنے کا مسئلہ ہی بہت پیچیدہ ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، زندگی کی پیچیدگیاں بڑھتی جاتی ہیں، اس مسئلے کی پیچیدگی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ پھر بھی انسان برابر کوشاں رہا ہے اور آج بھی ہے کہ اس مسئلے کا کوئی زیادہ سے زیادہ صحیح حل معلوم کرے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس سب سے زیادہ مفید آلۂ کار اس کی عقل ہی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو عقل کے فروغ میں کوئی عیب نہیں ہے عیب عقل کے بے جا استعمال میں ہے جسے اگر کچھ روک سکتا ہے تو کوئی ایسا معقول سماجی نظام ہی روک سکتا ہے جو انسان کی حریصانہ اور بہیمانہ ذہنیت کو کھل کھیلنے کا موقع نہ دے۔

جگر یہ بھی سمجھتے تھے کہ ظلم ایک طرح سے مظلوم کے لئے رحمت بھی ہے کیونکہ یہ مظلوم میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے جس سے وہ آپ اپنا مستقبل بنانے کے لئے جد وجہد کرتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے قارئین ہی کو ظلم کے خلاف نبرد آزما ہونے کا مشورہ نہیں دیتے بلکہ خود بھی ساقی اور میخانہ کو چھوڑ کر "خنجر بکف" نبرد آزما ہونے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسے اشعار میں شعریت بہت کم ہے۔ شعریت سے زیادہ ان میں خطابت کا احساس ہوتا ہے ایسے شعر عام طور پر

پاٹ ہیں اور ان میں لہجے کی تندی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی جھنجھلاہٹ بھی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ اصغر کے فیضِ صحبت نے جگر کے دل میں روحانیت کی قدریں مستحکم ہو گئیں جس سے وہ سماجی مسائل کا بھی روحانی حل تلاش کرتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جگر کا مسلک انسانیت وسیع اور غیر محدود ہے۔ وہ ساری انسانیت کو باہمی محبت، خلوص نیت اور جذبۂ ایثار کا درس دینا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسی طرح سماج کی خرابیاں دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی نیا پیغام یا نظریہ نہیں ہے۔ مذاہب کے رہبر اور روحانیات کے نہ جانے کتنے علم بردار ہزاروں برس سے انسانوں کو کم و بیش یہی مشورہ دیتے چلے آئے ہیں۔ اگر ان کی تعلیمات کا واقعی وہ اثر ہوا ہوتا جو جگر کے پیش نظر ہے تو آج تک سارے انسان فرشتے بن چکے ہوتے اور اب بیسویں صدی کے وسط میں جگر کے اس شکست خواب کی نوبت نہ آتی۔ انھیں لالۂ گل اور بہار تو بہ شکن سے بیزاری کا اظہار کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور دلوں میں جراحتوں کے جنون کا احساس نہ ہوا ہوتا۔

پھر بھی اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا تو غلط ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی جرم ہوگا کہ جگر کے دل میں عام انسانوں کا درد تھا اور وہ خلوص دل سے پوری انسانیت کو خوش و خرم دیکھنے کے آرزومند تھے۔

گدازِ میر اور فکرِ غالب سے تھی تو رونق سخن کی لیکن
بھلا کہاں بانکپن تھا ایسا غزل میں فضلیؔ جگر سے پہلے
(فضل احمد کریم فضلی)

کتب خانہ نواب سالار جنگ
میں
دکھنی (قدیم اُردو) نثری داستانیں

جناب نصیر الدین ہاشمی

اصحاب علم اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ اردو نثری داستانوں کا آغاز بھی دکن سے ہوا ہے۔ "سب رس" مصنفہ وجہی پہلی نثری داستان تسلیم کرلی گئی ہے۔ یہاں ان داستانوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو دکھنی (قدیم اُردو) میں لکھی گئی ہیں اوران کے قلمی نسخے کتب خانہ نواب سالار جنگ حیدر آباد میں محفوظ ہیں۔

(۱) "سب رس" اگرچہ اب شائع ہوگئی ہے۔ مگر اس کے قلمی نسخے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ کتب خانہ ہذا میں اس کے دو نسخے ہیں ان میں سے ایک کی کتابت ۱۰۷۳ھ میں ہوئی ہے۔ یعنی تصنیف کے (۲۸) سال کے بعد یہ نسخہ لکھا گیا ہے اس لئے اہمیت رکھتا ہے۔

وجہی کے متعلق اب مزید امور معلوم ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ اس کا نام اسد اللہ تھا اور وہ خراسان کا باشندہ تھا اس کا فارسی دیوان بھی مرتب ہوا تھا چنانچہ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس میں نام کے متعلق جو وضاحت ہے وہ یہ ہے۔

اسم اسد اللہ وجہہ است تخلص　　　آلایش دکانچہ بازار وکلام است

اس فارسی دیوان سے واضح ہوتا ہے کہ وجہی اپنا تخلص وجہہ۔ وجہی اور وجیہی استعمال کرتا تھا۔ وجہی کا باپ خراسان سے دکن آیا تھا اور وجہی کی پیدائش دکن میں ہوئی اس نے گولکنڈہ میں نشو و نما پائی۔ دکھنی نظم اور نثر میں اپنے قلم کے نقش ثبت کئے۔

دکھنی کی دونوں کتابیں یعنی نظم کا شہ کار "قطب مشتری" اور نثری داستان "سب رس" زیور طبع سے آراستہ ہوگئی ہیں اس کے علاوہ یہ دونوں کتابیں ناگری رسم الخط میں بھی شائع ہوگئی ہیں۔

(۲) سنگھاسن بتیسی۔

یہ داستان بھی دکھنی میں مرتب ہوئی ہے۔ واضح ہو کہ یہ داستان چتربھوج داس نے فارسی میں قلم بند کیا تھا اس کے پہلے غالباً وہ سنسکرت میں تھی۔ فارسی میں کب منتقل ہوئی اس کا صحیح سنہ معلوم نہ ہوسکا۔ سنہ ۱۸۰۴ء میں فورٹ ولیم کالج کے دارالترجمہ میں لالہ للولال نے اس کو اردو زبان میں منتقل کیا۔ مگر کتب خانہ سالار جنگ میں جو قلمی نسخہ ہے وہ اردو نہیں بلکہ دکھنی ہے۔ چنانچہ اس کے دکھنی میں مرتب ہونے کی صراحت خود مصنف نے دیباچہ میں کردی ہے ملاحظہ ہو۔

"اول یہ کتاب چتربھوج داس بیٹا سروپ چند بہنٹ کا فارسی زبان میں لکھ کر نام اس کا شاہ نامہ رکھا اور بتیس حکایتاں بھوت فصاحت اور نزاکت سے ظاہر کیا۔ ہندوی زبان میں اس کتاب کو سنگھاسن بتیسی کہتے ہیں۔ کوئی شخص فارسی زبان سے آشنا نہیں۔ اس واسطے ترجمہ اس کا دکھنی زبان میں اس طرح سے لکھا گیا۔ اب مجھ کو دانشمندوں اور صاحب کمالوں سے التماس ہے کہ اگر کچھ فراموش اور خطا اس میں ظاہر ہووے اپنی عنایت سے معاف فرمائیں۔"

اس اقتباس سے واضح ہے کہ یہ کتاب دکھنی یعنی قدیم اردو میں ہے۔ مگر افسوس ہے کہ نہ تو مترجم کا نام معلوم ہوتا ہے اور نہ سنہ ترجمہ۔ خیال یہ ہے کہ سنہ ۱۸۰۰ء کے اوائل یا سنہ ۱۷۰۰ء کے اواخر میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کتاب کے کسی اور نسخے کا پتہ اب تک نہیں چلا ہے۔ کتب خانہ کا یہ نسخہ کافی ضخیم ہے۔ (۳۸۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس دکھنی ترجمہ میں بتیس حکایتیں ہیں۔ تمام حکایتیں راجہ بکرماجیت سے متعلق ہیں اور ان میں ہندو دیومالا کا تذکرہ ہے۔ مختصر دیباچہ ہے۔ اس میں حمد اور نعت ہے۔ جلال الدین اکبر کی مدح کی گئی اور اس کو دعا

دی گئی ہے اور پھر وہ عبارت ہے جو سطور بالا میں درج ہے۔ چنانچہ اکبر کے متعلق جو صراحت ہے
وہ یہ ہے۔

"..... پناہ دینے والا خلق کا جمشید کے مرتبے کا اور بزرگی کے قدرت کا۔ حاتم سخاوت کا
نوشیرواں عدالت کا فریدون کی برابری کا۔ راحت بخشنے والا عالم کا۔ سربلند کرنے والا،
بادشاہوں کا آسمان کی بلندی کا۔ قطب ہے زمانے کا۔ نام اس کا جلال الدین اکبر شہنشاہ
غازی ہمیشہ رکھے اللہ تعالیٰ مالک اوس کا۔ وہ بادشاہ اپنے فضل اور بخشش سے عالم پر
نوازش کیا ہے۔ نشانیاں ظلم و ستم کے اپنے ملک سے دور کیا ہے۔ اول یہ کتاب چتر بھوج
داس۔ بیٹا سروپ چند بھنٹ کا۔ الخ۔"......

دکھنی مرحوم نے اپنا کوئی تعارف یا نام وغیرہ نہیں لکھا ہے۔ دیباچہ کے بعد ہی داستان
شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ داستان کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

"یوں نقل کرتے ہیں کہ ایک شہر عظیم الشان اور آبادان نام اس شہر کا دھارانگر مشہور
تھا اور قلعے اس کے نہایت خوب صورت اور دروازے بہوت مضبوط تھے آدمی
ہر قسم کے اوس شہر میں زیادہ جمعیت اور دولت سے محفوظ رہتے تھے۔ سونا،
روپا، جواہر۔ اور لعل موتی اور الماس گھوڑے اور ہاتھیوں کا شمار نہ تھا۔ بہوت
خوبی اور زینت سے زندگانی کرتے تھے۔ ہر ایک محلے اور راستوں میں محل اور
حویلیاں نقاش فرما کر رنگین اور آراستہ کئے تھے۔ تمام عالم زمانے کے حادثے
اور آفتوں سے امنیت پا کے عیش و عشرت سے رہتے تھے اوس شہر میں
راجہ بھوج نام کا ایک راجہ تھا وہ راجہ بہوت قابل اور لائق چودہ علم سے
واقف تھا اس شہر پر وہ راج کرتا اور اپنے بادشاہت میں خلق کو بہوت
راضی رکھا تھا اور سب راجے ملکوں کے متابعت اور فرمان برداری اوس
کی کرتے تھے۔ اور ہر سال خزانہ تحفہ نذرانہ اس کو بھیجتے تھے۔ خوشیاں اور

اس جماعت کے ہمیشہ بیچ خدمت کے حاضر رہتے تھے ....

"مہادیو اوپر کیلاس پہاڑ کے بیٹھا تھا وہ پہاڑ مہا دیو کے رہنے کا مکان تھا اور پاربتی نام ایک عورت تھی ہاتھ باندھ کر خدمت میں کھڑی تھی کہی کہ آج کے روز دل میرا یوں چاہتا ہے کہ قصہ کوئی راجہ پرہیزگار کا سخاوت اور شجاعت میں بے مثال ہووے صاحب کے زبانی سنوں"

داستان کا اختتام حسب ذیل عبارت پر ہوا ہے۔

"اور تعریف کالداس شاعر کی اور مجلس کے دانشمندوں کی فرمایا۔ اور وہاں سے رخصت ہو کر طرف راجہ اندر کے روانہ ہوا۔ بعد از رخصت ہونے اس کے راجہ بھوج کو ان کو خلعتاں بخشا اور انعام بہوت فرمایا۔ تمام خوش وقت ہوئے اور دعا کئے کہ پروردگار! اس راجہ کو سلامتی دے اور ہمیشہ دولت اوس کی قائم رکھ۔"

جیساکہ سطور بالا میں صراحت کی گئی ہے اس کتاب میں (۳۲) داستانیں یا حکایتیں شامل ہیں۔ ہر ایک داستان کا خلاصہ درج کرنا دشوار ہے۔ یہاں صرف ایک حکایت کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

"چودویں تیلی۔ جب وہ دن گذرا دوسرے روز راجہ بھوج تخت پر بیٹھنے چاہا ایک تیلی ہر بہا دلی نام رکھتی تھی یک مرتبہ ہنسی اور کہی۔ یہ تخت راجہ بکرماجیت کا ہے۔ جو کوئی مانند اس کے ہمیشہ اور سخاوت رکھے وہ لائق ہے کہ اس تخت پر بیٹھے۔ تب راجہ بھوج پوچھا وہ حقیقت کس طرح ہے۔ یک مرتبہ تیلی کہی راجہ بکرماجیت اوجین کے شہر میں حکومت اور بادشاہت کرتا تھا۔ نہایت آباد شہر کے طول میں تیرا[۱۳] کوس اور نو کوس کے تھی۔ راجہ سخاوت اور شجاعت اور عدالت نہایت کرتا تھا۔ اور کوئی درمیان ملک کے بھوکا اور ننگا نہیں رہتا تھا اور تمام آدمی راستی اور دوستی میں معاملت کرتے رہتے اور ہر کام میں نیکی اور خوبی سے سرگرم رہتے تھے اور کسی کے مال پر کوئی طمع نہیں رکھتا تھا اور اس وقت تمام لوگ ہندوی علم میں کامل

تھے اور بدعملی سے نہایت ڈرتے اور کانپتے رہتے تھے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتے اور پیروی نیک عمل کی کرتے رہتے اور زر اور زیور کا اعتبار نہیں کرتے تھے اور دوست اور فرزندان اور بھائی اور خویشاں سے الفت زیادہ رکھتے تھے کہ دنیا آخر فنا ہے اس سے دل لگانا کچھ فائدہ نہیں ہے اس اندیشے سے خیرات بہت کرتے تھے اور عمل نیکی کا بجا لاتے ۔"

اس اقتباس سے داستان کا اسلوب واضح ہو سکتا ہے ۔

داستان میں بعض جگہ شعر بھی آگئے ہیں ایک نظم یہاں درج کی جاتی ہے ۔

اتھی خوبی میں وہ مہتاب صورت	کہ جس کے دیکھتے زیادہ ہوئے محبت
عجب وہ شوخ مانند پری تھی	ہنر میں اوس کتیں جادوگری تھی
بہوت تھی صورت و سیرت میں نادر	بنایا اپنی کیا قدرت سے قادر
کری تھی کئی طرح کا علم حاصل	تھی رعنائی و زیبائی میں کامل
نکلتے موں سے بول باتاں نرالے	گویا موتی کو مرجاں سے نکالے

اس داستان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ کتاب کا مترجم یا تو انگریزوں کو اردو تعلیم دیا کرتا تھا یا پھر انگریزی رسم و رواج اور انگریزی معمولات وغیرہ سے واقف تھا اس موقع پر ایک مختصر عبارت پیش کی جاتی ہے جس سے ہمارے بیان کی تصدیق ہو سکتی ہے ۔

" بعد از خلعت شاہی کا پہن کر دیوان خانے میں آتا تھا اور نہایت عزت اور مرتبہ سے تخت پر بیٹھ کر سرانجام شاہی کرتا تھا اور وقت دو پہر کچھ حاضری نوش فرما کر پاکیزہ بچھلانے پر کہ نرم تر دیا اور مخمل سے اور تکیئے اس کے بہتر سے بہتر تھے آرام کرتا ۔"

حاضری نوش کرنا یعنی عام طور سے لنچ کو حاضری سے موسوم کیا جاتا تھا ۔ اس طرح انگریزی معاشرت سے واقف ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ مترجم کو انگریزوں سے ربط تھا ۔

(۳) قصہ معظم شاہ و چتر ریکھا ۔

اس داستان کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا مگر داستان کا دکھنی ہونا ثابت ہے۔
(۹ × ۶) سائز کے (۱۲۰) صفحے پر یہ داستان مشتمل ہے۔
زیر بحث نسخہ کی کتابت سنہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں ہوئی سنہ ۱۸۲۰ء کے قبل اس کے ترجمہ ہونے کا خیال ہے۔ داستان کے آغاز میں کسی شاعر کے چند شعر ہیں اس کے بعد نثر میں پوری داستان ہے۔ داستان کا آغاز یہ ہے۔

آغاز

"کہتے ہیں کہ چین کے ملک میں ایک بادشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اوس کی ذات میں تھی اور اس کے وقت رعیت آباد اور خزانہ معمور۔ لشکر مرفع الحال اور غریب غربا چین سے گزران کرتے تھے اور خوش رہتے تھے کہ ہر ایک کے گھر میں دن عید رات شب برات تھی اور اس بادشاہ کو ایک لڑکا تھا نام اس کا معظم شاہ تھا"

داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ چین کا شہزادہ معظم شاہ جب باپ کی جگہ تخت نشین ہوا تو ایک دن ایک فریادی آکر فریاد کیا۔ بادشاہ نے وزیر کو طلب کرکے فریادی کی فریاد سننے کا حکم دیا اور خود آرام کیا۔ جب وزیر واپس آیا تو اس کے پاؤں کی آواز سن کر معظم شاہ بیدار ہوگیا اور وزیر کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ وزیر نے اپنے قصور کی وضاحت چاہی۔ بادشاہ نے کہا کہ وہ ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب مکمل نہیں ہوا تھا کہ وزیر کے قدموں کی آواز سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ بادشاہ ایک خوب صورت حسین پری جمال شہزادی کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔ وزیر نے اپنی جان بخشی پر خواب کی شہزادی کو ڈھونڈ نکالنے کا وعدہ کیا اور تلاش میں روانہ ہوا۔ مصیبتیں جھیلتا ہوا آخر منزل مقصود کو پہنچا اور معظم شاہ کی شادی اس شہزادی سے ہوگئی۔ وزیر کی جان بخشی ہوئی۔ انعام ملا۔ داستان کے درمیان کئی اور قصے آجاتے ہیں اس کی وجہ سے داستان طویل ہوگئی ہے ورنہ اصل داستان نہایت مختصر ہے۔

داستان کا دکھنی زبان میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۴) قصہ کام روپ

اس نام کی ایک داستان کندن لال لاہوری نے سنہ ۱۸۴۹ء میں ترجمہ کیا ہے۔ مگر زیر بحث داستان اس سے سترہ سال پہلے کی کتابت ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کس سنہ میں اس کا ترجمہ ہوا ہے اگر کتابت کا سنہ جو سنہ ۱۸۳۲ء ہے اس کو ترجمہ کا سنہ قرار دیا جائے تو بھی کندن لال سے سترہ سال پہلے زیر بحث داستان مرتب ہوئی ہے۔ اندرونی شہادتوں سے سنہ ۱۲۱۱ھ کے بعد اس داستان کا مرتب ہونا پایا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے مترجم کا نام معلوم نہیں ہوا۔

داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ سرندیپ کا ایک راجہ تھا اس کو ملک مال اور دولت کی کمی نہ تھی مگر اولاد نہیں تھی۔ ایک فقیر کی دعا سے اس کو لڑکا تولد ہوا اس کا نام کنور کام روپ رکھا گیا۔ جب وہ چودہ سال کا ہوا تو شکار کا شوق ہوا۔ باپ نے ایک باغ تیار کیا۔ اس باغ میں ہر قسم کے چرند پرند اور جانور رکھے گئے۔ کنور صبح میں شکار کرتا اور رات کو محفل طرب آراستہ ہوتی۔ کنور کے چھ رفیق تھے ان میں ایک وزیر کا لڑکا دوسرا پنڈت کا لڑکا تیسرا حکیم کا لڑکا۔ چوتھا مصور کا لڑکا پانچواں جوہری کا لڑکا اور چھٹا ایک موسیقار کا لڑکا تھا۔ کنور کام روپ ایک رات ایک شہزادی کو خواب میں دیکھا اور اس پر عاشق ہو گیا۔ بیداری کے بعد خواب کی شہزادی کی تلاش میں روانہ ہوا۔ شہزادے کے چھ رفیق بھی اس کے ساتھ تھے۔ ہر ایک رفیق شہزادے کی تلاش میں مدد کرتا ہوا ساتھ رہا اور ہر ایک رفیق اپنے کام سے شہزادہ کو خوش کیا آخر کار شہزادہ اپنے خواب کی حسینہ سے شادی کر کے اپنے ملک کو واپس ہوا۔

یہ داستان (۱۸×۵½) سائز کے (۶۹) صفحات پر مشتمل ہے آغاز یہ ہے۔

" سراندیپ کے شہر کا راجہ اس کا نام راجہ راج پتی اور وہ نہایت سخی عادل۔ ذرا دل

ریدا اور سپاہ ملک و مال سے آباد تھا لیکن اسے اولاد نہ تھی ہر ایک مشایخ اور فقیر اور گوسائیں سے مل کر کہتا ہے کہ میرے حق میں اولاد ہونے کی دعا کرو۔"

انڈیا آفس لندن میں ایک منظوم داستان کام روپ کے نام سے موجود ہے یہ کسی شمالی ہند کے شاعر کی نتیجۂ فکر کا نمونہ ہے۔ اس کا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے۔

رہی دو جگ کا نوں کرتار ہے ہر یک شئی کا پیدا کرن ہار ہے
نکوئی کر سکے تیری قدرت بیان نہیں علم تیرا کسی پر عیاں ۶۶

(۵) قصہ ملک زمان و کام کندلہ

یہ داستان (۷ × ۵ ۱/۲) سائز کے (۱۸۴) صفحات پر مشتمل ہے مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ سنہ ۱۲۳۴ھ کے پہلے یہ داستان مرتب ہوئی ہے مصنف نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ کتاب کرناٹکی" زبان میں ہے۔ چنانچہ آغاز کی عبارت کے ساتھ ہی اس کا تذکرہ ہوا ہے۔

آغاز

"خدا کا حمد اور پیمبر کا نعت بشر کہاں کر سکتا ہے۔ اس واسطے اس عاصی نے کرناٹکی محاورے سے نو آموز سرداران والا شان کے پڑھنے کی خاطر لکھتا ہوں"

داستان کا خلاصہ پیش ہے۔

ایک بادشاہ اور اس کے وزیر کو اولاد نہیں تھی۔ بڑی مدت کے بعد دونوں کو لڑکے تولد ہوئے۔ دونوں کی پرورش ہونے لگی۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد دونوں کو جدا جدا کر دیا گیا۔ شہزادہ کو وزیر زادہ کی جدائی کا صدمہ تھا۔ خط لکھ کر دونوں سیر کو نکلے اور دونوں ساتھ ہو گئے۔ راستے میں پیاس معلوم ہوئی۔ ایک ندی پر پہنچے۔ ندی کا پانی خوشبودار تھا۔ دھوبی سے معلوم ہوا کہ ایک حسینہ کے کپڑے دھوئے جاتے ہیں اس لئے پانی خوشبودار ہو گیا ہے اور وہ حسینہ ایک سوداگر کی بیٹی تھی۔ شہزادہ نام سن کر ہی

سوداگر زادی پر عاشق ہوگیا۔ شادی کی تحریک ہوئی۔ سوداگر زادی یعنی کام کندلہ نے شادی کے لیئے تین شرط پیش کیئے۔ اول تو یہ کہ شہزادہ کام کندلہ کا چہرہ نہ دیکھے۔ دوسرے یہ کہ کام کندلہ تمام دن شہزادے کے پاس رہے گی مگر رات کو اپنے محل میں آجائے گی۔ تیسری شرط یہ کہ شہزادہ کام کندلہ سے بات نہ کرے گا۔

شہزادہ نے تینوں شرط قبول کر لئے اور شادی ہوگئی۔ کچھ عرصہ تک شرطوں کی پابندی ہوتی رہی اس کے بعد ایک مالی نے شہزادہ پر مہربان ہوکر ایسی مٹی دی کہ جس کو لگانے سے وہ لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہوجاتا۔ شہزادے نے مٹی لگاکر کام کندلہ کا پیچھا کیا اور اس کو معلوم ہوگیا کہ کام کندلہ رات کو راجہ اندر کے دربار میں جاتی اور وہاں رقص کرتی ہے اور جو واقعات گزرے اس کا اظہار کچھ عرصہ کے بعد شہزادہ نے کام کندلہ پر کیا اور آخر اسی کی ترکیب بتلانے سے راجہ اندر نے کام کندلہ کو شہزادہ کے حوالے کردیا۔ دوبارہ جلوس کے ساتھ شہزادہ اور کام کندلہ شاہی محل میں آئے اور وصل کی لذت سے شادکام ہوئے۔

(۶) قصہ سوداگر

یہ ایک مختصر داستان ہے جو (۸ ½ × ۵ ½) سائز کے (۲۸) صفحے پر مشتمل ہے۔ کسی فارسی داستان سے ترجمہ کی گئی ہے۔ مترجمہ کا نام نہنو بی ہے۔ سنہ ۱۲۶۷ھ میں یہ ترجمہ ہوا ہے۔

داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک سوداگر کو چار فرزند تھے جن میں سے چھوٹا فرزند خوب صورتی اور علمی قابلیت میں ممتاز تھا۔ تینوں بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے حسد کرتے تھے۔ مل کر سازش کی کہ چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا جائے مگر اس کی بیوی کو اس سازش کی خبر ہوگئی۔ اس نے اپنے شوہر کو اس سے مطلع کر دیا اب اس نے باپ سے اجازت لے کر تجارت کے لئے روانہ ہوا باپ بہت کچھ دولت ہمراہ کرنا چاہا مگر یہ راضی نہیں ہوا۔ باپ نے

اصرار کیا تو کچھ اشرفیاں لے کر روانہ ہوا۔ راستہ میں بیسوں مصیبتیں پیش آئی ہیں مگر بہتر مصیبت دور ہوتی گئی۔ خدا نے ہر بلا سے بچا لیا۔ اور تینوں بھائی ماں باپ بحالت تباہ چھوٹے بھائی کے در دولت پر آئے اس نے اپنے بھائیوں کو عزت اور حرمت سے ہر ایک کے لئے زندگی بسر کرنے کا سامان کر دیا۔

داستان کا آغاز :-

" روایت کرتے ہیں اور لکھنے والے یوں لکھتے ہیں کہ ملک سراندیپ میں ایک سوداگر تھا اور مال متاع اس کے پاس ایسا تھا کہ کوئی بیوپاری یا مہاجن اس کے برابر نہیں تھا اور اس پر حق تعالیٰ کی عنایت سے چار بیٹے تھے۔ چھوٹا لڑکا حسن و جمال میں بے مثال تھے سولہ سال کی عمر میں علم دانائی اور علم اوستادی سے کامیاب ہوا اور فن سپہ گری میں کامیاب طاق ہوا اور ایک دم حق تعالیٰ کی یاد سے تغافل میں نہیں رہتا تھا۔ اور خوراک سوائے دودھ گائے کے کچھ نہیں کھاتا تھا اور ماں باپ اس پر بہوت جان نثار اور خوش سب چاہتے تھے۔ غرض تینوں بھائی اپنی بے وقوفی سے اس کی دشمنی میں تھے "۔

ان داستانوں سے واضح ہوگا کہ دکن میں مرتبہ داستانیں کس رنگ کی ہیں، اور شمالی ہند سے ان کو ایک حد تک مختلف کہنا ضروری ہے جن داستانوں کا اس مضمون میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں اور ان کے قلمی نسخے بھی مجھے کسی اور کتب خانہ میں ہم دست نہیں ہوئے۔

غزل

حضرت نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

تشنہ کیوں کر نہ رہے ذوقِ تماشا میرا
مجھ پہ کھلتا نہیں جب خود ہی معمّا میرا

خود نمائی سے ہو فرصت جو کبھی تو اے دوست
دیکھ آنکھوں سے مری رنگِ تمنّا میرا

ق

آفریدہ ہوں عبث میکدۂ ہستی میں
نہ تو ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ مینا میرا

خس و خاشاک کے مانند بہا پھرتا ہوں
نہ تو موجیں ہیں نہ ساحل ہے نہ دریا میرا

اک بگولہ ہے کہ سرگرم تک و تاز میں ہے
نہ تو منزل ہے کوئی اور نہ جادا میرا

آشیاں بھول گیا طائرِ نو پر کی طرح
نہ تو گلزار ہی میرا ہے نہ صحرا میرا

جستجو میں تری آوارہ پھرا کرتا ہوں
نہ تو کعبہ ہی مرا ہے نہ کلیسا میرا

میں ہوں اس دشتِ جنوں خیز میں سرگرمِ طلب
بھاگتا مجھ سے ہے خود نقشِ کفِ پا میرا

شب کے سناٹے میں جب ڈوبنے لگتا ہے دل
پوچھ جاتا ہے اثرؔ پوچھنے والا میرا

لال ٹوپی ــــــ ایک خاکہ

پرنسپل مرزا محمود بیگ

آج کل ٹوپی پہننے کا رواج بہت کم ہے۔ لوگ عام طور پر ننگے سر رہتے ہیں۔ اور نہ وہ خود اس کو برا سمجھتے ہیں۔ نہ دوسرے ان پر انگلی اٹھاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یا تو سر پہ بڑے بڑے پگڑ صافے بندلاسے یا طرح طرح کی پگڑیاں باندھتے تھے۔ جن میں شملے کی لمبائی اور طرے کی اونچائی کو کافی دخل تھا۔ یا انگریزی ہیٹ (HAT) یا (EVENIN G) ایوننگ کیپ پہنتے تھے جو کسی کے سر پہ اچھی اور کسی کے سر پہ بری لگتی تھیں۔ یا چوگوشی یا کشتی نما یا گول کامدار ٹوپیاں پہنی جاتی تھیں پھر ایک زمانے میں ترکی ٹوپی کا کافی رواج رہا۔ اور یہ زمانہ وہ تھا جب سر کا ڈھکنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ تہذیب میں شامل تھا۔ اور ننگے سر رہنا بری بات تھی بلکہ کہا جاتا تھا کہ ننگے سر پہ شیطان چلنے لگتا ہے۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو آج کل تو شیطان بہت مصروف رہتا ہوگا بلکہ اسے اپنا فرض ادا کرنے میں مدد لینے کے لئے بہت سے کارندے رکھنے پڑتے ہوں گے۔ کیوں کہ آج کل اکثر لوگ ننگے سر ہی نظر آتے ہیں۔

اور دیکھئے اس کے باوجود میں آج آپ سے اپنے لال ٹوپی والے دوست کا تعارف کروانا چاہتا ہوں۔ ان کی لال ٹوپی کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتی۔ گو میں جانتا ہوں کہ سفید ٹوپی۔ کالی ٹوپی اور لال ٹوپی آج کل خاص خاص سیاسی پارٹیوں کے نشان ہیں مگر جن لال ٹوپی والے صاحب کا میں آپ سے تعارف کروا رہا ہوں ان کا تعلق ہرگز ہرگز کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ہے۔ اور ہو بھی نہیں سکتا کیوں کہ آپ کبھی بھی ان کو سڑک پر چلتا پھرتا۔ یا کسی جلسے میں یا کسی

محفل میں بیٹھا ہوا نہیں پائیں گے۔ یہ صاحب اکثر آپ کے ساتھ رہتے ہیں مگر اس طرح کہ نہ سامنے نہ دائیں نہ بائیں نظر آئیں گے۔ وجہ ظاہر ہے۔ ان کا جسمانی وجود ہے ہی نہیں۔ یہ صاحب محض آپ کے تصور کی ایجاد ہیں اور جب آپ اکیلے ہوتے ہیں یہ آپ کے تصور میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان کا صرف ایک ہی کام ہے۔ آپ کو پریشان کرنا۔

شاید آپ نے ان کو پہلے کبھی غور سے نہ دیکھا ہو اور اس وجہ سے ان کے وجود کی آپ کو خبر نہ ہو۔ اگلی دفعہ جب آپ اپنے کو فکر مند پائیں۔ جب آپ کی بھوک فکر کی وجہ سے کم ہو جائے یا رات کی نیند فکر کی وجہ سے بالکل اُڑ جائے تو ذرا آنکھیں نیند کے اس دھندلکے میں جو آنکھیں بند کرنے کے فوراً بعد آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے آپ اُن کو تلاش کیجئے گا تو ادھر ادھر کسی کونے میں یا بالکل سامنے انگلیاں نچاتے اور آپ کو چڑاتے ضرور نظر آئیں گے لیکن ہر فکر کی کیفیت میں یہ نظر نہیں آیا کرتے۔ بعض فکر ایسے ہیں جن کو فکر معیشت کہا جاتا ہے جو ہر ایسے انسان کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں جس کی زندگی کش مکش حیات کی وجہ سے طرح طرح کے تفکرات سے بھری رہتی ہے۔ جس کے لئے نون تیل۔ لکڑی کا مسئلہ طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتا ہے اس کی آمدنی اتنی نہیں کہ بیوی اور بچوں کے لئے رہنے کے قابل گھر، پہننے کے قابل کپڑے پیٹ بھرنے کے قابل روٹی دال مہیا کر سکے۔ اور یہ سب چیزیں مہیا کرنے کے بعد بچوں کی تعلیم اور کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر کی دکھ بیماری کے اخراجات برداشت کر سکے۔

ایسے شخص کے تفکرات اتنے سچے اور اصلی ہیں کہ لال ٹوپی والے صاحب کو اس کے تصور میں انگلیاں نچانے کی ضرورت نہیں۔

اس ہی طرح طالب علم کو امتحان کا فکر ہوتا ہے بے کار کو روزگار کا فکر ہوتا ہے بیمار کو صحت کا فکر ہوتا ہے۔ قرضدار کو قرض خواہ کا فکر ہوتا ہے۔ شہرت کے طلب گار کو نام ونمود کا فکر ہوتا ہے اور بھی طرح طرح کے فکر ہیں جن کا تعلق لال ٹوپی سے نہیں۔ یہ فکر انسان کو محنت اور تدبیر کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اس کی زندگی میں عمل کے محرکات بن کر

آتے ہیں۔ ایسے تفکرات ہر صحیح قسم کے انسان کے دل اور دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، اور پیدا ہونے چاہئیں۔ کیوں کہ ان پر ہی اس کی کامیاب زندگی اور ترقی کا انحصار ہے۔
لال ٹوپی والے صاحب ایسے لوگوں کے تصور میں جگہ پا ہی نہیں سکتے۔ کیوں کہ ایسے شخص کے تصور میں عام طور پر تدبیریں اور تجویزیں ارادوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے تجربے کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جاتا ہے۔ قابل عمل منصوبوں کی شکل دی جاتی ہے اور پھر ان پر عمل کیا جاتا ہے اور اس عمل سے صرف فرد کی ہی نہیں۔ جماعتوں کی ہی نہیں بلکہ قوموں اور ملکوں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔

لال ٹوپی والے دوست جن سے میں آپ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں ایسے باعمل لوگوں سے دور بھاگتے ہیں اور ان لوگوں کے تصور کی دنیا کو آباد کرتے ہیں جو فکر کو ہی اصل حیات اور فکر کو ہی مقصد حیات سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یہ لال ٹوپی والے صاحب اس ماں کے تصور کو آباد کرتے ہیں جو بچے کو دس منٹ دیر سے گھر آنے کو اپنے لئے دس سال بنا لیتی ہے اور ہر طرح کی چوٹ اور ہر قسم کے حادثے کا تصور کر کے اپنے آپ کو بھی پریشان کرتی ہے اور دوسروں کو بھی۔ یہ لال ٹوپی والے صاحب اس ماں کے تصور کو آباد کرتے ہیں جو بچے کے بیمار ہونے پر ڈاکٹر کے نسخوں کے باوجود ہر لحظہ اپنے لئے طرح طرح کے فکر ایجاد کرتی ہے۔ ہر وقت دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہتی رہتی ہے: "اگر یوں نہ ہوا تو کیا ہوگا۔ اگر یوں ہو گیا تو کیا ہوگا۔" لال ٹوپی والے صاحب کو ایسا موقعہ خدا دے۔ یہ اس کی نیند میں طرح طرح کی شکلیں بنا کر اسے ڈراتے ہیں اور اس کی نیند حرام کر دیتے ہیں۔ اگر وہ کھانا کھاتی ہوتی ہے تو اس کے ہاتھ کے نوالے کے گرد اس طرح ناچتے ہیں کہ وہ نوالہ منہ تک پہنچانے کی بجائے پلیٹ میں رکھ دیتی ہے اور بن کھائے کھڑی ہو جاتی ہے یہ صاحب اس کے بیمار بچے کی چارپائی کی گرد اس طرح سے ناچتے ہیں کہ ماں کو بچہ کا آہستہ آہستہ صحت مند ہوتا چہرہ نظر ہی نہیں آتا بلکہ بچہ اور زیادہ کمزور نظر آنے لگتا ہے۔

یہ لال ٹوپی والے صاحب اس طالب علم کے تصور میں ناچتے ہیں جس کا امتحان کا فکر عمل کی قوت پیدا کرنے کے بجائے اس کو اور کم کر دیتا ہے وہ کتاب اپنے سامنے کھول کر رکھتا ہے۔ مگر بجائے اس کے کہ اس پر چھپے ہوئے حروف اس کو نظر آئیں ان صفحوں پر یہ لال ٹوپی والے صاحب اچھلتے کودتے انگلیاں نچا کے منہ چڑاتے نظر آتے ہیں۔ وہ کتاب پڑھنے کے بجائے یہ بھی سوچتا رہتا ہے "کہ اگر فیل ہو گیا تو کیا ہو گا" اگر امتحان میں وہ سوال پوچھے گئے جو مجھے نہیں آتے تو میں کیا کروں گا۔ اگر امتحان کے وقت مجھے باتیں یاد نہ آئیں تو میں کیا کروں گا" یہ سوال بار بار لال ٹوپی والے صاحب انگلیاں نچا نچا کر اس سے کرتے جاتے ہیں۔ اور اس کا دل ڈوبتا جاتا ہے۔ اس کا دماغ کام کرنے سے انکار کر دیتا ہے اس کے پڑھائی کے تین چار گھنٹے پڑھائی میں صرف ہونے کے بجائے اس کے دل میں بے اطمینانی بے اعتمادی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کے سر میں اور آنکھوں میں درد ہوتا ہے اُسے بخار سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی بھوک ختم ہو جاتی ہے اور نیند رخصت ہوتی ہے۔ وہ اب واقعی لکھا پڑھا سب بھول جاتا ہے اور لال ٹوپی والے صاحب کی برکت سے اچھا خاصا پاس ہوتا لڑکا بہت اچھے نمبر والا لڑکا اپنی کامیابی کی وجہ سے سرخرو ہونے والا لڑکا ایسا ہو جاتا ہے کہ اس کے پاس ہونے کے لالے پڑ جاتے ہیں یہ لال ٹوپی والے صاحب اس شخص کے تصور کو آباد کرتے ہیں جن کو بیماری کوئی نہیں ہوتی، مگر وہ اپنے لئے طرح طرح کی بیماریاں ایجاد کر لیتے ہیں اگر سہ پہر کو ذرا بدن گرم محسوس ہوا تو سمجھ بیٹھتے ہیں کہ تپ دق ہو گئی ہے جھٹ کوئی کتاب نکال کر پڑھتے ہیں اس میں تپ دق کی جتنی علامات دی ہوتی ہیں ان کو سب اپنے میں نظر آنے لگتی ہیں۔ لال ٹوپی والے صاحب ایک ایک علامت پر انگلی رکھتے جاتے ہیں اور اپنی لمبی انگلی نچا نچا کر ان کو یقین دلاتے جاتے ہیں کہ یہ علامت بہت عرصہ سے موجود ہے۔ اور یہ علامت بھی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھے خاصے صحت مند صاحب لال ٹوپی والے دوست

کی سازش سے اپنے آپ کو بیمار، پورا بیمار قریب المرگ بیمار تصور ہی نہیں بلکہ یقین کر بیٹھتے ہیں اور چادر اوڑھ کر اپنی بیماری کا اعلان کر دیتے ہیں۔

یہ لال ٹوپی والے دوست ان لوگوں کے تصور کو آباد کرتے ہیں جو ارادے اور تجویزیں ضرور ذہن میں لاتے ہیں مگر جن میں عمل کی جرأت نہیں ہوتی۔ خود ہی ان ارادوں کو بعض باتوں سے ڈر کر ترک کر دیتے ہیں بقول شخصے ؎

ارادے باندھتا ہوں سوچتا ہوں توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

"کہیں ایسا نہ ہو جائے" کا خوف ان پر اتنا سوار ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا بہترین حصہ ارادوں کو باندھنے اور ان کو توڑنے میں ہی صرف ہو جاتا ہے۔ اور محض لال ٹوپی والے صاحب کی کارستانی کی وجہ سے ان کی تدبیریں تدبیریں ہی رہتی ہیں۔ اور تجویزیں محض تجویزیں۔ تھوڑی بہت عمل کی ہمت شروع شروع میں موجود بھی تھی تو لال ٹوپی والے صاحب کی برکت سے بہت جلدی ختم ہو جاتی ہے اور ان کے لئے عمل کی حد محض لال ٹوپی کے تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔

مجھے نہیں معلوم ہے کہ جن لال ٹوپی والے صاحب کا میں نے آپ سے تعارف کرایا ہے آپ کو خود ان سے واسطہ پڑا ہے یا نہیں۔ آپ کے تصور کو بھی ان ذات شریف نے آباد کیا ہے یا نہیں مگر آپ یقین رکھئے کہ لال ٹوپی والے صاحب کا جسمانی وجود نہیں۔ اس آب و گل سے ان کا خمیر نہیں۔ سڑک پر اور دفتر میں اور کارخانے میں اور محفل میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی ہو۔ مگر ان کا ذہنی وجود ان کی تخیلی حیثیت ایک حقیقت ہے، جس سے اکثر لوگ آشنا ہیں۔ اور اگر آشنا نہیں تھے تو اس تعارف کے بعد آشنا ہو جائیں گے۔ ان صاحب کی دوستی اچھی نہیں۔ یہ ارادے اور عمل کے دشمن ہیں۔ یہ صحت اور تن درستی سے بیزار ہیں۔ یہ سکون اور اطمینان کے

ڈاکو ہیں۔ اگر ایک دفعہ یہ تصور میں جگہ پا جائیں تو ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ تسمہ پا کی طرح ان کی ٹانگیں گردن کو اس طرح سے جکڑتی ہیں کہ سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر مریض فکر و اقعی اور مرض موت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

آج ان لال ٹوپی والے صاحب کا آپ سے تعارف کرانے کی غرض صرف اتنی تھی کہ آپ ان کو اچھی طرح دیکھ لیں، ان کے حلیے سے واقف ہو جائیں، اُن کے کرتوت کو خیال میں رکھیں اور اگر کبھی یہ آپ کے تصور میں جگہ بنانے کی کوشش کریں تو ان کو ہرگز ہرگز ایک لمحہ کے لئے ٹھہرنے کی اجازت نہ دیں۔ یہ آپ کے لئے آپ کی صحت کے لیے، آپ کے عمل کی قوت کے لئے، آپ کے ملک اور قوم کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

جگر مرحوم کے دو خط

بنام جناب ابرار الرحمٰن قدوائی

[ذیل میں حضرت جگر کے دو خط شائع کئے جا رہے ہیں۔ مرحوم اپنے خطوں پر عام طور پر مقام اور تاریخ نہیں لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ ان خطوں پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے مکتوب الیہہ کا خیال ہے کہ پہلا خط غالباً مارچ یا اپریل ۱۹۴۸ء کا ہے اور دوسرا جون یا جولائی ۱۹۴۹ء کا۔

اسی طرح مرحوم خط لکھنے کے بعد انھیں دوبارہ نہیں پڑھتے تھے، جس کی وجہ سے اُن کے خطوں میں اکثر بعض لفظ چھوٹ جاتے تھے یا کوئی لفظ نامکمل رہ جاتا تھا۔ دوسرے خط میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ہم نے قوسین میں اُن کی تصحیح کر دی ہے۔ مرتب]

۷۸۶

عزیز گرامی قدر سلمہ اللہ تعالیٰ، دعائے فراواں

آج ہی واپس ہوا ہوں۔ ۲۶ کو لاہور میں مشاعرہ ہے حضرت شاعر لکھنوی اسی غرض سے بھیجے گئے ہیں۔ "پرمٹ" یا ڈپٹی کمشنر کا اجازت نامہ" بہرحال یہ اور اس ذیل کے تمام مراحل میرے مزاج سے مطلق مناسبت نہیں رکھتے۔ دل و دماغ بیکار سے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ جس وقت مجھے فرصت ہو میں آپ کو لکھ دوں۔ آپ کا پتہ میں نے محفوظ کر لیا ہے۔ آپ کبھی کبھی گونڈہ آتے رہا کیجئے۔ انشاء اللہ وقت ضائع نہیں جائے گا۔ آئندہ سے اس قدر احتیاط رکھئے کہ جواب کے لئے لفافہ روانہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

جگر

(۲)

۶۸۹

گونڈہ :-

عزیز گرامی قدر سلمہ اللہ تعالیٰ   دعاہائے فراواں

ایک طویل سلسلۂ سفر کے بعد واپس ہوا ہوں۔ دائم المریض بھی ہوں، مزاجاً کاہل اور ضرورۃً مصروف، اس لئے جواب اکثر و بیشتر دیر میں لکھنے کا عادی ہوں۔ ماہ رمضان المبارک کا ابتدائی نصف حصہ گونڈہ میں رہنے کا ارادہ ہے اور باقی نصف لکھنؤ میں۔ میں نے اصلاحی و تبلیغی جماعت (جس کا مرکز اوّل دہلی اور مرکز ثانی لکھنؤ میں) بہت قریب اور بہت غور سے دیکھا ہے۔ یہ (میں) بہ آسانی کسی کا معترف نہیں ہوا کرتا۔ خود اپنے ایک مطلع میں اپنی اسی افتاد طبیعت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ نہیں دل کسی عنوان نہ جانے پائے   مگر اتنا ہے کہ آسان نہ جانے پائے

بہرحال میں آپ (کو) مشورہ دیتا ہوں کہ مولانا "مودودی" کے لٹریچر کا تفصیلاً مطالعہ کرتے رہیئے۔ وہ حقیقۃً بہت بڑے مفکّر ہیں لیکن ان کی تصانیف کا اثر صرف دماغ تک محدود رہتا ہے۔ میں اس تحریک کو غیر حکیمانہ بھی سمجھتا ہوں۔ اگر (چہ) تحریک کے ایک ایک جزو سے مجھے اتفاق ہے۔ مختصراً (یہ) کہ ان کی تصانیف قلب و روح کے لئے بیکار سی ہیں، تاہم ذہنی اعتبار پر بےحد مفید۔ آپ نوجوان ہیں، لکھنؤ قریب ہے کبھی کبھی جاتے بھی رہتے ہوں گے اس تحریک کا قریب سے صرف مطالعہ کیجئے (دیکھیے) اگر روح و قلب خود آگے بڑھیں تو پھر رُکئے نہیں۔ ندوۃ العلماء کی مسجد میں "جمعرات" کی شب مغرب سے صبح تک وہیں بسر کیجئے۔ انشاء اللہ آپ فائدے میں رہیں گے۔ کاش آپ کبھی گونڈہ پہنچ سکیں۔

مجھے لکھئے کہ کس زمانے میں آپ کو فرصت ہوگی۔ اگر بعد عید ممکن ہو سکے تو تین چار روز کے لئے ضرور یہاں آجایئے۔   دعاگو

جگر

یہ بھی شادی وہ بھی شادی

محترمہ بیگم صالحہ عابد حسین

باجوں کی جھنکار، روشنیوں کی چکا چوند، کھانوں کی خوشبو، مہمانوں کی کثرت، بچوں کے شور، زیوروں کی جھنجھناہٹ، لباسوں کی سرسراہٹ، جہیز کی بہتات، دولہن کی آرائش، دولھا کی زیبائش ایک چیز ہو تو آدمی سہارے، بچاری فرحت آپا کے لئے یہ سب مل کر اتنا بار ہو گیا تھا کہ بس چلتا تو ساری مروّت چھوڑ اپنے گھر بھاگ جاتیں۔ اوپر سے خواتین کی باتیں انھیں اور جھنجھلائے دے رہی تھیں۔

"واہ بہن واہ، کیسا عمدہ انتظام کیا ہے مدن میاں نے، جی خوش ہو گیا۔"

"سب کام کیا وقت پر ہوا! آٹھ بجے بارات آئی، ساڑھے آٹھ بجے نکاح ہوا، نو بجے کھانا اور اب دس گیارہ تک رخصتی بھی ہو جائے گی۔"

"اور کھانا کتنا عمدہ تھا! سات آٹھ سو آدمیوں کی دعوت، مگر ہر ایک نے چھک کر کھایا اور پھر قورمہ، کباب، بریانی، کھیر، شیرمال کیا نہ تھا۔" ایک بیوی چٹخارہ لے کر بولیں: "مدن میاں کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بیس پچیس آدمیوں نے پندرہ دن سے دن رات ایک کر رکھا ہے۔"

"خیر، یہ تو ان کا فرض تھا، سبھی کے ماتحت کرتے ہیں۔"

"اور جہیز؟ جہیز تو اتنا دیا ہے کہ سارا گھر بھر جائے گا۔ بارہ پندرہ ہزار سے کم کا نہ ہو گا۔"

"بہن، بارہ پندرہ ہزار کا تو خالی زیور ہی ہے۔ ایک پوری شیشے کی الماری میں زیور سجے ہیں۔"

"اور کیا بہن! ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے اس زمانے میں اتنا دینا۔ اس کے لئے دل چاہیئے دل۔"

"فرحت آپا اب نہ سہار سکیں"۔ اس کے لئے دل سے زیادہ فالتو روپے کی ضرورت ہے۔" اور ان کے لہجے کے طنز پر کئی عورتوں نے مڑ کر انھیں دیکھا۔ ایک صاحبہ دوسری سے دبی آواز میں کہنے لگیں: "اے یہ فرحت آپا یونہی لوگوں کا جہیز اور شادیاں دیکھ کر جلا کرتی ہیں"

"جلتی نہیں بچاری، اصلاح کی کوشش کرتی ہیں، مگر سنتا کون ہے ان کی۔"

"کہتی تو سچ ہیں۔ جہیز اور تحفوں کا زور ہمارے دیکھتے دیکھتے کتنا بڑھ گیا ہے۔ زندگی اجیرن ہو گئی ہے"

"اور کیا، ہر مہینے دو ایک تحفے دینے کا خرچ ہم جیسے کم حیثیت لوگوں کے لئے مصیبت بن گیا ہے۔ اور پھر غریب آدمی کا جی کتنا للچاتا ہے ان رئیسوں کی لڑکیوں کا جہیز دیکھ کر۔"

"اللہ، پیسے والے تو بہت ہیں، مدن میاں کا سا دل کسی کا نہیں ہے"

"دل تو جب ہوتا خالہ!" فرحت آپا نے بوڑھی بی بی کو مخاطب کر کے کہا: "جب اپنی بیٹی کو اتنا زیادہ جہیز دینے کے بجائے، تھوڑا کم کر کے، دو چار غریب لڑکیوں کا بیاہ کرا دیتے"

"اوئی بوا! یہ نرالی منطق ہے"

"اتنا جہیز، متوسط درجے کی پندرہ بیس اور غریب گھرانے کی چالیس پچاس لڑکیوں کے لئے کافی سے زیادہ ہوتا خالہ!"

"اے ہے، تم سے کون مغز مارے بوا۔ تم نہ دینا اپنی لڑکی کو کچھ، غریب لڑکیوں کا بیاہ کرا دی پھرنا" "انشاءاللہ" فرحت آپا نے کہا اور اس انشاءاللہ نے سب کی زبان بند کر دی۔

دوسری طرف دلھن کی سہیلیاں ریحانہ کی قسمت کو سراہ کر رشک کی ٹھنڈک کم کر رہی تھیں۔

"کتنی خوش نصیب ہے ریحانہ - اتنا زیور، ایسے تحفے، اتنا سامان "

" اور دولھا بھی اچھا ملا - سُنا ہے ہزار روپے سے زیادہ کی آمدنی ہے اس کی "

" اُنھ ہزار کمانے سے کیا ہوتا ہے - پڑھا لکھا تو خاک نہیں - بزنس مین ہے نرا "

" اور ریحانہ صاحبہ بی اے - بی ٹی "

" اے بڑے لوگ یہ کب دیکھتے ہیں - پیسہ دیکھا جاتا ہے پیسہ "

" صورت بھی دولھا کی ماشاء اللہ ہے - کیسا یدھو سا لگتا ہے - موٹا ٹھنگنا - بھدا "

" ہمت نا جنس - میں تو ایسے سے دس ہزار کمانے والا ہوتا تب بھی نہ کرتی "

" بس رہنے دے شیخی یا رو - تجھے تو دو تین سو والا بھی پوچھے گا تو ....."

" بری بات ہے بیتا - مانا کہ پارو کالی ہے مگر ....."

" دیکھو انجم تم مجھے پارو سے لڑاؤ نہیں - میں نے تو یونہی مذاق میں کہا تھا - "

" آخر یہ اتنے سارے تحفے کہاں سے آئے ؟ "

" واہ ! تحفے ملتے کیوں نہیں ؟ دوستوں نے، عزیزوں نے دیئے ماتحتوں نے معمولی ملنے جُلنے والوں تک نے دیئے ہیں - دو ہزار کارڈ جب چھپوا کر تقسیم کئے جائیں تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ آؤ نہ آؤ تحفہ بھیج دو " اور کئی لڑکیاں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں -

" تم نے دیکھا ! فرحت آپا نے کوئی تحفہ نہیں دیا ؟ "

" وہ تو کسی کو بھی تحفہ نہیں دیتیں - اصول ہے ان کا "

" ریحانہ ایک دکان رکھے گی تو اچھا رہے گا - اتنے لیمپ، تھرماس، گھڑیاں، چلاے، کافی، لیمن، آئس کریم کے سٹ، کئی ریڈیو، سینکڑوں زیور، پچاسوں جوڑے بیسیوں جوتے، آخر کیا کرے گی بچاری، ان سب کا ؟ "

" چیک اور روپے کیا کم ہیں ؟ ایک تو کیس میں تو سارے چیک اور نوٹ ہی ٹھس پلے

کئے گئے ہیں ....."

"اور ایک صاحب کی جدت دیکھی؟ چاندی کے سو روپے ایک چاندی کی پلیٹ میں رکھ کر دیئے ہیں۔"

"یہ جدت ہے یا بدمزاقی کی انتہا۔"

"بدمزاقی اور نو دولتے پن کا اظہار ہے کس چیز میں نہیں؟"

"اوفوہ پارو۔ چپ بھی رہ ...... تیری زبان نہ رکے گی۔"

"انجم صاحبہ آپ کی مارے رعب کے گھگی بندھی ہوئی ہے، میری نہیں۔ بھلا دیکھو تو پڑھی لکھی لڑکی اور اتنے بھاری جہیز میں ایک کتاب بھی نہیں۔"

"اب یہ تمہاری زیادتی ہے بہن۔ ایک کتاب ہے تو —— پرنسپل صاحب کا تحفہ۔"

"چارپلے بود —— صرف ایک کتاب۔" اور فرحت آپا جو تھوڑی دیر سے کھڑی ان لوگوں کی باتیں سن رہی تھیں بے اختیار ہنس پڑیں۔

"ارے لڑکیوں کیا بک بک کئے جا رہی ہو۔ راستے سے تو ہٹو۔ دولہا اندر آرہا ہے، آرسی مصحف کے لئے" ایک بھاری آواز گونجی۔

"چلو بھئی بھاگو۔ کوتوال صاحبہ آگئیں۔"

"انجم پرسوں ہمارے ہاں آنا۔ تمہیں ایک شادی دکھائیں گے۔"

"کس کی شادی ہے پارو؟"

"میرے پڑوس میں ایک لڑکی کی۔"

"میں بے بلائے کیسے ......"

"ارے میری ہر سہیلی کو وہاں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ فرحت آپا آپ بھی تو چلیں گی نادرہ کے بیاہ میں۔"

"ہاں بیٹی ضرور۔" فرحت آپا نے جواب دیا۔

"شاہدہ بھی آئے گی نا؟ یہاں تو نہیں آئی؟" پارو نے پوچھا۔

"وہاں ضرور جائے گی۔ ابھی سے تیاری کر رہی ہے۔" فرحت آپا کی آواز عورتوں کی چیخ و پکار میں دب گئی۔

آرسی مصحف ہو رہا تھا۔ عورتیں بیتے سہاگ کے دنوں کی شیریں یاد میں محو تھیں تو لڑکیوں کے دل مستقبل کے آئینے میں اپنے سپنوں کے پیتم کی مورت دیکھ کر دھڑک رہے تھے۔

انجم پہنچی تو پارو جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔

"آؤ انجم چلیں۔ دیر ہو گئی خاصی۔"

"تم کیا تحفہ دے رہی ہو اپنی دوست کو ذرا دکھانا۔"

"میں الگ سے کیا دیتی۔ امی کچھ چیزیں بھیج رہی ہیں۔"

پارو نے پیکیٹ کھولا۔ سستی ساٹن کا گلابی جوڑا، کامدانی کا ڈوپٹہ۔ سنہرے چپل ایک رومالوں کا سٹ، ایک چھوٹا سا پرس اور بیس روپے۔

"جوڑا اور روپے امی بھیج رہی ہیں۔ رومال ناہید لائی ہے اور پرس میں دے رہی ہوں۔" پارو نے بتایا۔

"لو یہ میری طرف سے دے دینا۔" انگریزی کی ایک خوب صورت جلد کی کتاب انجم نے پارو کو تھما دی۔

پارو مسکرائی۔ "یہ کتاب —— اس کے کام نہ آئے گی۔"

"کیوں تم ہی تو کل کہہ رہی تھیں کہ کتاب سے بڑھ کر کوئی تحفہ نہیں۔"

"ہاں مگر وہ انگریزی نہیں جانتی......" پارو نے بتایا۔

"نہیں کوئی بات نہیں۔ لو وہ فرحت آپا بھی آگئیں۔ اسے یہ تو برا ہوا۔"

"بیٹی مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ کیا آصفہ ابھی تیار نہیں ہوئیں؟" فرحت آپا نے پوچھا۔

"امی تو آج ماموں جان کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ چل رہے ہیں۔ فرحت آپا آپ کے ساتھ۔"

"اور شاہدہ نہیں چل رہیں؟" انجم نے پوچھا۔

"وہ تو دوپہر سے وہیں ہے۔"

"آپ نے کیا دیا فرحت آپا نادرہ کو"۔ پارو نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں بیٹی۔"

"واہ ——— زینب خالہ تو کہہ رہی تھیں سب آپ ہی نے کیا ہے۔"

"وہ تو گپ مارتی ہے۔"

"سچ بتایئے ورنہ میں خود زینب خالہ سے پوچھ لوں گی۔"

"نہیں نہیں اس سے نہ پوچھنا۔ میں نے کچھ نقد دے دیا تھا۔ البتہ شاہدہ اپنی طرف سے کچھ چیزیں لائی ہے؟"

"کیا کیا لائی ہے شاہدہ۔"

"ایک چائے کا سٹ، ایک ساڑھی، ایک گلے کی لاکٹ۔"

"اتنی بہت سی چیزیں آپ نے ایک لڑکی کو دے دیں؟ اور کل آپ کہہ رہی تھیں کہ تحفے دینا بیکار کی نمائش اور فضول خرچی ہے؟" انجم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بیٹی۔ آدمی سے خطا ہو ہی جاتی ہے۔ کہتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے۔"

"ارے ارے انجم کیا بک رہی ہو۔" پارو نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"اچھا اب چلو۔" فرحت آپا نے بات ٹالی۔

"چلئے میری کار باہر کھڑی ہے۔" انجم نے پیش کش کی۔

"کار کی ضرورت نہیں دو قدم ہی پر تو ہے۔" انجم نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا پیچھے سے تیرہ سالہ ناہید ریشمی سرخ جوڑا سرسراتی اور زیور چھنکاتی ان میں شامل ہو گئی۔ تھوڑی

دور چلے تھے کہ انجم بولی۔

"یہاں کہاں جا رہی ہو پارو۔ ادھر تو جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں ہیں۔"

"انجم وہیں جانا ہے!"

"تمہاری سہیلی جھونپڑی میں؟"

"تو کیا تم کسی کوٹھی بنگلہ کا تصوّر کر کے آئی تھیں؟" پارو نے کھسیا کر کہا۔

"بیٹی کوٹھی بنگلوں کی شادیاں تو اکثر دیکھتی ہو۔ آج جھونپڑی کا جشن دیکھ لو۔"

"فرحت آپا۔ نادرہ باجی کا دولھا بڑا اچھا ہے۔ لمبا گورا، ہنس مکھ۔" ناہید نے اپنی معلومات سے سب کو فیض پہنچانا شروع کیا: "دو جوڑے ریشمی آئے ہیں بری میں اور تین زیور۔ ناک کی نتھ۔ پاؤں کے چھاگل اور گلے کا چاندی کا ہار مگر زینب خالہ کہتی ہیں، تین تیرہ نہیں ہونے چاہئیں اور لاؤ ایک یا دو زیور۔"

"پاگل ہے وہ تو۔" فرحت آپا نے دھیرے سے کہا۔

"سب کہہ رہے ہیں دولھا بڑا کماؤ ہے۔ ڈرائیور ہے بس کا۔ سو روپے ملتے ہیں۔ اہا جی اب تو نادرہ آپا مزے کریں گی......"

جھونپڑی کے باہر ذرا سی کھلی جگہ میں ایک چھوٹی سی دری پڑی تھی۔ بارات ابھی نہ آئی تھی اور پڑوس کے بچّے اس پر دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ جھونپڑی کے بڑے صحن میں ٹاٹ کے چار پانچ ٹکڑوں کا فرش بچھا تھا۔ چار پانچ بانوں کی چارپائیاں پڑی تھیں، ایک لالٹین چھپر میں لٹک رہی تھی اور ایک بد قلعی ٹوٹا ہوا پاندان کھلا پڑا تھا جس میں ڈبیاں زیادہ تھیں اور چھالیہ کتھا کم۔ پڑوس کی بہت سی عورتیں اور بچّے جمع تھے۔ جن کو بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کھڑی تھیں۔ عورتیں حسب عادت اعتراض کرنے، بچوں کو ڈانٹنے یا دودھ پلانے اور پان کھلانے میں مصروف تھیں۔ پارو اور فرحت آپا کو دیکھ کر کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ "آداب آپا۔ سلام آپا۔" "آؤ آؤ آپا۔" "اِدھر بیٹھ جاؤ۔" "لَو جمیلہ

ذرا بنکھا تو جھل آپا کو۔" دیکھا آپا تم نے اپنی زینب بوا کا پھوڑاپا۔" دری تک نہیں۔ روشنی نہیں۔ توبہ۔ توبہ۔"

فرحت آپا سب کے سلاموں کا جواب دیتی، باتیں سنتیں آگے بڑھیں۔ زینب نے لپک کر ان کی پیشوائی کی: "آؤ آپا بیٹھو۔"

"نادرہ کہاں ہے؟"

"اندر چھپر میں ہے۔ ابھی نہلا کر اٹھایا ہے۔ سسرال کے کپڑے آئیں گے تو پہنے گی۔"

"چلو اس کے پاس چلتے ہیں پہلے۔"

اندر سترہ سالہ نادرہ صرف ایک پرانے بد رنگ سرخ ڈوپٹہ میں لپٹی بیٹھی تھی۔ گیلے بالوں کا آبشار پشت پر گر رہا تھا، ستواں ناک میں چھوٹی سی نتھ ہل رہی تھی۔ گندمی رنگ میں شرم، مسرت اور شدتِ جذبات نے سرخی بھر دی تھی اور سیاہ پلکوں میں سے موتی لڑھک لڑھک کر دھڑکتے سینے پر پھیل جاتے تھے۔ فرحت آپا نے جا کر اس کا سر چھاتی سے لگایا تو اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے گرد بہت سی لڑکیاں بیٹھیں ہنسی مذاق ... کر رہی تھیں مگر اپنی ہنس مکھ پر خلوص سہیلی کے جدائی کے احساس سے ان کی آنکھیں آبگوں تھیں۔

انجم گدڑی کے اس لال کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ پرسوں ریحانہ کے حسن کو دیکھ کر رشک کی ایک تیز لہر اس کے سینے میں اترتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ حسن جس کو مصنوعی سامان آرائش، کارچوبی جوڑے اور جڑاؤ زیورات نے دو آتشہ بنا دیا تھا مگر نادرہ کے اس قدرتی، معصوم، سادہ حسن نے اُسے مسحور سا کر لیا۔

فرحت آپا باہر آ کر ایک جھلنگے پر بیٹھ گئیں اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے لگیں۔ زینب بی پاگلوں کی طرح ہر طرف کام کرتی پھر رہی تھیں۔ باتیں بنانے والے بہت تھے ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا اور کوئی کرتا بھی تو کیا؟ نہ کھلنے کا اہتمام نہ فرش فروش، نہ مہمانوں کی خاطر داری کے انتظامات، نہ پان چھالیہ کا بکھیڑا۔ پھر ایک دم وہ فرحت آپا کے پاس آ کر رو پڑیں۔ "تم تو جانو ہو

آپا ـــ میرے پلّے تھا ہی کیا۔ فلتے پڑ رہے تھے ـــ تم ہی لوگوں کے صدقے میں اس کے ہاتھ پیلے کر پائی ۔ اب دیکھو ـــ یہ عورتیں کیا کلّوں میں چاول دبا دبا کر باتیں بنا رہی ہیں...... تم ہی کہو پان چھالیہ، کھانا دانا، خاطر مدارات کہاں سے کرتی؟ دس براتیوں کے لئے قورمہ روٹی اور زردہ پکوایا ہے ۔ اور یہی دو چار جوڑے اور برتن ہو سکے ہیں" اور وہ زیادہ بلک بلک کر رونے لگیں۔

"تم کیوں پروا کرتی ہو۔ لوگ تو بکا ہی کرتے ہیں بچّی کو اچھا گھر اور بَر مل گیا اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے تھا" فرحت آپا نے تسلّی دی۔

"ذرا چل کر اپنی بچی کا جہیز تو دیکھ لو ـــ غریبوں کے بھی تو دل ہوتے ہے آپا" اور فرحت آپا کے ساتھ ساتھ اور لڑکیاں اور عورتیں بھی اندر لپکیں۔ چھپر کے دوسرے کونے میں ٹاٹ کے فرش اور ٹین کے صندوق پر جہیز سجا کر دلہن کی سہیلیوں اور بہنوں نے دل کے ارمان نکالے تھے۔

پانچ سوتی یا سستے ریشم کے جوڑے، سات تانبے کے برتن، ہاتھوں پاؤں کے چاندی کے چھلّے دو چاندی کی پتلی پتلی چوڑیاں، ایک لال تکیہ، دلائی، ایک تولیہ، دو کڑھے غلاف شیشے کی چند رکابیاں پیالے، شاہدہ کا لایا چائے سٹ، منا سا مراد آبادی پاندان۔ ٹین کے چار چمچے، ایلومونیم کا ایک لوٹا اور بھرت کا گلاس سیاقی اللہ کا نام اور اللہ کا کلام۔ ایک چھوٹا سا کلام مجید مع رحل کے۔

درد کی ایک لہر فرحت آپا کے دل میں اٹھی اور آنکھیں بھر آئیں۔ لیکن لالٹین کی مدھم روشنی میں ان کے دل کی کیفیت چھپ گئی اور وہ ہنس ہنس کر ایک ایک چیز کی تعریف کرتی رہیں۔

پارو، شاہدہ، انجم، ناہید سبھی جھکی پڑی تھیں۔ انجم کی نظروں میں پرسوں کی شادی کا منظر گھوم گیا۔ دولت اور غربت کی ننگی پرچھائیاں ناچتی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ اور اس کے ذہن دماغ میں پہلی بار ہلچل پیدا ہوئی۔

"دولھا آرہا ہے۔ دولھا آرہا ہے"
لڑکیاں یہ سن کر بھدبھدبھاگیں۔ باہر بینڈ کا شور اور ہیجڑوں کا ناچ، بچوں اور چھوٹی لڑکیوں کو لبھا رہا تھا۔ اور اندر دولھا عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کا مرکز توجہ بنا تھا۔ سسرال کے سستے نئے جوڑے میں، سرخ رومال سے منہ چھپائے شرمایا کھڑا تھا مگر مسرت اس کے عضو عضو سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ اور فقرہ بازیوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

لیٹی لپٹائی دلہن جس کے چھریرے جسم پر سسرال کا سرخ جوڑا بڑا بانکا لگ رہا تھا اور سہرے کی لڑیوں میں سے شرمایا چہرہ بالوں میں چھپے آدھے چاند کی طرح جھانک رہا تھا، یا ہرلائی گئی۔ ڈھولک کی تھاپ پر نوجوان گلوں کے گھنگرو بج اٹھے، گیت کی مدھر تانیں فضا میں بکھر اٹھیں۔ روپہلی قہقہوں کی گونج نے مسرت کے موتی ہر طرف بکھیر دئے
انجم اب سب کچھ بھول کر اس ماحول کا ایک جز بنی خود بھی شاہدہ اور پاروکے ساتھ لہک لہک کر گا رہی تھی اور فرحت آپا کے دل کی کسک بھی مسرت کی اس سادہ معصوم فضا میں جانے کہاں تحلیل ہو گئی تھی۔

(کشمیر ریڈیو سے نشر)

حالات حاضرہ

یورپ کی مشترکہ منڈی

جناب محمد رحمت علی، استاد معاشیات جامعہ کالج

دولت مشترکہ کے ممبر ملکوں کی پندرھویں کانفرنس ۱۰ ستمبر ۱۹۶۲ء کو لندن میں شروع ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے ابتدائی مباحث ممبر ملکوں کی برطانیہ سے وفاداری اور تعاون کے فوائد پر مشتمل نہیں تھے۔ بلکہ اس بار سوائے روڈیشیا کے سارے ممالک کے نمائندوں کی بھنویں چڑھی ہوئی تھیں اور سبھوں نے رسمی گفتگو اور تقاریر کے بجائے یورپ کی مشترکہ منڈی میں برطانیہ کی متوقع شرکت سے متعلق رائے زنی شروع کی ۔ مخالفت سبھی نے کی ۔ سفید فام اقوام کا لب و لہجہ کسی قدر نرم تھا لیکن افریقہ اور ایشیا کے ممالک کا بہت ہی سخت۔

یورپ کی مشترکہ منڈی کی داغ بیل مارچ ۱۹۵۷ء میں ڈالی گئی تھی، اس وقت یورپ کے چھ ممالک (اٹلی، فرانس، مغربی جرمنی، بلجیم، ہالینڈ، لکسمبرگ) نے مل کر اپنی تجارت کو مشترکہ بنیادوں پر آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مشترکہ منڈی کے تصور کی بنیاد اصل میں یورپی اقوام کی یہ خواہش ہے کہ مل جل کر معاشی میدان میں اس وقت کے دو بڑے ملکوں (روس اور امریکہ) کا مقابلہ کیا جائے۔ مزید براں یہ تصور اس سیاسی بیداری کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ یورپی اقوام، بین الاقوامی مسائل میں چاہے وہ معاشی ہوں یا سیاسی، اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے عظیم تر یورپ کی بنیاد پر متحد ہونا چاہتی ہیں۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ مستقبل میں ان ممالک پر مشتمل یورپ میں ایک وفاق وجود میں آجائے جو ہر لحاظ سے موجودہ دونوں بلاکوں سے بڑا اور مضبوط ہو۔ یورپی اقوام کی پچھلی تاریخ کے پیش نظر یہ کہنا مشکل ہے کہ اس قسم کا کوئی اتحاد دیرپا ثابت ہوسکے گا۔

یا نہیں، کیوں کہ اپنی لسانی اور قومی برتری کا احساس ان میں سے ہر ایک کو ہے اور یہ احساس کبھی کبھی اتنا شدید ہو گیا ہے کہ اس کے باعث ماضی میں کئی خونریز لڑائیاں ہو چکی ہیں، لیکن آج تک بدلے ہوئے حالات میں جبکہ نہ صرف بین الاقوامی مسائل میں ان کے اثر کا سوال ہے بلکہ خود ان کی بقا کا مسئلہ پوری اہمیت کے ساتھ سامنے آگیا ہے، شاید یہ اتحاد کامیاب ثابت ہو۔

برطانیہ کی ہچکچاہٹ ــ آزاد تجارتی علاقے کا منصوبہ

اصل میں مشترکہ منڈی کا مسئلہ ہم لوگوں کی توجہ کا مرکز اس وقت بنا جبکہ اس تنظیم میں برطانیہ کی شرکت کا سوال سامنے آیا۔ برطانیہ نے مشترکہ منڈی کے قیام کے بعد اس تنظیم سے دلچسپی نہیں لی اور ۱۹۵۹ء میں اس نے آزاد تجارتی علاقہ کی ایک علیحدہ تنظیم قائم کی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دو باتیں اُس وقت برطانیہ کو مشترکہ منڈی میں شرکت سے روک رہی تھیں، ایک تو اسے دولت مشترکہ کے منتشر ہو جانے کا اندیشہ تھا دوسرے یورپ کے دیگر ممالک خصوصاً مغربی جرمنی اور فرانس کی بالادستی اسے پسند نہیں تھی، اور اگر برطانیہ کی آزاد تجارتی علاقے والی اسکیم کامیاب ہو جاتی تو اس کے لئے یورپ کی اس تنظیم میں شرکت کرنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ لیکن ہوا یہ کہ مشترکہ منڈی کی تنظیم اپنے باہمی تعاون اور امریکہ کی امداد کی بنا پر بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی اور آزاد تجارتی علاقہ کا نظریہ مقبول نہیں ہو سکا۔ مجبوراً برطانیہ کو اپنی پچھلی پالیسی پر نظرثانی کرنی پڑی اور جب یہ بات واضح ہو گئی کہ برطانیہ یورپ کی مشترکہ منڈی میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو دولت مشترکہ کے ممالک نے اس کی مخالفت شروع کی، کیونکہ اس سے ان کی برآمدی تجارت جس کا تعلق برطانیہ سے ہے براہِ راست متاثر ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ برطانیہ مستقبل میں دولت مشترکہ کے ممالک کے مقابلے میں مشترکہ منڈی کے ممالک کو تجارتی معاملات میں ترجیح دے گا۔

برطانیہ اور دولت مشترکہ کی باہمی تجارت

برطانیہ کے اس موقف کی مخالفت کرنے والے حق بجانب ہیں۔ پچھلے دس سال کی بیرونی

تجارت کے اعداد و شمار کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ باقی یورپ سے علیحدہ رہ کر برطانیہ کی معیشت کی ترقی تعطل کی شکار ہو جائے گی۔ کیونکہ اس مدت میں برطانیہ کی بیرونی تجارت یورپ کے ممالک سے بڑھتی اور دولت مشترکہ کے ممالک سے مسلسل گھٹتی رہی ہے۔ مثلاً ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک یورپ سے انگلستان کی برآمدی تجارت دوگنی ہوگئی لیکن دولت مشترکہ سے اس کی تجارت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ معاہدہ آٹوہ (۱۹۳۲) کی رو سے جو مراعات دولت مشترکہ کے ممالک کو حاصل ہوئی تھیں۔ ان میں آہستہ آہستہ کمی ہوتی گئی۔ مثلاً ۱۹۳۰ء میں دولت مشترکہ کے ملکوں کو ترجیحی سہولتیں ذریعے بارہ[۱۲] فیصدی کی حد تک حاصل تھیں لیکن ۱۹۴۱ء میں گھٹ کر پانچ سے چھ فیصدی اور ۱۹۵۷ء میں چار سے پانچ فیصدی تک رہ گئیں۔ اسی طرح انگلستان کے مال کو دولت مشترکہ کے ممالک میں دی ہوئی سہولتیں ۱۹۳۷ء میں گیارہ فیصدی تھیں جو گھٹ کر ۱۹۴۸ء میں سات اور ۱۹۵۷ء میں پانچ فیصدی رہ گئیں۔ یہ صورت حال تجارت کے بدلتے ہوئے رجحانات کی وجہ سے پیش آئی مثلاً بیرونی تجارت کا تناسب خاص طور سے دوسری جنگ عظیم کے بعد صرف ترقی یافتہ ممالک کے درمیان ہی بڑھا ہے۔ اس رجحان کو بعض روکنے کی ضرورت ہے۔ لیکن انگلستان یورپ کی اس نئی معاشی برادری سے باہر رہ کر شاید اس رجحان کو نہ روک سکے۔

برطانیہ مشترک منڈی میں کیوں شریک ہو رہا ہے؟

حکومت برطانیہ اس دوران میں ہمیشہ یقین دلاتی رہی ہے کہ مشترکہ منڈی میں شرکت کے بعد بھی وہ دولت مشترکہ کے مفادات کی حفاظت کرے گی۔ بلکہ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مشترکہ منڈی میں شرکت سے برطانیہ کی معاشی اور سیاسی حیثیت مضبوط ہو جائے گی اور مضبوط انگلستان دولت مشترکہ کی مضبوطی کی ضمانت دینے لگے گا۔ لیکن برسلز کانفرنس میں زرعی پالیسی اور تجارتی مراعات کے سلسلے میں جو فیصلے ہوئے ہیں اس سے دولت مشترکہ کے مفادات کی حفاظت کی توقعات پر پانی پڑ گیا۔ اور اس طرح ممبر ملکوں کے شکوک و

شبہات فطری طور پر یقین میں بدلنے لگے۔

حالیہ مشترکہ کانفرنس کے موقع پر اکثر ممبر ممالک نے صرف ایک ہی زاویہ سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے اور وہ یہ کہ دولت مشترکہ مفلوج ہو جائے گی، اور انھوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر برطانیہ کی مشترک منڈی میں شرکت کی مخالفت کی ہے۔ لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ کس حد تک کوئی ملک اپنے مفادات اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کرے گا۔ برطانیہ کی مشترکہ منڈی میں شرکت کا بنیادی پہلو میری نظر میں یہ ہے کہ اس سے خود برطانیہ کے مفادات کا حصول کس حد تک ممکن ہے؟ دولت مشترکہ اور باقی دنیا کے مفادات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ برطانیہ ضرور یورپ کی اس برادری میں شریک ہوگا، البتہ وہ اس بات کی پوری کوشش کرے گا کہ دولت مشترکہ کی تنظیم ٹوٹنے نہ پائے لیکن اگر ان دونوں تنظیموں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا سوال پیدا ہو تو موجودہ حالات اور یورپ میں اپنے اثر ورسوخ کے پیش نظر وہ یورپ کی برادری کو ترجیح دے گا۔ یہ ضرور ہے کہ انگلستان میں اس وقت ایک با اثر حلقہ ایسا بھی ہے جو اس صورت میں دولت مشترکہ کو مشترک منڈی پر ترجیح دے گا، لیکن اس کی کامیابی کی توقع بہت کم ہے۔ دولت مشترکہ کی مسلسل اور پُرزور مخالفت کے جواب میں مسٹر میکملین نے نرم لہجہ ہی میں سہی لیکن صاف کہہ دیا کہ یہ تو انگلستان کے عوام طے کریں گے کہ اس ملک کو مشترک منڈی میں شریک ہونا چاہیئے یا نہیں۔ گویا انگلستان کی حکمران جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ برطانیہ کا اس برادری میں شریک ہونا ناگزیر ہے۔ اس شرکت سے نہ صرف اس کا معاشی موقف مضبوط ہوگا بلکہ انگلستان اپنے اور باقی یورپ کے سیاسی مفادات کی حفاظت کر سکے گا۔ اس کے علاوہ ایک مضبوط انگلستان دولت مشترکہ کے مفادات کی بھی بخوبی حفاظت کر سکے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انگلستان مستقبل میں مشترک یورپ کے اقدامات پر اپنا اثر رکھ سکے گا جو بہت ضروری ہے۔

جہاں تک رائے عامہ کا تعلق ہے انگلستان کے زرعی طبقہ کو اس بات کی شکایت ہے کہ مشترکہ منڈی میں شرکت کے سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس میں ان کے مفادات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ شرکت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کا خیال

ہے کہ زرعی پیداوار کی قیمتوں کے سلسلے میں جو منصوبہ بندی ہو وہ عظیم تر یورپ کے بجائے بین الاقوامی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ زرعی طبقہ آج بھی انگلستان میں بہت اہم ہے اور زرعی پیداوار سے حاصل ہونے والی قومی آمدنی، موٹر کار اور کوئلہ کی صنعت کی مشترکہ آمدنی سے دوگنی ہے لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ یہ زرعی طبقہ مشترکہ منڈی میں انگلستان کی شرکت کا مخالف نہیں معلوم ہوتا بلکہ اسے اپنے مفاد کی فکر ہے اور اس مسئلہ کے حل کی اگر کوئی قابل قبول صورت نکل آئے تو پھر شاید یہ طبقہ مخالفت نہ کرے۔ انگلستان کا صنعتی طبقہ تو پورے طور پر اس کی موافقت میں ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ مشترکہ منڈی میں شرکت سے انگلستان کی برآمدی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہوگا اور انگلستان کی صنعتی پیداوار امریکہ اور روس کا بیرونی منڈیوں میں مقابلہ کرسکے گی اس لئے یہ طبقہ دولت مشترکہ کے دیرینہ تعلقات کو پس پشت ڈالنے کے لئے آمادہ ہے انگلستان کے کثیر الاشاعت اخبار لندن ٹائمز نے اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تجارتی مراعات، کوٹہ اور تجارتی انحراف (ڈائی ورژن) کی شکل میں برطانیہ کو اپنی شرکت کی بھاری قیمت دینی ہوگی۔ اب یہ تو انگلستان کے فیصلہ کرنے کا سوال ہے کہ اگر دو برائیاں ہی سامنے ہوں تو کم تر درجہ کی برائی کو چن لے۔

برطانیہ کی لیبر پارٹی کے لیڈر گیٹسکل نے اپنے روائتی انداز میں برسر اقتدار جماعت کے اقدام کی نہ صرف مخالفت کی ہے بلکہ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی جماعت کے لئے سیاسی فضا کو سازگار بنانے کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ ان کی تنقید کی بنیاد دولت مشترکہ کا متوقع انتشار ہے اور ان کا کہنا ہے کہ برسلز معاہدہ کے مقابلے میں دولت مشترکہ کی یکجہتی اور اس کی باہمی تجارت کے فروغ ہی میں انگلستان کی معاشی اور سیاسی فلاح ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں لیبر پارٹی میں خود اختلاف رائے ہے، ایک دوسرے بااثر لیڈر آرتھر باٹم کا خیال ہے کہ انگلستان کی مشترکہ منڈی میں شرکت ناگزیر ہے۔ اور اس سے دولت مشترکہ کمزور نہیں بلکہ اور طاقتور ہوگی۔ اس کے علاوہ اس کا امکان بھی ہے کہ یورپ کی اس معاشی برادری میں شریک ہو کر انگلستان

باقی چھ ممبر ملکوں کو بھی کم ترقی یافتہ ممالک کی معاشی ترقی کی جد و جہد پر مدد دینے کے لئے تیار کرسکے گا اس میں انگلستان عظیم تر یورپ کی قیادت کی رسہ کشی میں جس کے آثار ابھی سے دکھائی دے رہے ہیں اپنے آپ کو کسی طرح الگ نہیں رکھ سکتا۔

دولت مشترکہ کے ایشیائی اور افریقی ملکوں کے اندیشے

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں دولت مشترکہ کی اس کانفرنس میں تقریباً تمام ملکوں نے اپنے حالات کے پیش نظر مشترکہ منڈی میں انگلستان کی شرکت کی مخالفت کی ہے لیکن افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کے غم و غصہ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی کل تک ان کی نوآبادیاتی حیثیت سے انگلستان پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا، معاہدہ آٹوہ (OTTAWA) ۱۹۳۲ء کی روسے اُسے ساری تجارتی مراعات حاصل تھیں، ان ملکوں کی تجارت (خام پیداوار کی برآمد اور مشین سے بنی ہوئی چیزوں کی انگلستان سے درآمد) سے انگلستان نے خوب فائدہ اٹھایا لیکن اب جبکہ اس کے امکانات پیدا ہو رہے تھے کہ یہ ممالک صنعتی میدان میں آگے بڑھیں اور ان پُرانے معاہدوں سے فائدہ اٹھائیں انگلستان، یورپ کی برادری سے رشتہ جوڑ رہا ہے۔ خود ہمارے ملک کے لئے یہ مسئلہ انتہائی اہم ہے۔ ہمارے منصوبوں کی کامیابی اور ہماری معاشی ترقی بڑی حد تک برطانیہ اور یورپ سے مشینوں کی درآمد پر منحصر ہے۔ ہماری درآمدی تجارت کے سلسلہ کی ادائیگیاں برآمدی تجارت کی آمدنی سے ہوسکتی ہیں، لیکن جب اس طرح کی تجارت کا تناسب کم ہوجائے گا تو ہندوستان کے پاس بیرونی زرمبادلہ نہ رہے گا۔ مثال کے طور پر اس وقت انگلستان، ہندوستان کی اشیاء برآمد کی مقدار کے چوتھائی حصے کا خریدار ہے اور ہندوستان کی اشیاء درآمد کی مجموعی مقدار کا پانچواں حصہ انگلستان سے آتا ہے دولت مشترکہ کے ناطے دونوں ممالک تجارتی مراعات سے استفادہ کرتے ہیں لیکن یورپ کی مشترکہ منڈی میں انگلستان کی شرکت کے بعد ہندوستان سے جو کپڑا انگلستان میں برآمد کیا جائے گا اس پر فوراً ۲۰ فیصدی اس کے ۱۸ ماہ بعد ۲۰ فیصدی، ایک سال بعد ۳۰ فیصدی اور بالآخر مزید ۳۰ فیصدی اس طرح سو فیصدی ٹیکس لگایا جائے گا جس سے ہندوستان کے مال کی قیمتیں انگلستان

کے بازار میں دوگنی ہوجائیں گی۔ اس کے مقابلے میں جدید تجارتی مراعات کی بنا پر یورپ کے ممالک میں بنے والی چیزیں سستے دام انگلستان میں فروخت ہوں گی۔ اس طرح ہندوستان کے مال کے لئے انگلستان کا بازار ختم ہوجائے گا اور ہندوستان کے پنج سالہ منصوبوں کی کامیابی خطرہ میں پڑجائے گی اور تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی کامیابی کی صورت میں معیار زندگی کے کچھ بلند ہونے کی جو امید ہو چلی تھی وہ پوری نہ ہوسکے گی۔ مردم شماری کی حالیہ رپورٹ (۱۹۶۱ء) نے اس مسئلہ کو اور بھی گھمبیر بنا دیا ہے۔

ان تمام باتوں کے پیش نظر ہندوستان کی مخالفت بالکل بجا معلوم ہوتی ہے۔ دولت مشترکہ کے افریقی اور ایشیائی ممبر ملکوں کے مسائل کی نوعیت تقریباً یکساں ہے اور اسی لئے ان کی مخالفت کا انداز اور اس کی تلخی، ان کے اندیشے اور وسوسے ایک ہی طرح کے ہیں اور پھر معاہدہ کی ایک دیوار کھڑی کرکے یورپ کو باقی دنیا سے علیحٰدہ کرنے کا جو منصوبہ بنایا جارہا ہے اس کے پیش نظر مشترکہ منڈی کے ممالک سے تجارتی معاہدوں کے امکانات بھی بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔

اس صورت حال نے ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں کے لئے جو ابھی ابھی آزاد ہوئے ہیں اور اپنی معاشی ترقی کے منصوبے بنارہے ہیں، ایک چیلنج پیش کیا ہے۔ یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کا یہ گٹھ جوڑ ان کے سامراجی مزاج کے عین مطابق ہے، اس کا گلا اور شکوہ تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں، اس کے بجائے ان ملکوں کو کچھ ایسے ذرائع ڈھونڈنے ہوں گے جن کے سہارے یہ اپنی مشکلات کا حل نکال سکیں اور نئے حالات کا مقابلہ کرسکیں۔

سوال یہ ہے کہ تجارت اور سیاست میں ایشیائی اور افریقی ملکوں کا باہمی تعاون کیسے قائم ہو؟ اور ہندوستان اس نئی کمیونٹی میں اپنا خاص حصہ کس طرح ادا کرے؟ لیکن یہ بات کہ کمزور اور معاشی حیثیت سے پست ملکوں کا اتحاد وہاں کے عوام کے مسائل کو حل کرسکے گا، بحث طلب ہے۔

اگر انگلستان مشترکہ منڈی میں شریک ہوتا ہے اور وہاں اسے دولت مشترکہ کے ملکوں کے لئے مراعات حاصل کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہوتی تو ہوسکتا ہے کہ ہندوستان

کمیونسٹ ملکوں سے اپنے تجارتی تعلقات بڑھائے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کا افریقی ایشیائی ممالک سے ربط اور کمیونسٹ ممالک سے اس کی بڑھتی ہوئی تجارت ایک طرف تو دولت مشترکہ کو مفلوج کردے گی اور دوسری طرف نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا سے انگلستان کے اثرات رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے لیکن اگر انگلستان کسی طرح یورپ کی برادری میں دولت مشترکہ کے لئے مراعات حاصل کر سکا اور متحدہ یورپ پسماندہ ملکوں کو سہارا دینے کے لئے آمادہ ہو سکا جس کے امکانات سے متعلق ابھی کچھ کہنا مشکل ہے تو صورت حال بدل جائے گی اور متحدہ یورپ کی خودغرضی کے باوجود ایشیا اور افریقہ میں کمیونزم کی اشاعت کے امکانات بہت کم ہو جائیں گے۔ توقع ہے کہ یہ بات انگلستان یورپ کی برادری کے سامنے زور دے کر کہے گا اور اس طرح اس عام بے چینی کی ترجمانی کرے گا جس کا مظاہرہ ایشیائی اور افریقی ملکوں نے دولت مشترکہ کانفرنس میں واضح الفاظ میں کیا ہے۔

یورپی مشترکہ منڈی کے ذریعہ کم ترقی یافتہ ممالک کو مجبور کیا جائے گا

کہ وہ خام مال اسے فراہم کریں اور وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ ہندوستان کو یورپی مشترکہ منڈی میں برطانیہ کی شرکت سے اس لئے پریشانی ہے کہ اس کا فوری طور پر ہندوستان کے سوتی کپڑے اور دوسرے سامان کی برآمدی تجارت پر خراب اثر پڑے گا جہاں تک ہندوستان کی طویل مدت کے مسائل کا تعلق ہے، وہ ان سے نپٹ لے گا اور براہ راست تجارتی معاہدے کر کے معاملات کو درست کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی بقیہ مدت میں اگر اس کی برآمدی تجارت پر خراب اثر پڑا، تو اس کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

(وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو)

تعلیمی مسائل

"نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن"

۳۰ اگست کو صدر جمہوریہ نے تعلیم کے ایک قومی ادارے "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن"
(ادارے) کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ شاندار عمارت ستر ایکڑ زمین پر دہلی کے علاقے میں مہرولی کے قریب
(ایک) کروڑ ... لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوگی۔ دراصل یہ تعلیمی کارکنوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہوگی
(جس میں) کچھ سو مقیم طلبہ کی رہائش اور تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اس موقع پر صدر جمہوریہ نے فرمایا
(ہمیں) وہ سب کچھ میسر ہے جو بامِ عروج پر لے جائے بجز اعلیٰ معیار کی تعلیم کے۔ ہماری آبادی
(بڑی) ہے اور ہمارے قدرتی وسائل وافر ہیں لیکن مناسب موزوں تعلیم کے انتظامات کی کمی ہماری
(راہ م)یں حائل ہے۔ ملک کی سماجی اور معاشی تعمیرِ نو میں تعلیم کو پہلا درجہ حاصل ہونا چاہیئے اور یہی
(و)قت ہے کہ ہم اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ اس معاملے میں کسی قدر بھی گھٹیا معیار پر قانع ہوجانے
(سے) ہمارا کام نہیں چل سکے گا۔ ہمیں تعلیم چاہیئے اور سب سے اچھی تعلیم۔ اس ادارے کا قیام ہماری ذہنی
(بیدا)ری کی علامت ہے۔" انھوں نے مشورہ دیا کہ بچوں کو ابتدائی منزل میں حرفے اور دستکاریاں
(سکھا)نی چاہئیں، ثانوی تعلیم میں تنوع ہونا چاہیئے اور اعلیٰ تعلیم کا معیار بہر طور اعلیٰ ہے۔ انھوں نے
(اس) بات پر زور دیا کہ سائنس کی تعلیم پر پوری توجہ کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے وابستگی بھی نہایت
(ضرور)ی ہے تاکہ انسان انسان رہ سکے۔ اور فرمایا: "اس صورتِ حال میں استاد کا منصب بہت
(بڑھ) جاتا ہے۔ ان کا نظریہ معتدل اور معقول ہو اور انھیں انسانیت پر اعتماد ہو۔"

ہمارے صدر جمہوریہ صرف ہمارے راشٹر پتی ہی نہیں ہیں بلکہ عالم گیر شہرت رکھنے والے
معلّم اور مفکّر بھی ہیں۔ ان کے یہ احساسات ایک عالمی دانشور کے ارشادات کی حیثیت
(رکھتے) ہیں اور ان کی توقعات، تعلیم کے اس قومی ادارے کے منصب کی نشاندہی کرتی ہیں۔

کمیونسٹ ملکوں سے اپنے تجارتی تعلقات بڑھالے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کا افریقی ایشیائی ممالک سے ربط اور کمیونسٹ ممالک سے اس کی بڑھتی ہوئی تجارت ایک طرف تو دولت مشترکہ کو مفلوج کردے گی اور دوسری طرف نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا سے انگلستان کے اثرات رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں گے لیکن اگر انگلستان کسی طرح یورپ کی برادری میں دولت مشترکہ کے لئے مراعات حاصل کر سکا اور متحدہ یورپ پسماندہ ملکوں کو سہارا دینے کے لئے آمادہ ہو سکا جس کے امکانات سے متعلق ابھی کچھ کہنا مشکل ہے تو صورت حال بدل جائے گی اور متحدہ یورپ کی خود غرضی کے باوجود ایشیا اور افریقہ میں کمیونزم کی اشاعت کے امکانات بہت کم ہو جائیں گے۔ توقع ہے کہ یہ بات انگلستان یورپ کی برادری کے سامنے زور دے کر کہے گا اور اس طرح اس عام بے چینی کی ترجمانی کرے گا جس کا مظاہرہ ایشیائی افریقی ملکوں نے دولت مشترکہ کانفرنس میں واضح الفاظ میں کیا ہے۔

یورپی مشترکہ منڈی کے ذریعہ کم ترقی یافتہ ممالک کو مجبور کیا جائے گا

کہ وہ خام مال اسے فراہم کریں اور وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ ہندوستان کو یورپی مشترکہ منڈی میں برطانیہ کی شرکت سے اس لئے پریشانی ہے کہ اس کا فوری طور پر ہندوستان کے سوتی کپڑے اور دوسرے سامان کی برآمدی تجارت پر خراب اثر پڑے گا جہاں تک ہندوستان کی طویل مدت کے مسائل کا تعلق ہے، وہ ان سے نپٹ لے گا اور براہ راست تجارتی معاہدے کر کے معاملات کو درست کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن تیسرے پنج سالہ منصوبہ کی بقیہ مدت میں اگر اس کی برآمدی تجارت پر خراب اثر پڑا، تو اس کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

(وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو)

"نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن"

۳۰ اگست کو صدر جمہوریہ نے تعلیم کے ایک قومی ادارے "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن" کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ شان دار عمارت ستر ایکڑ زمین پر دہلی کے علاقے میں مہرولی کے قریب ایک کروڑ دس لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوگی۔ دراصل یہ تعلیمی کارکنوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہوگی جہاں پر چھ سو مقیم طلبہ کی رہائش اور تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ اس موقع پر صدر جمہوریہ نے فرمایا کہ "ہمیں وہ سب کچھ میسر ہے جو بامِ عروج پر لے جائے بجز اعلیٰ معیار کی تعلیم کے۔ ہماری آبادی بہت ہے اور ہمارے قدرتی وسائل وافر، لیکن مناسب و موزوں تعلیم کے انتظامات کی کمی ہماری ترقی میں حائل ہے۔ ملک کی سماجی اور معاشی تعمیرِ نو میں تعلیم کو پہلا درجہ حاصل ہونا چاہیے اور یہی وہ وقت ہے کہ ہم اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ اس معاملے میں کسی قدر بھی گھٹیا معیار پر قانع ہو جانے سے ہمارا کام نہیں چل سکے گا۔ ہمیں تعلیم چاہیے اور سب سے اچھی تعلیم۔ اس ادارے کا قیام ہماری ذہنی بیداری کی علامت ہے۔" انھوں نے مشورہ دیا کہ بچوں کو ابتدائی منزل میں حرفے اور دستکاریاں سکھائی جائیں، ثانوی تعلیم میں تنوع ہونا چاہیے اور اعلیٰ تعلیم کا معیار بہر طور اعلیٰ ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ سائنس کی تعلیم پر پوری توجہ کے ساتھ ساتھ علم و ادب سے وابستگی بھی نہایت ضروری ہے تاکہ انسان، انسان رہ سکے۔ اور فرمایا: "اس صورتِ حال میں استاد کا منصب بہت اہم ہو جاتا ہے۔ ان کا نظریہ معتدل اور معقول ہو اور انھیں انسانیت پر اعتماد ہو۔"

ہمارے صدر جمہوریہ صرف ہمارے راشٹرپتی ہی نہیں ہیں بلکہ عالم گیر شہرت رکھنے والے ایک معلّم اور مفکّر بھی ہیں۔ ان کے یہ احساسات ایک عالمی دانشور کے ارشادات کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی توقعات، تعلیم کے اس قومی ادارے کے منصب کی نشان دہی کرتی ہیں۔

یہ ادارہ "نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ" کی طرف سے قائم کیا گیا ہے۔ یہ کونسل یکم ستمبر ۱۹۶۱ء کو ایک خود مختار ادارے کی حیثیت سے عالم وجود میں آئی تاکہ روز افزوں قومی ضرورتوں کے پیش نظر سارے دیس کے تعلیمی مسائل کو بنیادی طور پر سوچا اور سمجھا جاسکے، اور دیگر تعلیمی اداروں کے تعاون کے ساتھ تعلیمی تحقیق اور اساتذہ کی تربیت کا ایک جامع و مرتب پروگرام چلایا جاسکے۔ اس کونسل کے خاص خاص مقاصد میں تعلیم کے تمام شعبوں میں تحقیقی کام کی تنظیم و ترقی، ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کی تربیت کرنے والے عملے کی تیاری اور مدارس میں تعلیم کے نئے طریقوں کی ترویج و اشاعت شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اسی کونسل کے تحت ملک کے مختلف علاقوں میں ایسے چار ادارے قائم کرنے کی تجویز ہے جو اپنے اپنے علاقے کے تمام تربیتی اداروں کی رہنمائی اور قیادت کے فرائض انجام دے سکیں۔ اگرچہ کونسل کے مقاصد میں اصولی مسائل کی تحقیق کی طرف کافی دھیان دیا گیا ہے لیکن اصل توجہ اُن مسائل کی عقدہ کشائی کی طرف دی گئی ہے جو تعلیمی نظام کو درپیش آتے ہیں۔ خاص طور پر اساتذہ کے تربیتی پروگرام میں جدید طریقوں کی دریافت اور اُن کی رہنمائی کے فرائض انجام دینے کی طرف توجہ کی گئی ہے تاکہ اساتذہ کی تربیت ملک کی تعلیمی ضرورتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق موثر طور پر ہوسکے۔ یہ کونسل تعلیم کے میدان میں کام کرنے والوں کے مابین اشتراکِ عمل کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن" میں اعلیٰ پیمانے پر مختلف ریاستوں سے آئے ہوئے اساتذہ کی تربیت اور تعلیمی تحقیق کا انتظام کرے گی۔ اس طرح تعلیم کے ایک قومی نظام کی داغ بیل پڑسکے گی جس کی آج بڑی ضرورت ہے اور تعلیمی کام کرنے والوں کا ایک مستقل عملہ وجود میں آئیگا۔

اس کونسل کے صدر، مرکزی وزارت تعلیم کے وزیر ہیں اور اس میں تمام ریاستوں کے وزرا تعلیم اور ملک کے بعض مشہور ماہرین تعلیم شامل ہیں، کونسل کی ایک مجلس منتظمہ اور ایک مجلس تعلیمی بھی مقرر کی گئی ہے۔ کونسل اپنے تمام مقاصد نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے ذریعے حاصل کرے گی۔ یہ ادارہ بھی کونسل کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا جبکہ مرکزی وزارت تعلیم نے سات مرکزی تعلیمی

اداروں کو اس میں مدغم کر دیا۔ یہ مختلف ادارے گذشتہ پندرہ سال کے اندر قائم ہوئے تھے اور اپنے اپنے مخصوص دائرۂ عمل میں تعلیمی کام کر رہے تھے لیکن بیشتر تعلیمی مسائل ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے، ایک مرکزی ادارے کی شکل دینے کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ تعلیم کا یہ قومی ادارہ اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ اس نئی تشکیل میں یہ سابقہ سات ادارے، اس بڑے قومی ادارے کے مختلف شعبوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، کا کام، نیشنل انسٹی ٹیوٹ، کے ایک شعبے کی حیثیت سے اساتذہ کی تربیت تک محدود ہو جائے گا۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا تھا جہاں بی۔ ایڈ، ایم ایڈ اور پی ایچ ڈی، کی تعلیم ہوتی رہی ہے۔ وہاں پر ۱۹۵۳ء میں تعلیمی نفسیات میں تحقیق کا مخصوص انتظام بھی کیا گیا تھا۔ یہ حصہ اب نیشنل انسٹی ٹیوٹ "میں تعلیم کی نفسیاتی اساس" کا شعبہ کہلائے گا۔ سنٹرل بیرو آف ٹیکسٹ بک ریسرچ اور سینٹرل بیرو آف ایجوکیشنل اینڈ ووکیشنل گائیڈنس، ۱۹۵۴ء میں بنے تھے۔ درسی کتابوں کا محکمہ، انتخاب کتب، ان کی تیاری، اور مختلف نصابی مسائل سے متعلق کام کرتا رہا ہے۔ اب یہ محکمہ نصاب، درسی کتب اور تدریس کے طریقوں کے شعبے کی حیثیت سے فروغ پائے گا۔ دوسرا محکمہ رہنمائی کرنے والے کارکنوں کے لیے تربیتی نصاب، کانفرنس وغیرہ کا انتظام کرتا تھا۔ اب یہ کام بھی تعلیم کی نفسیاتی اساس کے شعبے کے تحت ہوا کرے گا۔ ڈائرکٹریٹ آف ایکسٹینشن پروگرامس فار سیکنڈری ایجوکیشن، کی ابتدا ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی جسے ثانوی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کے علم کو تازہ رکھنے اور انھیں تعلیم کی رفتار ترقی سے باخبر رکھنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ محکمہ بھی نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے ایک شعبے کی حیثیت سے یہی خدمت انجام دیا کرے گا۔ توسیعی پروگرام کے محکمے کے قیام کے ایک سال بعد نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف بیسک ایجوکیشن، اور نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سینٹر، وجود میں آئے۔ بنیادی تعلیم کا قومی ادارہ، بنیادی تعلیم کے میدان میں تحقیق کرنے، اور اس کے نقطۂ نظر کو فروغ دینے کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ اب اسے بنیادی اور ابتدائی تعلیم کے شعبے کی حیثیت حاصل ہوگی، سماجی تعلیم کا مرکز، سماجی تعلیم کے کارکنوں کی تربیت کرنے اور اس سلسلے میں تحقیقی کام کرنے کی غرض

سے قائم ہوا تھا۔ اب اسے ایک شعبے کی حیثیت حاصل ہوگی۔ سب سے آخر میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آڈیو وژول ایجوکیشن ۱۹۵۹ء میں بنا تاکہ صوتی بصری تعلیم کو ترقی دی جاسکے۔ اب یہ انسٹی ٹیوٹ بھی نیشنل انسٹی ٹیوٹ کے ایک شعبے کی حیثیت سے اپنے مقاصد حاصل کرے گا۔ ان شعبوں کے علاوہ تعلیم کی سماجی وفلسفیانہ اساس، اور دیگر ممالک کی تعلیم، انتظام تعلیم، اور سائنس کی تعلیم کے شعبوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ عظیم الشان مرکزی ادارہ، تعلیمی تحقیق اور اساتذہ کی تربیت کے کام کو قومی پیمانے پر سر انجام دے گا۔

کسی ملک کی ترقی اس کے تعلیمی وقار سے وابستہ ہوا کرتی ہے اور تعلیمی وقار اپنے اساتذہ کے معیار سے قائم ہوتا ہے۔ یہ تعلیم کا قومی ادارہ اسی غرض سے قائم ہوا ہے کہ دیس کے بچوں کو تعلیم دینے والوں کی ذہنی سطح بلند کی جاسکے، ان میں بالغ نظری پیدا ہو اور وہ فکری ہم آہنگی کے ساتھ کام کرسکیں۔ یہ ادارہ اس وقت جن مرکزی اداروں کو ملا کر بنایا گیا ہے، اُن سے جو امیدیں قائم کی گئی تھیں وہ کبھی پوری نہ ہوسکیں۔ انھوں نے تعلیمی تحقیق کے میدان میں بہت کم معیاری کام کیا کیونکہ ان کے لئے جن وسائل کی ضرورت تھی وہ غالباً ان کو میسر نہ آسکے اور کسی طور وہ اپنے منصب کا حق ادا نہ کرسکے۔ اب نہ صرف آٹھ بتیوں سے مل کر ایک چراغ روشن ہوا ہے بلکہ اس میں تجربے کا روغن بھی شامل ہے اس چراغ سے ذہنوں کے چراغ روشن کرنا ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہی۔ لیکن بے نور چراغ سے نہیں بلکہ روشن چراغ سے۔ استاد کا بیدار ذہن ہی بچوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرسکے گا۔ ہمیں بہت سے اساتذہ اور دیگر تعلیمی کارکنوں کی ضرورت ہے۔ اُن سب میں علم کا ذوق وشوق، عمل کی تگ ودو، انسانیت کی قدر ومنزلت، سب ہی کچھ درکار ہے ہمارے دیس میں ایسے جواہر لاتعداد ہیں۔ وہ سب مناسب تراش خراش سے آبدار بن سکتے ہیں اور اپنی آب وتاب سے نور پھیلا سکتے ہیں۔ اچھے اساتذہ، اچھے شہری پیدا کریں گے، اچھے انسان بنائیں گے۔ اس نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن، سے یہی توقعات وابستہ ہیں حسنِ اتفاق سے آج ہمارے صدر اور نائب صدر دونوں اس پیشہ معلمی کی آبرو اور آرزو ہیں وہی ہمارے معمار ہیں اور انھیں سے ہمیں نیا معیار قائم کرنا چاہیئے۔ "معلّم"

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

صُبح (سہ ماہی)   ایڈیٹر: محمد عتیق صدیقی

انجمن ترقی اُردو کی دہلی شاخ کی سرپرستی میں پچھلے سال کے اواخر میں یہ رسالہ جاری کیا گیا ہے۔ اُردو کے معروف محقق صدیقی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں اور حضرت تلوک چند محرومؔ، حضرت روش صدیقی، محترمہ صالحہ عابد حسین اور محترمہ حمیدہ سلطان جیسے مشہور شاعر اور ادیب اس کی مجلس ادارت میں شامل ہیں۔

اب تک اس کے دو شمارے نکل چکے ہیں اور دونوں معیاری اور بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ اور مدیر کے تحقیقی ذوق کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن بعض مضامین معیاری ہوتے ہوئے بھی ایک سہ ماہی رسالہ کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ کتابت اور طباعت ایک اچھے پرچے کے شایانِ شان نہیں۔ ان دو شماروں میں سے کسی پر بھی تاریخ طباعت درج نہیں ہے۔ عتیق صاحب تحقیق کا کام کرتے ہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تاریخ طباعت کی کیا اہمیت ہے، اس لئے تجارتی تقاضے چاہے کچھ بھی ہوں تاریخ طباعت کا نہ ہونا ایک اہم نقص ہے۔

سالانہ چندہ: پانچ روپے اور فی پرچہ ڈیڑھ روپے۔

پتہ: انجمن ترقی اردو شاخ دہلی علی منزل۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی ۶

اطلاع "جامعہ" ہر ماہ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو پوسٹ کیا جاتا ہے اگر کسی پرچے کے نہ ملنے کی شکایت موصول ہوگی تو اگلے ماہ انھیں تاریخوں میں سے کسی کو روانہ کیا جا سکے گا۔

طابع و ناشر : عبداللطیف اعظمی
مطبوعہ : یونین پرنٹنگ پریس دہلی















طابع و ناشر: عبد اللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پرنٹنگ پریس دہلی



PROVED REMEDIES for QUICK RELIEF

for COUGHS & COLDS
CHESTON
SYRUP

for ASTHMA
ALERGIN
TABLETS

TONIC FOR
UDENTS
WORKERS
HOTON

for FEVER & FLU
QINARSOL

PRODUCTS OF
THE WELLKNOWN LABORATORIES



AT ALL CHEMISTS

جامعہ

جامعہ ملّیہ اسلامیہ، دہلی

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

تعلیم اور روایتی قدریں

ڈاکٹر ذاکر حسین

(انڈین نیشنل کمیشن کا جو مرکزی وزارت تعلیم نے یونسکو کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے بنایا ہے سہ روزہ اجلاس پچھلے ماہ ۲۶ ستمبر کو نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس ادارہ کے متعلق ایک تعارفی مضمون "تعلیمی مسائل" کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ اجلاس کے آخری دن تعلیم اور روایتی اقدار" کے عنوان سے ایک سمپوزیم ہوا تھا جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ نے فرمایا تھا۔ اس افتتاحی خطبہ کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب نے شروع میں "افتتاحی رسم" کے روز افزوں رواج پر اپنے مخصوص انداز میں لطیف طنز فرمایا تھا، مگر ہم صرف وہی حصہ شائع کر رہے ہیں، جو اصل موضوع سے متعلق ہے۔ اس سلسلے کی بعض دوسری تقریروں کے ترجمے بھی آئندہ اشاعتوں میں شائع کئے جائیں گے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے املا کرایا ہے۔)

آپ حضرات اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ تعلیم میں روایتی اقدار کی کیا اہمیت ہے بہتر ہے کہ پہلے ہم ان الفاظ کے معنی کو وضاحت کے ساتھ سمجھ لیں، جو اس سوال میں استعمال کئے گئے ہیں۔ میرے خیال میں آپ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ نوع انسانی کا ہر فرد تین طرح کے وظائف انجام دیتا ہے جسمانی یا نباتی، دماغی یا حیوانی اور ذہنی یا روحانی، جنھیں ہم مخصوص انسانی وظائف کہہ سکتے ہیں۔ جسمانی اور دماغی وظائف کا اظہار پہلے ہوتا ہے۔ ان کے انجام دینے میں بچے کو پہلے پہل آسودگی یا ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بعض چیزوں، بعض کاموں کو پسند اور بعض کو ناپسند کرنے لگتا ہے، گویا وہ ان کی قدر کا تعین کرتا ہے۔ یہ منفی یا مثبت قدر

کا احساس ذہنی نشو و نما کی بنیاد ہے۔ جب بچے کے حافظے میں احساسِ قدر کے تجربوں کا ذخیرہ جمع ہونے لگتا ہے، تو اس کی ذہنی زندگی ترقی کی ایک اہم منزل طے کرتی ہے، یعنی وسائل و مقاصد کا شعور بیدار ہو جاتا ہے، مگر یہ اقدار، جن کا شعور نشو و نما کی ان ابتدائی منزلوں میں ہوتا ہے، سراسر حسی یا مادی ہوتی ہیں۔ بچپن کی میزان قدر میں صرف خوشگواری یا ناگواری آرام یا تکلیف، جسمانی آزادی یا جسمانی بندش، حسی لذت یا حسی کوفت کا احساس تولا جاتا ہے۔ ابھی تک اس میزان کی سطح انسان کے یہاں کم بیش وہی ہوتی ہے، جو ادنےٰ درجے کے جانوروں کے یہاں۔ افسوس ہے کہ بعض انسان اسی سطح پر ٹھہر کر رہ جاتے ہیں۔

مگر طبعاً فردِ انسانی کے اندر ایک تیسری قسم کے وظائف یعنی ذہنی اور اخلاقی عمل بھی ظہور میں آتے ہیں۔ ان وظائف کے انجام پانے سے بھی کچھ قدروں کا احساس ہوتا ہے، لیکن یہ قدریں کچھ اور ہی طرح کی ہیں۔ دونوں کی نوعیت میں جو فرق ہے، اس کو ظاہر کرنے کے لئے ایک طرف حق، حُسن، خیر، قُدس اور عدل کا اور دوسری طرف جسمانی صحت، حسی لذت، مادی منافع یا جنسی محبت کا نام لے دینا کافی ہے۔ تعلیم فردِ انسانی کی مکمل نشو و نما کا ذریعہ ہے۔ اُسے اِنھیں مخصوص انسانی اقدار سے سروکار ہے، جو اقدارِ عالیہ مطلقہ کہلاتی ہیں۔ تعلیم کا سب سے بڑا اور سب سے مقدم موضوع فرد اور اس کی مخصوص انسانی قدر ہے۔ تعلیمی عمل یہی ہے کہ وہ شعور اقدار کو جو فرد کے اندر بالقوۃ موجود ہوتا ہے، تہذیبی اشیاء کے ذریعے سے قوت سے فعل میں لائے۔ یہ تہذیبی اشیاء خود کسی فرد یا جماعت کی ذہنی کوشش کی پیداوار ہوتی ہیں۔ چنانچہ تعلیم کو بجا طور پر معروضی تہذیب کا فرد کے اندر نئے سرے سے موضوعی زندگی پانا کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اسے معروضی ذہن کا موضوع بن جانا کہہ سکتے ہیں۔ سچی تعلیم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ان دونوں میں مناسبت اور مطابقت ہو۔ صحیح تعلیم یہ نہیں ہے کہ متعلم کو کسی مقررہ سانچے میں ڈھال دیا جائے، جو فلاں اسکیم یا فلاں منصوبے کی رو سے ضروری سمجھا گیا ہے۔ تعلیم نام ہے متعلم کے

انفرادی نفس میں مخصوص انسانی صلاحیتوں کے بیدار ہونے اور نشوونما پانے کا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ جو اپنے خیال میں بچے کے خالی ذہن میں تھوڑی سی یا بہت سی معلومات بھر دیتا ہے، درصل اسے تعلیم نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نظریے کا ٹھونس دینا تعلیم نہیں کہلاتا۔ تعلیم وہ عمل ہے، جس کے ذریعہ ذہن کو زیادہ سے زیادہ نشوونما کا جو اس کے لئے ممکن ہے، موقع ملے اور وہ صرف انھیں تہذیبی اشیاء کے سابقے سے ہو سکتی ہے، جو اُسی قسم کے ذہنوں کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں اور جن کے اندر کچھ معروضی اقدار موجود ہیں۔ یہ اقدار تہذیبی اشیاء میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ جب کوئی ذہن جو ان سے مناسبت یا مشابہت رکھتا ہے، انھیں حاصل کرتا ہے یا اسے ان کا ادراک یا معرفت یا تجربہ ہوتا ہے، تو خود اس ذہن کے اندر یہ اقدار جاگ اٹھتی ہیں اور اس کی اخلاقی نشوونما کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ان اقدار کے تجربے کے ساتھ ہی ان کی صحت و معقولیت، ان کے دوام اور ان کی قدر مطلق کا خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ انسان انھیں بے چوں وچرا تسلیم کر لیتا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اس کے نظام زندگی کو اس کے احساسِ قدر اور معیارِ قدر کو اس کی پسند اور ناپسندیدگی اور اس کے عمل کے محرکات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ سچی تعلیم یہی ہے کہ انفرادی ذہن کو ان مخصوص انسانی معروضی اور روحانی اقدار کا تجربہ کرایا جائے، تاکہ وہ اسے خود بخود اس بات پر مجبور کر دیں کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے عمل میں اسے حاصل کرے۔ یہ گویا ایک ایسی شمع جلانا ہے جو اندھیرے میں انسان کو راہ دکھائے اور وہ مضبوطی سے قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ سکے۔ یہ شمع درصل انسان کے مرکزِ وجود میں یعنی اس کے قلب میں روشنی ہوتی ہے۔ تعلیم کو یہ شرف بخشا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کے سینے میں شمع کی جوت جگائے۔ اس کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے یعنی تہذیبی اشیاء، ادب، آرٹ، سائنس، صنعت، مذہب، اخلاقی اور قانونی ضابطے

اور خاص طور پر وہ پاکیزہ شخصیتیں جن میں ذہنی اور اخلاقی قوت نے مکمل شکل اختیار کر لی ہے۔

مگر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس قوت سے کام لینے کے لئے اس کا ذکر کر دینا، اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچا دینا کافی نہیں ہے، بلکہ زندگی میں اس کا تجربہ کرنے، اسے برتنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کا خاص کام یہی ہے کہ اس تجربے کا موقع بہم پہنچائے تعلیم کو متعلم کے موضوعی ذہن اور اس معروضی ذہن کے درمیان جو تہذیبی اشیا سے معمور ہے، یا دوسرے الفاظ میں فردِ انسانی اور انسانی تہذیب کے درمیان واسطہ بننا ہے۔

عملِ تعلیم کا مرکزی مسئلہ یہی ہے کہ یہ توسط کس طرح اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہاں اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کرنے کا موقع نہیں، مگر میرے خیال میں بلا شبہ ایک بات کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس قسم کے موثر اور کامیاب توسط یعنی اچھی تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ اس خیال کو ذہن سے بالکل نکال دیا جائے کہ محض معلومات، تجربے اور دریافت کا بدل ہو سکتی ہے۔ اگر نئی نسل کو اس چیز سے جسے ہم تہذیب کی روایتی اقدار کہتے ہیں، آشنا کرنے میں یہ رجحان غالب آگیا کہ ہم معلومات پر اکتفا کریں اور تجربے اور دریافت کو نظر انداز کر دیں تو یہ اندیشہ ہے کہ تعلیم میں ناقابل برداشت سطحیت اور ریاکاری پیدا ہو جائے گی۔

روایتی اقدار کے ذریعہ سے تعلیم دینے میں جس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا ہے وہ یہ ہے کہ ایک تو اقدار کے انتخاب میں خاص اہتمام کیا جائے اور دوسرے ایسی موثر تدبیروں سے کام لیا جائے کہ متعلم ان اقدار سے پوری طرح فیض اٹھا سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے مواقع فراہم کئے جائیں جن میں ان اقدار کا تجربہ کر سکے۔ جو اس کی اپنی ذہنی اور روحانی وضع نفسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ ہمیں اپنے بے شمار تہذیبی کارناموں میں سے جنھوں نے

معروضی شکل اختیار کرلی ہے، بڑی احتیاط سے مناسب انتخاب کرنا ہے۔ تاریخ وہ خزانہ ہے جس سے ہم اس تعلیمی مواد کا انتخاب کرسکتے ہیں، اس لئے کہ ہر قوم کی جڑیں اس کی تاریخ میں پیوست ہوتی ہیں اور وہ ماضی کی گہرائیوں میں پھیلتی جاتی ہیں تاکہ اسے مستقبل میں زیادہ سے زیادہ بلندی اور وقت کے سیلِ پیہم میں قرار و دوام حاصل ہو سکے۔ ٹیگور نے ایک جگہ کہا ہے :۔

میں نے تیری بے آواز آہٹ کو اپنی رگوں میں دوڑنے والے لہو میں محسوس کیا
اے ابد قرار ماضی !
میں نے تیری خاموش صورت کی جھلک دیکھی ہے
وقت کے پرشور قلب میں
تو اس لئے آیا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی ناتمام کہانی کو لکھے
خطِ مخفی میں ہماری زندگی کے اوراق پر
تو بھولے بسرے زمانے کو نئے سرے سے یاد دلاتا ہے
تاکہ اس کی روشنی میں نئے پیکر تراشے جائیں

یہ تو صحیح ہے مگر ماضی کی دولت بے شمار ہے۔ تعلیم کو اس میں سے انتخاب کرنا ہے اور یہی اس کی بڑی کٹھن ذمہ داری ہے۔ انتخاب کے معنی ہیں چھانٹنا اور چھانٹنے کے لئے کوئی اصول ہونا چاہیئے۔ بعض لوگ قدیم کو انتخاب کریں گے، بعض جدید کو۔ بعض ہماری مرکب تہذیب اور مرکب قومیت کے ایک عنصر کو، بعض دوسرے عنصر کو۔ ہماری میراث دراوڑوں، آریوں، عربوں، ترکوں، مغلوں اور یورپیوں کا عطیہ ہے۔ اس کی تخلیق میں ہندوؤں، بودھوں، مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں اور پارسیوں نے حصّہ لیا ہے۔ ماضی کے وافر خزانے میں کسی چیز کا اچھا یا بُرا ہونا اس پر موقوف نہیں کہ وہ قدیم ہے یا جدید ہے۔ وہ ہندوؤں کی ہے یا بودھوں کی، مسلمانوں کی ہے یا سکھوں کی

عیسائیوں کی ہے یا پارسیوں کی، بنائے تمیز دراصل یہ ہے کہ ان میں سے کونسی اصلی ہے اور کونسی نقلی، کونسی عارضی اور کونسی دائمی، کونسی وقتی قیمت رکھتی ہے اور کونسی ابدی قدر کی حامل ہے۔ سماج کے سوچے سمجھے عمل یعنی تعلیم کا کام یہ ہے کہ وہ اس میراث کے وسیع سمندر کو کھنگال کر ان چیزوں کو نکالے جو ہماری نئی نسلوں کی اخلاقی اور روحانی غذا بن سکتی ہیں اور اسے ان کے سامنے دستر خوان پر چن دے تعلیم کو تمیز کرنا چاہیئے ان روایات میں جو زندگی کی جڑوں کو کمزور کرتی ہیں اور ان میں جو ان کو قوت پہنچاتی ہیں۔ صرف وہ روایات جو جاں بخش اور جانفزا ہیں ابدی اقدار کی حامل ہوتی ہیں اور تعلیم کا کام کرتی ہیں، جو نشو ونما اور ترقی میں رکاوٹ ڈالتی ہیں، وہ تعلیمی اعتبار سے محض بے کار ہی نہیں بلکہ مضر ہیں۔ فرد اور سماج دونوں کی زندگی کو منزل کی راہ دکھانے والی صرف معروضی ابدی اقدار ہی ہیں ان کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ اقدار خود ہی اپنے از سر نو حاصل کئے جانے کا تقاضا کرتی ہیں اور برابر ترقی کی تحریک کرتی رہتی ہیں۔ میں نے "از سر نو حاصل کئے جانے" کا فقرہ جان بوجھ کر رکھا ہے۔ اس لئے کہ ان اقدار کا آخری اور قطعی طور پر حاصل کرنا کسی زمانے میں بھی ممکن نہیں ہے۔ قدر بجائے خود ابدی ہے، مگر ہر نسل کو بلکہ ہر فرد کو اسے اپنے طور پر تلاش کرنا اور حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ہماری روایتی میراث جن ابدی اقدار کی حامل ہے ان کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ماضی کے ٹھٹھرے ہوئے جامد جسم کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھیں، وہ تو زندگی اور حرکت بخشنے والی ہیں اور ہر نئی نسل کے دل میں یہ لگن پیدا کرتی ہیں کہ وہ انھیں نئے سرے سے حاصل کرے، تاکہ ایک نئی اور بہتر تہذیب کی تعمیر ہو سکے۔

ہمیں نئی نسل کو یہ بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں یہ معروضی قدریں کس طرح حاصل کی گئیں۔ ہمیں ایسے مواقع فراہم کرنا چاہیئے کہ فرد کے شعور میں ایک یا ایک سے زیادہ قدروں کا تجربہ کرنے کی جو صلاحیت قدرتی طور پر موجود ہے، وہ قوت سے فعل

مہیا آئے اور اسے ہر ممکن ذریعہ سے مدد دے کہ وہ اس قدر کو جس کا اسے تجربہ ہے، خود اپنی یا اپنے گرد و پیش کی زندگی میں حاصل کر سکے، چاہے وہ حق ہو یا حُسن یا خیر یا قدس یا عدل۔ تبھی اس میں مخصوص انسانی صفات نشو و نما پا سکتی ہیں، تبھی اس کی سچی تعلیم ہو سکتی ہے، اس لئے کہ جیسا پہلے کہا جا چکا ہے، سچی تعلیم یہی ہے کہ فرد کے شعور میں اقدار عالیہ کا احساس ان تہذیبی اشیاء کے اثر سے پیدا ہو، جو اقدار کی حامل ہیں۔

ہماری روایات ایسی تہذیبی اشیاء سے مالا مال ہیں۔ ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں ان کے تعلیمی اثرات ہماری نئی نسل پر پڑیں۔ خاص طور پر ایک قدر ہے، جس کی طرف ہماری قومی زندگی کے موجودہ دور میں غیر معمولی توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ عدل کی قدر ہے، جس کا ریاست کو حامل ہونا چاہیئے۔ ہماری روایات ہمیشہ سے یہی رہی ہیں کہ ریاست دھرم یا اخلاقی قانون کی تابع ہو۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے ملک کے سارے بچوں اور نوجوانوں کو اس اثر پذیر عمر میں تعلیمی ادارے کے ذریعہ اس قدر کا تجربہ ہو سکے۔ ریاست محض قوت و اقتدار کی حامل ہونے کی حیثیت سے کوئی اخلاقی قدر نہیں رکھتی یہ ہمارے مزاج کا ایک جزو ہے۔ ہماری تاریخ کے بہترین صفحات کا ایک سبق ہے، ایک قیمتی میراث ہے، جو ہمیں اپنی تحریک آزادی کے عظیم رہنما سے ملی ہے کہ قوت کا استعمال محض جائز اخلاقی مقصد کے لئے ہونا چاہیئے۔ ہمیں اپنے آپ کو اس امن کے قیام کے لئے وقف کر دینا چاہیئے جو اخلاقی قدر سے حاصل ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے اور یقین ہے کہ ہم اپنی قومی زندگی کی منزل کے تصور کو ہمیشہ سامراجی ملک گیری کے رجحان سے پاک رکھیں گے۔ ہم سامراج کے قدموں تلے سے نکلے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ان کا بوجھ کمر توڑ دیتا ہے۔ ہم ایسی اندھی وطن پرستی کو جو جنگ جوئی سکھائے کبھی اپنے پاس نہ پھٹکنے دیں گے۔ ہماری سعی یہ ہوگی کہ افلاس، جہالت اور بیماری کو دور کر کے وہ قلیل ترین شرائط فراہم کر دیں جو ایک معمولی انسان کی طرح بسر کرنے کو درکار ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنے سماجی نظام

سے قبیح رسوم اور لاطائل اوہام کو خارج کردیں گے ۔ اور اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ کوئی انھیں ہماری میراث کے نام سے قائم رکھنے کی کوشش کرے ۔ ہم ہر قسم کی تنگ دلانہ اجتماعی خود غرضی کو، ہر قسم کی نفرت کو جو ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے، ایک ذات کو دوسری ذات کو ہے، جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے اور یہ برداشت نہیں کریں گے کہ کوئی انھیں قومی روایات کہہ کر ان کی حمایت کرے ۔ یہ سب کچھ ہم عدل و انصاف کی ان ابدی اقدار کی خاطر کریں گے جو ہماری قومی میراث کا جزو ہیں ۔ ہم اس خدمت کو اخلاقی فرض سمجھ کر دل سے قبول کریں گے اور خوشی سے انجام دیں گے ۔ ہم قوت اور عدل، صنعت اور اخلاق، عمل اور فکر و مراقبے کو ایک دوسرے کے ساتھ سمونے کی کوشش کریں گے ۔ اس مشکل کام کو انجام دینے کی صلاحیت ہمارے اندر کس طرح پیدا ہوگی؟ اس طرح کہ تعلیم ان ابدی اقدار کے ذریعہ جو خود ہماری تہذیبی اشیاء میں مجسم ہوگئی ہیں، ہمارے اندر ان قدروں کو بیدار کردے گی اور وہ صرف ہماری ہی تہذیبی اشیاء سے کام نہیں لے گی، بلکہ بقیہ نوع انسانی کی تہذیبی میراث سے بھی، خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے کی ہو، اس لئے کہ ہم اس کا دل سے احترام کرتے ہیں اور اس طرح اس کے وارث بن جاتے ہیں ۔

ہماری تعلیم حیات انسانی کے اور اہم وظائف کی طرح، اس کڑی کا کام دے گی جو ابدی زندگی اور زمانی زندگی، روحانی بیداری اور فنی کارکردگی، اخلاقی عقیدے اور مادی فلاح کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ابدیت، روحانیت اور اخلاق کے مفہوم کو الفاظ میں ضبط کرنا مشکل ہے ۔ مگر جو کچھ بھی ہو تعلیم کا فرضِ اولین ان میں اقدار کا شعور پیدا کرنا ہے ۔ اس فرض کو وہ تہذیبی اشیاء مناسب انتخاب سے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے مگر اس کا سب سے موثر ذریعہ یہ ہے کہ خود معلموں میں ان ابدی اقدار کے جیتے جاگتے مظہر موجود ہوں، ماضی اور حال کی حقیقی شخصیتوں میں اخلاقی عظمت کے نمونے دکھائے جائیں اور مشکل اور پیچیدہ حالات میں حق پسندانہ فیصلے کرنے کے قصے سنائے جائیں، ہندوستان

کی تاریخی روایات ایسی شخصیتوں کے نورِ اخلاق سے منوّر ہیں اور مجھے امید ہے کہ آنے والے زمانے میں خود ہمارے تعلیمی ادارے ایسے معلموں سے خالی نہ ہوں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ اب میں اس سیمینار کا افتتاح کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کی مشاورت ہماری تعلیم کی بہت سی اہم گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دے گی۔

میں آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ جے ہند

میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ

پروفیسر محمد مجیب

قدرت کا ہم پر یہ بڑا احسان ہے کہ ہم پر جو گذرتی ہے اسے ہم بھول سکتے ہیں، دکھ کا بھاری سے بھاری بوجھ وقت کے ساتھ ہلکا ہو جاتا ہے، سکھ کا مزہ ہر دفعہ نیا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں کچھ یاد نہیں رہتا۔ بعض لوگ ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھ لیتے ہیں تو اس کا ایک ایک لفظ یاد رہتا ہے۔ مولانا آزاد نے ایک بار کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے ۱۹۵۶ء میں فرمایا کہ میں نے اس کا ذکر فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر ۱۶ سنہ ء میں دیکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس صفحے کا رنگ کسی وجہ سے زرد پڑ گیا تھا۔ بعض لوگ جو اور چیزیں کھوتے رہتے ہیں اور خود بھی کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، اپنے مطلب کی یا شوق کی بات کبھی نہیں بھولتے۔ ہم سب کا سینکڑوں آدمیوں سے واسطہ رہتا ہے، آنکھوں کا کام دیکھنا ہے، وہ دیکھتی رہتی ہیں، کسی کی صورت ذہن پر نقش ہو جاتی ہے، کسی کو دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہوتا ہے۔ کسی کی ذرا سی ناگواری دل کو صدمہ پہنچاتی ہے، کسی کو چھیڑنے اور خفا کرنے میں لطف آتا ہے، کسی کا احسان دل پر بار ہوتا ہے، کسی سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے "کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو"۔ انسان کے حواس، اس کی آنکھ، اس کی عقل کو، یا تو اس عدالت تک رسائی نہیں ہے جہاں یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کون سا اثر قابلِ قبول ہے کون سا نہیں۔ یا خود عدالت اپنی رائے اس طرح بدلتی رہتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کے فیصلے کسی قاعدے قانون کے مطابق نہیں ہوتے، اس کی رہنمائی ایسی کیفیتیں کرتی ہیں جنھیں خود قرار نہیں۔

بہت سے لوگوں کو اس کا یقین ہے کہ ان کا نفس ایک خاص شریعت، یعنی اصولوں کے ہم آہنگ مجموعے کا پابند رہتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے قول اور عمل میں کسی قسم کا تضاد ثابت کرنا، ان

سے کہنا کہ وہ خوش ہوتے ہیں تو ایک طرح سے بات کرتے ہیں، خفا ہوتے ہیں تو دوسری طرح سے، ان پر ایک بھاری الزام ہے، ان کی عزت و آبرو، ان کی نیک نامی پر حملہ ہے اور وہ لڑنے کے لئے اس جوش اور خلوص سے تیار ہو جاتے ہیں کہ حق کی راہ میں جان دینے کی مثال سامنے آجاتی ہے ایسے لوگوں کو اس کا بھی پورا یقین ہوتا ہے کہ وہ غلط اور صحیح، حق اور باطل ظلم اور انصاف میں تمیز کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں اور ہر معاملہ میں ان کی رائے صحیح ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ اصول اور اخلاق کی پابندی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنی ساری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب معلوم ہوتی ہے، جس کے ہر صفحے پر صحیح فیصلے اور اچھے کردار کی مثالیں درج ہوتی ہیں اور وہ اکثر آسانی سے بتا سکتے ہیں کہ کسی اچھی بات یا اچھے آدمی نے ان کی ساری زندگی کو اس کا خاص رنگ دے دیا شاعروں نے اپنی مصلحت سے ایسے تمام لوگوں کو زاہد، واعظ، ناصح کہنے کی رسم جاری کردی، دراصل اس قبیلے میں وہ سب شامل ہیں جنھیں اپنے اندر ساری خوبیاں نظر آتی ہیں، یا جن کو دوسروں کے عیبوں کا ایسا شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سب کی نہیں اور اکثر کی نہیں تو بہرحال ان خاص خوبیوں کی مثال سمجھنے لگتے ہیں جن سے عام طور پر دوسرے محروم ہوتے ہیں۔ شاعر ہی زاہد واعظ، ناصح کے مقابلے پر رند کو لے آئے، یعنی ایسے شخص کو جو اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا سوائے اس کے کہ وہ رائے رکھنے اور فیصلہ کرنے کا اہل نہیں ہے۔ بظاہر اس دعویٰ میں بڑا انکسار ہے، مگر غور کیجئے تو اس میں زاہد کے دعویٰ سے کہیں زیادہ خودستائی ہے۔ زاہد بےچارہ عقل، علم، اصول، حکم کی بات کرتا ہے، اپنے گلے میں منطق، اخلاقیات اور دینیات کا پھندا ڈالتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ جس میں ہمت ہو وہ ہاتھ بڑھا کر رسّی کھینچ لے اور اس کا گلا گھونٹ دے۔ اس کے خلاف رند کو دیکھیے کہ وہ کسی طرح گرفت میں آتا ہی نہیں۔ عقل کے مقابلے پر عشق کو لے آتا ہے، علم کے مقابلے پر دل کو، اصول کے مقابلے پر وجدان کو، حکم کے مقابلے پر رحم و کرم کو۔ اس سے مشورہ لیجئے تو وہ کہتا ہے کہ غلطی کرنا مشورہ لے کر صحیح بات کرنے سے بہتر ہے۔ آپ اس سے پوچھئے کہ آپ اپنی زندگی کے کسی واقعے کو ناقابل فراموش سمجھتے ہیں تو جواب دے گا کہ میں خود

اپنی زندگی کا تنہا واقعہ ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اسے حتی الامکان نظر انداز کروں اور خدا کے لئے آپ بھی اسے بھول جائیے، یا کم از کم اس کا ذکر نہ کیجئے۔

رند اور بہت سی ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ ساقی کی، اس مست نظر کی جو شراب بن کر پیالے میں آجاتی ہے، اس بیہوشی کی جو معرفت کی پہچان ہے، وجد اور رقص کے اس عالم کی جو اپنے آپ کو رضائے الٰہی کے سپرد کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر سب رند ایک سے نہیں ہوتے، ہو بھی نہیں سکتے۔ جن رندوں کو اعلیٰ کیفیتیں شعر اور ادب کی چھلنی سے چھن کر پہنچتی ہیں اور صرف دلکش خیال کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ بھی چھوٹے منہ سے بڑی بات کہہ گذرتے ہیں، لیکن اس سے خود ان کے سوا اور کوئی دھوکا نہیں کھاتا۔ زیادہ تر رند ایسے ہوتے ہیں جو اپنی طبیعت سے واقف نہیں ہوتے، اپنے طریقے کو نہ سمجھتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں اور دیکھنے والے کو صرف ایک بے پروائی، ہر حال میں خوشی اور چین کی کوئی صورت نکال لینے کی صلاحیت، قاعدے اور اصول سے بے بہرہ رہنے کی خصوصیت نظر آتی ہے۔

مگر زاہد اور رند کا ذکر کرنا صرف بات کو طول دینے کی ترکیب ہے، اصل میں ہم خود غرض ہیں کوئی کچھ کم کوئی کچھ زیادہ، اور سب ایک دوسرے پر خود غرضی کا الزام رکھ کر اپنے عیب کو چھپاتے ہیں۔ جو خود غرض نہ ہو وہ بھی بے غرض نہیں ہوتا، وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنا معاملہ صاف رکھے۔ ذکری کرتا ہے تو اسے قومی خدمت نہیں کہتا، اپنا کام جی لگا کر کرتا ہے، کام ذرا زیادہ ہو جائے تو اس کا دکھڑا نہیں روتا، لیکن یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، ہر مہینے کے شروع میں پچھلے مہینے کی تنخواہ مل جائے اور اس کی عزت آبرو کا خیال رکھا جائے۔ دنیا کا سہارا یہی محنت سے کام کرنے، منطق اور شاعری سے دور رہنے والے لوگ ہیں۔ ان کی زندگی خاموش بہتے ہوئے دریا کی سی ہوتی ہے، جس کے کنارے آدمی کھڑا ہو کر محسوس کرتا ہے کہ حادثے اور انقلاب فطرت کے خلاف ہوتے ہیں، دریا میں بہاؤ پیدا کرنے کے لئے کسی طاقت کی ضرورت نہیں ہوتی، سب سے اعلیٰ مطلب وہ ہے جو خاموش رہنے پر بھی ادا ہو جائے۔

میری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ کوئی واقعہ نہیں ہے، یہی خاموش بہاؤ ہے۔ کوئی ۳۸ برس ہوئے جرمنی میں اپنے ایک دوست سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ میں بھی جامعہ ملیہ میں کام کروں گا۔ اب بھی اگر آپ پوچھیں کہ میں نے یہ بات کیوں کہی تو میں کوئی جواب نہ دے سکوں گا۔ میرے سامنے یہ مسئلہ تھا ہی نہیں کہ جامعہ میں کام کروں یا نہ کروں، کروں گا تو کیا ہوگا، نہ کروں تو کون سا نقصان ہو جائے گا۔ میرے اس فیصلہ کی بہت سے لوگوں نے تعریف کی، مجھے معلوم تھا کہ میں نے فیصلہ کرنا درکنار کچھ سوچا بھی نہیں ہے۔ میرے خاندانی بزرگوں اور عزیزوں نے سمجھانا چاہا کہ جامعہ میں جانا اور تھوڑی تنخواہ پر کام کرنا بڑی نادانی کی بات ہے، جب دوسری جگہ زیادہ تنخواہ ملنے کا امکان ہے۔ میں نے کوئی فیصلہ کیا ہوتا تو شاید اس کی خواہش ہوتی کہ اسے صحیح ثابت کروں، جب یہ الزام ہی غلط تھا کہ میں نے فیصلہ کیا ہے تو مجھے حق تھا کہ مسکین خاموشی کا انداز اختیار کرکے بحث کو ختم کردوں تعریف کرنے والے اب بھی نہیں ملتے، کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں، وہ بزرگ اور خیر خواہ جو مجھے نادان کہتے تھے، دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میرا جامعہ میں آنا اب کوئی واقعہ بھی نہیں کہا جا سکتا، اگر یہ غلطی تھی تو وقت کے گذرنے سے خود معاف ہوگئی ہے۔ اگر یہ اچھی بات تھی تو اس کا اب ذکر کیا کیجئے، ۳۶ برس پہلے کی بات ہے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

عکسِ رُخ

جناب عبداللہ ولی بخش قادری

غالباً آپ کو مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا یہ مشہور شعر یاد ہوگا:

ایک گھوڑا تھا نہایت عیب دار　　اپنے سائے سے بدکتا بار بار

لیکن کبھی آپ نے یہ غور فرمایا کہ اس عیب داری میں کسی ایک گھوڑے یا صرف گھوڑوں کی تخصیص نہیں اور نہ صرف حیوانات کا یہ خاصہ ہے بلکہ بہت سے اللہ کے بندے بھی اپنے سائے سے بھڑکنے لگتے ہیں۔ یہ وہی حضرات ہیں جو ہر دم کڑی کمان کا تیر بنے، دوسروں پر مسلط رہا کرتے ہیں اور اعتراض کا تیشہ ”تخریب“ اٹھائے ہوئے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ ذرا گنجائش نظر آئی اور یہ چراغ پا ہوئے۔ مجال کیا ہے کہ کسی میں ذرا سی خامی ہو اور ان کی نظر چوک جائے۔ دوسروں کے عیب تلاش کرتے ہیں اور بڑی جانفشانی کے ساتھ تلاش کرتے ہیں۔ انھیں محض دوسروں کی مزاج پرسی میں ہی اپنے ”دکھ کا علاج“ نظر آتا ہے۔ لیکن ایسا طرزِ عمل دراصل ردِ عمل ہے۔ یہ تو اپنے جہاں سے بے خبر ”سارے جہاں کا جائزہ“ لے رہے ہیں اور وہ بھی اس دل مایوس کے سہارے پر جس میں گرمی کی رمق تک باقی نہیں رہی ہے۔ انھیں اپنی آنکھ کا [illegible] نظر نہیں آتا ہے اور دوسرے کی ذرا سی پھانس فوراً ٹٹول لیتے ہیں۔ ان کی یہ روش [illegible] کسی کمی یا الجھن کا باعث ہوتا نہیں کیا۔ اگر کوئی جوابی حملہ کر بیٹھے تو یہ شرمسار نہ ہوں [illegible] اپنے کام سے کام۔ [illegible] آتی ہے اور ابھر کی [illegible] حقیقت [illegible] آئے وقت میں [illegible] کا تقاضہ بھی ہوتا ہے [illegible]

کہ میدانِ کارزار سے راہِ فرار اختیار کرلی جائے۔ تاہم شعور کی خامی، اس حالت پر بھی قانع ہونے نہیں دیتی۔ احساسِ انفعالِ ہزیمت اتنا شدید ہوتا ہے کہ "وضعِ احتیاط" کے مصداق خود فریبی کی چادر تان لی جاتی ہے۔ اپنی غیر آسودہ خواہشات اور ناکام تمنائیں اس درجہ اذیت کا باعث ہوتی ہیں کہ ان کا اظہار کہیں ہو اور کسی طور ہو، خواہ مخواہ اپنے لئے سوہانِ روح معلوم ہونے لگتا ہے۔ مگر ایک جذباتی اور حساس ذہن اپنے دل کا یہ چور ظاہر کرنے کے لئے کسی طور پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ اس پر تاویل کا لبادہ ڈال دیتا ہے۔ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی پردہ پوشی، دوسروں کے حقیقی اور فرضی عیوب کی پردہ دری میں نظر آتی ہے۔ اس کے اپنے نصیب کی سیاہی، اُسے کچھ اس طرح گھیر لیتی ہے کہ ہر شے اسے تاریک نظر آنے لگتی ہے۔ ایک کریہہ صورت، دوسروں میں بدنمائی دیکھتا ہے اور اس پر انگشت نمائی بھی کرتا ہے۔ کبھی کبھی ایک مصنف بھی اس کمزوری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی بعض تخلیق محض اس کی کدورت خاطر کی کارفرمائی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس طرح تسکینِ غم کا ایک پہلو ہاتھ آجاتا ہے اور اندرونی کسک میں کچھ کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ سمجھ کر کہ دوسرے تو ہم سے بھی گئے گزرے ہیں، کچھ اپنی عزت بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک شخص جس کی اپنی نیت صاف نہیں ہوتی اور اسے اپنی اس خامی کا احساس بھی ہوتا ہے، زمانے کو ناقابلِ اعتبار اور بد دیانت گردان کر اپنی سُرخ روئی کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔ وہ بظاہر زمانے کی اخلاقی کمزوریوں اور بے اعتدالیوں کا ڈھنڈورہ پیٹتا ہے لیکن فی الحقیقت بہ اندازِ دگر یہ اس کا اعترافِ گناہ ہوتا ہے۔ اس طرزِ عمل سے وہ پریشانی اور گرانی محسوس نہیں ہوتی جو صورتِ حال کو قبول کرنے سے پیدا ہو سکتی تھی، جنسی خلفشار میں یہ نوبت عموماً آجاتی ہے۔ ایک پاپی اپنے من کا روگ چھپانے کی غرض سے ہر ایک کو بد کردار و بداعمال قرار دے ڈالتا ہے۔ ایک زلیخا کی اپنی طبیعت کا احساس اور اخفائے راز کی خواہش سب ہی زنانِ مصر کی عفت و عصمت پر حرف گیری کرنے لگتی ہے۔

عیب جوئی اور نکتہ چینی کے حربے کا یہ زاویہ نمایاں طور پر ان خشک طبیعتوں کا وطیرہ بن جاتا ہے جو بخیالِ خویش اپنے آپ کو شہیدِ مظلومیت گردان لیتی ہیں۔ جب کوئی امید بر نہیں آتی اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ انسان خود اپنے وجود سے شرمانے لگے تو وہ اپنے وہم کو صورتِ مجسم بناکر بھرپور چوٹ کرتا ہے۔ دل کے پھپھولے پھوڑتا چاہتا ہے لیکن تہذیب و شائستگی مانع آتی ہیں۔ روایات کا خیال آتا ہے۔ وضعداری بنا ہنا ہوتی ہے۔ لہٰذا آزار، سربازار کی گنجائش بھی نہیں نکل پاتی اور قہرِ درویش بجانِ درویش ہی رہتا ہے۔ اب اس کشاکش سے خود کو کچھ اس طرح آزاد کراتا ہے کہ اپنا "عکسِ رُخ" دوسروں کی شبیہہ میں دیکھ کر بدکنے لگتا ہے۔ الزام تراشتا ہے، اور بدگمان ہوتا ہے۔ جس پر نگہ پڑتی ہے شک و شبہ کے ساتھ پڑتی ہے۔ نہ کوئی لائقِ اعتبار رہتا ہے، نہ قابلِ اعتماد اور بالآخر یہ وسوسہ، دل میں بیٹھ کر رہ جاتا ہے کہ سارا زمانہ اس کے خلاف سازش کئے ہوئے ہے اور وہ بچارا فلکِ کج رفتار کی سفاکی کا شکار ہے۔ اسے ہوا کی ہر جنبش کا کل دہر کو کچھ اور الجھاتی ہوئی نظر آتی ہے اور ہدف وہ اپنی ذات ہی کو تصور کرتا ہے بلکہ یوں کہئے : ع

آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے!

لیکن "خود حفاظتی تدابیر" کا یہ انداز کہ ہم محض پینترے دکھلاتے اور دھمکاتے رہیں ہمیں سرفراز کرنے کے بجائے سبک سر ہی بناتا ہے۔ ان ہتھکنڈوں سے جس قدر ہم اپنے آپ کو محفوظ بناتے ہیں، اسی قدر جگ ہنسائی اور ہوتی ہے۔ اپنا عکسِ رُخ دیکھ کر بدکنے والی کیفیت بھی دراصل توجیہہ کا ایک انداز ہے۔ ہم اپنی بے عملی کا جواز تلاش کر کے مطمئن ہونا چاہتے ہیں یا دوسروں کو موردِ الزام قرار دے کر اپنی ذمہ داری سے بچنے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ بس اسی ذکر و فکر میں عمرِ عزیز رائیگاں جاتی ہے اور بیتے ہوئے دنوں کی یاد سوہانِ روح بنی رہتی ہے۔ اداسی کے زاویے اگرچہ بدلتے رہتے ہیں لیکن جذبے کی شدت میں کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ اپنے روگ کو زمانے کی نگاہوں سے بچاکر پالتے رہے، دوسروں پر طعن و تشنیع کے تیر برساتے رہے تنقید و تنقیص کا بازار گرم رکھا، صرف اس لئے کہ کوئی ہماری طرف نظر نہ اٹھائے۔ لیکن وائے قسمت :

شوقِ ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا   قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

یہ ایک حقیقت ہے، تلخ ہی سہی، کہ مایوسی اور ناکامی کے بغیر زندگی میں نکھار نہیں آتا۔ بلا زحمت اور بلا محنت اگر منزلِ مقصود تک رسائی ہوا کرتی تو غالباً آسودگیٔ منزل کی مسرت بھی زائل ہو جاتی۔ لذتِ حیات کے لئے نامرادی کی چاشنی درکار ہے۔ لہٰذا ہزاروں خواہشیں ایسی سہی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے لیکن لطف اسی میں ہے کہ سب ارمان "نہ نکلنے پائیں۔ اور یہ بھی درست ہے کہ تازیانۂ نامرادی ہی بڑی بڑی مرادیں پوری کرنے کے لائق بناتا ہے۔ مثلاً طالب علموں کی راہ میں نصاب کا اعلیٰ معیار حائل ہوا کرتا ہے۔ ان کے اپنے مقاصد کی تکمیل ہوتی نظر نہیں آتی اور عزتِ نفس پر آنچ آتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونے والے بیشتر طلبا عموماً اپنے آپ کو ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ اسباب کا جائزہ لے کر مناسب راہِ عمل تلاش کرتے ہیں۔ اگر دشواریاں عقدۂ لاینحل نظر آتی ہیں تو اپنے لئے قابلِ حصول مدارج کا تعین کرتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کا پہچاننا اور اپنی اہلیت کا اندازہ لگانا، ایک صالح ذہن کی علامات ہیں۔ لیکن ایک جذباتی ردِعمل بسا اوقات، ماحول سے مطابقت پیدا کرنے نہیں دیتا۔ ناکامی کے اضطراب کو مناسب راہِ عمل اختیار کر کے کم کرنے کے بجائے خود فریبی کی چال بازیوں سے کم کیا جاتا ہے۔ ایک ناکام طالب علم اپنی تسکین کے لئے مختلف بہانے تلاش کرتا ہے۔ مثلاً اپنے آپ کو کھیل کے میدان میں ممتاز سمجھ کر خوش ہو جاتا ہے یا اساتذہ کی بے رخی اور بے توجہی کو اپنی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرا دیتا ہے۔ کوئی پہلے ہی سے پیش بندی کر ڈالتا ہے اور بیمار پڑ کر امتحان کی آزمائش سے ہی بچ نکلتا ہے۔ کوئی ہوائی محل تعمیر کر کے "عکسِ رُخ" والی کیفیت پیدا کر کے، اپنی بے چینی دور کر لیتا ہے۔ لیکن یہ اوچھے ہتھیار نہ کبھی کسی کے معاون ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔ ان سے اصل غرض نہ کبھی پوری ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ ان کا عمل توقیر کا نہیں، تذلیل کا ہی باعث ہوتا ہے۔ ان کے برتنے سے وقار گھٹتا اور بے وقعتی بڑھتی ہے۔ مزید برآں یہ دوسروں کے لئے بھی باعثِ آزار ہوا کرتے ہیں۔ ہم سب کو حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیئے اور اپنے آپ کو سمجھنا چاہیئے۔ ان طور طریقوں کے ذکر سے ہم میں سے کسی کو بھی آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے اور اس بات سے قطعی پریشان نہ ہونا چاہیئے کہ ان کا بیان ہمارے چال چلن اور عادات و اطوار کی غمازی کرتا ہے۔ اگرچہ یہ سب کسی شدید ذہنی

خلفشار کے مظہر بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کی جھلک تو کہیں بھی دکھائی دے سکتی ہے
مثال کے طور پر ہم سب ہی شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی کوتاہیاں، دوسروں کے
نامہ اعمال میں لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ایک انتہائی صورت ہے جبکہ کوئی شخص یہ
سوچ کر پریشان ہونے لگے کہ اس کے گرد و پیش سب ہی لوگ کسی متفقہ سازش کے
تحت اس کے درپے آزار ہیں۔ اس وقت عجیب دار گھوڑے والی بات ہوتی ہے۔

اکبر اور جذباتی ہم آہنگی

ڈاکٹر محمد عمر۔ استاد تاریخ جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ

آج کل مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی بڑی جد و جہد کی جارہی ہے اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے ذرائع اور وسائل اختیار کئے جارہے ہیں لیکن یہ مسئلہ نیا نہیں ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے آنے کے بعد پہلی مرتبہ یہ مسئلہ سامنے آیا۔ مگر اس وقت اس کی وہ نوعیت نہ تھی جو آج ہے۔ اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت کے احساس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہوگیا ہے کہ ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے درمیان یک جہتی اور ہم آہنگی کے لئے جد و جہد کی جائے۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اس مسئلہ کا حل صوفیائے کرام اور شاہانِ وقت نے نکالا، اور اس طرح انھوں نے اسلامی رواداری پر عمل پیرا ہو کر اپنی وسعت قلبی، دور اندیشی اور سیاسی تدبّر کا ثبوت دیا۔ عہد مغلیہ کے ما قبل اس کام کو زیادہ تر صوفیائے کرام اور ہندو بھگتوں نے، جو بھگتی تحریک کے رہنما تھے، کیا۔ اور وہ لوگ اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ان کی کامیابی کی سب بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا فلسفۂ حیات، خالق اور مخلوق کی محبت اور اخوت و مساوات انسانی تھا۔ ان کی زندگی میں مذہب کی خالص روح رواں دواں تھی اور وہ لوگ ہر مذہب کی ان باتوں کو، جو انسانوں میں مذہبی اختلاف کی بنا پر دشمنی، عناد و نفرت پیدا کرتی ہیں، برا بتاتے تھے۔ وہ لوگ کسی کے مذہب کی مذمت نہیں کرتے تھے اور نہ اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے کے لئے بحث و مباحثہ کرتے تھے بلکہ ان کی رائے میں ہر مذہبی فرقہ اپنے انداز سے معبود حقیقی تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ شیخ نظام الدین اولیاء کا یہ مصرع اس طرز و اندازِ فکر کی نشان دہی

کرتا ہے :۔

"ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے"

صوفیاء کرام نہ صرف ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے شگفتہ تعلقات رکھنے کے حامی تھے، بلکہ اس کی تلقین بھی کرتے تھے اور اکثر ان کی زبان سے یہ شعر سنا جاتا تھا۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام[۵۵]

حاصل کلام یہ کہ یہ صوفی اور بھگت عوام کے ساتھ فقر و فاقہ میں گزر بسر کرتے تھے اور اپنے اعمال صالحہ سے لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتے تھے اور اپنی بلند اخلاقی، وسعت قلبی، مذہبی رواداری بلند ہمتی اور اپنی شانِ استغنا سے لوگوں کے دلوں کو موہ لیتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برادرانہ تعلقات اور جذباتی ہم آہنگی قائم ہو گئی۔ ان رہنماؤں میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شیخ بابا فرید گنج شکر، شیخ نظام الدین اولیا دہلوی اور حضرت امیر خسرو کبیر داس، گرو نانک، پیپا، رائے داس، دادو دیال اور چیتنا مہا پربھو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اکبر بادشاہوں میں اکبر وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے اپنی رعایا کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اکبر کے عہد میں یہ مسئلہ موجودہ زمانے کے مقابلے میں بہت زیادہ نازک اور دقت طلب تھا۔ سب سے پہلے اکبر کو اس ملک میں ایک مضبوط انتظامی مرکزیت قائم کرنا تھا اور اس کام میں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا۔ اس نے اپنی سیاسی بصیرت، فراست اور جنگ و پیکار سے تمام شمالی ہندوستان اور جنوبی ہند کے کچھ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کیا اور اس طرح پورے ملک کو ایک مضبوط مرکزیت بخشی۔ ایک ہی قسم کا نظم و نسق، ایک سرکاری زبان

---

[۵۵] نافع السالکین۔ ص ۱۰۶

ایک ہی طرح کا سکہ، اور مرکزی ملازمت کا نظام، اس مرکزیت کے عناصر اربعہ کہے جا سکتے ہیں۔ سرکاری ملازموں کا ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو تبادلہ کیا جاتا تھا اور یہ طریقہ کار اس بڑے ملک میں انتظامی اور سیاسی استحکام اور مرکزیت قائم رکھنے کا ایک بڑا اور موثر وسیلہ تھا۔

مذہبی رواداری اور مساوات

تاریخ کی مستند کتابیں شاید ہیں کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں غیر مسلم رعایا کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مگر کچھ سیاسی اور انتظامی قوانین ایسے تھے جن کو مذہب کا رنگ دے کر بعض مورخوں نے مسلمان بادشاہوں کو متعصب اور تنگ نظر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

بہرحال اکبر نے مذہبی رواداری اور مساوات کی اس پالیسی کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا۔ مثلاً اس نے جنگ کے دوران میں پکڑے ہوئے قیدیوں کو غلام بنانے کے قاعدے (۱۵۶۲ء) جاترا ٹیکس (۱۵۶۳ء) اور جزیہ (۱۵۶۴ء) کو ختم کر کے اپنی اعلیٰ سیاسی بصیرت، تدبر اور فراست کا ثبوت دیا۔ اور اس طرح اس نے ان قوانین کو منسوخ کر دیا جو شریعت کی اصل روح اور مقتضائے زمانہ کے منافی تھے۔ اکبر کا قول تھا:

"ہم کو ہر شخص کے ساتھ صلح سے کام لینا چاہیئے۔ اگر وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں مشغول ہے تو اس سے جنگ کرنا معیوب ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسے افراد نادانی کے مرض میں مبتلا ہیں اور مہربانی کے قابل ہیں۔"[1]

مختصر یہ کہ اکبر اپنی صلح کل پالیسی کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا اور اپنی مسلم اور ہندو رعایا کے درمیان مذہبی اعتبار سے کسی قسم کی تفریق نہیں چاہتا تھا اور اس کے اس عمل میں سیاسی نقطۂ نظر غالب تھا۔ اس کے زمانے تک ہندوستان کی مذہبی فضا ایسی ہو چکی تھی کہ اب ہندو اپنے مسلمان بادشاہوں کی ملازمت بخوشی قبول کرنے لگے تھے اور ابتدائی نفرت و حقارت کا جذبہ ان کے دلوں سے مفقود اور محو ہو چکا تھا۔ اکبر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جو ہندو

---

[1] آئین اکبری (اردو ترجمہ) ج ۲۔ ص ۳۵۲۔

اس کے یہاں ملازمت کرنا چاہتا، اُسے وہ بخوشی اور خندہ پیشانی سے ملازم رکھ لیتا۔ اکبر جیسے رعیت پرور بادشاہ کے یہاں نوکری کرنا غیر مسلم رعایا اپنے لئے باعث فخر سمجھتی تھی۔

شاہانِ ہند اور مذہبی قوانین

یہ خیال عام ہے اور اکثر مورخ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوستان میں اسلامی حکومت تھی لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ حکمراں چاہے ہندو ہو یا مسلمان، پہلے وہ بادشاہ ہوتا ہے اور بعد میں کسی ایک مذہب کا پیرو مختصر یہ کہ سلاطین دہلی اور شاہانِ مغلیہ پہلے حکمراں اور بادشاہ تھے۔ اور بعد میں مسلمان۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی اشاعت و ترویج اسلام کو اپنا شیوہ نہیں بنایا۔

مغلوں نے جب ہندوستان فتح کیا تو انھیں یہاں ایک ایسی فضا ملی جو بھگتی تحریک کے نغموں سے معمور تھی، مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک ساتھ رہتے ہوئے تین سو سال بیت گئے تھے اور ایک خاص سطح پر ان میں میل جول بڑھ گیا تھا اور اتحاد و یک جہتی کے عناصر اپنا اثر ڈال رہے تھے، پھر مغلوں میں نسبتاً مروّت، رواداری زیادہ تھی، اس لئے انھوں نے طبعاً اور مصلحتاً اس کی کوشش شروع کی کہ کوئی ایسا مسلک نکلے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ مغل بادشاہوں میں اکبر نے ہندوستان کے اس ماحول کو اچھی طرح سمجھا، پھر اُسے اس کا موقع بھی ملا کہ وہ اس ماحول کو برقرار اور بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ لہٰذا اس نے اُمور مملکت اور نظام حکومت میں مذہب کو ابتداء ہی سے دخیل نہ ہونے دیا۔ اس نے ایک غیر مذہبی حکومت قائم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی اور اپنے اس مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس نے اپنی رعایا کو ہر قسم کی مذہبی آزادی دی اور "کارجہانبانی" کو مذہب کے اثر سے الگ رکھا۔

یہ سب کچھ کرنے پر بھی اکبر کو پورا اطمینان حاصل نہ ہوا بھگتی تحریک اور صوفیاء کرام کی تمام کوششیں ایک ایسے ملک کے لئے تھیں کہ جس پر ہندو اور مسلمان دونوں شانہ بشانہ چل سکیں۔ حاصل کلام یہ کہ وہ لوگ "دین محبت" قائم کرنا چاہتے تھے۔ کبیر نے اس دوہے

میں اسی مقصد کی طرف اشارہ کیا ہے :

جات پات کوئی پوچھت ناہی
ہری کو بھجے سو ہری کا ہو ہی

اکبر نے اپنے ماحول کے اس تقاضے کی صدائے بازگشت سُنی اور اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا ایک نیا طریقہ یا مسلک نکالا جو "دین الٰہی" یا "رہنموئی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلے میں مورخوں میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ ایک نیا مذہب تھا اور دوسرے گروہ کا کہ صوفیائے کرام کے دیگر سلسلوں کی طرح یہ بھی ایک سلسلہ تھا۔ یہی دوسرا خیال زیادہ صحیح بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اکبر پر تصوف کا بہت غلبہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تمام رعایا کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنانے کے علاوہ ان کے مذہبی اختلافات کو بھی دور کرنا چاہتا تھا۔

"دین الٰہی" کے متعلق ڈاکٹر تاراچند کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ کوئی نیا مذہب نہ تھا بلکہ ہندوستان کی مذہبی سدھار تحریکوں کا لازمی نتیجہ تھا جس کا اظہار کبیر جیسے بزرگوں کی تعلیمات میں ملتا ہے۔

اکبر نے "دین الٰہی" کو اس انداز سے ترتیب دیا تھا کہ جس میں ہندوستان کے تمام مذاہب کی اچھی اچھی باتیں آجائیں تاکہ ہندوستان کی قدیم مذہبی فرقہ پرستی نیست و نابود ہو جائے اور تمام رعایا ایک ایسے مسلک پر عمل کرنے لگے جس کا قائدِ اعظم اکبر بادشاہ ہو۔

اس پالیسی کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قسم کے فقیر، سنیاسی، جوگی، سیوڑہ، قلندر، حکیم اور صوفی، ہر طرح کے اہل سیف و اہل قلم، سوداگر، کسان و پیشہ ور اکبر کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور اکبر کو اپنا روحانی رہنما سمجھنے لگے[1]

لوگوں کو مُرید کرتے وقت اکبر جو شرائط ان پر عائد کرتا تھا، ان سے بھی یہی معلوم

---

[1] آئین۔ (اردو) ج اول۔ ص ۳۰۷۔

ہوتا ہے کہ وہ اپنا ایک نیا سلسلہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ جس کے افراد اکبر کے لئے جان، مال، مذہب اور عزت تک قربان کر دیں[۵۱]۔

اس سلسلے میں اکبر نے اور جو کچھ کیا اس کے بالتفصیل بیان کی یہاں گنجائش نہیں ہے لیکن اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اکبر نے اپنے سلسلے کے دستور میں تمام مذاہب کے عمدہ عمدہ اصول شامل کر لئے تھے اور اس طرح تمام فرقوں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ میں اکبر کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مختلف مذاہب کے پیروؤں میں جذباتی ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہو گئی اور ساتھ ساتھ اس کی حکومت کی جڑیں مضبوط اور مستحکم ہو گئیں۔

معاشرتی یک جہتی

اکبر کا دوسرا کارنامہ، جو سیاسی اور انتظامی مرکزیت قائم کرنے سے کہیں زیادہ دقت طلب تھا، یہ تھا کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان معاشرتی ہم آہنگی پیدا کرنے اور ایک متحدہ قومیت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ اپنے اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس نے خود راجپوت گھرانوں میں شادیاں کیں۔ ان عورتوں کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ مغل حرم سرا میں رہتے ہوئے انھیں اپنے مذہبی عقائد کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی دی۔ یہ رانیاں اور ان کی خادمائیں حرم سرا میں بت پرستی کرتیں اور بلا مزاحمت اپنے دیگر مذہبی رسومات ادا کرتیں۔ حرم سرا میں ہون کی رسم ادا ہوتی تھی جس کی ادائیگی کے وقت ویدوں کے منتر بھی پڑھے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اکبر نے خود بھی ہندو رسوم اور تیوہاروں کو منانا شروع کیا۔ مثلاً جھروکہ، درشن، تولہ دان، رکشا بندھن، دسہرہ، ہولی، بسنت، دیوالی، اور شیوراتری۔

ہندوؤں کے تیوہاروں کے منانے میں اکبر کی نیک نیتی کا پتہ اس واقعہ سے چلتا ہے کہ اتفاقاً دسہرہ سے ایک دن قبل اس کی والدہ رحلت فرما گئیں۔ اکبر نے حکم دیا کہ اس شام کو سوگ نہ منایا

---

۵۱ بدایونی۔ ص ۲۹۹۔

جائے کیوں کہ دوسرے دن اسے بڑی دھوم دھام سے دسہرہ کا تیوہار منانا تھا۔[۵۱]

اکبر نے نہ صرف خود ہندو گھرانوں سے شادی بیاہ کرکے تعلقات پیدا کئے بلکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں یگانگت اور اخوت کو ایک مستحکم صورت دینے کی غرض سے اپنے لڑکوں کی شادیاں بھی ہندو گھرانوں میں کیں۔ اس کا قول تھا کہ "بیگانہ افراد میں شادی کرنا پسندیدہ ہے۔ کیوں کہ بیگانگی، یگانگت سے مبدل ہو جاتی ہے"۔[۵۲]

یہ شادیاں راجپوتوں کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی تھیں۔ طرف ثانی کے گھر دولھا کو برات کے ساتھ لے جایا جاتا تھا اور شادی کے موقع پر ہندو اور اسلامی دونوں رسومات عمل میں آتے تھے۔

اکبر نے اپنے عزیزوں کی وفات پر ہندوؤں کے عقائدِ مذہبی کے مطابق اپنے سر، داڑھی اور مونچھ کے بال منڈوا کر سوگ منانا شروع کیا۔ اس نے اپنی والدہ اور اپنی مخصوص دایہ جیجی انگا کی، جس کو وہ اپنی ماں کے مثل سمجھتا تھا، وفات پر ان رسومات پر عمل کرکے سوگ منایا۔

اکبر کے اس طرزِ عمل کا اثر یہ ہوا کہ اعلیٰ طبقے کے مسلمانوں نے بھی سوگ کی اس رسم و رواج کو اپنا لیا۔ اُن میں ابوالفضل اور فیضی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے اپنے والد کے انتقال پر اپنے سر، داڑھی اور مونچھ کے بال منڈوائے تھے۔ اغلباً عزیز کوکا نے بھی اپنی والدہ کی وفات پر یہی عمل کیا تھا۔

دسہرہ اور دوسرے ہندو تیوہاروں کے موقعوں پر اکبر نے، اسی انداز اور پیمانے پر جس طرح وہ دونوں عیدوں کے موقعوں پر کیا کرتا تھا، دربار میں جشن منانے کی رسم جاری کی۔ ان جشنوں کے موقعوں پر انواع و اقسام کی آرائش کی جاتی، رقص و سرود کی محفلیں سجائی جاتیں اور کھانوں سے لوگوں کی ضیافت کی جاتی۔[۵۳] ان جشنوں میں اونچے درجے کے ہندو اور مسلمان دونوں مدعو

---

[۵۱] اکبرنامہ (فارسی)، ج ۳۔ ص ۸۳

[۵۲] آئین۔ ج ۲۔ ص ۳۶۸

[۵۳] آئینِ اکبری (اردو ترجمہ)، ج اول۔ ص ۱۱، ۱۴۰

کئے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے نشست و برخاست کا الگ الگ انتظام کیا جاتا تھا، پھر دونوں فرقوں کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب ترلانے کی غرض سے اکبر نے یہ طریقہ اپنایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر کے عہد حکومت میں ہندو اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے اتنے زیادہ قریب ہو گئے اور ان کے سماجی رسومات اس قدر یکساں ہو گئے اور مذہبی اختلافات اتنے دور ہو گئے کہ ہندو اور مسلمان کی تفریق کرنا صرف ناموں یا کچھ مذہبی عقائد کی بنا پر ممکن ہو سکتا تھا۔

اکبر نے ہندو سماج کا سدھار بھی کیا اور ان کی ان رسومات کو قانونی طور پر بند کروا دیا جو نقصان رساں تھیں۔ مثلاً لڑکے، لڑکی کی شادی کی عمر کی مدت بڑھا دی، کثرت ازدواج، ستی کی رسم، حرام کاری اور شراب نوشی پر سخت پابندیاں عائد کر دیں۔ اس نے گداگری کو ختم کرنے کی بھی پوری کوشش کی۔ یہ قوانین ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یکساں نافذ کئے گئے تھے۔

ثقافتی یک رنگی

اکبر نے ہندوستان میں ایک قوم (جو نہ تو ہندو ہو اور نہ مسلمان بلکہ ہندوستانی ہو) کے جذبے کو پیدا کرنے کی دوسری کوششیں بھی کیں۔ اس نے محسوس کیا کہ ان دو قوموں کے درمیان حقیقی تعاون اور یک جہتی کی خالص روح پیدا کرنے کے لئے ثقافتی یک رنگی بہت ضروری ہے۔

اکبر کے دربار کی زبان فارسی تھی، اس نے ضروری سمجھا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ایک لٹریچر ہو۔ اس کے لئے اس نے اپنے عہد کے علماء و فضلاء کو مختلف فنون کے اصلی نسخوں کو اس زبان میں منتقل کرنے کا کام سونپا۔ اپنی نگرانی میں ترجمے کرنے کا ایک شعبہ قائم کیا اور عربی، سنسکرت، ترکی اور یونانی زبان کی اعلیٰ تصانیف کے فارسی زبان میں ترجمے کرائے۔ اور اپنے درباریوں اور دیگر اعلیٰ عہدہ داروں کو یہ کتابیں بہم پہنچائیں۔ ہندوؤں مسلمانوں، پارسیوں کی مذہبی اور غیر مذہبی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا تاکہ مختلف مذہبی گروہ ایک دوسرے کے مذہبی اور غیر مذہبی خیالات اور عقائد تک رسائی پا سکیں اور ان کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ

"اہل زبان و زبان داں حضرات کا ایک گروہ ہمیشہ ہندی، یونانی، عربی فارسی زبانوں کی

کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرتا ہے"۔ ذیل کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔

(۱) تاریخ جدید۔ میرزائی میر فتح اللہ شیرازی کی جاں فشانی اور ابوالفضل کی امداد سے کشن جوگی گنگا دھر مہانند نے فارسی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔

(۲) مہابھارت کو نقیب خاں و مولانا عبدالقادر بدایونی اور شیخ سلطان تھانیسری نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

(۳) رامائن، نقیب خاں، مولانا عبدالقادر بدایونی اور شیخ سلطان تھانیسری نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

(۴) اتھروید کو حاجی ابراہیم سمرقندی نے فارسی زبان کے قالب میں ڈھالا۔

(۵) لیلاوتی کو، جو فن حساب کی بہترین تصنیف ہے، فیضی نے فارسی کا جامہ پہنایا۔

(۶) تاجک کو، جو علم نجوم کی بہترین اور معتبر کتاب ہے، مکمل خاں گجراتی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۷) تزک بابری۔ مرزا خان خاناں نے ترکی سے فارسی میں ترجمہ کیا۔

(۸) معجم البلدان، کو، ملا احمد اللہ و قاسم بیگ و شیخ منور نے عربی سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔

(۹) ہرنبس، جو سری کشن کے حالات کا ایک معتبر نسخہ ہے، مولانا شیری کی کوشش سے فارسی زبان میں ظاہر ہوا۔

(۱۰) کلیلہ دمنہ۔ ابوالفضل نے عیار دانش کے نام سے اسے فارسی میں منتقل کیا۔

(۱۱) نل دمن کا، جو ہندی زبان میں ایک جگر گداز افسانہ ہے، فیضی نے فارسی میں ترجمہ کیا۔

مندرجہ بالا کے علاوہ دوسری کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے تھے۔

اکبر نے طریقۂ تعلیم اور نصاب میں بھی سدھار کئے۔ نصاب سے فرسودہ کتابوں کو نکال کر ان کتابوں اور مضامین کا اضافہ کرایا جو عوام کے لئے باعثِ دلچسپی ہو سکتے تھے علاوہ ازیں

ایک ہی درسگاہ میں ہندو اور مسلمان بچوں کو ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے طریقے کو رائج کیا۔ اس وقت سے ہندوؤں نے بڑی دلچسپی کے ساتھ فارسی زبان سیکھنا شروع کی اور تھوڑی ہی مدت میں اس زبان پر اتنا عبور حاصل کر لیا کہ مسلمانوں سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اکبر نے سنسکرت زبان اور ہندی شاعری کی بھی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی۔ اور یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ وہ دور ہندی ادب کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس کے دربار سے کئی ہندی کے شاعر وابستہ تھے۔ مثلاً مہاپاتر نرہری بندی (۱۵۰۵ء تا ۱۶۱۰ء) کو اکبر نے مہاپاتر کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاپاتر نے گائے کی تعریف میں ایک شعر کہا تھا کہ اس کو سُن کر اکبر اتنا متاثر ہوا کہ اس نے گائے کشی بند کروا دی تھی۔ عالم، ٹوڈرمل، منوہر کوی، عبدالرحیم خانخاناں، بیربل، گنگ بھی اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ سورداس، تلسی داس، بلبھدر مسر، جمال، کیشو داس اسی کے عہد میں پروان چڑھے تھے۔

اکبر نے خود بھی ہندی میں شعر کہنے کی کوشش کی تھی اور ذیل کا ہندی کا شعر اسی کا بتایا جاتا ہے جو اس نے بیربل کی وفات پر کہا تھا۔

दीन देखि सब दीन, एक न दीन्हों दुसह दुःख।
सो अब हम कह दीन, कछु नहिं राख्यो बीरबल॥

فنِ تعمیر

تہذیبی یک رنگی اور جذباتی ہم آہنگی کے منصوبے کے پیشِ نظر اکبر نے فنونِ لطیفہ کے میدان میں بھی کچھ کارہائے نمایاں انجام دیئے، اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم فنِ تعمیر کا ذکر کریں گے۔ اکبر کے مزاج میں بڑی جدت اور طبیعت میں بڑی جودت تھی، اس کا ثبوت اس کی اس کوشش میں ملتا ہے کہ اس نے ہندو فنِ تعمیر اور مسلم فنِ تعمیر کے مابین ایک خوشگوار اور حسین امتزاج پیدا کرنے اور ایک نئے فنِ تعمیر کی ترقی کے سامان اور مواقع فراہم کئے۔ اُس کی سرپرستی میں ہندو مسلم ماہرینِ فن نے مل کر ہندو مسلم فنِ تعمیر کا ایک خاص دبستاں قائم کیا۔

ترکوں کے ہندوستان میں ورود سے پہلے یہاں فن تعمیر کے بڑے بڑے شاہکار موجود تھے اور وہ زیادہ تر ہندوؤں اور بدھوں کے مندروں اور مٹھوں کی شکل میں تھے۔ ہندوؤں کا اسلوب تعمیر یہ تھا۔ چھتیں شہتیر دار اور چورس ہوتی تھیں، مکانوں میں مورتیاں بھی ہوتی تھیں، مکان اور مندر کی دیواریں نقش ونگار سے مزین اور آراستہ۔ بڑے بڑے ستون اور ستون دار مکانوں کی چھتوں کے چاروں طرف پتھر یا اینٹ کی باہر کو نکلی ہوئی آڑیں، مخروطی گنبد اور ہیرمی اصولوں پر بنی ہوئی محرابیں۔

اس کے برخلاف مسلمان اپنے ساتھ مسلم فنِ تعمیر لائے تھے، مثلاً وہ عمارت کے جوڑنے میں ایک مسالہ کا استعمال کرتے تھے، محراب، مینار، کاشی کاری، بسنت کاری، لداؤ چھتیں۔ نصف گنبددار دوہرے پھاٹک اور چوڑا کھلا ہوا صحن، اور سب سے بڑھ کر خطاطی۔ اکبر کی سرپرستی میں مسلم معماروں نے ہندو طرزِ تعمیر کی بعض خوبیوں کو اپنا لیا اور ان کو اپنے فنی شاہکاروں میں اس طرح سمویا کہ وہ اس فن کا جزو لاینفک بن گئیں۔

اس ہندو مسلم فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے آگرہ کے قلعے، فتح پور سیکری، الہ آباد اور لاہور کے قلعوں کی عمارتوں میں ملتے ہیں۔ پانچ سو عمارتیں جو بنگالی اور گجراتی طرز پر بنوائی گئیں، ان میں جہانگیری محل، جو قلعہ کے اندر اکبر نے تعمیر کروایا خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، اگرچہ اس کی ترتیب اسلامی ہے، لیکن اس کا خاکہ اور صناعی ہندو فنِ تعمیر کے اسلوب پر ہے۔ اس کی چھتیں ہموار، اور دروازے چوکور ہیں۔ اور اس کے سنہرے منقش پتھروں کو دیوارگیریوں سے آراستہ کیا گیا ہے، جن پر پتھر کے شہتیر قائم ہیں۔ ان کی بناوٹ ہندو فنِ تعمیر کے طرز پر ہے۔ فتح پور سیکری میں اکبر کی تعمیر کردہ عمارتوں میں دیوانِ خاص، مریم مکانی کا محل، جودھا بائی کا محل اور ترکی سلطانہ کا محل ہندو مسلم فنِ تعمیر کے امتزاج کے اعلیٰ نمونے ہیں، شیخ سلیم چشتی کے مقبرے کی عمارت میں بھی اس نئے اسکول کے اثرات نمایاں ہیں۔

اکبر نے مجسمے سازی کے فن کی بھی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے چتوڑ کے بہادروں ــــــ

چ مل اور پاٹا — کے پتھر کے ہاتھی پر سوار مجسمے بنوائے اور ان کو آگرے کے قلعہ کے دہلی دروازے کے سامنے نصب کرایا۔ فتح پور سیکری میں اپنے قلعہ کے ہاتھی پول دروازے کی زینت اس نے سُرخ پتھر کے دو ہاتھیوں سے بڑھائی۔ مریم مکانی کے محل کے مکانوں کے سائبان کی دیواروں کے چاروں طرف چھجّے پر ہاتھی اور دوسرے جانوروں کے مجسمے نصب تھے۔ لاہور کے قلعے میں کثرت سے طاؤس اور دوسرے پرندوں اور جانوروں کے مجسمے لگے ہوئے تھے۔

مُصوّری، خطاطی اور دیواری تصاویر

تاریخ کی مستند کتابیں شاہد ہیں کہ "عہد سلطنت میں تصویر کشی رائج تھی اور دیواروں اور شاہی محلوں پر مختلف قسم کی تصویریں بنائی جاتی تھیں[۵۱]" لیکن مغلوں کے عہد میں اس فن کی اتنی ترقی ہوئی کہ یہ فن اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گیا۔ دربار اکبری علم و فن کا بہت بڑا مرکز تھا اور اس کی سرپرستی میں فنِ مصوّری نے ایسا عروج حاصل کیا کہ مغلیہ زمانے کے مصوّروں کا اپنا ایک مخصوص دبستان وجود میں آیا۔

اکبر کو ابتدائے عمر سے ہی فن مصوّری سے بڑی رغبت تھی۔ ابوالفضل لکھتا ہے:

"جہاں پناہ کو اس فنِ لطیف سے ابتدائے عمر سے ذوق و شوق ہے اور ہمیشہ اس امر پر توجہ فرماتے ہیں کہ اس فن کی روز افزوں ترقی ہو۔"

"قبلۂ عالم کی قدردانی و پرورش سے اس دلکش جادو نگاری کو انتہائی ترقی نصیب ہوئی اور ایک گروہ کثیر اس فن کا یکتائے روزگار استاد بن گیا۔"[۵۲]

اکبر نے ایک دن خلوت کدے میں جہاں صرف مریدانِ خاص کا مجمع تھا کہا:

"ایک گروہ فنِ تصویر کشی کا دشمن ہے اور اس پیشے کے معائب بیان کرتا ہے

---

[۵۱] برائے تفصیل ملاحظہ ہو: فتوحاتِ فیروز شاہی (علی گڑھ فارسی مطبوعہ) ص ۱۱، تاریخ فیروز شاہی ص ۰۲۹، ۳۷۴، ۳۸۴، مسلم ثقافت ہندوستان میں۔ ص ۳۸۱۔

[۵۲] آئین (اردو ترجمہ) ج اوّل، ص ۱۹۳۔

لیکن ان کے اقوال و دلائل کو دل سے قبول نہیں کرتا بلکہ قرینِ قیاس و عقل یہ ہے کہ مصوّر اکثر طبقات انسانی سے زیادہ خدا شناس ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ شخص جانور کی تصویر اتارتا ہے، اس کے ہر عضو کی شبیہہ کھینچتا ہے اور تصویر کو تمام کر کے جب یہ دیکھتا ہے کہ باوجود اس ظاہری سحر نگاری کے وہ اس میں روح پھونکنے سے عاجز و عاری ہے تو اس کو خالق مطلق کی قدرت کاملہ کا اندازہ ہوتا ہے اور صانع باکمال کے آگے سربسجدہ ہو جاتا ہے۔"[۵]

وسط ایشیا میں فنِ مصوّری کی بڑی قدر تھی۔ خراسان کے حکمران سلطان حسین مرزا کی سرپرستی میں اسے بہت فروغ ملا۔ بہزاد اس کے دربار سے منسلک تھا۔ اس نے چین کے فنِ مصوّری کے بعض عناصر وسط ایشیائی فن مصوّری میں شامل کئے۔ بہزاد کے چابک دست شاگرد آقا مرزا تبریزی، سلطان محمد اور مرزا علی نے فنِ مصوّری کے اعلیٰ شاہکار پیش کئے۔ سلطان حسین مرزا کے انتقال کے بعد بہزاد ایران کے سلطان اسمٰعیل صفوی کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اس نے چینی یا منگولی فنِ مصوّری میں ایرانی رنگ اس خوش اسلوبی سے سمویا کہ اس میں ایرانی طرز کی چمک دمک نمایاں ہو گئی۔

اکبر کی قدردانی اور سرپرستی کی بنا پر یہ فن اسی صورت میں ہندوستان لایا گیا۔ اس نے خواجہ عبدالصمد شیرازی کو، جو ہندوستان میں آنے سے پہلے ہی اس فن میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا اور ہمایوں کی دعوت پر ہندوستان آچکا تھا، بادشاہ کے لئے تصویریں اور دیواری تصاویر بنانے کا حکم دیا۔

اکبر نے ہندو مصوّروں کو بھی اپنے یہاں ملازم رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ایرانی فن مصوّری ہندوستانی فنِ مصوّری کے امتزاج سے ایک نیا طرز رونما ہوا، جس کو ہندو مغل دلبستان مصوّری کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس فن سے بیرونی اثرات زائل ہو گئے اور یہ فن

---

[۵] آئین۔ ج اوّل۔ ص ۱۹۵۔

خالص ہندوستانی ہو گیا۔[۵۱]

موسیقی

مسلمان بادشاہوں نے موسیقی کے فنِ لطیف کی ترقی اور تہذیب کے سلسلے میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مسلمانوں کو ہندوستانی موسیقی سے عمومی شغف تھا اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا ذیل کا بیان بڑا اہم ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لئے غیر ملکی نہیں رہے تھے۔ بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستانی موسیقی کے علم و ذوق سے تغافل برتتے۔ چناں چہ ساتویں صدی ہجری میں امیر خسرو جیسے مجتہدین کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے۔ اب ہندوستانی موسیقی، ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ .... خلجی اور تغلق کے دربار میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدر دانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ لیکن جس شاہی خاندان نے موسیقی سے بحیثیت فن کے خاص اعتنا کیا، وہ غالباً جون پور کا شرقی خاندان تھا.... مالوہ، بنگال اور گجرات کے بادشاہوں کے ذاتی اشتغال و ذوق کے واقعات تاریخ میں کثرت میں ملتے ہیں۔ گوڑ کے سلاطین ملکی زبان اور ملکی موسیقی دونوں کے سرپرست تھے۔ مالوہ کے باز بہادر کو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بھی بنا دیا اور موسیقی کا ماہر بھی۔"[۵۲]

دوسرے فنون لطیفہ کی طرح اکبر نے فن موسیقی میں بھی بے حد دلچسپی لی اور اختراعات کئے۔ اکبر کو اس فن سے ابتدا عمر سے دلچسپی اور شغف تھا۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:

"قبلۂ عالم اس فن پر خاص توجہ فرماتے ہیں۔ اور ہر موسیقی داں کے سرپرست اور مربی ہیں۔"[۵۳]

---

۵۱ اکبر کے دربار سے وابستہ ہندو مصوروں کے ناموں کے لئے ملاحظہ ہو۔ آئین (اردو ترجمہ) ج اول ص ۱۹۴،۹۵

۵۲ غبارِ خاطر۔ صفحات ۳۱۹، ۳۲۵۔

۵۳ آئین۔ ج اول، ص، ۵۳۔

تان سین گوالیاری بھی اکبر کے دربار میں ملازم تھا۔ اس نے فنِ موسیقی کی تعلیم گوالیار کے اس اسکول میں پائی تھی جس کو راجہ مان سنگھ تومر نے قائم کیا تھا۔

چوں کہ اکبر کے دربار میں ہندو مسلم دونوں فرقوں کے مشہور موسیقار جمع ہو گئے تھے، اس بنا پر اکبر کی سرپرستی میں ہندی اور اسلامی فنِ موسیقی میں اختلاط ہوا اور قدیم ہندی راگ و نغمہ میں بڑی حد تک تبدّل و تغیّر ہوا۔ اور اس طرح موسیقی کے ایک نئے دبستان کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی

مولانا امداد صابری

علامہ فضل حق خیرآبادی فرقتی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء میں خیرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا فضل امام اپنے دور کے عالموں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ دہلی میں دارالسلطنت میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے۔ مولانا فرقتی کے دادا مولانا محمد ارشد نے ہرگام سے خیرآباد رہائش اختیار کی تھی۔

آپ کا سلسلۂ نسب ۳۳ واسطوں سے خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ علاّمہ کے مورث اعلیٰ خیر الملک بن شاہ عطار الملک ایرانی تھے۔

مولانا فضل امام بڑے ذہین تھے۔ مولانا سید عبد الواحد کرمانی خیرآبادی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی۔ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں تیرہ سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم نقلیہ وعقلیہ کی تکمیل کی، چار ماہ اور کچھ دنوں میں قرآن مجید حفظ کیا۔ منقولات کی تحصیل حضرت شاہ عبد القادر محدثؒ اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی سے کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ ایک طالب علم مولانا فضل امام سے پڑھنے کے لئے آیا تھا۔ مولانا نے اس سے کہا کہ تم بھی فضل حق سے پڑھ لیا کرو۔ حسب الحکم وہ آپ کی خدمت میں آیا۔ اس کی عمر زیادہ تھی۔ غریب آدمی تھا۔ صورت کا بھی اچھا نہیں تھا۔ یہ نازک طبع، چودہ برس کا سن اس کو تھوڑا سا سبق پڑھایا تاڑ گئے کہ کند ذہن ہے اس کی کتاب پھینک دی۔ اور ڈانٹ کر نکال دیا۔ وہ افسردہ مولانا کے پاس پہنچا اور جو سلوک اس کے ساتھ کیا گیا تھا اس نے بیان کیا۔ فرمایا۔ بلاؤ خبیث کو۔ حاضر ہوئے مولانا نے ایک تھپڑ زور سے مارا اور فرمایا طلبہ کی منزلت نہیں جانتا آئندہ اگر ایسا کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔ یہ خاموشی کے ساتھ کھڑے روتے رہے اور طالب علموں کے ساتھ برے برتاؤ سے گریز کیا۔[1]

---

[1] تذکرہ غوثیہ ص ۱۲۳۔

علامہ کی والد ماجد کے انتقال کے وقت اٹھارہ سال کی عمر تھی۔ اکبر شاہ ثانی کا عہد تھا دہلی کے رزیڈنٹ کے محکمے میں سر رشتہ دار عدالت دیوانی مقرر ہوئے۔ حکام تنک مزاج تھے علامہ نے استعفیٰ دے دیا۔ نواب فیض محمد خاں والی جھجر کے ہاں پانچ سو روپیہ ماہانہ پر ملازم ہوئے انھوں نے اپنے پاس بلا لیا۔ دہلی سے روانگی کے وقت بہادر شاہ ظفر جب کہ ولی عہد تھے علامہ کو بلوایا اور ایک دوشالہ ان کو عنایت کیا اور جانے وقت آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

"چوں کہ آپ جانے کے لئے تیار ہیں میرے لئے بجز اس کے کوئی چارہ کار نہیں کہ میں بھی اس کو منظور کر لوں۔ مگر خدا علیم ہے کہ لفظ وداع زبان پر لانا دشوار ہے"۔[۱]

ایک عرصہ تک جھجر رہے۔ پھر مہاراجہ الور کے ہاں مدعو ہوئے دو سال مہارن پور میں ایک اعلیٰ عہدہ پر رہے۔ نواب ٹونک کے ملازم بھی ہوئے۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے محکمہ نظامت سپرد کیا اور تلمذ کی عزت حاصل کی۔ آٹھ برس رام پور میں رہے پھر لکھنؤ تشریف لے آئے۔ وہاں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ گورنر جنرل نے دوسرے سال ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ آ کر ایک کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے مقرر کی۔ اس کے مہتمم آپ مقرر ہوئے۔

زمانہ ملازمت میں ایک واقعہ پیش آیا۔ دہلی کے کسی پل پر کسی وجہ سے آمد و رفت ممنوع قرار دی گئی تھی۔ علامہ کے پاس کچھ لوگ آئے اور برات پہنچانے کی اجازت چاہی علامہ نے ایک پرچہ لکھ دیا "روکو مت جانے دو" نگرانی کرنے والوں نے پرچہ دیکھ کر جانے دیا حکومت کی طرف سے جواب طلبی ہوئی، نگرانی کرنے والوں نے اجازت نامہ پیش کیا علامہ سے بازپرس ہوئی، آپ نے فرمایا، میں نے لکھا تھا "روکو، مت جانے دو"۔ علامہ نے اپنی دانائی سے برات والوں کا کام بھی کر دیا اور اپنے اوپر الزام بھی نہیں آنے دیا۔

علامہ سے مرزا غالب کے پرخلوص و گہرے تعلقات تھے۔ یہ دونوں ہم سن تھے۔

---

[۱] کلیات نثر غالب ص ۱۴۷۔

۱۷۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے ایک جان دو قالب مانے جاتے تھے۔

مرزا غالب کی شعر گوئی کا طرز جدا گانہ تھا۔ مرزا مشکل اور مغلق الفاظ استعمال کرتے تھے اور ترکیبیں بھی اس قسم کی استعمال و ایجاد کرتے تھے۔ لوگ معترض ہوتے تھے کہ ایسے اشعار طبیعت کو مکدر کر دیتے ہیں۔ مرزا غالب نے دوسرے اعتراضوں کی پرواہ نہیں کی جب علامہ فضل حق نے سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیں گے تو مرزا پر اثر ہوا۔ اس واقعہ کو مولانا محمد حسین آزاد اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں[۱]

"مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانے میں دہلی میں سر رشتہ دار تھے اس عہد میں مرزا خاں کوتوال تھے وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے ہمیشہ باہم دوستانہ جلسہ اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے مرزا نے کہا جو کچھ کر چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے وہ دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو آج عینک کی طرح لوگ آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

چنانچہ مرزا غالب کے کلام میں سے دو ثلث کے قریب نکال دیا گیا اور اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔[۲]

علامہ کی سخن فہمی کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ مرزا کے ایک فارسی قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے ؂

ہم چناں در تتق غیب ثبوتے دارند　　　　بوجودے کہ ندارند ز خارج اعیاں

---

[۱] آب حیات ص ۵۱۲ ۔ [۲] یادگارِ غالب ص ۱۰۲۔

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب خود مجھ سے کہتے تھے کہ ہیں "ثبوتے" کی جگہ "نمودے" لکھا تھا۔ مولوی فضل حق کو جب یہ شعر سنایا تو انھوں نے کہا کہ اعیان ثابتہ کے لئے نمود کا لفظ نامناسب ہے اس کی جگہ ثبوت بنادو۔ چنانچہ طبع ثانی میں بجائے نمود کے ثبوت بنادیا ہے۔[۵]

مولانا علوم دینیہ پر اس قدر حاوی و قادر تھے کہ علوم کے بڑے اہم مسائل کا سلجھانا معمولی بات سمجھتے تھے۔ صاحب تذکرہ علماء ہند لکھتے ہیں: "سنہ ۱۲ھ کو لکھنؤ میں مولانا کی خدمت میں پہنچا آپ حقہ نوشی اور شطرنج کھیلنے کی حالت میں طالب علم کو افق المبین کا سبق دے رہے تھے اور حسن بیانی کے ساتھ اس کے مطالب کو دل نشین کرا رہے تھے۔"

علامہ فضل حق کی قابلیت و ذہانت و ذکاوت کے ان کے ہم عصر معترف تھے۔ سرسید مرحوم آثار الصنادید میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔

"جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے جب ان کی زبان سے یک حرف سنا دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے با ایں ہمہ کمالات علم ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی طبع رسا وسعت آویز بلندی مدارج ہے۔"

منشی امیر احمد مینائی انتخاب یادگار میں تحریر فرماتے ہیں۔

"افضل الفضلا، اکمل الکملا، فضائل دستگاہ فواضل پناہ جناب مولانا مولوی فضل حق صاحب فاروقی برداللہ مضجعہ، فنون حکمیہ میں مرتبہ اجتہاد بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین نہایت ذکی، طلیق و ذلیق، انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق۔۔۔ جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔"

---

۵ یادگار غالب ص ۷۹

ہندوستان پر انگریز کے تسلط سے ہر با شعور ہندوستانی متاثر تھا اور اس کے طوق غلامی کو توڑنا چاہتا تھا چنانچہ انہی حالات کو دیکھ کر شاہ عبدالعزیزؒ نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد مولانا سید احمد بریلوی مولانا اسمٰعیل دہلوی اور مولانا عبدالحئی صاحبان نے پہلے اس فتویٰ پر عمل کیا۔ علامہ فضل حق گرچہ ملازمت کر رہے تھے لیکن ہندوستان کے سیاسی حالات سے غافل نہیں تھے ان کا بغور مطالعہ کر رہے تھے جس کا اظہار انھوں نے رسالہ الثورۃ الہندیہ میں کیا ہے۔

"برطانوی نصاریٰ جن کے دل ممالک ہند کے دیہات و شہر پر قبضہ اور اس کے اطراف واکناف و سرحدوں پر تسلط کے بعد عداوت و کینہ سے بھر گئے تھے۔ اور تمام ذی عزت اعیان کو ذلیل وخوار کر کے ان میں سے ایک کو بھی اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ سر نافرمانی کو جنبش دے سکے انھوں نے تمام باشندگان کو کیا امیر کیا غریب چھوٹے بڑے مقیم و مسافر، شہری و دیہاتی سب کو نصرانی بنانے کی اسکیم بنائی ان کا خیال تھا کہ ان کو نہ کوئی مددگار معاون نصیب ہوگا اور نہ انقیاد و اطاعت کے سوا سرتابی کی جرأت ہو سکے گی۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ سب لوگ انہی کی طرح ملحد و بے دین ہو کر ایک ہی ملت پر جمع ہو جائیں اور کوئی بھی ایک دوسرے سے ممتاز فرقہ نہ رہ سکے انھوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر ٹکراؤں سے باشندوں کا اختلاف تسلط و قبضہ کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا اور سلطنت میں انقلاب پیدا کر دے گا اس لئے پوری جانفشانی اور تن دہی کے ساتھ مذہب و ملت کو مٹانے کے لئے طرح طرح کے مکر و حیلہ سے کام لینا شروع کیا انھوں نے بچوں اور ناسمجھوں کی تعلیم اور اپنی زبان و دین کی تلقین کے لئے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کئے پچھلے زمانے کے علوم و معارف اور مدارس و مکاتب کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری ترکیب یہ سوچی کہ مختلف طبقوں پر قابو اس طرح حاصل کیا جائے کہ زمین ہند کے غلہ کی پیداوار، کاشتکاروں سے لے کر نقد دام ادا کئے جائیں اور ان غریبوں کو خرید و فروخت کا کوئی حق نہ چھوڑا جائے۔ اس طرح بھاؤ کے گھٹانے بڑھانے اور منڈیوں تک اجناس پہنچانے اور نہ پہنچانے کی خود ہی ذمہ دار بن بیٹھیں اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ خدا کی مخلوق مجبور و معذور ہو کر ان کے قدموں پر آپڑے اور خوراک نہ ملنے پر ان نصاریٰ اور ان کے اعوان و انصار کے حکم کی تعمیل اور ہر مقصد کی تکمیل کرے۔ ان ترکیبوں کے علاوہ

ان کے دل میں اور بھی بہت سے مقاصد چھپے ہوئے تھے مثلاً مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنا شریف و پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین کو مٹانا وغیرہ۔ اپنے مکر کی ابتداء اس طرح کی کہ سب سے پہلے اپنے ہندو مسلم لشکریوں کو ان کے رسوم و اصول سے ہٹانے اور مذہب و عقائد سے گمراہ کرنے کے درپے ہوئے ان کا گمان تھا کہ جب بہادر لشکری اپنے دین کو بدلنے اور احکام نصرانیت بجالانے پر آمادہ ہوجائیں گے تو پھر دوسرے باشندوں کو سزا و عتاب کے ڈر سے خود ہی مجال انکار نہ ہوسکے گی۔ انھوں نے ہندو لشکریوں کو جو تعداد میں بہت زیادہ تھے گائے کی چربی اور مسلمان سپاہیوں کو جو تھوڑی تعداد میں تھے سور کی چربی چکھانے پر زور ڈالا یہ شرمناک روش دیکھ کر دونوں فرقوں میں اضطراب پیدا ہوگیا اور اپنے اپنے مذہب و اعتقاد کی حفاظت کی خاطر اس کی اطاعت و انقیاد سے منہ موڑ لیا ان کے اس اضطراب نے خرمن امن پر چنگاری کا کام کیا گروہ نصاریٰ کا قتل ڈاکہ زنی ان کے سرداروں اور سپہ سالاروں پر حملہ شروع کر دیا۔"

ان واقعات و حالات کو دیکھنے کے بعد علامہ فضل حق خاموش ہو کر بیٹھنے والے نہیں تھے۔ میرٹھ سے دہلی میں مجاہدِ وطن ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے پہنچ گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر ہندوستان کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جنگ جاری ہوگئی تھی ۱۶ اگست یا ۱۸ اگست کو الور سے علامہ دہلی پہنچے۔ بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کا فائل نیشنل آرکائیوز نیو دہلی میں ہے جس میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا ذکر ہے فائل نمبر ۱۲۲/۳۵۴ III دہلی نیوز ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء میں مخبروں کی رپورٹیں شامل ہیں اس میں لکھا ہے کہ مولوی فضل حق ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کو دہلی میں ملازمت کے لئے آئے۔ تراب علی جاسوس و مخبر ۲۴ اگست ۱۸۵۷ء کی چٹھی کے ذریعہ اطلاع دیتا ہے۔

"مولوی فضل حق الور سے دہلی میں ایک ہفتہ ہوا آئے ہیں اور شاہی کونسل انتظامی میں انگریزی حکومت کی انتہائی مخالفت کی وجہ سے داخل کئے گئے ہیں۔ ان کا بیٹا سہارنپور کا ناظم مقرر ہوا ہے اور مولوی میاں جان جو ان کا بھتیجا ہے پہلے نائب سرشتہ دار گوڑگانوہ تھا ہم

گوڑگانوہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔

دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران میں محبان وطن نے جو خط و کتابت کی تھی وہ انگریزوں کے قبضہ میں آگئی تھی یا مخبروں نے اپنے انگریزی آقاؤں کو جو خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط کو بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں پیش کیا گیا تھا ان خطوط میں ایک خط انگریزوں کے مخبر مکند لال کا ہے۔ جو بہادر شاہ ظفر کا سکریٹری بنا ہوا تھا۔ اس نے ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کی انتظامی کونسل کی رپورٹ ان الفاظ کے ساتھ لکھی ہے کہ جب بہادر شاہ ظفر دربار کرنے کے بعد اپنے کمرہ خاص میں تشریف لے گئے تو مولوی فضل حق نواب احمد علی خاں، بدھا صاحب اور مرزا اختر صاحب بہادر نے جو تحریری احکام دئے تھے۔ وہ مفصلہ ذیل ہیں۔ احکام کی تعداد ۲۷ ہے۔ ان میں سے ضروری اور اہم حکم نقل کئے جاتے ہیں: تاکہ معلوم ہو جائے کہ کن کن چیزوں کے لئے حکم دئے گئے تھے۔

راؤ رتلام کے پتہ پر روپیہ بھیجنا ہے حسب ہدایت شمشیر الدولہ قلم بند کر لیا۔

بنام بخشش علی حسب ہدایت حسن بخش عرفی بگی لکھا گیا بابت بھرتی پانچسو پیدل برائے ملا گڑھ۔

لکھنؤ جانے کا پروانہ راہداری بموجب درخواست محمد بخش حسب ہدایت کلیات اللہ بیگ و حسن بخش خاں عرفی بگی تحریر کیا گیا۔

بنام راؤ رتلام: سدھروی کی آمدنی پہنچنے کے لئے حسب ہدایت شمشیر الدولہ۔

بنام راؤ رتلام: خزانہ بھیجنے اور معتمد الخیٹ بھیجا جائے حسب ہدایت شمشیر الدولہ۔

بنام حسن بخش عرفی بگی علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے کے لئے مولوی فضل حق کی موجودگی میں لکھا گیا۔

بنام فیض محمد اسے ضلع بلند شہر و علی گڑھ کی آمدنی وصول کرنے پر مقرر کیا گیا حسب ہدایت مولوی فضل حق تحریر کیا گیا۔

بنام ولیداد خاں مذکورہ دونوں آدمیوں کی آمدنی وصول کرنے میں مدد دینے کے لئے تحریر کیا گیا۔ مولوی فضل حق۔

بنام مولوی عبدالحق خاں ضلع گوڑگانوہ کی مالگذاری کی آمدنی وصول کرنے کا انتظام کیا جائے
حسب ہدایت مولوی فضل حق لکھا گیا جن کا بھتیجا گوڑگانوہ جائے گا۔
روزنامچہ عبداللطیف میں ۲۷ رذی الحجہ ۱۹ اگست ۱۸۵۷ء میں مولوی فضل حق کے بارے میں
تحریر ہے۔
"جب زمانۂ شور وشر پھیلا مولوی فضل حق خیرآبادی نے عزم کیا اور بارگاہ میں باریابی کے
آرزومند ہوئے نذر اور نثار کے لئے بہت سا روپیہ پیش کیا وہ حصول عہدہ کے خواہش مند تھے جب
کامیابی کے اشتیاق نے انھیں بے صبر کر دیا بادشاہ نے فرمایا کہ جب تک تمہاری مراد کی خوشخبری ظہور
میں آئے کشتی آرزو ساحل مقصود تک پہنچے صبر کرو۔"
منشی جیون لال مخبر کے روزنامچہ میں بھی مولانا فضل حق خیرآبادی اور ان کے صاحب زادے کا ذکر
آیا ہے وہ لکھتا ہے۔
(۱) مولوی فضل حق شریک دربار ہوئے انھوں نے اشرفی نذر میں پیش کی اور صورت حال کے
متعلق بادشاہ سے گفتگو کی۔ (۱۶ راگست ۱۸۵۷ء)
(۲) بادشاہ دربار عام میں تشریف فرما ہوئے مرزا الٰہی بخش، مولوی فضل حق، میر سعید علی خاں
اور حکیم عبدالحق آداب بجا لائے۔ (۲ رستمبر ۱۸۵۷ء)
(۳) مولوی فضل حق نے اطلاع دی کہ متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے اور انگریزوں کو شکست دینے
کے بعد شہر پر حملہ کر رہی ہے۔ (۶ رستمبر ۱۸۵۷ء)
(۴) بادشاہ دربار خاص میں رہے حکیم عبدالحق، میر سعید علی خاں، مولوی فضل حق، بدرالدین اور
دیگر تمام امراء رؤساء شریک دربار ہوئے۔ (۷ رستمبر ۱۸۵۷ء)
(۵) عبدالحق خاں (خلف مولوی فضل حق) اور مولوی فیض احمد لگان وصول کرنے کی غرض سے
گوڑگانوہ گئے (۱۹ راگست ۱۸۵۷ء)
یہ تو محب وطن حضرات کے مخبروں جاسوسوں اور دشمنوں کی رپورٹیں اور روزنامچوں میں اپنے

انداز میں مولانا فضل حق نے ۱۸۵۷ء کی دہلی کی جنگ آزادی میں جو حصہ لیا تھا اس کے بارے میں رائے ہے۔ قابل اعتماد اور لائق اعتبار منشی جو مولانا فضل حق کے دوستوں میں شمار کی جاتی تھی۔ وہ منشی ذکاء اللہ صاحب کی ہے انھوں نے اپنی مشہور تصنیف تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی خدمات کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انجام دی تھیں اور ان کی پاداش میں ان کو جلاوطن ہونا پڑا تھا۔

ضلع گوڑگانوہ کے زمینداروں کی طرف سے درخواست آئی کہ سارے ضلع میں بدنظمی ہو رہی ہے کوئی حاکم انتظام کے لئے بادشاہ کی طرف سے بھیجا جائے۔ بادشاہ نے یہ کام مولوی فضل حق کے سپرد کیا مولوی صاحب متبحر عالم مشہور تھے وہ الور سے ترک ملازمت کرکے دہلی میں آئے تھے انھوں نے بادشاہ کے لئے ایک دستور العمل سلطنت لکھا تھا جس کی دفعہ اول یہ مشہور ہوئی تھی کہ گائے کہیں بادشاہی عملداری میں ذبح نہ ہو جس پر مولویوں نے ان کا خوب مضحکہ اڑایا مگر یہ دستور العمل کہیں کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔ ان کو اس بغاوت کی سبب سے جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔ وہ رہا ہوئے مگر جلاوطنی ہی میں روح نے جسم کی قید سے رہائی پائی۔ انھوں نے گوڑگانوہ میں اپنے بیٹے مولوی عبدالحق کو کلکٹر اور آدمیوں کو تحصیلدار مقرر کیا جس کی عمل درآمد نہیں ہوئی۔" (۶۸۷)

یہ بات تو مسلمہ ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا چنانچہ خود مولانا نے بھی قصائد فتنۃ الہندیہ میں تسلیم کیا ہے۔

"میں بیٹھنے والوں کو لڑائی میں برابر آگے بڑھاتا رہا اور لڑائی شروع ہو جانے پر خود بیٹھا رہا میں اپنی سستی کی وجہ سے ایسے مواقع پر باز رہا، یہ میں نے بڑا جرم کیا ہے جب نیک بخت حضرات نے مجھے شہادت کے لئے بلایا تو میں حاضر نہ ہوا یا شہادت سے محروم رہا جبکہ سعادت مندوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اے آموزگار! میرے قصور کو معاف کر، اور جو کچھ مجھ سے خطا سرزد ہوئی، اس سے درگذر کر، تجھ سے ہی عفو و درگذر کی امید ہے۔"

جب دہلی شہر پر انگریزوں کا مکمل طور پر قبضہ ہو گیا اور کوئی لشکر و شہری باقی نہ رہا۔ غلہ اور

پانی دشمنوں کے استبداد کی وجہ سے ناپید ہوگیا تو مولانا فضل حق پانچ روز تک بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے پانچویں روز اسی حالت میں اپنی کتابیں مال و اسباب چھوڑ کر خدا پر بھروسہ کرکے اہل وعیال کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ دریا پار گئے جنگلوں میں سے گذرے اور بھیکن پور ضلع علی گڑھ میں اٹھارہ روز مقیم ہوئے۔ اس کے بعد آپ کے چچا نواب عبدالشکور رئیس بھیکن پور نے سانگرہ کے گھاٹ سے پار اود بریلی کی طرف اتروادیا۔ اس کے بعد مولانا روپوش ہوگئے۔ ان کی مخبری ایسے دو مرتد جھگڑالو اور تند خو افراد نے کی جو مولانا سے اس آیت پر مجادلہ کرتے تھے جس کا یہ حکم تھا کہ نصاریٰ کا دوست بھی نصرانی ہے۔ وہ دونوں نصاریٰ کی موادت و محبت پر مصر تھے۔ انھوں نے مرتد ہوکر کفر کو ایمان سے بدل لیا تھا۔

جس وقت ملکہ نے عام امن و معافی کا اعلان کیا اس پر اعتماد کرکے مولانا اپنے گھر چلے آئے اور ان کے روپوش ساتھی بھی منظر عام پر آگئے لیکن پولس نے صرف مولانا کو گرفتار کیا۔ اور ان کی گرفتاری سیتاپور سے ہوئی اور ۱۸۵۹ء کو لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق پر مقدمہ دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی شرکت کے سلسلے میں چلا ہوگا لیکن جناب امتیاز علی عرشی لائبریرین رضا لائبریری رامپور نے ایک مضمون مولانا فضل حق خیرآبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ جہاد (رسالہ تحریک دہلی ۱۹۵۷ء میں چھپا ہے۔ ایک خط مولانا فضل حق بنام نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور نقل کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا پر اس مقدمہ میں دہلی کی جنگ آزادی میں شرکت کا کوئی ذکر یا الزام نہیں ہے بلکہ ان پر یہ الزامات لگائے گئے تھے۔

(۱) نواب خان بہادر خاں نبیرہ حافظ رحمت خاں بہادر نے جب انگریزوں کے خلاف بریلی میں بغاوت کی تو مولانا نے ان کا ساتھ دیا اور اس کی طرف سے نظامت پیلی بھیت کا کام انجام دیا۔

(۲) جب انگریزوں نے بریلی فتح کرلی تو مولانا یہاں سے بھاگ کر اودھ پہنچے اور خان علی خاں

۱؎ الثورۃ الہندیہ

کی طرف سے ریاست محمدی کے چکلہ دار مقرر ہوئے۔

(۳) مولانا نے اس کے بعد ایک باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی۔

چنانچہ مولانا نے اس خط میں ان تینوں الزامات کی تردید کی ہے کہ ان واقعات کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ کارنامے دراصل میر فضل حق شاہ جہاں پوری کے ہیں۔ میرے ہم نام ہونے کی وجہ سے مخبروں کو غلط فہمی ہوئی ہے جس کی بنا پر انھوں نے اپنی خفیہ رپورٹوں میں یہ بھی اضافہ کردیا کہ ان کا ایک بھائی مہاراجہ پٹیالہ کا ملازم ہے۔ جو واقعتاً صحیح ہے۔

اس خط کو دیکھنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ واقعی انگریزی حکومت اتنی اندھی تھی اور دہلی کے حکام اور خفیہ پولیس کا عملہ اتنا غافل تھا کہ دہلی جو بغاوت کا مرکز بنی ہوئی تھی اس کے مخصوص و اہم شخصیتوں اور باغیوں کو جنھوں نے دہلی کی جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کو نظر انداز کردے۔ اور جن حکام نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کی تیاری و تفتیش کی ہوگی انھیں مولانا فضل حق خیرآبادی کے باغیانہ واقعات کا علم نہیں ہوگا۔ اور کیا دہلی اور لکھنؤ کے حکام نے مل کر مقدمہ کی تفتیش نہ کی ہوگی۔ اس مقدمہ میں دلی کے باغیانہ واقعات و الزام کا ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ کیا خان بہادر خاں کی شخصیت بہادر شاہ ظفر کے مقابلہ میں اور بریلی و بیلی بھیت وغیرہ وغیرہ کی بغاوت دہلی کی بغاوت سے زیادہ اہم تھی جو مولانا کے مقدمہ میں خان بہادر خاں اور بیلی بھیت وغیرہ کے واقعات کو اہمیت دی اور بہادر شاہ ظفر اور دہلی کے واقعاتِ بغاوت کو فراموش کردیا۔ جبکہ دشمن کی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ سخت سے سخت الزامات و شکنجوں میں مخالف کو کسا جائے۔

دوسرا غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ میر فضل حق شاہ جہاں پوری نے بیلی بھیت اور محمدی میں جو کچھ کیا تھا وہاں کے حکام و مخبران سے ناواقف تھے اور ان کے متعلق کوئی رپورٹ ان کے پاس نہیں ہوگی۔ نیز کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہوتی کہ بیلی بھیت اور محمدی کے حکام و مخبر میر فضل حق شاہجہاں پوری کے باغیانہ واقعات کو مولانا فضل حق خیرآبادی پر تھوپیں۔ جبکہ ان کے پاس مولانا خیرآبادی کے خلاف دہلی کے باغیانہ واقعات حرکات سکنات کی رپورٹیں موجود تھیں۔

مولانا فضل حق خیرآبادی نے جن دو مجذوبوں کا ذکر کیا ہے اور ان سے جو وجہ مخاصمت بیان کی ہے ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں مجذوب دہلی کے تھے ۔ پیلی بھیت او رجھ دی میں جب مولانا کا گذر ہی نہیں ہوا تو وہاں کسی سے مجادلہ و مباحثہ ممکن نہیں ہے اور مولانا کے مجذوب وہی تھے ، جن سے مولانا کا مجادلہ ہوا تھا۔[۵۱]

نواب یوسف علی خاں والئ رامپور ان ہر دو حضرات میر فضل حق (شاہجہاں پوری) اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے بخوبی واقف تھے اور دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جو لوگ برطانوی حکومت کے خلاف حصہ لے رہے تھے ان کو بھی خوب اچھی طرح جانتے تھے ۔

مولانا فضل حق خیرآبادی نواب رام پور کے استاد تھے انھوں نے ان کو محکمہ نظامت سپرد کر رکھا تھا ۔ اور کافی عرصے تک یہ رام پور میں رہے تھے ۔

اسی طرح میر فضل حق شاہجہاں پور کے نہیں بلکہ رام پور کے رہنے والے تھے ۔ رام پور میں ہی سید احمد علی خاں صاحب کے عہد میں پیدا ہوئے تھے رام پور میں نائب سررشتہ دار محکمہ صدر رہ چکے تھے نواب یوسف علی خاں ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے ۔ جب میر صاحب فیروز شاہ کے شریک ہو گئے تھے تو نواب یوسف علی خاں نے ان کو ہر چند چاہا کہ رام پور چلے آئیں انھوں نے جواب کہلا کے بھیجا اب تو تمنائے شہادت ہے چنانچہ یہ پھانسی پر شہید ہوئے[۵۲] گویا نواب یوسف علی خاں میر صاحب کی سیاسی سرگرمیوں سے بھی واقف تھے ۔

جبکہ نواب رام پور ان دونوں بزرگوں کی بے پناہ عزت کرتے تھے اس کی سیاسی سرگرمیوں سے بھی ناواقف نہیں تھے اور ان کی حکومت برطانیہ کے حکمرانوں میں کافی رسائی تھی اگر مولانا فضل حق پر یہ بے بنیاد الزامات لگائے جاتے تو ان کے علم میں یہ بات ضرور آتی اور ان کو انگریزی حکمرانوں سے مولانا کی صفائی دینے کا سنہری موقع ملتا جس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتے ۔ لیکن یہ حقیقت نہیں ہے کہ مولانا پر مذکورہ بے بنیاد الزامات لگائے گئے تھے جس کی بنیاد صرف یہ خط ہے، جو

---

[۵۱] الثورۃ الہندیہ ۔ [۵۲] تذکرہ کاملان رام پور ۔ ص ۳۲۰ ۔

انتہائی مشتبہ، غیر ذمہ دار اور ناقابلِ اعتبار ہے اس کو مولانا سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

مولانا فضل حق پر بہادر شاہ ظفر کا ساتھ دینا، اور انگریزوں کے خلاف دہلی کی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں شریک ہونا وغیرہ اور کچھ مخبروں کے من گھڑت الزامات عائد کئے گئے تھے۔ جس کی بنا پر مولانا صاحب جلاوطن ہوئے۔ چنانچہ منشی ذکاء اللہ صاحب نے بھی اس بات کی مذکورہ عبارت میں تصدیق کی ہے کہ وہ ان کو اس بغاوت کی سبب جلاوطنی کی سزا ملی تھی"۔

مولانا پر جب مقدمہ چلایا گیا تو اس کی باقاعدہ پیروی کی گئی مقدمہ کے خاص پیروکار منشی کرم احمد خیرآبادی تھے اور مولانا کے صاحبزادے مولوی عبدالحق نے بھی مقدمہ کی پیروی کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہیں رکھا تھا ان کی ہی درخواست پر مولوی نبی بخش، مولوی قادر بخش اور مولوی سید فضل حسین مولانا کی صفائی دینے کے لئے لکھنؤ آئے تھے چنانچہ ان حضرات کا ذکر اور مقدمہ سے رہائی کی امید کا اظہار منشی کرم احمد خیرآبادی نے سید اعظم علی کے ایک خط میں کیا ہے۔[۱]

مقدمہ کی شنوائی کے لئے جو حضرت مقرر کئے گئے تھے وہ انگریز تھے ان سے بھلائی ورہائی کی امید کرنا بے معنی تھی چنانچہ مولانا فضل حق خیرآبادی نے اس مجسٹریٹ وجج کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔[۱]

"میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا جو مظلوم پر رحم کرنا ہی نہ جانتا تھا۔ اس ظالم حاکم نے میری جلاوطنی اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا اور میری کتابیں جائداد، مال ومتاع اور اہل وعیال کے رہنے کا مکان غرض ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔"

اس فیصلے کے بعد مولانا کو جزیرہ انڈمان روانہ کر دیا اور مولوی عبدالحق اور مولوی شمس الحق نے خواجہ غلام غوث میرمنشی لفٹننٹ گورنر مغربی وشمالی کی اعانت سے اس مقدمہ کے خلاف اپیل کی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی، ماتحت عدالت کا فیصلہ ہی بحال رہا۔ مصیبت میں دوست وآشنا عزیز واقارب بھی کترانے لگتے ہیں چنانچہ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں مرزا یوسف کو اپیل کی نامنظوری کی اطلاع تو دی ہے لیکن بچتے بچاتے، ان کا نام نہیں لکھا صرف لفظ مولانا پر اکتفا کیا ہے۔[۲]

مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ تم مجھ سے معلوم کرو مرافعہ میں حکم دوام حبس بحال رہا بلکہ

---

[۱] ملاحظہ ہو الثورۃ الہندیہ ص ۱۷۰، [۲] اردوئے معلی ص ۳۲۴۔

تاکید ہوئی ہے کہ جلد دریائے شور کی طرف روانہ کر و۔ چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا بیٹا ولایت میں کیا چاہتا ہے کیا ہوتا ہے سو ہونا تھا ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

مولانا فضل حق کی دوستی اس قدر مضبوط و گہری تھی کہ ان کی یاد مرزا غالب کے دل سے نہیں جاتی تھی۔ جب مرزا غالب کو معلوم ہوا کہ میاں داد خاں سیاح کلکتہ میں ہے تو ان سے مولانا فضل حق کے بارے میں ایک خط کے ذریعہ دریافت کرتے ہیں۔

"ہاں خاں صاحب آپ جو کلکتہ پہنچے ہو اور سب صاحبوں سے ملے تو مولوی فضل حق کا حال اچھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرہ میں اس کا کیا حال ہے گزارا کس طرح ہوتا ہے۔"

مولانا فضل حق پر ہندوستان کی جیلوں اور کالے پانی میں کیا گذری، کیا کیا مصائب برداشت کئے انگریزی حکام نے کس طرح دل کھول کر ان سے بدلہ لیا، یہ درد ناک داستان مولانا کی زبانی سنئے جو انھوں نے قصائد فتنۃ الہند میں تحریر فرمایا ہے۔

"جب میں قیدی بن کر ان کا اطاعت گزار نہ بنا تو ان کی طرف سے رنج و تکلیف میں اور بھی زیادتی کردی گئی انھوں نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا میرے رات دن سخت گرمی میں اور اندھیری میں گذرتے ہیں گویا کہ سخت موسم گرما کے دن اور آخر ماہ کی اندھیری راتیں ہیں رات تو دوامی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی صبح نہیں ہے اور نہ دن کے لئے شام اور رات ہی ہے مجھے جب تصرفات سے روک کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا جس میں زہریلی ہوا کے سوا اور کسی قسم کی ہوا نہ پہنچ سکتی تھی کیسی مصیبت تھی، اس کی کوٹھری کی دیواریں انسانی اعضاء کو بھونتی تھیں اور اس کی مٹی تپتی ہوئی زمین تھی۔ کیسا پریشان کن قید خانہ تھا، نہ تو اس کے میدان میں پیشاب خانہ تھا نہ اس کے پاخانہ میں آب دست خانہ تھا۔ انھوں نے سختی کے ساتھ، دوستوں، بھائیوں، اور بیٹوں کو مجھ سے ملنے سے روک دیا میرے کپڑے چھین کر مجھے تہبند اور کملی پہننے کے لئے دے دی گئی، کپڑے اتار کر قیدیوں کی کملی پہنادی میرے پاس اس خراب کملی کے سوا کوئی دوسری چادر نہ رہی، میرے برتن، اور جوتے بھی ظلماً چھین لئے میرے

استعمال کے لئے کوئی برتن، اور پیالہ بھی باقی نہ چھوڑا... ظلم و ستم کے لئے میری قید ہی کافی نہ سمجھی گئی بلکہ جلاوطنی، اور غربت، مسافرت کی سزا بھی دی۔ قید کر کے مجھے رات میں ایسے پہاڑ پر لے گئے جہاں بہت قیدی ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس پہاڑ کی گھاٹیوں کو دریا گھیرے ہوئے ہیں موت کے سوا اس کا کوئی صحن نہیں یہاں کی آب و ہوا ناموافق اور آنے والے کے لئے وبال ہے۔ وبائیں ہر طرف عام ہیں۔ یہاں شریف ذلیل و گریہ کناں ہیں، دوا ناپید اور بیماریاں بے شمار ہیں اس کی گھاٹیوں میں عفونت و ہلاکت عام ہے اس میں دوا دارو بھی بیماری میں اضافہ کرتی ہے اس میں نہ تو پیاسے کے حلق سے پانی اترتا ہے اور نہ بھوکے کو غذا اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ماش کی دال غذا ہے، گوشت و پیاز، ترکاری، ککڑی کچھ میسر نہیں وہ دریا کا کنارہ ہے جہاں میدان گیہوں اور شیرینی کسی چیز کا پتہ نہیں قیدیوں کے گروہ کے گروہ مر چکے ہیں جو بچے ہوئے ہیں وہ نہ مردوں میں ہیں نہ زندوں میں، میت کی نماز جنازہ، قبر، کفن اور پوشش کا یہاں کوئی سوال نہیں وہ ایسی خراب جگہ ہے جہاں طاقت ور انسان پر بھی رہنے کے بعد زردیتوں کا غلبہ ہو جاتا ہے قیدیوں کو ایسی مشقت میں مبتلا کیا گیا کہ ان کی ایذا ہلاکت کے درجہ تک پہنچ گئی۔ بلاؤں اور سختیوں نے انھیں ہلاک کیا چکی دار و مصیبتوں نے رنج میں مبتلا کر دیا۔ انھوں نے مجھے ایسے مہلکہ میں ڈال دیا جہاں ان بن زمین ہے نہ آسمان، آسمان ہے اس کا قریبی آسمان وہ بادل ہے جن کی بارش غموں کا سیلاب ہے اور اس کی زمین سنگریزے ہیں اس میں بارش نہیں ہوتی گرمی کی شدت سے فضا آسمانی سے بخارات کا پسینہ گرنے لگتا ہے۔ بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا ہے جس کی وجہ سے دن میں سورج اور رات کو چاند نظر نہیں آتا۔ رات میں اندھیرے پر اندھیرا چھایا رہتا ہے اور دن اندھیری رات کی طرح ہے اس کے سیاہ افق پر کسی نے چاند نکلتا نہیں دیکھا اور نہ گرگٹ ہی سورج دیکھ سکا وہ خود تاریکی سے اور تاریک دریا سے گھرا ہوا ہے اس دریا میں نہ موتی ہے نہ روشنی یہاں نہ گرمی ہے نہ جاڑا... مجھے ظلماً اہل و وطن سے اچانک دور کر دیا گیا میری کمزور و نحیف ذریت کو بھی نہ چھوڑا ان کو زبردستی ان کے مکان سے نکالا گیا۔ ان کے لئے آرام و سکون کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی وہ مسکین و فقیر بن گئے کیوں کہ مکان روزی اور کوئی چیز بھی ان کے

لیے نہیں رہتی میں نے انھیں حالت گرسنگی میں چھوڑا نہ ان کے پاس مال و دولت ہے نہ مسکن و منفعت
اقربا اپنے، بیگانے بن کر علیٰحدہ ہو گئے اور برابر والوں نے ظلم و ستم اختیار کیا۔ میرے خاندان اور اعزا
کو قید و بند نے دور کر دیا اب یہاں پانی کے سوا کوئی دوست نہیں ہے۔ میرے بیٹوں سے میری خبریں
ایسی پوشیدہ ہیں جیسی ان کی مجھ سے مجھے وحشیوں میں بسا دیا گیا ہے۔ اس قید خانہ (جزیرے)
میں دو قسم کے وحشیوں اور اجنبیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی آب و ہوا ناموافق اور وبائی ہے
میری مصیبت میں میرے بدن کے عارضوں قولنج، فتق (فوطوں میں پانی اترنا) اور قوبا (داد) نے
اضافہ کر دیا ہے۔" (۴۳۶ تا ۴۴۵)

مولانا فضل حق ان مصیبتوں میں مبتلا تھے جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک شریف و علم نواز انگریز
تھا جو مولانا کی قابلیت ولیاقت سے واقف نہیں تھا۔ اسی زمانہ میں اس کی منشی میں ایک قیدی
مولوی صاحب تھے، اس نے ایک فارسی کی کتاب جو ہیئت پر تھی ان کو اس کی عبارت کی
صحت و درستگی کے لئے دی۔ مولوی صاحب کی بس کی بات نہیں تھی خود اصلاح نہ کر سکے، مولانا سے عبارت درست کرائی
مولانا نے عبارت کی درستگی کے ساتھ حاشیہ پر اور بہت سے مسائل کا اضافہ کر دیا اور کتابوں کے حوالے
بھی لکھ دیئے جب یہ کتاب سپرنٹنڈنٹ نے دیکھی تو بہت خوش ہوا داد و تحسین دی مولوی صاحب
نے حقیقت بیان کی تو مولانا سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ مولوی صاحب اس کو مولانا کی
بارک میں لے گئے، مولانا وہاں تشریف فرما نہیں تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے انتظار کیا تھوڑی
دیر کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ آپ بغل میں ٹوکرا دبائے چلے آرہے ہیں اس حالت کو دیکھ کر
آبدیدہ ہوا معذرت چاہی اور آپ کو کلرکی میں لے لیا۔ اور گورنمنٹ سے سفارش بھی کی ادھر
مولانا کے صاحب زادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر رہا کرانے کی سعی میں تھے۔
پروانہ رہائی حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈمان پہنچے۔ جہاز سے اترے تو معلوم ہوا کہ مولانا کل،
۱۲ر صفر ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء کو فوت ہو چکے ہیں۔

ہندوستان اور یونسکو

انجمنِ اقوام متحدہ کا تعلیمی سائنسی اور تہذیبی ادارہ جس کا انگریزی میں مختصر نام یونسکو ہے، ۱۹۴۶ء میں قائم ہوا۔ ہندوستان اس کا ایک اساسی رکن ہے۔ اور اس کی متنوع بین الاقوامی سرگرمیوں میں برابر تعاون کرتا رہا ہے۔ اس ادارے کے ساتھ اشتراکِ عمل کو فروغ دینے کی غرض سے ۱۹۴۹ء میں حکومت نے ایک عارضی کمیشن مقرر کیا جسے ۱۹۵۱ء میں مستقل حیثیت دے دی گئی۔ مرکزی وزیر تعلیم اس کمیشن کے صدر ہیں۔ دو سال ہوئے کہ کمیشن کی چوتھی کانفرنس میں غیر سرکاری قومی جماعتوں کے تعاون پر زور دیا گیا تھا کمیشن کی پانچویں کانفرنس ۲۶ ستمبر ۱۹۶۲ء کو دہلی میں منعقد ہوئی اور تین روز تک جاری رہی۔ اس موقع پر مرکزی وزیر تعلیم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ اب اس کمیشن کی تنظیم میں خاطر خواہ وسعت پیدا کر دی گئی ہے اور 'یونسکو' کے روز افزوں مشاغل کے پیش نظر اس کے پانچ ذیلی کمیشن بھی بنا دئے گئے ہیں جو 'یونسکو' کے پانچ اہم میدانِ عمل یعنی 'تعلیم' 'طبیعی علوم' 'سماجی علوم' 'علم و ادب' منجملہ تہذیبی مشاغل' اور خبر رسانی کے عام روابط' سے متعلق معاملات میں تعاون کریں گے۔

'یونسکو' کا نصب العین نوعِ انسانی کو امن و آشتی کی ضرورت سے آگاہ کرنا اور اشتراکِ عمل کے ذریعے سے بین الاقوامی مفاہمت پیدا کرنا ہے۔ غالباً اس بات سے عموماً لوگ واقف نہیں ہیں کہ یہ ادارہ افریقہ اور ایشیا کے اُن ممالک میں تعلیمی توسیع و ترقی کے کاموں میں کس قدر دستگیری کر رہا ہے جو اپنی بچھڑی ہوئی حالت کو چھوڑ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہندوستان، یونسکو کے چند اہم خصوصی منصوبوں میں بھی شریک ہے۔ جنوبی ایشیا میں صنعتی ترقی کے سماجی اثرات کی تحقیق کرنے کی غرض سے ایک علاقائی مرکز ۱۹۵۶ء میں کلکتہ میں قائم کیا گیا تھا۔ اب اس مرکز کے مقاصد میں سماجی اور معاشی ترقی کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور اب وہ دہلی منتقل ہو گیا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں بنجر زمینوں

کے بارے میں سائنسی تحقیق کا ایک منصوبہ تیار ہوا۔ اس وقت سے ہندوستان اس منصوبے میں برابر پرجوش عملی تعاون کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں بنجر زمینوں سے متعلق ایک مرکزی تحقیقی ادارہ جودھپور میں قائم کیا جاچکا ہے۔ مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات کی باہمی قدر شناسی کے بڑے منصوبے میں بھی ہندوستان نے نمایاں طور پر شرکت کی ہے۔ بین الاقوامی مفاہمت اور تعاون کی اسپرٹ کو ابھارنے کے لئے 'یونسکو' کے زیر اہتمام مختلف ممالک میں چند منتخب مدارس اور ٹریننگ کالج کئی سال سے پروجیکٹ 'چلا رہے ہیں۔ اس وقت ہندوستان کے نو ثانوی مدارس اور تیرہ ٹریننگ کالج اس میں شرکت کر رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ طلبہ کے دلوں سے تہذیبی مغائرت نکلے اور ان میں کشادگی قلب ونظر پیدا ہو سکے۔

۱۹۶۱ء میں ٹیگور کی صد سالہ سال گرہ کی عالمی تقریبات اور رام کرشنا مشن انسٹی ٹیوٹ کی مشرق و مغرب کی تہذیبی کانفرنس' میں 'یونسکو' کا پُر خلوص تعاون بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ 'یونسکو' کے نزدیک بین الاقوامی مفاہمت اور تہذیبی لین دین کی کتنی اہمیت ہے۔ دہلی میں ایک علاقائی مرکز جنوبی ایشیا میں طبعی علوم کے معاملات میں تعاون کی راہیں استوار کرنے کی غرض سے ۱۹۴۸ء میں قائم ہو چکا ہے اسی ادارے کی طرف سے بحرِ ہند کی بین الاقوامی مہم کی تنظیم کی گئی ہے یہ بحر اعظم طول ارض کا ساتواں حصہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور دنیا کی ایک چوتھائی آبادی اس کے ارد گرد بستی ہے۔ وہ حیوانی اور نباتاتی دنیا کے عجائبات کا مخزن ہے۔ اس مہم کے کامیاب ہونے کی صورت میں اس بحر اعظم سے ملحق سب ہی دیسوں کو بڑے فوائد حاصل ہوں گے اس مہم کے تحت جو کچھ کام کوچین میں ہو رہا ہے، اس میں 'یونسکو' کی پوری اعانت وعنایت ہمارے ساتھ ہے۔ علاوہ ازیں مدراس میں چمڑے کی تحقیق کے قومی انسٹی ٹیوٹ، بنگلور میں سائنس انسٹی ٹیوٹ، احمد آباد میں کپڑے کی تحقیقی ایسوسی ایشن اور کھرگ پور و بمبئی کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کو بھی 'یونسکو' مختلف عنوانات سے امداد بہم پہنچا رہا ہے۔

۱۹۶۰ء کے آغاز پر پندرہ ایشیائی ممالک نے 'یونسکو' کی سرگرمی میں بیس سالہ کراچی

منصوبے' کا آغاز کیا۔ یہ ممالک افغانستان سے لے کر فلپائن تک پھیلے ہوئے ہیں جن کی مجموعی آبادی کے بارے میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۸۰ء تک گیارہ ہزار آٹھ سو پچاس' لاکھ ہو جائے گی اور اس منصوبے کے تحت توقع کی جاتی ہے کہ ۱۹۸۰ء تک سات سال کی مفت اور لازمی تعلیم دو ہزار تین سو ستر لاکھ بچوں کو دی جا سکے گی۔ اس وقت بمشکل چھ سو لاکھ بچے چار یا پانچ سال کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ 'کراچی منصوبے' نے ایشیا میں تعلیمی ترقی کے ایک نئے باب کا آغاز کیا ہے۔ اس سلسلے میں 'یونسکو' نے چار علاقائی مرکز قائم کئے ہیں۔ ان میں سے ایک دہلی میں قائم کیا گیا ہے۔ اس مرکز میں ابتدائی تعلیم کے اعلیٰ ماہرین تربیت پائیں گے تاکہ وہ اپنے اپنے ممالک میں تعلیمی رہنمائی کے فرائض بخوبی انجام دے سکیں۔ کام کا اندازہ لگانے کی غرض سے ایک 'یونسکو سمپوزیم' اس سال کے آغاز پر دہلی میں منعقد کیا گیا تھا اور جون کے مہینے میں 'کراچی منصوبے' کے معاملات و مسائل کا جائزہ لینے کے لئے متعلقہ ممالک کے وزرا تعلیم کی ایک میٹنگ ٹوکیو میں ہوئی تھی۔ اس موقع پر یہ احساس کچھ اور قوی ہو گیا کہ تعلیم نہ صرف ایک شہری کا بنیادی حق ہے بلکہ اس کے ذریعے معاشی حالت بھی سدھرتی ہے۔ اور یہ بات تسلیم کی گئی کہ سماجی اور معاشی ترقی کے ایک جزو کی حیثیت سے تعلیم کی ایک مبسوط اسکیم تیار کی جائے جس میں ۱۹۸۰ء تک تعلیمی اخراجات کو بڑھا کر قومی میزانیہ کا پانچ فیصدی کر دیا جائے۔ اس اضافہ کی اہمیت کا اندازہ اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جو کہ 'کراچی منصوبے' میں شریک ہونے والے ممالک میں ایک نہایت ہی ترقی یافتہ ملک ہے، اس وقت اپنے قومی میزانیہ کا تقریباً دو فیصدی سے کچھ زائد تعلیم پر صرف کر رہا ہے اور ابتدائی تعلیم پر کل تعلیمی اخراجات کا پینتیس فیصدی صرف ہوتا ہے۔ اب اگر تدریجی ترقی کے ساتھ ۱۹۷۵ء تک ابتدائی تعلیم کے اخراجات کل تعلیمی اخراجات کے آدھے کر دئے گئے جو کہ قومی میزانیہ کا صرف دو فیصدی ہوں گے تو گیارہ سال تک کے تمام بچے مفت اور لازمی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ اس وقت روس میں قومی میزانیہ کا تقریباً سات فیصدی تعلیم پر صرف ہوتا ہے اور یہ دنیا کا سب سے اعلیٰ معیار ہے۔ اپنے مختلف مشاغل اور مقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں 'یونسکو' کی طرف سے ہمیں پچھلے سال تک پچھتر لاکھ ڈالر سے بھی کچھ زائد رقم مل چکی ہے۔ ثانوی تعلیم کی منزل پر اس وقت 'نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن' اور اس سے

متعلق چار علاقائی کالجوں میں سائنس کی تدریس کے طریقوں کو بہتر بنانے کے لئے یونسکو نے مدد دینے کا فیصلہ کیا ہے
اسی طرح اعلیٰ تعلیم میں تحقیقی کام کے لئے بھی ہمیں یونسکو سے مدد ملے گی۔ امید کی جاتی ہے کہ ۱۹۶۳ء سے لے کر ۶۵ء
تک کے عرصے میں یونسکو کے ذریعے دی گئی مالی امداد غالباً بیس لاکھ ڈالر تک پہنچ جائے گی۔

اس مرتبہ یونسکو کے قائم مقام ڈائرکٹر جنرل رین ماہیو بھی 'انڈین نیشنل کمیشن' کی کانفرنس میں شریک
تھے جنھوں نے اپنے خطبے میں ہندوستان کے تعاون کو بہت سراہا۔ کانفرنس کے آخری روز تعلیم اور
روایتی اقدار' کے موضوع پر ایک دلچسپ سمپوزیم' منعقد ہوا جس کا افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر
جمہوریہ ہند نے فرمایا۔ اس میں بارہ مختلف ماہرین تعلیم اور عالموں نے اپنے اپنے مقالات مباحثے کے
لئے پیش کیے جن میں یونسکو کے قائم مقام ڈائرکٹر جنرل اور ہمارے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب
کے مقالات بھی شامل ہیں۔

ہمارے اس دورِ ترقی میں جبکہ فکرِ انسانی نے فضا سے لے کر خلا تک سب کچھ تسخیر کر لیا ہے اور اس کی
راہ میں نہ 'تعرِ دریا' حائل رہا ہے۔ اور نہ 'پہنائیٔ فلک' سفینۂ حیات ایک ایسی منزل پر آ لگا ہے کہ انسان
خود اپنی 'عظمت کا کفن' سیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان حالات میں صرف 'یونسکو' جیسے ادارے ہی
شعاعِ امید سے انسانی دل و دماغ کو منور کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ہماری ذمہ داری دوسروں سے
کچھ زائد ہی ہے کیونکہ ہماری سرزمین پر کرشن کی منسی بجی ہے، یہاں پر گوتم نے دھیان گیان کیا ہے
یہاں چشتی نے 'پیغامِ حق' سنایا ہے اور نانک نے 'وحدت کا راگ' گایا ہے۔ یہاں گاندھی نے اہنسا
اور پریم کا پرچار اپنے خونِ جگر سے کیا ہے۔ ہمیشہ سے یہاں کے بھگتوں کے گیت میں شکتی اور شانتی
کے نغمے گونجتے رہے ہیں اور ہمیشہ یہی پیغام ملا ہے کہ دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے، لہٰذا
ہمیں پورے خلوصِ نیت کے ساتھ ایسے نظام کے لئے جد و جہد کرنا ہے جو محبت و مروت اور اشتراک و اتحاد پر
قائم ہو۔ ہمیں یہ اعتماد رکھنا چاہیئے کہ فضائے عالم میں گھلائے اخوت و یگانگت کی مہک جلد پھیلے گی
اور یہ بات یقینی ہے کہ اس عظیم و برتر کام میں 'یونسکو' کا ایک نمایاں مقام ہوگا۔

نمودِ صبح کاذب ہی دلیلِ صبح صادق ہے — افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

"معظم"

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی — مطبوعہ یونین پریس دہلی — ٹائٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۷ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۶۲ء | شمارہ ۶

فہرست مضامین

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

بہادر شاہ ظفر

از ڈاکٹر ذاکر حسین ——— ترجمہ: ڈاکٹر سید عابد حسین

آج سے پورے سو سال پہلے، ۷ نومبر کو بہادر شاہ ظفر اپنی پیاری دلی اور اپنے محبوب لال قلعہ سے دور رنگون میں بے کسی اور تنہائی کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ زمانے کے نشیب و فراز اور زندگی کی دھوپ چھاؤں پر غور کرتے ہوں گے تو انھیں اپنے ذی ہوش اور منچلے بزرگوں کے کارنامے یاد آتے ہوں گے جنھوں نے ہندوستان میں ایک ایسی وسیع سلطنت تعمیر کی جو ہندوکش سے کاویری تک پھیلی ہوئی تھی، جس کی بے شمار دولت، بے مثل صنعت و حرفت اور بے نظیر خوشنما اور شاندار عمارتوں کی سارے سنسار میں دھوم تھی، جس کے علوم و فنون، شاعری اور موسیقی کا دیش بدیش چرچا تھا۔ اس سلطنت کے نظم و نسق کی عمارت گاؤں پنچایت کے پرانے خود اختیاری نظام پر قائم تھی اور منزل بہ منزل سرکار، ضلع، صوبے اور مرکزی حکومت تک جس کا فرماں روا شہنشاہ تھا۔ اٹھتی چلی گئی تھی، اس کے حکمرانوں نے دانش مندی سے کام لے کر اپنی ساری رعایا کی حمایت حاصل کر لی تھی، اور وہ ہندو مسلمان دونوں کو اپنے قصر حکومت کے ستون سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستانی علم و حکمت اور فنون لطیفہ کے قدردان اور سرپرست تھے اور ان کے زمانے میں دیسی بھاشاؤں، برج بھاشا اودھی اور بنگلہ نے بہت فروغ پایا اور سور، تلسی، بہاری اور کاشی رام کے لافانی کلام سے ہندوستانی ادب کو مالا مال کر دیا۔

بہت سے نیک اور پرہیزگار بزرگوں نے جن میں بعض شہنشاہ بھی شامل تھے اس بات کی کوشش کی کہ مختلف مذہبی عقیدوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک مشترک زندگی

کی بنیادیں رکھیں۔ وہ صلح کل کے مسلک کو اپنا کر ایک ایسی راہ نکالنا چاہتے تھے جس پر سبھی سالک دوش بدوش چل سکیں اور سعادت کی ابدی منزل تک پہنچ سکیں۔

پھر بہادر شاہ ظفر یہ سوچتے ہوں گے کہ خدا کے بھید خدا ہی جانتا ہے اور تقدیر کا لکھا اٹل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آپس کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے، بھائی بھائی سے لڑنے لگا۔ ایک ذات دوسری ذات کی، ایک مت دوسری مت کی خون کی پیاسی ہو گئی اور ہزاروں میل دور سات سمندر پار سے ایک بدیسی قوم آئی، اور آپس کی پھوٹ سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی مالک بن بیٹھی۔

اس ناٹک کے آخری سین میں خود بہادر شاہ محض تماشائی نہیں بلکہ خود ایکٹر کی حیثیت سے بہت اہم حصہ لے رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سلطنت آنے والی بلا کو ٹالنے کا موقع کھو چکی تھی۔ مگر اس کی دو سو سال کی شان و شوکت کی گہری چھاپ ہندوستانی قوم کے دلوں پر موجود تھی۔ اٹھارھویں صدی میں مغل شہنشاہ کی سیاسی طاقت برائے نام رہ گئی تھی، پھر بھی اس کے نام کا اور اس خاندان کی روایات کا جادو اب تک کام کرتا تھا۔ پرانے راجپوت راجا اب بھی دہلی کے دربار سے خطاب اور خلعت پاتے تھے، مرہٹہ پیشوا اور ان کے سردار اب بھی اس کی عنایات سے سرفراز ہوتے تھے۔ خود مختار صوبہ دار اب تک اپنی غصب کی ہوئی حکومت پر جواز کا پردہ ڈالنے کے لئے سندیں حاصل کرتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل اب بھی اپنے آپ کو شہنشاہ کا فدوی کہتا تھا۔ سنے بادشاہ کی تخت نشینی سے اب بھی سنہ جلوس شروع ہوتا تھا۔

بہادر شاہ ظفر اکتوبر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۷ء میں تخت سلطنت پر بیٹھے۔ ان کی قلمرو لال قلعہ کی دیواروں تک محدود تھی۔ سلطنت کی بس ایک پرچھائیں رہ گئی تھی اور دربار کی حیثیت جھگڑالو، بیکار شہزادوں، مرشد زادوں، درباریوں اور چوبداروں کی ایک بھیڑ سے زیادہ نہ تھی۔ اس اداس گھٹتے ہوئے ماحول میں بہادر شاہ اپنے جاہ و منصب کے وقار کو قائم رکھنے اور اپنے بزرگوں کی تہذیبی روایات کو نبھانے کی اپنی سی کوشش کرتے تھے۔

لال قلعے میں اب بھی اہل سخن اور اہل قلم کا جمگھٹ رہا کرتا تھا۔ دہلی والوں کے محبوب میلوں اور تہواروں کو پہلے کی طرح اب بھی دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ بادشاہ کے جلوس کو دیکھ کر اب بھی لوگوں کو سلطنت کی عظمتِ رفتہ یاد آجاتی تھی۔ اور اس کے دم قدم سے شہر کے آس پاس باغوں اور سبزہ گاہوں کی رونق کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ خزانے میں روپے پیسے کا توڑا تھا۔ پھر بھی خانقاہوں اور دھرم شالوں، غریبوں اور محتاجوں کے لئے تھیلیوں کے منہ کھلے ہوئے تھے۔

بہادر شاہ ظفر علم دوست اور شاعر تھے اور ان کے وقت کا بڑا حصہ ادبی مشاغل میں گزرتا تھا۔ وہ کئی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے اور فارسی، اردو، ہندی اور پنجابی میں شعر کہتے تھے۔ ان کے اردو و ہندی کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فن کی باریکیوں کو سمجھتے تھے، ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور محاورے اور روزمرہ کے استاد تھے۔

بظاہر ان کی پرسکون زندگی کا بندھا ہوا ڈھرا بدلنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی مگر ہندوستانی زندگی کی خاموش اور ساکن زندگی کی سطح کے نیچے بے چینی اور شورش کا ایک طوفان چھپا ہوا تھا۔ ان حکمراں خاندانوں کے سینوں میں جو اپنے تاج و تخت سے محروم کردئے گئے تھے، انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ عام لوگوں کو یہ شکایت تھی کہ حکومت کی پالیسی جبر و تشدد پر مبنی ہے انصاف مہنگا ہے، عدالت کی کارروائیوں میں بہت دیر لگتی ہے اور بڑی ذلت اٹھانی پڑتی ہے وہ اپنے دین دھرم، ذات پات کو بدیسی حکمرانوں کے ہاتھوں خطرے میں پاتے تھے۔ اور ان کی خود پسندی اور غرور سے بیزار تھے۔ یہ مادہ جو اندر ہی اندر پک رہا تھا ۱۸۵۷ء کی زبردست شورش کی شکل میں پھوٹ نکلا۔

اس مہیب، اور خطرناک مہم کی رہنمائی کے لئے لوگوں نے ہندوستان کی عظمت رفتہ کے نشان سلطنت کے نام نگین کے وارث، اکبر اور شاہجہاں کے جانشین بہادر شاہ کو چنا۔ زبانِ خلق سے ایسی دعوت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے اور جنھیں ملتی ہے ان میں بھی بہت کم ہیں جو سود و زیاں کے اندیشے سے بے نیاز ہو کر اس پر لبیک کہتے ہیں۔ مگر بہادر شاہ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا

اور بجی شاہانہ شان سے بنھایا۔ وہ محاصرۂ دہلی کے یادگار زمانے میں جنگ آزادی کے روح رواں بن گئے۔ لڑنے والی فوج کی ہمت بڑھائی، اس کے لئے مالی وسائل فراہم کئے اور ان پُرآشوب دنوں میں شہری امن قائم رکھا۔

اس آزمائش کے موقع پر ان کے دل میں بس ایک ہی لگن تھی کہ جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اسے پورا کرنے میں کوئی کوشش اور کوئی تدبیر نہ اٹھا رکھیں۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ شہزادوں کی نااہلی اور خود پسندی سے کامیابی خطرے میں پڑ گئی ہے تو فوج کی کمان ایک قابل اور آزمودہ کار سپہ سالار جنرل بخت خاں کے ہاتھ میں دے دی۔ فوجی اور ملکی امور کے انجام دینے کے لئے ایک انتظامی کونسل قائم کی، جو ہو بہو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل کی کونسل کا نمونہ تھی۔

مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے والوں کی ناپاک کوششوں کو چلنے نہیں دیا۔ وہ ساری عمر اپنی خاندانی روایات کے مطابق ہندوؤں کے تہوار رکشا بندھن، بسنت، ہولی، دیوالی اس طرح مناتے آئے تھے جیسے یہ ان کے اپنے تہوار ہوں۔ ان کا قول تھا: "اگر مسلمان مجھے ایک آنکھ کی طرح عزیز ہیں تو ہندو بھی دوسری آنکھ کی طرح پیارے ہیں۔" چنانچہ انھوں نے محاصرے کے زمانے میں اپنے ہندو سپاہیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے گاؤکشی کی ممانعت کر دی اور یہ فرمان جاری کیا کہ جو لوگ فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کریں گے انھیں سخت سے سخت سزا دی جائے گی۔

ان کی یہ بے نفسی بھی یادگار رہے گی کہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ اپنے لئے کوئی منصب نہیں چاہتے اور تحریک آزادی کے کارکنوں پر چھوڑ دیں گے کہ ملک کے مستقبل کے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کریں۔

بہادر شاہ نے ملک کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا، اور وہ ہار گئے، ہاں وہ ہار گئے، مگر اس لڑائی کا جو آزادی کو حاصل کرنے کے لئے اور اس لڑائی کا جو آزادی کو قائم رکھنے کے لئے لڑی جاتی ہے، انجام ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اور وہ فتح ہے آزادی کے علمبرداروں

کی۔ بیشک بہادر شاہ ہار گئے، مگر جو تحریک انھوں نے شروع کی تھی وہ دھیرے دھیرے بڑھتی گئی، پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ نوے سال بعد کامیاب ہو کر رہی۔ آزادی کی جدوجہد جب شروع ہوتی ہے تو نفع نقصان کا کھاتہ نہیں کھولا جاتا۔ آزادی وہ قدرِ اعلیٰ ہے جو ہر قیمت پر سستی ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر زندگی میں اخلاقی ذمہ داری نہیں رہتی، بلکہ سچ پوچھئے تو زندگی زندگی نہیں رہتی، آزادی کے بغیر زندہ رہنا موت سے بدتر ہے۔ آج ہمارا بڑا کڑا مقابلہ ہے اس ہمسائے سے جس کے ساتھ امن و عافیت سے رہنے اور دوستی کے نبھانے میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر ہم اس آزادی کی جسے ہم نے اپنا خون پسینہ ایک کرکے حاصل کیا ہے، حفاظت کرنا بھی جانتے ہیں۔ ہماری قوم کا یہ عزم کہ ہم مرتے مر جائیں گے مگر آزادی کا سودا نہیں کریں گے ہماری کامیابی کی کافی ضمانت ہے، لڑائی کتنی ہی کڑی کتنی ہی کٹھن کیوں نہ ہو ہم فتح کی منزل پر پہنچ کر دم لیں گے۔ ہاں بہادر شاہ ہار گئے کہ ہماری جیت کے لئے راہ کو ہموار کر دیں ہاں، وہ ہار گئے۔ ان کے بیٹوں کو بے دردی سے ان کی آنکھوں کے سامنے گولی مار دی گئی، ان کو ذلیل کیا گیا اور ایک برطانوی عدالت کے سامنے، جس کو قانون کی رو سے ان پر کوئی اختیار نہ تھا، ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ انھیں جلاوطنی کی سزا سنائی گئی اور قید کرکے رنگون بھیج دیا گیا، جہاں وہ اپنے گھر بار سے دور، بہت دور تھے، جہاں ان کا کوئی عزیز، کوئی دوست ان کی خدمت اور دلجوئی کے لئے نہ تھا۔ ان کی زندگی کے یہ آخری دن رنج و مصیبت کے دن تھے، مگر ان کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہیں آیا اور وہ اس آزمائش سے صبر و وقار کے ساتھ گزرے۔ ان کا یہ راضی بہ رضا رہنا ان کی روحانی رفعت کی دلیل ہے۔ ان کے اہلِ وطن انھیں شکر گذاری کے جذبے کے ساتھ یاد رکھیں گے کہ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑی ہمت کی اور بہت دکھ اٹھائے۔ مجھے امید ہے کہ سارے ہندوستان میں ان کی صد سالہ برسی ان کے شایانِ شان اس آہنی عزم کے ساتھ منائی جائے گی کہ ہم سب کندھے سے کندھا جوڑ کر حملہ آور قوت کا مقابلہ کریں گے اور اس آزادی کی حفاظت کے لئے جو ہم نے بہت کٹھنائیاں اٹھا کر حاصل کی ہے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ جے ہند

(انگریزی سے ترجمہ)
بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی

غزل

بہادر شاہ ظفر مرحوم

کہاں خلقت عزیزد زیرِ چرخِ پیر پھرتی ہے
یہ فانوسِ خیالی میں ہر اک تصویر پھرتی ہے

نہ چرخِ آسیا ہوں، نے بھنور ہوں، نے بگولا ہوں
مجھے تو کیوں لئے اے گردشِ تقدیر پھرتی ہے

ہوا ہے جوشِ گل سے جوشِ وحشت اس قدر پیدا
کہ ہر موجِ ہوا لیتے ہوئے زنجیر پھرتی ہے

تمہیں آتا ہی زیرِ چرخ خواب اے غافلو کیوں کر
کہ شب کو کہکشاں کھینچے ہوئے شمشیر پھرتی ہے

اترتے ہیں گلے میں گھونٹ آبِ زندگانی کے
چھری جب حلق پر قاتل دمِ تکبیر پھرتی ہے

ظفر کو منزلِ مقصود پر تقدیر لے پہنچی
کدھر بھٹکی ہوئی یہ عقلِ بے تدبیر پھرتی ہے

قومی دفاع اور ہماری ذمّہ داریاں

از: پروفیسر محمد مجیب   ترجمہ: عبداللطیف اعظمی

ہم نے اپنی قومی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹا ہے، ہماری شمالی سرحدوں پر حملہ کیا گیا ہے، اور ساری قوم حملہ آور کا مقابلہ اور اس کو پسپا کرنے کے لئے متحد ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس حملے سے ہمیں صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن اس صدمہ سے زیادہ شدید اس بات کا صدمہ ہے کہ ہماری دوستی کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے اور ہمارے جذبۂ خیر سگالی کو پیروں سے کچلا گیا ہے۔ اس لئے اپنی حکومت کا ہاتھ بٹانے کے لئے اپنی فوج کے حوصلے کو بڑھانے کے لئے اور اپنے وطنِ عزیز کی مدافعت میں سب کچھ نچھاور کرنے کے لئے ہم سب ایک ہو گئے ہیں۔ اس لڑائی نے ہم سب کو ایک جسم اور ایک دماغ کی طرح کام کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔

ہم نے نہ صرف اپنے لئے بلکہ دنیا کی تمام قوموں کے لئے امن کی خواہش اور کوشش کی تھی اور اس خواہش اور کوشش کی بنا پر یہ سمجھنا کہ امن قائم رہے گا کوئی غلطی نہیں تھی، اب بھی ہم کو یہی سمجھنا چاہیئے، کیونکہ امن کی خواہش اور پر امن طریقوں کی حمایت اور وکالت ایسی قیمتی اور اعلیٰ قدر ہے جسے محض ایک ملک کی غداری کی وجہ سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ چینی حملہ درحقیقت ہمارے لئے ایک امتحان اور ایک چیلنج ہے اور اس کا بہترین جواب یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کر دیں کہ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ اپنی امن کی خواہش کو اور زیادہ موثر بنا سکتے ہیں۔

ہم اپنی طاقت کو کس طرح بڑھا سکتے ہیں؟ یقیناً اس سوال کے بہت سے جوابات ہو سکتے ہیں اور یہ سب مل کر قوم کا متفقہ جواب ہو سکتے ہیں۔ میں صرف وہ عرض کروں گا۔ جو میں نے تعلیمی تجربوں سے سیکھا اور سمجھا ہے کہ یہی میرا میدان عمل رہا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ہماری تعمیر و ترقی کی راہ میں امن و سکون کے سوا اور کچھ نہیں یہی ہماری تقدیر ہے اور ہماری پہلی اور آخری منزل۔ باوجود اس کے کہ ہم نے منصوبے بنائے اور ان کو کامیاب بنانے کے لئے مدت مقرر کی مگر حالات کے شدید تقاضوں کے مطابق آگے نہیں بڑھے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ

محسوس نہ کر سکے کہ ہمارے سامنے ایک دشمن کا چیلنج ہے، یعنی ہم زندگی اور بقا کی خاطر لڑ رہے ہیں لیکن اب ایک دشمن سامنے کھڑا ہے اور دانشمندی اور احتیاط کا تقاضا ہے کہ اسے نہ صرف بیرونی بلکہ اندرونی خطروں کی بھی علامت سمجھیں ضرورت ہے کہ اب ہم اپنے ساتھ سختی برتیں۔ ہم بیکار بحثوں میں پڑے رہے۔ ہماری بحثوں کی کوئی انتہا نہیں ہی حقیقت تو یہ ہے کہ ہم پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہی کہ ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے نہیں بلکہ بحث کی خاطر بحث کرتے رہے اور اگر ہم کسی نتیجہ پر پہنچے بھی تو ہم نے پورے طور پر اپنی یہ ذمہ داری نہیں محسوس کی کہ اس پر عمل بھی کریں۔ ہم نے اپنی قوت فکر کا بھی بیجا استعمال کیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کی یہ خواہش رہتی ہی کہ جو کچھ کسی اور نے سوچا ہے اس میں اپنی فکر پیمائی کا ایک چھوٹا سا جزو ضرور شامل کر دے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ ان معمولی خیالات کا ایک انبار لگ جاتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا یا سلجھانا ناممکن ہو جاتا ہی۔ ہم نے دنیا کی سب سے قیمتی چیز وقت کو بھی پوری فیاضی کے ساتھ ضائع کیا ہے، کیونکہ یا تو ہم بہت پیچھے دیکھتے ہیں، اپنی تہذیب کے آغاز سے بھی پیچھے، یا بہت آگے دیکھتے ہیں، تصور سے بھی پرے۔ اب ہمیں اپنے تصورات اور خیالات میں توازن پیدا کرنا اور ناقابل انکار حقائق کا سامنا کرنا چاہیئے۔

بے نتیجہ بحثوں کا نام جمہوریت نہیں ہے، اگر جمہوریت کے اصول کا تقاضا ہے کہ ہر ایک کو آزادی تقریر حاصل ہو، تو اس پر کامیابی کے ساتھ عمل کرنے کے لئے ایسی وفاداری کی ضرورت ہے، جس میں کسی خارجی تحریک کو دخل نہ ہو اور اس میں شعور و دانشمندی ہو۔ ایسی صورت میں ہم حاکموں اور آقاؤں کی اطاعت نہیں کر رہے ہوں گے بلکہ خود اپنی کریں گے۔ ہمیں خاموش رہنے کے لئے حکم دینے کی ضرورت پیش نہ آئے، خود ہم کو خاموش رہنا چاہیئے، تاکہ ہم اپنے غور و فکر اور بحث و نظر میں کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں، اپنے اوپر پابندیاں عائد کر کے ہم اپنے کو آزادی کا زیادہ مستحق بنا سکیں گے۔ ہماری شخصیت تقریروں کی کثرت کے مقابلے میں فکر انگیز خاموشی میں زیادہ بہتر طور پر نشو و نما پا سکے گی اور ترقی کرے گی اور ہم فیصلوں کی دیانتداری کے ساتھ تعمیل کر کے اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ سیکھ سکیں گے کہ ان فیصلوں کی حکمت و دانائی کی مسلسل جانچ پڑتال کرتے رہیں۔

اس وقت بہت سی باتیں ہیں جن پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ چین جس کی دشمنی سے آج ہم دوچار ہیں، ایک طویل تاریخ کا حامل ہے، یہ تاریخ علاقائی توسیع کی تاریخ رہی ہے، جس نے بعض اوقات سیاسی سامراج کی شکل اختیار کر لی ہے، صبر و تحمل اور محنت و مشقت کی تاریخ بھی ہے، دیوار چین عظیم الشان نہر اور ایسے ہی دوسرے کارنامے اس کے شاہد ہیں۔ یہ ایسے لوگوں کی بھی تاریخ ہے، جو چھوٹی

جماعتوں کی شکل میں دنیا کے مختلف حصّوں میں پھیل سکتے ہیں اور اپنے آپ کو مستحکم کرکے ایک آزاد معیشت کی مضبوط بنیاد بن سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملایا اور انڈونیشیا کے چینیوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ چینیوں کو جب کسی ایک شعبۂ زندگی میں ناکامی ہوئی ہے تو انھوں نے کسی اور شعبۂ زندگی میں قدم جما لیے ہیں۔ اس لیے جب میں کہتا ہوں کہ غور و فکر کی ضرورت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں صرف اسی کی فکر نہیں کرنی چاہیئے کہ چینی فوجوں نے ہماری شمالی سرحدوں پر حملہ کیا ہے، ہمیں اس امکان پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ چینی ہمارے قومی محاذ میں مختلف شکلوں میں داخل ہو سکتے ہیں، ہمیں ہر قسم کے خطروں کے لئے تیار رہنا چاہیئے، ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق ان فوجی، سیاسی اور معاشی تدبیروں کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے جو چینی اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ لڑائی جو آج شروع ہوئی ہے غالباً جلد ختم نہیں ہوگی اور اگر جلد ختم ہو جائے تو بھی ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ دیرپا امن صرف ہماری پیش بینی اور طاقت کی بنا پر ممکن ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ امن و امان برقرار رہے گا، اس لئے ہم نے شخصی اہلیت کے معیاروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے ہم اپنے آپ کو جانچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ امتحانوں اور ڈگریوں کی قدر و قیمت ہمارے نزدیک زیادہ ہے اور حقیقی علم کی بہت کم۔ یونیورسٹیوں کے قاعدے ضابطے صورت حال کو نہیں بدل سکتے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب نوجوانوں میں جو پڑھ رہے ہیں اور اساتذہ میں جو ان کی رہنمائی کر رہے ہیں، یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی اہلیت کو بڑھائیں گے اور تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں گے، بجائے اس کے کہ کم سے کم پڑھیں اور کم سے کم پڑھائیں خود اپنے سے ہمارا یہ مطالبہ ہونا چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں گے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے کو اہل بنائیں گے۔

اہلیت ایسی چیز نہیں ہے، جسے امن کے زمانے میں غیر ضروری سمجھا جائے، بلکہ میں نے اکثر اس کا فدشے کے ساتھ ذکر کیا ہے، کیوں کہ اسے "تعلیمی وعظ" کی حیثیت دی جا سکتی ہے، اس وقت میں اسے ایک فوری ضرورت سمجھتا ہوں جسے قومی مفاد کے پیش نظر ہر قیمت پورا ہونا چاہیئے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ نوجوان اپنی جسمانی صحت کو بہتر بنائیں۔ کیونکہ ملک کو فوجی خدمات کے لئے ان کی کسی وقت ضرورت پڑ سکتی ہے، ان کی معلومات زیادہ سے زیادہ وسیع اور صحیح ہونی چاہئیں، انھیں لڑائی کی حکمت عملی اور اس کے مختلف داؤ پیچ، فوجی تنظیم اور رسل و رسائل کی ضروری باتیں بھی معلوم ہونی چاہئیں، انھیں سفر کرنے پر پابندیاں عائد کرنے کی ضرورت کو سمجھنا چاہیئے اور یہ کہ خام اشیاء اور تیار شدہ مال کی مداخلت

کے لئے کیا اہمیت ہے؛ انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اس زمانے میں ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کو روکنا ضروری ہے، انھیں اس پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے کہ ان کے آس پاس کے بازاروں میں حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی تو نہیں کی جارہی ہے اور غیر سماجی عناصر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہیں۔ انھیں این سی سی کے ماتحت چھوٹے ہتھیار کا استعمال سیکھنا چاہیئے یا اس کے لئے رائفل کلب قائم کرنے چاہئیں، تاکہ وہ اس قابل ہوں کہ اپنے محلوں کو غنڈوں اور شرپسند عناصر سے محفوظ رکھ سکیں، مختصر یہ کہ بظاہر چاہے وہ سویلین معلوم ہوں، مگر ذہنی لحاظ سے فوجی ہوں اور ان کی پوری زندگی فوجی ضابطوں کی پابند ہو۔ انھیں یہ سب کچھ کرنا اور سیکھنا چاہیئے، مگر ساتھ ہی ساتھ ان کی تعلیم حسب معمول جاری رہنی چاہیئے اور یہ مقصد پیش نظر رہنا چاہیئے کہ انھیں اپنے مخصوص رجحانات کے مطابق اپنے علم اور اپنی قابلیت میں اضافہ کرنا ہے۔

اساتذہ اور طلبا، اگر ٹائم ٹیبل کی سختی سے پابندی کریں اور یہ محسوس کریں کہ انھیں ہر لمحے سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنا ہے، تو اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ دوسروں کو بھی اسی طرح تنظیم اور پابندی کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب ہوگی۔ کم سے کم مہمل باتیں ہوں گی، کم سے کم بے توجہی اور تاخیر ہوگی، کم سے کم پبلک مقامات گندے ہوں گے، پبلک کی آسائش اور سہولت کے لئے حکومت جو چیزیں مہیا کرتی ہے ان کا کم سے کم غلط استعمال ہوگا، ریلوں اور بسوں وغیرہ کے کام میں کم سے کم خرابی اور رکاوٹ ہوگی — اسی طرح شکست خوردگی اور خرابی کی مختلف شکلوں کو بے توجہی کے ساتھ قبول کر لینے کے بجائے ہمارے نوجوان پر شفقت اور بہترین کارکردگی اور ادائیگی فرض کی مثال پیش کریں گے ——— دوسرے ملکوں کے معاشرے میں اس قسم کی اہلیت پیدا کرنے میں پوری کامیابی ہوئی ہے، وہاں یہ کامیابی مقابلے کے ذریعہ حاصل کی گئی ہے، لیکن ہمیں یہ شبہ رہا ہے کہ ایسی اہلیت قابل قدر ہوسکتی ہے، جو صرف مقابلے کے ذریعہ یا اس نظریے کے ماتحت کہ صرف اسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، جو سب سے بہتر ہے حاصل کی جائے۔ مہاتما گاندھی اور ہمارے وزیر اعظم ایسے معاشرے کے قائل ہیں جس کی بنیاد ایک دوسرے کے تعاون پر قائم ہو، یعنی ایک ایسی سوسائٹی جس میں اہلیت کو شعوری طور پر سماجی مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ مجھے اس سے بہتر کوئی سماجی سطح نظر معلوم نہیں ہے، لیکن بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ ہم اس سوسائٹی کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے فرائض ادا کریں، ایسی سوسائٹی کے فوائد کے بارے میں سوالات کرتے رہتے ہیں۔

چینی حملہ آوروں کے بارے میں جب ہم سوچیں تو ان تمام باتوں پر غور کریں۔ ہم صرف علاقے اور مجروح وقار کی خاطر نہیں لڑ رہے ہیں، بلکہ زندگی کے ایک آئیڈیل کے لئے بھی لڑ رہے ہیں، جس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی بھی کم ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی

ہندوستانی تاریخ میں فرقہ وارانہ زہر

شری چندر گپت ودیالنکار

(شری چندر گپت ودیالنکار ہندی کے ملنے ہوئے ادیب ہیں اور تاریخ ان کا مخصوص مضمون ہے۔ پیش نظر مضمون جامعہ رورل انسٹی ٹیوٹ کے ایک استاد جناب شیام سروپ شرما صاحب نے ہندی کی ایک کتاب سے ترجمہ کیا ہے، جسے ہندی دکشن بھارت پرچار سبھا مدراس نے شائع کیا ہے)

تاریخ کی تعلیم ہر قوم کی زندگی کا ایک ضروری حصہ ہے۔ کیونکہ اپنی تاریخ کی یادگار ہی قوم کا احساس خودی ہے۔ اپنے بزرگوں کو اپنا سمجھ کر یاد کرنا اور ان کے زندگی کے حالات اور کارناموں کے مطالعے میں دل کا لگنا قومی بیداری کا تقریباً ساٹھ فیصدی یہی تو ہے "न हि तृप्यामि पूर्वेषां शृण्वानश्चरितं महत्" (بزرگوں کی زندگی کی عظیم کہانی سنتا ہوا میں نہیں تھکتا) مہابھارت کے مصنف نے جنمے جیہ کے منہ سے یہ الفاظ کہلوائے ہیں۔ لیکن ان میں زندہ اقوام کے ہر بچے کے دل کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔ یہ کوئی غرور نہیں نہ ہی کوئی خود فریبی ہے۔ یہ صحت مند انسانی ذہن کی بالکل قدرتی پیداوار ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ سر یدوناتھ سرکار نے کہا ہے کہ "ہم اپنے تاریخی ماضی کے زندہ پیغمبر ہیں۔ وہ ماضی ہمارے خون اور ہماری ہڈیوں میں، ہمارے خیالات اور ہمارے یقین میں گھل مل گیا ہے"۔ اس کے لئے کشش محسوس نہ کرنا ہی بیماری کی علامت ہے۔ وہ قومی انسان کی زندگی میں بالکل ویسی ہی بیماری ہے جیسے کسی غم سے پاگل انسان کا اپنی زندگی سے بیزار رہنا۔

آج دنیا کی بہت سی اقوام میں اپنے بزرگوں کے حالات زندگی کی طرف کشش کا مطلب

ہو گیا ہے اپنے پڑوسی ملک کے بزرگوں کے حالاتِ زندگی سے نفرت۔ تاریخ اس طرح لکھی جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کی تعلیم دی جاتی ہے کہ جہاں لوگوں کے دل میں اپنی قوم کے لئے بے انتہا محبت پیدا ہو وہاں پڑوسی کے لیے انتہائی نفرت بھی بھڑک اٹھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی تعلیم ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گئی ہے۔

لیکن ہمارے بھارت کا مسئلہ بالکل دوسرا ہے۔ یہاں انگریز سامراجی مصنفوں نے وقت کو بھی فرقے وار بانٹنے کی کوشش کی ہے اور ان کے اندھے پیروؤں نے اس تقسیم کو ایک ہمیشہ ہمیشہ سے چلی آرہی صداقت اور اصلیت مان رکھا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، جس شکل میں ہمارے بچوں کو تاریخ کی تعلیم دی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو آج بھی محمود کی بت شکنی کو یا اورنگ زیب کی کم اندیشی کو معاف نہیں کرنا چاہتا اور مسلمان آج بھی پرتاپ یا شواجی کے "غدر" کو دل سے بھولنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہندو کو ہندو زمانہ اور تاریخ ہی اپنی محسوس ہوتی ہے اور مسلمان کو قدیم ہندوستان کا نام بھی زبان پر لانا پسند نہیں۔ اس کو شام، فلسطین اور افریقہ میں اسلامی تاریخ کا راستہ ہی زیادہ پرکشش محسوس ہوتا ہے۔ اپنے بزرگوں کی یادگار کا بھی ہم اسی طرح بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں جس طرح جھگڑالو بھائیوں نے وراثت میں ملی توکرانی کا کیا تھا۔

اس ذہنی حالت کا نتیجہ یہ ہے کہ ۵ - ۶ برس کی عمر سے ہی ہمارے بچوں کی تعلیم کے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں اور اسی وقت سے ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت کے بیج بوئے جانے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ فرقہ وارانہ زہر ہماری قومیت کے درخت کو جڑ تک مارے جا رہا ہے۔

فرقہ وارانہ رنگ میں تاریخ کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ اصل میں جھوٹ اور فریب پر مبنی ہے اور ایک ایسا دھوکا ہے جس کا کوئی جواب نہیں۔ ہماری سستی اور لاپرواہی نے سامراجیوں کو وہ موقع عطا کر دیا ہے جس سے فرقہ واریت کے رنگ کی گرد اڑا کر وہ لوگ ہم کو گمراہ کئے ہوئے ہیں اور اس رنگ کا نشہ اتنا رنگین بن گیا ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کا اب

اس کو ترک کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ دوسری طرف سستی اور لاپرواہی کی تھپکیاں ہم کو میٹھی نیند سلائے ہوئے ہیں اور بنے ہوئے راستے کو توڑ کر نیا راستہ بنانے کی محنت ہمیں مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کڑوی سچائی کو سننا اور اپنے پرانے پلے ہوئے خیالات کو چھوڑ دینا دل کو اچھا نہیں لگتا۔ ہمارے زمانے کے عظیم رہنما نے سیاست کو بھی صداقت کے راستے پر چلانا چاہا ہے۔ لیکن سچائی کے راستے پر ہمیشہ گلاب نہیں بچھے رہتے۔ عدم تشدد کا دوسرا نام رواداری ہے۔ سچائی کی روشنی اور رواداری کا پانی لے کر اگر ہم اپنی تاریخ کے راستے کو صاف کرنے کا ارادہ کر سکیں تو فرقہ وارانہ زہر کی دھول بہت جلد بیٹھ جائے۔

محمود غزنوی ہماری تاریخ کا ایک ایسا کردار ہے جس کی یاد آج بھی بھڑکانے والی سمجھی جاتی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد ہندو حکمرانوں کو لوٹنا اور ہندو عبادت گاہوں کو توڑنا بتایا گیا ہے۔ محمود افغانستان کے لئے جو کہ ہندوستان کا صوبہ تھا ایک غیر ملکی تھا۔ غیر ملکی حملہ آور کی شکل میں اس نے افغانستان، پنجاب اور سندھ کو فتح کیا۔ سیاسی نقشے پر جب ہم اس کے کارناموں کے نشان لگاتے ہیں تو وہ صرف لٹیرا ہی نہیں ثابت ہوتا۔ اس کے حملوں میں ایک صاف منصوبہ اور ترتیب ہے اور وہ اپنی حکومت کو ایک سلسلے میں بڑھاتا ہوا اس کو ایک سامراج کی شکل دیتا ہوا ملتا ہے۔ کلمے کے سنسکرت ترجمے والے اس کے سکے ملے ہیں جن کو رائے بہادر کاشی ناتھ دکشت روشنی میں لائے ہیں۔ ان پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

अव्यक्तमेकं मुहम्मद अवतार صاف ظاہر ہے کہ اسلام کے اللہ اور دیانت کے برہم کا ایک ہونا پہچان لیا گیا تھا اور رسول اور اوتار کا خیال بھی ایک سے سمجھ لیا گیا تھا۔ کیا یہ ہندو مذہب اور اسلام کے میل کی، اسلام کے ہندوستانی بننے کی شروعات نہیں ہے؟

مندر برباد کرنے کی بات قابل غور ہے۔ زمانہ وسطیٰ میں ہندوستانیوں کے خیالات

کا سلسلہ ایک طرح سے رک سا جاتا ہے اور وہ علم، تہذیب اور تمدن، سیاست وغیرہ کسی بھی طرف بڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی فالتو پونجی کا کوئی نیا استعمال ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ملک خوش حال تھا اور مندر بنانے کے فن میں ہی سب فالتو پونجی لگ رہی تھی۔ وہ فن بھی تنزل کی طرف جا رہا تھا اور خوب صورت تخیل کی جگہ زیورات اور باہری سجاوٹ لیتے جا رہے تھے۔ مندر ملک میں ضرورت سے کہیں زیادہ بن رہے تھے۔ ان میں ملک کی دولت اکٹھی ہو رہی تھی لیکن اس دولت کی حفاظت کرنے کی طاقت اس کے مالکوں میں کم زور پڑتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں کسی نہ کسی حکومت کی تبدیلی میں اس کا لُٹنا ضروری تھا۔ محمود سے سو برس آگے پیچھے دو ہندو راجہ ہوئے ہیں۔ جن میں سے ایک نے مندروں کی جائدادیں ضبط کیں اور دوسرے نے ایک देवोत्पाटना नायक (مندر اکھاڑنے والا افسر) کا تقرر کیا۔ اس افسر کا کام تھا مندروں کو چپکے سے ناپاک کرا دینا اور بعد میں ضبط کر لینا۔ اس طرح مندروں کا بہت تعداد میں بننا اور بعد میں ٹوٹنا صرف اقتصادی اور سماجی حالات کی ایک کروٹ تھی۔ انھیں اقتصادی اور سماجی حالات کی بنا پر محمود کی فالتو دولت سے غزنی میں محل اور مسجدیں بنیں اور ان کی بھی غوریوں کے ہاتھ وہی حالت ہوئی جو محمود کے ہاتھ سومناتھ کی ہوئی تھی۔

اور اگر محمود نہ آتا اور اگر کوئی دوسرا انقلاب بھی نہ ہوتا تو کیا وہ مندر محفوظ رہتے ہندوؤں کی جس نیند کی وجہ سے وہ سرحدی لٹیروں سے نہ بچ سکے کیا اُس نیند کے موجود ہوتے وہ گھاس اور دیمک سے بچ جاتے؟ کیا عوام کی پیٹھ ان کو قائم رکھنے کا وزن ڈھوتی رہتی؟ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ پرانے مندروں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے! آج چتوڑ میں جا کر دیکھیے، راجا بھوج کے مندر سے چمگادڑوں کی بدبو کس طرح دور تک اڑتی ہے۔ جہاں حیدرآباد میں اجنتا کی ایک ایک تصویر کی حفاظت کا کوئی طریقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا، جہاں بھوپال دربار سانچی کے ستوپ کو اپنے محلوں کی طرح جھکا جھک رکھتا ہے

وہاں چتوڑ میں خوبصورت فن کے انوکھے نمونے اینٹوں کے ملبے میں دبے برباد ہو رہے ہیں اور اودے پور کے عجائب گھر میں دیواروں کے سہارے پڑے ہوئے کتبوں اور مورتوں پر بھی دیواروں کے ساتھ ہی سفیدی پوت دی جاتی ہے۔ آج بہار کے کسانوں سے پوچھیئے ـــ کیا ان کی پیٹھ اپنے مندروں اور مسجدوں کی زمینداریوں کا وزن آرام سے برداشت کر رہی ہے۔ اقتصادی حالات کیا آج پھر ایک کروٹ بدلنے والے نہیں ہیں؟

ادھ پڑھے پنڈتوں کی ایک پکار ہے ـــ مسلمانوں نے مندر توڑ کر ہندو فنون لطیفہ کو برباد کر دیا۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہندو کلا کا دم جب بندھی ردایات کی بیہودگیوں باہری سجاوٹ کی باریکیوں اور اونچے تخیل کی کمی کی وجہ سے گھٹ رہا تھا اس وقت اسلام نے اسے نیا تخیل دے کر اس کی روح کو بچا لیا۔ جونپور، پانڈوا، مانڈو، اور احمد آباد میں فن کے جو نمونے اس زمانے کے ملتے ہیں ان کو مسلم فن کہنا فضول ہے۔ وہ ہندوستانی آرٹ کا ایک نیا رخ ہے۔ وہ انھیں پرانے کاریگروں کے کارنامے ہیں، احمد آباد کی مسجدوں میں تو وہی قدیم کمل وغیرہ کے اشارے موجود ہیں۔ لیکن اس کاریگری میں اسلام نے ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ میرے کہنے کا کوئی تعصبی مسلمان یہ مطلب نہ لگائیں کہ اسلام میں فن کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی دائمی طاقت ہے۔ اس زمانے میں وہ طاقت تھی آج ختم ہو چکی ہے۔ تاریخ کی کوئی پیداوار دائمی نہیں ہوتی۔ ہم کو ہمیشہ ترقی پسند ہونا چاہیئے کسی بھی چیز کو ہم دائمی سمجھ کر اس سے چمٹے رہیں گے۔ تو پیچھے رہ جائیں گے، یہی تاریخ سے سبق حاصل ہوتا ہے۔

محمود کے بعد شہاب الدین غوری نے مسلم حکومت کو پنجاب سے سارے شمالی ہند تک پھیلا دیا۔ غوری کے ناگری سکے کافی تعداد میں موجود ہیں جن پر لکشمی یا بیل کی شکلیں کھدی ہوئی ہیں۔ اگر شہاب الدین کا مقصد صرف اسلام کو پھیلانا ہی تھا تو ان سکوں کا کیا مطلب ہے؟

غوری نے اجمیر اور قنوج کے ہندو راج خاک میں ملا دئے، لیکن اگر غوری نہ آتا تو ان کی کیا حالت ہوتی؟ چیدی کی مثال سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں۔ چیدی حکومت گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں بہت ترقی یافتہ اور خوشحال تھی لیکن تیرھویں صدی کے شروع میں خود بخود بکھر جاتی ہے اور جگہ جگہ لوگ سر اٹھا لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں بہت سے مندروں کی دولت بھی کیا مقامی لٹیروں کے ہاتھ نہ پڑی ہوگی؟

جاوا کا ملو تکت سامراج بیرونی بھارت کی آخری ہندو حکومت تھی جس کو رانی جے وشنو وردھنی کی خواہشات اور کوششوں نے ایک سامراج کی شکل دے دی تھی۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسے مسلمانوں کی نمک حرامی نے برباد کیا، لیکن کتبوں سے اب یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ اسی طرح خود بخود ٹوٹا اور اس کے بعد وہاں مسلم حکومت قائم ہوئی۔

مہارانا کنبھا کے اندراجات میں یہ بات درج ہے کہ اس نے ناگور کی مسجد کو زمین دوز کر دیا۔ کیا کنبھا اسلام کا دشمن تھا؟ اپنے پڑوس کے دو مسلم حکمرانوں کو شکست دینے کے بعد اس نے چتوڑ میں ایک کیرتی کا ستون بنوایا۔ اسی مینار پر جس جگہ برہما، وشنو، مہیش کی مورتیں بنی ہیں اسی جگہ ان کے ساتھ پتھر میں اللہ اللہ بھی کھودا گیا ہے۔ کیا اس سے صاف ظاہر نہیں ہے کہ اس نے اپنی حکومت میں اسلام کو جگہ دی تھی؟ پھر دونوں باتوں کا میل کس طرح ہو؟ ہم اس طرح میل کر سکتے ہیں کہ ناگور کے شرارتی حکمرانوں کی سرکوبی کے لئے اسے زیادہ سے زیادہ سختی کی ضرورت تھی اور ایک بار یہ دکھانا ضروری ہو گیا تھا کہ سیاسی ضروریات ہوتے پر وہ کہاں تک جا سکتا تھا؟ اور مسجد میں بھی کوئی جادو نہ تھا۔ سکھ تاریخ کی کئی ایک دوسرے سے مخالف دکھائی دینے والی باتوں کی اصلیت بھی یہی ہے۔

اورنگ زیب کی بھبک کے لئے کیا آج صرف ہندوؤں کو افسوس ہونا چاہیئے کیا آج کے ہندوستانی مسلمان اس کی کرنی کی یاد سے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں؟ اس کے اپنے وقت میں اس کے خسر نے اس کی مخالفت کی، اس سے لڑا اور مارا گیا۔ اس کی بیٹی

مرہٹوں کو قید اسلاک بدر کی تکلیفات اٹھانی پڑیں۔ وہ سبھی اس کے اکبر کی پالیسی کو چھوڑ دینے کو غلط سمجھتے تھے جس وقت ہندوستان کے ساحل کے پاس حاجی جہازوں کی دولت اور بیدعورتوں کی عزت انگریز ڈاکوؤں کے ہاتھ لوٹی جا رہی تھی اسی وقت اورنگ زیب کا ہندوؤں سے لڑنے میں اپنی حکومت کی طاقت کو برباد کرنا کیا ایسا کام تھا جس سے کسی مسلمان کو خوشی ہو سکتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو وہ سراسر بے وقوفی ہے۔

اورا س کی کم اندیشی کے بارے میں ہم جو کچھ کہیں، لیکن اس کے مضبوط ارادے، بے انتہا فرض شناسی اور ہوشیار محنت، انتھک طاقت اور بے داغ بلند کرداری کی تعریف کیا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے بچے مضبوط کردار اور ارادے کے لاثانی نمونے کو بھول جائیں اور تیس مار خاں دارا شکوہ کا نام رٹا کریں، اس سے کوئی فائدہ نہیں۔

اورنگ زیب کی طرح بالاجی باجی راؤ پیشوا کی کم اندیشی کے لئے آج ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ افسوس کر سکتے ہیں۔ انگریز جب بنگال اور تامل ناڈ میں مراٹھوں کے منہ کا لقمہ چھینے جاتے ہیں، ابدالی اور نجیب جب اس سے سمجھوتہ کرنے کی منت کر رہے ہیں، اس وقت بھی وہ پنجاب واپس لینے کی ضد نہیں چھوڑتا۔ ابدالی کی ایک چڑھائی سے فائدہ اٹھا کر کلائیو بنگال پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس کی دوسری لڑائی میں مراٹھوں کو پھنسا دیکھ کر تامل ناڈ کو پوری طرح فتح کر لیتا ہے مراٹھوں اور روہیلوں کے آپس میں لڑتے رہنے سے ہی ہندوستان کی موجودہ غلامی شروع ہوتی ہے۔

لیکن جہاں ہمیں اس کی اس بے وقوفی کے لئے افسوس ہوتا ہے وہاں ہم یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ کاویری سے پنجاب تک اور کاٹھیاواڑ سے کٹک تک ہندوستان کے اتحاد اور آزادی کے لئے اس زمانے میں اگر کوئی چال کی بازی لگا رہا تھا تو وہ مراٹھے ہی تھے۔

اور مراٹھوں اور روہیلوں سے یہ سمجھ کی غلطی چاہے جیسی ہوئی ہو لیکن جب وہ لڑے تو مردوں کی طرح لڑے۔ جب انہوں نے حالات کو سمجھا تو مردوں کی طرح کھلے دل سے اس غلطی کا

اعتراف کیا صرف اعتراف ہی نہیں بلکہ اس غلطی کو اپنی قربانیوں سے برابر کرنے کی کوشش بھی کی۔ آج کی گری ہوئی فرقہ وارانہ بیچ کچ میں جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے سامراجی طاقت نے دونوں فرقوں کے کچھ خودغرض اور بھٹکنے والے لوگوں کو خرید کر اور بہکا کر پیدا کی ہے، بہت یاد رکھیے کاغذی پہلوان مراٹھوں اور روہیلوں کی لڑائی کا ناٹک کیا کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جہاں تک شواجی اور باجی راؤ کے خاندانوں کا تعلق ہے وہ اپنی غلطی کو اپنے خون سے دھو گئے۔ ناناصاحب اور عظیم اللہ، لکشمی بائی اور حضرت محل، بخت خاں اور تانتیا ٹوپے کا ایک ساتھ اپنی قربانی دینا، احمد شاہ کو بچانے کے لئے نانا کا لیک کو بھیجنا اور تانتیا ٹوپے کا ساتھ دینے کے لئے شاہزادے فیروز کا بھاگ کر آنا، بہادر شاہ اور بہادر خاں کا گئو کشی بند کرنے کا فرمان نکالنا اور جن روہیلے اور اودھ والوں سے لڑتے رہنے کی وجہ سے اپنی آزادی کے ملنے کا یہ بویا گیا تھا، انہیں کے ملک میں ان کے لئے جان دیتے ہوئے پیشوا کے آخری خاندانی کا ختم ہونا۔ مراٹھا ناٹک کا یہ آخری ڈراپ سین کیا ہندو مسلم دشمنی کا پیغام دیتا ہے؟

صداقت کی تلوار اور رواداری کی ڈھال لے کر اگر ہم اپنی تاریخ کے ناہموار راستے میں اترتے ہیں۔ تو اس کے اندھیرے میں ہم کو کہیں بھی نفرت اور دشمنی کے بھوت دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اسی وقت ابھرنے لگتے ہیں جب سچائی کو چھپایا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان کے بارے میں علما نے جو سچائیاں تلاش کی ہیں ہمارے سیانوں کا اشارہ یہ رہتا ہے کہ ان کو بچوں کی درسی کتابوں میں شامل نہ کیا جائے۔

پیپل کی شاخوں کے لئے آج کتنی پریشانیاں ہوتی ہیں؟ سچائی یہ ہے کہ قدیم ہندو اپنے یگیوں میں پیپل کی لکڑی خاص طور سے کاٹ کر جلاتے تھے۔ جب گیا کا ایک پیپل بودھی ورکش (درخت) بن گیا تب سے پیپل کی عزت بڑھ گئی۔ اور جب راجہ ششانک نے اس بودھی ورکش کو اکھاڑ پھینکا، شاید اس کے بعد سے ہی اس کی شہادت کی یاد میں اس کی پوری برادری مقدس قرار دی گئی۔ گئو کشی کو لے کر آج ہمارے ملک میں کتنا خون خرابا ہوتا ہے! تاریخی اصلیت یہ ہے کہ پہلے پہل بھارشو اور واکاٹک زمانے سے گئو کشی کو پاپ مانا جانے لگا ہے۔ سانچی کے گنبد کی ویدیکا (یگیہ کرنے کی جگہ) کے ایک ستون پر تیسری صدی کے حروف میں ایک کتابت ہے جس میں پہلے پہل ہم کو گئو کشی کے پاپ ہونے کی بات ملتی ہے۔

آنریبل جسٹس سیّد محمود مرحوم

جناب عبدالمجید قریشی

ایک بہت بڑے باپ کے بہت بڑے بیٹے اور ایک بہت بڑے بیٹے کے بہت بڑے باپ، میری مراد یہاں سرسید کے نامور لختِ جگر اور سرراس مسعود کے والد بزرگ ایم اے او کالج علی گڑھ کے لائف جوائنٹ سکرٹری، الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور برصغیر کے نہایت ممتاز اور عظیم قانون دان آنریبل جسٹس سید محمود مرحوم سے ہے۔ متحدہ ہندوستان کے ہر بڑے آدمی کی تصویر میری نظر سے گذری ہے لیکن دل میں یہ حسرت باقی رہی کہ سیّد صاحب کی اب تک زیارت نہ ہو سکی۔ ویسے سنا ہے کہ چہرہ مہرہ بالکل باپ کا سا تھا بلکہ اُن سے بھی وجیہا اور بارعب بتلائے جاتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور چہرہ پر کھلتی ہوئی خوبصورت ڈاڑھی تھی۔ لیکن پیتے تھے اور بہت زیادہ پیتے تھے اور خوب پیتے تھے، شب و روز پیتے تھے، خدا جانے بنتِ عنب سے انھیں کہاں عشق ہوا۔ کیسے وہ اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوئے کہ تمام کی تمام ذہانت، لیاقت اور شہرت اس کے قدموں پر نچھاور کر بیٹھے حتیٰ کہ متاعِ زیست کا نذرانہ بھی اس کے حضور میں پیش کر دیا۔ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں نے انھیں قبل از وقت بوڑھا بنا دیا تھا۔ سرسیّد کی وفات کے بعد وہ صرف ڈیڑھ سال اور جیئے اور آخرکار اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ ہندوستان بشمول پاکستان میں خاندانِ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی کے بعد سوائے سرسید کے گھرانے کے مجھے کوئی اور خانوادہ ایسا نظر نہیں آتا جس میں مسلسل تین پشتوں تک یکساں قابل فاضل اور شہرۂ آفاق شخصیتوں نے جنم لیا ہو۔

سید محمود اور ان کے بڑے بھائی سید حامد ابھی بچپن کی منزلوں میں تھے کہ اُن کی والدہ انھیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ سرسیّد کو ان سے بڑی محبت تھی۔ کچھ اُن کی محبت کا تقاضا اور کچھ بچوں کے

مستقبل کا خیال کہ سید صاحب نے نکاحِ ثانی کا تصور تک نہ کیا۔ حالانکہ ان کی عمر اُن دنوں چالیس برس کے قریب تھی انھوں نے اپنے دونوں بچوں کی پرورش اور تربیت خود کی اور خوب کی۔

سید حامد صوبجات متحدہ میں براہِ راست سپرنٹنڈنٹ پولیس بھرتی ہوئے۔ اس دور میں یہ عہدہ کس قدر اہمیت رکھتا تھا اس کا تصور بھی ہم آج نہیں کرسکتے۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور عین عالم شباب میں وہ فوت ہو گئے۔

سید محمود مرحوم سب سے پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے ولایت سے قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ اور انیسویں صدی کے آخر میں جب انگریزی عروج و اقبال کا آفتاب نصف النہار پوری تابانی کے ساتھ جگمگا رہا تھا جب چھوٹی چھوٹی ملازمتوں اور معمولی معمولی عہدوں تک پر انگریز افسر فائز ہوا کرتے تھے سید محمود کو الہ آباد ہائی کورٹ کی ججی کی کرسی نصیب ہوئی۔ اس وقت پورے ملک کی عدالت ہائے عالیہ کا کوئی جج بھی ہندو یا مسلمان نہ تھا۔ یہ سید محمود کی قانونی عظمت کا کرشمہ تھا کہ انھیں انگریز ججوں اور قانون دانوں کی صفِ اول میں کمال عزت و وقار کے ساتھ جگہ ملی اور انھوں نے اپنی بے مثل فراست اور عدیم النظیر قوتِ فیصلہ سے ثابت کردیا کہ وہ کہاں تک اس عہدۂ جلیلہ کے مستحق ہیں اور حکومت ہند کے اس وقت کے انگریز وزیر قانون کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ سید محمود کی قانونی موشگافیوں سے استفادہ کرتے ہیں' بلاشبہ وہ ایک نامور باپ کے نامور بیٹے ہیں۔

ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت اور اعلیٰ قانونی قابلیت کا پتہ ان اہم مقدمات کے فیصلوں سے چلتا ہے جو سید محمود نے بحیثیت جج الہ آباد ہائی کورٹ صادر فرمائے تھے اور جو آج بھی دنیائے قانون میں اپنی اہمیت' فوقیت اور مسلمہ حیثیت کی بنا پر اپنی مثال آپ ہیں۔ کسی نے سچ کہا کہ سید محمود کا دماغ قانون کا دماغ تھا۔ اس کا دماغ کس طرح کام کرتا اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے بخوبی ہوتا ہے۔

پہلے واقعہ کے راوی خان بہادر نقی محمد خاں صاحب ہیں وہ اپنی سرگذشت حیاتِ "عمر رفتہ" میں رقم طراز ہیں کہ ایک مرتبہ جب سید صاحب ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ایک انگریز بیرسٹر ان کی

عدالت میں ملزم کی طرف سے وجوہاتِ صفائی بیان کر رہا تھا۔ گرمی کا زمانہ خس کی ٹٹیاں اور پنکھوں کی سرد ہوا۔ ان پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اور انھوں نے آنکھیں بند کر لیں بیرسٹر سمجھا کہ وہ بحث کو بغور سُن رہے ہیں لیکن جب خراٹوں کی آواز سنی تو خاموش ہو گیا اس کے خاموش ہوتے ہی ان کی آنکھ کھل گئی، پوچھا کہ خاموش کیوں ہو گئے۔ اس نے جواب دیا کہ جب عدالت سو جائے تو بحث کس کو سناؤں۔ سید صاحب مسکرائے پھر انھوں نے وہ تمام باتیں دہرا دیں جو ان کے سونے کی حالت میں اس نے بیان کی تھیں، بیرسٹر حیرانی سے ان کا منہ تکنے لگا۔

دوسرا واقعہ ان دنوں کا ہے جب سید صاحب بحیثیت بیرسٹر الہ آباد ہائی کورٹ میں ایک اہم مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے۔ وقوعہ کے روز حسبِ معمول بیٹے ہوئے تھے کہ بحث کے لئے حاضرِ عدالت ہوئے بحث کا آغاز بڑی آن بان سے کیا لیکن ان کے موکل کی بدقسمتی کہ سید صاحب کے بیان کردہ تمام دلائل اس کے خلاف جا رہے تھے۔ جج حیران اور فریقِ مخالف کا وکیل مسکرا رہا تھا۔ سید صاحب کا موکل گھبرا گیا۔ اس نے عدالت سے درخواست کی کہ وہ سید صاحب سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ عدالت نے اجازت دے دی۔ موکل نے ان کے کان میں کچھ کہا کہ سید صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لیکن فوراً ہی سنبھل گئے۔ بحث اسی رنگ میں پھر جاری ہو گئی اور پانچ سات منٹ کے بعد ختم ہو گئی دو چار سیکنڈ سکوت فرمایا پھر معاً عدالت کی جانب متوجہ ہوئے کہ حضور والا یہ وہ دلائل ہیں جو میرے مخالف وکیل اپنے موکل کی موافقت میں دے سکتے ہیں۔ اب میرے دلائل سماعت فرمایئے۔ یہ فقرے سنتے ہی انگریز جج کرسی سے اُچھل پڑا اور کہا ضرور ضرور۔ چنانچہ سید صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنا کیس عدالت کے سامنے پیش کیا اور آخر کار مقدمہ جیت کر اُٹھے۔

جناب ممتاز حسین جونپوری علی گڑھ میگزین کے "علی گڑھ نمبر" میں رقم طراز ہیں کہ سید صاحب کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا۔ اردو فارسی عربی اور انگریزی کے ہزاروں اشعار انھیں ازبر تھے۔ وہ شاعر نہ تھے مگر شعر و سخن کے بڑے دلدادہ اور قدردان تھے۔ شعر و سخن سے

ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ مقدموں کی شکلوں اور ات لالی تقریروں میں مناسب اور برمحل اشعار بڑی خوب صورتی اور برجستگی سے پیش کرتے تھے۔ ایک مشہور مقدمہ کے فیصلہ میں انھوں نے قاتل کی آستین پر خون کے دھبوں کا ذکر فرماتے ہوئے یہ شعر تحریر کیا تھا۔

قریب ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

ایک بار ان کی عدالت میں ایک حسین و جمیل عورت جس کا نام سوسن تھا شہادت دینے کے لئے حاضر ہوئی۔ ایسی تیز وطرار اور زبان دراز کہ الٰہی توبہ۔ سید صاحب بار بار اس کی طرف دیکھتے اور اس کی ہزار داستانی اور بے محل طراری کو دیکھتے رہ جاتے۔ تماشائیوں سے اجلاس بھرا ہوا تھا، سید صاحب نے میر فدا حسین وکیل کی طرف دیکھ کر فرمایا میر صاحب دیکھا آپ نے

سوسن نے زباں درازیاں کیں

میر صاحب نے فرمایا کہ سید صاحب دوسرا مصرع بھی ساتھ ہی پڑھ دیجیے۔

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں

سید صاحب ہنس پڑے۔

اسی طرح مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری نے بزم محمودی کا جو نقشہ "یادایام" میں کھینچا ہے وہ اپنی جگہ آپ ہے مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ دلّی میں سید حامد کے انتقال کی خبر سن کر میں سید محمود صاحب کی قیام گاہ پر گیا، میرے ہمراہ منشی رحمت اللہ رعد، اور منشی عطا اللہ خاں کوتوالِ شہر بھی تھے۔ ادائے تعزیت کے بعد جب ہم نے اٹھنا چاہا تو سید صاحب نے جانے کی اجازت نہ دی۔ کچھ دیر کے بعد کھانا آیا۔ اور اس طرح رات کے دس بج گئے۔ ہم نے پھر اٹھنے کا ارادہ کیا مگر اجازت نہ ملی۔ ارشاد ہوا کہ برسوں کے بعد آج جناب رعد سے ملاقات ہوئی ہے۔ کچھ دیر اور تشریف رکھیے۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ سید صاحب رعد کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ جناب رعد آپ کی آواز میں رعد کی سی کڑک ہے لہذا کلام بھی ایسا ہی پُرجوش ہو گا کچھ سنائیے بسلسلہ

معذرت کی کہ جب سے مسدس حالی کو پڑھا ہے ایشیائی شاعری سے تائب ہو چکا ہوں۔ مگر یہ عذر قبول نہ ہوا۔ اور رعد نے مجبوراً اپنا کلام سنایا۔ چند غزلوں کے بعد یہ دور ختم ہو گیا۔ ایک شعر یاد آگیا آپ بھی سن لیجئے۔

جھانکتے تھے ان کو ہم جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

اس کے بعد رعد نے فرمائش کی کہ جناب بھی شاعر ہیں کچھ اپنا کلام سنائیے۔ فرمایا کہ لندن میں بزمانۂ طالب علمی کچھ انگریزی نظمیں کہی تھیں اور ہندوستان آکر کچھ نظمیں اتفاقیہ طور پر فارسی میں لکھیں انھیں چھوڑیئے۔ البتہ اگر متقدمین و متاخرین شعراء کا کلام سننا چاہتے ہوں تو عرض کروں۔

رعد نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اس کے بعد سید صاحب نے سوال کیا کہ نظم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایئے کہ کس زبان کے شعراء کا کلام سناؤں۔ اور یہ بھی طے ہونا چاہیئے کہ اصنافِ سخن میں سے آپ کو کیا پسند ہے غزل یا قصائد۔

رعد نے اردو غزل کی فرمائش کی اور عرض کیا کہ ولی دکھنی سے آغاز کیا جائے۔ چنانچہ رعد ولی کی غزل کا کوئی شعر پڑھتے اور سید صاحب پوری غزل سنا دیتے۔ ولی کے بعد ان شعرائے دکن کا کلام سنایا جو ولی سے بہت پہلے گذر چکے تھے۔ شعرائے دکن کے بعد میر کا کلام سنایا یہ اشعار گویا میر کے بہتر نشتر تھے جو پوری کلیات سے انتخاب کئے گئے تھے۔ اور غالب کے کلام پر شعرائے اردو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

اردو کے بعد متقدمین شعرائے عجم کا کلام سنایا۔ ہر بار سید صاحب یہی فرماتے تھے کہ آپ کسی شاعر کا نام لیں اور اس کی غزل کا مطلع پڑھیں چنانچہ اسی اصول پر حافظ۔ سعدی۔ جامی اور خیام وغیرہ کی متعدد غزلیں ردیف دار سنائیں۔ جب عاشقانہ رنگ سے طبیعت سیر ہو گئی تو منشی صاحب نے مثنوی مولانا روم کی فرمائش کی۔ چنانچہ یہ درخواست بھی منظور ہوئی اور چند منٹ کے لئے سید صاحب دوسرے کمرے میں تشریف لے گئے۔ جب واپس آئے تو قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور داڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے۔ بلند آواز سے خادم کو پکارا

اور تولیہ کی فرمائش کی۔ تولیہ سے منہ ہاتھ پونچھ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ مثنوی مولانا روم میں بغیر وضو نہیں پڑھتا ہوں۔ اب جو حکایت آپ کو پسند ہو اس کا پہلا شعر پڑھیے۔ رعد کی زبان سے نکلا ع

دید مجنوں را یکے صحرا نورد

چنانچہ سید صاحب نے نہایت ذوق و شوق اور بلند آواز سے یہ پوری حکایت سُنائی۔ دورانِ گفتگو میں نے ہمیشہ سید محمود کو اس کا عامل پایا کہ ان کی زبان سے جو حرف ادا ہوتا تھا وہ صحیح مخرج سے نکلتا تھا۔ دوسرے یہ کہ گھنٹوں کی گفتگو میں بھی ایک انگریزی لفظ زبان پر نہ آتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد بھی متعدد مرتبہ سید محمود سے الہ آباد وغیرہ میں ملاقات ہوئی مگر یہ رات عجیب و غریب تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اخیر عمر میں سید صاحب پر شراب غالب تھی اور کھانا چھوٹ گیا تھا چوبیس گھنٹوں میں صرف دو سیر دودھ۔ انڈے اور چائے پر زندگی تھی۔ اس محفل سے وہ دس بجے شب سے پانچ بجے صبح تک سات آٹھ مرتبہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں تشریف لے گئے تھے۔ اور چند منٹ بعد واپس آئے یہ آنا جانا ضرور تھا، لیکن ان کی زندگی کا یہ عظیم الشان اخلاقی واقعہ ہے کہ کسی شخص نے ان کو بچشم خود شراب پیتے نہیں دیکھا اور نہ کوئی شرعی شہادت موجود ہے۔"

سید صاحب کی تصویر کا یہ رُخ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اب ان کی تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جہاں وہ پیکر جاہ و جلال نظر آتے ہیں۔ سید صاحب کی یہ تصویر سر سید رضا علی کے قلم نے انتہائی کامیابی اور کمال چابکدستی سے "اعمال نامہ" میں کھینچی ہے: "سر سید کی جانشینی کا مسئلہ محسن الملک اور سید محمود" کے زیر عنوان وہ تحریر فرماتے ہیں:

"بزم اغیار ہے ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے
ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو جائے

سر سید کی وفات کے بعد سید محمود صاحب کی جو حالت تھی اس کی سچی تصویر اس شعر

میں موجود ہے۔ ۳۱ جنوری ۱۸۹۹ء کو ٹرسٹیان کالج کا جلسہ نواب محمد حیات خاں صاحب کی صدارت میں ہوا۔ ایک طرف سید محمود اور دوسری طرف محسن الملک موجود تھے۔ میری یہ عبارت کہ برآمدہ میں پہنچ گیا۔ سید محمود نظیر اکبر آبادی کا یہ مصرع پڑھتے ہوئے اسٹریچی ہال سے نکل رہے تھے۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

سارے ٹرسٹی ایسے ملول و مغموم تھے گویا جنازہ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ سید محمود کے پیچھے پیچھے نواب محسن الملک تھے۔ چہرہ زرد، آنکھوں میں آنسو۔ بھرائی ہوئی آواز قدم ڈالتے کہیں تھے پڑتا کہیں تھا۔ ان کے ذرا پیچھے نواب محمد حیات خاں صاحب اور خان بہادر ملک برکت علی خاں صاحب اور خلیفہ محمد حسن صاحب تھے۔ تینوں حضرات سرسید کے سچے رفیق اور کالج کے بڑے معاون تھے۔ ان تینوں کے بعد مسٹر بیک جن کو بارہ سال پیشتر سید محمود ولایت سے پرنسپلی کے عہدہ کے لئے منتخب کر کے لائے تھے۔ کچھ ٹرسٹی اسٹریچی ہال کے برآمدے میں تھے۔ کچھ ہال سے نکل رہے تھے۔ ٹرسٹیوں نے اس ہنگامہ سے ذرا دیر پہلے سرسید علیہ الرحمۃ کی جگہ نواب محسن الملک کو کالج کا آنریری سکرٹری منتخب کیا تھا۔ سید محمود فرماتے تھے کہ میں لائف جوائنٹ سکرٹری ہوں۔ قواعد ٹرسٹیاں کی رو سے میرے موجود ہوتے تم محسن الملک یا کسی اور کو آنریری سکرٹری نہیں بنا سکتے۔ سید محمود کی حالت زخمی شیر کی سی تھی۔ بپھرے ہوئے تھے اور جو منہ میں آتا تھا کہہ رہے تھے۔ سب اِدھر اُدھر دبک رہے تھے۔ شیر کا مقابلہ خود اس کے پرانے رفیق محسن الملک سے تھا۔ سارے ٹرسٹیوں کی کوشش تھی کہ جس طرح بن پڑے خوشامد درآمد کر کے غضب آلودہ شیر کو چیتے کی طرح رام کریں۔ اس کوشش میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لینے والے مسٹر بیک معلوم ہوتے تھے دوران گفتگو میں سید محمود مسٹر بیک کو تھیوڈور کہہ کر خطاب کرتے تھے (مسٹر بیک کا پورا نام تھیوڈور بیک تھا) جس سے شیر برطانیہ اور معزول شیر علی گڑھ کے درمیان گہری دوستی اور انتہائی بے تکلفی کا پتہ چلتا تھا۔

شام کے پانچ بجے کا وقت تھا۔ جلسہ سارے دن رہا تھا۔ ٹرسٹیوں نے تو گتھی سلجھانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی مگر سید محمود کی برہمی سے معلوم ہوتا تھا کہ سلجھنے کی بجائے گتھی میں اور پیچ پڑ گئے ہیں۔ بالآخر اسی شخص کی سوجھ بوجھ کام آئی جس کی فراست و ذکاوت اور ہوش مندی کا اب سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ڈنکا بج رہا تھا۔ محسن الملک بڑھے اور سید محمود کے قدموں کی طرف جھکے۔ آن کی آن میں ایک سید کی ٹوپی دوسرے سید کے قدموں پر تھی۔ سید محمود نے ہاتھ پکڑ کر محسن الملک کو اٹھایا اور فرمایا "مہدی تو کیا کہتا ہے" محسن الملک کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "میں کہتا ہوں کہ اس وقت قوم کی کشتی کو ڈوبنے سے سوائے تمہارے اور کوئی نہیں بچا سکتا۔" سید محمود بولے: "اچھا تو کہتا ہے تو میں راضی ہوں"۔ سید محمود کی آواز میں افسوس کا ذرا سا بھی شائبہ نہ تھا۔ ہم سب محو حیرت تھے کہ ایں چہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب۔ ٹرسٹیوں نے دن بھر سارے جتن کئے مگر بے سود۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر محسن الملک سید محمود کے جذبۂ شرافت سے استغاثہ نہ کرتے تو سید محمود معاملہ کو بغیر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے نہ چھوڑتے جس سے کالج کو سخت نقصان پہنچتا۔"

اس واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ سر سید کی وفات کے بعد کالج کی مالی حالت نہایت نازک ہو چکی تھی کیونکہ کالج اب سے چند سال پیشتر ایک بہت بڑے غبن سے دوچار ہو چکا تھا جس کے اثرات ابھی تک باقی تھے۔ سید محمود کی جو ان دنوں کالج کے عارضی آنریری سکریٹری تھے جملہ صلاحیتوں کو کثرت مے نوشی سلب کر چکی تھی۔ حالات کا مزید مقابلہ کرنا اب ان کے بس کا کام نہ تھا ضرورت تھی کہ کالج کی عنانِ اقتدار ایسے ہاتھوں میں آئے جو اس عظیم ادارہ کے واقعی اہل ہوں۔ چنانچہ ٹرسٹیانِ کالج نے اس عہدہ کے لئے نواب محسن الملک کا انتخاب کیا جنھوں نے آگے چل کر ثابت کر دیا کہ ٹرسٹیان کالج کی رائے اس معاملہ میں کس قدر صائب تھی۔

وفات سے کچھ عرصہ پیشتر وہ لکھنؤ تشریف لے گئے۔ وہاں ان کا معمول تھا کہ صبح سویرے سکندر باغ چلے جاتے۔ وہاں کسی گوشہ میں تنہا بیٹھ جاتے۔ آنکھیں بند کر لیتے اور تلاوت کلام پاک کرتے یا بے ثباتی عالم پر فارسی اشعار پڑھتے۔ دیکھنے والوں نے بارہا دیکھا کہ لب پر کلام پاک کی آیات جاری ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔

ان کی وفات کا ماتم حضرت اکبر الہ آبادی نے حسب ذیل اشعار کی صورت میں کیا:

نہ وہ بیک رہ گئے نہ سرسید
دلِ احباب سے نکلتی ہے آہ
ذاتِ محمود سے تسلی تھی
لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ
اے حریصا نہ شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا لا الٰہ الا اللہ

رسالہ "زمانہ"

جناب ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

"زمانہ" کا سب سے پہلا شمارہ ماہ فروری ۱۹۰۳ء میں مطبع قیصری پریس بریلی میں باہتمام داروغہ منشی مہاراج پرشاد منیجر طبع ہوا تھا۔ اس رسالہ کے سب سے پہلے ایڈیٹر روحانی پیشوا منشی شیوبرت لال ورمن ایم اے تھے جو دو سو سے زیادہ اردو کتابوں کے مصنف تھے لیکن ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر کسی اردو کی ادبی تاریخ میں نہیں کیا۔ رسالہ "زمانہ" ان کی ایڈیٹری میں ماہ فروری ۱۹۰۳ء سے ماہ اکتوبر ۱۹۰۳ء تک شائع ہوتا رہا عبدالرزاق قریشی نے دسمبر ۱۹۵۹ء میں رسالہ آج کل میں منشی دیا نرائن نگم پر ایک مقالہ لکھا ہے اس میں بغیر تحقیق کئے ہوئے یہ لکھ دیا ہے کہ

"زمانہ" ۱۹۰۱ء سے بریلی سے نکلتا تھا"

اس قسم کی غلطی رسالہ "زمانہ" کے سلسلے میں مولانا حسرت موہانی کشن پرشاد کول اور اردو ہندی کے دوسرے ادیبوں نے بھی کی ہے۔ رسالہ زمانہ کے ماہ فروری ۱۹۰۳ء کے شمارے میں زمانہ اور اس کی اصلیت و غرض کے سلسلے میں منشی شیوبرت لال ورمن یوں رقم طراز ہیں:

حضرات ناظرین! (۱) زمانہ کے نمونے کا پرچہ بہ تعظیم تمام نذر خدمت کیا جاتا ہے،
گر قبول افتد زہے عز و شرف

(۲) زمانہ

عاشق ملک ہے دیوانہ ہے — وہ اس اک شمع کا پروانہ ہے

دین و آئین بھی ہے اس کا — حامی مذہب فرزانہ ہے

(۳) زمانہ کی اشاعت ایک خاص غرض کی تکمیل ہے۔ اردو زبان میں مغربی و مشرقی خیالات کے

اتحاد کی تصویر پیش کرتے رہنا اور ان علوم و فنون و ضروری واقعات پر خامہ فرسائی کرنا جو ہمارے طرز معاشرت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جن کی معمولی واقفیت تہذیب و شائستگی کا معیار قرار دی جاتی ہے اس کا مین مقصد ہے۔

(۴) زمانہ میں ہر قسم کے مضامین سوشل و پولیٹکل زیر بحث آویں گے اور اہتمام کی جائے گی کہ زمانہ حال کے خیالات میں وسعت پیدا ہو اور اس ملک کی سب قومیں باہم شیر و شکر کی طرح مل کر قومی اتحاد کے اصول پر عمل کریں۔

(۵) زمانہ کی کوشش ہوگی کہ وہ گورنمنٹ کی منشا کو عوام پر اعلان کرے اور عوام الناس کی خواہش و تمنا کو بلا کم و کاست سرکار تک پہنچائے اور فریقین کی لاعلمی کے دور کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔

منشی شیو برت لال ورمن کی اڈیٹری کے زمانہ میں رسالہ زمانہ کے پانسو سے زیادہ خریدار ہو گئے تھے۔ منشی شیو برت لال ورمن نے رسالہ میں ادبی تاریخی، مذہبی اور سائنس کے مضامین شائع کئے اور بہت سے مختلف رسالوں سے مختلف مضامین اقتباس کئے گئے۔ منشی رام بہادر لال جریا منشی کندن لال شرر سہارنپوری اور دوارکا پرشاد گہر مرحومین کی نظمیں بھی ماہ فروری سنہ ۱۹۰۳ء سے ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۳ء کے شماروں میں نظر آتی ہیں۔ "دارِ فنا" کے عنوان سے زمانہ مئی سنہ ۱۹۰۳ء میں حضرت فانی بدایونی کی ایک غزل شائع ہوئی ہے۔

ماہ نومبر و دسمبر سنہ ۱۹۰۳ء میں رسالہ زمانہ منشی دیا نراین نگم کی اڈیٹری میں نکلنا شروع ہو گیا اس مشترکہ شمارے میں مسٹر راناڈے کا نوحہ مکیسبت لکھنوی کا لکھا ہوا شائع ہوا ہے۔ منشی دیا نراین نگم زمانہ بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۰۴ء میں زمانہ کی اڈیٹری کی تبدیلی کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں:

زمانہ کی ایڈیٹری میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ناظرین پر سرورق سے ظاہر ہو گئی ہوگی۔ یہ تبدیلی بڑے پس و پیش کے بعد منظور کی گئی ہے۔ اپنی کم مائگی بے علمی کا یقین مانع تھا کہ ایسا اہم کام اپنے ذمہ لیا جائے۔ مگر شوق اکتسابِ علم اور جوش خدمت ملکی اور خیال اصلاح رسالہ ہذا نے بالآخر

نتیجہ پائی اور نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ کی ترتیب کم سے کم کچھ دنوں کے لئے اپنے سر لی گئی۔ مگر اس نازک خدمت کا خوبی اور خوش اسلوبی سے سرانجام پانا اہل قلم کی دستگیری اور سرپرستی کے بغیر ناممکن ہے۔ شکر ہے کہ ملک کے ایک کثیر التعداد اہل قلم کی جانب سے بیہ امداد بلا دریغ ملی ہے۔ جو بہر حال زمانہ کی عمدگی اور ہماری حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔ ہم اپنی طرف سے زمانہ کو ملک میں ایک مفید اور جامع میگزین بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ مگر ہماری کوششوں کی کامیابی بہت کچھ اہل ملک کی قدردانی اور حوصلہ افزائی پر منحصر ہے۔

اس اہم ذمہ داری کے لیتے وقت زمانہ کو ملک کے اور دلچسپ و دلکش میگزینوں سے جدا اصولوں پر چلانے کا ارادہ کرلیا گیا ہے کہ کافی غور و فکر اور صلاح و مشورہ کے بعد یہ طے پایا ہے کہ زمانہ محض شاعری اور انشاپردازی کے ہاتھ رہن نہ رکھ دیا جاوے۔ کیونکہ ملک میں ایسے رسالوں کی ایک کافی تعداد موجود ہے جو زبان اردو کے لئے عمدہ کام کر رہے ہیں۔ زمانہ میں حتی الوسع ترقی زبان کا خیال لئے ہوئے اصلاح خیالات۔ درستی مذاق۔ توسیع معلومات۔ ترقی اتحاد وغیرہ کا زیادہ خصوصیت سے التزام رکھا گیا ہے۔ مگر ان ارادوں کا پورا ہونا بہت کچھ تائید غیبی اور امداد باہمی پر موقوف ہے اس لئے دل سے دعا ہے کہ خدا ہماری کوششوں میں برکت دے۔"

منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں زمانہ نومبر و دسمبر ۱۹۰۳ء سے جنوری ۱۹۴۲ء تک جاری رہا۔ منشی جی فدائے اردو تھے اس لئے مرتے دم تک اردو کی ترقی و عروج کے خواہاں رہے۔ منشی جی کی بیش بہا ادبی خدمت کو اردو والوں نے بھلا دیا لیکن بے شبہ انھوں نے اردو ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ان کی یادگار قائم رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی ادبی خدمات پر انجمن ترقی اردو ہند کوئی کتاب شائع کرے اور ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی شائع کرے۔ اگر یہ کام منشی جی پر اس وقت نہیں ہوئے تو آئندہ کوئی امید نظر نہیں آتی کیونکہ پرانے رسالوں میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین دیکھنے کی کون زحمت گوارا کرے گا اور پرانے رسالوں تک ہر ایک کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی اگر کوئی اردو ادب کی تاریخ لکھنا چاہے

تو اس کو رسالہ زمانہ کے چالیس سال کے فائل کا مطالعہ ضروری ہوگا کیونکہ ان رسالوں میں اردو کی چالیس سالہ تاریخ ملتی ہے۔ رسالہ زمانہ کا دامن ان داغوں سے پاک رہا جبکہ زیادہ تر رسالے سطحی ادب پیش کر رہے تھے۔ مرحوم کا مطمع نظر بلند تھا اس لئے رسالہ کا جو معیار انھوں نے قائم کیا آخر تک اسے نباہا۔ رسالہ زمانہ کے ذریعے بہت سے گمنام ادیب اور شاعر منظر عام پر آئے ورنہ ان کے افکار اور مضامین سے اردو دنیا محروم رہتی۔

درگا سہائے سرور۔ چکبست۔ منشی تو بیت رائے نظر۔ جگر بریلوی۔ فراق۔ محروم۔ منور، روان۔ وحشی۔ اقبال، احسان دانش۔ جوش ملیح آبادی۔ جگر مرادآبادی۔ اثر لکھنوی۔ عزیز لکھنوی وغیرہ کا کلام بھی زیادہ تر رسالہ زمانہ میں شائع ہوا اور انھیں شہرت نصیب ہوئی۔ اقبال کا قومی ترانہ جگر بریلوی کی پیام ساوتری۔ درگا سہائے سرور کی نظمیں اور پریم چند کے افسانے سب سے پہلے رسالہ زمانہ میں ہی شائع ہوئے۔ اردو ہندی ہندوستانی پر جگر بریلوی اور دوسرے ادیبوں سے نہایت ہی مفصل بحث ہوئی جو صاحب اس بحث کو دیکھنا چاہیں وہ زمانہ کے ان مضامین کو پڑھیں جو ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۱ء تک اردو ہندی ہندوستانی کی بحث کے سلسلے میں شائع ہوئے۔ رسالہ زمانہ کے خاص نمبر رسالہ نگار کی طرح ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ پریم چند نمبر، حالی نمبر اور جوبلی نمبر سے اردو کی کوئی لائبریری خالی نہیں ہونا چاہیئے۔ رسالہ زمانہ کے بارے میں، جگر بریلوی 'یادِ رفتگاں' میں فرماتے ہیں۔

"زمانہ کی چالیس سال کی جلدیں ایسے ایسے بلند پایہ مضامین سے بھری پڑی ہیں جو اردو زبان کے لئے گراں بہا دولت ہیں۔ ادب کا کوئی سنجیدہ شعبہ ایسا نہ ہوگا جس پر نہایت پر مغز مضامین نہ موجود ہوں ادب، شعر، تاریخ، مذہب، تہذیب و تمدن، مصوری، موسیقی سنگتراشی، معاشیات، طبیعیات، اثریات، لسانیات، نفسیات، طنزیات، مضحکات سیاسیات، فلسفہ اخلاقیات، روحانیت وغیرہ وغیرہ تمام موضوعات پر بڑے بڑے عالموں اور ماہروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایک ایک موضوع پر یہ تمام مضامین اکٹھے

کہ کے کتابی صورت میں شائع کیے جائیں تو اردو میں متعدد علوم و فنون پر بہترین تصانیف کا اضافہ ہو جائے اور شاعری اور انشا پردازی کے بیش بہا مجموعے تیار ہو جائیں۔ حق یہ ہے کہ زمانہ نے کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے اردو زبان کی ایسی گراں قدر خدمت انجام دی ہے جس کے بار احسان سے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اور جس سے ہمیشہ آئندہ نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔"

زمانہ فروری و مارچ ۱۹۴۳ء (یادگار نمبر) میں منشی دیا نرائن نگم کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر محمد حفیظ، سید ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے اس میں زمانہ کے سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں۔

"چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زمانہ کی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں بڑی حد تک چالیس برسوں کے درمیانی عرصہ میں واقع ہونے والے تمام ادبی علمی اور لسانی تغیرات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ زمانہ نے ہر حیات پرور رجحان اور زندگی بخش ادبی اور علمی تحریک کو لبیک کہا اور اس کی نشو و نما میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔۔۔۔۔۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ زمانہ کے صفحات کو نئے خیالات کے طوفان کو روکنے کا اور جدید ادبی کاوشوں کی مخالفت کا منحوس آلہ نہ بننے دیا بلکہ جہاں تک ہو سکا اُن کے اعلیٰ اور بہترین کارناموں کو زمانہ کے صفحات پر نمایاں جگہ دی۔ لیکن ساتھ ہی ان کی زمانہ شناس نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ مستقبل ماضی سے بالکل علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور ماضی ہی کے بطن سے مستقبل کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں اس لئے انھوں نے زمانہ کو کبھی کسی نوزائیدہ اور فوری جوش کے تحت خواہ مخواہ ماضی کی اچھی چیزوں کی مخالفت کا ذریعہ نہیں بنایا۔"

منشی دیا نرائن نگم کے مضامین رسالہ زمانہ اور مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں وہ کس پایہ کے ادیب تھے چند مضامین کے اقتباسات سے معلوم ہو جائے گا۔

"اخبار نویس ایک معمولی اہل قلم نہیں ہے اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اس کا درجہ بڑے سے

بڑے مدبر نامور سے نامور محب ملک اور مشہور سے مشہور قومی لیڈر سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس کا اثر بظاہر اتنا نمایاں نہیں ہوتا اور اس کا رسوخ خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے اور سب تعمیری کام کرنے والوں کی طرح اسے بھی ہر وقت اپنی جگہ پر ایثار نفسی کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ سچے اخبار نویس کو تحریر میں وزن اور متانت پیدا کرنا ہوگی اسے نکتہ چینی کو ذاتیات سے بالاتر رکھنا پڑے گا۔ رائے زنی میں ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی فکر سے آزاد رہنا ہوگا اور حمایت ہو یا مخالفت دونوں میں اسے ہر طرح کے تعصب سے پاک رہنا ہوگا۔ وہ وکالت کرے گا مگر اس کی وکالت میں طرف داری کا شائبہ نہ ہوگا۔ وہ واقعات اور خبروں میں رورعایت سے کام نہ کرے گا۔ دوسرے کی اختلاف رائے سے بدظن نہ ہوگا اور مخالفین کو اظہار رائے کا پورا موقع دے گا۔"

" سچ ہے خدا کا نام رہتا ہے ہمیشہ کچھ نہیں رہتا ہمارے یہ ہمدرد معاونین جن کو ہم رہ رہ کر یاد کر رہے ہیں۔ ہماری امداد و اعانت کے لئے اس عالم علم و عمل میں موجود نہیں ہیں لیکن ہم کو یقین ہے کہ ان کا روحانی فیض اس وقت بھی ہمارے شامل حال ہے۔ ان کی ہمدردی ان کی دستگیری بے کار نہیں گئی ان کے کارنامے ہمیشہ یادگار زمانہ رہیں گے اور جب تک اردو ادب کا نام و نشان باقی ہے ان کے اعلیٰ خیالات اور پاکیزہ جذبات جو زمانہ کی گذشتہ جلدوں میں محفوظ ہیں عزیزان وطن کے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے رہیں گے اور شائقین ادب ان کے کارناموں کو فخر اور مسرت سے یاد کریں گے، ان کی مثالیں شمع ہدایت کا کام دیں گی ان کے نقش قلم رہنمائی کا فرض ادا کریں گے اور ان کی محنت و محبت کی یادگاریں آئندہ نسلوں کو بھی ملک کی ادبی خدمت پر مائل کرتی رہیں گی۔" (یادرفتگاں)

" ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو عرصہ سے سست پڑ گیا تھا، پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہو گیا۔ پورانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے، اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پرمیشور کا

خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کرکے اسے بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان میں آکر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا جن کا عام خیالات پر بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیم میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کر دئے اور ان کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا ان کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔"

"دنیا کے بہت سے آزاد ملکوں میں پریس کی آزادی کو آئینی حیثیت سے باضابطہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ سیاسی آزادی کی پہلی شرط زبان اور قلم کی آزادی ہے۔ ملٹن نے تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ خواہ اور کوئی آزادی نصیب ہو یا نہ ہو لیکن معلومات حاصل کرنے کے مطالب ادا کرنے اور ضمیر کے مطابق دلائل پیش کرنے کی سب کو پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ سر چارلس مٹکاف نے سو سال سے زائد ہوئے یہ لکھ گئے ہیں کہ پریس کی آزادی کے فوائد اس کے مضر نتائج سے کہیں زیادہ ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی انسان کے ازلی حقوق میں داخل ہے۔ یہ کوئی رعایت نہیں بلکہ انسانی حق ہے۔"

(خطبۂ صدارت اردو پریس کانفرنس)

تعلیمی مسائل

تربیتِ جسمانی

تعلیم کے میدان میں تربیتِ جسمانی کی اصطلاح یوں تو برابر استعمال ہوتی ہے لیکن اکثر و بیشتر اس کے مفہوم کی اہمیت کا اندازہ کئے بغیر ہی اُسے برتا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک تربیتِ جسمانی کے معنی ورزش اور کھیل کود کے سوا کچھ نہیں۔ بعض حضرات تربیت جسمانی (فزیکل ایجوکیشن) تفریحی مشاغل کی تعلیم (ریکریایشن ایجوکیشن) اور تعلیم صحت (ہیلتھ ایجوکیشن) کی علیحدہ علیحدہ تشریح و تفریق مناسب خیال کرتے ہیں۔ تربیتِ جسمانی سے عموماً جسمانی کھیل، کسرت، تیراکی وغیرہ کی واقفیت و تربیت مراد لی جاتی ہے اور تفریحی مشاغل کے تحت وقت گذاری کے مناسب استعمال پر زور دیا جاتا ہے تاکہ کاہلی و سُستی دُور ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون بھی میسر آسکے۔ تعلیم صحت کے دائرے میں صحت کا درس، صحت مند ماحول کی واقفیت، تندرست و توانا رہنے کی معلومات و ہدایات اور جسم کو اچھی حالت میں رکھنے کے ذرائع اور مواقع وغیرہ شامل ہیں اور بلا شبہ اس کا مفہوم حفظانِ صحت سے کہیں زیادہ ہے جسے ایک نئے مضمون کی حیثیت سے اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں بھی داخل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح اس دورِ ترقی میں تفریحی مشاغل، نہ محض تفریحی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ وہ صرف "مشغلہ" ہیں۔ آج فکرِ انسانی کی بدولت رفتارِ زمانہ غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔ دنوں کا کام لمحوں میں انجام پانے لگا ہے۔ ایک مشین بہت سے مزدوروں اور کاریگروں کا نعم البدل ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مادّی وسائل کی فراوانی کے ساتھ وقت کی بچت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اب ایک ملک کی معاشی خوش حالی کا اندازہ ہفتے بھر میں کام کے دنوں کی تعداد سے لگتا ہے۔ کام کا ہفتہ چھ دن کے بجائے پانچ دن اور اس سے بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس صورت

میں خالی وقت کو مفید طور پر استعمال کرنے کے لئے پوری توجہ اور رہنمائی درکار ہے۔ لیکن یہ تینوں علوم دراصل تربیتِ جسمانی کے تین رُخ ہیں۔ تربیتِ جسمانی کسی ایک عمل کا نام نہیں ہے اور نہ اسے کسی مخصوص نوعیت کی دلچسپیوں تک محدود سمجھنا چاہیے۔ تربیتِ جسمانی بجائے خود ذہنی تربیت کا سبب بن سکتی ہے۔ تربیتِ جسمانی، فوجی تربیت یا اس کا بدل بھی نہیں ہے۔ وہ پورے تعلیمی عمل کا ایک لازمی جزو ہے۔ ایک طرف وہ خالص علمی کاموں کے ہم پلہ ہے اور دوسری طرف ہاتھ کے کام کے ساتھ بھی اس کا قوی تعلق ہے۔ اس کی حیثیت تعلیم کے ایک مخصوص باب کی ہے جہاں مشاغل کو تعلیمی مقاصد کے تحت منتخب کیا جاتا ہے۔ تربیتِ جسمانی کا مقصد ہر ایک فرد کو امکانی صحت و توانائی عطا کرنا ہے۔

تعلیمِ صحت کو قومی صحت کے پروگرام کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ ہمارا بہت کچھ دکھ درد ناواقفیت کی بنا پر ہوتا ہے کیونکہ ہم حفظانِ صحت کے عام اصولوں سے عموماً بے خبر رہتے ہیں تعلیم صحت کے اہم نکات میں جسمانی صفائی ستھرائی، آس پاس کی صفائی، چھوت کی بیماریوں کی روک تھام، معقول غذا، ورزش، والدین کی تربیت اور بچوں کی دیکھ بھال وغیرہ باتیں شامل ہیں۔ اس پروگرام کو چلانے کے لئے ۱۹۵۶ء میں ڈائریکٹریٹ جنرل آف ہیلتھ سروسیز کے تحت ایک سنٹرل ہیلتھ بیورو قائم کیا گیا تھا پھر مرکز کی پیروی میں متعدد ریاستوں نے بھی اپنے اپنے 'بیرو' قائم کئے۔ دوسرے قومی پنج سالہ منصوبے کے دوران میں تربیتِ جسمانی کی طرف کافی توجہ دی گئی۔ ۱۹۵۷ء سے گوالیار میں 'لکشمی بائی کالج آف فزیکل ایجوکیشن' قائم ہوا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا کالج ہے جہاں سہ سالہ سندی نصاب جاری کیا گیا ہے اور اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے انتظامات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ لوگوں کو اپنی صحت بہتر بنانے کی ترغیب دلانے کے لئے ۱۹۵۹-۶۰ء میں قومی صحتِ جسمانی کے معیار کی مہم (نیشنل فزیکل ایفیشینسی ڈرائیو) کا آغاز کیا گیا۔ علاوہ ازیں متعدد دوسرے مرکزی پروگرام شروع کئے گئے جن کے تحت دیسی کسرت کے طریقوں کو فروغ دینے، پہلوانوں کے اکھاڑوں کی مدد کرنے اور اسی طرح کے دوسرے کاموں کو ترقی دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کھیل کود کے میدان میں ہندوستان کا جھنڈا بلند کرنے کی غرض سے دوسرے

قومی منصوبے کے اختتام پر پٹیالہ میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسپورٹس قائم کیا گیا تاکہ مختلف کھیلوں کی تربیت دینے والے استاد (کوچ) تیار کئے جا سکیں۔ مرکزی سرکار مدرسوں میں کھیل کے میدان تیار کرنے اور کھیل کا سامان فراہم کرانے کے لئے بھی امداد دیتی ہے۔ نومبر میں بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائڈس کے نام سے دیس بھر کے لئے اسکاؤٹنگ کی ایک تنظیم وجود میں آئی۔ اسکاؤٹنگ کی تحریک کی روایات بڑی شاندار ہیں اور وہ طلبہ و طالبات میں بے لوث خدمت، ایثار اور ضبط نفس کے جذبے کو فروغ دینے کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ تحریک کی تنظیمی اصلاح سے اس کا کام بھی خوب آگے بڑھا ہے۔ تیسرے قومی منصوبے میں اس تحریک کو دیہات کے اندر بھی رائج کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ آزادی کے بعد قائم ہونے والی مہاجرین کی بستیوں میں طلبہ کے اندر قدرتی طور پر بے راہ روی کے مظاہروں نے شدت اختیار کی۔ ضبط کی حالت کو سدھارنے کے لئے بحالی کی مرکزی وزارت کی طرف سے ۱۹۵۴ء میں ضبط کی قومی اسکیم (نیشنل ڈسپلین اسکیم) شروع کی گئی۔ اس اسکیم نے کچھ ایسی کامیابی حاصل کی کہ پھر اُسے سارے ملک میں رائج کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ۱۹۵۷ء سے یہ اسکیم مرکزی وزارت تعلیم کے اندر ایک ڈائرکٹریٹ کے ماتحت آگئی ہے۔ اب یہ اسکیم سارے دیس کے لئے ہے جس کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں کی صحت کو بہتر بنانے، ان کے کردار کو بلند کرنے، شخصیت کو ابھارنے، تہذیبی ذوق کی تربیت دینے اور انتظام کے معمولی طریقوں سے واقفیت پیدا کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت تربیت پانے والے اساتذہ کی تعداد دو ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔ تیسرے قومی منصوبے کے دوران میں تین مرکزی تربیتی ادارے قائم کرنے کا خیال ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ایک مرکزی تربیتی ادارہ الور میں قائم کیا جا چکا ہے جہاں پر پانچ سو استاد تربیت حاصل کرتے ہیں۔ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ (سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن) کی سفارش پر طلبہ کے لئے دو تجاویز طے پائی ہیں۔ پہلی تجویز کے مطابق مدرسوں اور کالجوں کے طلبہ دس دن سے لے کر تیس دن تک دیہات کے اندر "یوتھ کیمپ" میں گذارتے ہیں۔ جہاں سماج سیوا کے کاموں میں ہر ایک سے روزانہ چار گھنٹے محنت و مشقت بھی کرائی

جاتی ہے تاکہ طلبہ میں ذوقِ خدمت پیدا ہو اور وہ اپنے دیس کی دیہاتی زندگی سے بھی واقف ہو جائیں یہ کیمپ یونیورسٹیاں، ریاستیں، بھارت اسکاؤٹس اینڈ گائڈس، بھارت سیوک سماج اور دوسرے رفاہِ عام کا کام کرنے والی انجمنیں چلایا کرتی ہیں اور ان کے تمام اخراجات مرکزی سرکار برداشت کرتی ہے دوسرے قومی منصوبے کے دوران میں تقریباً ساڑھے پانچ سو کیمپ لگے جن میں تقریباً پانچ لاکھ طلبہ شریک ہوئے اور لگ بھگ ایک کروڑ بیس لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ دوسری تجویز یونیورسٹیوں، کالجوں اور مدرسوں میں تفریحی مشاغل کی سہولتیں فراہم کرنے سے متعلق ہے۔ اس کے ذریعے اسٹیڈیم، جمنیزیم، پیراکی کے لئے تالاب، تفریح کے لئے ہال، وغیرہ تعمیر کرائے جاسکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ طلبہ اور اساتذہ اپنے عملی تعاون سے ۵ فیصدی اور ساداراہ ۲۵ فیصدی اخراجات پورا کرنے کی پوری ذمہ داری لے۔ طلبہ کے خالی اوقات کو کارآمد بنانے اور انھیں ذہنی سکون پہنچانے کی غرض سے بھی مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں جن میں یونیورسٹیوں کا سالانہ یوتھ فیسٹول، ڈرامے کی تربیت کا انتظام، تعلیمی سیر کے لئے امداد اور یوتھ ہوسٹل وغیرہ شامل ہیں طلبہ کی فوجی تربیت کی غرض سے نیشنل کیڈٹ کور، اور دوسری متعلقہ تنظیمیں قائم کی گئی ہیں۔ چھوٹے بچوں کی تفریح کا سامان مہیا کرنے کے لئے بال بھون، تجویز کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں دہلی کے بال بھون کے ساتھ بچوں کا ایک قومی عجائب گھر بھی قائم کیا جائے گا۔

دوسرے قومی منصوبے کے اختتام پر ۴ کروڑ ۳ لاکھ بچے مدرسوں میں داخل تھے۔ تیسرے منصوبے میں تقریباً دو کروڑ بچوں کا اضافہ ہو جائے گا اور منصوبے کے آخر میں چھ سال سے لے کر گیارہ سال تک کے تقریباً ۵ کروڑ بچے مدرسوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے۔ اتنے بہت سے بچوں کی صحت کا سوال نہ صرف بذاتِ خود اہمیت رکھتا ہے بلکہ قومی صحت کا ایک اہم جزو بھی ہے۔ دوسرے منصوبے کے آخر میں اسکول ہیلتھ کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کی جس میں بتایا کہ مدرسے کے بچوں میں خرابی صحت اور بیماری کی زیادتی کی وجہ ناموزوں اور کم غذا ہے۔ اس کمیٹی نے تجویز کیا کہ تیسرے منصوبے میں مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچوں کی صحت کی طرف ضرور توجہ کی جائے جس میں پینے کے صاف پانی اور گندگی و نجاست سے بچنے کے انتظام طبی معائنے اور اساتذہ کی تعلیم صحت سے متعلق تربیت کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ابتدائی

مدارس کے ان بچوں کے لئے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنے کی تجویز در سفارش کی گئی ہے۔ اسکول ہیلتھ کمیٹی کی ان سفارشات پر غور کرنے کے لئے ابتدائی تعلیم کی مرکزی کونسل (آل انڈیا کونسل فار ایلیمنٹری ایجوکیشن) کے چیئرمین نے ایک جائزہ کمیٹی (اسٹڈی گروپ) مقرر کردی تھی جس کی تجاویز کونسل کے چھٹے اجلاس منعقدہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں پیش کی گئیں۔ یہ تجاویز بالخصوص ابتدائی مدرسوں کے اندر انتظاماتِ صحت کو بہتر بنانے اور بچوں کو دوپہر کا کھانا مفت مہیا کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس موقع پر مرکزی وزارتِ تعلیم کے منسٹر نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ مرکزی وزارتِ تعلیم نے اس سلسلے میں دو اہم سفارشات کو منظور بھی کرلیا ہے۔ یعنی نیشنل اسکول ہیلتھ کونسل کا قیام اور تیسرے قومی منصوبے کے اختتام تک کم سے کم ایک کروڑ بچوں کے لئے دوپہر کے کھانے کا مفت انتظام۔ اس وقت دوپہر کے کھانے کی اسکیم صرف کیرالا، مدراس، آندھرا پردیش، راجستھان، اور پنجاب کی ریاستوں میں جاری ہے اور اس سے تقریباً پچاس لاکھ بچے مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کام کے لئے مرکزی سرکار نے ریاستوں کو علیحدہ سے کل اخراجات کی ایک تہائی رقم بھی دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ قدم نہایت مبارک ہے لیکن اس طرح ابتدائی مدارس میں تعلیم پانے والے بچوں کے صرف پانچویں حصے کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ قومی صحت کے پروگرام کا تقاضا ہے کہ کسی نہ کسی طور پر تمام مدرسوں میں انتظاماتِ صحت کو معقول بنایا جائے اور ابتدائی تعلیم پانے والے سب ہی بچوں کو مدرسے کے اندر دوپہر کے وقت مناسب اور صحت بخش غذا فراہم ہو۔ بلکہ ثانوی مدارس اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں بھی طلبہ کے قیام و طعام کی حالت کو سدھارنے کی شدید ضرورت ہے۔ دارالاقاموں کے اندر کھانے کا انتظام عام طور پر بڑی لاپرواہی کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ خوراک کا کوئی معیار نہ مقرر کیا گیا ہے اور نہ اسے طبی نقطۂ نگاہ سے کوئی دیکھتا ہے۔ اس سلسلے میں غذائیت کا لحاظ رکھ کر علاقائی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کھانے کا ایک قومی معیار قائم ہونا چاہیئے تاکہ طلبہ کی صحت درست رہے اور انھیں اپنے کھانے پینے کی عادتوں کو سدھارنے کا موقع نصیب ہو۔ اس کے علاوہ اداروں کے اندر ریستوران، چائے خانوں اور ناشتہ گھروں میں "انا پورنا" کی طرح صرف کم قیمت اور اچھی مقررہ چیزیں ہی دستیاب ہوں۔ اس باب میں اگر مالی امداد بھی کرنی پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ طلبہ کی رہائش کا مسئلہ بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ دارالاقاموں کی کمی نہ صرف طلبہ کے اخراجات بڑھاتی ہے اور انھیں گندی بستیوں میں رہنے پر مجبور کردیتی ہے بلکہ ان کی صحت بھی بگڑتی ہے، ان کے اخلاق و کردار پر بھی مضر اثرات پڑتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کی تعلیمی حالت خراب ہو جاتی ہے۔

موجودہ ہنگامی حالات کے آئینے میں تربیتِ جسمانی کی ضرورت و اہمیت اور زیادہ واضح طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ دنیا واقف ہے کہ سیاست کو صداقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوا کرتا۔ وہاں تو صرف حکمتِ عملی کا سکہ رائج ہوتا ہے۔ آج چین محسن کشی پر آمادہ ہے اور انسانیت سوز رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ کل کسی اور کا دماغ خراب ہو سکتا ہے۔ ہم دوسروں کی نیت کے ذمہ دار نہیں بن سکتے لیکن اپنے آپ کو چاق و چوبند ضرور رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے تعلیمی نظام میں تربیتِ جسمانی کے مختلف پہلوؤں پر پوری توجہ ہونی چاہیئے۔ کھیل کود، ورزش اور فوجی تربیت تمام طلبہ کے لئے لازمی ہو اور ان کا مرتبہ ایک خالص تعلیمی مضمون سے کسی طور پر کم نہ ہے۔ آج ہمارے اداروں میں طلبہ کی انجمنیں محض سیاسی شورش میں تضیع اوقات کرتی رہتی ہیں۔ جس قدر بڑا ادارہ ہوتا ہے، اسی قدر طلبہ کی ہنگامہ آرائی زور پر ہوا کرتی ہے۔ لہذا ان انجمنوں کی جگہ مختلف تعلیمی، تفریحی اور تہذیبی مشاغل کے "کلب" کو دینی چاہیئے۔ تربیتِ جسمانی کی اس تنظیم سے طلبہ کو اپنا وقت بہتر طور پر گذارنے کا موقع ہاتھ آئے گا اور ان کی ذہنی و جسمانی نشوونما بخوبی ہو سکے گی۔ اس وقت بجا طور پر مرکزی حکومت نے طلبہ کے لئے فوجی تربیت لازمی کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ قدم محض وقتی مصالح کے تحت اٹھایا گیا ہے لیکن اس کو تربیتِ جسمانی کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے۔ فوجی تربیت کے ساتھ ساتھ اداروں میں کھیل کے میدان اور کھیل کود کی دیگر سہولتیں فراہم کرنے کی طرف بھی خاص توجہ درکار ہے۔ دراصل تربیتِ جسمانی کا ایک جامع اور صالح نظریہ ہی ہماری تعلیم کو پورے طور پر مفید و موثر بنا سکتا ہے۔ اس کام کو قومی پیمانے پر کرنے کی ضرورت ہے اور سماج سدھار کے کاموں میں اسے سب سے اہم مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ تیسرے منصوبے میں تعلیم صحت کی واقفیت کی فراہمی اور صحت کے متعلق نمائش و اشاعت پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن تعلیمی اصول اور وقت کا سکھایا ہوا سبق آج اس معاملے میں ہم سے کہیں زیادہ توجہ چاہتا ہے۔ دیس بھر میں تعلیم صحت کا ایک مستحکم نظام قائم ہونا چاہیئے اور تربیتِ جسمانی کے کام کو تعلیمی و ملکی ضرورت سمجھ کر کرنا چاہیئے۔ اسی میں ہماری اور ہمارے دیس کی فلاح و بہبود کا راز پوشیدہ ہے۔ تن پاک من پاک!

"معلم"

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں)

حدیث دل از غلام ربانی تاباں

تاریخ طباعت: دوسری بار ۱۹۶۲ء۔ قیمت: ۲/۲۵ پتہ: مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۲۵

ہمارے شعر و ادب کے نقاد اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ادب کے ہر دور کے ساتھ ایک ذیلی دور یا اس دور کا تتمہ بھی ہوتا ہے جو اپنے ماقبل دور کے مانند بھی ہوتا ہے اور اس سے ممتاز بھی خصوصاً اس زمانے میں جبکہ مسائل تہذیب اور اقدارِ حیات پہلے کے مقابلے کہیں جلد بدل جاتے ہیں۔ مثلاً فانی، یگانہ اور جگر کے بعد غزل گو شعرا کا ایک اور دور ہے جس میں فراق اور چند دوسرے شعرا کو شمار کرنا چاہیئے۔ اور اسی طرح اس دور سے ملا ہوا ایک طبقہ ان شعرا کا ہے جس میں تاباں جذبی اور فیض کو شامل کرنا چاہیئے۔ تاباں اس آخرالذکر دور کے ایک اہم غزل گو شاعر ہیں جنھوں نے غزل کی حسین روایات کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی کے جدید تقاضوں کو اس میں اس طرح سمو دیا ہے کہ اس سے غزل کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ ان کی غزل میں نہ فن کی حسین اور ضروری پابندیوں سے فرار ہے اور نہ مسائل حیات سے۔ انھوں نے ان مختلف عناصر کو اپنے ذوقِ جمال اور مذاقِ آگہی سے ہم آہنگ کر کے حسین سے حسین تر بنا دیا ہے۔ ان کے اشعار میں حسن کی محفلوں کے غمزہ و ناز اور خلوتوں کے راز و نیاز کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے اور عاشقوں کے نغمہ ہائے وصال اور نالہ ہائے فراق بھی سنے جا سکتے ہیں۔ ان کے اتحاد سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن و عشق اور جنون و خرد کی ہر منزل سے نہایت ہوش و حواس کے ساتھ گزرے ہیں۔ ایک ایک پھول اور ایک ایک خار سے سرگوشیاں

کی ہیں اور ایک ایک ذرے کی دل کی دھڑکن کو غور سے سنا ہے اور پھر ان واردات و کیفیات کو بڑے حسن اور سلیقے سے بیان بھی کر دیا ہے۔ وہ بقول خود "بیکدے کی اصطلاحوں" میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور اس لئے "دستورِ زبان بندی" بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔

تاباںؔ الفاظ کے انتخاب میں بڑے محتاط واقع ہوئے ہیں اور اس کا انھیں پورا سلیقہ ہے۔ یہ بات ایک شاعر کے لئے جتنی ضروری ہے اتنی ہی دشوار بھی ہے۔ ہماری غزل میں بعض مضامین اتنے فرسودہ اور پامال ہیں کہ اب ان میں بالکل جان نہیں رہی ہے مگر پھر بھی بعض اوقات شاعر کو ان سے گریز ممکن نہیں ہوتا لیکن انھیں نیا کر کے بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا ہے شاعر کی ندرت بیان اور قوتِ اختراع کا ایسے ہی موقعوں پر امتحان ہوتا ہے۔ مثلاً فصل بہار کی آمد اور جنوں کے تعلق پر اردو شاعری میں ہزار دل شعر مل جائیں گے اور اب اس مضمون کو کسی نئے انداز میں کہنا محال معلوم ہوتا ہے مگر تاباںؔ کا شعر سنئے اور ان کی ندرت بیان کا اندازہ کیجئے۔

اُدھر چمن میں زرِ گل لٹا اِدھر تاباںؔ
ہماری بے سر و سامانیوں کے دن آئے

اسی طرح ان شعروں کو ملاحظہ فرمایئے کہ کتنے فرسودہ مضامین میں کتنی تازگی پیدا کر دی ہے۔

مری جامہ دری نے راز یہ کھولا زمانے پر
خرد دھوکے دیا کرتی ہے جیب و آستیں بن کر

ملی ہے دل کو کسی شوخِ فتنہ ساماں سے
وفا گمان کی صورت جفا یقیں کی طرح

میں نے ان چند سطروں میں قصداً مثالوں اور انتخابِ اشعار سے گریز کیا ہے کیونکہ نہ مجھے معلمی اور تنقید کا سلیقہ ہے اور نہ رسوائی کا شوق لیکن جو بھی "حدیثِ دل" کا مطالعہ کرے گا وہ اس مختصر مجموعے میں بہت سے نادر اور بے مثال اشعار پائے گا اور میری طرح محسوس کرے گا کہ اس میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو براہِ راست دل پر چوٹ مارتے ہیں اور میں شاعری میں علم و آگہی سے

زیادہ دل کی چوٹ کو اہم سمجھتا ہوں اور اس کو فن کی بلندی کا سب سے بڑا معیار سمجھتا ہوں۔

میرے خیال میں شاعری میں تقلید کی نقالی سے زیادہ اہمیت نہیں ہے اس لئے میں "تازہ واردان بساطِ شاعری" کو تاباںؔ کی تقلید کا مشورہ تو نہ دوں گا مگر میں سمجھتا ہوں کہ تاباںؔ کی غزل آئندہ نسلوں کے لئے ایک مثال اور مشعل کا کام دے گی اور ان کی غزل کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکے گا کہ کلاسیکل انداز کو برقرار رکھتے ہوئے جدید اقدارِ حیات کو کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

آخر میں یہ گزارش بے محل نہ ہوگی کہ میں ناقد نہیں ہوں اور نہ مجھے اس کا سلیقہ ہے۔ میں نے ایک شاعر کی طرح حدیثِ دل کا مطالعہ کیا ہے اور جتنا اس سے متاثر ہوا ہوں اسے بھی احتیاطاً اور مصلحتاً کچھ کم کر کے ظاہر کر دیا ہے۔ (میکش اکبرآبادی)

آج کل (فن تعمیر نمبر) مدیر مسئول: بال مکند عرش ملسیانی: اسسٹنٹ ایڈیٹر: مظفر شاہ

قیمت، ایک روپیہ۔ پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن، پوسٹ بکس ۲۰۱۱۔ دہلی ۶

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اردو میں ہندوستانی فن تعمیر پر کوئی اچھی اور جامع کتاب نہیں ہے اور اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اس موضوع پر اردو میں لکھنے والے بہت کم ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ "آج کل" نے ہندوستانی فن تعمیر پر مخصوص نمبر شائع کر کے اردو ادب کی ایک بڑی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اگرچہ یہ شمارہ بہت ضخیم نہیں ہے، اگر موضوعِ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ متعدد تصاویر سے، جن میں مکتیشور مندر (بھونیشور) اور موتی مسجد (لال قلعہ، دہلی) کی رنگین ہیں۔ اس نمبر کی افادیت میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

(ع ل ا)

کوائف جامعہ

شیخ الجامعہ صاحب کی تقریر

۲۹ اکتوبر کو حسب معمول جامعہ کا یوم تاسیس منایا گیا۔ صبح کو سب سے پہلے شیخ الجامعہ صاحب نے جامعہ کا پرچم لہرایا اور بچوں نے جامعہ کا ترانا پڑھا۔ اس کے بعد ایک عام جلسہ منعقد ہوا، جس میں جامعہ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین پڑھے گئے۔ آخر میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے تقریر کی، جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔)

آج جامعہ کا یوم تاسیس ہے، وہ دن جب ہمیں اپنے کاموں کا جائزہ لینا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے کہاں تک اپنے ارادوں کو اور ان امیدوں کو جو لوگوں کو ہم سے ہیں پورا کیا ہے۔ یہ تعلیم کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا، اس کام کو کرنے والوں کا فرض ہے کہ ہمیشہ نئی باتیں سوچتے رہیں۔ جن سے تعلیم بہتر ہو سکے، دوسری طرف قوم اور حکومت کو دیکھتے رہنا چاہیئے کہ تعلیم کس حد تک ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے اور اسے کس طرح کی مدد ملنی چاہیئے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اس سال ۱۲ جون کو حکومت نے جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کا ادارہ مان لیا ہے، اور اب ہمارا تعلق زیادہ تر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے رہے گا جامعہ کو اب تک حکومت سے مدد ملتی رہی ہے، مگر کام کو بڑھانے اور بہت سی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے لازمی تھا کہ جامعہ کو یا تو قومی اہمیت رکھنے والے ادارے یا یو جی سی ایکٹ کے ماتحت اعلیٰ تعلیم کے ادارے کی حیثیت دی جائے۔ اب آخر نومبر میں ایک کمیٹی ہمارے منصوبوں پر غور کرے گی اور اس کی سفارشوں کے مطابق ہمیں اپنے کاموں کو مضبوط کرنے اور بڑھانے اور دشواریوں اور تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے امداد ملے گی۔

مگر جو سپاہی کا پیشہ اختیار کرتا ہے وہ جنگ کے میدان کو اپنا گھر بناتا ہے۔ ہم ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اپنے طریقہ پر آزادی کی جد و جہد میں شریک رہے۔ یہ لڑائی ختم ہوئی تو ہم یہ معلوم کرنے کی فکر میں پڑ گئے کہ آزاد

ہندوستان میں ہماری حیثیت کیا ہوگی۔ اس لئے نہیں کہ ہمیں خدمت کے بارے میں کچھ لینا تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے بغیر ہمارے کاموں میں مضبوطی نہیں پیدا ہوسکتی تھی۔ اب جو یہ بات طے ہوگئی تو ہمارے اوپر نئی تعلیمی ذمہ داریاں آگئی ہیں۔ آج ان ذمہ داریوں کو بیان کرنے کی خاص ضرورت ہے اس لئے کہ ہمارے ملک پر ایک دشمن نے حملہ کیا ہے، اور ہمیں اس دشمن کا اس طرح مقابلہ کرنا ہے کہ اس کے بعد ہر دشمن کا ہر طریقے سے مقابلہ کرسکیں۔ اب تک ہم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم کسی سے عداوت نہیں برتیں گے تو ہم سے کوئی عداوت نہیں برتے گا اور ہم کسی سے دوستی کرنا چاہیں گے تو ہم سے بے مروتی نہیں کرے گا مگر چین کے رویے نے ثابت کیا ہے کہ ہمارا خیال غلط تھا تو اس کا غم نہیں۔ ہمارا اصول کہ جہاں تک ہوسکے صلح پسندی سے کام لینا چاہیئے صحیح تھا اور اس کے سوا اور کوئی اصول صحیح مانا نہیں جاسکتا۔ ہم اب تک یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہمیں سب سے پہلے غریبی، جہالت، سماجی بے انصافیوں کا مقابلہ کرنا ہے، لیکن میدان جیتنے کے گر ہم نے نہیں سیکھے۔ اس میدان میں ہم کو اپنی کوششیں جاری رکھنا ہے، لیکن تعلیم کا اب مقصد یہ ہوگا کہ جنگ کے میدان کو ہر دوسرے منصوبے کے لئے ایک مثال بنا دے۔

یہ میرے بتلانے کی بات نہیں ہے آپ نے اپنے تجربے سے معلوم کیا ہوگا کہ گھبراہٹ میں کام خراب ہوتا ہے، اور جتنا بڑا کام ہو اتنا ہی زیادہ خراب ہوتا ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ بہت مشورہ کیا جائے تو کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ جو قاعدہ بنایا یا حکم دیا گیا ہے اس کی خوبی یا خرابی اس پر عمل کرنے سے ہی معلوم ہوسکتی ہے، ہم یا تو اس پر بحث کرتے ہیں کہ قاعدہ بنانے یا حکم دینے والے کو اس کا ادھیکار تھا یا نہیں، یا خود قاعدے یا حکم میں عیب نکالتے ہیں۔ ہم میں سے بہت کم یہ سوچتے ہیں کہ جس بات میں ہمیں اپنا نقصان معلوم ہوتا ہے اس سے دوسروں کو اور مجموعی حیثیت سے سماج کو کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے، اور ہمیں اس فائدے کا زیادہ خیال کرنا چاہیئے یا اپنے نقصان کا۔ دراصل انسان کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بہت سے چھوٹے مقصدوں کو قربان کرنا ہوتا ہے، سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ یہ قربانی زبردستی کرائی جائے یا لوگ اسے لازمی سمجھ کر خود قبول کریں۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ کامیاب وہ ہوتا ہے جو اپنے کام کو جانتا ہے، کوئی سپہ سالار

اس وجہ سے لڑائی نہیں جیتتا کہ وہ اچھا آدمی ہے یا اچھے مقصد کے لئے لڑتا ہے۔ کامیاب وہ سپہ سالار ہوتا ہے جو لڑائی کے فن کو خوب جانتا ہو، اس کے اصولوں اور طریقوں سے جیسی مصلحت ہو کام لے سکے اور جس کی پشت پر ایک متحد قوم ہو۔ اب سوچئے کہ انھیں چند باتوں سے کیا کیا نتیجے نکلتے ہیں۔

آدمی گھبراتا اس وقت ہے جب کوئی ایسی بات ہو جائے جس کے لئے وہ تیار نہ ہو۔ آپ آج ارادہ کر لیجئے کہ آپ خود کو ہر صورت حال کے لئے تیار کر لیں گے۔ کچھ مشورے میں بھی دے سکتا ہوں۔ جنگ کی تاریخ اور آج کل جنگ کا جو طریقہ ہے اس کے بارے میں جتنی کتابیں مل سکیں پڑھیئے۔ ممکن ہے آپ کی اس محنت کو ہم آپ کی کارگذاری میں شامل کر سکیں، ممکن ہے نہ کر سکیں نصاب کو بدلنے میں بہت دیر لگتی ہے، آپ واقف کار شہری بننے کے لئے اس کا انتظار نہیں کر سکتے۔ آپ کو کتابیں چاہئیں تو کچھ میرے پاس ہیں، کچھ کا پتہ میں بتا سکتا ہوں، کچھ مل جُل کر خرید یئے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ آپ طے کر سکیں گے کہ ضرورت پڑنے پر آپ کون سا کام اپنے ذمے لے سکیں گے۔ نوجوان فوج میں بھرتی ہو سکتے ہیں، زیادہ عمر کے لوگ فوج میں بھرتی ہونے والے جو کام کر رہے ہیں ان میں سے مناسب کام اپنے ذمے لے سکتے ہیں سول ڈفنس میں شریک ہو سکتے ہیں، پروپگنڈا کر سکتے ہیں۔ میں تو چاہوں گا کہ طالب علموں میں سے ہر ایک، اور خاص طور سے لڑکیاں، بندوق چلانے کی مشق کریں، وہ نقشے کو سامنے رکھ کر قزاقانہ جنگ (GUERILLA WARFARE) کے پلین بنائیں۔ اور چھٹی کے دنوں میں اس کی مشق کریں۔ فرسٹ ایڈ یعنی دواؤں وغیرہ کے ذریعے زخمیوں اور بیماروں کی فوری مدد کے طریقے بھی ہم سب کو جاننے چاہئیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کی الگ ٹریننگ ہوتی ہے، اور آپ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ اس کا انتظام کیا جائے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ پڑھے لکھے ہندوستانی شہریوں کو ایسا بے بس نہ ہونا چاہیئے کہ جو باتیں کتابوں سے معلوم کی جا سکتی ہیں وہ بھی معلوم نہ کر سکیں جب تک کہ کورس اور استاد اور۔ ہاں آخر میں سرٹیفکٹ کا انتظام

نہ ہو جائے۔ جنگ اور اس سے متعلق باتوں کے بارے میں آپ کافی معلومات حاصل کرلیں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ میں اعتماد پیدا ہوگا اور آپ دوسروں کی گھبراہٹ کو بہت جلد دور کرسکیں گے۔ مثلاً اگر آپ سنیں کہ ہندوستانی فوج بیس میل پیچھے ہٹ آئی تو آپ پریشان نہیں ہوں گے، اس لئے کہ فن جنگ کے استادوں اور ماہروں نے بتایا ہے کہ لڑائی میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون آگے بڑھا کون پیچھے ہٹا، دیکھا یہ جاتا ہے کہ کس نے زیادہ آدمیوں اور سامان کا نقصان اٹھایا، فوج کو پیچھے ہٹا کر اور مقابلہ کے لئے بہتر موقع نکال کر دشمن کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے، اور فوج کو آگے بڑھا کر نقصان اٹھایا جا سکتا ہے۔ فوجیں جب قوم کے لئے لڑ رہی ہوں وہ گھبرا جائے تو پھر جیتنا کیا لڑنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی چند مثالیں دیتا ہوں۔ بلجیم اور ہالینڈ پر جرمنی کا حملہ سنہ ۴۱ء میں اور امریکیوں کا حملہ جرمنی پر سنہ ۴۵ء میں ان مواقع پر وہاں کے عوام گھبرا کر بھاگنے لگے، جس کی وجہ سے فوج کی آمد و رفت رک گئی اور دشمن کو ان جگہوں پر قبضہ کرنے کا بہترین موقع مل گیا۔ اسی طرح کی گھبراہٹ اگر دہلی میں ہوئی تو اس کا اثر سارے ملک پر پڑے گا۔ اور ہماری فوج کی راہ میں بڑی دقتیں پیدا ہو جائیں گی۔

اب دوسری بات غور کیجئے، کہ مشورہ کب تک اور کہاں پر کرنا چاہیئے، اور قاعدے یا حکم پر کب عمل کرنا چاہیئے۔ جمہوری طریقے کے مطابق مشورہ کرنا اور مشورہ دینا بہت ضروری ہے مگر جمہوری طریقہ بالکل ناکامیاب، بلکہ ایک مصیبت ہو جاتا ہے اگر مشورہ کرنے کی کوئی حد مقرر نہ ہو، اور مشورہ دینے والے اس کی اہمیت اور استعداد نہ رکھتے ہوں، جامعہ میں ہم مشورہ کرتے ہیں، آزادی سے رائے دیتے ہیں، ساتھ مل کر کام کرلیتے ہیں، مگر ہم قدم ملا کر نہیں چلتے، جو بات اپنی سمجھ میں نہ آئے اسے نہیں کرنا چاہتے۔ خفا ہو کر کہہ دیتے ہیں کہ ہاں، حکم دیجئے تو کریں گے ورنہ نہیں کریں گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جن جلسوں میں شرکت اختیاری ہو ان میں لوگ شریک ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ کوئی غیر معمولی خرابی نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے ہم نے کوئی خاص نقصان نہیں اٹھایا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم میں یہ صفت نہیں ہے کہ

ایک جگہ جمع ہونے کی ضرورت ہو تو گھنٹی بجائے اور شور مچائے بغیر جمع ہو جائیں، جسے یقین نہ ہو کہ وہ صحیح مشورہ دے سکتا ہے وہ مشورہ کے وقت چپ رہے، جو صحیح مشورہ دے سکتا ہو وہ آگے بڑھ کر مشورہ دے تو اسے بغیر حجت کے قبول کر لیا جائے، شیخ الجامعہ کی عدم موجودگی میں کوئی فیصلہ کرنا ہو تو خازن اور مجلس اور سینیر اساتذہ مل کر فیصلہ کر لیں، اور جامعہ کی برادری سمجھے کہ ایسا کرنا مناسب ہے۔

چین کے حملے کے بعد ہر طرف پکار کر کہا جا رہا ہے کہ اب ہمیں متحد ہونا چاہیئے۔ جامعہ میں ہم برابر کہتے رہے ہیں کہ ہم ہندوستان کے شہری ہیں، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں وہ بات نہیں ہے جسے فرقہ وارانہ جھگڑے، لسانی اختلافات اور علاقائی تعصب کہا جاتا ہے۔ دوسروں کی بہ نسبت شاید ہمیں اس کا بہتر موقع ہے کہ ہم اپنے کام میں اور اپنی روزمرہ زندگی میں وہ ڈسپلن اور یک جہتی پیدا کر لیں جو جنگ کے لئے تیار فوج میں ہوتی ہے۔ ہم میں اور فوج کے سپاہیوں میں فرق یہ ہوگا کہ سپاہی پر خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کی ذمہ داری نہیں ہوتی، اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا افسر کون ہے اور وہ وہی کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف ہم میں سے ہر ایک سپاہی بھی ہے اور افسر بھی، ہم میں سے ہر ایک میں اس کی صلاحیت ہونا چاہیئے کہ حکم مان سکے اور دے سکے، خود سوچ سکے اور دوسروں کی رائے پر عمل کر سکے۔ سپاہی لڑتا ہے یا لڑائی کی مشق کرتا ہے، ہم کو ایسی ذہنیت پیدا کرنا ہے کہ امن اور انسانیت کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔ دوسروں کی بھلائی چاہیں، اگر عزت و آبرو کو اور ملک کو بچانے کے لئے ضروری ہو جائے تو سپاہی کی طرح میدان میں آ جائیں۔ ایسی ذہنیت صرف اچھی تعلیم کے ذریعے پیدا کی جا سکتی ہے، اور اچھی تعلیم وہ ہے جو ہمیں حق اور انصاف اور آدمیت کی خدمت کرنے کا حوصلہ دلائے اور اس حوصلہ کو پورا کرنے کے قابل بنا دے۔

سول ڈیفنس کی ٹریننگ اور قومی فنڈ میں چندہ

چین کے حملہ کی وجہ سے تعلیمی میلا جو ۹، ۱۰ اور ۱۱ نومبر کو ہونے والا تھا، ملتوی کر دیا گیا اور سول ڈیفنس

کے لئے مختلف قسم کے کاموں کی سکیمیں تیار کی گئی ہیں۔ مثلاً طالب علموں اور طالبات کے لئے ٹریننگ کا ایک
کورس تیار کیا گیا ہے کہ آگ لگنے کی صورت میں اس پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے، زخمیوں کی کس طرح امداد
کی جائے، افراتفری اور گھبراہٹ کو کس طرح روکا جائے اور اپنے اپنے علاقہ کے نظم و نسق کو برقرار رکھنے
کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک رائیفل کلب قائم کیا گیا ہے جس میں طالب علموں
اور اسٹاف کو رائیفل اور بندوق کا استعمال سکھایا جائے گا اور صحیح نشانے کی مشق کرائی جائے گی۔

قومی مدافعت فنڈ کے لئے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو حسب ذیل چندے بھیجے گئے ہیں۔

۱۔ جملہ اسٹاف کی ایک دن کی تنخواہ	۲۷ ر ۱۸۸۹ روپے
۲۔ انجمن اساتذہ کی طرف سے	۱۰۰۱ روپے
۳۔ چندہ از طلبائے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس ایجوکیشن	۱۴۱ روپے
۴۔ جگو بھائی شاہ (آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے ایک استاد)	۱۰۱ روپے

میزان، ۲۷ ر ۳۲۳۲ روپے

بقیہ اداروں کے طلباء چندہ جمع کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبائے مدرسہ ثانوی نے ایک
دن اور طلبائے کالج نے دو دن روزے رکھ کر اپنے کھانے کی رقم قومی مدافعت فنڈ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔
آرٹس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ایک ڈرامہ کیا گیا ہے اور اس کی جملہ آمدنی مدافعت فنڈ میں دی جائے گی۔
استادوں کے مدرسہ کے بہت سے طلباء اور کچھ اساتذہ نے خون کی پیش کش کی ہے۔ ان کے خون کی جانچ
ہو چکی ہے اور عبداللہ ولی بخش قادری (استاد)، ویر سنگھ بھاٹی (متعلم بی ایڈ)، حکم سنگھ چوہان
اور ستیش پال (متعلمین صداقت نامہ معلمی سال دوم) کا فی کس ۔۔۔ سی سی خون لیا
جا چکا ہے بہر حال تعلیم معمول کے مطابق جاری ہے، مگر ساتھ ساتھ ہی قومی مدافعت کے لئے بڑے
جوش و خروش کے ساتھ متعدد قسم کے کام بھی کئے جا رہے ہیں۔

مراسلات

حضرت جگر کے خط مطبوعہ جامعہ کی صحیح تاریخ

اکتوبر ۱۹۶۲ء کے رسالہ جامعہ میں جگر مرحوم کے دو خط شائع ہوئے تھے، جن پر کوئی تاریخ درج نہیں تھی۔ فاضل مکتوب الیہ کے محض اندازے کے مطابق نوٹ میں تاریخ درج کردی گئی تھی۔ پہلے خط میں حضرت شاعر لکھنوی اور لاہور کے ۲۶ تاریخ کے مشاعرہ کا ذکر ہے، اس لئے میں نے موصوف کو صحیح تاریخ معلوم کرنے کے لئے عریضہ لکھا جس کے جواب میں حسب ذیل عنایت نامہ موصول ہوا ہے :-

کراچی

۲۶ ستمبر ۱۹۶۲ء   برادرم جناب اعظمی صاحب   سلام مسنون

.... مرحوم نے اپنے خط میں جس ۲۶ تاریخ کا ذکر کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

"۲۶ اپریل ۱۹۴۹ء کو انجمن حمایت الاسلام لاہور کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ کا انعقاد ہوا تھا اور ہندوستان سے حضرت جگر کو اپنے ہمراہ لاہور لانے کی خدمت مجھے سپرد کی گئی تھی۔ حضرت جگر اُن دنوں گونڈہ میں تشریف فرما تھے۔ میں گونڈہ میں اُن کے ہمراہ اجازت نامہ (NO OBJECTION) حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ جو گونڈہ کے ڈپٹی کمشنر سے تعلقات میں کشیدگی کے باعث ناکامی پر ختم ہوئی اور میں اور جگر صاحب دونوں لاہور کے مشاعرہ میں شریک نہ ہو سکے۔ یہ مشاعرہ خواجہ ناظم الدین (جو اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل تھے) کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔"

نیازمند

شاعر لکھنوی

حضرت شاعر نے اپنے اس خط میں "ڈپٹی کمشنر کے تعلقات کی کشیدگی" کا ذکر کیا ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں تھوڑی سی اس پر بھی روشنی ڈال دی جائے۔ جگر مرحوم اپنے بے تکلف اور محترم دوست حضرت تسکین کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"گونڈہ کی فضا نہایت خراب ہوگئی ہے۔ یہاں کا ڈپٹی کمشنر شیطان بہ صورت انسان ہے۔
میں نے اس کے خلاف قدم اٹھالیا ہے۔ یہاں کا سیاسی جمود ختم ہو رہا ہے۔ ایک وفد کے سلسلے میں
رکن کی حیثیت سے حکومت یو پی کے وزیر اعظم سے کل ہی مل لینا ہے۔ منشی صاحب تانگے کی تلاش
میں گئے ہوئے ہیں۔" (مکاتیب جگر صفحہ ۶۹)

اس خط سے حضرت شاعر لکھنوی کی تاریخ کی تائید ہوتی ہے۔ جگر مرحوم نے اس خط پر ۲۷ اپریل
کی تاریخ درج کی ہے۔ سنہ کے بارے میں حضرت تسکین نے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "سال غالباً
بلکہ یقیناً ۱۹۴۹ء ہوگا۔ میں اس زمانے میں لکھنؤ سے اپنے وطن گیا ہوا تھا۔" مگر باوجود اس کے
کہ جگر مرحوم نے ۲۷ اپریل لکھا ہے حضرت تسکین لکھتے ہیں "چونکہ اگلا خط ۹ اگست کا ہے
اس لئے غالباً یہ خط ماہ جولائی میں لکھا گیا۔" لیکن اگلے خط میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس
کی بنا پر جگر مرحوم کی تاریخ کو غلط سمجھا جائے۔ اس لئے میں نے حضرت تسکین سے اس کے
بارے میں استصواب کیا۔ انھوں نے جواب میں لکھا ہے کہ یہ نوٹ غلطی سے شائع ہوگیا ہے۔

جاوید نامہ کا انگریزی ترجمہ ——— ایک تصحیح

رسالہ جامعہ کے سالنامہ میں، جو فروری ۶۲ء میں شائع ہوا تھا، جناب ڈاکٹر عبادت
بریلوی صاحب کا ایک مضمون "پاکستان کی اردو مطبوعات پر ایک نظر" کے عنوان سے شائع
ہوا تھا۔ موصوف نے صفحہ ۴ پر ایک جگہ لکھا ہے:-

"بزم اقبال لاہور نے علامہ اقبالؒ کے جاوید نامہ کا ترجمہ بھی انگریزی میں شائع کردیا
ہے۔ اس کے مترجم عبدالکریم خاں ہیں اور انھوں نے علامہ کی فارسی نظموں کو انگریزی نظم کے
سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔"

ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے سکریٹری جناب اشرف ڈار صاحب نے ہمیں لکھا ہے کہ
اس بیان میں مترجم اور ناشر دونوں کے نام غلط ہیں۔ ذیل میں موصوف کا خط شائع کیا جارہا ہے

مناسب تو یہ تھا کہ فاضل مضمون نگار ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کی رائے بھی معلوم کر کے ساتھ ہی شائع کردی جاتی، مگر افسوس کہ موصوف لندن یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے تین سال کے لئے، انگلستان چلے گئے ہیں، اس لئے ان سے استصواب کئے بغیر ہی یہ خط شائع کیا جا رہا ہے :-

مدیر صاحب جامعہ!

" آپ کے موقر جریدۂ "جامعہ" کے سالنامہ (اشاعت فروری ۱۹۶۲ء) میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی ایک کتاب کے بارے میں غلط اطلاع درج ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے مختلف اشاعتی اداروں کی مطبوعات کے متعلق اپنے مضمون میں علامہ اقبال کے "جاوید نامہ" کا انگریزی ترجمہ کسی "عبدالکریم خاں" سے منسوب کر دیا ہے اور تحریر فرمایا ہے کہ یہ ترجمہ بزم اقبال نے شائع کیا ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ "جاوید نامہ" کا ترجمہ پروفیسر محمود احمد (پرنسپل گورنمنٹ کالج۔ میرپور) نے کیا ہے اور اسے شائع کرنے کا فخر ادارہ ثقافت اسلامیہ کو ہے۔

احقر

اشرف ڈار

بوتل میں بند۔ توانائی اور صحت

کا سرچشمہ

ماءاللحم خاص

(اصلی زعفرانی رنگ)

گوشت کے جیسے جوش ۱۰۰۰/۲۱ وٹامینز سے بھرپور پھلوں کے رس

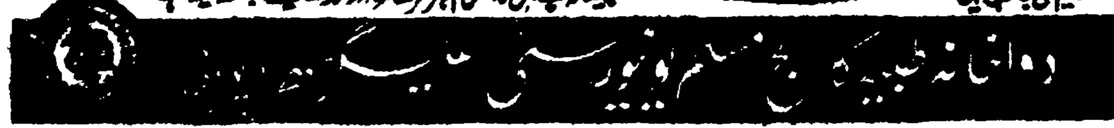
قیمتی جڑی بوٹیاں، مشک، عنبر اور زعفران کا بہترین مرکب

ماءاللحم خاص بے پناہ قوت اور توانائی، جوش و امنگ اور حسن فراہم

پیدا کرتا ہے اس کا استعمال ہر عمر کے مرد اور عورت کیلئے بے حد مفید ہے



ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جا رہی ہیں



ایجنسیاں:- (۱) مرادآباد چوکھاپل (۲) کانپور ظہیر اینڈ سنس چمن گنج (۳) جمشید پور محمد مصطفیٰ اسٹور بازار (۴) مرک پور محفوظ الرحمٰن عبدالحفیظ (۵) مئو ناتھ بھنجن، صدر بازار احمد مجتبیٰ (۶) لکھنؤ امین آباد، اودھ جنرل اسٹور

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ
جامعہ نگر - نئی دہلی - ۲۵